نگار

قیمت

۸ر

تصانیف نیاز فتحپوری

نگارستان

حضرت نیاز کے بہترین ادبی مقالات اور افسانوں کا مجموعہ نگارستان نے ملک میں جو درجہ قبول حاصل کیا اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس کے متعدد مضامین غیر زبانوں میں منتقل کئے گئے۔

قیمت دو روپیہ (عہ/)
علاوہ محصول

جمالستان

اڈیٹر نگار کے مقالات ادبی کا دوسرا مجموعہ جس میں ۲۲۔افسانے ۳۳ء تک کے درج ہیں۔ زبان قدرت بیان علو تخیل اور پاکیزگی خیال کے بہترین شاہکار کے علاوہ بہت سے اجتماعی و معاشری مسایل کا حل بھی آپ کو اس مجموعہ میں نظر آئے گا۔ ہر افسانہ اور ہر مقالہ اپنی جگہ معجزۂ ادب کی حیثیت رکھتا ہے

قیمت چار روپیہ (للعہ/)
علاوہ محصول
خریداران نگار سے ایک روپیہ کم

مکتوبات نیاز

اڈیٹر نگار کے تمام وہ خطوط جو نگار میں شائع ہوئے ہیں نیز وہ جو شائع نہیں ہوئے۔ جذبات نگاری اور سلاست بیان رنگینی اور البیلے پن کے لحاظ سے فن انشاء میں یہ بالکل پہلی چیز ہے جس کے سامنے خطوط غالب بھی پھیکے معلوم ہوتے ہیں مع تصویر حضرت نیاز ۲۸ پونڈ کے کاغذ پر مجلد شایع ہوئی ہے۔

قیمت دو روپیہ آٹھ آنے (عہ/)
علاوہ محصول

شہاب کی سرگزشت

حضرت نیاز کا وہ عدیم النظیر افسانہ جو اردو زبان میں بالکل پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے اصول پر لکھا گیا ہے اس کی زبان اس کی تخئیل اس کی نزاکت بیان اسکی بلندی مضمون اور اسکی انشاء عالیہ سحر حلال کے درجہ تک پہونچتی ہے۔

قیمت ایک روپیہ (عہ/)
علاوہ محصول

اُردو شاعری

یعنی جنوری ۳۵ء کا نگار جس میں اردو شاعری کی تاریخ، اس کی عہد بہ عہد ترقی اور ہر زمانہ کے شعراء پر بسیط نقد و تبصرہ کیا گیا ہے معہ انتخاب کلام، اس کی موجودگی میں آپ کو کسی اور تذکرہ دیکھنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ اور جس میں سات مضامین اڈیٹر نگار کے لکھے ہوئے ہیں حجم ۲۵۶ صفحات۔ قیمت عہ/ علاوہ محصول

ہندی شاعری

یعنی جنوری ۳۶ء کا نگار جس میں ہندی شاعری کی تاریخ اور اس کے تمام ادوار کا بسیط تذکرہ موجود ہو اس میں تمام مشہور ہندو شعراء کے کلام کا انتخاب مع ترجمہ کے درج ہے۔ ہندی شاعری کی اصل قدر و قیمت کا اندازہ مقصود ہو تو اردو میں آپ کے لئے صرف یہی ایک مجموعہ کافی ہے۔ قیمت علاوہ محصول عہ/

"نگار" جنوری ۳۷ء

(۱) "ڈرامہ اصحاب کہف"۔ یہ ڈرامہ مصری انشاء پرداز توفیق الحکیم کی کتاب "اہل الکہف" سے ماخوذ و مقتبس ہے اور تنہا یہی ایسی چیز ہے جو آپ کے ذوق انشاء تمثیل کو آسودہ کرنے والی ہے۔ اس کے علاوہ (۲) اسکر وائلڈ کے خطوط جو اُسنے سارہ (مشہور ایکٹریس) کو لکھے تھے اور جو دنیائے ادب و انشاء میں خاص مرتبہ کی چیز سمجھے جاتے ہیں۔ وائلڈ اپنے طرز انشاء و ندرت بیان کے لحاظ سے یوروپ میں جس مرتبہ کا شخص شمار ہوتا تھا اُسکا اندازہ آپ ان خطوط سے کرسکتے ہیں (۳) "مسئلہ خلافت و امامت" (آزاد خیال شیعی کے قلم سے) مسئلہ خلافت و امامت لاکھ قدیم و لاینحل سہی پھر بھی اس سلسلۂ تحقیق و جستجو میں بعض ایسی باتوں کے نکلنے کا امکان ہے جن سے مفاہمت کی کوئی صورت پیدا ہو سکے چنانچہ اس سلسلہ کا یہ پانچواں مقالہ ہے اسکے بعض عنوان یہ ہیں:۔ مسئلہ خلافت کے مبادی مقدمات۔ نفس مسئلہ خلافت۔ مسئلہ خلافت کے فروع و جزئیات وغیرہ ——— صفحات ۱۴۴ — قیمت عہ/ علاوہ محصول

"نغمۂ کارواں" کا حصہ عدم گنجائش کے باعث اس مہینے کے پرچے میں شایع نہیں ہوسکا

نگار

رسالہ ہر مہینے کی ۱۵ تاریخ تک شایع ہوجاتا ہے
رسالہ نہ پہونچنے کی صورت میں ۲۵ تاریخ تک دفتر میں اطلاع ہونی چاہئے ورنہ رسالہ مفت نہ روانہ ہوگا
سالانہ قیمت پانچ روپیہ (صہ) ششماہی تین روپیہ (سے)
بیرون ہند سے بارہ شلنگ آٹھ روپیہ (عہ) سالانہ پیشگی مقرر ہے

شمار (۱)	فہرست مضامین جولائی ۱۹۳۸ء	جلد (۳۴)

اڈیٹر:- نیاز فتحپوری

شمارہ-۱	جولائی سنہ ۳۸ء	جلد-۳۴

ملاحظات

لکھنؤ اور شیعہ سُنّی نزاع

دنیا میں اختلاف ہمیشہ رہا ہے اور رہیگا اور غالبًا یہ کہنا نادرست نہ ہوگا کہ نوعِ انسانی کی ترقی بہت کچھ اسی "اختلاف" کی ممنونِ کرم ہے، لیکن ساتھ ہی اس کے ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ اسی اختلاف نے ملک کے ملک ویران کردئے اور قوم کی قوم کو تباہ کرکے رکھدیا ـــ اختلاف وہی ایک مگر نتیجے دو؟ اس کے سمجھنے کے لئے ذہن انسانی کی گزشتہ تاریخ کا مطالعہ کیجئے

اختلاف دو قسم کا ہوا کرتا ہے، ایک ذہنی اور دوسرا اعتقادی - ذہنی اختلاف سے میری مراد اُن دو آزاد ذہنوں کا اختلاف ہے جن میں سے ہر ایک حق و حقیقت کی جستجو چاہتا ہے اور اعتقادی اختلاف سے مراد اُن دو مذہبی جماعتوں کا اختلاف ہے، جن میں سے ہر ایک ذہنی غلامی میں مبتلا ہے اور دوسرے سے محض اپنی روایات کو تسلیم کرانا چاہتا ہے

وہی قسم اول کا اختلاف ہے جس نے حکما، و فیلسوف، مخترع و موجد دنیا میں پیدا کئے اور یہی دوسری قسم کا اختلاف ہے جس نے انسانیت کو شل کرکے رکھدیا۔ سنی شیعہ اختلاف بھی یہی روایتی اختلاف ہے، جس کا تعلق ذہن کی آزادی سے بالکل نہیں ہے بلکہ صرف ان معتقدات سے ہے جن کو ہم نے بغیر ذاتی فکر و تدبر کے صحیح باور کرلیا ہے اور جن کے خلاف سننے کی تاب ہماری تنگ نظری نہیں لاسکتی، بہرحال یہ تو اُصولی گفتگو ہے جس کا یہ محل نہیں اس وقت دیکھنا صرف یہ ہے

کہ لکھنؤ میں جو یہ نزاع پیدا ہوئی ہے اس میں، واقعی غلطی کس کی ہے اور فساد کا اصل ذمہ دار کس کو قرار دیا جائے گا

سُنّی کہتے ہیں کہ ہم خلفار کو اچھا سمجھتے ہیں اس لئے ہمیں علی الاعلان اس کے ظاہر کرنے کا حق حاصل ہے، شیعہ کہتے ہیں کہ ہم اُن کو بُرا سمجھتے ہیں اس لئے ہمیں بھی اُن کو بُرا کہتے پھرنے کا حق پہونچتا ہے۔ اس مسئلہ کو آپ اگر کسی منصف حاکم کے سامنے پیش کریں گے تو وہ یقیناً یہی فیصلہ صادر کرے گا کہ علی الاعلان نہ تم خلفار کو بُرا کہو نہ وہ اچھا کہیں اور یہی اصل روح ہے اس فیصلہ کی جو یو۔پی کی حکومت نے کیا ہے، لیکن شیعہ اس پر مطمئن ہیں اور سُنّی نہیں ہیں۔ عام طور پر اس بحث کے سلسلہ میں سنیوں کی طرف سے عقلی یا اخلاقی استدلال یہ پیش کیا جاتا ہے کہ دنیا میں کسی کی تعریف کرنا اتنا بُرا نہیں ہو سکتا جتنا اس کو گالیاں دینا، لیکن اس قسم کی حجتوں سے سنی اسوقت کام لے سکتے جب خود اُن کے تمام عقاید عقل پر قایم ہوتے، معاملہ مذہب کا ہے جس میں عقل کو دخل نہیں اس لئے کسی عقلی حجت سے کام لینے کا حق نہ سنیوں کو حاصل ہے نہ شیعوں کو، دونوں جیسے ہیں، ویسا ہی ان کو سمجھ کر فیصلہ کرنا ہوگا

حکومت یقیناً مذہبی آزادی کی طرفدار ہے، لیکن اگر یہ آزادی فتنہ و فساد کی باعث ہو، تو بیشک اس آزادی کو چھن جانا چاہئے اور اس بنار پر اگر "مدح صحابہ" کے لئے یہ پابندی عاید کی گئی ہے کہ پہلے اس کی اجازت حاصل کرلینا ضروری ہے تو میں اس کو انتہائی نرم حکم سے تعبیر کروں گا، ورنہ فیصلہ تو یہ ہونا چاہئے تھا کہ مدحِ صحابہ قطعاً ممنوع ہے۔ اس مسئلہ میں یہ بحث اُٹھانا کہ عقاید کے لحاظ سے شیعہ قابل استحسان ہیں یا سُنّی، بالکل بے محل ہے، دیکھنا صرف یہ ہے کہ ان میں کون اپنے مسلمات مذہب سے ہٹ کر آگے بڑھنا چاہتا ہے، خواہ وہ کتنے ہی لغو و مہمل کیوں نہ ہوں

تھوڑی دیر کے لئے مان لیجئے کہ شیعہ کا خلفار کو بُرا کہنا یا بُرا سمجھنا، نہایت رکیک حرکت ہے لیکن اس کا انکار سُنّی بھی نہیں کر سکتے کہ یہ اُن کے مسلک و مذہب کی بنیاد ہے اور آج سے نہیں بلکہ اسی وقت سے جب واقعۂ کربلا[1] پیش آیا، لیکن کیا کوئی سُنّی کہہ سکتا ہے کہ خلفار یا صحابہ کی مدح و ثنا میں جلوس نکالتے پھرنا یا کوئی مخصوص بزم قایم کرکے اس کا اعلان کرنا اسکے مذہب میں داخل ہے۔ یہ تو خیر صحابہ کا معاملہ ہے، میں کہتا ہوں کہ خود رسول اللہ کی شان میں بھی اس انداز سے قصاید مدحیہ پڑھنا یا ذکر میلاد کی صحبتیں برپا کرنا سنیوں کے ایمان و مذہب میں داخل نہیں

اب رہا سنیوں کا یہ استدلال کہ آزاد شہری ہونے کی حیثیت سے ان کو مجبور نہیں کیا جا سکتا کہ جن کو وہ اچھا کہتے ہیں انکو اچھا نہ کہیں، سو اس میں شک نہیں کہ ان کی یہ دلیل خاصہ وزن رکھتی ہے، لیکن اگر اسی کے مقابلہ میں شیعہ یہ کہیں (اور ان کا کہنا بالکل حق بہ جانب ہوگا) کہ وہ صحابہ کو بُرا کہنے کا حق مذہب کے لحاظ سے بھی رکھتے ہیں اور آزاد شہری ہونے کے لحاظ سے بھی، تو کسی کے پاس اس کا کیا جواب ہوگا۔ ہر چند بظاہر یہ بات بہت عجیب سی معلوم ہوتی ہے کہ "اچھا کہنے اور بُرا کہنے" کو

---

[1] ممکن ہے شیعہ حضرات اپنے مذہب کی ابتدا وفات رسول کے بعد ہی سے قرار دیں، لیکن میرے نزدیک شیعوں کی اجتماعیت نے مذہب کی حیثیت واقعۂ کربلا کے بعد اختیار کی ہے۔

ایک ہی درجہ کی چیز قرار دیا ہے، لیکن جب سوال دلآزاری کا آجائے گا تو ہمیں ماننا پڑے گا کہ شیعہ کے کانوں کے لئے مدح صحابہ وہی حکم رکھتی ہے جو سُنّیوں کے لئے تبرّا

دنیا کا کوئی فیصلہ ہو، نفسیاتی حقیقت کو اس سے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا پھر کون ہے جو دشمن کی تعریف سُنکر ناخوش نہ ہوگا اور اس کی دلآزاری نہ ہوگی۔ شیعوں کو نفسِ مدح صحابہ سے کوئی عناد نہیں ہے بلکہ اس اسپرٹ یا رُوح سے ہے جو اس کے ذریعہ سے ظاہر ہوتی ہے۔ اور یہ واقعہ ہے کہ سُنّیوں کا موجودہ اصرار ضد اور ہٹ کے سوا کچھ نہیں، کیونکہ یہ انھیں خود بھی معلوم ہے کہ مذہب کو اس سے کوئی واسطہ نہیں۔ اور لکھنؤ میں ۱۹۰۹ء سے قبل کبھی یہ بدعت نہیں دیکھی گئی

میں نے خود یہ جلوس دیکھے ہیں اور اُن والنیٹروں کو بھی دیکھا ہے جو اپنے آپ کو گرفتار کرا دینے کے لئے باہر نکلتے ہیں، اسی کے ساتھ میں نے وہ الفاظ بھی سُنے ہیں جن کے ذریعہ سے "مدحِ صحابہ" کا فرض انجام دیا جاتا ہے، سچ عرض کرتا ہوں کہ جب یہ منظر میرے سامنے آیا ہمیشہ "ثم رددناہ اسفل سافلین" کی تصویر نگاہوں کے سامنے آگئی

شیعہ سُنّی کا مذہبی اختلاف تو خیر قیامت تک دور نہیں ہو سکتا، لیکن مذہب کی بنا پر تمدنی و معاشرتی تعلقات کو خراب کر لینا اتنی بڑی حماقت ہے کہ شاید مذہب بھی اس کو برداشت نہیں کر سکتا حالانکہ عقل کا حامی وہ بھی نہیں ہے

ہر چند حکومت فتنہ و فساد کو روک سکتی ہے، وہ ایسے قانون وضع کر سکتی ہے جو دو لڑنے والوں کو ایک دوسرے سے دور رکھ سکے، لیکن یہ جو کچھ ہوگا عارضی ہوگا، ناقابلِ اطمینان ہوگا۔ حقیقی امن و سکون اُسی وقت حاصل ہو سکتا ہے جب خود جماعت کے اندر اس کا احساس پیدا ہو جائے اور یہ بغیر رواداری کے ممکن نہیں

اپنے جذبات کے مقابلہ میں دوسروں کے جذبات کی رعایت آسان نہیں، لیکن انسانیت کا اقتضا بہرحال یہی ہے اور جب تک ہم اس پر کاربند نہ ہوں صرف "حیوانِ ناطق" ہیں، انسان نہیں ہیں

اب رواداری کے باب میں یہ کہنا کہ فلاں جماعت تو اس سے کام لے اور فلاں نہیں، ذرا خلافِ اُصول ہے، رواداری کے معنی ہی ہیں دونوں فریق کا ایک دوسرے کی طرف جُھکنا، اس لئے صحیح معنے میں رواداری کی شان اُسوقت پیدا ہو سکتی ہے جب دونوں اپنی اپنی جگہ ایثار سے کام لیں، لیکن اگر کوئی ایک فریق اس کے لئے طیار نہیں تو اس کے معنے یہ نہیں کہ دوسرا بھی طیار نہ ہو۔ اگر شیعہ (باوجود اس کے کہ خود حضرت علی کی زندگی یکسر مسالمت اور رواداری کی زندگی تھی) اسپر آمادہ نہیں تو نہ ہوں۔ سُنّیوں کو وسعت نظر سے کام لیکر ایثار دکھانا چاہئے اور انھیں اعلان کر دینا چاہئے کہ چونکہ شیعوں کے لئے مدح صحابہ باعث دلآزاری ہے اس لئے ہم اس کو ترک کئے دیتے ہیں

یہ سنیوں کی اتنی بڑی اخلاقی فتح ہوگی کہ شیعہ حضرات خود اپنی مغلوبیت کو چند دن میں محسوس کرنے لگیں گے اور ہو سکتا ہے کہ اس کا ردِ عمل یہ ہو کہ وہ بھی مدحِ صحابہ کو گوارا کر لینے کا اعلان اپنی طرف سے کر دیں

شیعہ سُنّی، بہرنوع ایک ہی جسم کے اعضاء ہیں، ایک ہی قوم کے افراد ہیں، ایک ہی خدا و رسول کے ماننے والے ہیں

ان کو ایک دوسرے کے ساتھ ملکر رہنا پڑے گا اگر وہ اپنی سلامتی چاہتے ہیں، اُن کو یہ مذہبی تعصبات ترک کرنا ہوں گے، اگر وہ زندہ رہنا چاہتے ہیں، ورنہ قانونِ قدرت جس کی زد سے نہ کوئی رسول بچا ہے نہ آلِ رسول، نہ خلفاء اس کا مقابلہ کر سکے ہیں نہ صحابہ اب بھی وہی ہے جو پہلے تھا اور اس نے کبھی اس کشتی کو ساحل تک نہیں پہونچایا جس کے بیٹھنے والوں نے خود ساحل تک پہونچنے کی کوشش نہیں کی۔

کانگرس سے ہم کیا چاہتے ہیں

پچھلے مہینے نگار میں، مختصراً میں نے کانگرسی حلقوں کی اس ذہنیت کا ذکر کیا تھا جو ہندو مسلم کشیدگی میں اضافہ کا باعث ہو رہی ہے اور اسی کے ساتھ یہ بھی بتایا تھا کہ کانگرس نے اپنا نصب العین چاہے "پورنا سوراج" مقرر کیا ہو یا "مزاج" لیکن جن ہاتھوں میں اس کی قسمت کا فیصلہ ہے، وہ ہندوستان کے لئے مستعمراتی آزادی سے زیادہ کچھ نہیں چاہتے۔ اس میں شک نہیں کہ مستعمراتی آزادی ایک نوع کی آزادی ضرور ہے لیکن ہے بہرحال وہ غلامی ہی کی ایک قسم جس میں ہمیشہ اکثریت کو فایدہ اور اقلیت کو نقصان پہونچتا ہے تاآنکہ یا تو اقلیت اکثریت کے ساتھ شامل ہو جائے یا اس کے لئے مخصوص تحفظات قایم کر دئے جائیں

میں نے نہ تحفظات کی پالیسی کو کبھی مفید سمجھا اور نہ جداگانہ انتخاب کو، کیونکہ ان کی بنیاد بے اعتمادی ہے اور دو قوموں کے تعلقات جب تک اعتماد پر قایم نہ ہوں، آپس کا اختلاف کبھی مٹ نہیں سکتا۔ اسی لئے میں نے نہ کبھی "مسلم لیگ" کی طرفداری کی اور نہ مسٹر جینا کے مطالبات کی، کیونکہ اس قسم کا سودا نتیجہ کے لحاظ سے ہمیشہ نقصان رساں ثابت ہوتا ہے۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ مسلمان ہندوؤں کے اخلاق اور اپنی قوت پر بھروسہ کرکے شریک ہوتے اور متفقہ عزم کے ساتھ ملک کی آزادی کے لئے کوشش کرتے۔ لیکن ایسا نہیں ہوا، یہاں تک کہ آج کانگرس کا مفہوم ہی "ہندو جماعت" ہو کر رہ گیا ہے

ایسا کیوں ہوا اور اس غلطی کا ذمہ دار کون ہے؟ یہی وہ سوال ہے جس کے جواب کی جستجو ہمیں ارباب کانگرس کی ذہنیت کے مطالعہ کی طرف متوجہ کرتی ہے اور جو ہمیں اس نتیجہ تک پہونچاتی ہے کہ اس باب میں اگر مسلمانوں سے غلطی ہوئی تو ہندوؤں سے بھی ہوئی اور سچ پوچھئے تو ان سے زیادہ ہوئی

مسلمانوں کی غلطی تو یہ تھی کہ انھوں نے خود اپنے اوپر اعتماد نہ کیا اور ہندوؤں کی یہ کہ وہ اپنے آپ کو قابل اعتماد نہ بنا سکے انھوں نے زبان سے تو ہمیشہ یہی کہا کہ وہ مسلمانوں کے تمام مطالبات ماننے کے لئے طیار ہیں، ان کے قومی و مذہبی جذبات رواداری ان کا فرض ہے، لیکن علاوہ اس کو صحیح نہ ثابت کر سکے

وزارتیں قبول کرنے سے قبل جو حالت کارکنان کانگرس کی تھی وہ یقیناً مختلف تھی اور اسی کو سامنے رکھکر بعض مسلم کو اس میں شرکت کی ہمت ہوئی تھی، لیکن جب قیام حکومت کے بعد سے ہندوؤں کی بے نیازیاں مسلمانوں کی طرف سے

نمایاں ہوگئیں تو مسلمان سخت مایوس ہوگئے اور اسی کا نتیجہ تھا کہ مسلم لیگ جو کانگرس حکومتوں کے قیام سے قبل مردہ ہوچکی تھی بعد کو پھر اس میں آثار حیات نظر آنے لگے اور فرقہ دارانہ لڑائیاں بھی بہ نسبت پہلے کے زیادہ ہوئیں

کانگرس حکومتوں میں ہندو پبلک کا یہ خیال کہ اب حکومت ہندوؤں کی ہے، نہایت خطرناک بات ہے اور اس خیال کے ماتحت جو زیادتیاں ہندوؤں کی طرف سے ہو رہی ہیں اس کے ذمہ دار یقیناً ارباب کانگرس ہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ کانگرس کا نصب العین یہاں ہندو راج قائم کرنا ہے، لیکن اس وقت جن ہاتھوں میں کانگرس کا نظام ہے ان کا طرز عمل بہت مشکوک ہے۔ مثلاً آپ زبان ہی کے مسئلہ کو لیجئے، کانگرس کا فیصلہ تو یہ ہے کہ ایک عام سہل زبان اختیار کی جائے جو ہندو مسلمانوں کے درمیان تبادلۂ خیالات کا مشترک ذریعہ قرار پائے، لیکن کانگرسی وزراء کا یہ حال ہے کہ وہ قصداً اس میں سنسکرت کے مشکل الفاظ لانے کی کوشش کرتے ہیں اور عام طور پر جو زبان وہ ہر وقت اپنے گھروں میں بولتے ہیں اسے اپنی پبلک تقریروں اور تحریروں میں استعمال نہیں کرتے۔ پھر کیا پنڈت جواہر لال نہرو کو اس کا علم نہیں ہے۔ کیا گاندھی جی اس سے ناواقف ہیں، کیا کانگرس کی آل انڈیا ورکنگ کمیٹی کے کانوں تک یہ شکایتیں اس وقت تک نہیں پہونچیں۔ یقیناً سب اس حقیقت سے آگاہ ہیں لیکن وہ اس طرز عمل پر نکتہ چینی نہیں کرتے اور اس طرح مسلمانوں کو کانگرس کی طرف سے بدظنی کا موقعہ ملتا ہے۔

اسی طرح فرقہ وارانہ فسادات میں کانگرسی وزراء کی طرف سے جو طرز عمل اختیار کیا جاتا ہے وہ بھی غیر جانب دارانہ نہیں ہوتا اور حقیقت کو چھپانے میں انھیں ترکیبوں سے کام لیا جاتا ہے جو اس سے قبل کی حکومت اختیار کیا کرتی تھی۔

سال گزشتہ جس وقت انتخابات کے مسایل سامنے تھے، کانگرس نے ایک تحریک (Mass Muslim Contact) کے نام سے شروع کی تھی۔ اس تحریک کا مقصود یہ تھا کہ کانگرس براہ راست عام مسلمانوں سے تبادلۂ خیال کرکے ہندو مسلم کشیدگی کو دور کرے اور کانگرس کے اغراض و مقاصد ان کو سمجھائے۔ اس میں شک نہیں کہ تحریک نہایت مفید تھی لیکن اس پر عمل نہیں کیا گیا۔ اگر کانگرس واقعی پورے عزم کے ساتھ وسیع پیمانہ پر اس تحریک کو شروع کر دیتی تو نہ مسلم لیگ کو اُبھرنے کا موقعہ ملتا، اور نہ انتخابات میں کانگرس کو ناکامی ہوتی

میں یہ جانتا ہوں کہ ہندو رہ چاہتے ہوئے بھی مسلمانوں کو اپنا ہم خیال بنانے پر ایک حد تک مجبور ہیں صرف یہ ہے کہ اگر ہندو مسلم کشیدگی نے زیادہ خطرناک صورت اختیار کرلی تو پھر ان کا استمراری آزادی والا خواب پریشاں ثابت ہوگا، لیکن اس مصلحت کے اقتضاء کے لحاظ سے جو طریق کار وہ اختیار کر رہے ہیں، صحیح نہیں۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے سب سے پہلے خط مسٹر جینا کو اس وقت لکھا جب انتخابات میں کانگرس کو خلاف ناکامی ہوئی تھی اور غالباً اس خیال سے لکھا تھا کہ اگر مسٹر جینا مصالحت کے لئے راضی ہوگئے تو گویا صرف مسلم لیگ بلکہ تمام مسلمانان ہند کی ہوگی، لیکن یہ خیال پنڈت جی کا صحیح نہ تھا، جس کا ثبوت اب خود مسلم لیگ سے جن کے خلاف خود مسلمانوں کی بعض جماعتوں کی طرف سے احتجاج کیا جا رہا ہے، پنڈت جی

ہم جانتے ہیں کہ لارڈ ولنگڈن سے گفتگو کی ملاقات کے بعد ہی گاندھی جی کا مسٹر جناح کو گفتگوئے مصالحت کا پیغام دینا کیا معنی رکھتا ہے اور ہو سکتا ہے کہ گاندھی جی کی طرح مسٹر جناح کے دل میں بھی یہی ہو کہ وفاق کو قبول کر لینا چاہئے۔ لیکن مسٹر جناح یقیناً مسلمانانِ ہند کے صحیح نمایندے نہیں ہیں اور ان کا کوئی قول مسلمانوں کے خلاف حجت نہیں ہو سکتا

مسٹر جناح کا اس شرط پر زور دینا کہ انھیں کو تمام مسلمانوں کا واحد نمایندہ سمجھا جائے، ممکن ہے اس میں ان کا جذبہ تفوق و حکمرانی بھی شامل ہو اور ہو سکتا ہے کہ درپردہ "وفاق" کی راہ کو آسان بنا دینا بھی ان کے پیشِ نظر ہو۔ بہرحال اس تمام گفتگو سے مقصود یہ بتانا ہے کہ اگر کانگرس واقعی مسلمانوں کو شریکِ کار بنانا چاہتی ہے اور ملک میں امن و سکون پیدا کرنا اس کا مقصود ہے تو اس کی صورت یہ نہیں ہے کہ وہ مسٹر جناح یا کسی اور ایسے ہی رئی سیاست سے گفتگو کرکے مطمئن ہو جائے، بلکہ اس کی صورت یہ ہے کہ وہ عام مسلمانوں کے جذبات کو پہچانے اور سچے دل سے رواداری پر آمادہ ہو جائے۔ اس کے جواب میں ارباب کانگرس کہیں گے کہ وہ بارہا اس کا اعلان کر چکے ہیں اور وہ ہر ایثار کے لئے طیار ہیں، لیکن انکا یہ جواب اطمینان بخش نہیں ہو سکتا، کیونکہ عمل سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی۔ ارباب کانگرس لاکھ زبان سے کہیں کہ وہ مسلمانوں کو اپنا ہی ایک جزو سمجھتے ہیں، لیکن عملی زندگی میں وہ ہم سے بالکل جدا ہیں اور ان کی ہر ہر بات سے جذبۂ نفرت ظاہر ہوتا ہے۔ وہ لوگ جو دفاتر میں ملازم ہیں یا جن کو عمالِ حکومت سے واسطہ پڑتا رہتا ہے، ان سے پوچھئے کہ اسوقت مسلمان ہونا کتنا بڑا جرم ہے اور اس جرم کی کتنی سخت سزا اسے برداشت کرنا پڑتی ہے۔ پھر اگر ارباب کانگرس واقعی مسلمانوں سے اتحادِ عمل چاہتے ہیں، تو اس کی تنہا تدبیر یہ ہے کہ پہلے وہ اپنی جماعت کی اس ذہنیت کو دور کریں جو مسلمانوں سے نفرت کرنا سکھاتی ہے۔ اعتماد کوئی مادی چیز نہیں ہے جو ہم کسی سے لے سکیں یا کسی کو دے سکیں، اس کا تعلق دماغی کیفیت اور قلبی احساس سے ہے اور قلب و دماغ کا اطمینان صرف خلوص و صداقت سے پیدا ہوتا ہے

یہ تو ہوا ہمارا وہ مطالبہ جو ہم کانگرس سے کرتے ہیں، لیکن اسی کے ساتھ ہمیں مسلمانوں سے بھی کچھ کہنا ہے اور وہ یہ کہ [illegible] وہ کبھی کامیابی حاصل نہیں کر سکتے۔ اگر ہم [illegible] [illegible] واقعی [illegible] مخلص رہنما کا وجود پایا جا سکتا ہے [illegible] کہ وہ پہلے آپ کو [illegible] ایک ہوں، لیکن ان کا باہمی اختلاف [illegible] زیادہ تر مذہبی رجحانات کا نتیجہ ہے کبھی دور نہیں [illegible] کی تدبیر ہو سکتی ہے تو صرف یہ کہ کسی ایسے ادارہ میں شریک [illegible] جو مذہبیات [illegible] صرف سیاسیات سے تعلق رکھتا ہے [illegible]

[illegible] مسلمان بیشک کسی ایک مرکز پر جمع ہو سکتے ہیں، لیکن اس سے علحدہ رہنے کی حالت میں مذہبی اختلافات انکی تحریکوں کو کبھی کامیاب نہ ہونے دیں گے

[illegible] مسلمانوں کی امیدیں سب سے زیادہ مسلم لیگ سے وابستہ ہیں لیکن بدقسمتی سے اس کشتی کا ناخدا ایسا

برخود غلط اور ضدی واقع ہوا ہے کہ ساحل تک پہونچنے کی کوئی توقع نہیں۔ مسٹر جناح جیساکہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں کانگرس میں اس لئے شریک نہیں ہوتے کہ وہاں ان کا شمار دوسرے درجہ کے لیڈروں میں بھی نہیں ہو سکتا اور مسلم لیگ کو اس لئے کامیاب نہیں بنا سکتے کہ ان میں ایثار و قربانی کا جذبہ موجود نہیں ہے۔ ان کو شرکت کانگرس کی دعوت دیجاتی ہے تو وہ ایسی شرائط پیش کرتے ہیں کہ ہندو تو ہندو خود مسلمانوں کے لئے بھی قابل قبول نہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خود اعتمادی کی کیفیت ان سے بالکل مفقود ہو گئی ہے

حال ہی میں مسلمانوں کا جو جلسہ عام ہوا تھا اور جس میں کانگرس سے مصالحت کا مسئلہ درپیش تھا، اس کی کارروائی دیکھنے سے ہماری مایوسیاں بہت بڑھجاتی ہیں۔ مسٹر جناح نے اپنی تقریر میں کہا کہ مسلمان کمزور ہیں اور ہندو قوی اس لئے دونوں میں مصالحت ممکن نہیں۔ سر سکندر حیات خاں، شرکتِ کانگرس کو ہندوؤں کی غلامی سے تعبیر کرتے ہیں۔ بہ الفاظ دیگر اس کے معنے یہ ہیں کہ مسلمانوں کو بدستور انگریزوں کا دست نگر رہنا چاہئے اور قومی اسپرٹ کو خیرباد کہدینا چاہئے۔ ان کے اندر ایسا خوف سما گیا ہے کہ بظاہر اس کے دور ہونے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی اور اب چارۂ کار سوائے اس کے کوئی نہیں کہ یا تو مسلمان کوئی اور لیڈر منتخب کریں اور اگر اس میں ناکامی ہو (جو یقینی ہے) تو پھر اپنی قوت اور خدا پر بھروسہ کر کے کانگرس میں شریک ہو جائیں۔ اگر غلامی مسلمانوں کے لئے واقعی مقسوم ہو چکی ہے اور کانگرس میں شریک ہوتا ہندوؤں کا غلام بننا ہے تو میں کہوں گا کہ یہ غلامی اس غلامی سے بہتر ہے جو وہ اختیار کرنا چاہتے ہیں

آیندہ جنوری سنہ ۳۹ء کا "نگار"

"مصحفی" نمبر ہوگا

اساتذۂ قدیم میں "مصحفی" جس مرتبہ کا شاعر ہوا ہے، اس کا اندازہ یوں نہ کرنا چاہئے کہ میر کے ساتھ ساتھ اس کا نام بھی لیا جاتا ہے بلکہ اس طرح کہ شاعری کی جن جن اصناف میں اس نے اپنا کلام پیش کیا اُن کو چھونے کی ہمت میر کو بھی نہیں ہوئی تمام اُردو شعراء میں یہ خصوصیت صرف مصحفی کو حاصل تھی کہ اس نے ہر رنگ کو اختیار کیا اور جس رنگ کو اختیار کیا اسے اپنا بنا لیا خصوصیت کے ساتھ مشکل زمینوں کو مانوس بنا دینا، کہ اس باب میں تو اس کا ہمسر کوئی پیدا ہی نہ ہوا

مصحفی نمبر بہت ضخیم ہوگا اور مومن نمبر کی طرح انتہائی احتیاط کے ساتھ مرتب کیا جائے گا۔ اس سلسلہ میں جن جن عنوانات پر مقالے درکار ہیں ان کی مختصر سی فہرست یہ ہے:- (۱) مصحفی کی شاعرانہ خصوصیات۔ (۲) مصحفی تذکرہ نگاری کی حیثیت سے۔ (۳) مصحفی اور اس کے ہمعصر اساتذہ۔ (۴) مصحفی اور اس کے تلامذہ۔ (۵) مصحفی کی شاعری پر ماحول کا اثر۔ (۶) مصحفی بہ حیثیت ایک انسان کے (۷) مصحفی ایک نقاد کی حیثیت سے۔ (۸) مصحفی اور مختلف اصناف سخن وغیرہ وغیرہ۔ ان کے علاوہ آپ اور جو عنوان مناسب سمجھیں اس پر لکھ سکتے ہیں مضمون معہ تصویر زیادہ سے زیادہ اکتوبر سنہ ۳۸ء کے آخر تک پہونچ جانا چاہئے۔ **مینیجر نگار**

مسئلۂ خلافت و امامت

(انسانیت اور اسلام کے نقطۂ نظر سے)

جولائی سنہ ۳۰ء کے نگار میں بعنوان مندرجۂ صدر جو مضمون شائع ہوا ہے وہ گویا خلافت و امامت کے مسئلہ پر ایک فیصلہ کُن بحث کی دعوتِ عام ہے اور نگار کے اڈیٹر صاحب چاہتے ہیں کہ اصل موضوع پر دونوں فرقوں کی جانب سے ایسے دلائل پیش کئے جائیں کہ دنیا کسی حد تک اس قدیم اور دشوار تر گتھی کو سلجھانے کے قابل ہو سکے!۔ فاضل مقالہ نگار نے اس مسئلہ کے تصفیہ میں پہلے انسانیت اور پھر اسلام کے نقطۂ نظر سے گفتگو کرنے کا دعویٰ کیا ہے اس لئے آیئے دیکھیں کہ انسانیت و اسلام کے جو اصول انھوں نے مقرر کئے ہیں وہ کس حد تک لائق تسلیم ہیں اور انسانیت انھیں گوارا بھی کرتی ہے یا نہیں وہ انسانیت کا مدار عقل عمومی پر رکھتے ہیں ملاحظہ ہو:۔

"عقل عمومی سے میری مراد وہ معمولی فہم و فراست ہے کہ جسے روزمرہ کے کاروبار میں ہم کام میں لاتے ہیں اور جس کے ذریعہ سے ہم بہت سی ابتدائی صداقتوں کو پہچانتے ہیں۔ ایسی صداقتیں جن پر بنی نوع انسان عمومیت کے ساتھ متفق ہوتے ہیں اور جن سے عامۃ الناس کو اعتقاد نہیں بلکہ سمجھ بوجھ کر اختلاف رائے کی گنجایش نہیں ہوتی مثلاً سچ بولنا اچھا ہے۔ یہ ہماری عقل عمومی کا فیصلہ ہے۔ اس طرح "انسان کا قتل کرنا" وحشیانہ فعل ہے یا "جھوٹ بولنا" بری بات ہے۔ اس نوع کے تمام اصول و کلیات ایسے ہیں کہ جنھیں ہماری عقل عمومی تسلیم شدہ قرار دیتی ہے"

افسوس ہے کہ فاضل مقالہ نگار کی اس تشریح سے بھی ابہام رفع نہیں ہوتا کیونکہ اس سلسلہ میں اس امر کی تشخیص کہ فلاں بات سچ ہے اور فلاں جھوٹ کس کے ذمہ قرار پائے گی۔ یہ ایک الجھن ہے

اب میں ایک اور نگاہ سے اس قول کو جانچتا ہوں ـــ اس بحث میں عقل عمومی کو حجت قرار دیا گیا ہے یعنی عقل عمومی جس شے کا انکار کرے وہ رد کر دینے کے قابل ہے اور جس شے کو قبول کرے وہ قابل اخذ ہے۔ اگر یہ نظریہ صحیح مانا جائے اور عوام کا اقرار یا انکار حجت ہو جائے تو کوئی اصل اپنے مقام پر ثابت نہیں رہتی۔ یہی عقل عوام تھی جو ایک زمانے میں

شہنشاہیت مطلقہ کے سامنے جھکی ہوئی تھی اور اب یہی عقل عمومی ہے جس کے لئے بقول آں محترم اشتراکیت جاذب نظر بنی ہوئی ہے

اصل یہ ہے کہ عوام ہر زمانہ میں کالانعام ہوا کرتے ہیں اور آج بھی ہیں۔ عوام ہمیشہ ایک مخصوص جماعت کے ہاتھ میں ہوا کرتے ہیں۔ اس لئے عوام کا رجحان کبھی سند کے قابل نہیں ہو سکتا اور صاحب نظر عوام کی قبولیت یا عدم قبولیت کو کبھی اہمیت نہیں دیتے بلکہ نفس مسئلہ پر نظر رکھتے ہیں

میرے قول بالا کی دلیل خود اس مضمون میں موجود ہے۔ ارشاد ہوتا ہے کہ "کسی مذہب کا معیار صداقت یہ ہونا چاہئے کہ اس سے کسی انسانی جماعت کا حق غصب نہ ہوتا ہو" یہ جزاول ہے۔ اس کے بعد کہا جاتا ہے کہ "الوہی امامت سے انسانی جماعت کا حق غصب ہوتا ہے"۔ یہ جزو ثانی ہے ان دونوں کو ملانے سے جو نتیجہ نکلے گا وہ سامنے ہے۔ بالکل ممکن ہے کہ عقل عمومی ہمزبان ہو جائے لیکن یہ ہمزبانی صاحب فکر کو مسحور نہ کر سکے گی۔ وہ تو یہ دیکھے گا کہ اس قضیہ کے اجزا جو قایم کئے گئے ہیں وہ کہاں تک صحت رکھتے ہیں۔ اب میں ان مطالب کی طرف بڑھتا ہوں جو اس تحریر کی روح ہیں۔

"رسول اکرم نے ہرگز یہ فیصلہ نہیں کیا کہ ان کی وفات کے بعد حضرت علی خلیفہ ہوں اور یہ سلسلہ شاہان خود مختار کی طرح نسلاً بعد نسلٍ قایم رہے

(۲) حضرت علی کی "الوہی امامت" کے سلسلہ میں جتنی روایات و احادیث پیش کی جاتی ہیں وہ سب یا تو موضوع، جعلی اور خود ساختہ ہیں یا ان کا مفہوم وہ نہیں ہے جو الوہی امامت کی تصدیق کرتا ہو"

یہ دعوے ہے اور اس دعوے کو نباہنے کے لئے کچھ تنقیحات قایم کرتے ہوئے نتیجہ یہ نکالا گیا ہے کہ الوہی امامت کا مطلب یہ ہو کہ

"خداوند کریم نے یہ طے کر دیا تھا کہ رسول کریم کے بعد ان کے داماد حضرت علی خلیفہ ہوں اور ان کے بعد یہ منصب جلیل ان کی اولاد میں سے کسی کو عطا کر دیا جائے اور اس طرح یہ سلسلہ تا قیامت جاری رہے"

اس نتیجہ پر زور دیتے ہوئے کچھ اور بھی فرمایا گیا ہے جو قابل غور ہے، طوالت کے خیال سے اپنے ہی لفظوں میں ان کا خلاصہ درج کئے دیتا ہوں:۔

(۱) خلافت و امامت صرف علی کی نسل کے لئے مخصوص ہے

(۲) ہر خلیفہ کی جگہ اس کا بیٹا ہی مسند نشین ہوگا۔ مثل شاہان خود مختار

(۳) تمام دنیا کے مسلمان حضرت علی کی دائمی اور ابدی خلافت میں رہنے پر مجبور ہیں وہی اولوالامر و آقا و مولا ہوں اور ہر مسلمان ان کے سامنے سر تسلیم خم کرنے پر مجبور۔ تمام دنیا کے مسلمان خواہ کتنے ہی متقی و متورع ہوں، اس سے محروم رہتے ہیں

(۴) بانی اسلام کی گویا خواہش تھی کہ ان کی نسل تا قیامت مسلمانوں پر حکومت کرے اور یہ حکومت

مطلق العنان ہو۔ اس طرح خانوادۂ علی کے لئے گویا نسلی امتیاز قائم ہو جاتا ہے اور آل علی کا ہر فرد گویا ماں کے پیٹ سے یہ حق لیکر پیدا ہوتا ہے کہ تمام دنیا کے مسلمان اس کے سامنے سر عقیدت جھکائیں"

اور یہ وہ باتیں ہیں جنھیں عقل عمومی قبول نہیں کرتی۔

قبل ازیں کہ دعوے اور استدلال پر توجہ کی جائے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ انصاف پسند حضرات اس پر بھی غور فرمائیں کہ آج ہم جس نسلی امتیاز سے متنفر ہیں، آج جو شہنشاہیت ہماری نظروں میں کھٹکتی ہے کیا عقل عمومی اس سے اسی طرح متنفر اور بیزار رہی ہے اور کیا سقیفۂ بنی ساعدہ میں بمقابلہ انصار جو یہ استدلال پیش کیا گیا تھا کہ " الائمۃ من قریش " کیا اسکے معنی اس کے سوا کچھ اور تھے۔ کیا اس استدلال سے نسلی امتیاز کی بو نہیں آتی اور اگر یہ صحیح ہے تو پہلے عقل عمومی آنکھ بند کرکے تسلیم کرنے پر کیوں مایل ہے اور اس کے بعد بھی صدیوں تک جو صورت اسلامی حکومت کی پائی گئی کیا وہ شہنشاہیت نہ تھی!

اب رہا نسلی امتیاز، کیا میں سوال کرسکتا ہوں کہ مختلف اقوام میں اور مختلف زمانوں میں اس امتیاز کا احساس رہا ہے یا نہیں؟ اور آج بھی ہے یا نہیں؟ یہ عالمگیر احساس مجھے تو کبھی گم ہوتا نظر نہ آیا بلکہ بنی نوع انسان کی ایک وسیع جماعت ہمیشہ اس کی حمایت کرتی نظر آئی

یہ خیال کہ اسلام اس نسلی امتیاز کو مٹانے کے لئے آیا تھا کم از کم کلام مجید سے تو ثابت ہوتا نہیں بلکہ برخلاف اس کے اس امتیاز کی تائید ثابت ہوتی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:۔

" ان اللہ اصطفےٰ آدم و نوحا و آل ابراہیم و آل عمران علی العٰلمین "

کیا اس سے آل ابراہیم اور آل عمران کا نسلی امتیاز ثابت نہیں ہوتا۔ اس سے بھی تیز تر سنئے:۔

" ام یحسدون الناس علیٰ ما آتاہم اللہ من فضلہ فقد آتینا آل ابراہیم الکتاب والحکمۃ وآتیناہم ملکاً عظیما فمنہم من آمن بہ ومنہم من صد عنہ وکفیٰ بجہنم سعیرا "

(کیا یہ لوگ ان لوگوں سے حسد رکھتے ہیں اس شے پر جو خدا نے اپنے فضل سے انھیں عطا کر دی۔ بے شک ہم نے آل ابراہیم کو کتاب بھی دیدی اور حکمت بھی اور انھیں ملک عظیم عطا کر دیا اب کوئی تو اس پر ایمان لاتا ہے اور کوئی رکتا ہے اور جہنم کے شعلے اس کے لئے بہت کافی ہیں)

آل ابراہیم پر برکتوں کی بارش اور اس شد و مد سے کہ جو اس پر ایمان نہ لائے اس کے لئے جہنم کے شعلے ہیں کس امر پر دال ہے اور کیا یہ اس امر کا بین ثبوت نہیں ہے کہ خود مشیت الٰہی قوم، اور نسلی امتیاز کی حامی ہے

بلاشک وشبہ رسول اللہ کا مقصود جو اسلام لیکر دنیا کے سامنے آئے دنیا و عقبیٰ میں صرف سعادت بشری کا حصول تھا اور چونکہ اسلامی نقطۂ نظر سے دنیا، آخرت کا مقدمہ ہے اور دین وحی الٰہی ہے اس لئے اس میں کسی انسانی

مصلحت اندیشی کو دخل نہیں ہو سکتا اور اس کی تبلیغ میں ایک پیغمبر کا یہ مقصد ہرگز نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ اپنے لئے یا اپنی نسل کے واسطے یا اپنی قوم اور اپنے ملک کی خاطر کسی سلطنت کی بنیاد قایم کر جائے اگرچہ دنیا یہ شبہ کرتی ہے اور بعض نے تو حتماً و جزماً اسکا اعلان بھی کر دیا ہے چنانچہ یزید کہتا ہے :-

لعبت ہاشم بالملک ولا
خبر جاء ولا وحی نزل

(ایک ہاشمی نے سلطنت کے لئے یہ کھیل کھیلا حالانکہ نہ کوئی خبر آئی نہ کوئی وحی نازل ہوئی) - شیعی حلقوں میں جس سلطنت اور جس حکومت کو آل نبی کا حق سمجھا جاتا ہے، وہ دنیاوی حکومت نہیں ہے، بلکہ وہ ایسی سعادت کبریٰ ہے جسکا راز آنحضرت کے سینے میں رکھا گیا اور جس کو بروئے کار لانا بھی آپ کے فرائض میں داخل تھا۔ مقصد الٰہی یہ تھا کہ اس قانون کے ماتحت حیات انسانی کی تنظیم اس طرح کی جائے کہ سعادت کا کوئی انفرادی و اجتماعی پہلو چھوٹنے نہ پائے۔ لیکن یہ حقیقت بالکل واضح ہے کہ کوئی قانون زیر عمل نہیں آسکتا جب تک کہ حکومت کی باقاعدہ تشکیل نہ ہو۔ چنانچہ حضرت پیغمبر اپنے وقت میں خود حاکم تھے لیکن یہ حکومت نہ شہنشاہیت تھی نہ اسے "ڈکٹیٹر شپ" سے تعلق تھا اور نہ "جمہوریت" کی ممنون احسان تھی بلکہ فی الحقیقت یہ حکومت، نبوت الٰہیہ کی ایک شعاع تھی۔ یوں سمجھنا چاہئے کہ نبوت کے دو پہلو تھے۔ ایک یہ کہ بارگاہ الٰہی کے احکام اس کی مخلوق تک پہونچا دیں اور دوسرا یہ کہ ان کے اجرا کا انتظام بھی فرمائیں۔ اس اعتبار سے جس طرح نبوت من جانب اللہ ہے اسی طرح یہ حکومت بھی ہے اور رسول اللہ کے بعد لامحالہ ہم کو اس کے لئے محل قابل کی تلاش کرنی پڑے گی

یہاں علی و عمر کی بحث نہیں ہے۔ اگر علی محل قابل ہیں تو چشم ما روشن اور اگر عمر اس کی قابلیت رکھتے ہیں تو دل ما شاد مگر اس کا ذریعہ و شناخت بھی صرف زبان وحی ہونا چاہئے جو عقل عمومی سے بہت زیادہ بلند ہے

جائیکہ سلطان خیمہ زد غوغا نباشد عام را

ظاہر ہے کہ اس حکومت میں اکتساب کو دخل نہیں تھا بلکہ یہ عطیۂ الٰہی تھی اور یہ جہاں بھی قایم ہو، اس کی شان برقرار رہنی چاہئے۔ جہاں پائی جائے من اللہ پائی جانی چاہئے اور "من اللہیت" کے معلوم کرنے کا ذریعہ صرف رسول ہے۔ اب اسے حکومت الٰہیہ سمجھئے، خلافت الٰہیہ کہئے، امامت الٰہیہ فرمائیے، جو کچھ چاہے کہئے لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس چیز کو خود رسول بھی اپنے اختیار سے کسی کو عطا نہیں فرما سکتے تھے !

"ربک یخلق ما یشاء و یختار ما کان لہم الخیرۃ"

یہ ہے وہ امامت الٰہیہ جو طبقۂ شیعہ کا مطمح نظر ہے۔ اس امامت کے لئے یہ ہرگز ضروری نہیں ہے کہ عوام بھی اسکے ساتھ رہیں اور اُس کا یہ بھی فرض نہیں ہے کہ وہ لوگوں کو اپنی طرف جذب کرنے کے لئے پروپیگنڈا کرے۔ اسقدر بیان سے غالباً امامت الٰہیہ کے متعلق شیعہ نظریہ واضح ہو گیا ہوگا

حضرات اہل سنت جن کو خلفاء کہتے ہیں ہم بھی انھیں خلفا کہتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ایک جماعت کے اتفاق سے وہ خلیفہ بنے، ہم بھی اسی کے قائل ہیں وہ کہتے ہیں اچھے سہی لیکن یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ ان کی حکومت، حکومت الٰہیہ ہے کیونکہ اجماع و شوریٰ خود اس کے منافی ہیں لیکن مصیبت یہ ہے کہ حضرات اہل سنت جس کو خود حاکم بنائیں اس کی نسبت یہ اعتقاد رکھنا بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ اب اس کا ہر قول، ہر فعل، ہر حرکت حکم خدا ہے اور یہیں سے سارا جھگڑا پیدا ہوتا ہے۔ شیعہ یہ کہتے ہیں کہ یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ ہم اس کو ضرور حاکم اسلامی سمجھیں گے۔ اس کی حکومت، حکومت اسلامی کہلائے گی مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ اُسے حکومت الٰہیہ بھی تسلیم کر لیا جائے

الغرض شیعہ کے نزدیک خلفاء کی خلافت ایک دنیوی قسم کی حکومت تھی اور یہی سبب ہے کہ علی مرتضیٰ کو بھی اس خلافت کے لحاظ سے جو علی الظاہر انھیں حصول کے بعد حاصل ہوئی کوئی خاص فضیلت حاصل نہیں ہوئی، وہ اس خلافت کے باعث عالم تشیع سے روشناس نہیں ہوئے۔ اگر یہ چند روزہ حکومت نہ ہوتی تو بھی علی بہرحال علی ہی رہتے

فاضل مضمون نگار نے صفحہ ۹ پر جو تنقیحات قائم فرمائی ہیں اگرچہ وہ بہت کچھ بحث طلب بلکہ اصلاح طلب ہیں لیکن ان سے اور بعد کی تشریحات سے صاف پتہ چلتا ہے کہ ان کے نزدیک اولاد علی میں خلافت کا محصور ہونا دوسری جماعتوں کی حق تلفی ہے۔ لیکن حق تلفی کا سوال اسوقت پیدا ہوتا ہے جب دو برابر کے حقداروں میں سے کسی ایک کا حق غصب کیا جائے یا کسی زیادہ مستحق شخص کے مقابلہ میں کم استحقاق رکھنے والے کو ترجیح دیجائے۔ لیکن چونکہ "امامت الٰہیہ" کا تعلق اکتسابات دنیاوی سے نہیں ہے جن میں فرق و امتیاز کا پایا جانا ضروری ہے۔ بلکہ محض منشار خداوندی سے ہے اس لئے اگر اس کے صحیح مفہوم کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ اعلان کیا گیا کہ:-

"خداوند عالم طے کر چکا ہے کہ رسول کریم کے بعد خلافت الٰہیہ علی ہی کے لئے ہے اور علی کے بعد اس کے گیارہ فرزندوں کے لئے"

تو اس میں کیا قباحت لازم آتی ہے۔ ہاں یہ خیال وماغ سے نکال دینا چاہئے کہ یہ عطیہ ان لوگوں کو اولاد رسول ہونے کی حیثیت سے ملا ہے یا رسول یہ چاہتے تھے کہ میری نسل مسلمانوں کی گردنوں پر مسلط رہے، کیونکہ اگر اولاد رسول ہونے کی حیثیت مدنظر ہوتی تو خود علی کو یہ شے کیسے ملتی، اور اگر اولاد علی کا لحاظ کیا جائے تو علی مرتضیٰ کی اولاد دوسری بی بیوں سے بھی ہے یہ منصب وہاں کیوں نہ پہونچا اور اگر بنو فاطمہ کا لحاظ کیا جائے تو اولاد امام حسن اس سے کیوں محروم رہی۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ اس امر میں کسی نسلی امتیاز کا لحاظ نہیں کیا گیا

نوع انسان میں آدم سے لیکر آج تک بیشمار انسان گزرے ہیں لیکن ان لاتعداد انسانوں میں سے صرف چند منصب نبوت پر سرفراز ہوئے، اس کے کیا معنی؟ یہاں بھی یہ حق تلفی نظر آتی ہے۔ عقل کا جواب اس مقام پر یہ ہے کہ غصب حقوق کا اطلاق وہاں ہوا کرتا ہے جہاں کوئی حق پایا جائے اور جب حق کا وجود ہی نہ ہو تو غصب حقوق یعنی چہ!

میں اس تحریر میں بیان کر چکا ہوں کہ اس منصب جلیل کو مقرر کرنے کا اختیار خود رسول کو بھی نہیں تھا، ہاں اعلان

ان کے فرائض تبلیغ میں ضرور تھا اور یہ اعلان بطریق شیعہ بذریعہ اہل بیت علی التواتر ثابت ہے

فاضل مقالہ نگار نے طعناً لکھا ہے کہ شیعہ تمام دنیا کی آبادی میں دس فیصدی بھی نہیں ہیں۔ اگر یہ تحقیق صحیح مان لی جائے تو بھی دس فیصدی بہت ہیں کیونکہ جس فرقے پر صدیوں تک تلوار چلی ہو اور چل رہی ہو اس کا صفحۂ عالم پر باقی رہ جانا ہی حیرتناک امر ہے۔ بہرحال وہ جتنے بھی ہیں شرفا ہیں اس لئے کہ عوام الناس مصائب میں ثابت قدم نہیں رہ سکتے اب سوال یہ ہے کہ انھوں نے ان تمام دینوی زحمتوں کو قبول کیوں کیا؟ کیا ان کے لئے حکومتوں میں منضم ہو جانا ممکن نہ تھا یقیناً تھا لیکن ان کی نظر مادی فوائد پر نہیں تھی بلکہ وہ دین صحیح اور اسلام صحیح کے طلبگار تھے اور ان کے نزدیک اسلام صحیح کی حامل دوسری ہستیاں تھیں۔ لہذا انھوں نے حکام وقت کے مظالم سہے مگر ان کا دامن نہ چھوڑا

خوجہ اور بوہرہ حضرات کے مرشدوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے تمام اولاد علی کو جو صاحب مضمون نے خلافت الہیہ کا مرکز بنایا ہے۔ یہ محض ایجاد بندہ ہے۔ اسی طرح آغا خاں اور ملا طاہر سیف الدین کی تسلیم جو کچھ ہو۔ عقیدہ خلافت الہیہ اس کا ذمہ دار نہیں

یہاں یہ بتانا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ فرقہ اسماعیلیہ کے ظہور کا سبب کیا ہے؟ ناظرین غور فرمائیں کہ روس میں بالشوزم کی بنیاد کیوں پڑی؟ ظاہر ہے کہ شاہان روس کے مظالم بالشوزم کے ظہور میں آنے کا سبب ہیں۔ اگر عوام امن و سکون کی زندگی بسر کریں۔ مظلوم کو ظالم کی طرف سے کھٹکا نہ ہو۔ عدالت صحیحہ کا دور دورہ ہو تو بغاوت کے جراثیم پیدا ہی نہیں ہوتے لیکن اگر ایسا نہ ہو تو ابن آدم کا یہ فطری حق ہے کہ امن و آزادی کی تدبیریں سوچے۔ اب اُسوقت کی اسلامی حکومتوں پر نظر کیجئے۔ ظاہر ہے کہ وہ منصوص من اللہ تو تھیں نہیں اور ظلم و استبداد دنیا میں پھیل رہا تھا اس لئے ایک جماعت نے ان سے گلو خلاصی کی کوشش کی

وہ ہستیاں جو منصوص من اللہ تھیں انھوں نے تو ہمیشہ صبر و سکوت کا حکم دیا نہ خود ان امور میں حصہ لیا اور نہ کسی کو اجازت دی لیکن یہ صبر و حلم ہر شخص کا حصہ نہیں ہوتا جس کا پیمانۂ صبر لبریز ہو جاتا تھا وہ حکومت کے خلاف اُٹھتا تھا اور اپنی جان دیدیتا تھا۔ علوئین، سلاطین وقت کے خلاف اُٹھے اس کا راز یہی ہے اور اس معاملہ میں وہ قطعاً معذور تھے۔ چنانچہ زید بن علی اسی جذبہ کے تحت حکومت کے خلاف میدان میں آگئے اور حضرت ابو حنیفہ گویا ان کے خاص معاونین میں سے تھے (اگرچہ انھوں نے عین وقت پر عذر کر دیا) آئمہ اہل بیت جو ان حضرات کو روکتے تھے اس کا سبب یہ تھا کہ انکی حقیقت بین نگاہیں انجام کو جانتی تھیں

سب جانتے ہیں کہ جب دنیا سے حق و ناحق کا امتیاز اُٹھ جاتا ہے تو ہر نوع کا انتشار و اضطراب پیدا ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ یہی ان موقعوں پر بھی ہوا وہ لوگ جو ان سلطنتوں سے تنگ آئے ہوئے تھے ان کی نظر میں علوئین اور فاطمیین کی کی ناکامیاں بھی تھیں اور وہ ایک نئے اور کامیاب ذریعہ کی جستجو کر رہے تھے پھر چونکہ ہر ناکامی انسان کے لئے سبق ہے

کامیابی کا لہٰذا انھوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ بنو علی و بنو فاطمہ جو ناکام رہتے ہیں اس کا سبب یہ ہے کہ ان حضرات میں سب اوصاف سہی لیکن قیادت مذہبی انھیں حاصل نہیں اور جن بزرگواروں کو صحیح مذہبی عظمت حاصل ہے وہ اس میں شرکت نہیں کرتے اور ان کی عدم شرکت کے راز سے سب آگاہ ہیں اس لئے ملک کو کوئی دلچسپی ان سے نہیں رہتی اور حکومت بآسانی مقابل آنے والوں کو زیر کر لیتی ہے

فکر کرنے والوں کے سامنے جب کوئی ایسا "سبب" آجاتا ہے جو ان کے ارادوں میں حائل ہو تو وہ اس کے دور کرنے کی فکر کیا ہی کرتے ہیں۔ چنانچہ یہ عزم کر لیا گیا کہ ایک مذہبی مسند الگ قائم کی جائے تاکہ قائد کا وقار مذہبی حیثیت سے بھی مسلم ہو۔ چنانچہ اسی خیال کے تحت اس تجویز کو عمل میں لایا گیا اور آخر ایسی کامیابی ہوئی کہ بڑی بڑی قہار خلافتوں کے بنائے کچھ نہ بن سکی فرقہ باطنیہ کی بنیاد قائم ہوئی جس کے ہاتھوں بڑے بڑے حکام قتل ہوئے۔ اب انھیں کو سراجا تا ہے۔ لیکن بالشویکوں نے روس کے شاہی خاندان کا چن چن کے خاتمہ کیا تو اس پر سب نے کبھی نہ کی بلکہ اشتراکیت کو سراہا جا رہا ہے۔ حالانکہ جس روح کے تحت زار روس تباہ ہوا اسی کی بنا پر بڑے بڑے لاقتل ہوئے جو فی الحقیقت عوام کو قابو میں رکھنے کے لئے ظالمانہ حکومتوں کے ایجنٹ تھے

اہل نظر انصاف فرمائیں کہ ایسے فرقوں کی پیدائش کا سبب ظالمانہ حکومتیں ہیں یا عقیدہ خلافت الٰہیہ

مزید توضیح ملاحظہ ہو۔ اہل سنت کے پاس انعقاد خلافت کے چار طریقے ہیں :۔

(۱) اجماع یعنی ایک ہم خیال گروہ کا مل جل کر کسی کو حاکم بنا لینا۔ ہم خیال اس لئے کہتا ہوں کہ آزادو واقعی اجماع محقق نہیں

(۲) استخلاف یعنی جانے والا کسی کے لئے کہہ جائے کہ یہ میرا جانشین ہے

(۳) شوریٰ یعنی ایک محدود جماعت کے مشورہ سے کسی کو نامزد کر دینا

(۴) قہر و غلبہ یعنی جس کے ہاتھ میں بھی تلوار آجائے اور سلطنت حاصل کر لے

واقعتاً جامعیت اسی کا نام ہے یعنی جتنے طریقے بھی حکومت کے ہو سکتے ہیں وہ سب گھیر لئے گئے ہیں۔ کسی قسم کی بھی حکومت ہو وہ ان صورتوں سے خالی نہ ہوگی بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ جن جن صورتوں سے حکومتوں کا ظہور ہوا ان سب کو حق مانتے ہوئے یہ اصول تصنیف کئے گئے ہیں۔ گویا حکومتیں کسی اصول کے تحت نہیں بلکہ اصول حکومت کے تحت ہیں۔۔

یہاں تک غنیمت ہے لیکن افسوس کا مقام یہ ہے کہ ان کی اطاعت خدا و رسول کی اطاعت سمجھی جاتی ہے اور ان کی بیعت سے تقاعد کرنے والا مستوجب جہنم۔ چنانچہ ایسے ہی موقعوں کے لئے یہ حدیث پیش کی گئی ہے :۔

"من مات ولم یعرف امام زمانہ مات میتۃً جاہلیۃ"

صاحبان غور و فکر سے التماس ہے کہ طرق چہارگانہ جو بیان کئے گئے وہ اصل میں تین ہی ہیں اس لئے کہ اجماع و قوعی و شوریٰ کی روح ایک ہی ہے اور یہ تینوں طریقے بلاشبہ متضاد ہیں اب سوال یہ ہے کہ ان میں اسلامی طریقہ کونسا ہے؟

اگر یہ سب کسی اسلامی نکتہ کے تحت میں تو معاف کیجئے ایک اہم اور اصولی مسئلے میں ایسے متضاد احکام! عقلاً ایسے اسلام کو دور ہی سے سلام کرنا چاہئے

میں مناسب سمجھتا ہوں کہ اس بحث کے آخر میں اپنی تحریر کا خلاصہ درج کر دوں تاکہ سمجھنے میں آسانی ہو۔

(۱) اسلام بلاشک وشبہ سعادت بشر کے لئے آیا ہے

(۲) اسی سعادت کا ایک جزو خلافت الٰہیہ ہے

(۳) خلافت الٰہیہ ایک موہبت الٰہیہ ہے وہ کسی نسلی امتیاز پر نہیں بلکہ جوہر ذاتی کی بنا پر ہے کسی ایک نسل میں اس کا پایا جانا اس مفہوم کا حامل نہیں کہ نسلی امتیاز مدنظر رکھا گیا ہے

(۴) خلافت الٰہیہ سے کسی فرد یا جماعت کی حق تلفی کا ذکر ایک دھوکا ہے۔ پہلے یہ ثابت کیا جائے کہ فلاں شخص یا فلاں خاندان اس عطا کا مستحق تھا۔ بغیر اثبات حقوق کے غصب حقوق کہنا ایک بے معنی بات ہے

(۵) اگر غیر مستحق مدعیان امامت پیدا ہوئے تو امامت الٰہیہ اس کی ذمہ دار نہیں

(۶) عقل عمومی کی حجت کا دعویٰ غلط ہے

یہاں تک انسانیت مفروضہ کے متعلق عرض کیا گیا۔ اب قرآن و احادیث کی طرف توجہ کی جاتی ہے

شیعہ اور سنیوں میں ایک اصولی اختلاف یہ بھی ہے کہ شیعہ ہر مسئلہ کو اسلام کی روشنی میں دیکھنا چاہتے ہیں برخلاف اس کے حضرات اہل سنت کا مسلک دوسرا ہے۔ چنانچہ اسی تحریر سے معلوم ہو سکتا ہے کہ محرر کے نزدیک "انسانیت" اور شے ہے اور "اسلام" اور شے

مسئلہ قرآن میں سب سے پہلے جس چیز پر نظر جاتی ہے وہ یہ ہے کہ قرآن پاک کے مطالب صاف و صریح سمجھ میں بھی آسکتے ہیں یا نہیں۔ ملاحظہ کیجئے یہ کتاب خود اپنے متعلق کیا کہتی ہے :۔

"فیہ آیات محکمات ہن ام الکتاب و اُخر متشابہات"

اس میں بعض آیات محکمات ہیں جو اُم الکتاب ہیں اور دوسری متشابہات ہیں اور خود قرآن یہ نہیں بتاتا کہ فلاں آیت محکم ہے اور فلاں متشابہ۔

اس کتاب میں اجمال بھی ہے۔ مثلاً اقیموا الصلوۃ و اٰتوا الزکوۃ۔ لغت کے لحاظ سے دیکھو تو صلوۃ کے معنی دعا اور زکوۃ کے معنی نمو۔ قرآن یہ کہیں نہیں بتاتا کہ صلوۃ سے مراد وہ عبادت ہے جس کے اجزا تکبیر۔ قیام۔ رکوع۔ سجود۔ تشہد وغیرہ ہیں یا زکوۃ سے مراد وہ خیرات ہے جو مذہبی فرض کے طور پر ادا کی جاتی ہے۔ ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے :۔

"ان اللہ اصطفیٰ آدم و نوحاً و آل ابراہیم" (خود قرآن کچھ نہیں بتاتا کہ آلِ ابراہیم سے مراد کل ہیں یا بعض)

دوسری جگہ فرمایا ہے ۔۔
" یقول الذین کفروا لست مرسلا قل کفی باللہ شہیدا بینی وبینکم ومن عندہ علم الکتاب "
کافر کہتے ہیں کہ تو رسول نہیں ہے ۔ کہدے میرے اور تمہارے درمیان شہادت دینے کے لئے خدا کافی ہے اور وہ شخص جس کے پاس علم الکتاب ہے ۔ یہ صاحب علم الکتاب کون ہے ؟ قرآن بظاہر خاموش ہے
ایک اور آیت ملاحظہ ہو :۔
" انہ لقرآن کریم فی کتاب مکنون لا یمسہ الا المطہرون "
یہ قرآن کریم ہے جو کتاب مکنون میں ہے اسے مس نہیں کریں گے مگر مطہر ۔ وہ کتاب مکنون کیا ہے جو ذات قرآن ہے ؟
یہ چند مثالیں بطور نمونہ پیش کی گئی ہیں ۔ ورنہ ایک ایک قدم پر بھی مشکل پیش آتی ہے یہ مشکلات تو تفسیر کی حد میں
اب رہی تاویل وہ تو ایک دریائے ناپیدا کنار ہے
آیات قرآنی کے سلسلہ میں اعتراضاً تحریر فرمایا گیا ہے کہ اہل تشیع تاویل کرنے اور اصل مفہوم کو کچھ سے کچھ کر دینے میں اُستاد مانے جاتے ہیں اور اسلام میں اس نوع کی تاویل کا دروازہ سب سے پہلے اسی فرقہ نے کھولا ہے اور حاشیہ پر پروفیسر نکلسن کی کتاب کا بھی حوالہ دیا گیا ہے
پہلے تو انھیں یہ معلوم ہونا چاہئے کہ تاویل کے معنی ہیں کسی لفظ کو اس کی حقیقت اولیہ کی طرف پلٹانا چنانچہ بعض مقام پر یہی حقیقت اولیہ مراد لی جاتی ہے اور ظاہر لفظ کا کوئی خیال نہیں رکھا جاتا اور بعض مقام پر حقیقت اولیہ بھی مدنظر رکھی جاتی ہے اور ظاہر معنی بھی
مثلاً " ید اللہ فوق ایدیہم " ۔ اللہ کا ہاتھ ان کے ہاتھ پر ہے ۔ معلوم ہے کہ " ید " یا " ہاتھ " سے ظاہری معنے مراد نہیں ہو سکتے ۔ اس لئے یہاں " قوت و قدرت گرفت " کے معنی مراد لئے جائیں گے اور ظاہر معنی کا قطعاً لحاظ نہ ہوگا
مثال ۲ ۔ اقیموا الصلوۃ ۔ ظاہر ہے کہ نماز کی حقیقت اولیہ رجوع الی اللہ ہے ۔ اب یہ معنی بھی ملحوظ رہیں گے اور اس کے مفہوم ظاہری کا بھی لحاظ رکھا جائے گا جو شارع علیہ السلام نے متعین فرما دیا ہے کیونکہ بعض ارکان کے خلاف کوئی دلیل عقلی یا نقلی موجود نہیں ہے ۔ بلکہ علی التواتر یہی اُصول عبادت تسلیم کیا گیا ہے ۔ یہ ہیں تاویل کے معنی جو عرض کئے گئے ۔ اب اگر اس قسم کی تاویل کا دروازہ شیعوں نے کھولا ہے تو وہ اولوالالباب ہیں ۔ صاحب فہم و فراست ہیں ۔ لیکن اگر فاضل مضمون نگار اپنے خیال میں تاویل کے معنی یہ سمجھ رہے ہیں کہ اصل مفہوم و منشاء کو کھینچ تان کر کچھ سے کچھ بنا دینا تو اس کی تفصیل آئندہ اوراق میں آ سکے گی ۔ یہاں صرف اس قدر عرض کرنا ہے کہ مطالب قرآنی ہر عامی اور نامحرم کی سمجھ میں نہیں آ سکتے ۔ اسی لئے اس کے معلم اول خود رسول اللہ تھے مسلمان مجبور تھے کہ وقت نزول آیۃ رسول اللہ سے اس کا مطلب دریافت کریں ، دریافت کرتے تھے اور جواب پاتے تھے ۔ انھیں جوابات کو تفسیر سے تعبیر کیا جاتا ہے اور اس تفسیر چھوڑ کر قرآن کو

کافی سمجھا یا خود اس کے مفہوم متعین کرنا رسول کے مرتبۂ معلمیت سے انکار کرنا ہے
اب سوال یہ ہے کہ مسئلہ کی صورت کیا ہے؟ آیا تفسیر سے ہاتھ اٹھالیں یا اس پر عمل کریں؟ اور اگر عمل کریں تو کس کے توسط سے؟ شیعہ دوسری صورت کو اختیار کئے ہوئے ہیں اور توسط کے معاملہ میں ان کی نگاہ اہل بیت پر جمی ہوئی ہے — مطالب قرآنی کے متعلق یہ ہے شیعی نقطۂ نگاہ۔ اب میں قبلہ کی قرآن فہمی پر نظر کروں گا۔ ابتداء اسے عنوان میں تحریر فرماتے ہیں

"وہ قرآنی آیات جن کی بناء پر حضرات شیعہ کی جانب سے عموماً یہ خیال کیا جاتا ہے کہ ان سے حضرت علی کی الٰہی خلافت پر مضبوط قرائن قائم ہوتے ہیں"

اس تحریر سے یقین دلانے کی کوشش کی گئی ہے کہ صرف اتنی ہی آیتیں مدار مذہب شیعہ ہیں — خیر آئیے مطلب کی طرف۔
(۱) "لیس البر بان تاتوا البیوت من ظهورها ولکن البر من اتقی واتوا البیوت من ابوابها"
(نیکی یہ نہیں ہے کہ گھروں میں ان کی پشت کی طرف سے داخل ہو بلکہ نیکی یہ ہے کہ اللہ سے ڈرو اور گھروں میں دروازے سے داخل ہو) — تفسیر آیت یہ ہے کہ زمانہ جاہلیت عرب جب حالت احرام میں ہوتے تھے تو دروازوں سے گھروں میں داخل نہیں ہوتے تھے۔ بلکہ پشت خانہ پر گھر کی سیڑھی بنا لیتے تھے۔ اسی میں سے آتے جاتے تھے اور اسے جزو دین سمجھتے تھے۔ اسلام نے اس آیت کے ذریعہ اس رسم پرستی کی ممانعت کر دی
یہ تو وہ حقیقی مفہوم ہوا جو الفاظ سے مترشح ہوتا ہے اور جو اس آیت کی شان نزول پر مبنی ہے۔ لیکن ذرا نظر کو وسعت دیجئے احکام قرآنی کسی خاص مسئلے سے متعلق صادر تو ضرور ہوتے ہیں لیکن ان میں اس قسم کے سارے واقعات کا احاطہ مقصود ہوتا ہے۔ ایسا نہ ہو تو قوانین اسلامی مختص المقام فرمان ہو کر رہ جائیں گے۔ اس لئے یہ ماننا پڑے گا اس حکم میں سیدھا راستہ چلنے کی طرف اشارہ ہے۔ کجروی کی ممانعت کی گئی ہے۔ اب آپ خود غور کیجئے کہ آیت کی تاویل غلط ہی یا صحیح تاویل یہ ہے کہ ہر فن میں ہر علم میں، ہر مسئلہ میں اسی قاعدے سے داخل ہونا چاہئے جو اس کے لئے معین مقرر ہے اگر عقب سے آؤ گے یعنی خلاف قاعدہ داخل ہو گے تو کچھ استفادہ نہ کر سکو گے۔ یہ ایک سیدھا سا عقلی اصول ہے اور اسی آیت کے تحت میں آرہا ہے۔ یہ بھی واضح رہے کہ ہر فن میں داخل ہونے کے لئے اس شخص کے پاس جانا چاہئے جو اس فن کی تعلیم دیتا ہے۔ چنانچہ اسی عقلی اصول کی بناء پر نحو کا دروازہ نحوی ہے اور راگ کا دروازہ گویا۔ نحو سیکھنے کے لئے نحوی کے پاس جائیے اور راگ سیکھنے کے لئے گویئے کے پاس۔ اسی طرح خداشناسی کا ذوق ہے تو رسول کے پاس جائیے کیونکہ معرفت الٰہی کا دروازہ رسول ہے
اب سوال یہ ہے کہ علم رسول کا دروازہ کون ہے یعنی علم رسول کا باب تو ضرور ہونا چاہئے مگر وہ ایسا کون ہے جو ہر حیثیت سے واقف علم رسول ہو۔ شیعہ یہاں تک تو صرف بحکم عقل آتا ہے اور جب تلاش کا قدم بڑھتا ہے تو اس کی خوش قسمتی سے ارشاد رسول اس کے لئے مشعل راہ بن جاتا ہے کہ "انا مدینۃ العلم وعلی بابها"

اب اس شناخت کے بعد اس کی نظر اس ارشاد الٰہی پر جاتی ہے:-

"ہل یستوی الذین یعلمون والذین لا یعلمون انما یتذکر اولوا الالباب"

اب میں عرض کرتا ہوں کہ اس استدلال میں کیا خرابی ہے اور آپ ہی متعین کیجیے کہ آخر عالم علم رسول کا حصہ کون ہے۔

(۲) "الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینا"

(ترجمہ۔ آج میں نے تمہارے دین کی تکمیل کر دی اور اپنے احسان کو تم پر پورا کر دیا (نعمت کا ترجمہ احسان کیا خوب) اور میں نے پسند کیا کہ تمہارا دین اسلام ہو)

اس کے متعلق ارشاد ہوتا ہے کہ "سمجھ میں نہیں آتا اس آیت میں کونسا خلا یا نقص ہے جو حدیث غدیر کے ضم کرنے کی ضرورت ہوئی"

بے شک ذرا دور کی بات ہے۔ اس مقام پر کچھ تفصیل کی ضرورت محسوس ہوتی ہے

واضح ہو کہ "الیوم" میں "الف" "لام" کا ہی نمایاں ہے یہ "الف" "لام" "یوم" کو جو نکرہ ہے معرفہ بنا رہا ہے اسی لیے اس کا ترجمہ "آج" کیا گیا۔ مگر میں ترجمہ کرتا ہوں "آج کا دن" در اصل لفظ کی قوت اسی میں باقی رہتی ہے۔ الغرض "الیوم" سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ دن کوئی مخصوص دن ہے۔ اب آپ فرمائیں کہ وہ روز مخصوص کونسا ہے۔ فرض کیجیے ہمارے سامنے ایک پروگرام ہے اور جب اس پروگرام کا جزو اخیر انجام پا جائے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ آج کے دن ہم نے اس پروگرام سے فراغت پائی۔ یا آج کے دن ہم نے اس کی تکمیل کر دی۔ ہاں یہ واضح رہے کہ پروگرام کی تکمیل کے پانچ دس دن بعد بلکہ اس کے دوسرے ہی دن "الیوم" کہنا درست نہ ہوگا۔ اسی طرح سے آیۂ مذکور میں نہ صرف یوم مخصوص بلکہ نبوت کے پروگرام کے جزو اخیر کی شناخت بھی ضروری ہے۔ اس کو خلا یا نقص نہیں کہتے بلکہ اسے "دعوت تفکر" کہتے ہیں۔

یہ ارشاد کہ "رسول کریم نے اپنی وفات سے قبل یہ اعلان فرمایا" کچھ مفید نہیں ہے اسی کو تعریف المجہول بالمجہول کہتے ہیں۔

لفظ مولیٰ سے جو تعرض کیا گیا ہے میں اس کی طرف توجہ نہیں کرنا چاہتا۔ اس پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ اب کچھ کہا جائے تو کس کے سامنے

(۳) "وانذر عشیرتک الاقربین واخفض جناحک" الخ

(ترجمہ۔ اپنے قریب کے رشتہ داروں کو متنبہ کر دے اور جو ایمان والے تیرے ساتھ ہیں ان کے سامنے اپنے بازو نیچے رکھ (یعنی ان کے ساتھ نرمی سے پیش آ)

اب سوال یہ ہے کہ اس حکم کی تعمیل رسول اللہ نے کی یا نہیں؟ اگر کی تو کیا کوئی عنوان خاص اختیار کیا یا ویسے ہی عام طور پر کھڑے ہو کر اعلان کر دیا۔ آخر تاریخی حیثیت واقعہ کی کیا ہے۔ فاضل مضمون نگار نے اس مقام پر وعدہ کیا تھا کہ بیعت عشیرہ کے واقعہ پر بحث احادیث میں روشنی ڈالی جائے گی۔ مگر تمام بحث احادیث میں اس کی طرف کوئی اشارہ نہیں تھا

گویا پی گئے۔ اگر ڈپٹی نذیر احمد مرحوم زندہ ہوتے تو اس موقعہ پر ضرور لکھ دیتے کہ "معلوم ہوا پانی مرتا ہے"

(۴) "انما ولیکم اللہ و رسولہ والذین آمنوا الذین یقیمون الصلوٰۃ ویؤتون الزکوٰۃ وہم راکعون"

(ترجمہ۔ تمہارا رفیق تو صرف اللہ ہے اور اس کا رسول اور وہ لوگ جو ایمان لے آئے ہیں نماز پڑھتے ہیں اور عجز و انکسار سے زندگی گزارتے ہیں)۔ "ولی" کا ترجمہ "رفیق"! کیا کہنا

سوال یہ ہے کہ اگر کسی کے لئے کوئی ایسی صورت حال پیدا ہو جائے اور اسے کسی کی ولایت میں آنا پڑے تو وہاں ولی کے کیا معنی ہوں گے

اب دوسرے پہلو کو دیکھئے۔ "وہم راکعون" کا ترجمہ فرمایا گیا ہے "اور عجز و انکسار سے زندگی گزارتے ہیں" اب میں اس کا ترجمہ یہ کرتا ہوں کہ "واؤ" کو "عاطفہ" نہیں "حالیہ" قرار دیتا ہوں) اور کہتا ہوں۔ "وہ زکوٰۃ دیتے ہیں درآنحالیکہ وہ رکوع میں ہوتے ہیں"، کونسا قانون عربیت اس ترجمہ سے روک سکتا ہے اس طرح اس آیت کے دو ترجمے ہو گئے ایک وہ جو صاحب مضمون نے کیا ہے دوسرا یہ جو میرے قلم سے نکلا ہے، ایسی حالت میں ضروری ہے کہ ایک ایسا معیار ہو جسکی طرف دونوں رجوع کر کے فیصلہ کر سکیں اگر کوئی معیار نہیں ہے تو پھر معاملہ یونہی مبہم کا مبہم رہیگا

اب میں از روئے مفہوم اس آیت کو دیکھنا چاہتا ہوں۔ مفہوم اولین یہ ہے کہ اس آیت کی رو سے ایک گروہ تو اولیا کا ہے جس کا سلسلہ خود ذات باری ہے۔ دوسری وہ جماعت ہے جو "کم" کی مخاطب ہے جن سے کہا گیا ہے کہ اللہ و رسول اور ان ان صفات والے لوگ تمہارے ولی ہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ وہ کون لوگ ہیں جن پر یہ ولایت مقرر ہوئی ہے ان کا یقین کئے بغیر آیت تشنہ مفہوم ہی رہے گی

دوسرے لفظوں میں یوں سمجھنا چاہئے کہ "اولیا" کا طبقہ الگ ہے اور "مولیٰ علیہم" کا طبقہ الگ اور طبقۂ اول میں لازماً کچھ ایسی صفات ہیں جو انھیں دوسرے طبقہ سے ممتاز کر رہی ہیں۔ ورنہ ایک جماعت کو ولی قرار دینا اور دوسری کو "مولیٰ علیہم" ایک بے معنی بات ہے۔ پس ماننا پڑے گا کہ طبقۂ ثانی میں وہ صفات نہیں ہیں جن کا طبقۂ اولیٰ حامل ہے

اب بحکم عقل سلیم واجب ہے کہ "وجہ امتیاز" کی تلاش کی جائے اور وہ ایسی شے ہو کہ دوسروں میں نہ پائی جا سکے۔ دیکھئے "الذین آمنوا" سے کچھ بھید نہیں کھلتا۔ اس لئے کہ ایمان ایک شے مشترک ہے جو کم و بیش ہر مخاطب میں موجود ہے اسی طرح "یقیمون الصلوٰۃ" بھی کوئی روشنی نہیں ڈالتا۔ سب ہی نماز پڑھتے ہیں۔ علیٰ ہذا "یؤتون الزکوٰۃ" ادائے زکوٰۃ سے بھی کوئی خصوصیت خاصہ ظاہر نہیں ہوتی اس لئے صاحب مضمون کے ترجمے کی بناء پر اس آیت کا کوئی مفہوم صحیح پیدا نہیں ہوتا اور نہ کوئی وجہ امتیاز معلوم ہوتی ہے

بر سبیل تنزل زیادہ سے زیادہ اگر کوئی مفہوم پیدا کریں تو یہی ہوگا کہ جن کا ایمان اعلیٰ درجہ کا ہے۔ جو انتہائی خضوع و خشوع سے ہمیشہ نماز پڑھتے ہیں جو برابر زکوٰۃ دیتے ہیں۔ جو ہمیشہ خضوع و خشوع سے زندگی گزارتے ہیں۔ یہ لوگ ولی ہیں ان لوگوں کے

جن کا ایمان ادنیٰ درجہ کا ہے یا صرف زبانی ہے۔ لیکن مفہوم پھر بھی مبہم کا مبہم رہ جاتا ہے۔ بتایا جائے وہ بڑے ایماندار کون ہیں جو کمزور ایمان والوں کے رفیق ہیں؟ پھر یہ بھی ہے کہ ایمان کی کمی و بیشی ایک امر باطنی ہے۔ اسی طرح خضوع و خشوع فی الصلوۃ ان امور کا کون اندازہ لگائے؟ غرض اس مفہوم کی بنا پر بھی انسان کسی صحیح نقطہ تک نہیں پہونچ سکتا اور فاضل مضمون نگار نے جو ترجمہ پیش کیا ہے اس کی بنا پر آیت گورکھ دھندا ہو کر رہ گئی ہے

برخلاف ازیں دوسرا ترجمہ "وہ زکوۃ دیتے ہیں در آنحالیکہ رکوع میں ہوتے ہیں" ایک نہایت صاف و صریح "وجہ امتیاز" ہے اور یہ شان امتیازی جہاں پائی جائے گی وہیں ولایت متحقق ہو جائے گی۔ اس بات کی پروا نہیں کہ یہ "امتیاز" کہاں پایا جاتا ہے؟ ہمیں اصرار نہیں کہ علی ہی اس کے حامل ہیں نہیں۔ ابوبکر میں ثابت ہو جائے فبہا۔ عمر میں ثابت کر دیجئے قبول۔ لیکن محض اس بنا پر کہ علی میں یہ "شان امتیاز" پائی جاتی ہے۔ مفہوم آیت کو بدلنے کی سعی کرنا دیانت کا کام نہیں ہے

اب میرا سوال یہ ہے کہ "ولی" کا ترجمہ "رفیق" کس بنا پر فرمایا گیا ہے۔ آیا "ولی" اور "رفیق" مترادف الفاظ ہیں؟ یا لفظ ولایت مشترک ہے۔ اگر مشترک ہے تو کسی ایک معنی کے ساتھ مخصوص کرنے کے لئے قرینے کی ضرورت پڑتی ہے مثلاً لفظ "عین"، کہ "سورج" کے معنی بھی دیتا ہے اور "چشمہ" کو بھی "عین" کہتے ہیں۔ "آنکھ" کے لئے بھی مستعمل ہے پس جب تک کوئی قرینہ نہ پایا جائے تو کسی ایک معنی کے ساتھ مخصوص نہیں ہو سکتا۔ اب بتایا جائے کہ اس آیت میں کونسا قرینہ تھا جسکی بنا پر "ولی" کے معنی "رفیق" کر لئے گئے

(۵) "یا ایہا الرسول بلغ ما انزل الیک من ربک وان لم تفعل فما بلغت رسالتہ واللہ یعصمک من الناس"

(ترجمہ۔ اے رسول وہ تمام چیزیں لوگوں تک پہونچا دے جو تیرے رب کی جانب سے تجھ پر نازل ہوئی ہیں اور اگر تو نے ایسا نہ کیا تو تو نے کچھ نہ پہونچایا اس کا پیغام اور اللہ لوگوں سے تیری حفاظت کرے گا)

اس آیت کے متعلق خلاصہ ارشاد یہ ہے کہ مفہوم آیت بجائے خود مکمل ہے۔ شان نزول دیکھنے کی ضرورت نہیں رہ آیئے اس کا امتحان کریں۔ مفہوم اولین کے لحاظ سے آیت میں جو پہلو نکلتے ہیں۔ قابل ملاحظہ ہیں۔

(۱) "ما انزل الیک" "جو تیری طرف نازل کیا جا چکا" اس سے یہ مفہوم نہیں معلوم ہو سکتا کہ وہ نازل شدہ شے ایک ہے یا کئی ہیں۔ مثلاً زید۔ عمرو سے کہتا ہے۔ "افعل ما قلت لک" وہ کر جو تجھ سے کہہ چکا ہوں ضروری ہے کہ متکلم اور مخاطب کے ذہن میں تو وہ مفہوم موجود ہو لیکن سننے والا یہ نہیں کہہ سکتا اور نہ حتماً کہہ سکتا ہے کہ وہ ایک کام ہے یا کئی کام ہیں۔ پس "ما" کا ترجمہ "جو" "وہ چیزیں" کیا گیا کس دلیل سے؟ یہ ہے پہلے ہی قدم پر لغزش

(۲) اس آیت میں ایک ایسی تاکیدی شان ہے جو تہدید کی حد تک پہونچ رہی ہے

(۳) وعدۂ حفاظت الٰہی بتا رہا ہے کہ اس میں لوگوں کی طرف سے خوف بھی ہے

(۴) ضروری بات ہے کہ وہ شے جس کی بابت اس شد و مد سے حکم تبلیغ ملا ہے وہ پہلے نازل ہو چکی ہو اور رسول اسے

جاتا ہو۔ جیسا کہ مثال میں اشارہ کیا گیا

جب تک ان پہلوؤں کو روشنی میں نہ لایا جائے۔ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ مفہوم بجائے خود مکمل ہے۔ ہاں مکمل ہے مگر ان عقدوں کے کھل جانے کے بعد۔ بغیر ان پہلوؤں کو روشن کئے یہ کہتے ہوئے چل دینا کہ مفہوم بجائے خود مکمل ہے "بحث توختم ہوئی۔ دامن چھڑاتا ہوا

یہی مشکلات ہیں جو انسان کو مجبور کرتے ہیں کہ وہ شان نزول کی طرف رجوع کرے اور شان نزول کو دیکھ کر جو مطالب پیدا ہوں انھیں پیش کرے۔ اس سے یہ نتیجہ نکالنا قطعاً صحیح نہیں ہے کہ اس صورت میں قرآن سے استدلال نہ ہوگا بلکہ شان نزول یا حدیث سے استدلال رہ جائے گا کیونکہ جس طرح صرف۔ نحو معانی۔ بیان کی قرآن فہمی کے لئے ضرورت ہے اسی طرح شان نزول۔ تاریخ۔ حدیث کی بھی ضرورت ہے۔ یہ سب قرآن فہمی کے ذرائع اور وسائل ہیں۔ اب اگر کوئی شخص بہ لحاظ علم معانی و بیان قرآن سے استدلال کرے تو کیا یہ کہنا درست ہوگا کہ یہ شخص قرآن سے نہیں بلکہ معانی و بیان سے استدلال کر رہا ہے

بحث آیات ختم ہو رہی ہے اور اس اختتام پر مجھے کہنا پڑتا ہے کہ فاضل صاحب مضمون نگار نے اس بحث میں قطعاً کامیابی حاصل نہیں کی۔ منطقی سطحی باتوں سے دل بہلانا چاہا ہے۔ ان سے صاحب غور و نظر کے سامنے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا جا سکتا۔ آیات کی بحث ختم ہو گئی اور مجھے یقین ہے کہ قارئین کرام کو اس کا اندازہ ہو گیا ہوگا کہ صاحب مضمون نے جس تفصیل آیات کا غیر واقعی تاویل سمجھا ہے وہ تاویل ہے با حقیقت۔ اس بحث میں میری جانب سے صرف اس قدر کوشش کی گئی ہے کہ جو مغالطہ ذہنی مضمون نگار کو ہوا ہے اور مغالطہ منطقی انھوں نے دینا چاہا ہے اس کی اصلاح ہو جائے ورنہ ان آیات کے رموز و اسرار پر ابھی بحث و گفتگو کی بہت گنجایش ہے۔ باقی

مکتوبات نیاز

آپ نے بیدل کا یہ مصرعہ سنا ہوگا۔

چشم وا کردن زمین تا آسماں آغوش داشت

اس کا صحیح مفہوم کل رات سمجھ میں آیا جب ایک شخص کی زبانی آپ کی آمد کا حال سنکر عجیب قسم کا پُرلطف صدمہ دل کو پہنچا لطف تو اس احساس سے متعلق تھا کہ آخر کار آپ یہاں آہی گئے اور صدمہ یوں کہ آپ نے مجھے اس قابل بھی نہ سمجھا کہ آنے کی خبر ہی کردیتے، میزبانی کی تمنا تو خیر میں کیا کر سکتا تھا اور کرتا بھی تو کس توقع پر؟

معاف کیجئے، بیدل کا وہ مصرعہ مجھے آخر میں لکھنا چاہئے تھا لیکن گھبرا کر پہلے ہی لکھ گیا۔ اگر آپ اس میں کوئی مخصوص اشارہ نہیں پاتے تو میری قسمت لیکن اس کے معنے یہ نہیں ہیں کہ میری گزارش والتجا میں کوئی کمی پیدا ہو جائے سوال اگر مہربانی یا نامہربانی کا ہوتا تو غالب کی زبان میں کہہ سکتا تھا کہ "میں گیا وقت نہیں ہوں" لیکن یہاں تو معاملہ "وسعت برنرش" کا ہے۔ کیسی اطلاع اور کہاں کی اجازت

کل صبح آؤں گا اور خواہ مخواہ آؤں گا۔ اس سے مقصود آپ کو اطلاع دینا نہیں، بلکہ اپنے عزم میں پختگی پیدا کرنا ہے

خط پہونچا۔ تم نے کیوں وہ باتیں چھیڑ دیں، جن کے بھلانے کے لئے سو بار دل خون ہو چکا ہے۔ ماضی کی داستان میں لاکھ لذتیں ہوں، لیکن ان کی یہ تلخی کہ وہ اپنی ناپائداری سے ہمارے حال و مستقبل دونوں کو بیکار بنا جاتی ہیں، ناقابل برداشت ہے ایک شاعر لکھتا ہے:۔

لیلیٰ و مجنوں بہم می بودہ اند

پیش ازیں خوش روزگارے بودہ است

تم نے دیکھا اس "خوش روزگارے" میں زندگی کا کتنا دردناک مرثیہ پوشیدہ ہے۔ مقصود ماضی کی یاد نہیں، بلکہ حال کا ماتم اور مستقبل کی سوگواری کا اظہار ہے۔۔ میں نے ایک عمر جذبات کی دنیا میں صرف کی اور آخر کار نتیجہ میں یہی کہنا پڑا کہ:۔

"اے خوں شدہ دل تو تو کسی کام نہ آیا"

پھر کیا انسان کے لئے اس سے زیادہ سخت امتحان کوئی اور ہو سکتا ہے کہ پیدا تو کیا " اسے خیال پرست " اور مطالبہ ہے عملی زندگی کا — بیرحم و ظالم عمل!

خدا جانے زندگی کی کتنی راتیں اس سوچ میں بسر ہو گئی ہیں کہ " نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا " ۔ بعض اوقات کہتا ہوں " کچھ نہ ہوتا " ۔ اور کبھی یہ سمجھتا ہوں کہ " یہی سب کچھ ہوتا " پھر نہ اس میں اپنی عظمت کا احساس ہے، نہ اس میں اپنی تحلیل گی کا، بلکہ ایک اضطراری عدم توازن ہے ذہن انسانی کا اور لطف یہ کہ فطرت نے اس پر اپنی کارگاہ کا توازن قائم کیا ہے!

بیدل کہتا ہے :—

دریائے خیالیم و نمے نیست در اینجا
جز وہم وجود و عدمے نیست در اینجا

میں کہتا ہوں، یہ کہنا بھی ایسا ہی ہے

سچ پوچھو تو اب میں صرف اس امید پر جی رہا ہوں کہ جینے پر اختیار ہو یا نہ ہو، مرنے پر تو ہے، اور اسی سے کچھ تسکین ہوتی ہے

ہم نے چاہا تھا کہ مر جائیں سو وہ بھی نہ ہوا

اس کا میں قایل نہیں

بندہ نواز ، گرامی نامہ ملا ۔ پرسش حال کا شکریہ ۔ اچھا ہوں، اس لئے کہ ہر بدتر اور بدترین سے بہرحال بُرا، اچھا ہے ۔ کہتے ہیں کہ انسان میں ایک چھٹی حس اور بھی ہو جسے " حسِ توازن " کہتے ہیں، میں اس میں " حسِ تقابل " کا بھی اضافہ کرنا چاہتا ہوں ۔ کیونکہ یہ نہ ہو تو زندگی دشوار ہو جائے ۔ ایک برہنہ پا اسی لئے جی رہا ہے کہ دنیا میں بہت سے " آبلہ پا " بھی موجود ہیں، خیر، یہ تو وہ باتیں تھیں جنہیں خواہ مخواہ میں نے آپ کی رسمی مزاج پُرسی کے جواب میں لکھ مارا ۔ اب اصل مدعا کی طرف متوجہ ہوتا ہوں

آپ سے کیا کہوں، لیکن کہنا پڑتا ہے کہ دنیا میں سب سے زیادہ مشکل کام کسی کی ذمہ داری اپنے سر لینا ہے، اور خاصکر میرے لئے کہ میں خود اپنے افعال کا بھی جوابدہ بننا پسند نہیں کرتا ۔ آپ نے اُن پر جو لطف فرمایا ہے، وہ، قطع نظر اس سے کہ میں اس کی داد دوں یا نہ دوں، آپ اپنی داد ہے، لیکن اگر اس کی لطافت میں آپ کوئی ثقل پیدا کرنا چاہتے ہیں تو آپ کی خوشی ۔ منطق و اقتصاد، فلسفہ و اخلاق، مذہب و سیاست سبھی کچھ موجود ہے، ان میں سے ہر ایک کے زاویۂ نگاہ سے تبصرہ فرمائیے اور دیکھئے کہ آپ نے جو کچھ کیا وہ مناسب تھا یا نہیں — نیکی کرنے کے بعد اتنی فرصت کہ انسان اس کی توجیہ و تعلیل بھی کر سکے! اب کیا کہوں کہ کیا ہے ۔ بہرحال مجھ سے تو آپ کچھ پوچھئے نہیں، جو آپ مناسب سمجھتے ہوں

کیجئے۔ میں شکر ادا کرنے میں بھی بخیل ہوں، اور شکایت کرنے میں بھی۔ وہ تو خیر شاذ یا اتفاقاً کبھی کبھی ہو بھی جاتا ہے، لیکن اس کے لئے زبان نہیں ملتی۔ اس کا سبب غیرت و خودداری نہیں ہے۔ بلکہ صرف اپنی نا اہلی کا احساس — وہی — "ہم کیا ہیں جو کوئی کام ہم سے ہوگا" والا احساس۔ یہ میں نے اس لئے ظاہر کر دیا کہ مبادا کبھی آپ اس کی توجیہ پر اتر آئیں اور خواہ مخواہ مجھ پر رعونت وغیرہ کا الزام قائم کر بیٹھیں ——— گرمی کو آپ کیا پوچھتے ہیں
"لگا سے نہ لگے اور بجھائے نہ بجھے"

مکرمی۔ دنیا گزشتنی و گزاشتنی ہے۔ اس کا مطلب میں نے یہ سمجھا ہے کہ اگر یہاں کوئی کسی کو بھلا دے تو افسوس نہ کرنا چاہئے۔ لیکن باوجود اس علم کے بعض ہستیاں ایسی ہوتی ہیں کہ ان کی فراموشکاری پر افسوس بھی ہوتا ہے اور شکایت کرنے کو جی بھی چاہتا ہے۔ آپ کو شاید معلوم نہیں کہ میں نے آپ کو ہمیشہ اسی نگاہ سے دیکھا ہے اور اسی لئے حیران ہوں کہ آپ کی یاد آوری پر شکایت کروں یا شکر!

مرسلہ مقالہ اچھا ہے لیکن یہ تو بتایئے کہ انگریزی کے کس مضمون سے لیا گیا ہے۔ مترجم صاحب نے اس کی وضاحت نہیں کی — اگست کے نگار میں شائع ہوگا

اللہ، اللہ، یہ اہتمام اور "ایک جانِ ناتواں کے لئے"! غضب کرتے ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ افلاطون سے لیکر اسوقت تک تو تمھارا جواب پیدا ہوا نہیں۔ آئندہ ہو تو ہو

تمھیں معلوم ہے کاروبارِ محبت میں سب سے زیادہ نازک موقع کونسا ہوتا ہے؟ — وہ، جب انسان ترکِ محبت کی راہیں ڈھونڈھنے لگتا ہے۔ تو کیا وہ واقعی ایسا کرنا چاہتا ہے؟ نہیں، بلکہ یہ عزم و ثبات ہے اس قسم کا جو خودکشی کے ارادہ سے ظاہر کیا جاتا ہے۔ خودکشی سے جان تو چلی جاتی ہے، لیکن "ہستی" اور ابھر آتی ہے — پھر مجھے سمجھاؤ کہ تمھارا مقصود کیا ہے۔ مصائبِ روحانی سے چھوٹ جانا؟ تم تو مذہبی انسان ہو اور ایسے سخت قسم کے کہ نہ صرف روح کی بقا کے قائل ہو، بلکہ یہ بھی کہ ٹوپی شیروانی سمیت وہ اپنی تصویر بھی کھنچوا لیتی ہے۔ پھر تمھیں کیونکر یقین آیا کہ اس زندگی کے بعد تمھاری روح کو چین مل جائے گا جبکہ اس کے تمام احساسات اور زیادہ قوی ہو جائیں گے — اچھا یہ نہ سہی تو کیا تمھارا مدعا "لیلیٰ و مجنوں کی حکایت تازہ کرنا ہے"؟ میں جانتا ہوں اس کے جواب میں تم ہاں نہ کہو گے، کیونکہ سمجھتے ہو یہ ہنسی میں اڑا دینے کی بات ہے — پھر کیا عبث گانٹھنا چاہتے ہو؟ — دیکھو اسکے جواب میں حسبِ معمول میر کا یہ شعر نہ سنانا

کب نیازِ عشق نازِ حسن سے کھینچے ہے ہاتھ
آخر آخر، میر، سر بر آستاں مارا گیا

جس سے تمھاری عاشقانہ نگاریوں کی پردہ پوشی ہو جائے ۔ میں تمھاری فطرت، تمھارے ذوق اور تمھاری حسن پرستیوں سے اچھی طرح واقف ہوں۔ کیوں بیوقوف بنتے ہو ۔ دنیا اب بہت ہوشیار ہوگئی ہے، اتنی ہوشیار کہ معشوقانہ اداؤں نے بھی بالکل سائنٹفک صورت اختیار کرلی ہے ۔ عشق و عاشقی کے اب وہ پرانے طور کام نہیں دیتے ۔ پہلے عاشق محبت میں اپنی جان دیدیتا تھا، اب دوسروں کو ذبح کرڈالتا ہے، پہلے جنگلوں میں خاک چھانتا تھا، اب پارکوں میں ٹہلتا ہے پہلے جیب و گریباں چاک کرڈالتا تھا، اب کالر و ٹائی کی درستی میں مصروف رہتا ہے، پہلے "خونِ دل" پیتا تھا اور "لختِ جگر" کھاتا تھا، اب شراب پیتا ہے اور کباب کھاتا ہے ۔ پھر تمھیں بتاؤ کہ اس زمانہ میں کیونکر کسی کو یقین آئیگا کہ بنارس میں ایک فرہاد پیدا ہوا ہے، جسے اگر شیریں نہ ملی تو سر پر تیشہ مارکر مرجائے گا!

ہاں، اُن سے میں مل چکا ہوں۔ لیکن کیا بتاؤں کہ میں نے انھیں کیا پایا۔ یہ اس قسم کی عورتوں میں سے ہیں کہ اگر انھیں کمسن سمجھ کر ملو تو اچھی خاصی جوان معلوم ہوتی ہیں اور جوان سمجھ کر ملو تو کمسن نظر آتی ہیں۔

اس خط کا جواب دینے کی ضرورت نہیں۔ ممکن ہے میں خود تم سے آکر ملوں، لیکن اتنا بھائے دیتا ہوں کہ اس "طوفانِ نوح" لانے سے کوئی فائدہ نہیں ہے

دو اشک بھی بہت ہیں اگر کچھ اثر کریں

سنئے صاحب ۔ میں اس

"چشم سوئے فلک و روئے سخن سوئے تو بود"

کا قایل نہیں۔ منہ ادھر ہے تو آنکھیں بھی ملائیے ۔ یہ "دل جائے دیگرست و نگہ جائے دیگر ست" کچھ نہیں۔ میں برملا کہتا ہوں اور برملا سننا چاہتا ہوں

میں اُن سے زیادہ خوش ہوتا ہوں جو میری ہاں میں ہاں نہیں ملاتے۔ میں کوئی کہانی نہیں کہتا کہ صرف "ہونہہ، ہونہہ" کرنے والے درکار ہوں ۔ میں نشتر چبھوتا ہوں اور اس یقین کے ساتھ کہ اس کے جواب میں "دشنہ و خنجر" سے کام لیا جائیگا یہ عورتوں کی سی "کراہ" مجھے پسند نہیں۔ شیر ڈکار کا جواب شیر کی گرج سے دیجئے۔ صرف کوسنے اور بددعا دینے سے کہیں کام چلتا ہے

علاوہ اس کے یوں بھی، علم و عقل کا اقتضا یہی ہے کہ اگر کوئی شخص غلطی پر ہے تو آپ اس کی اصلاح کریں، اسے سمجھائیں ۔ اندھے کو راہ بتائی جاتی ہے ۔ گڑھے میں نہیں ڈھکیلا جاتا ۔ میں بہت خوش ہوں گا اگر آپ اس بحث کو نگار ہی میں چھیڑیں گے

حضرت۔ یہ آپ سے کس نے کہدیا کہ میں خفا ہوں۔ میں! خفا!! اور آپ سے!!! ان تین باتوں کا اجتماع عقلاً محال ہے۔ یعنی اگر کوئی کہے بھی تو آپ کو یقین نہ کرنا چاہئے۔ بیشک اس دوران میں بارہ دہلی جانے کا اتفاق ہوا، لیکن آپ وہاں تھے کب، آخری بار گیا تو معلوم ہوا کہ دو ہی چار روز ہوئے آپ ولایت سے واپس آئے ہیں لیکن یہ اطلاع مجھے اسوقت ملی جب یہاں "چل چلاؤ" لگ رہا تھا۔ اس کے بعد پھر دہلی جانا ہوا نہیں۔ البتہ اگر آپ یہ شکایت کریں کہ اس کے بعد میں نے کیوں جستجو نہیں کی، تو بیشک میرے پاس امر کا کوئی جواب نہ ہوگا، گو میری طرف سے اسی قسم کی شکایت کے آپ کے پاس سو جواب موجود ہوں۔ خیر جو ہوا سو ہوا۔ آیئے کیوں نہ اب نئے سرے تجدید محبت کریں

مخلص نواز۔ آپ کیا پوچھتے ہیں، یہ حادثہ کتنا بڑا ہے۔ میں دوپہر کو حسب معمول اپنے کام میں مصروف تھا کہ ریڈیو اسٹیشن لکھنؤ کے ایک عہدہ دار تشریف لائے اور کہا کہ "اقبال کا انتقال ہوگیا ہے اور شام کو ریڈیو اسٹیشن پر آپ کو اس حادثہ کے متعلق ایک تقریر نشر کرنا ہے۔" میری عمر میں بہت کم واقعات ایسے ہیں جنھوں نے مجھے اچانک صدمہ پہونچایا ہو سنتے ہی دماغ چکرانے لگا، پیشانی پر پسینہ آگیا اور ایسا محسوس ہونے لگا جیسے کسی نے تیز روشنی گل کرکے دفعتاً اندھیرے میں ڈالدیا ہے

میں مرحوم سے اول اول ۱۹۱۰ء میں ملا تھا اور وہیں لاہور میں۔ ملاقات بہت مختصر تھی، لیکن تاثرات کے لحاظ سے بہت کامیاب۔ اس کے بعد بھی چونکہ عرصہ تک میرا قیام لاہور میں رہا اس لئے بارہا حاضری کی فرصت نصیب ہوئی اور ہر مرتبہ انکی شاعرانہ عظمت ایک نئے انداز سے میرے دل میں گھر کرتی گئی۔

آپ "صدیاں" کہتے ہیں، میں کہتا ہوں کہ یہ جگہ کبھی پُر ہو ہی نہیں سکتی۔ اس سے پہلے کب کسی کی جگہ پُر ہوئی ہے کہ اب ہوگی۔ سعدی، ہومر، شیکسپیر، فردوسی، بیدل، ہمیشہ ایک ہی پیدا ہوتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ اقبال سے زیادہ شہرت و قبول کسی اور شاعر کو نصیب ہوجائے، لیکن اقبال کی جگہ بدستور خالی نظر آئے گی۔ میں نے نگار میں اس حادثہ کے متعلق کچھ نہیں لکھا کیونکہ رسمی باتوں سے مجھے نفرت ہے اور اقبال کے لئے حقیقی معنے میں صفِ ماتم بچھانے کے لئے کافی وقت، کافی دماغ اور کافی کاوش کی ضرورت ہے۔ پھر یہ کہ اقبال پر اتنا لکھا جاچکا ہے کہ میں چاہوں بھی تو کوئی اضافہ اس میں نہیں کر سکتا

اقبال کا پیام جو کچھ بھی رہا ہو اس سے بحث نہیں لیکن دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ وہ کہتا کس زبان میں تھا۔ اُسکی شاعرانہ خصوصیات میں رفتہ رفتہ جو ترقیاں ہوئیں، وہ ثبوت ہیں اس امر کا کہ اس کی شاعری یکسر مفکرانہ تھی، جسے دوسرے الفاظ میں ملہمانہ بھی کہہ سکتے ہیں ــ اقبال کی موت کو دنیا "بے وقت" کہے، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ "ضرب کلیم" کے بعد ان کو زندہ نہ رہنا چاہئے تھا۔ پیدائش کا مقصود پورا ہو جانے کے بعد جینا، جینا برا ہے

بہت سے رسالے اقبال نمبر نکال رہے ہیں اور نکالیں گے، لیکن مجھ میں ہمت نہیں۔ مجھے سوگواریاں خاموش زیادہ اچھی معلوم ہوتی ہیں

سیاسیات یوروپ
(۵)
(جنگ حبشہ)

مسولینی نے اکتوبر ۳۵ء میں حبشہ کے خلاف جارحانہ اقدام کیا اور بجائے اس کے حسب شرائط معاہدہ وہ حبشہ کی اعانت کرتا اس کی غارتگری میں مصروف ہوگیا

مسولینی عرصہ سے مشرق کی طرف تاک لگائے ہوئے تھا کبھی وہ ٹیونس کی طرف للچائی ہوئی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا اور کبھی اناطولیا کی طرف، کیونکہ اطالیہ کو وسیع کرنے کے لئے اسے مستعمرات کی ضرورت تھی، لیکن چونکہ یوروپ واقف تھا کہ گیدڑ بھبکی اس کی عادت ہے اس لئے اس کی کسی بات کو اہمیت حاصل نہ تھی

پھر اس نے اپنی دھمکیوں کو پورا کر دکھانے کے لئے ۳۵ء کا انتخاب کیوں کیا، اور حبشہ سے کیوں اس کی ابتدا کی، اس کے سمجھنے کے لئے پہلے اطالیہ کی اقتصادیات کا مطالعہ ضروری ہے

اطالیہ کی آبادی ۴ کروڑ ۲۰ لاکھ ہے تو فرانس کے برابر لیکن رقبہ اس سے بہت کم ہے۔ آبادی میں ہر سال ۴۵ لاکھ کا اضافہ ہو رہا ہے۔ آبادی کا ۶۰ فی صدی حصہ کاشت پر زندگی بسر کرتا ہے (باقی) ۱۰ فیصدی صنعت و حرفت پر، ۲۱ فی صدی وہاں کے لوگ جاہل ہیں۔ خام پیداوار (مثلاً ربڑ، ٹین، نکل، ابرک، کرومیم وغیرہ) مفقود ہے۔ روئی، اون، کوئلہ، لوہا تانبہ وغیرہ تقریباً ۹۵ فی صدی باہر سے آتا ہے۔ غلہ کی پیداوار ملک کی ضرورتوں کے لحاظ سے بہت کم ہے۔ گوشت بھی ۵ فیصدی باہر سے آتا ہے اور (جاپان کو چھوڑ کر) کوئی ملک ایسا نہیں جس کے محدود سواحل پر اتنی آسانی سے حملہ ہو سکتا ہو جتنا اطالیہ کے سواحل پر۔ ظاہر ہے کہ ایسے ملک کے سلئے جو قدرت کی طرف سے اتنی دشواریاں اپنے ساتھ لایا ہے، مسولینی کی یہ کوشش کہ وہ دنیا کی بڑی زبردست قوت بن جائے معمولی بات نہیں اور اس میں شک نہیں کہ اس کی یہ کوشش بہت مہنگی پڑ رہی ہے

اس نے ٹیکس میں اضافہ کرکے قومی آمدنی کا ۲۸ فی صدی تو لے لیا لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تجارت کو سخت صدمہ پہونچا اور ۳۲ء کے بجٹ میں آمدنی دس کروڑ پونڈ سے زیادہ گھٹ گئی لیکن چونکہ ڈکٹیٹرشپ میں اقتصادیات کا مسئلہ بھی

سیاسی مسئلہ بن جاتا ہے اور اس کے عام اُصول بیکار ہوجاتے ہیں، اس لئے اطالیہ کی ساکھ کسی طرح قایم رہی اور جنگ حبشہ میں تین کروڑ ۳۰ لاکھ پونڈ صرف کرنے کے بعد بھی وہ بدستور زندہ و سلامت موجود ہے ۔ بہر حال اس میں کلام نہیں کہ اطالیہ کی اقتصادی حالت عرصہ سے نازک ہے اور ہوسکتا ہے کہ حبشہ پر حملہ کرنے کی ایک وجہ یہ بھی ہو لیکن اسی کے ساتھ بعض اور محرکات بھی شامل تھے۔

لوگوں کو لندن کے اس خفیہ معاہدہ کا علم ہوگا جو گزشتہ جنگ عظیم کے دوران میں اطالیہ کے ساتھ ہوا تھا۔ اطالیہ سے کہا گیا کہ اگر وہ جرمنی کے خلاف اتحادیین کا ساتھ دیگا تو مال غنیمت کا بڑا حصہ اس کو دیا جائے گا۔ چنانچہ وہ اس لالچ میں آگیا اور جنگ میں شریک بھی ہوا، لیکن نتیجہ وعدہ و امید کے خلاف نکلا۔ اسی کے ساتھ مسولینی کی خارجہ پالیسی کو بھی دیکھئے کہ وہ کس قدر ناکام رہی۔ فرانس نے ٹیونس کی طرف سے اسے مایوس کر دیا۔ البانیہ میں اس کا اقدام غیر مفید ثابت ہوا، عربوں کے ساتھ جنگ کرنے میں اس نے غلط فریق کا ساتھ دیا۔ اور دول بلقان میں باہم اختلاف قایم رکھنے کی کوشش اس لئے ناکام رہی کہ یوگوسلیویا، رومانیہ، ٹرکی اور یونان میں باہمدگر معاہدہ ہوگیا۔ آسٹریا اور ہنگری پر البتہ وہ اپنا اثر قایم کرلیگا (لیکن اب کہ جرمنی نے اس پر قبضہ کرلیا ہے، یہ بھی باقی نہیں رہا)

اطالیہ کی اقتصادی اور سیاسی حالت تو آپ نے سُن لی، اب اسی کے ساتھ آپ مسولینی کی ذہنیت کو بھی سامنے رکھئے مسولینی تمام ڈکٹیٹروں کی طرح اقتدار پر جان دیتا ہے اور کچھ نہ کچھ اسے کرنا ضرور تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کے سیاسی اقدامات نہایت خطرناک ہیں، وہ اچھی طرح واقف تھا کہ حبشہ کی مہم نہایت دشوار ہے۔ وہ خوب سمجھتا تھا کہ بحر روم میں اس کے سواحل ہر وقت برطانیہ کے گولوں کا آماجگاہ بن سکتے ہیں، لیکن اسی کے ساتھ وہ اپنے قومی اقتدار کو بھی ہاتھ سے دینے پر آمادہ نہ تھا اور اطالیہ کی تمام گزشتہ مایوسیوں اور ذلتوں کا انتقام لینے کے لئے بے چین تھا۔ اور چونکہ حبشہ ہی ایک ایسا ملک تھا جو دول یورپ کی مستعمراتی دست بُرد سے اسوقت تک محفوظ رہا تھا، اس لئے اس نے اسی کو اپنا نشانہ بنایا۔

اس جگہ یہ بحث دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ برطانیہ اور فرانس کی دستبرد سے حبشہ کیونکر محفوظ رہا

بات یہ ہے کہ اول تو حبشہ کی سرزمین ایسی ہے جہاں کوئی یورپین قوم مستقل طور سے آباد نہیں ہوسکتی، دوسرے یہ کہ حصول دولت کے فطری ذرایع، ہاں بہت موہوم ہیں اور پھر یہ کہ وہاں کے جنگجو وحشی قبایل سے سر برآنا آسان نہیں تاہم دول عظمیٰ کی مداخلت سے یہ ملک آزادانہ رہ سکا اور ۱۸۹۱ء سے ۱۸۹۶ء تک برطانیہ اور اطالیہ دونوں وہاں اپنا حلقہ اثر قایم کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ اطالیہ کو تو خیر اس سے کوئی فایدہ نہ ہوا لیکن برطانیہ کامیاب رہا کیونکہ ٹسانا جھیل اسی کے تصرف میں تھی جس سے سوڈان اور مصر میں آبپاشی ہوتی ہے۔ ہر چند ۱۹۰۶ء میں حبشہ کی آزادی کو اطالیہ نے تسلیم کرلیا تھا لیکن فرانس، برطانیہ اور اطالیہ نے باہم معاہدہ کرکے اس کو اصولاً تین حصوں میں تقسیم کرلیا تھا۔ یہ جنگ عظیم سے پہلے کی ملوکانہ پالیسی تھی جس کے خلاف حبشہ نے صدائے احتجاج بھی بلند کی، لیکن بےسود ثابت ہوئی

اس کے بعد ۱۹۱۵ء میں جو خفیہ معاہدہ لندن میں ہوا (اور جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے) اس کی رو سے یہ طے پایا کہ اگر فرانس و برطانیہ، افریقہ میں مستعمراتی توسیع کریں تو اطالیہ کے ساتھ یہ رعایت ملحوظ ہوگی کہ اس کے مستعمرات (اریٹریا سومالی لینڈ۔لیبیا) کی حد بندی کے متعلق اس کی موافقت میں فیصلہ کیا جائے گا

۱۹۲۳ء میں حبشہ۔لیگ اقوام کا ممبر ہوا اور فرانس و برطانیہ کی حمایت و اعانت پر بھروسہ کرکے مطمئن ہوگیا ۱۹۲۵ء میں مسٹر چمبرلین (وزیر اعظم برطانیہ) اور مسولینی میں ایک معاہدہ ہوا جس کی رو سے دونوں نے طے کر لیا کہ حبشہ کے کس حصہ میں کس کا کتنا اثر تسلیم کیا جائے گا۔ برطانیہ جھیل ٹسانا میں ایک بندھ بنانا چاہتا تھا اس لئے مسٹر چمبرلین نے مسولینی کو اس پر راضی کر لیا کہ اگر وہ اس میں دخل نہ دیگا تو برطانیہ حبشہ کے مغرب میں اطالوی اثرات کو تسلیم کریگا اور اریٹریا سے سومالی لینڈ تک جو جدید ریلوے لائن وہ نکالنا چاہتا ہے اس کی حمایت کریگا۔لیکن یہ معاہدہ عملی صورت اختیار نہ کرسکا کیونکہ شاہ حبش نے جنیوا کے اجلاس میں اس کی سخت مخالفت کی اور یہ معاہدہ ختم ہوگیا

۱۹۲۸ء میں اطالیہ نے حبش سے ایک دوستانہ معاہدہ کیا اور ہر ایک نے دوسرے کی آزادی کو تسلیم کر لیا اور اس کے بعد سات سال تک کوئی بات ایسی پیدا نہ ہوئی کہ اس معاہدہ کو توڑا جاتا، آخر کار ۱۹۳۵ء آیا اور مسولینی نے اپنی پہلی ضرب استعمال کی

۵ دسمبر ۱۹۳۴ء کو ولوال کا سرحدی جھگڑا شروع ہوا، حالانکہ وہ حدود سومالی لینڈ سے سو میل حبشہ کے اندر واقع ہے۔اس نزاع کی ابتدا یوں ہوئی کہ ایک کمیشن نے (جو انگریزی و حبشی ممبروں پر مشتمل تھا) بمقام ولوال ایک اطالوی فوجی دستے کو خیمہ زن پایا۔ یہ دیکھ کر انگریز تو واپس گئے، لیکن حبشیوں نے اس سے جنگ کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۳۲ اطالوی اور ایک سو دس حبشی سپاہی مارے گئے

مسولینی (جس نے فی الحقیقت یہ چھیڑ اسی لئے کی تھی کہ لڑائی کا بہانہ ہاتھ آجائے) آپے سے باہر ہوگیا اور شاہ حبش سے مطالبہ کیا کہ وہ معافی چاہے، اطالوی جھنڈے کو سلامی دے اور ۲۰ ہزار پونڈ تاوان ادا کرے، لیکن حبش اس پر راضی نہ ہوا اور اس کا نتیجہ جو کچھ ہوا وہ سب کو معلوم ہے

مسولینی نے یہ سمجھا تھا کہ برطانیہ اس کے اقدام کی مخالفت نہ کریگا لیکن جب اسے معلوم ہوا کہ برطانیہ کچھ زیادہ موافق نہیں ہے تو جنوری ۱۹۳۵ء میں مسولینی نے دوبارہ برطانیہ سے گفت و شنید کرنا چاہی، لیکن جب اس نے دیکھا کہ برطانیہ معاملہ کو لیگ اقوام پر چھوڑ رہا ہے اور اس کے خلاف تجارتی ناکہ بندی کی تجویز ہو رہی ہے تو وہ بپھر گیا اور اسنے لیگ سے علٰحدہ ہونے کی دھمکی دیتے ہوئے، ۳ اکتوبر کو حبشہ پر حملہ کر دیا۔اس وقت اس نے مارننگ پوسٹ کے نمائندہ کو جو بیان دیا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ واقعی مسولینی کے دل میں کیا تھا۔اس نے کہا کہ "اب ہم سے یہ کہنا کہ لڑائی سے باز آئیں بہت بعد از وقت ہے۔ پرتگال کو دیکھو، بلجیم اور ہالینڈ کو دیکھو، ان میں سے کون ایسا ہے جو زرخیز مستعمرات کا

مالک نہیں۔ یقیناً اطالیہ کو بھی ایسی ہی مستعمرات ملنا چاہئیے اور جس وقت ہمیں اس میں کامیابی ہوگئی، تو ہم بھی ویسے ہی صلح پسند ہو جائیں جیسے اور ممالک ہیں"۔ نیویارک کے اخبار سن (Sun) سے اس نے کہا کہ:۔ "ہم پر کیوں اُن باتوں کا الزام لگایا جاتا ہے جو خود تمہارے لئے جائز ہیں۔ جب تمہارے اغراض تم کو مجبور کرتے ہیں تو کبھی جنگ سے پس و پیش نہیں کرتے، لیکن ہمارے لئے ایسا کرنا جُرم ہے"۔ ایک بار اس نے اپنی تقریر کے دوران میں کہا کہ "تقدیر کا پہیا اب منزل تک پہونچنے کے لئے گردش میں آگیا ہے اور اب اس کو نہیں روکا جا سکتا"۔

اسے سب سے زیادہ غصہ برطانیہ پر تھا۔ وہ یہ دیکھ دیکھ کر جل رہا تھا کہ برطانیہ خود تو ایک چوتھائی کرۂ ارض پر قابض ہے اور ۴۵ کروڑ انسانوں پر حکومت کر رہا ہے لیکن اطالیہ کو اس کی بھی اجازت نہیں دیجاتی کہ وہ حبشہ ایسے حقیر اور اُجاڑ حصۂ زمین پر متصرف ہو جائے۔ اسے معلوم تھا کہ برطانیہ نے ہندوستان پر کیونکر قبضہ کیا، وہ جانتا تھا کہ جنگ بوئر میں برطانیہ نے کیا کیا، وہ واقف تھا کہ اس نے جاپان کو کیوں منچوریا پر قابض ہو جانے دیا۔ مصر کے اندر اسکی ریشہ دوانیاں، عدن کا الحاق، ایران کے معاملات میں اس کی مداخلت، جنگ کریمیا میں روس کے خلاف ترکوں سے اتحاد، قبرص کا قبضہ، سوڈان میں ملوکانہ اقدام، یہ اور اسی قسم کے بہت سے واقعات برطانوی تصرفات کے اسے معلوم تھے[1] اور وہ اندر ہی اندر کڑھ رہا تھا کہ خود اپنے حرکات کو تو برطانیہ دیکھتا نہیں اور اطالیہ کی مخالفت میں لیگ اقوام کا بہانہ ڈھونڈھ رہا ہے۔

اعلانِ جنگ کے بعد برطانیہ نے یہ سوچا کہ اگر اطالیہ میں اسبابِ حرب کی درآمد بند کر دیجائے، تو ممکن ہے، حبشہ کی جان بچ جائے، لیکن اول اول سب سوچ بچار ہی میں پڑے رہے اور آخر کار جب مسولینی نے ایک لاکھ فوج حبشہ میں اُتار دی تو ان کے کان کھڑے ہوئے اور ناکہ بندی کے لئے بحر روم میں جنگی جہاز جمع ہونے لگے۔ اسی کے ساتھ مسٹر ایڈن نے اقتصادی ناکہ بندی کی بھی تجویز پیش کی، اور اس طرح مسولینی کا غصہ اور بڑھتا گیا

حقیقت یہ ہے کہ لیگ اقوام کی ناکامی کا سب سے بڑا سبب برطانیہ کی پالیسی تھی، جو ایک طرف یہ بھی چاہتا تھا کہ اطالیہ حبش پر قابض نہ ہونے پائے اور دوسری طرف وہ اطالیہ سے بگاڑنا بھی مناسب نہ جانتا تھا۔ کیونکہ اندیشہ یہ تھا کہ اگر اطالیہ لیگ اقوام سے علحدہ ہوگیا تو یقیناً جرمنی سے مل جائے گا۔ اسوقت لیگ کے سامنے حقیقتاً اطالیہ اور حبشہ کا سوال

---

[1] سنہ ۱۸۸۰ء سے برطانیہ نے جن آزاد حکومتوں پر اپنا قبضہ قایم کیا، ان کی فہرست ملاحظہ ہو:۔ بلوچستان۔ برما۔ قبرص۔ ویہائے وی۔ ہانگ کانگ۔ کویت۔ سنائی۔ شمالی گائینا۔ جنوبی گائینا۔ مشرقی گائینا۔ جزائر سلیمان۔ جزائر ٹونگا۔ سوڈان۔ اگانڈا۔ برٹش ایسٹ افریقہ۔ برٹش سومالی لینڈ۔ زنجبار۔ ٹرنسوال۔ آرینج فری اسٹیٹ۔ رھوڈیسیا۔ برٹش سنٹرل افریقہ۔ نائجیریا۔
علاوہ ان کے آمرانہ حیثیت سے وہ فلسطین۔ ٹرانس جارڈن ٹنگنیکا۔ ٹوگو۔ کیمرون۔ سوتھ ویسٹ افریقہ پر بھی قابض ہے۔

نہ تھا بلکہ جرمنی کا تھا۔ کبھی یہ خیال ہوتا تھا کہ اطالیہ کے خلاف ناکہ بندی نامناسب ہے کیونکہ اطالیہ کی کمزوری سے ہٹلر کو ہاتھ پاؤں پھیلانے کا موقعہ مل جائے گا اور وسطِ یوروپ کا امن وسکون درہم برہم ہو جائے گا، کبھی یہ سوچتے تھے کہ ناکہ بندی ضروری ہے تاکہ اطالیہ کی حالت کو دیکھ کر ہٹلر کو تنبیہ حاصل ہو اور دوسرے ملکوں میں مداخلت کے خیال کو ترک کر دے۔

اسی کے ساتھ یہ اندیشہ بھی تھا کہ اگر اطالیہ کو زیادہ سختی کے ساتھ باز رکھا گیا تو ممکن ہے دوسری عالمگیر جنگ شروع ہو جائے۔ الغرض برطانوی مدبرین اس باب میں مختلف الخیال تھے اور اسی لئے بحرِ روم میں انکے جنگی جہازوں کی نقل و حرکت اسوقت تک شروع نہیں ہوئی، جب تک لیبیا میں اطالوی فوجوں کے اجتماع سے مصر اور مالٹا کی طرف سے برطانیہ کو خطرہ پیدا نہ ہو گیا۔ اطالیہ کے خلاف ناکہ بندی کے متعدد اسباب یہ تھے:۔

ایک یہ کہ اگر اسوقت لیگ اقوام نے کوئی موثر کارروائی نہیں کی تو اس کا رہا سہا اقتدار بھی ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائیگا اگر منچوریا کے مسئلہ میں لیگ اقوام نے جاپان کے خلاف کوئی قدم نہیں اُٹھایا تھا تو خیر کوئی بات نہ تھی کیونکہ وہ معاملہ ایک دور دراز ایشیائی حصہ کا تھا، لیکن حبشہ تو گویا گھر کی بات تھی اس لئے اگر اسوقت اطالیہ کی مداخلت کو گوارا کر لیا گیا تو آئندہ جرمنی کو بھی اس کا حوصلہ ہوگا اور یوروپ کا امن خاک میں مل جائے گا۔

دوسرے یہ کہ مقبوضات برطانیہ سب کی سب ناکہ بندی پر زور دے رہے تھے

تیسرے یہ کہ انگلستان کی لبرل جماعت جو فاسزم کی دشمن ہے مسولینی کو نیچا دکھانا چاہتی تھی

چوتھے یہ کہ جب جون ۱۹۳۵ء میں لارڈ سیسل نے لوگوں کی رائے حاصل کی تو معلوم ہوا کہ تقریباً تین کروڑ آدمی اقتصادی ناکہ بندی کے موافق ہیں اور تقریباً پون لاکھ اقتصادی وحربی دونوں قسم کی ناکہ بندیاں چاہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جب کسی ملک کی نصف آبادی ایک طرف ہو جائے تو کیونکر اس کو نظر انداز کیا جا سکتا ہے

علاوہ اس کے لیبر پارٹی بھی پوری طور سے ناکہ بندی کی موافقت میں تھی اور جنرل اسمٹس نے ظاہر کیا کہ حبشہ اور اطالیہ کی یہ جنگ برطانوی مستعمرات میں گورے اور کالے کی جنگ سمجھی جائے گی جو برطانوی اغراض کے منافی ہے۔

اسی کے ساتھ یہ خیال بھی تھا کہ مبادا اطالیہ کی کامیابی مصر، بحرِ احمر، اور ہندوستان کے لئے کوئی خطرہ بن جائے

الغرض ناکہ بندی کا فیصلہ کر لیا گیا لیکن بالکل بادلِ ناخواستہ اور عمل کیا گیا اتنی سست روی کے ساتھ کہ اس کا ہونا نہ ہونا برابر تھا۔ اقتصادی یا تجارتی ناکہ بندی تو خیر کچھ ہوئی بھی لیکن اسبابِ حرب کی درآمد اطالیہ میں برابر جاری رہی اور نہر سویز کو اطالیہ کے خلاف بند کر دینے کی جو تجویز برطانیہ یا لیگ اقوام نے پیش کی تھی اس پر تو عمل ہوا ہی نہیں۔

ادھر ظاہر میں تو یہ سب کچھ ہو رہا تھا، لیکن اندرونی طور پر کیا سمجھوتے ہو رہے تھے۔ اس کی داستان بھی سن لیجئے محکمۂ خارجہ کے اربابِ حل وعقد اس کوشش میں لگے ہوئے تھے کہ اس جنگ کو کیسے ختم کرنا چاہیئے۔ ۸ر دسمبر کو سر سموئیل ہور (برطانیہ کے وزیر خارجہ) پیرس گئے اور وہاں مسٹر لیول سے کچھ گفتگو کی، لیکن کچھ پتہ نہ چلا کہ آپس میں

کیا طے کیا گیا۔ لیکن اتفاق سے فرانس کے اخباروں کو کچھ پتہ چل گیا اور ان کے ذریعہ انگلستان کے اخباروں کو بھی معلوم ہو گیا کہ حبش کا ایک حصہ اطالیہ کو رشوت میں دینا طے کر لیا گیا ہے۔ اس سے انگلستان کی پبلک میں ہیجان پیدا ہو گیا۔ اب کابینہ کو فوراً کچھ نہ کچھ کرنا ضروری تھا، اس لئے مسٹر بالڈوین نے فوراً کابینہ کو طلب کر کے "ہور۔ لیول" سمجھوتہ کی منظوری دیدی اور اتنی جلدی اس کو طے کیا کہ وزرا کو یہ سمجھنے کا بھی موقعہ نہ ملا کہ فی الحقیقت اس سمجھوتہ کی نوعیت کیا ہے کہا جاتا ہے کہ اس وقت کمرہ سے نقشے بھی ہٹا دئے گئے تھے تاکہ لوگوں کو یہ سمجھنے کا بھی موقعہ نہ ملے کہ حبشہ کا کتنا حصہ اطالیہ کو دیا جا رہا ہے

دوسرے دن مسٹر بالڈوین نے ایوان وزارت میں ایک تقریر کی جس سے اس سمجھوتہ پر کچھ روشنی پڑتی تھی۔ انھوں نے دوران تقریر میں کہا کہ "اس وقت میرے لبوں پر مہر لگی ہوئی ہے لیکن جس وقت یہ ہنگامہ فرو ہو جائے گا تو میں تفصیل بیان کروں گا" "مجھے امید ہے کہ کوئی آواز بھی میرے خلاف نہ اُٹھے گی"

اس بیان نے لوگوں میں حیرت و اضطراب کی لہر دوڑا دی اور حقیقت معلوم کرنے کے لئے بے چین ہو گئے۔ سر سموئیل ہور ابھی تک واپس نہ آئے تھے۔ ۱۳ دسمبر کو اس سمجھوتہ کی تفصیل شایع ہوئی جو لوگوں کے اندیشہ سے زیادہ خراب ثابت ہوئی ۱۴ نومبر سے وزیر برطانیہ تعینہ حبش کو تار بھیجا کہ شاہ حبش پر پورا اثر ڈال کر راضی کیا جائے۔ لیکن ادھر پبلک کی برہمی برابر بڑھتی جا رہی تھی چنانچہ مسٹر ایڈن نے صاف صاف کہدیا، "فرانس اور برطانیہ دونوں ملکر حبش کو ڈبو دینا چاہتے ہیں" اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت کی موافق جماعت بھی متزلزل ہو گئی، مسٹر بالڈون پر ہر طرف سے اعتراضات ہونے لگے یہاں تک کہ ٹوری جماعت بھی مخالف ہو گئی۔ اس صورت میں کسی نہ کسی کو قربانی کا بکرا ضروری تھا اس لئے جب سر سموئیل ہور، سوئٹزرلینڈ سے واپس آئے تو مسٹر بالڈون نے انھیں کی بھینٹ چڑھا دی، یعنی ان کو وزارت خارجہ سے استعفا دینا پڑا اور یہ سمجھوتہ ختم ہو گیا

۱۹ دسمبر کو ہور نے دارالعوام میں دبی زبان سے کچھ جوابدہی کی، لیکن مسٹر بالڈوین کے لبوں پر جو مہر سکوت لگی ہوئی تھی وہ نہ ٹوٹی، اسی لئے بعض نے یہ رائے قایم کی کہ استعفا اصل میں بالڈوین سے طلب کرنا چاہئے تھا نہ کہ ہور سے۔ مسٹر بالڈوین جن باتوں کو ظاہر نہ کر سکتے تھے وہ یہ تھیں کہ اگر اطالیہ کے خلاف ناکہ بندی کی گئی اور خصوصیت کے ساتھ پٹرول وغیرہ کی درآمد وہاں بند کر دی گئی تو بالکل ممکن ہے کہ وہ جھنجھلا کر برطانوی بیڑہ پر حملہ کر دے اور اس صورت میں سارے یوروپ کے اندر جنگ چھڑ جانا یقینی تھا، اسی کے ساتھ ایک جماعت کا خیال تھا کہ اطالیہ اس جنگ میں ناکام رہے گا اور یوروپ کی موجودہ سیاسیات متزلزل ہو جائے گی، دوسری جماعت کا خیال تھا کہ وہ کامیاب ہوگا، اس لئے مناسب یہی ہے کہ اختتام جنگ سے قبل اس کو حبش کا ایک ٹکڑا دیکر راضی کر لیا جائے ۔۔ ان صورتوں میں مناسب یہی تھا کہ ناکہ بندی وغیرہ کی کارروائی سے قبل ہی اطالیہ کو حبشہ کا ایک ٹکڑا دیکر راضی کر لیا جائے، لیکن یہ تدبیر کامیاب

نہ ہوئی اور آخرکار ناکہ بندی شروع ہوئی ۔ یہ ۱۹۳۶ء کی ابتدا کی بات ہے
مسولینی جو برطانیہ و فرانس کی ترکیبوں کو غور سے دیکھ رہا تھا آخرکار سمجھ گیا کہ اسے کیا کرنا ہے اور اس نے فوراً اطالوی سپاہ معہ جدید آلات حرب اور زہریلی گیس وغیرہ کے اسقدر تیزی کے ساتھ حبش پہونچا دی کہ لوگ حیران رہ گئے نتیجہ جو کچھ ہوا سب کو معلوم ہے ۔ ۵ مئی کو ادیس ابابا فتح ہوگیا اور شاہ حبش فرار ہوگیا
رہائن لینڈ میں ہٹلر کی کامیابی، حبش میں مسولینی کی فتح اور جنگ اسپین حقیقتاً سب ایک ہی زہریلے درخت کی شاخیں ہیں اور اس میں شک نہیں کہ اب ڈیماکریٹک حکومتیں اس کو ماننے لگی ہیں کہ بلا پس وپیش اپنے آپ کو خطرہ میں ڈالدینا بھی بجائے خود ایک قوت ہے اور اس قوت کا بہترین مظاہرہ فاسزم اور نازیزم کی طرف سے ہو رہا ہے
مسولینی کی کامیابی حبشہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ فاسسٹ جماعت کے حوصلے بڑھ گئے اور یورپ کے مختلف حصوں میں اس نے جارحانہ اقدام شروع کر دیا

اس وقت یورپ آماجگاہ ہے اس تصادم کا جس میں ایک طرف حق و قانون کی پناہ ڈھونڈھی جا رہی ہے اور دوسری طرف تیغ و تفنگ سے فیصلہ چاہا جاتا ہے ۔ اس کا نتیجہ کیا ہوگا ؟ فیصلہ دشوار ہے ، تاہم یہ یقینی ہے کہ کچھ نہ کچھ ہو کر رہیگا اور جلد ہو کر رہیگا ۔

راہب

(ایک ایکٹ کا ڈرامہ)

راہب اونچے مینار پر بیٹھا کتاب پڑھ رہا ہے :۔

"لغزش، انسانی سرشت میں داخل ہے، کون ہے جو ان لغزشوں سے مبرا ہے؟ ان کو مٹانا تو درکنار ان کا ادراک بھی مشکل امر ہے۔ کون ہے جو ایک عورت کو دیکھے اور اپنا دین و دل نہ کھو بیٹھے؟ کون ہے جو کسی دوشیزہ کو دیکھ کر اپنی روحانیت برقرار رکھ سکے"

کچھ سوچ کر آپ ہی آپ کہنے لگتا ہے :۔

"یقیناً ہمارے عیسٰے کو ضرور کوئی خطرناک عورت ملی ہوگی، مگر مجھی ایسی نہ ملی، میں تو سمجھتا ہوں آج تک جتنی عورتیں مجھے ملی ہیں سب کی سب شریف خصائل تھیں"

پھر پڑھنے لگتا ہے :۔

"اے بیٹے! اگر تو سعادت دارین چاہتا ہے تو عورت کو خطرناک خیال کر اپنی پوری طاقت سے عورت سے دور بھاگ، اس کے آگے سر نہ جھکا، عورت کی سرشت میں داخل ہے کہ مرد کا تعاقب کرے"

اوپر دیکھ کر آپ ہی آپ :۔

"میرے مینار کی چوٹی سے اچھی جگہ کوئی نہیں ہے۔ لیکن مسیح تو عورت کو بہت سخت الفاظ سے یاد کرتے ہیں۔ غالباً انھیں عورت سے ملنے کا موقع نہ ملا ہوگا"

(مینار کے نیچے سے ایک آواز) راہب! معزز راہب!

راہب — کون ہے، مجھے کون بلاتا ہے؟

آواز (نزدیک سے) ایک زائر

راہب — کیا تو ہمارے لئے کوئی ہدیہ لایا ہے؟

زائر ۔ ہاں کھجوروں کی دو ٹوکریاں

راہب ۔ صرف دو ؟ (کچھ سوچکر) خیر، اوپر آجاؤ ! (کچھ وقفہ کے بعد سیڑھیوں سے ایک سر دکھائی دیتا ہے)

زائر ۔ راہب ! معزز راہب

راہب ۔ (اپنی آواز میں اجنبیت پیدا کرتے ہوئے) معزز نوجوان مینار کے نیچے سے آوازیں دینا کوئی معنی نہیں رکھتا

زائر ۔ (ذرا اور اوپر آکر) لیکن مینار پر چڑھنا بھی کوئی آسان کام نہیں

(وہ مینار پر آکر راہب کے سامنے کھڑا ہو جاتا ہے۔ یہ ایک جوشیلا نوجوان ہے اور زائرین کے لباس میں ملبوس ہے)

آپ ہی ہیں معزز راہب ! اور یہی ہے آپ کا مقدس مینار (گھٹنوں کے بل جُھک کر) کس قدر مبارک ہے آج کا دن کہ مجھے آپ کی زیارت نصیب ہوئی

راہب ۔ نوجوان ! اگر تم احتیاط سے کام نہ لوگے تو گر پڑوگے۔ میں کوئی ایسا بڑا راہب نہیں ہوں۔ ہاں تو وہ کھجوروں کے متعلق تم نے کیا کہا تھا

زائر ۔ میں دو ٹوکریاں لایا ہوں۔ (کھڑا ہو کر کپڑوں میں سے تلاش کرتا ہے) ایک یہ اور دوسری ۔ ۔ ۔ ۔ معزز راہب، میرا خیال ہے کہ میں دوسری ٹوکری مینار کے نیچے بھول آیا ہوں

راہب ۔ (غصہ سے) تم بڑے لاپرواہ معلوم ہوتے ہو

زائر ۔ میں کل کسی کے ہاتھ بھیج دوں گا

راہب ۔ کل تم کیوں نہیں آسکتے ؟

زائر ۔ کیونکہ میں ایک راہبہ کارنیلیا کی زیارت کرنے جا رہا ہوں۔ سنا ہے کہ اُس نے تین سال سے کچھ نہیں کھایا۔

راہب ۔ (حسد سے) تو تم غلطی سے راستہ بھول کر میری طرف آگئے ہو، ہاں ہاں کارنیلیا کے پاس جلدی جاؤ ورنہ وہ مرگئی تو تمھارے لئے بہت بُرا ہوگا

زائر ۔ لیکن آپ تو کارنیلیا سے زیادہ مشہور ہیں، اسی لئے کارنیلیا کے لئے کھجوروں کی صرف ایک ٹوکری لئے جا رہا ہوں اور آپ کے لئے دو لایا ہوں

راہب ۔ ایک، دوسری کا تو صرف وعدہ ہے اور یہ کھجوریں کارنیلیا کے لئے کیوں لئے جا رہے ہو وہ تو کچھ نہیں کھاتی، مجھے افسوس ہے کہ میں نے تم سے کیوں کہا کہ احتیاط کرو ورنہ نیچے گر پڑوگے

زائر ۔ (جھک کر) خدا کے لئے برہم نہ ہوجئے، میں بہت دور سے چل کر آیا ہوں۔ یہاں پہونچنے میں پانچ سال صرف ہوگئے ہیں

راہب — تم نے راستہ میں کتنے راہبوں کی زیارت کی ؟
زائر — جتنے راستہ میں مل سکے، لیکن آپ سب سے زیادہ مقدس و بزرگ ہیں
راہب — (کچھ نرمی سے) مجھے خوشامد کی ضرورت نہیں ہے
زائر — لیکن میں تو بالکل درست کہتا ہوں۔ تمام دنیا میں آپ کی شہرت ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ آپ کو ایک نظر دیکھکر آپ کو بھلا دینا ممکن نہیں۔ ہزاروں آدمی صرف آپ کی زیارت کے لئے ہر قسم کی قربانی کرنے کو طیار ہیں۔
راہب — ہاں بہت سے لوگ لیکن وہ اپنی عقیدت کا نذرانہ کھجوروں کی صرف دو ٹوکریوں سے کرتے ہیں، نہیں بلکہ ایک سے، اور دوسری صرف وعدہ کی صورت میں
زائر — لیکن میں تو غریب ہوں۔ کھجوریں آپ نے مینار کے نیچے بکتی ہیں، اور وہ کچھ بہت زیادہ گراں قیمت بھی نہیں۔
راہب — ہوں — تو یہ وجہ ہے کہ میرے پاس آج کل کھجوریں ہی لائی جاتی ہیں۔ میں اکثر حیران ہوا کرتا تھا۔ نوجوان! اگر تم غریب ہو تو تم نے پانچ سال سفر میں کس طرح صرف کئے ؟
زائر — میں نہیں جانتا۔ معزز راہب! دنیا بہت عظیم الشان ہے اور آزادی بہت اچھی
راہب — یہ تو بہت پرانا خیال ہے اس سے یہ تو ظاہر نہیں ہوسکتا کہ تم زائروں کے لباس میں کیوں ملبوس ہو
زائر — شاید آپ کو معلوم ہو کہ آجکل سفر کرنے کا آسان طریقہ صرف یہی ہے۔ ایک زائر بہت سی چیزیں بغیر قیمت ادا کئے دیکھ سکتا ہے۔ اگر اُسے قیمت ادا کرنی بھی پڑے تو وہ کچھ زیادہ نہیں ہوتی
راہب — کیا تمھیں کھجوریں بھی ارزاں مل گئی ہیں ؟
زائر — آپ کے لئے مخصوص کھجوریں، ہوتی ہیں جو کچھ کم درجہ اور ——
راہب — (غصہ سے) کیا یہ کم درجہ ہوتی ہیں ؟ میں اس کے متعلق ضرور دریافت کروں گا۔ میرے الفاظ یاد رکھو کہ کل تک وہ دوکان یہاں نہیں رہے گی۔ میں اُنھیں کم درجہ کھجوریں رکھنے کا مزا چکھاؤں گا
زائر — میرا خیال ہے کہ آپ کوئی سخت بددعا نہیں دیں گے۔
راہب — خیر تمھیں اس سے کیا واسطہ۔ ہاں، تو تم زائرین کے لباس میں اس لئے سفر کرتے ہو کہ تمھارا خرچ کم ہو۔ کس قدر نفرت انگیز عمل ہے۔ اچھا اب تم اس مینار سے جلد اُتر جاؤ۔ تم نے اپنی کھجوروں — کم درجہ کھجوروں کی قیمت سے زیادہ گفتگو کرلی ہے۔ جلد اُتر جاؤ اور کارنیلیا کے پاس جاؤ، میں تمھیں دیکھنا نہیں چاہتا
زائر — آپ بھی تو اس مینار سے نیچے اُتریے، دیکھئے موسم بہار میں دنیا کیسی خوبصورت ہوجاتی ہے
راہب — میں خوبصورتی سے نفرت کرتا ہوں
زائر — نہیں، آپ ضرور یہاں سے اُتر کر نیچے جائیے اور دنیا کے عجائبات دیکھئے، اگر میں اپنی تمام عمر سفر میں

صرف کردوں تب بھی ان عجائبات کو نہیں دیکھ سکتا

راہب ۔۔ میں ان عجائبات کی کوئی پرواہ نہیں کرتا

زائر :۔۔ نہیں آپ غلطی پر ہیں۔ کیا آپ پہاڑوں پر گھوم کر جانے والی سڑک کی خوبصورتی اور دل آویز و دلکش میدانوں کی پرواہ نہیں کرتے ؟ کیا آپ اس مینار کے مقابلہ میں وہاں رہنا پسند نہیں کریں گے ؟

راہب ۔۔ ہرگز نہیں

زائر :۔۔ (کچھ وقفہ کے بعد) آپ تمام راہبوں میں سب سے زیادہ عجیب ہیں۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ آپ میں ایسی قربانی کے لئے طاقت کہاں سے آئی ؟ کیا یہ سب کچھ مذہبی یقین نے سکھایا ہے ؟

راہب ۔۔ اگر تم تمام رات یہاں رہو تب بھی نہیں بتاؤں گا

زائر :۔۔ یہ مذہبی یقین ہے، میں اچھی طرح جانتا ہوں، اس کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا

راہب :۔ کارنیلیا تمھارا انتظار کرتی ہوگی، جاؤ، جلدی جاؤ

زائر :۔۔ کیا آپ اس مینار سے میرے ساتھ نیچے نہیں اتریں گے ؟

راہب :۔۔ ہرگز نہیں۔ میں یہاں نامعلوم عرصہ تک بیٹھا رہوں گا

زائر :۔۔ اس کا مجھے یقین نہیں آتا

راہب :۔ اگر یقین نہیں آتا تو سفر ختم کردو اور میری طرح مینار پر بیٹھ رہو

زائر :۔۔ میرے لئے یہ ممکن نہیں۔ میں آخری سانس تک سفر کرتا رہوں گا

راہب :۔۔ اچھا تو جاؤ ۔۔۔ کارنیلیا کے پاس جاؤ

زائر :۔۔ بیشتر اس سے کہ میں جاؤں میرے لئے دعائے خیر کیجئے

راہب :۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔ تم میری دعا کے قابل نہیں ہو

زائر :۔۔ جب تک آپ میرے لئے دعائے خیر نہیں کریں گے تب تک نہیں جاؤں گا۔ میں اسے حاصل کرنے کے لئے پانچ سال سے سفر کر رہا ہوں

راہب :۔۔ اچھا تو تم بھی میری طرح یہاں نامعلوم عرصہ تک بیٹھے رہو

(دور سے باجہ بجنے کا شور سنائی دیتا ہے)

زائر :۔۔ یہ کیا ؟

راہب :۔۔ مجھے کیا معلوم

زائر :۔۔ (مینار سے نیچے دیکھتے ہوئے) کوئی جلوس ہے، گھوڑے اور سپاہی ساتھ ہیں، درمیان میں ایک

سنہری گاڑی کھڑی ہے۔ یہ جلوس ضرور کسی بادشاہ کا ہوگا

راہب:۔ (انگڑائی لیتے ہوئے) ہوگا

زائر:۔ مجھے جلد نیچے جا کر اسے دیکھنا چاہیئے

راہب:۔ ہاں جلد جاؤ خدا حافظ

(نیچے اترتے ہوئے) خدا حافظ

راہب:۔ (انگڑائی لیکر ایک کھجور اٹھاتا ہے اور آہستہ آہستہ دیکھتا ہے۔ کچھ عرصہ کے بعد غصہ میں آکر زائر کی طرف پھینک دیتا ہے) بے وقوف! عجائبات دنیا۔ اونہہ!

کتاب کھول کر پڑھتا ہے:۔

"بے وقوفوں کی باتیں مت سنو، "جواب جاہلاں باشد خاموشی" پر عمل کرو"

(اوپر دیکھ کر) کتنی اچھی بات کہی ہے! (شور زیادہ قریب آجاتا ہے) کیا ایسی فضول آوازوں سے مجھے کبھی نجات نہ ملے گی؟ —— آہ!

دوبارہ پڑھتا ہے:۔

"زندگی آگ ہے جسے عورت بھڑکاتی ہے"

(دوبارہ شور کی آواز سنکر) برا ہو اس آواز کا۔ میں نہیں چاہتا کہ میرے خیال کی دنیا میں یوں خلل ڈالا جائے

(بہت نیچے سے ایک آواز) بادشاہ سلامت کے لئے راستہ صاف کرو

راہب:۔ دنیا میں کہیں بھی امن نہیں، خیر——

وہ پھر پڑھنے لگتا ہے:۔

"عورت صبح کے وقت متبسم نظر آتی ہے اور تمہارا دین و دل لے جاتی ہے، شام تک تمہاری عزت و شہرت کو خاک میں ملا دیتی ہے۔ ستارے چمکنے سے پہلے تم تباہ ہو جاتے ہو اور جب ......"

شاہی مسخرا:۔ بادشاہ سلامت کے لئے راستہ صاف کرو

(راہب کتاب بند کر دیتا ہے اور بالکل سیدھا بیٹھ جاتا ہے جیسے کہ عبادت کر رہا ہو)

شاہی مسخرا:۔ بادشاہ سلامت کے لئے راستہ------

راہب:۔ تم اس طرح چیخنے کی بجائے بادشاہ کو سیڑھیاں چڑھنے میں مدد کیوں نہیں دیتے؟

مسخرا:۔ بادشاہ سلامت------

بادشاہ:۔ (مینار کے اوپر آکر) یہ بے وقوف تو راہب کے امن میں خلل کیوں ڈالتا ہے؟

راہب :۔ میں نے بھی اسے چپ ہونے کے لئے کہا تھا

بادشاہ :۔ اچھا، آپ ہیں معزز راہب اور یہ ہے آپ کا پاکیزہ مینار!

راہب :۔ ہاں

بادشاہ :۔ آپ نے تمام دنیا کو حیرت میں ڈال دیا ہے

راہب :۔ ہاں

بادشاہ :۔ کیا آپ کو کوئی دنیاوی خواہش نہیں ہے ؟

راہب :۔ ہاں، نہیں ہے۔

راہب :۔ یہ کون ہے ؟

بادشاہ :۔ شاہی مسخرا

راہب :۔ میں حیران ہوں کہ تم اس کی معیت کس طرح برداشت کر سکتے ہو ؟

بادشاہ :۔ بادشاہ کو ہر چیز برداشت کرنی پڑتی ہے۔ معزز راہب شاید آپ ہمیں دولتمند اور خوش نصیب خیال کرتے ہیں

راہب :۔ نہیں، میں تمھیں بدنصیب سمجھتا ہوں

بادشاہ :۔ ہاں میں بدنصیب ہوں۔ بادشاہ ہونے کی تکلیف سے زیادہ کوئی تکلیف نہیں ہے۔ میں موت کو شاہی زندگی پر ترجیح دیتا ہوں

راہب :۔ (انگڑائی لیکر) کیا آپ کسی ضروری کام کے لئے آئے ہیں

بادشاہ :۔ میں آپ کی مدد چاہتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ یہ مینار چھوڑ کر میرے ساتھ چلیں۔ سوائے اس مسخرہ کے میرا کوئی دوست نہیں، کوئی ایسا نہیں جس پر میں اعتبار کر سکوں اور اُسے اپنا دل دکھا سکوں۔ اس لئے آپ نیچے اُتریں اور ہماری مدد کریں۔ مینار کو اسی طرح چھوڑ دیئے اور نیچے آکر ہماری روحانیت کو بلند کیجئے میں آپکو کوئی دنیاوی انعام نہیں دوں گا کیونکہ میں جانتا ہوں آپ بھی میری طرح دولت کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہوں گے۔ یہ ہے وہ عظیم الشان کام جس کو آپ اور صرف آپ انجام دے سکتے ہیں

راہب :۔ کیا تمھارا ملک بہت بڑا ہے ؟

بادشاہ :۔ ہاں بہت بڑا

راہب :۔ کیا تمھارے ملک میں کوئی بھی ایسا نہیں جو بدی کو دور کر سکے

بادشاہ :۔ کوئی نہیں۔ میں نے برسوں بے سود تلاش کی۔ لوگوں کے دلوں میں صرف برائی بھری ہوئی ہے

راہب :۔ میں اس پر یقین نہیں کر سکتا

بادشاہ:۔ مگر یہ بالکل سچ ہے

راہب:۔ ہو گا مگر میں مینار سے نیچے نہیں اُتر سکتا، میں یہاں نامعلوم مدت تک بیٹھا رہوں گا

(سیڑھیوں میں سے عورت کی آواز) راہب! معزز راہب!

راہب:۔ خدایا، آج میری گلوخلاصی ہو گی یا نہیں۔ عین اُسوقت جبکہ میں یہ دعا کرنے لگا تھا ایک عورت آگئی

آواز:۔ معزز راہب! ہم اوپر آرہے ہیں، یہ مینار بہت خطرناک ہے

راہب:۔ یہاں تمہارے لئے کوئی جگہ نہیں ہے

آواز:۔ میری مالکہ آپ کو دیکھنے کی بہت خواہشمند ہے

راہب:۔ اپنی مالکہ سے کہدو کہ نیچے چلی جائے ورنہ میں دھکا دیکر نیچے گرادوں گا

پراکلا:۔ (اوپر آکر) کیا واقعی آپ زیارت کرنے والی عورتوں کو دھکا دیکر نیچے گرادیتے ہیں؟

راہب:۔ نہیں میرا یہ مطلب نہیں۔ میں تو کہتا ہوں کہ یہاں بیک وقت چار آدمی نہیں ٹھہر سکتے، جگہ بالکل نہیں ہے

اپنی مالکہ سے یہ کہدو

پراکلا:۔ میری مالکہ اس کو غلط سمجھے گی

راہب:۔ پچھلے مہینے ایک عورت چار بچوں کو لیکر مجھے دیکھنے آئی لیکن صرف دو کے ساتھ واپس گئی، تم سمجھیں؟

بادشاہ:۔ (مسخرے سے) اُن کو نیچے اُتاردو اور آؤ ہم واپس چلیں

مسخرا:۔ نیچے جاؤ بادشاہ سلامت واپس جانا چاہتے ہیں

(پراکلا نیچے کسی سے گفتگو کرتی ہے)

پراکلا:۔ میری مالکہ کہتی ہے کہ وہ نیچے نہیں جائے گی۔ کاش میں ایسے خوفناک مینار پر نہ ہوتی۔ اگر تم اوپر آنے نہ دوگے

تو میں گر پڑوں گی

راہب:۔ آہ! میں کیا کروں، تم اوپر آجاؤ لیکن حیران ہوں کہ تم بیٹھو گی کہاں

پراکلا:۔ یہ بالکل معمولی بات ہے، میں تمہارے پاؤں پر اس طرح بیٹھ جاؤں گی

(اُس کے پاؤں پر بیٹھ کر اپنا سر جھکا لیتی ہے)

راہب:۔ نامعقول!

پراکلا:۔ لیکن مجھے تو کسی نہ کسی طرح توازن قایم رکھنا ہے، پھر کیا کروں؟

راہب:۔ (بادشاہ سے) کیا تم مجھے اس مصیبت سے نہیں بچا سکتے؟

بادشاہ:۔ میں دوسروں کے معاملات میں خواہ مخواہ دخل نہیں دیا کرتا۔ دوسری عورت کو بھی اوپر بلا لو تاکہ ہم چلے جائیں

(یوڈوشیا سے) آپ اوپر آجائیں

راہب :۔ آپ کو یہ کہنے کا کوئی حق حاصل نہیں

بادشاہ :۔ ہم یہاں تمام رات نہیں ٹھہر سکتے۔ علاوہ اس کے چونکہ یہ نیچے نہیں جائے گی اس لئے اسے اوپر آجانا چاہئے

یوڈوشیا :۔ (اوپر آتے ہوئے) پراکلا کہاں ہے؟ (اس کو دیکھ کر) ہاں وہ ہے

راہب :۔ محترمہ! یہ میرا قصور نہیں کہ تمھاری خادمہ عقل سے خالی ہے

پراکلا :۔ بیگم! میں نے یہ عرض اپنے آپ کو بچانے کے لئے کیا ہے ورنہ مجھے تو مینار سے نیچے گرنے کا اندیشہ تھا

راہب :۔ (انگڑائی لیکر) میری گزشتہ زندگی میں اس طرح کبھی بے عزتی نہیں کی گئی۔ آہ میں کتنا بدبخت ہوں!

پراکلا :۔ آپ بگڑتے کیوں ہیں۔ میں ابھی اُٹھ جاؤں گی

بادشاہ :۔ راہب! خدا حافظ! مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کے پاس دو بدطینت اور ناسمجھ عورتیں چھوڑے جا رہا ہوں

(مسخرا نیچے اُترتا ہے اور اپنے مالک کا انتظار کرتا ہے)

یوڈوشیا :۔ (تیزی سے) پراکلا! راہب کو چھوڑ کر الگ کھڑی ہو جاؤ

(پراکلا اپنی خواہش کے خلاف اُٹھ کر الگ کھڑی ہو جاتی ہے)

بادشاہ سلامت! ہم نہ بدطینت ہیں اور نہ ناسمجھ، میری خادمہ ابھی بچہ ہے۔ وہ ابھی درست اور نادرست میں امتیاز نہیں کر سکتی میں اس راہب کے لئے بہت دور سے آئی ہوں۔ آپ ہمیں ناسمجھ اور بدطینت لیکر انصاف نہیں کر رہے ہیں۔ دنیا کی بدنامی اور بے عزتی عورتیں نہیں کرتیں بلکہ ہمیشہ مرد کیا کرتے ہیں

بادشاہ :۔ معاف فرمایئے، واقعی آپ جیسی خوبصورت عورتیں ہمیشہ عقلمند اور نیک طینت ہوا کرتی ہیں

یوڈوشیا :۔ (نرمی سے) میں آپ کی عزت افزائی کا شکریہ ادا کرتی ہوں

راہب :۔ ذرا ہوش سے کام لو۔ ایسی نادانیوں کے لئے اس مینار پر جگہ نہیں ہے

بادشاہ :۔ ہاں یہ درست ہے، اے خاتون! خدا حافظ! معزز راہب! خدا حافظ، شاید کچھ عرصہ کے بعد تم سمجھ جاؤ کہ اس طرح بیٹھے رہنے سے خلق خدا کی مدد کرنا کہیں زیادہ بہتر ہے۔ معزز لیکن غیر مفید راہب! خدا تمھاری مدد کرے

راہب :۔ اور تمھاری بھی اے بدنصیب اور مجھ سے زیادہ غیر مفید بادشاہ

(بادشاہ نیچے اُتر جاتا ہے)

راہب :۔ کیا تم بہت دور سے آرہی ہو؟

یوڈوشیا :۔ ہاں بہت دور سے۔ میں بہت دور پہاڑی پر رہتی ہوں۔ میرا نام یوڈوشیا ہے لوگ مجھے اچھی طرح جانتے ہیں

راہب :۔ تمھاری شہرت کس بات میں ہے؟

یوڈوشیا:۔ کس بات میں؟ آپ بھی عجیب انسان ہیں۔ میں اپنے ــــ اپنے حسن کی وجہ سے مشہور ہوں۔ کیا آپکے خیال میں میں خوبصورت نہیں ہوں؟

راہب:۔ یہ مجھ سے کیوں پوچھتی ہو؟

یوڈوشیا:۔ اس لئے پوچھتی ہوں کہ اگر میری غلط فہمی ہو دور ہو جائے۔ اکثر لوگ مجھ سے کہتے ہیں کہ تم بہت زیادہ حسین ہو لیکن وہ سب راہب ــــ آپ جیسے راہب نہیں۔ میں چاہتی ہوں کہ آپ مجھے بتائیں

راہب:۔ اچھا تو میں کہے دیتا ہوں کہ تم بہت حسین ہو۔ میں نے بہت عورتیں دیکھی ہیں لیکن تم ایک خاص کشش رکھتی ہو جس کا سبب غالباً تمہاری دوشیزگی ہے

یوڈوشیا:۔ میں خوش ہوں کہ آپ مجھے دوشیزہ خیال کرتے ہیں

راہب:۔ میرا مطلب یہ نہیں۔ میں تو صرف یہ کہتا ہوں کہ تم دوشیزہ معلوم ہوتی ہو

یوڈوشیا:۔ آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ آپ کا لہجہ ضرورت سے زیادہ سخت ہے

راہب:۔ تو کیا تم نرم لہجہ میں گفتگو کرنے آئی ہو؟ اچھا تو یہ بتاؤ تم کیا چاہتی ہو؟

یوڈوشیا:۔ شاید آپ جانتے ہوں کہ مرد عموماً بے وقوف ہوتے ہیں اور اُن میں حیوانیت بدرجۂ اتم موجود ہوتی ہے اُنکو خوش کرنا کوئی مشکل کام نہیں۔ اس لئے میں ایسے لوگوں سے اپنی خوبیاں سنکر تنگ آ گئی ہوں۔ اب میں ایسے شخص سے ملنا چاہتی ہوں جو میرے حسن کا تو قائل ہو لیکن مجھے محبت کرنے سے نفرت کرتا ہو

راہب:۔ یوڈوشیا! تم غلطی پر ہو۔ کیا تم مجھے بھی مسخر کرنا چاہتی ہو۔ لیکن ایک راہب کو مسخر کرنا آسان کام نہیں

یوڈوشیا:۔ معزز راہب! ایسا نہ کہو میں فوراً معلوم کر لیتی ہوں کہ میرے ساتھ گفتگو کرنے والا شخص مجھ سے محبت کرتا ہے یا نہیں اور جو مجھ سے محبت کرنے لگتا ہے وہ وہی کرتا ہے جو میں کہتی ہوں

راہب:۔ لیکن میں تو ان میں نہیں ہوں

یوڈوشیا:۔ آپ بھی اُنہی میں سے ایک ہیں

راہب:۔ میں اس سے بالکل انکار کرتا ہوں

یوڈوشیا:۔ (اپنی نگاہیں اُس کی نگاہوں میں ڈال کر) راہب! کہدو کہ یہ غلط ہے

راہب:۔ (غصہ سے بھر جاتا ہے) تم بڑی شریر ہو۔ تم میں اتنی ہمت کہاں سے آئی کہ یہاں آکر میری بزرگی کو داغدار کرو۔

پراکلا:۔ (اردگرد نظر دوڑا کر) مجھے تو بھوک لگی ہے

راہب:۔ وہ کھجوروں کی ٹوکری اسے دے دو ــــ ہاں، تم میں اتنی ہمت کہاں سے آئی کہ یہاں آؤ اور مجھ پر اپنا جادو چلاؤ

یوڈوشیا:۔ نہیں، جادو نہیں ہے۔ یہ میری ایک طاقت ہے جس کے استعمال کرنے میں مجھے بالکل شرم محسوس نہیں ہوتی۔ راہب! میں تمھیں مجبور کر سکتی ہوں کہ تم میرے ساتھ محبت کرو اور میں اس کا تجربہ کرنا چاہتی ہوں، اچھا، آؤ میرے ساتھ مینار سے نیچے اُترو

راہب:۔ کیا؟

یوڈوشیا:۔ مینار سے نیچے اُترو۔ آؤ میرے ساتھ نیچے چلو

راہب:۔ مینار سے نیچے اُتروں؟ ایسا ہونا ناممکن ہے۔ میں یہاں نامعلوم عرصہ تک بیٹھا رہوں گا

(مسکراتا ہوا اُس کی طرف دیکھتا ہے)

یوڈوشیا:۔ میں نے تم جیسا خوفناک انسان کبھی نہیں دیکھا۔ تم ایک مسرور زندگی کو جس میں تمھاری خواہش کے مطابق سب کچھ میسر ہو سکتا ہے اس مینار کی زندگی پر قربان کر رہے ہو۔ میرا خیال ہے کہ مذہبی جوش تمھیں اس پر مجبور کرتا ہے، لیکن میں تو اس خیال سے ڈرنے لگتی ہوں

راہب:۔ ڈرنے کی کیا ضرورت ہے؟ تم اپنی زندگی بسر کرو اور میں اپنی

یوڈوشیا:۔ مگر میں اپنی زندگی سے تنگ آگئی ہوں۔ میرا راستہ آسان نہیں۔ تاہم مصائب اور تلخ تجربات کے بغیر مسائلِ زندگی کو حل نہیں کیا جا سکتا

راہب:۔ یوڈوشیا! مجھے تم پر رحم آتا ہے، اگر تم اپنی زندگی میں تھوڑی تبدیلی کر لو تو؟

یوڈوشیا:۔ اپنی زندگی میں تبدیلی پیدا کر لوں؟ ہرگز نہیں۔ ایسی زندگی میری سرشت میں داخل ہو چکی ہے۔ میں آخر وقت تک ایسی ہی زندگی بسر کروں گی ۔۔۔ ہم جا رہے ہیں، خدا حافظ معزز راہب!

راہب:۔ خدا حافظ، یوڈوشیا!

(وہ اُس کی طرف دیکھتی ہے اور چلی جاتی ہے)

شام ہو گئی ہے اور چند ستارے بھی آسمان پر نظر آ رہے ہیں۔ راہب کتاب کھولتا ہے۔

راہب پڑھتا ہے:۔

"جب ایک عورت تبسم خوشی سے معمور تمھارے سامنے آتی ہے تو کیا تم ۔۔۔۔۔۔۔۔

(جلد کتاب بند کر دیتا ہے) اندھیرا ہو گیا ہے، اب میں نہیں پڑھ سکتا"

اندھیرا ہو جاتا ہے اور مینار کے گرد ایک بگولہ سا نظر آتا ہے۔ اُس میں سے طرح طرح کی آوازیں آتی ہیں۔

راہب سنبھل کر بیٹھ جاتا ہے اور گانے کی آواز میں کہتا ہے:۔

"کتنی ہی سخت آندھیاں آئیں لیکن صبر کو کسی روشنی کی ضرورت نہیں جو اُس کا راستہ روشن کرے

ہر بات مجھے صبر کی تلقین کرتی ہے

جنگ کے دوران میں بہت نقصان ہوتا ہے لیکن کامیابی زیادہ نقصان اٹھانے والے کے پاؤں چومتی ہے"

(ایک عجیب آواز) راہب! خوش الحانی سے گاؤ

راہب :۔ میں خوش الحانی سے گا رہا ہوں۔ میری روح رات ہی کے وقت بیدار ہوتی ہے

(گاتا ہے) "خوشی مذہبی یقین پختہ ہو جانے کے بعد حاصل ہوتی ہے اور امن تیری تلخی کو تباہ کر دے گا"

آواز :۔ اس سے بھی زیادہ خوش الحانی سے گاؤ

راہب :۔ جس طرح میں چاہوں گا گاؤں گا

(گاتا ہے) "جو لوگ اپنے داغ عصیاں کو آنسوؤں سے دھوتے ہیں وہ خوش رہیں گے۔ وہ موت کے دروازہ پر کھڑے ہیں لیکن خوف محسوس نہیں کرتے"

آواز :۔ راہب! ٹوٹے ہوئے ساز کی طرح گانا بند کر دو اور اچھی آواز میں گاؤ

راہب :۔ میں تو نہایت خوش الحانی سے گا رہا ہوں

آواز :۔ خوش الحانی سے ؟ (زور سے ہنسی کی آواز مینار کو ہلا دیتی ہے) تمھیں اس سے بھی زیادہ خوش الحانی سے گانا چاہیئے

راہب :۔ کیوں ؟

آواز :۔ آنے والے کا خیر مقدم کرنے کے لئے

راہب :۔ اب میرے پاس کون آئے گا ؟

بہت سی آوازیں :۔ ابلیس

راہب :۔ ابلیس ؟ کیا یہ شور اسی کی علامت ہے کہ ابلیس آرہا ہے ؟ میں بالکل نہیں ڈرتا۔ ابلیس پہلے بھی آتا رہا ہے اب بھی آجائے۔ وہ کہاں ہے ؟ آوازیں (آہستہ سے) وہ آرہا ہے راہب! وہ آرہا ہے

راہب :۔ اُسے آنے دو

ابلیس (راہب کے دائیں ہاتھ ظاہر ہوتا ہے) راہب! شکریہ، میں آگیا ہوں

(ابلیس اونچا جوان اور خوبصورت معلوم ہو رہا ہے۔ اُس کے سر پر بالوں کی خوبصورت ٹوپی ہے وہ آہستہ آہستہ احتیاط سے بول رہا ہے۔ لباس کافی چکدار ہے۔ ایک دوست اُس کے ساتھ ہے۔ وہ سیاہ رنگ اور غصہ سے بھرا ہوا ہے۔ تینوں کے چہرہ پر زرد روشنی پڑ رہی ہے)

راہب :۔ میرا سلام قبول فرمایئے

ابلیس: — اور میرا بھی ------- اے میرے دوست!

(وہ جھک جاتا ہے)

راہب: — اب تم پہلی دفعہ سے بہت اچھے معلوم ہو رہے ہو

ابلیس: — سوچ لینے دو — ہاں، پچھلی دفعہ میں بوڑھا طوطا بنکر آیا تھا

راہب: — نہیں، تم چھچھوندر کی شکل میں آئے تھے

ابلیس: — ہاں ٹھیک ہے۔ مجھے یاد ہے کہ جب میں بولتا تھا تو تم خوفزدہ ہو جاتے تھے

راہب: — یہ تمھاری انتہائی بے وقوفی تھی۔ میں حیران تھا کہ تم یہاں کیونکر آ گئے

ابلیس: — ہا ہا۔ (دوست سے) کیا تمھیں یہ معمولی سا واقعہ یاد ہے:

دوست: — تمہارا خیال ہے کہ میں تمھارا ہر فضول واقعہ یاد رکھوں

ابلیس: — اچھا تو پہلے پہل تم خوفزدہ ہو گئے تھے — ہا ہا

راہب: — یہ تمھارے لئے جائز نہ تھا

ابلیس: — اب میں یہاں کیا کرنے آیا ہوں!

راہب: — میں نہیں جانتا کہ تم یہاں اسوقت کیوں آئے ہو۔ آج میرے پاس کافی مہمان آئے

ابلیس: — انہی زائرین کی وجہ سے میں یہاں آیا ہوں۔ میں — نہیں ہم ------

دوست: — مجھے گفتگو میں شامل نہ کرو

ابلیس: — بہت اچھا، میں تمھارا آخری مہمان ہوں۔ کیا تمھیں معلوم ہے کہ اُن کو بھی میں نے ہی بھیجا تھا

دوست: — تم جھوٹ کہتے ہو، وہ خود یہاں آئے تھے

ابلیس: — نہیں میں نے تجویز کی تھی کہ وہ یہاں آئیں، ہاں، تو تم نے ان سے کیا کہا

راہب: — یہی کہ میں یہاں نامعلوم عرصہ تک بیٹھا رہوں گا

ابلیس: — تو تم پر کسی کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ بالکل غلط۔ پہلے زائر کی باتوں نے بھی تم پر اثر کیا، بادشاہ کا اصرار بھی اثر انداز ہوئے بغیر نہیں رہا ------ خیر، یہ ذکر چھوڑو — جب ہم یوڈوشیا --------

راہب: — (غصہ میں) چپ رہو — بدمعاش کہیں کا، یوڈوشیا کا نام نہ لے

ابلیس: — تم بہت مغرور ہو۔ تمھارا خیال ہے کہ تم اس مینار پر بیٹھ کر دوسروں سے زیادہ خدا کو خوش کر سکتے ہو۔ تم یہاں بیٹھ کر خیال کرتے ہو کہ تمھارا کام ختم ہو چکا۔ یہ سب کچھ دکھاوا ہے، دھوکا ہے، فریب ہے، تم دنیا میں اپنے آپ کو مشہور کرنا چاہتے ہو کہ لوگ تمھاری تعریف کریں۔ تم محض لوگوں کو دکھانے کے لئے یہاں بیٹھے ہو۔ یہ

سب کچھ بے فایدہ ہے۔ فطرت مجبور ہے کہ تم سے بدلہ لے اور تمھارا غرور و تکبر خاک میں ملا دے

راہب:- غرور نہیں، یہ سب کچھ عادت کی وجہ سے ہے

ابلیس:- کیا؟

راہب:- ہاں، عادت! تم میرے مذہبی یقین پر تعجب کرتے ہو اور سمجھتے ہو کہ میرا غرور بے فایدہ ہے۔ میں تمھیں بتا دینا چاہتا ہوں کہ یہ مذہبی یقین نہیں بلکہ عادت ہے۔ اگر مجھ میں طاقت ہوتی تو میں ضرور مینار سے نیچے اُترتا۔ میں پہلے زائر کے ساتھ پہاڑوں کی خوبصورت گھومتی ہوئی سڑکوں پر جاتا۔ میں بادشاہ کی مدد کرتا۔ میں یوڈوشیا۔۔۔ آہ! یوڈوشیا کے ساتھ بھی جاتا لیکن میں اپنی عادت سے مجبور ہوں۔ مجھ میں اتنی طاقت اور ہمت نہیں کہ میں مینار سے نیچے اُتروں۔ میری زیارت کرنے والے لوگ مجھ سے زیادہ نیک ہوتے ہیں۔ ایک طوائف جس کا مقصد روپیہ کمانے کے سوا کچھ نہیں ہوتا، ایسے شراب پئے ہوئے چاہنے والے کے ساتھ یہاں آتی ہو لیکن بزرگی میں مجھ سے زیادہ ہوتی ہے۔ میں نے یہ زندگی عالم شباب میں شروع کی تھی۔ اب میں خواہ غلطی پر ہوں یا صحیح راستہ پر، خواہ اس کا کوئی فایدہ ہو یا نہ ہو اس زندگی کو ترک نہیں کر سکتا۔ میں کسی دوسرے ماحول میں زندہ نہیں رہ سکتا۔ میں یہاں نامعلوم عرصہ تک بیٹھا ہونگا۔ تمھیں یہاں اُسوقت آنا چاہئے تھا جبکہ میں نے یہ زندگی شروع کی تھی

ابلیس:- لیکن عالم شباب کے جوش پر قابو حاصل کرنا میری طاقت سے باہر ہے

راہب:- خیر، اب یہ بالکل بے وقت ہے۔ اب میری عادت ہوگئی ہے اس لئے میری بقیہ زندگی بھی یہیں بسر ہوگی۔

ابلیس:- میں اسے ماننے کے لئے طیار نہیں۔ عادت تو اتنی سخت نہیں ہوا کرتی

راہب:- پہلے زائر سے کہکر دیکھو کہ اپنا سفر ترک کردے، بادشاہ سے کہو کہ حکومت چھوڑدے۔ یوڈوشیا سے کہو۔۔۔ لیکن اس پر عمل نہ کرنا ۔۔۔ کہ اپنی دلوں پر قابو حاصل کرنے والی طاقت کو ترک کردے، پھر دیکھو وہ کیا کہتے ہیں

ابلیس:- لوگوں کے خیالات عموماً بدل جاتے ہیں

راہب:- ایک شخص کی زندگی میں فوراً انقلاب برپا کردو تم دیکھوگے کہ چند روز میں پھر اسی راستہ پر آجائیگا۔ اس رات میرے مینار کو توڑدو، تم مجھے چند روز میں کسی دوسرے مینار پر دیکھوگے۔ اب تم جاؤ میں تھک گیا ہوں، اور مجھے گفتگو کی ہمت نہیں۔ جاؤ اور میرے مُریدوں کو بہکاؤ اور دیکھو وہ کیا کہتے ہیں۔ لیکن اب یہاں نہ ٹھہرو۔ میں بہت تھک گیا ہوں۔

(ابلیس چلا جاتا ہے)

راہب:- اُف، کسقدر تکلیف دہ دن تھا۔ شکر ہے کہ سب چلے گئے۔۔۔ رنج کے بعد خاموشی اور خاموشی کے بعد مکمل راحت ہوتی ہے۔ اس اندھیری رات میں ۔۔۔ آہ! یوڈوشیا، تو مجھے بے وقت کیوں ملی ۔۔۔ اب مجھے سو جانا چاہئے ۔ سو جانا چاہئے (آنکھیں بند کرلیتا ہے اور بڑبڑاتا ہے) میں یہاں ایک نامعلوم عرصہ تک بیٹھا رہونگا ۔۔۔ (خاموشی)

— پردہ —

(ایف سلیڈن سمتھ)   مترجمہ **افضل** ۔۔۔ گڑھا - جالندھر

ریاستوں کی آزادی وفاق کے نقطۂ نظر سے

ریاستوں کے متعلق شرکت وفاق کے بارہ میں اسوقت تک جتنی رائیں ظاہر کی گئی ہیں ان کو دیکھ کر بے اختیار یہ مصرعہ یاد آجاتا ہے کہ :- توکہے گبر مجھے، گبر مسلماں مجھ کو ---- درانحالیکہ اگر انصاف سے دیکھا جائے تو معلوم ہو سکتا ہے کہ اسوقت ریاستوں کے سامنے "کفر و ایمان" سے زیادہ من و تو کا جھگڑا درپیش ہے اور ان کو اسکے فیصلہ کا کوئی موقعہ نہیں دیا جاتا۔ حقیقت یہ ہے کہ ریاستوں کے طرز عمل کے متعلق برطانیہ عظمیٰ اور برطانیۂ ہند دونوں جگہ سخت غلط فہمی پیدا ہو گئی ہے ایک طرف تو ریاستوں پر یہ الزام قایم کیا جاتا ہے کہ وہ "مکمل خود مختاری" کا مطالبہ کر کے صد درجہ خود غرضانہ پالیسی اختیار کرنا چاہتی ہیں اور دوسری طرف یہ کہا جاتا ہے کہ شرکت وفاق سے وہ اپنے جائز حقوق ملکیت کو بھی ہاتھ سے دینے پر آمادہ ہیں۔ لیکن ہمارے نزدیک یہ دونوں الزام بے بنیاد ہیں

پہلے الزام کی لغویت تو اس سے ظاہر ہے کہ ریاستوں کے نقطۂ نظر سے "خود مختاری" کا تصور ہی بالکل بے معنی چیز ہے۔ کیونکہ جیسا سر ہنری مین نے ۱۸۶۴ء کے مقدمۂ کاٹھیاوار کے سلسلہ میں ظاہر کیا ہے، "خود مختاری" کوئی ایسی چیز نہیں جس کے درجے متعین ہو سکیں۔ ہندوستانی ریاستیں صحیح معنے میں اسی وقت "خود مختار" کہلائی جا سکتی ہے جب شہنشاہ ہند سے ان کے تعلقات اطاعت و فرمانبرداری محو ہو جائیں، ازروئے معاہدات تاج سے جو رشتہ قایم ہے اسے توڑ دیں اور برطانوی حکومت سے بالکل قطع تعلق کر کے خارجی مدافعت اور اندرونی حفاظت کی تمام پیچیدگیوں کی ذمہ داری اپنے سر لے لیں۔ پھر جب ریاستیں اس عمل کی اہلیت نہیں رکھتیں اور نہ نظریہ کے لحاظ سے ایسے مناسب سمجھا جا سکتا ہے تو پھر یہ کہنا کہ ان کا مطالبۂ خود مختاری خود غرضی پر مبنی ہے کیونکر درست ہو سکتا ہے۔ اس پر یہ اعتراض ضرور ہو سکتا ہے کہ خود مختاری کے ایسے وسیع معنی لینے کی ضرورت نہیں، بلکہ دیکھنا یہ ہے کہ کیا ریاستوں کی یہ کوشش نہیں ہے کہ وہ حکومت بالادست کی گرفت سے آزاد ہو جائیں اور کیا ان کا یہ مطالبہ خود ان کے یا پورے ملک کے مفاد کے لئے درست ہو سکتا ہے؟

اس الزام کی صحت یا عدم صحت پر حکم لگانے سے پہلے ضروری ہے کہ آپ حکومت بالادست کی اس عملی سیاست کو سمجھ لیں جو ریاستوں پر صرف کی جاتی ہے

اس میں شک نہیں کہ سر ہنری مین کے قول کے مطابق "خود مختاری" تقسیم ہونے والی چیز نہیں اور وہ اس کے

ٹکڑے کئے جاسکتے ہیں، لیکن ریاستہائے ہند اور تاج کے موجودہ تعلقات کو دیکھ کر ماننا پڑتا ہے کہ زیر بحث "خود مختاری" ریاستوں اور تاج کے مابین ضرور تقسیم ہوگئی ہے اور قوت بالادست نے ریاستوں کی اُس خود مختاری پر جو از روئے اسناد و معاہدات انھیں حاصل ہونا چاہئے، یقیناً بہت کچھ قبضہ کرلیا ہے

قبل اس سے کہ ہندوستان کے لئے وفاقی طرزِ حکومت تجویز کی جاتی، ریاستیں ڈر رہی تھیں کہ ان کی بچی کھچی آزادی بھی کہیں ختم نہ ہوجائے۔ وہ اچھی طرح واقف تھیں کہ برطانیہ کی سیاسی حکمت عملی بہت سے معاملات میں ان کی آزادی چھین چکی ہے اور جو کچھ باقی رہ گئی ہے وہ بھی اس رحم و کرم پر موقوف ہے۔ پھر ان کا یہ اندیشہ صرف قیاس پر مبنی نہ تھا بلکہ سرکاری طور پر بھی اس کی تصدیق ہوچکی تھی کیونکہ سر رابرٹ ہالینڈ نے (جب وہ حکومت ہند کے معتمد سیاسی تھے) ایکبار ظاہر کیا تھا کہ اس زمانہ میں جب حکومت برطانیہ تمام ملک کو سیاسی وحدت میں تبدیل کرنا چاہتی تھی تو حالات جدیدہ کے ماتحت دستوری اُصول میں بہت تغیر کرنا پڑا، اور اس اُصول کی رو سے بعض مسائل میں (مثلاً مسایل حد و دبندی، تعمیر ریلوے، تار، چھاؤنیوں کا نظم و نسق وغیرہ) ان تعلقات سے تجاوز کرنا پڑا جو مابین تاج اور ریاستہائے ہند قائم تھے اور ریاستوں کی منظوری یا عدم منظوری کا اس باب میں کوئی لحاظ نہیں کیا گیا۔ سر ہالینڈ نے اس کا اعتراف کیا کہ برطانوی حکومت اور ریاستوں کے تعلق نے (ماورا معاہدات و اسناد) جو رواجی صورت اختیار کرلی ہے وہ نیت کے لحاظ سے قابل اعتراض نہیں اور نہ اس کا مقصود رئیسوں کے اختیارات کو کم کرنا ہے گو ایک حد تک وہ متصرفانہ ضرور ہے۔

الغرض ریاستیں برطانیہ کی اس پالیسی کو بہت شتبہ نگاہوں سے دیکھ رہی تھیں اور اچھی طرح جانتی تھیں کہ جن طریقوں سے ان کی آزادی رفتہ رفتہ ختم کی جارہی ہے وہ نہ صرف یہ کہ اب بھی جاری ہیں بلکہ برطانوی ہند کے قومی مطالبات کی وجہ سے زیادہ سخت و وسیع ہوتے جارہے ہیں۔ لیکن رؤسا ہند کی تمام انفرادی و اجتماعی کوششیں تاج اور ریاستوں کے تعلقات کی تعیین نہ کرا سکیں بلکہ اس کے برخلاف جب ہارورٹ بٹلر کمیٹی سے اصرار کیا گیا کہ وہ قوت بالادست کے اختیارات کی تعیین کردے تو قوتِ بالادست کا مفہوم اور زیادہ وسیع و لچکدار صورت میں پیش کیا گیا اور اس کا سبب صرف یہ تھا کہ حکومت ہند کا محکمۂ سیاسیات اپنے اقتدار و اختیار کو ہاتھ سے دینے کے لئے طیار نہ تھا

برطانوی قوم منطق پسند قوم نہیں ہے کہ وہ محض تصورات و قیاسات سے کام لیا کرے وہ ہمیشہ موجودہ مشکلات کو سامنے رکھ کر ان کا فوری علاج سوچتی ہے۔ اُنیسویں صدی کی ابتدا میں جو معاہدات اس قوم نے کئے تھے وہ اسی وقت کے لحاظ سے مناسب تھے اور ان کا مقصود صرف یہ تھا کہ تمام ریاستیں ایک دوسرے سے جدا کردی جائیں اور اسکا امکان باقی نہ رہے کہ وہ کسی وقت آپس میں ملکر حکومت برطانیہ کے اقتدار کو کم کردیں۔ جس زمانہ میں یہ معاہدے ہوئے تھے اسوقت برطانوی ہند میں کوئی بات ایسی نہ تھی جو موجودہ ترقی یافتہ طرزِ حکومت سے مشابہ ہوتی۔ لیکن بعد کو جب آہستہ آہستہ نظم و نسق نے مرکزی طرزِ حکومت کی صورت اختیار کرلی تو برطانوی ہند اور ریاستہائے ہند کی حکومتوں کے درمیان نمایاں فرق

محسوس ہونے لگا۔ یعنی ہندوستانی آبادی کا ⅔ حصہ اور ہندوستانی رقبہ کا ⅗ ایک مضبوط مرکزی حکومت سے متعلق ہو گیا اور ملک کا باقی حصہ جو مختلف و متعدد ریاستوں میں علیحدہ علیحدہ منقسم تھا برطانوی ہند کے مقابلہ میں اپنی اہمیت کھو بیٹھا

اگر ریاستیں منتشر حالت میں نہ ہوتیں اور ایک ہی حصۂ زمین میں ایک دوسرے سے ملی ہوئی ہوتیں تو صورتِ حال کچھ اور ہوتی، لیکن چونکہ وہ تمام برطانوی ہند میں پھیلی ہوئی ہیں اس لئے یہ ناممکن تھا کہ ان کو نظر انداز کرکے برطانوی ہند میں مرکزیت پیدا کی جائے۔ حکومت کا یہ رجحان اُنیسویں صدی کے آخری نصف حصہ میں زیادہ نمایاں ہونے لگا جب برطانوی ہند کے وسیع مطالبات و ضروریات نے تمام مسایل انتظامی کو "آل انڈیا" حیثیت سے دیکھنے پر مجبور کیا۔ اور ظاہر ہے کہ اس صورت میں ریاستوں کا تعاون حاصل کرنا بھی ضروری تھا خواہ وہ معاہدات کے منافی ہوتا یا رئیسوں کی مرضی کے خلاف۔ اور اگر ایسا نہ کیا جاتا (خواہ وہ جبر و ظلم کے ساتھ ہی کیوں نہ ہوا ہو) تو ہندوستان کی اقتصادی وحدت جس کا قیام (سڑکوں، ریلوں، تار، ٹیلی فون اور لاسلکی وغیرہ کی بابت ایک مشترک و متحد طرزِ عمل اختیار کرنے کی وجہ سے) ضروری ہو گیا تھا، حاصل نہ ہوتی۔ پھر اس میں شک نہیں کہ اس غرض کی تکمیل میں ریاستوں کے معاہداتی موقف کو نقصان پہونچا، لیکن یہ کہنا کہ قوت بالادست نے ہمیشہ اور ہر جگہ ریاستوں کو نقصان پہونچایا درست نہیں۔ اگر ہم گزشتہ تین چوتھائی صدی کے اندر برطانوی ہند کے اُن انقلابات کو سامنے رکھیں جو غیر معمولی تیزی کے ساتھ یہاں رونما ہوئے تو ہم کو حیرت ہوتی ہے کہ ریاستیں کیونکر اپنی روایتی انفرادیت کو قایم رکھ سکیں اور یہ واقعہ ہے کہ اگر حکومتِ بالادست ان کی معاون نہ ہوتی تو یہ رہا سہا اقتدار بھی ریاستوں کا ختم ہو جاتا۔ اس لئے اگر ایک طرف حکومت بالادست پر یہ الزام قایم ہو سکتا ہے کہ اس نے مصالح انتظامی کی وجہ سے ریاستوں کی خود مختاری کو گھٹایا تو دوسری طرف اس کا بھی اعتراف کرنا پڑے گا کہ ریاستوں کی انفرادیت محض قوت بالادست کی وجہ سے ہنوز قایم ہے

اس میں شک نہیں کہ از روئے معاہدات، برطانوی حکومت کو ریاستوں کے معاملات میں دخل دینے کا حق حاصل نہیں، لیکن اگر قوتِ بالادست لفظ بہ لفظ اس پر عمل کرتی تو انیسویں صدی کے دوران میں خدا جانے کتنی ریاستیں نیست و نابود ہو جاتیں۔ وہ برطانوی مدبرین جو ریاستوں میں برطانوی مداخلت کے مخالف تھے، وہی تھے جو ریاستوں کی بقا کو پسند نہ کرتے تھے اور ہر چند مداخلت کی پالیسی معاہدات کی رو سے ناجائز تھی لیکن اگر اس پر عمل نہ کیا جاتا تو بدنظمی، اقتصادی پریشانی، نقض امن اور جانشینی کے جھگڑوں کی وجہ سے بہت سی ریاستیں تباہ ہو جاتیں

جیسا کہ ابھی ہم ظاہر کر چکے ہیں، برطانیہ کی پالیسی ہمیشہ یہ رہی ہے کہ وہ ریاستوں کی انفرادی حیثیت کو فنا نہ ہونے دے اور اسی پالیسی کی عینک سے ہمیشہ معاہدات کو دیکھا گیا۔ فرض کیجئے کہ ایک ریاست میں جانشینی کے دو امیدوار پیدا ہوتے ہیں اور وہاں کی آبادی کا ایک حصہ ایک امیدوار کا طرفدار ہے اور دوسرا حصہ دوسرے امیدوار کا اگر ایسی صورت میں قوت بالادست مداخلت نہ کرے تو نتیجہ یہ ہوگا کہ وہاں خانہ جنگی شروع ہو جائے گی اور ریاست تباہ

اسی طرح اگر کسی ریاست میں بدنظمی انتہا کو پہونچ گئی ہے اور امن وسکون قایم نہیں رہا ہے تو اس کا بھی لازمی نتیجہ وہی
ریاست کی تباہی ہے۔ پھر جبکہ برطانوی حکومت ریاستوں کی بقا کی ذمہ دار ہو چکی ہے اور خود اس کے مصالح کا اقتضاء
بھی یہی ہے کہ ریاستیں باقی رہیں تو وہ معاہدات کی لفظاً ملفظاً پابندی کیسے کرے کیونکہ یہ مقصود حاصل کر سکتی تھی اور اگر ایسی
صورت میں وہ مداخلت کرتی ہے تو کس کو اعتراض کا حق حاصل ہو سکتا ہے

سیاسیات کے طالب علم سے یہ امر مخفی نہیں کہ تاریخ کی طرف سے ہمیشہ معاہدات کا احترام ملحوظ رکھنے پر زور دیا گیا ہے
لیکن اسی کے ساتھ دوسری طرف معاہدات کے خلاف ریاستوں کے معاملات میں مداخلت بھی کی گئی ہے۔ اس کا سبب
صرف یہی ہے کہ ہر چند قانونی نقطۂ نظر سے قوت بالادست کو اس مداخلت کا کوئی حق حاصل نہیں، لیکن برطانوی ہند کے
مصالح انتظامی، نیز خود ریاستوں کے بقاء وتحفظ کے خیال سے، مداخلت ضروری تھی اور اس طرح ریاستوں کے
اس [illegible] معاہدات کا مسئلہ محض قانونی مسئلہ نہیں رہا ہے بلکہ اس کا تعلق سیاسیات سے بھی ہے یعنی اگر ایک طرف
برطانوی ہند کی سیاسی ضروریات کا خیال رکھنا پڑتا ہے تو دوسری طرف ریاستوں کی انفرادیت کو قایم رکھنا بھی
ضروری ہوتا ہے اور انھیں دونوں میں توازن رکھنا حکومت ہند کی سیاسیات کا وہ کارنامہ ہے جس کی عظمت کا
اقرار کرنا پڑتا ہے

اس بیان سے واضح ہو گیا ہوگا کہ حکومت ہند کی ڈپلومیسی کی تاریخ کیا ہے۔ ور ریاستوں کی آزادی، حکومت
بالادست اور رئیسوں کے درمیان کیونکر تقسیم ہو کر رہ گئی۔ بہر حال اب غور طلب یہ ہے کہ کیا ان حالات کے ماتحت ریاستوں
کا اپنے موجودہ پوزیشن میں تبدیلی چاہنا یا وفاق میں شرکت کے لئے گفت وشنید [illegible] خود غرضی پر محمول کیا جا سکتا ہے۔

وہ حضرات جو ہندوستان کے سیاسی نظام سے واقف نہیں ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ ریاستوں کے لئے یہ اچھا موقعہ ہے
کہ وہ گزشتہ ایک صدی کے حالات میں تبدیلی پیدا کرا سکیں چنانچہ وہ سوال کرتے ہیں کہ ریاستیں وفاق میں شریک ہو کر
(علاوہ ان اختیارات کے جو از روئے معاہدات اب سے قبل حکومت برطانیہ کو تفویض کئے جا چکے ہیں) کیوں اور دوسرے
معاملات برطانیہ کے سپرد کر دیں۔ وہ وفاق میں شریک ہو کر ذاتی مسایل میں برطانیہ کی بیجا مداخلت کو کیوں قانونی حق میں
تبدیل کر دیں اور کیا وفاق کی شرکت سے ریاستوں کو اپنے حقوق کی قربانی اور زیادہ نہ کرنا پڑے گی

اس قسم کے اندیشوں کا سبب ان لوگوں کا محض جذبۂ ہمدردی نہیں جو ریاستوں کی خود مختاری کو محفوظ دیکھنا چاہتے
ہیں، بلکہ اس کا دوسرا سبب یہ خوف بھی ہے کہ مبادا اس طرح حکومت برطانیہ کے سیاسی اثرات ریاستوں پر اور زیادہ
قوی ہو جائیں اور رہی سہی آزادی بھی چھن جائے۔ حال ہی میں بعض اطراف سے یہ بے بنیاد شکایت بھی سننے میں
آئی ہے کہ جب اسوقت بھی بعض ریاستیں پولٹکل افسران پر بہ نسبت اپنی رعایا کے زیادہ اعتماد کرتی ہیں تو شرکت وفاق کے
بعد اس میں اور اضافہ ہو جائیگا اور اُن ریاستوں میں بھی یہ وبا پھیل جائے گی جو ابھی تک اس سے محفوظ ہیں اور

اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ریاستوں اور ان کی رعایا کے درمیان اتحاد عمل کی راہ بہت تنگ ہو جائے گی - اسی کے ساتھ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ شرکت وفاق کے بعد اس کا بہت امکان ہے کہ برطانیہ ملک کی قومی پالیسی کو شکست دینے کے لئے ریاستوں کو اپنا آلۂ کار بنائے - کیونکہ ریاستوں کے نمایندے جو انتخاب شدہ نہ ہوں گے نامزد کردہ ہوں گے پولٹکل ڈپارٹمنٹ کے ہاتھ میں بالکل موم کی ناک ہونگے اور مقننۂ وفاق میں وہی کہیں گے جو پولٹکل ڈپارٹمنٹ کہلوائے گا - الغرض ریاستوں کی شرکت وفاق میں صرف یہ معنی رکھتی ہے کہ ملک کی قومی پالیسی کے خلاف برطانوی حکومت کے اقتدار کو ہندوستان میں اور زیادہ قوی بنایا جائے

لیکن حکومت برطانیہ اور ریاستوں کے تعلقات پر جو روشنی اس سے قبل ڈالی گئی ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ خطرات بے بنیاد ہیں کیونکہ ہر چند معاہدات و اسناد کو دیکھتے ہوئے ریاستوں کی موجودہ خود مختاری بہت کم ہو گئی ہے لیکن موجودہ ڈپلومیسی کا نظام، معاہدات پر قایم ہی کب ہے، اس کا تعلق تو اس طرز عمل سے ہے جس نے تاریخ کے ساتھ ساتھ رواج کی صورت اختیار کر لی ہے - پھر اگر کوئی شخص جو ریاستوں کی آزادی کامل کا طرفدار ہے محکمۂ سیاسیات کے تصرف و دستبرد کا شاکی ہے اور اس کو نادرست و ناجائز سمجھتا ہے تو وہ ایسا کر سکتا ہے، لیکن اسی کے ساتھ اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کر سکتا کہ اگر محکمۂ سیاسیات کی یہ پالیسی نہ ہوتی تو آج بہت سی ریاستیں ختم ہو گئی ہوتیں - کیونکہ قوت بالادست ہی ایک ایسا عنصر ہے کہ اگر یہ نہ ہوتا تو نہ صرف یہ کہ ریاستوں کا بقا دشوار ہو جاتا بلکہ خود برطانوی ہند کا نظام حکومت بھی موجودہ صورت اختیار نہ کر سکتا یہ قوت بالادست ہی کے اختیارات تھے جنھوں نے برطانوی ہند کے قومی مطالبات اور ریاستوں کے انفرادی وجود دونوں کو ایک دوسرے کے ساتھ شیر و شکر کر دیا

اب رہا یہ کہنا کہ ریاستوں کو صرف وہی مسایل وفاقی حکومت کے سپرد کرنا چاہئے جو از روئے اسناد و معاہدات اس سے قبل سپرد ہو چکے ہیں، گویا اس بات کا مطالبہ کرنا ہے کہ ہندوستان پیچھے ہٹ کر اس زمانہ میں پہونچ جائے جب معاہدے کرنے کی رسم جاری تھی

وہ زمانہ وہ تھا جب برطانوی ہند برطانوی ہند نہ تھا، نہ کوئی قومی تحریک ملک میں پائی جاتی تھی اور نہ آل انڈیا تحریکات کا وجود یہاں نظر آتا تھا اس لئے اگر انصاف سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ معاہدات و اسناد کے خلاف ریاستوں کے اختیارات کی کمی نے ہندوستان کی ترقی میں کافی مدد دی اور ہر چند ریاستوں کے لئے یہ قربانی بہت قیمتی ثابت ہوئی اور بعض اوقات صرف یہ کہ نامناسب ذرایع سے حاصل کی گئی بلکہ خود رئیسوں سے بھی استمزاج نہیں کیا گیا تاہم اس میں کلام نہیں کہ " موجودہ ہند" کا نشوونما قوتِ بالادست کی اسی پالیسی کا مرہون منت ہے اور یہ کہ اگر یہ پالیسی اختیار نہ کی جاتی تو ریاستوں کا انفرادی وجود قطعاً باقی نہ رہتا

لیکن اس کا ایک رُخ اور بھی ہے، وہ یہ کہ قوت بالادست باوجود اسقدر مفید ہونے کے بسا اوقات واقعی

زیادتی کرنے والی ثابت ہوئی ہے۔ یعنی جب کوئی نزاع ریاستوں اور حکومت کے درمیان پیدا ہوئی تو وہی جج بنی اور اسی نے ریاستوں کے حقوق و مواجب کی تعیین و صراحت کی۔ پھر چونکہ فطرت انسانی کمزوریوں سے خالی نہیں ہے اسلئے بسا اوقات پولٹکل افسران کی طرف سے اختیارات کا غلط استعمال ہوا اور رفتہ رفتہ ان اختیارات کی وسعت کا یہ عالم ہو گیا کہ اب ریاستوں کے ایڈمنسٹریشن کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جو قوت بالادست کی نگرانی واقتدار سے باہر ہو

لیکن اس کا علاج نہ یہ ہے کہ قوت بالادست کے وجود ہی سے انکار کر دیا جائے نہ یہ کہ اس نے اسوقت تک جو کچھ کیا ہے اسے کالعدم قرار دیا جائے بلکہ صحیح طریق کار یہ ہے کہ آہستہ آہستہ قوت بالادست کے متصرفانہ طرز عمل کو دور کیا جائے تاکہ وہ کانسٹی ٹیوشن یا مخصوص ضابطہ کے اندر رہکر اپنے اختیارات صرف کرے اور فی الحقیقت یہی وہ خیال تھا جس کے تحت بہت سی ریاستوں نے اُن احکامات اصلاح پر غور کرنا شروع کیا جن کی وفاقی حکومت کے سلسلہ میں توقع کی جاسکتی ہے

یہ ریاستوں ہی کا اسرار واثر تھا کہ گول میز کانفرنس میں وفاقی مرکزیت پر زور دیا گیا اور یہ اصرار اس لئے کیا گیا کہ نمایندگان ریاستہائے ہند کے نزدیک قوت بالادست کے متصرفانہ طرز عمل سے بچنے کی یہی ایک صورت تھی کہ یہاں ایک ذمہ دار وفاقی مرکزی حکومت قایم کردی جائے

وفاقی امور کے متعلق بعض لوگوں کا یہ خیال کہ اگر ریاستوں نے انھیں وفاقی حکومت کے سپرد کر دیا تو اس کے یہ معنے ہونگے کہ قوت بالادست کو ریاستوں میں اور زیادہ مداخلت کا قانونی حق دیدیا، درست نہیں۔ کیونکہ وفاقی امور کی فہرست دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں اکثر ایسے ہیں جن پر اب بھی ریاستوں کو چون وچرا کا حق حاصل نہیں۔ بعض تو ایسے ہیں، جو کبھی ریاستوں کے اقتدار میں تھے ہی نہیں اور بعض ایسے ہیں جو عرصہ سے قوت بالادست کے اختیار میں ہیں۔ اس لئے ان اُمور کو وفاقی حکومت کے سپرد کرنے کے معنے یہ نہیں ہوسکتے کہ ریاستوں کے اندر اور زیادہ مداخلت کا موقع پیدا کر دیا گیا، بلکہ برخلاف اس کے معنے یہ ہونگے کہ حکومتِ بالادست کے غیر آئینی وسیع اختیارات سے نکال کر انھیں ایک آئینی طریق حکومت کے سپرد کر دیا گیا

یہ صحیح ہے کہ اسناد کی رو سے بعض اُمور میں ریاستوں کے اختیارات ضعیف ہو جائیں گے، لیکن سوال یہ ہے کہ اسناد و معاہدات کو دیکھتا ہی کون ہے اس وقت تک ان کا کیا لحاظ رکھا گیا ہے کہ آیندہ رکھا جائے گا اس لئے قدیم معاہدات کو سامنے رکھکر آیندہ کا نظام عمل سوچنا مناسب نہیں۔ دیکھنا صرف یہ ہے کہ پولٹکل ڈپارٹمنٹ کا عمل کیا رہا ہے اور اُسے اس سے باز رکھنے کی صورت اگر ہوسکتی ہے تو صرف یہ ہے کہ ابتدائی، ہم امور جن میں سے اکثر پر اب بھی ریاستوں کا اقتدار نہیں ہے، مناسب تحفظات کے ساتھ وفاقی حکومت کے سپرد کر دئے جائیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ قوتِ بالادست کا تصرف جو اسوقت غیر محدود صورت اختیار کئے ہوئے ہے محدود ہو جائے گا اور اُن اُمور کے علاوہ جو وفاق کے سپرد کئے گئے ہیں، باقی تمام معاملات میں ریاستیں آزاد ہو جائینگی

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ وفاق میں شریک ہونے کے بعد ریاستوں کی توجہ برطانوی ہند کی طرف زیادہ ہو جائے گی اور اپنی رعایا کی طرف سے کم ہو جائے گی، لیکن یہ خیال بھی بالکل بے بنیاد ہے۔ یہ صحیح ہے کہ شرکت وفاق کے بعد ریاستوں کے

نظم ونسق میں کچھ اُلجھنیں پیدا ہوجائیں گی، لیکن ان اُلجھنوں کے دور کرنے کے لئے انھیں قوت بالادست کا منھ نہ دیکھنا پڑیگا، کیونکہ وفاقی مسایل وفاقی حکومت ہی طے کرے گی اور اس لئے یہ صورت ہوجائے گی کہ جو ریاست انتظام کے لحاظ سے جتنی زیادہ مضبوط ہوگی اتنا ہی اس کا اثر آل انڈیا معاملات پر پڑے گا اور یہ ظاہر ہے کہ ایک ریاست کی مضبوطی کا انحصار اسی پر ہے کہ رعایا بھی اس کے ساتھ تعاون کرے۔ پھر یہ کہنا کہ شرکتِ وفاق کے بعد ریاستوں کی توجہ اپنی رعایا کی طرف کم ہوجائے گی، گویا یہ کہنا ہے کہ ریاستیں خود جان بوجھ کر اپنے اُس اثر کو کم کریں گی جو رعایا کے تعاون کے بعد ہی انھیں حاصل ہو سکتا ہے۔

اسی کے ساتھ ایک امر اور قابل غور ہے۔ ہر چند یہ صحیح ہے کہ وفاقی اُمور میں قوتِ بالادست مداخلت نہ کرے گی لیکن اور تمام معاملات میں وہ بدستور قایم رہے گی اور اسے قایم رہنا چاہیئے ـــ شرکت وفاق کے بعد چونکہ ہندوستان کے نظام حکومت میں ریاستوں کو دخل ہوجائے گا اس لئے ان کے بقاء و تحفظ کو اس سے ضرور مدد ملے گی۔ لیکن جب تک ریاستوں کی انفرادی ملوکیت باقی ہے اور وہ برطانوی ہند کے صوبوں کا پوزیشن اختیار نہیں کرتیں، ظاہر ہے کہ شرکت وفاق کے بعد بھی بہت سے معاملات ایسے باقی رہیں گے جن کی وجہ سے قوت بالادست کا تعلق ریاستوں سے ضرور قایم رہے گا۔ ذاتی وخاندانی تعلقات کے علاوہ جو تاج اور ریاستوں کے درمیان قایم ہیں، بعض امور ایسے بھی ہیں جن کو ریاستیں اول اول وفاق کے سپرد نہ کریں گی اور اس سلسلہ میں ریاستوں اور صوبجاتی حکومتوں کے درمیان ضرور اختلاف ہوگا، پھر اگر قوتِ بالادست موجود نہ ہو اور وہ ریاستوں کی حفاظت و بقا کی ذمہ دار نہ ہے تو بڑی دشواری ہوگی۔ ہر چند فیڈرل کورٹ کا وجود بھی اس حفاظت کا ضامن ہے، لیکن کوئی جوڈیشل کورٹ کسی حکومت کے طرزِ عمل کی ضمانت نہیں کر سکتا اور اس لئے قوتِ بالادست کا وجود جو گورنر جنرل اور گورنروں کے ذریعہ سے اپنے اختیارات کا استعمال کر سکتی ہے بہت ضروری ہے ـــ یہ کہنا کہ شرکتِ وفاق کے بعد پولٹکل ڈپارٹمنٹ ریاستوں سے صرف یہ کام لیگا کہ قومی تحریکات کو اُن سے دبائے درست نہیں۔ کیونکہ دارالعوام میں اس کا اعلان ہوچکا ہے کہ ریاستیں اپنے انتظامی امور میں بالکل آزاد ہیں اور نظم ونسق کی تبدیلی میں قوتِ بالادست کے استمزاج کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ قوتِ بالادست کا اثر شرکتِ وفاق کے بعد کم ہوجائے گا اور پولٹکل ڈپارٹمنٹ کبھی انھیں مجبور نہ کر سکے گا کہ وہ قومی تحریکات کے خلاف کوئی رائے دیں۔

اب رہا یہ اندیشہ کہ ریاستوں کے نمایندے پولٹکل محکمہ کا اثر قبول کریں گے اسو اسکے ماننے کی بھی کوئی وجہ نہیں جبکہ خود ان نمایندوں کی نیک نامی بھی اسی پر منحصر ہے کہ وہ اپنی ریاستوں کی پوزیشن کو قایم رکھیں ـــ ہم یہ نہیں کہتے کہ مرکزی وفاق کے نظام میں کوئی نقص نہیں ہے لیکن وہ نقایص کیا ہیں اور ان کے دور کرنے کی کیا صورت ہے، اسکا صحیح علم اسوقت تک نہیں ہوسکتا جب تک ہم وفاق پر عمل نہ کریں۔ کیا صوبوں کے نظام میں نقایص نہیں بتائے جاتے تھے، لیکن جب اس پر عمل کیا گیا تو بہت سے اندیشے بے بنیاد ثابت ہوئے۔ ہوسکتا ہے کہ مرکزی حکومت کے متعلق یہ شبہات عمل کے بعد دور ہوجائیں ـــ بہر حال جب تک وفاق قایم نہ ہو اس کے حسن و قبح کے متعلق حکم لگانا قبل از وقت ہے اور چونکہ قیام وفاق کے لئے ریاستوں کی شرکت ضروری ہے، اس لئے ظاہر ہے کہ اگر انھوں نے شرکت سے احتراز کیا تو کبھی ہم کو یہ معلوم کرنے کا موقعہ نہ ملیگا کہ وفاق کے نظام میں کیا نقایص ہیں اور وہ کیونکر دور کئے جاسکتے ہیں ـــ یہ درست ہے کہ شرکت وفاق کے بعد صوبجاتی حکومتوں کا اثر ریاستوں کی رعایا پر ضرور ہوگا لیکن کیا ریاستوں کے نظامِ حکومت کا اثر صوبجاتی حکومتوں پر نہ ہوگا۔ یقیناً ہوگا اور اتحادِ عمل کی یہی وہ صورت ہے جو جدید ہندوستان کی تعمیر میں مدد دیگی۔

ابوالکمال اُمید امیٹھوی

اسوقت لکھنؤ کی محافلِ شعر وسخن کی رونق دو عناصر پر منقسم ہے۔ اُسوقت کا ذکر نہیں جب گرمیٔ محفل کے لئے شمع محفل بھی موجود تھی بلکہ ذکر اس وقت کا ہے جب لکھنؤ میں "جانِ سخن" تو کوئی نہیں لیکن "ماتم گسارانِ سخن" بہت ہیں ۔۔ مدعا یہ کہ میں اُس عہد کی باتیں نہیں کر رہا جب شعرا خود پیدا ہوتا تھا، بلکہ اس زمانہ کی باتیں کر رہا ہوں، جب شعر وشاعری کا تعلق نہ داخلی محرکات سے ہے نہ خارجی موثرات سے، بلکہ صرف اس بات سے کہ "شعر نہ کہیں تو کیا کریں" یا یہ کہ "ہم شعر کہتے ہیں اس لئے کہہ سکتے ہیں"۔ ہاں تو اس دور کی لکھنوی شاعری کے اجزا ترکیبی دو ہیں (حیدرآبادی زبان میں) ایک ملکی دوسرا غیر ملکی اور یہ کہنا غالباً غلط نہ ہوگا کہ اس پیوند نے لکھنؤ کی موجودہ شاعری کو بہت فایدہ پہونچایا!

اس وقت میں اس بحث میں پڑنا غیر ضروری سمجھتا ہوں کہ خالص لکھنوی شاعری کیا تھی اس کا عروج کب ہوا اور اسکے انحطاط کے اسباب کیا تھے، لیکن یہ ظاہر کر دینا ضروری ہے کہ اسوقت کی لکھنوی شاعری یقیناً وہ شاعری نہیں، جو اب سے نصف صدی قبل پائی جاتی تھی اور جس میں شاہان اودھ کی رنگ رلیوں کے کچھ مٹے مٹے نشانات ڈھونڈھنے سے مل جاتے تھے اس میں شک نہیں کہ "لکھنؤ" کی "لکھنویت" (خواہ اس میں شعریت رہی ہو یا نہ رہی ہو) اب بالکل مٹ گئی ہے لیکن اس کی شاعرانہ مرکزیت بدستور قایم ہے اور شاہانِ اودھ کے زمانہ سے جو سلسلہ باہر کے لوگوں کی آمد و رفت کا قایم ہو گیا تھا وہ برابر جاری ہے یہاں تک کہ لکھنؤ کی ذہنی و دماغی ترقی کا کوئی درمیانی دور ایسا نہیں جس کی تاریخ ان "غیر ملکیوں" کا ذکر کئے بغیر لکھی جا سکے

چنانچہ دورِ متاخر کے ان لوگوں میں جو باہر سے یہاں آئے اور جنھوں نے یہاں کی محافل شعر وسخن میں نمایاں حصہ لیا جناب امید امیٹھوی بھی ہیں ۔ آپ امیٹھی ضلع سلطانپور کے رہنے والے ہیں جو اودھ ہی کا ایک حصہ ہے ۔۔۔ آپ ۳۰ فروری ۱۸۸۰ء کو پیدا ہوئے۔ آپ نسباً سید ہیں سید محمد علی نام ہے اور امید تخلص۔ آپ کے مورث اعلےٰ حافظ سید رسول صاحب غزنی سے ہندوستان آئے اور رئیس پرتاب گڑھ کے ارادتمندانہ اخلاص سے مجبور ہو کر یہیں مقیم ہو گئے

یوں تو آپ کی ابتدائی تعلیم عربی و فارسی کی امیٹھی میں ہوئی، لیکن اسکی تکمیل لکھنؤ میں ہوئی جب آپ ۱۸۹۳ء میں یہاں پہونچے۔ اسوقت یہاں اُردو شاعری میں جلال کا طوطی بول رہا تھا اور فارسی میں خواجہ عزیزالدین کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی

ساتھ ہی ساتھ منشی سجاد حسین کے اودھ پنچ نے نثر میں ہنگامۂ ادب برپا کر رکھا تھا چونکہ امید صاحب کو فطرتاً فارسی سے لگاؤ
تھا اس لئے آپ نے ملا علی محمد شیرازی سے جو مٹیا برج سے لکھنؤ آ گئے تھے، اپنے اس ذوق کو پورا کیا، اور خواجہ عزیز الدین
ہی کو اپنا فارسی کلام دکھاتے رہے۔ کچھ دنوں بعد آپ کو مشاعروں میں شرکت کا شوق پیدا ہوا اور اس طرح اُردو شاعری
کی طرف بھی توجہ ہوئی۔ جیسا کہ میں ابھی عرض کر چکا ہوں، یہاں کے اساتذۂ سخن جلال کو بڑی شہرت حاصل تھی اور اس میں
شک نہیں کہ صرف دور متاخرین بلکہ لکھنؤ کے تمام اُردو شعراء میں جلال کو جو مرتبہ حاصل ہے وہ کسی شاعر کو حاصل نہیں
ہوا۔ صحت لغت و زبان کے لحاظ سے وہ سند سمجھے جاتے تھے اور فن کی حیثیت سے بھی ان کا مرتبہ بہت بڑا تھا۔ چنانچہ
امید صاحب نے بھی ان کے یہاں آمد و رفت شروع کی اور اپنا اُردو کلام دکھانے لگے لیکن چونکہ جلال صاف و سلیس
زبان کے شاعر تھے اور امید صاحب اپنے ذوق کی بنا پر زیادہ تر فارسی ترکیبیں استعمال کرتے تھے اس لئے یہ اُستادی
شاگردی زیادہ عرصہ تک قایم نہ رہ سکی اور آخر کار یہ اپنا فارسی و اُردو کلام ایک محمد حنیف صاحب رعب کو دکھانے لگے جو
شاہ آباد (پنجاب) کے رہنے والے تھے اور ۱۸۹۸ء میں (شاید تکمیل طب کی غرض سے) لکھنؤ آئے تھے۔ امید صاحب
جناب رعب کے مداح ہیں۔ لیکن جس حد تک شاعری کا تعلق ہے میں نے اُن کے کلیات میں (جو غالباً امید صاحب
ہی کی کوشش سے چھپ چکا ہے) میں نے کوئی بات ایسی نہیں پائی جسے دور کا لگاؤ بھی شاعری سے ہو
امید صاحب اکثر غریب خانہ پر تشریف لاتے رہتے ہیں اور اس میں شک نہیں کہ فارسی کا ذوق نہایت پاکیزہ رکھتے
ہیں۔ مطالعہ نہایت وسیع ہے اور اساتذۂ قدیم کے اشعار بہ کثرت یاد ہیں (جسے اشعار پریشاں کہنا زیادہ موزوں ہوگا
اور جو ابھی تک شایع نہیں ہوا)

آپ کا مجموعۂ کلام تمام اصناف سخن پر حاوی ہے، اور ہر رنگ میں آپ کی اُس وقت پسندانہ کاوش کا پتہ چلتا ہے جو
فارسی ذوق کی وجہ سے آپ کی فطرت ثانیہ ہو گئی ہے اور جس کا بوالطف آپ کے قصاید میں ملتا ہے۔ آپ کی شاعری میں
فارسی ہو یا اُردو، انداز بیان کا تنوع زیادہ تر استعمال تراکیب کا ممنون ہے اور اس لئے وہی لوگ اس سے لطف اُٹھا سکتے
ہیں، جو فارسی اشعار کا ذوق رکھتے ہیں۔ لیکن خالص جذباتی رنگ بھی آپ کے یہاں پایا جاتا ہے اور کافی تیز۔

فارسی کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:۔

دلم خوں گشت و جانم برلب آمد لیک اندوہت	نمیدانم کنوں دیگر چہ خواہد از دل و جانم
اے بیخبراں از خبرِ یار چہ گویم	زیں بیش خبر نیست کہ از وے خبرے ہست
ہر دیدۂ دل بر رخ تو وا نتواں کرد	حیف ست تماشا و تماشا نتواں کرد
کام جانِ عاشقانست گرچہ وصلِ دلبراں	لیکن اندر عاشقی ناکام بودن ہم خوش ست
زاہد مناز بر اثرِ ورزشِ سجود	ایں شیوہ ہم بطرز دگر داشتیم ما

کبھی ان کے کلام میں دل و دماغ پر بار نہیں ہوتی

امید صاحب کے قصاید بہت شاندار ہیں کیونکہ اس میدان میں ان کے ذوق وقت پسندی کو پوری طرح پھیلنے کا موقعہ ملتا ہے۔ نثر میں ان کا رجحان زیادہ تر تیچانہ رنگ کی طرف ہے اسی لئے اپنے عنفوان شباب میں جو مضامین وہ اودھ پنچ میں لکھتے تھے ان پر بسا اوقات منشی سجاد حسین کے مضامین کا دھوکا ہوجاتا تھا

امید صاحب باوجود اس کے کہ اس وقت ان کی عمر ۶۰ سال کی ہے، نہ صرف صحیح و توانا ہیں بلکہ اپنی خوشدلی اور خوش طبعی کے لحاظ سے ابھی تک جوان معلوم ہوتے ہیں۔ ہرچند حال ہی میں ان کو اپنے ایک جوان اکلوتے بیٹے کی موت کا سخت صدمہ پہنچا ہے اور اس کی چھوڑی ہوئی اولاد کی وجہ سے ان کی معاشی الجھنیں بہت بڑھ گئی ہیں، لیکن انکی غیرت، خودداری اور صبر وشکر کا وہی عالم ہے اور ایک لمحہ کے لئے بھی کوئی شخص یہ معلوم نہیں کرسکتا کہ بات بات پر ہنس پڑنے والے انسان کا دل کتنا داغدار ہے

وضعداری اور اخلاق کے لحاظ سے وہ یقیناً اس دور کے انسان نہیں ہیں اور اسی لئے جب کبھی وہ مجھ سے آکر ملتے ہیں تو میری نگاہوں کے سامنے خلوص ومحبت کا وہ دور آجاتا ہے، جس کی یادگار اسوقت تو خال خال کہیں نظر آجاتی ہے لیکن کچھ زمانہ کے بعد چراغ لیکر ڈھونڈھنے سے بھی کہیں نہ ملے گی

باب الاستفسار

بہزاد

(جناب سید طفیل احمد صاحب ۔ رائے پور)

ایران کے مشہور نقاش بہزاد کے حالات اگر دستیاب ہوسکیں تو براہ کرم مطلع فرمایئے، نیز یہ کہ کن کن کتابوں سے اس کے نفس و تعات زندگی معلوم ہوسکتے ہیں

(نگار) بہزاد کی صحیح تاریخ ولادت تو معلوم نہیں لیکن مورخین کا خیال ہے کہ وہ غالباً پندرھویں صدی عیسوی کے وسط میں پیدا ہوا تھا (یعنی سنہ ۱۴۵۰ء کے قریب) اور یہ خیال انھوں نے اس لئے قایم کیا ہے کہ اسکے جو ابتدائی نقوش دستیاب ہوئے ہیں ان پر ۱۴۷۹ء درج ہے۔ گویا ان کے نزدیک تقریباً ۳۰ سال کی عمر میں وہ اس قابل ہوا ہوگا کہ اس طرح کی نقاشی پیش کرسکے۔ مگر یہ صرف قیاس ہی قیاس ہے۔ ہوسکتا ہے اس نے اس سے کم عمر میں اتنی مشق حاصل کرلی ہو یا اور زیادہ معمر ہونے کے بعد اس مرتبہ پر پہونچا ہو۔

ایرانی مورخین نے اسے ہرات کے مشہور نقاش امیر روح اللہ کا شاگرد بتایا ہے اور ایک ترکی مورخ نے پیر سید احمد تبریزی کا۔ تزک جہانگیری میں، جہانگیر نے لکھا ہے کہ وہ "خلیل مرزا" کی نقاشی کا متبع تھا۔ بہزاد کا سب سے پہلا سرپرست میر علی شیر نوائی تھا، اسی کے ذریعہ سے وہ حسین بیقرہ والی ہرات کے دربار میں پہونچا جہاں اسوقت نوائی، جامی اور خوندمیر وغیرہ صاحبان فضل و کمال موجود تھے۔ جب اس خاندان کو محمد خاں شیبانی نے معزول کردیا تو بہزاد، ہرات سے تبریز چلا آیا جو صفوی خاندان کا پایۂ تخت تھا، شاہ اسماعیل صفوی نے اس کی بڑی قدر کی اور شاہی کتاب خانہ کا افسر بناکے تمام کاتب و نقاش اس کی ماتحتی میں کردئے۔ شاہ طہماسپ کے زمانہ میں بھی اس کی بڑی عزت تھی۔ سلطان محمد اور آقا میرک دو نقاش اور اس کے ساتھ دربار سے وابستہ تھے ۔ بہزاد نے سنہ ۹۴۲ھ یا ۱۵۳۶ء میں انتقال کیا اور شیخ کمال خجندی (مشہور شاعر) کے پہلو میں دفن کیا گیا۔ دوسری روایت کے مطابق اس کا انتقال ۱۵۳۳ء میں ہوا۔ ہرچند اسکے زمانہ کی تاریخوں سے اس کی نقاشی پر تفصیلی روشنی نہیں پڑتی، لیکن یہ سب نے لکھا ہے کہ وہ بہت بڑا صاحب فن تھا۔ خوندمیر نے لکھا ہے

کرشبیہ کو اصل سے قریب تر بنانے میں اسے ید طولیٰ حاصل تھا۔ حیدر مرزا لکھتا ہے کہ وہ اُستاد آقا میرک سے کم نہ تھا اور دونوں میں یہ فرق تھا کہ آقا میرک کے نقش میں پختگی زیادہ ہوتی تھی اور بہزاد کے نقوش میں نزاکت۔ شاہ مظفر بھی اس زمانہ کا بہت بڑا نقاش تھا لیکن حیدر مرزا کا بیان ہے کہ بہزاد موقلم کے استعمال اور خطوط کے توازن میں اس سے بہتر تھا۔ بابر لکھتا ہے کہ بہزاد بہت نازک نقاشی کرتا تھا، خصوصیت کے ساتھ داڑھی رکھنے والا چہرہ خوب بناتا تھا۔ بابر کے جانشینوں نے بھی بہزاد کے نقوش کی بڑی قدر کی اور بڑی بڑی قیمتیں ادا کرکے ان کو جمع کیا۔ جہانگیر لکھتا ہے کہ بہزاد لڑائی کے مناظر دکھانے میں کمال رکھتا تھا۔ اہل مغرب نے ایران کے قدیم نقوش فراہم کرکے بہزاد کے نقوش کی تعیین میں بڑی کوشش کی ہے اور وہ اس میں بڑی حد تک کامیاب بھی ہوئے ہیں، انکا خیال ہے کہ وہ تیموری طرز کا نقاش تھا اور خود اس نے کوئی نئی بات پیدا نہیں کی تاہم چھوٹی چھوٹی تصاویر بنانے میں اس کو کمال حاصل تھا، اسی لئے وہ کتابوں کو مصوّر کرنے میں بہت کامیاب ہوا

انقلاب فرانس

(جناب مرزا محمد اسماعیل صاحب۔ سارن)

انقلاب فرانس پر بڑی بڑی کتابیں لکھی گئی ہیں، لیکن اگر کوئی شخص آپ سے کہے کہ صرف دو صفحات میں اس کو بیان کر دیجئے تو آپ کیا کریں گے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے طبقہ کے لئے ضرورت اس امر کی ہے کہ دنیا کے تمام اہم تاریخی واقعات اور علمی مسایل نہایت مختصر الفاظ میں ان کے سامنے بیان کئے جائیں اور اس طرح کا ایک سلسلہ تاریخی صورت میں شایع کیا جائے [illegible] اختصار اسی درجہ کرنا ہر شخص کا کام نہیں اس لئے پبلک کی عام معلومات بڑھانے کے لئے ایسی ہی کتابوں کی ضرورت ہے جو ایک طرح سے مفصل انڈکس کی حیثیت رکھتی ہوں۔ کیا آپ اس طرف توجہ فرمائیں گے

(نگار) آپ کا خیال بالکل درست ہے۔ واقعتاً پبلک کو ایسی ہی اطلاعات کی ضرورت ہے، چنانچہ نگار میں استفسار و جواب کا سلسلہ اسی خیال سے جاری کیا گیا ہے۔ اسوقت تک تین جلدیں اس مجموعہ کی شایع ہو چکی ہیں اور آپ دیکھیں گے کہ اس میں سیکڑوں تاریخی، علمی، ادبی و سیاسی مسایل کو نہایت مختصر الفاظ میں سمیٹ لیا گیا ہے۔ "انقلاب فرانس" کی مختصر تاریخ نہایت مختصر عبارت میں درج ذیل ہے:- "انقلاب فرانس" نام اس تحریک کا ہے جو ۱۷۸۹ء میں فرانس کے اندر رونما ہوئی اور سارے یورپ میں ہلچل ڈال گئی۔ اس زمانہ میں فرانسیسی آبادی خصوصیت کے ساتھ دیہی آبادی بہت تباہ حال تھی اور حکومت کو اس کی پرواہ نہ تھی۔ بادشاہ اور اس کے امراء جو چاہتے تھے کرتے تھے اور مالی حالت اتنی خراب ہو گئی تھی کہ سارا ملک قحط زدہ ہو رہا تھا۔ اتفاق سے اسی زمانہ میں وہاں والٹیر، روسو وغیرہ چند نفوس ایسے پیدا ہو گئے جنھوں نے لوگوں میں ذہنی انقلاب پیدا

کرنا شروع کیا مثلاً والٹیر نے مذہبی پابندیوں اور رسم و رواج کی جکڑبندی کے خلاف لکھنا شروع کیا اور روسو نے حکومت کے خلاف
نکتہ چینی کرکے لوگوں میں ہیجان پیدا کردیا۔ دنیا میں ہمیشہ یہی ہوا ہے کہ جب کسی قوم کی حالت انتہائی پست ہوجاتی ہے تو اس میں ردِ عمل
کی کیفیت پیدا ہونے لگتی ہے اور اس وقت اگر کوئی شخص [illegible] آگ کو بھڑکانے والا پیدا ہوجاتا ہے تو وہ لیڈر و رہنما یا نبی و پیغمبر کی
حیثیت حاصل کرلیتا ہے۔ الغرض فرانس کی آبادی یونہی پہلے سے آمادہ بغاوت تھی اور والٹیر اور روسو نے اس میں اور قوت
پیدا کردی۔ اس کا نتیجہ ہوا کہ (اسٹیٹس جنرل یعنی پارلیمنٹ) [illegible] جو شاہ فرانس کے مشورہ کے لئے قائم تھی اور جس کا
کوئی اجلاس ۱۶۱۴ء سے اس وقت تک نہ ہوا تھا طلب کی گئی اور ایک قومی اسمبلی قائم کی گئی لیکن جو ہیجان لوگوں میں پیدا
ہوگیا تھا وہ یوں آسانی سے فرو نہ ہوسکتا تھا اس لئے ۱۴ جولائی ۱۷۸۹ء کو انھوں نے سب سے پہلے (Bastille)
کو جاکر تباہ کیا۔ یہ ایک قید خانہ تھا جس میں ہر وہ شخص نظر بند کردیا جاتا تھا جس سے بادشاہ ناخوش ہو۔ اسی کے ساتھ ملک کے
اطراف میں بھی بدامنی پھیل گئی اور انقلابیوں نے اپنا سہ رنگی جھنڈا بناکر جمہوریت کا مطالبہ شروع کیا۔ قومی اسمبلی نے یہ رنگ
دیکھ کر فیصلہ کیا کہ امراء کو جو حقوق حاصل ہیں وہ واپس لے لئے جائیں اور جدید کانسٹی ٹیوشن مرتب کیا جائے۔ اس میں شک نہیں
کہ اس ہنگامہ کو دیکھ کر بہت سے امراء بھاگ کر انگلستان چلے گئے اور بادشاہ کی حیثیت قیدی سے زیادہ نہ تھی تاہم شاہ پرست جماعت
ابھی بالکل ختم نہ ہوئی تھی ۔۔۔ اس کے دو سال بعد جون ۱۷۹۱ء میں بادشاہ (لوئی شانزدہم) پیرس سے بھاگا لیکن وارنیس
سے پھر واپس لایا گیا۔ اب اسمبلی نے فیصلہ کیا کہ یہاں (Constitutional Monarchy) قائم
کی جائے (اس سے مراد وہ طرزِ حکومت ہے جس میں بادشاہ کسی آئین کا پابند بنادیا جائے) لیکن اس پر عمل نہ ہوسکا چونکہ
اب یہ آگ زیادہ پھیل گئی تھی اس لئے دیگر حکومتوں کو بھی تشویش پیدا ہوئی اور جو فرانسیسی امراء بھاگ کر ادھر ادھر چلے گئے
تھے انھوں نے بھی دوسری سلطنتوں کو ابھارا خصوصیت کے ساتھ شاہ آسٹریا نے بہت گہری دلچسپی لی کیونکہ وہ لوئی شانزدہم
کا سالا تھا۔ اس نے فرانس سے مطالبہ کیا کہ وہ بادشاہ کو پھر تخت نشین کرے ۔۔۔ ادھر فرانس میں جمہوریت پسندوں کی
قوت بڑھتی جارہی تھی اس لئے غیر ملکوں کی مداخلت نے اور زیادہ ہیجان پیدا کردیا، یہاں تک کہ ۱۷۹۲ء میں آسٹریا کے
خلاف اعلان جنگ کردیا۔ اب شاہ پروشیا بھی آسٹریا کے ساتھ مل گیا لیکن نتیجہ فرانس کی کامیابی کی صورت میں نکلا، اسکے بعد ایک قومی
مجلس یہاں قائم ہوگئی اور جس نے بعد کو جمہوریت کی شکل اختیار کرلی۔ اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ ۲۱ جنوری ۱۷۹۳ء کو لوئی قتل کردیا گیا اور ہزاروں
آدمی مقید کردئے گئے۔ اسکے بعد ۱۷۹۳ء میں ایک کمیٹی "حفاظت عامہ" کی غرض سے قائم ہوئی جس کا نام (Committee of Public Safety)
تھا اور وہ ہنگامہ داروگیر شروع ہوا جسے "Reign of Terror" سے تعبیر کیا جاتا ہے
ہزاروں امراء اور سیاسی رہنما قتل کئے گئے یہاں تک کہ لوئی کی بیوی میری انٹوانیٹ بھی اکتوبر ۱۷۹۳ء کو قتل کردی گئی۔ یہ ہنگامہ تقریباً
دو سال تک قائم رہا۔ اسکے بعد یہاں اکتوبر ۱۷۹۵ء میں (Directory) قائم کردی (اس سے مراد پانچ آدمیوں کی کمیٹی تھی جو سلطنت
کے نظم و نسق کا پورا اختیار رکھتی تھی) اس ڈائرکٹری کے زمانہ میں نپولین کو عروج حاصل ہوا جس نے آخرکار ۹ نومبر ۱۷۹۹ء کو ڈائرکٹری کو بھی ختم کردیا اور
قونسل کا لقب اختیار کرکے خود فرانس کا حکمران بن گیا۔

مطبوعات موصولہ

فرہنگ عامرہ چھوٹے سائز کا لغت ہے جس میں عربی فارسی اور ترکی کے تقریباً ۴۰ ہزار الفاظ صحیح تلفظ کے ساتھ یکجا کر دئے گئے ہیں اور جن کا عام فہم ترجمہ اُردو میں کیا گیا ہے۔ اس فرہنگ کی خصوصیات فاضل مؤلف نے یہ ظاہر کی ہیں کہ:۔

(۱) الفاظ کی ترتیب حروف تہجی کے لحاظ سے اس طرح رکھی گئی ہے کہ کسی لفظ کی جستجو میں دقت نہیں ہوتی

(۲) صحت تلفظ کے لئے یہ اہتمام کیا گیا ہے کہ ہر لفظ کے آگے اس کے ٹکڑے کر دئے گئے ہیں اور ہر ٹکڑے پر اعراب دیدئے گئے ہیں۔ یہ وہی طریقہ ہے جو انگریزی زبان کے لغات میں رائج ہے

(۳) فارسی کی خلاف قیاس اور عربی کی مستعمل جمع اپنے صیغۂ مفرد کے ذیل درج کر دی گئی ہے اور کثیر الاستعمال صیغہائے جمع کو مستقل لغت کی حیثیت سے اس کی جگہ پر پھر دوبارہ دیدیا گیا ہے

(۴) کثیر الاستعمال فارسی مصادر کے مضارعات اور سماعی و قیاسی مشتقات بھی دیدئے گئے ہیں، اسی کے ساتھ قلیل الاستعمال مصادر کی بڑی تعداد بھی شامل کر دی گئی ہے

(۵) فارسی میں اکثر حروف دوسرے حروف سے بدل دئے جاتے ہیں، اس کی صراحت بھی ہر حرف کی تقطیع کی ابتدا میں کر دی گئی ہے

(۶) دورِ حاضر کے بہت سے مفید معرّبات و مفرّسات اس میں شامل ہیں

(۷) اشیاء کی ماہیت و معانی بیان کرنے میں جدید تحقیقات کا خیال رکھا گیا ہے

(۸) اسماء الرجال کے سلسلہ میں افسانوی افراد اور تاریخی شخصیتوں کے درمیان حدِ فاصل قایم کر دی گئی ہے

میں نے اس فرہنگ کو بغور دیکھا ہے اور میں نے یہ تمام خصوصیات اس میں پائی ہیں۔ ہماری زبان میں لغت کی کتابوں کی بہت کمی ہے اور خصوصیت کے ساتھ وہ جو جامع بھی ہوں اور مختصر بھی۔ اس لئے ملک کو جناب محمد عبداللہ خاں خویشگی کا ممنون ہونا چاہئے کہ انھوں نے سالہا سال کی محنت کے بعد یہ قابل قدر فرہنگ مرتب کی اور اچھے کاغذ پر مجلد شایع کر کے طلبہ کی بڑی ضرورت کو پورا کیا۔ یہ کتاب مولف سے "فیروز منزل خورجہ" کے پتہ سے دستیاب ہو سکتی ہے

فانوس خیال کلیات ہے سید جلال الدین توفیق حیدر آبادی کا جسے ان کے فرزند جناب سید امیر الدین توصیف نے نہایت حسن اہتمام کے ساتھ مجلد شایع کیا ہے

توفیق مرحوم حیدر آباد کے نہایت خوشگو شاعر تھے اور اپنی پختگی کلام کی وجہ سے اساتذہ میں شمار ہوتے تھے۔

توفیق ۱۲۸۱ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۳۳۹ھ میں انتقال ہوا۔ ان کی ابتدائی تعلیم نہایت اچھی ہوئی اور تربیت اس سے زیادہ اچھی۔ آپ ہرچند قلیل المعاش تھے لیکن یہ دنیاوی تنگیاں آپ کی [illegible] کبھی خارج نہیں [illegible] اور آپ نے اپنی ساری عمر ایک بلند اخلاق والے انسان کی طرح بسر کی

اس مجموعہ میں غزلیں، رباعیاں، قطعے، قصیدے، مرثیے اور مثنویاں وغیرہ تمام اصناف سخن پائے جاتے ہیں اور بقدر مشترک جو خصوصیت ان کے ہر رنگ سے ظاہر ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ آپ پڑھے لکھے شاعر تھے، کلام سے نہ صرف پختگی بلکہ دقت نظر اور کاوش فکر بھی نمایاں ہے۔ چنانچہ بہت سے اشعار آپ نے مرزا نوشہ کے رنگ میں بھی لکھے ہیں۔ زبان کی صحت اور انداز بیان کی سلاست کا بھی آپ کو بہت خیال تھا۔ ہرچند آپ جذباتی شاعر [illegible] رعایت لفظی صنعت جو اس زمانہ کی خصوصیت تھی بہ کثرت آپ کے کلام میں پائی جاتی ہے لیکن بدسلیقگی کے ساتھ نہیں۔ اس کلیات کی قیمت تین روپیہ ہے اور دکن بک اینڈ اسٹیشنری مارٹ عابد بلڈنگ حیدر آباد دکن سے مل سکتا ہے

ہندوستان کا نیا دور حکومت جناب پنڈت کشن پرشاد کول نے ہندوستان کے نئے دستور حکومت کا خلاصہ اس کتاب میں پیش کیا ہے اور ہندوستانی اکاڈیمی الہ آباد نے اسے شایع کیا ہے

پہلے دیباچہ میں یہ بتایا ہے کہ آئینی اصلاحات کا آغاز کیونکر ہوا اور اس کے بعد اصلاحات کے درمیانی منزلوں کا ذکر کرتے ہوئے موجودہ منزل تک کے واقعات کو مختصر و جامع الفاظ میں بیان کر دیا ہے

دیباچہ کے بعد اصل کتاب شروع ہوتی ہے جس میں صوبوں کی خود مختار حکومت پر روشنی ڈالی ہے اور کونسلوں کی ساخت، ایوان اعلیٰ و ادنیٰ کے اختیارات اور مقننہ و عاملہ کے اصول کار سے بحث کی ہے

دوسرے باب میں مرکزی حکومت یا بالفاظ دیگر وفاقی حکومت کی تشکیل پر نظر ڈالی ہے اور ساتھ ہی ساتھ فنانس وفاقی عدالت اور رزرو بنک کے متعلق بھی کافی معلومات فراہم کردی ہیں۔ اس کتاب میں دستور جدید پر کوئی انتقادی نگاہ نہیں ڈالی گئی ہے بلکہ دستور جدید کی قانونی حیثیت کو بلا کم وکاست پیش کر دیا گیا ہے

جدید ایکٹ اس وقت کی انجیل ہے۔ ہندوستان کے ہر باشندہ کا فرض ہے کہ وہ اسے سمجھے اور دیکھے کہ اس قانون میں کیا ہے اور کیا نہیں۔ پنڈت جی نے اس پیچیدہ آئین کو بہت صاف و سلیس اردو میں پیش کیا ہے اور ملک کو ان کا ممنون ہونا چاہئے

اصطلاحات کا ترجمہ کہیں کہیں تو کیا گیا ہے لیکن اکثر جگہ چھوڑ دیا گیا ہے اور انگریزی کا اصل لفظ رکھ دیا ہے

اس صورت میں زیادہ مناسب یہ تھا کہ ان اصطلاحات کو فٹ نوٹ کے ذریعہ سے علٰحدہ بتا دیا جاتا۔ بہرحال کتاب مفید و برمحل ہے اور ہر اردو داں کو اس کا مطالعہ کرنا چاہئے۔ قیمت ایک روپیہ ہے اور ملنے کا پتہ ہندوستانی اکاڈیمی الہ آباد۔

حسین کا پیغام ۲۴ صفحات کا مختصر سا رسالہ ہے جس میں مولانا سید علی نقی صاحب نے خود حسین کی زبان سے ظاہر کیا ہے کہ حسین کس شخصیت کے انسان تھے اور ان پر پے در پے کیا مصائب نازل ہوئے، ساتھ ہی ساتھ یزیدی خلافت کا ذکر کرتے ہوئے واقعۂ کربلا پر اس پیام کو ختم کر دیا ہے۔ یہ رسالہ امامیہ مشن لکھنؤ نے شایع کیا ہے۔ قیمت ایک آنہ ہے۔

شہدائے کربلا حصہ دوم یہ رسالہ بھی امامیہ مشن لکھنؤ نے شایع کیا ہے اور مولانا سید علی نقی صاحب کی تحقیق کا نتیجہ ہے۔ اس کا حصہ اول اب سے بہت پہلے شایع ہو چکا ہے، لیکن چونکہ اس میں تمام شہدائے کربلا کا ذکر نہ ہو سکا تھا اس لئے دوسرے حصہ کی اشاعت ضروری سمجھی گئی اس میں ۲۵ شہداء کی شہادت کا بیان کیا گیا ہے اور جہاں تک استناد و حوالہ کا تعلق ہے، روایات پر اعتبار کر لینے والا انسان ان تمام جزئیات و تفصیلات پر یقین کر لینے کے لئے مجبور ہے، جو اس میں درج ہیں، لیکن جیسا کہ میں اس سے قبل کسی وقت ظاہر کر چکا ہوں، یہ بات میری سمجھ میں آج تک نہیں آئی کہ ہنگامۂ کربلا کے متعلق ایسی موشگافیاں ممکن بھی تھیں یا نہیں۔

یہ اور بات ہے کہ فسانہ کی حیثیت سے ہم ان واقعات کو پڑھ لیں لیکن تاریخی حیثیت سے ان کی اہمیت بہت کم ہے اس کی قیمت ۱۵ روپے اور ملنے کا پتہ امامیہ مشن لکھنؤ

ماہ عرب اس رسالہ میں سید محمد ہادی ہیڈ ماسٹر انجمن اسلام ہائی اسکول احمد آباد نے رسول اللہ کے مختصر حالات بچوں کے پڑھنے کے لئے یکجا کر دئے ہیں۔ عبارت بہت صاف و سلیس ہے اور انداز بیان شگفتہ۔ سب سے زیادہ مسرت مجھے یہ دیکھ کر ہوئی کہ اس میں شق صدر، شق قمر وغیرہ ایسے واقعات کے اظہار سے گریز کیا گیا ہے اور رسول اللہ کے کسی معجزہ کا ذکر نہیں کیا گیا۔ بچوں کے سامنے ایسی باتیں پیش کرنا جو ابتدا ہی سے ان کے دل و دماغ کو ماؤف بنا دیں اور توہمات پر یقین کرنا سکھائیں، سخت اصولی غلطی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ سید محمد ہادی صاحب نے اسی نیت سے ان باتوں کے بیان سے احتراز کیا۔ ... حتیاط ان کی لائق ستائش ہے۔ اس رسالہ کی قیمت ۲ روپے اور مولف موصوف سے مل سکتا ہے۔

شارستان قدس پانچ چھوٹی چھوٹی فارسی مثنویوں کا مجموعہ ہے۔ اس کے مصنف جناب محوی بدایونی ہیں۔ ان مثنویوں میں تعلیمات اسلامی کو شاعرانہ لیکن موثر لب و لہجہ میں بیان کیا گیا ہے ... معلوم ہوتا ہے کہ جناب محوی مرزا عبدالقادر بیدل اور حکیم سنائی کے مسلک سے بہت متاثر ہیں۔ زبان و انداز بیان کے لحاظ سے بھی یہ مثنویاں خوب ہیں۔ قیمت ۸ روپے اور ملنے کا پتہ نظامی پریس بدایوں

لطائف غالب اس دو جزو کے رسالہ میں ایم - اے - شاہ نے غالب کے وہ لطایف جو غالب کے مکاتیب یا تذکروں میں ان کو اچھے معلوم ہوئے یکجا کر دئے ہیں، کتابت و طباعت اچھی ہے اور کاغذ بھی قیمتی استعمال کیا گیا ہے، قیمت ۴ر ہے اور ملنے کا پتہ مکتبہ پنجاب ریلوے روڈ لاہور

قرآن پاک مولوی عبد الواحد صاحب سندھی نے اس رسالہ میں تمام وہ ضروری معلومات یکجا کر دئے ہیں جو قرآن پاک کے متعلق بچوں کو معلوم ہونا چاہئے۔ یہ کتاب گویا قرآن کی تاریخ ہے نہایت سلیس انداز میں اور ایسے الفاظ میں کہ بچے انھیں آسانی سے پڑھ سکیں اور سمجھ سکیں، مکتبۂ جامعۂ دہلی نے اسے شایع کیا ہے اور ۶ر اس کی قیمت ہے - یہ کتاب غالباً جامعہ کے نصاب میں داخل ہوگی، لیکن جامعہ کی اور تمام کتابوں کی طرح اسے بھی جامعہ کے حدود سے باہر ہر مسلمان بچے کے مطالعہ میں آنا چاہئے

جامعۂ ملیہ کی تین اور کتابیں بچوں کے لئے جنگو کی بلی - انعامی مقابلہ - پوری جو کڑھائی سے نکل بھاگی مکتبۂ جامعہ نے بچوں کے لئے دلچسپ کہانیوں کا سلسلہ عرصہ سے شروع کر رکھا ہے جو پیام تعلیم میں چھپتی رہتی ہیں، یہ تینوں کہانیاں بھی اسی سلسلہ کی ہیں اور خوب ہیں ضرورت ہے کہ چھوٹے بچوں کے سامنے ایسی ہی کہانیاں پیش کی جائیں جو زبان کے لحاظ سے غلطی سے پاک ہوں اور نتیجہ کے لحاظ سے سبق آموز ہوں - یہ کہنا غالباً غلط نہ ہوگا کہ اسوقت ہندوستان میں کوئی ادارہ ایسا نہیں جو جامعہ ملیہ سے بہتر اس خدمت کو انجام دے رہا ہو - ان کی قیمت علی الترتیب ۲ر - ۳ر اور ۲ر ہے

غزل :

اعجاز اکبر آبادی

برہم نگاہیوں سے تماشا نہ کیجئے
للہ نظم دہر تہ و بالا نہ کیجئے

وہ حاصل حیات ہیں، وہ مرکز امید
کیا کیجئے جو اُن کی تمنا نہ کیجئے

وابستہ ہر خلش سے رہے یاد آپ کی،
اچھا ہے دردِ دل کا مداوا نہ کیجئے

غم اور وہ بھی پھر غمِ اُلفت زہے نصیب
یہ اور بات ہے کہ گوارا نہ کیجئے

آپ اور مجھ سے ترکِ تعلق، نہیں نہیں
کچھ کیجئے، مگر یہ ارادہ نہ کیجئے

کونین بھی کوئی اگر اس کے صلے میں دے
اعجاز شرحِ راز گوارا نہ کیجئے

دیوار کے اُس طرف

اُس طرف ہر رُخ پر افشاں جلوۂ رنگِ جمال — اِس طرف ہر چہرہ فرطِ ناتوانی سے نڈھال
اُس طرف چشمِ مسرت میں رعونت کا خمار — اِس طرف ہے غازۂ رخ رنج و محنت کا غبار
اُس طرف گھنٹہ، گھڑی، گھڑیال ہیں اوقات ساز — اِس طرف دنیا ہے قیدِ وقت سے بھی بے نیاز
اُس طرف نازک کفِ دولت میں پھولوں کی چھڑی — اِس طرف افلاس کے ہاتھوں میں بھاری ہتکڑی
اُس طرف ہے کاروبارِ زر پہ گھنٹوں گفتگو — اِس طرف بیتاب کُن یک پارہ ناں کی جستجو
اُس طرف کوٹھی پہ "بیگم" کو قناعت ہی نہیں — اِس طرف چھپر میں پورا گھر کا گھر عزلت نشیں
اُس طرف سینے میں اک پتھر کا ٹکڑا جائے دل — اِس طرف ہستی سراپا درد و گیسو پا بگل
اُس طرف ہیں کاہلی اور کسل سے ماتھے پہ بل — اِس طرف محنت کے باعث مرد کے بازو ہیں شل
اُس طرف انفاس عالم ہیں مئے عشرت میں غرق — اِس طرف انساں سراپا گرد از پا تا بہ فرق
اُس طرف حاصل ہوائے گرم میں خس اور گلاب — اِس طرف ہے تشنگی اور روئے صحرا کا سراب
اُس طرف سرگوشیاں کرتے ہیں برقی قمقمے — اِس طرف لڑتے ہیں تاریکی سے مٹی کے دئے
اُس طرف ہے خوبصورت جسم پر ہر جامہ تنگ — اِس طرف صحت کے گر جانے سے منہ کا زرد رنگ
اُس طرف ہے ریڈیو پر نغمۂ نو کی تلاش — اِس طرف ٹوٹا ہوا دل اور مسلسل ارتعاش
اُس طرف روشن ہیں تعلیم و تمدن کے چراغ — اِس طرف کچلا ہوا ہے جہل و پستی سے دماغ
اُس طرف ہے جادۂ ہستی، بساطِ کہکشاں — اِس طرف دم گھونٹ دینے والا زہریلا دھواں

حل طلب ہے مدتوں سے ہمنشیں یہ مسئلہ
اُس طرف تو ہے خدا، کیا اِس طرف بھی ہے خدا؟

فضل الدین اثر

خودشناس اقبال

دیدۂ دل باز کر، شمعِ حقیقت سے دیکھ — زندہ ہو اقبال ابھی چشمِ بصیرت سے دیکھ
تیغِ محبت کا زخم بھر نہیں سکتا کبھی — عشق کا مارا ہوا، مر نہیں سکتا کبھی
نشۂ جامِ خودی، چڑھ کے اترتا نہیں — حق نگر و خودشناس مر کے بھی مرتا نہیں

رابطۂ جسم و جاں راز ہے اک طرفہ راز — گاہ صدا ساز میں گاہ صدا میں ہو ساز
کل تلک آواز تھی زیر و بم ساز میں — آج ہے خود ساز گم اپنی ہی آواز میں

یعنی متاعِ وجود ہو گئی صرفِ خودی
اتنی فروزاں ہوئی شمع کہ خود جل بجھی

سرمست تمکین

بہکی بہکی باتیں

ہم سخن ہم نوا نہیں ملتا — زندگی میں مزہ نہیں ملتا
ایسی منزل پہ آگیا ہے شباب — سامنے راستہ نہیں ملتا

فطرت میں رنگ بھرنے کی ہمت نہ کر سکے — مرنا ہی تھا جینے کی حسرت نہ کر سکے
مجبوریوں کے جبر کا کیا دیجئے جواب — ہم چاہتے تھے اور محبت نہ کر سکے

مجاز (اسراری)

غزل :— خانصاحب مرزا جعفر علی خاں اثر لکھنوی

اور انداز ترا حسرتِ منزل ہو جائے
دل جو لذت کشِ محرومیٔ حاصل ہو جائے

ہاں چمن زار محبت میں بہار آتی ہے
نام اک نکہت بر باد کا جب دل ہو جائے

دل صد پارہ سے یوں اُلجھی ہو وہ شوخ نگاہ
جیسے سورج کی کرن پھول پہ مائل ہو جائے

اپنے بسمل کے تڑپنے کا تماشا تو دیکھ
تو سہی تُو بھی جو بے دردنہ بسمل ہو جائے

ایک اُچٹتی سی نگہ پر ہے یہ بیتابیِ دل
حال پوچھے کوئی اسوقت تو مشکل ہو جائے

ہائے کس لطف سے یہ عمر دو روزہ گزرے
تھوڑی مستی بھی اگر ہوش میں شامل ہو جائے

امتحاں طاقت دیدار کا جائز ہے، مگر
جب نظارہ بھی دھڑکتا ہوا اک دل ہو جائے

مجھ کو الزام نہ دے، آپ کو بدنام نہ کر
دعوے عشق غلط کیوں ہو، جو باطل ہو جائے

مان جائے بھی اگر حسنِ تماشا دشمن
شوقِ بیتاب سراپردۂ محمل ہو جائے

ہوشمندوں سے کہیں معرکے سر ہوتے ہیں
کاش دیوانہ کوئی رہبرِ منزل ہو جائے

ناخدا سے یہ کہے کون، کہ ہمت ہو اگر
موجِ طوفانِ بلا، دامنِ ساحل ہو جائے

کیا کرے کوئی گلہ اُن کے تغافل کا اثر
شوق جب آپ تمناؤں کا قاتل ہو جائے

علاءالدین کے عہد میں اس قدر مسجدیں، خانقاہیں، حوض، مینار اور حصار طیار ہوئے کہ کسی اور بادشاہ کو نصیب نہیں ہوئے۔ فرشتہ لکھتا ہے کہ:۔ علاؤالدین کے شاگرد پیشہ کی تعداد ۵۰ ہزار تھی جن میں سات ہزار صرف معمار و گلکار تھے جو بڑی سی بڑی عمارت کو چند ہفتوں میں طیار کر دیتے تھے۔ تمام سلطنت میں سڑکیں کثرت سے بن گئی تھیں اور نہایت عمدہ حالت میں تھیں

جب سلطان قطب الدین مبارک شاہ (علاؤالدین کے بیٹے اور جانشین) نے دہلی سے دولت آباد تک کا سفر کیا ہے تو اسوقت کا حال ابن بطوطہ نے لکھا ہے کہ "دہلی سے دولت آباد (دیوگڑھ) تک چالیس دن کا سفر تھا اور ان دونوں شہروں کے درمیان جو سڑک تھی اس کے دونوں جانب بید وغیرہ کے درخت لگے ہوئے تھے ایک مسافر ایسا محسوس کرتا تھا کہ گویا وہ کسی باغ کی روش پر چل رہا ہے۔ ہر میل پر ڈاک کی چوکی تھی اور راستہ میں ہر جگہ اس کو تمام ضرورت کی چیزیں اس قدر فراوانی سے دستیاب ہوتی تھیں گویا بازار لگا ہوا ہے۔

یہاں سے اور سڑکیں مہیند کی راہ کی معبر اور تلنگانہ تک بنی ہوئی تھیں۔ ہر منزل پر بادشاہ اور دیگر مسافروں کے قیام کے لئے مکانات بنے ہوئے تھے۔ مفلس مسافروں کو زاد راہ کی متعلق فکر نہیں ہوتی تھی اور ان کو تمام چیزیں مفت ملتی تھیں"

سب سے پہلے جو شخص ہاتھی پر عماری رکھ کر سوار ہوا علاؤالدین خلجی تھا۔ چنانچہ امیر خسرو فرماتے ہیں:۔

کسے در شاہی واندر سواری
جز او ننہاد بر فیلان عماری

سلطان علاؤالدین اپنے عزم و جبروت، اپنی سطوت و سیاست کے لحاظ سے تاریخ ہندوستان کا عجیب و غریب بادشاہ ہوا ہے۔ اس کے عہد کی چند خصوصیات کو ضیاء برنی نے ایک جگہ حسب ذیل جمع کیا ہے:۔

۱۔ غلہ۔ کپڑا اور دیگر اشیاء کی ارزانی
۲۔ مسلسل فتوحات اور دولت کا بیشمار انبار
۳۔ بڑی فوج کا قیام قلیل خرچ سے
۴۔ باغیوں کی سرکوبی اور تمام راجاؤں اور ماتحت فرمانرواؤں کا اطاعت شعار رہنا
۵۔ مغلوں کی تباہی
۶۔ ملک کے تمام راستوں کی حفاظت
۷۔ بازاری لوگوں کا ایماندار ہو جانا
۸۔ مسجدوں، میناروں، قلعوں، تالابوں وغیرہ کا کثرت سے تعمیر کیا جانا

۹۔ آخری دس سال کے اندر مسلمانوں کا عام طور سے دیانت و امانت عدل و انصاف پسندی کی طرف مائل ہو جانا

خضر خاں اور دیول رانی

عہد علائی کے خاص واقعات میں، خضر خاں (اس کے بیٹے) اور دیول رانی (راجہ رائے کرن کی بیٹی) کا واقعہ عشق و محبت ہے۔ لیکن تاریخ فیروز شاہی میں جو اس عہد کی نہایت مستند تاریخ ہے اس واقعہ کا ذکر نہیں کیا ہے۔ اسی طرح

علاؤالدین اور پدمنی

خود علاؤالدین کا راجہ چتوڑ گڈھ کی رانی پدمنی کے حسن و جمال کا شہرہ سنکر اس پر عاشق ہونا اور پدمنی کا آگ میں جلکر جان دینا بھی کہیں ضیاء برنی نے تحریر نہیں کیا۔ حالانکہ وہ اک متعصب مزاج تھا اور اس نے تمام وہ باتیں ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر درج کی ہیں جن سے علاؤالدین پر کوئی الزام عاید ہو سکتا ہے۔ لیکن اس نے یہ واقعہ درج نہیں کیا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ را خضر خاں اور دیول دیوی کا افسانہ عشق سو اس کو امیر خسرو نے ضرور ایک مثنوی کی صورت میں درج کیا ہے۔ لیکن اس کی صورت یہ تھی کہ خضر خاں نے امیر صاحب کو طلب کیا اور چند مسودات دیکر کہا کہ انمیں میرے اور دیول دیوی کے واقعات عشق و محبت درج ہیں ان کو نظم کر دیجئے چنانچہ آپ نے تعمیل ارشاد کردی[1]

دکن کی فتوحات

جب علاؤالدین اصلاحات سے فارغ ہوا تو اس نے توسیع سلطنت کی طرف پھر توجہ کی۔ چونکہ رنتھنبور اور چتوڑ کو وہ اس سے قبل فتح کر چکا تھا اس لئے پھر اس نے دکن کو اپنی تاخت کا جولانگاہ بنانا پسند کیا

ملک کافور دیوگیر میں

چنانچہ اس نے ملک کافور ہزار دیناری کو (جو ایک خوبصورت خواجہ سرا اور بادشاہ کا محبوب غلام تھا) ۷۰۶ھ ۱۳۰۶ء میں دیوگڈھ کی جانب روانہ کیا، جہاں کے راجہ نے خراج دینا بند کر دیا تھا اس مہم میں ملک کافور کامیاب ہوا اور علاوہ بہت سے مال غنیمت کے وہاں کے راجہ رام دیو کو مع اس کے بیٹوں کے دہلی لے آیا۔ بادشاہ نے راجہ کی بہت عزت کی اور ایک لاکھ تنکہ دیکر پھر حکومت دیوگیر اس کے سپرد کردی

ملک کافور تلنگانہ میں

دوسرے سال ملک کافور تلنگانہ کی طرف روانہ کیا گیا۔ (اس سے قبل ۷۰۳ھ میں بادشاہ نے تلنگانہ پر حملہ کیا تھا لیکن ناکامیاب رہا تھا) اس جنگ میں ورنگل مفتوح ہوا اور راجہ نے خراج دینا منظور کیا۔ اس مہم میں ایک سو ہاتھی سات ہزار گھوڑے اور بہت سے جواہرات ہاتھ آئے

ملک کافور ملابار میں

۷۰۹ھ ۱۳۱۰ء میں ملک کافور ساحل ملابار گیا اور وہاں کے قدیم دارالحکومت، دور سمندر کو فتح کر کے میسور تک بڑھ گیا اور معبر کے مشہور مندر کو مسمار کیا۔ اس تاخت میں ۶۱۲ ہاتھی، بیس ہزار گھوڑے جواہرات کے بہت سے صندوق، ۹۶ ہزار من سونا (جو موجودہ حساب سے ۲۹۰۰ ٹن کے برابر ہوا) ہاتھ آیا۔ جس وقت یہ دولت قصر سیری میں بادشاہ کے سامنے پیش کی گئی تو اس نے منوں کے حساب سے سونا لوگوں کو تقسیم کیا

ملک کافور نے دکن کے تمام شمالی حصہ کو سلطنت دہلی کا باجگذار بنا دیا۔ اور یہ زمانہ علاؤالدین کے انتہائی عروج کا سمجھنا چاہئے البتہ آخر وقت میں ملک کافور کے اقتدار کی وجہ سے امرا میں برہمی پھیل گئی تھی اور نظام حکومت میں تزلزل واقع ہو گیا تھا۔ علاؤالدین اس کو محسوس کرتا تھا لیکن قوا مضمحل ہو جانے کی وجہ سے وہ بیدست و پا ہو رہا تھا۔

[1] عشقیہ یا عشیقہ (امیر خسرو) الیٹ ص ۵۴۴-۵۴۵

علاؤالدین کا انتقال

حسب روایت فرشتہ سلطان علاؤالدین نے ۶ شوال ۷۱۶ھ (جنوری ۱۳۱۵ء یا ۱۳۱۶ء) کو بعارضہ استسقا انتقال کیا۔ بدایونی، امیر خسرو و برنی نے سنہ وفات ۷۱۵ھ تحریر کیا ہے اور یہی درست معلوم ہوتا ہے۔ اس نے بیس سال اور چند ماہ تک سلطنت کی

شہاب الدین بن علاؤالدین خلجی

۷۱۵ھ جنوری ۱۳۱۵ء / ۱۳۱۶ء　　۷۱۶ھ ۱۳۱۶ء

سلطان قطب الدین مبارک شاہ بن علاؤالدین خلجی

۷۱۶ھ ۱۳۱۶ء　　۷۲۰ھ ۱۳۲۰ء

ناصر الدین خسرو شاہ

۷۲۰ھ ۱۳۲۰ء

خضر خاں کی ولی عہدی

سلطان علاؤالدین[1] نے وقت آخر میں خضر خاں اپنے بڑے بیٹے کو ولی عہد بنانا چاہا اور قلعہ گوالیار سے اُسے طلب کرنے کا حکم دیا لیکن چونکہ ملک کافور کے مصالح کا اقتضاء یہ نہ تھا کہ وہ تخت نشین ہو اس لئے وہ ٹالتا رہا حتیٰ کہ علاؤالدین کا انتقال ہو گیا اور اس کے دوسرے دن ایک نوشتۂ سلطانی اس مضمون کا پیش کر کے کہ خضر خاں کی ولی عہدی منسوخ

---

[1] ابن بطوطہ لکھتا ہے کہ:۔ علاؤالدین کے پانچ بیٹے تھے خضر خاں[1]۔ شادی خاں[2]۔ ابوبکر خاں[3]۔ مبارک خاں[4]۔ شہاب الدین[5]۔ سلطان علاؤالدین مبارک خاں کی طرف زیادہ متوجہ نہ تھا۔ اپنے اور بیٹوں کو اس نے طبل و علم دیگر شاہانہ اعزاز سے سرفراز کر رکھا تھا لیکن اس کی طرف سے بے خبر تھا ایک دن علاؤالدین نے اس کو بلا کر کہا کہ میں تمھیں بھی وہی عزت دینا چاہتا ہوں جو تمھارے اور بھائیوں کو حاصل ہے اسنے جواب دیا کہ صرف خدا عزت دینے والا ہے اس جواب سے سلطان علاؤالدین بہت برہم ہو گیا

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۱۸۰ پر ملاحظہ ہو)

شہاب الدین کی تخت نشینی ۔ ملک کافور کے مظالم ۔ ملک کافور کا قتل ۔ مبارک شاہ قطب الدین کی تخت نشینی

کی جاتی ہے، شہاب الدین کو جو سب سے چھوٹا لڑکا علاؤالدین کا تھا اور اس کی عمر اس وقت صرف ۶ سال کی تھی تخت نشین کر کے تمام انتظامات اپنے ہاتھ میں لے لئے اور خاندان علاؤالدین کے تمام افراد کو تباہ کرنے پر آمادہ ہوگیا۔ شادی خاں اور ابوبکر خاں کو اندھا کرا کے گوالیار بھیجدیا اور وہیں خضر خاں کی بھی آنکھیں نکلوالیں۔ اب صرف ایک مبارک خاں رہ گیا تھا تو اسکو بھی قید کر لیا اور چند سپاہی قتل کرنے کے لئے روانہ کئے لیکن جب یہ سپاہی مبارک خاں کے پاس پہونچے تو اس نے ملائے مروارید ان کے سامنے ڈالدیا اور اپنے باپ کے حقوق یاد دلائے اس سے یہ لوگ متاثر ہو کر واپس آگئے اور اپنے افسران مبشر و بشیر سے سارا حال بیان کیا۔ چنانچہ انھوں نے اس رات ملک کافور کو قتل کردیا اور اس طرح ۸ محرم ۷۱۵ھ[1] کو مبارک شاہ سلطان قطب الدین لقب اختیار کر کے تخت نشین ہوا

اول اول اس نے صد درجہ خوش خلقی کا ثبوت پیش کیا یعنی سترہ ہزار قیدی رہا کئے۔ جلاوطنوں کو وطن واپس آنے کی اجازت دی اور فوج کو ۶ ماہ کی تنخواہ یک مشت دیگئی امرا و ملوک کی جاگیریں اور منصب بڑھائے گئے۔ تمام سخت محصول منسوخ کردئے۔ بازار کے جو انتظامات علاؤالدین نے قایم کئے تھے یک قلم موقوف ہوگئے۔ علماء و صلحاء کے وظایف میں اضافہ کردیا انعام و اکرام کی چاروں طرف سے بارش ہونے لگی لیکن ظاہر ہے کہ جن اصول کے اوپر علاؤالدین نے سلطنت قایم کی تھی انکا دفعۃً اٹھا دینا کبھی مفید نہ ہوسکتا تھا چنانچہ نتیجہ وہی ہوا کہ رعایا کا طبقہ تباہ ہونے لگا۔ امرا وغیرہ کا اقتدار بڑھ گیا اور رفتہ رفتہ جو نقایص دولت کے بیجا استعمال سے رونما ہونے لگتے ہیں وہ سلطنت میں ظاہر ہونے لگے۔ جس طرح علاؤالدین نے ملک کافور کو ادنےٰ درجہ سے وزارت کے عہدہ تک پہونچا دیا، اسی طرح قطب الدین مبارک شاہ بھی ایک نومسلم پروار زادہ سے مانوس ہوگیا۔ اس کا نام حسن تھا اور پہلوانان گجرات میں تھا۔ مبارک شاہ نے اس کو خسرو کا خطاب دیکر سارے انتظام کا مختار واحد بنا دیا

چونکہ حسن پہلے ہندو تھا اس لئے جب اس کا اقتدار قایم ہوگیا تو اس نے علانیہ ہندوؤں کو ترقی دینی شروع کی اور

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۱۸۹)

خضر خاں سب سے بڑا بیٹا تھا اور بادشاہ اس سے خوش بھی تھا لیکن اسکے ماموں سنجر نے علاؤالدین کی حیات ہی میں خضر خاں کو تخت نشین کرنے کی سازش کی جس کا پتہ ملک کافور کو مل گیا اور اس نے بادشاہ کی اجازت سے سنجر کو قتل اور خضر خاں کو قلعۂ گوالیار میں قید کرادیا۔ وقت آخر میں سلطان علاؤالدین نے ملک کافور کو حکم دیا کہ خضر خاں کو بلا کر اس کی ولی عہدی کا اعلان کردیا جائے لیکن ملک کافور ٹالتا رہا یہاں تک کہ علاؤالدین مرگیا ملک کافور نے ابوبکر خاں اور شادی خاں کو اندھا کرا کے گوالیار بھیجدیا اور خضر خاں کی آنکھیں جو پہلے ہی سے گوالیار کے قلعہ میں محبوس تھا نکلوالیں اس کا مقصود یہ تھا کہ سب سے چھوٹے لڑکے شہاب الدین کو تخت نشین کر کے سلطنت اپنے ہاتھ میں لیلے

[1] صاحب طبقات اکبری، فرشتہ اور ضیاء برنی نے ۷۱۵ھ تحریر کیا ہے لیکن امیر خسرو مثنوی نہ سپہر میں ۷۱۶ھ لکھتے ہیں۔

مسلمانوں کی ذلت میں کوئی کسر نہ اُٹھا رکھی

خسرو خاں اور اس کی تخت نشینی

آخر کار خسرو خاں نے ۷۲۰ھ[1] میں مبارک شاہ اپنے محسن کو قتل کر دیا اور خود تخت نشین ہوگیا۔ اس وقت تمام مسلمان امراء و ملوک سخت پریشان تھے۔ خسرو خاں علاؤ الدین کے تمام افراد کو تہ تیغ کر کے خاتونان حرم کی ہر ممکن توہین کر رہا تھا یہاں تک کہ اس نے مرحوم بادشاہ کی ملکہ سے بجبر شادی بھی کرلی۔ علانیہ مذہب اسلام کی توہین شروع کر دی تھی۔ تمام بڑے بڑے عہدے ہندوؤں کو دے دیئے جا رہے تھے اور جو چند مسلمان مالک و صوبہ دار رہ گئے تھے ان کو بھی خسرو خاں قتل کر دینا چاہتا تھا

خسرو خاں کا قتل

اس وقت غازی ملک دیپال پور کا حاکم تھا اور ان حالات کو سن سن کر مضطرب ہو رہا تھا۔ بارہا اس نے ارادہ کیا کہ خسرو خاں کا مقابلہ کرے لیکن چونکہ اس کا بیٹا ملک فخر الدین جونا خاں۔ خسرو خاں کے قبضہ میں تھا اس لئے خاموش رہ جاتا تھا۔ آخر کار جب جونا خاں خفیہ طور سے اپنی جان بچا کر دہلی سے بھاگ نکلا اور اپنے باپ کے پاس پہونچ گیا تو غازی ملک نے خسرو خاں کے خلاف فوج کشی کی اور ۷۲۱ھ[1] میں خسرو خاں قتل کیا گیا

جب غازی ملک اس جنگ سے فارغ ہوا اور خسرو خاں قتل ہوا تو اس نے تمام امراء کو بلا کر کہا کہ خدا کے فضل و کرم سے میں نے اپنے ولی نعمت کا انتقام لے لیا اب تم لوگ جس کو مناسب سمجھو تخت نشین کر دو

غازی ملک کی تخت نشینی

چونکہ خاندان خلجی میں اب کوئی شخص باقی نہ رہا تھا اس لئے سب نے بالاتفاق غازی ملک کا ہاتھ پکڑ کر تخت سلطنت پر بٹھا دیا اور غیاث الدین تغلق کا خطاب دیا[2]

سلطان قطب الدین نے بارہ سال اور چار ماہ تک حکومت کی اور خسرو خاں کچھ دن کم پانچ ماہ تک حکمراں رہا

---

[1] فرشتہ نے ۷۲۱ھ تحریر کیا ہے۔ بدایونی۔ صاحب طبقات اور ضیاء برنی نے ۷۲۰ھ درج کیا ہے

[2] فرشتہ ۱۲۳ - ۱۳۰ - تاریخ فیروز شاہی ۴۱۱ - ۴۲۹ - بدایونی ۵۲ - ۵۷ - برنی (الیٹ) ۳ - طبقات اکبری ۸۶ - ۹۵ -
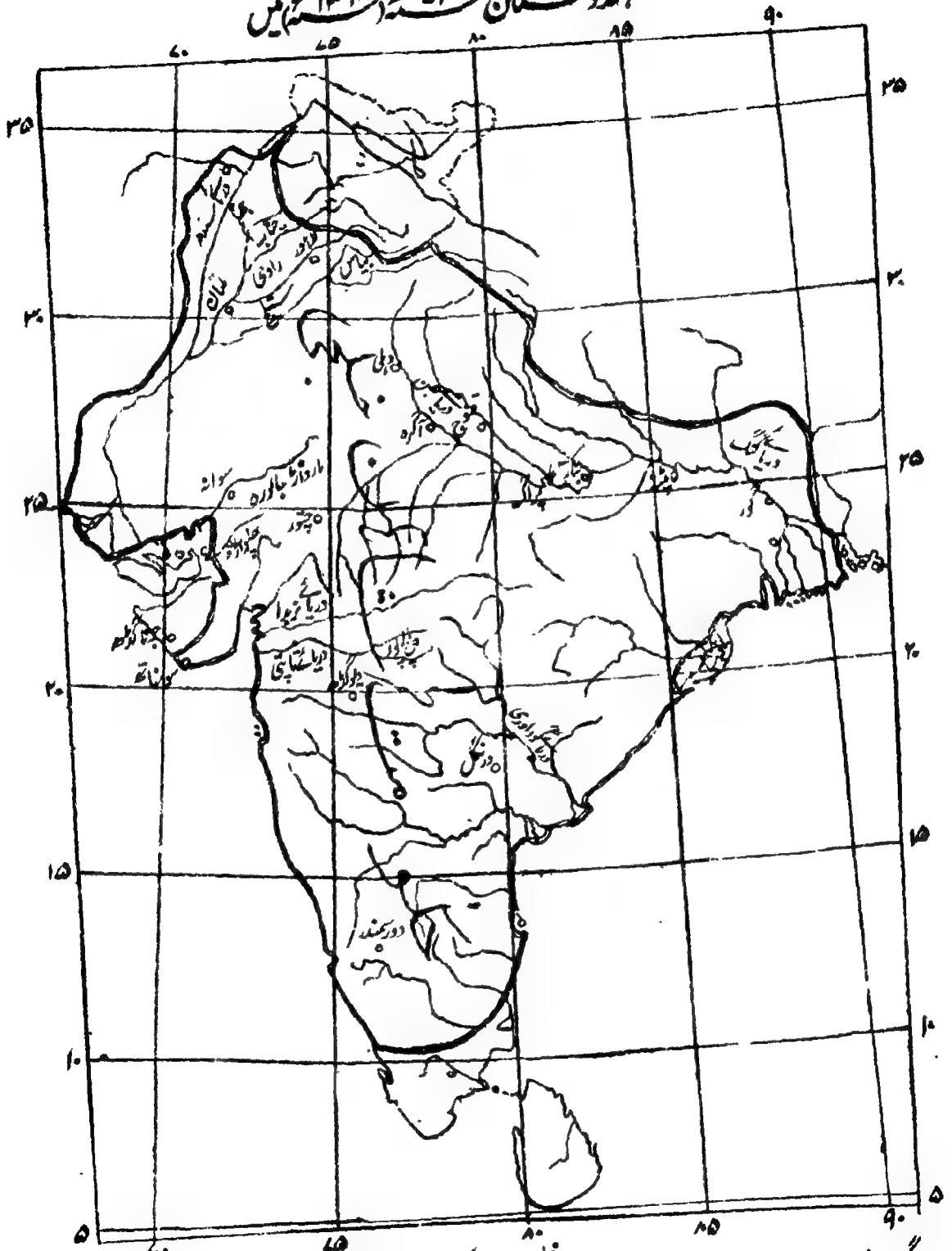
خاندان خلجی کا رقبۂ حکومت

باب دہم

خاندان تغلق

(غیاث الدین تغلق ۷۲۰ھ/۱۳۲۰ء تا ۷۲۵ھ/۱۳۲۵ء)

غیاث الدین خاندان "تغلق"[1] کا پہلا بادشاہ تھا۔ اور اس میں کلام نہیں کہ خسرو خاں کے بعد اس کا بادشاہ ہو جانا لوگوں کے لئے صد درجہ باعث سکون و مسرت ثابت ہوا۔ اس نے حسن انتظام و تلافی مافات میں کوئی دقیقہ کوشش کا اٹھا نہیں رکھا۔ بہ حیثیت ایک آزمودہ کار افسر ہونے کے جو شہرت اس نے صوبۂ پنجاب (دیبال پور) میں حاصل کی تھی،

---

[1] لفظ تغلق کے متعلق اکثر مورخین نے سکوت اختیار کیا ہے۔ فرشتہ کو عہد جہانگیری میں لاہور کے بعض محققین کے ذریعہ سے یہ معلوم ہوا تھا کہ غیاث الدین کا باپ تغلق، غلامان غیاث الدین بلبن میں سے تھا اور اس نے ایک جاٹنی سے شادی کر لی تھی، جس سے غیاث الدین پیدا ہوا۔ صاحب خلاصۃ التواریخ نے بھی غیاث الدین کے نسب کے متعلق یہی تحریر کیا ہے۔ اب رہا لفظ تغلق، سو اس کی نسبت ملحقات کے حوالہ سے فرشتہ لکھتا ہے کہ "تغلق، اصل میں "قتلغ" تھا۔ قتلغ، ترکی لفظ ہے جو ہندوستان میں بگڑ کر "تغلق" ہو گیا

مارکوپولو مشہور سیاح ظاہر کرتا ہے کہ "قرونیہ" ترکی زبان میں مخلوط النسل کو کہتے ہیں چونکہ تاتاریوں کی ایک جماعت نے ہندوستانی عورتوں سے شادی کر کے یہیں قیام کر لیا تھا اس لئے ان کی نسل کو "قرونیہ" (مخلوط النسل) کہنے لگے۔ شمس سراج عفیف نے اپنی تاریخ فیروز شاہی میں لکھا ہے کہ "میں نے اپنی تصنیف "مناقب سلطان تغلق" میں غیاث الدین کے سلسلۂ نسب سے پوری بحث کی ہے لیکن افسوس ہے کہ یہ تصنیف آج بالکل معدوم ہے۔ وصاف نے لکھا ہے کہ "قرونیہ اس جماعت کا نام بھی تھا جو خراسان کے چغتائی فوج کے توپ خانہ سے متعلق تھی۔ ممکن ہے غیاث الدین کا سلسلۂ نسب اسی جماعت سے ملتا ہو اور اسی بنا پر اسے قرونیہ ترک کہا گیا ہو۔ (بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۱۹۴ پر ملاحظہ کیجئے)

اور قبل بادشاہ ہونے کے جس پامردی و قابلیت کے ساتھ وہ تاتاری فتنہ کو ہندوستان سے دور کرنے میں کامیاب ہوا تھا[1]۔ وہ عنان سلطنت ہاتھ میں لینے کے بعد بھی باقی رہی اور اس نے اپنی دیانت و امانت، محنت و جفاکشی، حزم و احتیاط عقل و فراست سے کام لے کر اس تمام تزلزل کو جو آخری سلاطین خلجی اور خسرو خاں کے عہد حکومت میں پیدا ہو گیا، دور کر کے مملکت ہند کو اپنی اصلی حالت پر لے آیا۔

اس نے عہد علائی کے تمام معزول و تباہ شدہ امراء کو طلب کر کے، اُن کے مواجب و انعامات بحال کئے، خاندان علائی کے بقیۃ السیف افراد کی حد درجہ عزت کی اور خواتین خلجیہ کا احترام کرنے میں اس نے اپنی ساری کوشش صرف کر دی۔ الغرض ملک کا نظام حکومت جو بہت ابتر ہو گیا تھا اس کو ایک ہفتہ کے اندر اصلی حالت پر لے آیا۔ مستحقین کے حقوق ادا کئے اور ظالموں کی دار و گیر شروع کی

وہ حد درجہ معتدل مزاج تھا اور افراط و تفریط سے ہٹ کر ایک مناسب رائے تمام امور میں قایم کیا کرتا تھا۔ کام کرنے والے لوگوں کی اس نے قدر کی اور ناکارہ لوگوں کو اپنے دیار سے خارج کر دیا

اس نے خراج کے اُصول از سر نو منضبط کئے اور پیداوار کے دسویں یا گیارھویں حصہ سے زیادہ محصول لینے کی سخت ممانعت کر دی۔ اس کی کوشش یہ تھی کہ ہر سال رقبہ زراعت بڑھتا جائے اور مقدم و چودھری کاشتکاران پر جبر نہ کر سکیں جن امراء و ملوک کے پاس جاگیریں تھیں ان کی انتظامی حالت کی بھی نگرانی کرتا اور جبر و تعدی پر سخت باز پرس کرتا۔ خسرو خاں نے جن لوگوں کو خزانۂ شاہی سے بیجا انعامات دئے تھے وہ سب وصول کر کے خزانہ میں داخل کئے

انعام و اکرام

جب کوئی فتح یا کامیابی کی خبر اس کو ملتی، بیٹا پیدا ہوتا، یا شاہزادوں کی شادی وغیرہ ہوتی تو تمام اکابر و علماء کو طلب کرتا اور حسب حیثیت انعامات سے سرفراز کرتا جو مشایخ و صوفیہ خلوت نشین ہوتے اُن کے پاس تحائف و نذرانے وہیں بھیجتا۔

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۱۹۳)

ابن بطوطہ لکھتا ہے کہ مجھ سے امام شیخ رکن الدین نے ملتان میں بیان کیا تھا کہ سلطان تغلق اتراک قرونیہ میں سے تھا جو سندھ اور تاتار کے درمیانی سلسلۂ کوہستانی میں رہتے ہیں۔ سلطان تغلق پہلے بہت معمولی شخص تھا اور ایک سوداگر کے ساتھ بہ حیثیت ایک سائیس ہونے کے سندھ میں آیا تھا اس وقت علاؤالدین خلجی بادشاہ تھا اور اس کا بھائی سندھ کا گورنر تھا۔ تغلق سپاہیوں میں ملازم ہو گیا اور رفتہ رفتہ اپنی قابلیت سے سوار اور میر آخور ہو گیا۔ اسکے بعد جب اس کا اقتدار اور اثر زیادہ ہوا تو امراء کبار میں داخل ہو گیا اور آخر میں ملک غازی کے خطاب سے سرفراز ہوا۔ (ابن بطوطہ) الیٹ ۳ - ۶۰۶

[1] ابن بطوطہ سے شیخ امام رکن الدین ملتانی نے بیان کیا تھا کہ - انھوں نے خود اس مسجد کو دیکھا تھا جو غازی ملک (غیاث الدین) نے ملتان میں طیار کرائی تھی۔ اس کے ایک کتبہ میں درج تھا کہ "میں نے ۲۹ بار تاتاریوں کا مقابلہ کر کے ان کو شکست دی۔ اسی بنا پر مجھے ملک غازی کہا جاتا ہے"۔ ابن بطوطہ (الیٹ) ۳ - ۶۰۶

چاہتا تھا کہ جو مسرت مجھے حاصل ہو، اس میں ساری رعایا شریک ہو، چنانچہ وہ سب کو کچھ نہ کچھ دیتا اور اکثر ایسی داد و دہش کے بہانے پیدا کرتا رہتا۔ اس کا مقصود سلطنت یہ تھا کہ سالانک فراغت و اطمینان سے زندگی بسر کرے رعایا خوش حال ہو جائے لوگ گدائی چھوڑ دیں اور حلال کی کمائی حاصل کریں۔ اسی خیال کے زیر اثر اس نے مزدوری و اُجرت میں ۲۵ فی صد اضافہ کر دیا۔ کاشتکاروں اور ہندوؤں کی حالت میں جو تمدنی انحطاط عارضی اسباب کی وجہ سے ہو گیا تھا دور ہو گیا اور پھر وہ آزادی کے ساتھ اپنے اپنے مشاغل میں مصروف ہو گئے

جس سپاہ کو خسرو خاں نے واجب سے زیادہ روپیہ تقسیم کر دیا تھا وہ آہستہ آہستہ اس نے وصول کیا اور فوج کے باب میں جو قواعد علاؤالدین خلجی نے مقرر کئے تھے (حلیہ، امتحان، داغ اور تعیین قیمت وغیرہ) وہ سب بدستور جاری رکھے البتہ اس کی احتیاط ضرور کی کہ کوئی افسر یا میر سپاہی ان کو ذلیل نہ سمجھے اور ان کے کوڑے نہ مارے

مطالبات کے وصول کرنے میں بھی وہ بہت نرمی سے کام لیتا لاکھوں کے مطالبہ میں اگر ہزاروں بھی وصول ہو جاتے تو غنیمت سمجھتا اور حد درجہ نرمی و آشتی سے کام لیکر معاملات کو طے کرتا۔ وہ نہ معمولی باتوں پر کسی کو حد سے زیادہ انعام دیتا اور نہ ضرورت سے زیادہ سختی عمل میں لاتا۔ میانہ روی اس کی خصوصیت تھی اور عدل و انصاف اس کی حکومت کا تنہا نصب العین

انھیں باتوں کے ساتھ اس نے مغلوں کی طرف سے بھی ہندوستان کو مطمئن کر دیا اور ایسی سخت ناکہ بندی کر دی کہ اسکے عہد میں ان کو حدودِ ہند کی طرف آنے کی جرأت ہی نہ ہوئی

اس نے نہریں کثرت سے کھدوائیں، باغات تعمیر کرائے ویرانوں کو آباد کیا، بنجر زمین کو تردد سے قابل کاشت کیا اور متعدد عمارات قایم کرادیں۔ حصار تغلق آباد[1] اس بادشاہ کی یادگار ہے

غیاث الدین صوم و صلوٰۃ کا بھی پابند تھا وہ ہمیشہ باجماعت نماز ادا کرتا اور تراویح کے ساتھ روزہ رکھتا۔ وہ اکثر باوضو رہتا اور شراب نہ خود پیتا اور نہ کسی کو پینے دیتا۔ کبر و غرور اس میں نام کو نہ تھا۔ مکر و فریب سے وہ بالکل ناآشنا تھا اور سادگی اس کی فطری خصوصیت تھی

فتوحات کے لحاظ سے بھی اس کا عہد کامیاب ثابت ہوا اور بنگال و دکن کی طرف عساکر سلطانی نے کافی کامیابیاں حاصل کیں۔ سنہ ۷۲۱ھ میں جب تلنگانہ اور ورنگل کے راجہ نے خراج دینے میں تامل کیا، تو غیاث الدین تغلق نے اپنے بیٹے جونا خاں کو (جسے اب الغ خاں کا خطاب عطا ہو گیا تھا) اس کی سرکوبی کے لئے روانہ کیا اور ہر چند ایک بار بعض مفسدین

---

[1] غیاث الدین نے سکونت دہلی ترک کر کے دس بارہ میل کے فاصلہ پر تغلق آباد آباد کیا اور یہیں قیام رکھا۔ اب بھی یہاں کی شکستہ عمارتیں سیاحوں کے لئے جاذبِ نظر ہیں ۱۲

کے اغوا سے لشکر میں برہمی پیدا ہوگئی، لیکن دوسرے بار کامیابی حاصل ہوئی، ورنگل فتح ہوا اور اس کا نام سلطانپور رکھا گیا

بنگال کی اطاعت

اسی طرح جب ۷۲۴ھ میں لکھنوتی (بنگال) اور سنارگاؤں (ڈھاکہ) کی طرف سے جبر و ظلم کی شکایت موصول ہوئی تو غیاث الدین نے اپنے بیٹے کو ورنگل سے طلب کرکے دارالسلطنت کا انتظام سپرد کیا، اور خود لشکر عظیم لے کر لکھنوتی کی طرف کوچ کیا۔ غیاث الدین کی سطوت و جبروت سے اس وقت سارا ہندوستان آگاہ تھا۔ اس لئے ناصر الدین[1] فرمانروائے لکھنوتی تحائف وغیرہ لے کر خود حاضر ہوا اور بہادر شاہ کو جو سنارگاؤں کا فرمانروا تھا اور بہت متکبر و مغرور ہو گیا تھا، گرفتار کرکے حضور میں پیش کیا۔ سلطان غیاث الدین نے ازراہ لطف و عنایت ناصر الدین کو "چتر و دور باش" عنایت کرکے نہ صرف لکھنوتی کا فرمانروا تسلیم کیا بلکہ سنارگاؤں کو بھی اس کے سپرد کر دیا اور قلعۂ ترہت فتح کرتا ہوا، دارالحکومت کی طرف واپس آیا اور ایک اتفاقی حادثہ سے مر گیا

وفات غیاث الدین کا سبب اور اس کی تحقیق

وفات غیاث الدین کے متعلق فرشتہ اور تمام مورخین نے تفصیلی حالات لکھے ہیں اور بعض نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ جونا خاں (الغ خاں) اس کے بیٹے نے ہلاک کیا، لیکن حالات سے اس کی تکذیب ہوتی ہے۔ واقعات یہ ہیں کہ جب غیاث الدین بنگال کی طرف سے کامیاب واپس ہوا تو الغ خاں نے افغان پور کے قریب جلدی جلدی ایک قصر طیار کرایا تاکہ غیاث الدین وہاں شب کو قیام کرکے، صبح شاہانہ جلوس کے ساتھ دارالسلطنت میں داخل ہو۔ چونکہ بادشاہ نے وہاں قیام کرنا پسند نہیں کیا، اسلئے کھانے سے فارغ ہو کر الغ خاں معہ تمام امراء کے جلدی سے باہر آ گیا کہ سفر کی طیاری کی جائے اور اسی وقت اتفاق سے قصر کی چھت گر پڑی اور سلطان معہ پانچ آدمیوں کے جن میں اس کا چھوٹا بیٹا محمود بھی تھا مر گیا۔ بعض مورخین نے خیال کیا ہے کہ یہ عمارت قصداً اسی غرض سے بنائی گئی تھی اور ابن بطوطہ[2] بھی یہی بیان کرتا ہے لیکن ابن بطوطہ اسوقت ہندوستان نہ آیا تھا اس لئے ظاہر ہے کہ یہ واقعات اس نے بعد کو سنے ہوں گے

لیکن ضیاء برنی نے، جو اس عہد کا مورخ ہے، اس کا کہیں ذکر نہیں کیا، اور اگر اس کی نسبت یہ خیال کیا جائے کہ اس نے رعایت کی تو بھی بقول فرشتہ "یہ کسی طرح سمجھ میں نہیں آتا کہ الغ خاں نے کس کرامت سے کام لیکر قصر سے باہر

---

[1] ناصر الدین، غیاث الدین بلبن کا بیٹا تھا۔ عہد خلجی میں بھی اس کے حال سے کوئی تعرض نہ کیا گیا، کیونکہ اس کے انتظام کی طرف سے کوئی شکایت نہ تھی اور لکھنوتی کے ایک گوشہ میں پڑا ہوا، چالیس سال سے حکومت کر رہا تھا۔

[2] ابن بطوطہ کا نام شیخ ابو عبداللہ محمد ابن عبداللہ ابن محمد ابن ابراہیم الطنجی ہے۔ افریقہ کے ایک مقام طنجہ کا رہنے والا تھا۔ اس نے ایشیاء کے بہت سے ملکوں میں سیاحت کی اور ہندوستان بھی آیا۔ یہ ۷۳۴ھ میں بعہد سلطان محمد تغلق دریائے سندھ تک پہونچا اور وہاں سے پایۂ تخت دہلی کی طرف سفر اختیار کیا۔ جسوقت یہ دہلی پہونچا تو سلطان موجود نہ تھا اس کی ماں نے نہایت عزت کے ساتھ اس کو ٹھہرایا اور دو ہزار دینار نقد دیکر ایک مکان بھی قیام کے لئے مرحمت کیا۔ (بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۱۹۷ پر ملاحظہ ہو)

آتے ہی چھت کو گرا دیا۔ اگر چھت کی ساخت قصداً اس قسم کی رکھی گئی تھی کہ وہ ایک وقت مقررہ پر گر جائے تو ظاہر ہے کہ الغ خاں کا پروگرام یہ نہ تھا کہ بادشاہ اسی وقت روانہ ہو جائے۔ بلکہ رات کو قیام کرے اور صبح کو روانہ ہو پھر اس کے لئے بہتر وقت رات کا ہو سکتا تھا جب بادشاہ اپنی خواب گاہ میں تنہا سوتا ہوتا نہ کہ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد۔ فرشتہ اور تمام صائب الرائے مؤرخین نے اس سے انکار کیا ہے اور اس کی وجہ سوائے اس کے اور کوئی نہیں ہو سکتی کہ عمارت صرف تین دن کے اندر طیار ہوئی تھی، چھت کمزور تھی، بادشاہ کے ساتھ بڑا لشکر موجود تھا۔ گھوڑوں اور ہاتھیوں کے دوڑنے سے جو دھمک پہنچی اس نے چھت کو گرا دیا اور اگر یہ سبب نہ تھا تو پھر حاجی محمد قندھاری کا بیان صحیح ہو گا کہ گرج کی آواز سے چھت گر پڑی، جس کو ضیاء برنی نے بھی اختیار کیا ہے۔ عبد القادر بدایونی نے منتخب التواریخ میں لکھا ہے کہ بعض لوگ غیاث الدین کی وفات کا یہ سبب قرار دیتے ہیں کہ وہ سلطان المشائخ (حضرت نظام الدین اولیاء) سے برہم تھا، چنانچہ اس نے لکھنوتی سے واپس آتے ہوئے یہ پیغام کہلا بھیجا کہ دہلی سے کہیں چلے جائیے۔ اس کو سن کر حضرت سلطان المشائخ نے فرمایا کہ "ہنوز دہلی دور است" اور اسی وقت سے یہ ضرب المثل عام ہو گئی ہے۔ لیکن ابن بطوطہ کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سلطان المشائخ کا انتقال اس سے قبل ہو چکا تھا

عہد غیاث الدین کی خصوصیت

بہر حال غیاث الدین کے مرنے کے جو اسباب بھی ہوں، اس میں کلام نہیں کہ وہ بہترین فرمانروا تھا اور اگر وہ چند دن اور حکومت کرتا تو جو اسلوب حکمرانی اس نے اختیار کیا تھا وہ زیادہ مستحکم ہو جاتا

یہ صحیح ہے کہ اس کے جانشین محمد تغلق کو ابتداء میں کثرت سے کامیابیاں حاصل ہوئیں اور سلطنت بہت زیادہ وسیع ہو گئی۔ لیکن چونکہ اس کے عہد میں بغاوتیں شروع ہو کر طوائف الملوکی کی بھی بنیاد پڑ گئی تھی، اس لئے سلاطین دہلی میں یہ امتیاز صرف غیاث الدین ہی کو حاصل ہے کہ بحیثیت فرمانروائے ہندوستان ہونے کے سب سے زیادہ وسیع مملکت

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۱۹۶)

جب سلطان واپس آیا تو اس نے اور زیادہ عزت کی۔ پانچ ہزار دینار سالانہ آمدنی کے دیہات اس کی جاگیر میں دئے اور علاوہ اس کے دس کنیزیں ... دس ہزار دینار نقد اور ایک آراستہ گھوڑا خاص اصطبل شاہی کا عنایت کیا۔ سلطان محمد نے اس کی بارہ ہزار سالانہ تنخواہ مقرر کر کے دہلی کا قاضی کر دیا اور ایک سال کی تنخواہ پیشگی دیدی۔ ایک بار یہ ۵۵ ہزار دینار کا مقروض ہو گیا اور سلطان محمد تغلق نے یہ بھی ادا کیا۔ الغرض سلطان محمد تغلق نے حد درجہ عزت و احترام کے ساتھ اس کو رکھا اور شاہ چین کے پاس ایک سفارت بھی اس کی سرکردگی میں روانہ کی۔ جب ابن بطوطہ اپنے وطن واپس گیا تو سفرنامہ مرتب کیا۔ اور اس میں اکثر سلاطین دہلی کے حالات درج کئے۔ سلطان محمد تغلق کے حالات اس نے نہایت تفصیل سے درج کئے ہیں اور اس وقت کی جو کیفیت دہلی اور دربار کی تھی مفصل تحریر کی ہے جن سے اصل کتاب میں کہیں کہیں مدد لی گئی ہے۔

اس کی زیر نگیں تھی اور آخر تک وہ اس پر قابض بھی رہا
غیاث الدین کا زمانۂ حکومت صرف چار سال اور چند ماہ رہا۔ ۷۲۵ھ میں اس نے انتقال کیا اور الغ خاں کو اپنا جانشین چھوڑ گیا

امیر خسرو کی آخری تصنیف تغلق نامہ، غیاث الدین ہی کے حکم سے ہوئی تھی جو اب کمیاب ہے۔ امیر خسرو نے بھی اسی سال انتقال کیا۔

وفات غیاث الدین ۷۲۵ھ ۱۳۲۵ء

محمد بن تغلق شاہ

(۷۲۵ھ ۱۳۲۵-۲۴ء — ۷۵۲ھ ۱۳۵۱ء)

محمد تغلق کی تخت نشینی

غیاث الدین تغلق کی وفات پر شاہزادہ جونا جسے الغ خاں بھی کہتے ہیں "سلطان المجاہد محمد بن تغلق" کا لقب اختیار کرکے ۷۲۵ھ میں تخت نشین ہوا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ قرونیہ خاندان کو دنیا میں غیر فانی بنا دینے کے لئے جو کوششیں اس بادشاہ نے کیں وہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے نظیر نہیں رکھتیں

یہ عجیب بات ہے کہ ساتویں اور آٹھویں صدی ہجری میں ہندوستان پر تین خاندانوں نے حکومت کی اور اُن میں ایک نہ ایک ہستی ضرور ایسی پیدا ہوئی جو اپنی خصوصیات کی نہایت اہم نقوش صفحۂ تاریخ پر چھوڑ گئی

غلاموں میں بلبن جو نہ صرف اپنے عزم و ارادہ بلکہ تمام شاہانہ خصایص کے لحاظ سے ایک ممتاز درجہ رکھتا ہے جس طرح خلجیوں میں علاؤالدین انتظام، آئین سازی اور سیاست دانی میں نظیر نہ رکھتا تھا، اسی طرح قرونیہ یا تغلق خاندان کے مرقع میں محمد تغلق کی تصویر نمایاں نظر آتی ہے۔ لیکن فرق یہ ہے کہ علاؤالدین جاہل تھا (ہر چند اس نے بعد کو کچھ لکھنا پڑھنا سیکھ لیا تھا) اس لئے اس کے عزایم و تدابیر میں وہ شایستگی نہ تھی، جو ایک قابل حکمراں کی طرف سے ظاہر ہوتی ہے اور برخلاف اس کے محمد تغلق کے عزایم و خیالات ایک ایسے شخص کے عزایم تھے جن سے ذہانت و فراست کا پتہ چلتا ہے

محمد تغلق کی خصوصیات

محمد تغلق نہایت شیریں بیان اور فصیح مقرر تھا عربی و فارسی میں فی البدیہ ایسے مراسلات تحریر کرا دیتا تھا کہ بڑے بڑے ماہرین فن متحیر ہو جاتے تھے۔ ذہانت و فراست کا یہ عالم تھا کہ ایک شخص کو دیکھتے ہی اس کے تمام محاسن و معایب سے اس طرح آگاہ ہو جاتا جیسے کہ برسوں کے تجربہ کا نتیجہ ہو۔ علم تاریخ میں وہ مہارت حاصل تھی کہ مشکل سے اس کے سامنے کسی کو گفتگو کی جرأت ہوتی، حافظہ اس بلا کا تھا کہ جو ایک بار دیکھ یا سُن لیتا پھر وہ نقش کالحجر ہو جاتا۔ حکمت، نجوم، ریاضی و منطق میں تبحر کی یہ کیفیت تھی کہ دقیق ترین مسایل علمیہ بات کی بات میں حل کر دیتا۔ فن شعر میں بھی اس کی جامعیت مشہور ہے

نیاز فتحپوری کی دیگر تصانیف

نگار بک ایجنسی لکھنؤ

ترغیبات جنسی (یا) شہوانیات

اس کتاب میں فحاشی کی تمام فطری اور غیر فطری قسموں کے حالات انکی تاریخ و نفسیاتی اہمیت پر نہایت شرح و بسط کیساتھ محققانہ تبصرہ کیا گیا ہے جسمیں بتایا گیا ہے کہ فحاشی دنیا میں کب اور کس کس طرح رائج ہوئی۔ نیز یہ کہ مذاہب عالم نے اسکے رواج میں کتنی مدد کی۔ اس کتاب میں آپ کو حیرت انگیز واقعات نظر آئیں گے

قیمت تین روپیہ (سے) علاوہ محصول

خریداران نگار سے ایک روپیہ کم

مجموعۂ استفسار و جواب ۳ جلد

ان تینوں جلدوں میں ۱۹۲۲ء سے لیکر ۱۹۳۶ء تک کے استفسار و جواب شایع کئے گئے ہیں۔ اس مجموعہ کی اہمیت ظاہر کرنا بیکار ہے کیونکہ نگار کو جو خصوصیت اس باب میں حاصل ہے وہ کسی سے مخفی نہیں ان تینوں جلدوں میں سیکڑوں ادبی، تاریخی، تنقیدی، مسایل شامل ہیں اور اسکی حیثیت ایک مختصر سی سائیکلوپیڈیا کی ہے۔

قیمت فی جلد تین روپیہ (سے) علاوہ محصول

خریداران نگار سے فی جلد ایک روپیہ کم

جذبات بھاشا

جناب نیاز نے ایک دلچسپ تمہید کے ساتھ بہترین ہندی شاعری کے نمونے پیش کرکے ان کی ایسی تشریح کی ہے کہ دل بیتاب ہو جاتا ہے اردو میں یہی سب سے پہلی کتاب اس موضوع پر لکھی گئی ہے اور ہندی کلام کے بے مثل نمونے نظر آتے ہیں۔

قیمت علاوہ محصول بارہ آنہ (۱۲؍)

خریداران نگار سے تین آنہ (۳؍) کم

فلاسفۂ قدیم

اس مجموعہ میں حضرت نیاز کے تین علمی مضامین شامل ہیں:-

۱- چند گھنٹے فلاسفۂ قدیم کی روحوں کے ساتھ۔

۲- مادئین کا مذہب۔

۳- حرکت کے کرشمے۔

نہایت مفید و دلچسپ کتاب ہے۔

قیمت ایک روپیہ (عہ)

علاوہ محصول

خریداران نگار سے چار آنہ (۴؍) کم

شاعر کا انجام

جناب نیاز کے عنفوان شباب کا لکھا ہوا افسانہ حسن و عشق کی تمام نشہ بخش کیفیات اس کے ایک ایک جملہ میں موجود ہیں، یہ افسانہ اپنے پلاٹ اور انشا کے لحاظ سے اس قدر بلند چیز ہے کہ دوسری جگہ اس کی نظیر نہیں مل سکتی۔

قیمت دس آنے (۱۰؍)

علاوہ محصول

خریداران نگار سے دو آنہ (۲؍) کم

فراست الید

مولفۂ نیاز فتحپوری جس کے مطالعہ سے ایک شخص بآسانی ہاتھ کی شناخت اور اس کی لکیروں کو دیکھ کر اپنے یا دوسرے شخص کے مستقبل سیرت عروج و زوال، موت و حیات، صحت و بیماری، شہرت و نیکنامی وغیرہ پر صحیح پیشین گوئی کر سکتا ہے۔

قیمت ایک روپیہ (عہ)

علاوہ محصول

خریداران نگار سے چار آنہ (۴؍) کم

مذاکرات نیاز

یعنی حضرت نیاز کی ڈائری جو ادبیات و تنقید عالیہ کا عجیب و غریب ذخیرہ ہے ایک بار اسکو شروع کر دیجئے آخیر تک پڑھ لینا ہے۔ اس کتاب کی بہت کم جلدیں باقی رہ گئی ہیں۔

قیمت بارہ آنے (۱۲؍)

علاوہ محصول

خریداران نگار سے تین آنہ (۳؍) کم

گہوارۂ تمدن

یہ وہ معرکۃ الآرا کتاب ہے جس میں تاریخ و اساطیر سے ثابت کیا گیا ہے کہ تمدن کی ترقی میں عورت نے کتنا زبردست حصہ لیا اور دنیائے تہذیب و شائستگی اس کی کس قدر ممنون ہے اردو میں اس موضوع پر اس سے قبل کوئی کتاب نہیں لکھی گئی مصنف کو اس کتاب پر ریاست بھوپال سے ایک ہزار روپیہ انعام ملا تھا۔

قیمت دو روپیہ (عـ۲)

علاوہ محصول

رجسٹرڈ نمبر اے ۱۱۰۴
DELHI
امنگ
حوصلہ
جوانمردی
نوجوانی
کمال طاقت
کمال
کمال
کمال
کمال
کمال
KAMAL کمال
REGD. رجسٹرڈ
خون کی افزائش کے لئے دنیا کی بہترین دوا ہے۔ رگ و ریشہ میں خون پہنچا کر جوش اور امنگ پیدا کرتی۔
اعصاب کو تقویت دے کر اعضا کو قوی اور مضبوط بناتی، دل و دماغ کو قوت دیتی، کسل و ماندگی سستی و کاہلی کو دفع کر کے چستی و چالاکی پیدا کرتی ہے،
غرض کہ جو قوت ایک مرد کو صحیح معنی میں مرد کہلا سکتی ہے وہ "کمال" ہی کی رہین منت ہے
نشے والی اور زہریلی چیزوں سے پاک ہے
قیمت فی شیشی آٹھ روپے
مزید معلومات کیلئے فہرست طلب کیجئے۔
TAYYEBI DAWAKHANA UNANI
INDORE BOMBAY
طیبی دواخانہ یونانی
چوک بازار اندور
تار کا پتہ "شاہی" اندور
۶۶، محمد علی روڈ بمبئی ۳
ٹیلیفون نمبر ۲۶۹۸۳

رجسٹرڈ نمبر اے نمبر ۱۱۰۰

قیمت
۸/

نہایت ضروری اعلان

گزشتہ جنوری سے اڈیٹر کے قلم کی دو کتابیں مسلسل نگار میں شایع ہو رہی ہیں۔ ایک "اسلامی ہند کی تاریخ" جو تاریخی حیثیت سے بے مثل چیز ہے اور دوسری "نغمۂ کارواں" جو اپنی ادبیت کے لحاظ سے خاص مرتبہ رکھتی ہے۔
جو حضرات شروع سال (یعنی جنوری ۳۸ء) سے رسالہ کے خریدار نہیں ہیں، ان کے لئے اب بھی وقت ہے کہ وہ جنوری سے اسوقت تک کے تمام مسلسل پرچے طلب کر کے شروع سال سے اپنی خریداری محسوب کریں، ورنہ پھر بعد کو یہ دونوں کتابیں کسی قیمت پر بھی انھیں نہیں مل سکتیں۔

منیجر نگار لکھنؤ

شمار (۲)	فہرست مضامین اگست ۱۹۳۸ء	جلد (۳۴)

اڈیٹر:- نیاز فتحپوری

شمارہ - ۲	اگست ۱۹۳۸ء	جلد - ۳۴

ملاحظات

کانگرسی وزارتوں کی ناکامیاں

اس میں شک نہیں کہ زمانہ کے ساتھ ساتھ حکومت کا معیار بھی بدلتا رہتا ہے، لیکن ایسا کبھی نہیں ہوا کہ ملک کے احساس کو کسی حکومت نے نظر انداز کر دیا ہو اور وہ زیادہ عرصہ تک قائم رہ سکی ہو۔ چنگیز و ہلاکو، نیرو اور کالیگولا کی حکومتوں کا ذکر نہیں، بنو امیہ و بنو عباس کو دیکھئے کہ علویین کی جماعت ان کے مقابلہ میں کیا تھی لیکن پھر بھی اس نے شیرازۂ حکومت منتشر کر ہی دیا۔ نہ اقلیت و اکثریت کی جنگ کوئی نئی چیز ہے اور نہ بڑی بڑی سلطنتوں کا ذرا سی غلطی سے تباہ ہو جانا کوئی نیا واقعہ لیکن اسباب و نتائج پر غور کرنے والوں کے لئے یہ بات ضرور حیرت میں ڈال دینے والی ہے کہ ایک حکمراں جماعت اعتماد پیدا کرنے سے قبل ہی اپنا اعتماد کھو بیٹھے۔ پھر اور صوبوں کے متعلق تو میں نہیں کہہ سکتا لیکن یو پی کی حکومت کی نسبت ضرور کہہ سکتا ہوں کہ اس نے یہی حیرت میں ڈال دینے والی حرکت کی ہے اور بجائے سنبھلنے کے اسکی حالت روز بروز بگڑتی ہی جا رہی ہے

اول اول جب کانگرسی وزراء نے عنانِ حکومت ہاتھ میں لی تو اہل صوبہ کی بڑھی ہوئی توقعات کا یہ عالم تھا کہ ہر متنفس

بلا تفریق نسل و قوم یہی یقین رکھتا تھا کہ حکومت اب اُسی کی ہے اور اس کے عجز و درماندگی کا زمانہ گزر گیا ہے، لیکن جوں جوں دن گزرتے گئے یہ یقین شک میں تبدیل ہوتا رہا یہاں تک کہ رفتہ رفتہ سال ختم ہونے سے پہلے ہی یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ جس چیز کو ہم نے سونا سمجھا تھا وہ صرف ملمع تھا اور جس کیفیت کو ہم نے خلوص و صداقت سے تعبیر کیا تھا اس کا تعلق دل سے نہیں بلکہ صرف زبان سے تھا

کانگرس کی بین الاقوامی اہمیت کا راز صرف یہ تھا کہ وہ ہندوستان کی جماعتوں کی نمائندہ تھی۔ اس کی یہی مرکزیت تھی جس کے توڑنے کی ہمیشہ کوشش کی گئی اور اس کا یہی متحدہ محاذ تھا جس نے اتنی کامیابی حاصل کی پھر اب کہ کانگرس رفتہ رفتہ اپنی اس خصوصیت کو کھوتی جارہی ہے کیا وہ صرف اکثریت کی نمائندہ ہو کر اپنی اس اہمیت کو باقی رکھ سکتی ہے یہ وہ سوال ہے جو اکثریت نہیں بلکہ اقلیت کے زاویۂ نگاہ سے غور کرنے کے قابل ہے کانگرسی وزارت پر نہیں بلکہ اس سے نیچے اُتر کر توجہ کئے جانے کا مستحق ہے

یو۔پی کی حکومت محکمہ جات میں بداخلاقی و بددیانتی کے انسداد کے لئے ایک افسر کا تعین تو کرتی ہے، لیکن خود اپنے تئیں بھول جاتی ہے، حالانکہ سب سے پہلے اسے اپنی ہی نیت کا احتساب کرنا چاہئے اور اقلیت کے دل سے یہ اندیشہ دور کر دینا چاہئے کہ "انسدادِ بددیانتی" کے بہانہ سے جس گمشدہ انصاف و دیانت کی جستجو کی جارہی ہے اس کا مقصود کہیں اقلیت ہی کی جانِ ناتواں کا خون کرنا تو نہیں ہے

میں اس سے قبل کی اشاعتوں میں بھی ظاہر کر چکا ہوں اور اب پھر اس کا اعادہ کرتا ہوں کہ نہ دفتری کارروائی کوئی چیز ہے نہ محکمہ جات کے اعداد و شمار بلکہ اصل چیز حقیقی معنے میں اعتماد پیدا کرنا ہے اور یہ ممکن نہیں جب تک ہندو جماعت کے اکابر اپنی نیت میں خلوص و صداقت اور اخلاق میں بلندی پیدا نہ کریں

یہ بالکل صحیح ہے کہ اگر تمام ملازمتیں بجائے ہندوؤں کے مسلمانوں کو دیدی جائیں، تو بھی مسلمانوں کی اقتصادی دشواریاں دور نہیں ہو سکتیں اور نہ کوئی قوم محض نوکری کی بنا پر ترقی کر سکتی ہے، لیکن اس کے معنے یہ نہیں کہ جو چند افراد اس ذریعہ سے فائدہ اُٹھا سکتے ہیں ان کو بھی اس سے محروم کر دیا جائے، بلکہ اس کا اقتضا یہ ہونا چاہئے کہ تناسب آبادی کے سوال کو قطع نظر کر کے زیادہ سے زیادہ جو کچھ ان کی حالت سنبھالنے کے لئے کیا جا سکتا ہے، کیا جائے — تناسب آبادی کے لحاظ سے حصہ کی تقسیم میری سمجھ میں کبھی نہیں آئی۔ حکومت کو زندگی کا ایک معیار مقرر کر کے صرف یہ دیکھنا چاہئے کہ ملک میں کونسی قوم اس معیار سے گری ہوئی ہے، اور پھر ہر تدبیر سے اُسے اس معیار تک لانے کی کوشش کرنا چاہئے لیکن حکومت کے اس معیار کی توقع ہم کانگرسی وزارت سے کیا کر سکتے ہیں، جبکہ بقالانہ تقسیم کے لحاظ سے بھی وہ ڈنڈی مارنے سے باز نہیں آتی

حال ہی میں سینٹری انسپکٹری کے درجہ کے لئے ۸ امیدواروں کی ضرورت تھی اور تناسب آبادی کے لحاظ سے

۱۴ جگہیں مسلمانوں کے لئے مخصوص تھیں، لیکن آخیر وقت میں وزیر متعلقہ نے امیدواروں کی فہرست میں بیس نام ہندوؤں کے اور اضافہ کر دئے۔ ڈائرکٹر پبلک ہیلتھ نے جو اتفاق سے مسلمان ہیں، وزیر متعلقہ سے کہا کہ تیرہ نام مسلمانوں کے تو نکل نہیں سکتے اس لئے ان کو علیحدہ رکھ کر اب آپ ہی ، ۲۷ ہندوؤں کا انتخاب کرکے باقی ۲۰ نام کاٹ دیجئے۔ یہ سنکر وزیر متعلقہ نے جس برہمی کا اظہار کیا وہ ہرچند خلوت کی بات ہے، لیکن اتنا ظاہر کر دینے میں کوئی مضائقہ نہیں کہ انکی تکلیف کا سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ ان کے نزدیک ڈائرکٹر کی گفتگو فرقہ وارانہ کیفیت رکھتی تھی اور یہی وہ چیز ہے جسے کانگرس کی اتحاد پسند اور منصف مزاج وزارت کبھی برداشت نہیں کر سکتی۔ پھر اب کون ہے جو آنریبل وزیر صحت عامہ سے پوچھ سکے کہ کیا بیس ہندوؤں کے ناموں کا اضافہ کرنا فرقہ وارانہ جذبہ سے علیحدہ کوئی چیز تھا اور کیا اتحاد پسندی وانصاف کا تقاضہ یہ نہ تھا کہ ان ناموں کے ساتھ چند مسلمانوں کا بھی اور اضافہ کر دیا جاتا اور کیا مسلمانوں کی اقتصادی حالت کو دیکھتے ہوئے یہ مناسب نہ تھا کہ تناسب آبادی کے سوال کو قطع نظر کرکے مسلمان بجائے تیرہ کے چودہ لے لئے جاتے؟

اس سے مقصود کسی خاص واقعہ کی طرف ملک کو متوجہ کرنا نہیں بلکہ صرف یہ دکھانا مدنظر ہے کہ ارباب کانگرس کی یہ ذہنیت کیا ہوتی جارہی ہے اور اس ذہنیت کے ہوتے ہوئے ہندو مسلم اتحاد کی توقع کیونکر ممکن ہے

زبان اور رسم خط کے متعلق میں پہلے بھی لکھ چکا ہوں اور اب پھر وہی بات زبان پر آتی ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان سب سے بڑی خلیج جس چیز نے حایل کر دی ہے وہ ہندی اُردو کا جھگڑا ہے۔ حیرت ہے کہ پنڈت جواہر لال ایسا شخص اس مسئلہ کو درجۂ دوم کا مسئلہ قرار دیتا ہے اور اس کے خطرناک نتائج کی طرف سے آنکھ بند کئے ہوئے ہے۔

اس میں شک نہیں کہ کانگرس کا فیصلہ اس باب میں بہت مناسب ہے اور ملک میں ایک مشترک زبان پیدا کرنے کی صورت وہی ہوسکتی ہے جو اس نے بتائی ہے، لیکن کیا کانگرس کا فرض صرف اسی جگہ ختم ہو جاتا ہے کہ وہ ایک رزولیوشن پاس کردے یا کوئی تجویز پیش کرکے خاموش ہو جائے۔ میری رائے میں اس کو دیکھنا چاہئے کہ اس کی تجاویز پر عمل بھی ہوتا ہے یا نہیں۔ شمالی ہند، ہندوستان کا وہ حصہ ہے جہاں نہ صرف ہندوستانی بلکہ نہایت فصیح و بلیغ اُردو بولی اور سمجھی جاتی ہے یہاں تک کہ تمام معزز ہندو گھرانوں میں عام طور پر وہی زبان استعمال کی جاتی ہے جس میں ہمارے عزیز دوست پنڈت آنند نرائن ملا شاعری کرتے ہیں، لیکن اگر مولانا ابوالکلام (جو کانگرس پارلیمنٹری بورڈ کے ممبر ہیں اور جن کے فرائض میں یہ بھی داخل ہے کہ وہ کانگرسی نقطۂ نظر سے وزارتوں کا احتساب کریں) تکلیف فرماکر ایک بار یہاں کی کونسل میں شریک ہوں اور اُن تقریروں کو سُنیں جو ہندو ممبران اور ہندو وزراء کی زبان سے ادا ہوتی ہیں، تو مجھے یقین ہے کہ وہ بھی ضبط نہ کرسکیں گے اور بے اختیار فارسی یا عربی میں تقریر کرنے کھڑے ہو جائیں گے

یہ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ ہم بیسویں صدی کے کسی جلسہ میں شریک ہیں، بلکہ چندر گپت اور اشوک کے دربار کا منظر سامنے آجاتا ہے اور مسلمان تو مسلمان ہندو پبلک بھی پچاس فی صدی ان تقریروں کا مفہوم سمجھنے سے قاصر رہتی ہے

پھر یہ بدعت کونسل ہال اور دفاتر وزارت ہی تک محدود نہیں ہے بلکہ اس کا اثر عام ہوتا جارہا ہے چنانچہ ڈسٹرکٹ بورڈوں کی کارروائیاں بھی اب زیادہ تر اسی زبان (اسی رسم خط میں تلمبن کی جاتی ہیں) اور مسلمانوں کی دلچسپی کو ہر ہر شعبہ سے کم کیا جارہا ہے۔ یہاں کی ڈسٹرکٹ کانگرس کمیٹی سے بعض مسلمان صرف اس لئے استعفا دینے پر مجبور ہوئے کہ دفتر کانگرس سے جو اطلاع اور جو اعلان شایع ہوتا ہے وہ ہندی میں ہوتا ہے درآنحالیکہ یہاں کا ہر ہندو اُردو زبان اور اُردو رسم خط سے واقف ہے اور اگر کہا جاتا ہے کہ کیوں نہ اُردو ہندی دونوں زبانوں میں اعلانات شایع کئے جائیں تو کہا جاتا ہے کہ اس میں مصارف زیادہ ہیں، اس کے معنے صرف یہ ہیں کہ جس وقت سوال کسی اقتصادی یا سیاسی مصلحت کا آئے گا تو سب سے پہلے اس چیز کو محو کیا جائے گا جو مسلمانوں کی قومی کلچر کی سب سے بڑی امانت دار ہے

یہ وہ تدابیر ہیں جو منظم طور پر کھلم کھلا ہر جگہ مسلمانوں کی اہمیت کو کم کرنے کے لئے اختیار کی جارہی ہیں اور اسی کے ساتھ عام اخلاقی حیثیت سے بھی مسلمانوں کے ساتھ جو سلوک کیا جارہا ہے، ان کی تفصیل کے لئے تو ایک دفتر چاہئے۔

یو۔پی کے وزیر تعلیم جو سوشلسٹ جماعت کے تنہا نمایندہ ہیں اور جن کو سب سے زیادہ آزاد خیال ہونا چاہئے۔ ان کے اخلاق کا فسانہ بھی سُن لیجئے۔ ایک مسلمان ٹیچر جس نے اُردو زبان سیکھنے کا کوئی آسان طریقہ ایجاد کیا ہے، ان سے ملنا چاہتا ہے اور وقت مقرر ہوجاتا ہے، لیکن جب وہ تاریخ موعودہ پر دولتکدۂ وزارت پر پہونچتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ سرکار ڈیرہ دون تشریف لے گئے ہیں اور وہیں یاد فرمایا ہے۔ یہ غریب جس کی تنخواہ اس کی ضروریات زندگی کے لئے بھی کافی نہیں ہوتی، کسی نہ کسی طرح ڈیرہ دون پہونچتا ہے، لیکن وہاں پہونچکر یہ خبر ملتی ہے کہ حضور پھر لکھنؤ واپس تشریف لے گئے اور اسے وہیں حاضر ہونا چاہئے۔ یہ لکھنؤ واپس آتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ حضرت فیض آباد میں تشریف فرما ہیں! — معلوم نہیں اس فرار و تعاقب کا نتیجہ کیا ہوا، لیکن خیال یہی ہے کہ وہ غریب تھک کر بیٹھ رہا ہوگا۔ پھر ہو سکتا ہے کہ مسلمان کے بجائے کوئی ہندو ہوتا تو اس کے ساتھ بھی یہی صبر آزما سلوک کیا جاتا، لیکن کیا اس صورت میں جبکہ سوال ہندو وزیر تعلیم اور مسلمان ٹیچر کا ہے قدرتاً مسلمانوں کو یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ یہ تعزیرِ دوادوش محض اس لئے تھی کہ وہ ہندو نہ تھا اور ان تمام باتوں سے قطع نظر میں یہ پوچھتا ہوں کہ کیا ایک وزیر جو خوش قسمتی یا بدقسمتی سے ادیب بھی ہے، وعدے کر کرکے ٹال جانا اور کسی حرماں نصیب کو یوں ستانا، کیا کوئی بڑی شاعرانہ بات ہے!

اس قول و فعل کا اختلاف اور اس ظاہر و باطن کے تضاد کا فسانہ کہاں تک کوئی بیان کر سکتا ہے — وہی رکن کانگرس ہے کہ وزیر ہونے سے قبل اپنے مکان پر عہد قدیم کی سادگی کا مجسمہ نظر آتا ہے لیکن عنان وزارت ہاتھ میں لینے کے بعد وہ رہنے کے لئے شہر کی بڑی سی بڑی کوٹھی کا انتخاب کرتا ہے، سواری کے لئے بیش قیمت موٹر اس کے لئے خرید جاتا ہے اور شان وزارت قایم رکھنے کے لئے قوم کے روپیہ سے تمام ان بیہودہ مصارف کو جو اس کے ماہوار مشاہرہ سے سہ چند اور چہار چند زیادہ ہوتے ہیں، گوارا کرلئے جاتے ہیں

درانحالیکہ جس حد تک کلچر کا تعلق ہے، عہدۂ وزارت نہ ٹوپی اور دھوتی میں کسی اُجلے پن کا اضافہ کرسکتا ہے اور نہ اُن آلودہ پتوں اور ٹوٹے گندے کلھڑوں میں کوئی کمی، جن پر کونسل چیمبر کے گوشوں میں ہر وقت مکھیاں بھنکتی نظر آتی ہیں، جن صوبوں میں کانگریسی وزارت قایم ہے وہاں اقتصادی دشواریوں کے دور کرنے اور کاشتکاروں کے اُبھارنے کے لئے جو کچھ بھی ہوا ہو لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ ہندو مسلم اختلافات زیادہ پیدا ہوگئے ہیں اور اس کا سبب سوائے اس کے کچھ نہیں کہ ہندوؤں کی مہاسبھائی ذہنیت زیادہ قوی ہوتی جارہی ہے، چنانچہ دیکھئے صوبۂ بہار میں ذبیحۂ گاؤ روکنے کے متعلق کیا کیا اہتمامات ہورہے ہیں اور خود یوپی کے بعض دیہات میں ہندوؤں نے کس دیدہ دلیری سے کام لیا

میرا مقصود اس سے نہ کانگریس کی مخالفت ہے اور نہ اس کے اُصول سے انحراف، بلکہ صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ وہ لوگ جو آج کل کانگریس کے روحِ رواں بنے ہوئے ہیں وہ حقیقتاً کس ذہنیت کے انسان ہیں اور یہ کہ ان کی تنگ نظری کو دیکھتے ہوئے قطعاً کوئی امید نہیں کہ مسلمانوں میں شرکت کانگریس کا ولولہ پیدا ہوسکے، یہ میں نے اس بات کو سامنے رکھکر کہا کہ ہندو جماعت مسلمانوں کو شرکت کانگریس کی دعوت دے رہی ہے، ورنہ میں جانتا ہوں کہ کہاں کی دعوت اور کیسی اجازت۔ اگر کانگریس کا مقصود واقعی ملک کو آزاد کرانا ہے تو ایک مسلمان کا فطری حق ہے کہ اس کو اپنی چیز سمجھے اور اگر ہندو اس سے کم پر سودا کرنے کے لئے طیار ہیں تو ان کو کانگریس سے علحدہ کردے

ہندوؤں میں سوشلسٹ جماعت ہی ایک ایسی جماعت تھی جس سے ذہنی شستگی کی داد پانے کی کچھ توقع ہوسکتی تھی، لیکن گاندھی جی کی ڈکٹیٹرشپ نے اس کو بھی معطل کردیا ہے، یہاں تک کہ جواہر لال ایسا زبردست اشتراکی بھی اسی نیچی سطح پر اتر آیا ہے جس سے زیادہ بلندی پر ایک غیر اشتراکی ہندو جاہی نہیں سکتا۔ پھر جس طرح اسوقت مسلمانوں کے سامنے ان کے تحفظ کا مسئلہ ہے، اسی طرح ہندوؤں کے لئے ایک سخت گتھی یہ موجود ہے کہ آیا مسلمانوں سے علحدہ ہوکر وہ اپنا مقصد حاصل کرسکتے ہیں اور اگر نہیں تو پھر ان دونوں کے اتحاد کی کیا صورت ہے

نواب سر اکبر حیدری اور ہندو مسلم اتحاد

اس میں کلام نہیں کہ ان دونوں جماعتوں کے ذی فہم افراد یہی چاہتے ہیں کہ باہم صلح و آشتی کی صورت پیدا ہوجائے لیکن اسوقت تک کوئی یقینی تدبیر کسی کے ذہن میں نہیں آئی۔ نواب سر اکبر حیدری نے، جامعۂ ڈھاکہ کے جلسۂ تقسیم اسناد میں اپنا فاضلانہ خطبۂ صدارت دیتے وقت اس مسئلہ پر بھی نہایت مدبرانہ تبصرہ فرمایا ہے اور اس میں شک نہیں کہ جو تدابیر موصوف نے بتائی ہیں وہ پوری توجہ کی مستحق ہیں۔ آپ نے پہلی تدبیر تو یہ بتائی ہے کہ فریقین میں سے ہر ایک کو فرقہ وارانہ تحریکیں قطعاً بند کردینا چاہئے، اسی کے ساتھ دوسری تدبیر یہ پیش کی ہے کہ "دونوں فریق کو اپنے اپنے تاریخی لٹریچر سے نفرت پیدا کرنے والے حصے الگ کردینا" اور سب سے آخر میں لیکن سب سے زیادہ اہم و مفید تدبیر یہ بتائی ہے کہ "مذہب کا مفہوم سمجھنے کی کوشش صرف تصوف و روحانیات کی وساطت سے کرنا چاہئے اور ظواہر و مراسم کو مذہب نہ سمجھنا چاہئے"

ان تینوں تدبیروں میں پہلی اور تیسری تدبیر ایک دوسرے سے دست وگریباں ہیں بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ پہلی تدبیر پر اسوقت تک عمل ممکن نہیں، جب تک تیسری متعین نہ ہو جائے

فرقہ دارانہ تحریکوں کا ذمہ دار صرف مذہب ہے اور چونکہ مذہب نام رکھا ہے صرف گائے کا گوشت کھانے یا نہ کھانے کا دھوتی پہننے یا نہ پہننے کا، سر پر چوٹی رکھنے یا نہ رکھنے کا، اس لئے ناممکن ہے کہ ہندو مسلمان کو گائے کا گوشت کھانے کی وجہ سے ملکش نہ سمجھے اور ایک مسلمان ہندو کو اس کی دھوتی اور چوٹی کی وجہ سے کافر نہ کہے۔ سب سے بڑی مصیبت یہی ہے کہ کلچر کے اختلاف کو دین کا اختلاف سمجھ لیا گیا ہے اور دونوں فریق کے مذہبی پیشوا اسی اختلاف کو سامنے رکھ کر آپس میں جذبۂ منافرت پیدا کرتے رہتے ہیں، اس لئے نواب سر اکبر حیدری کی بتائی ہوئی تدبیروں پر اسی وقت عمل ہو سکتا ہے، جب سب سے پہلے مولویوں اور پنڈتوں کو سوسائٹی سے علیحدہ کر دیا جائے اگر انھیں ہم ملک سے باہر نہیں نکال سکتے اور چونکہ یہ اسوقت تک ممکن نہیں جب تک ملک میں تعلیم عام ہو کر خود پبلک کو اس جماعت سے نفرت نہ ہو جائے، اس لئے فوری تدبیر ہندو مسلم اختلاف دور کرنے کی اگر کوئی ہو سکتی ہے تو صرف یہ کہ کانگرس اپنے کھوئے ہوئے اعتماد کو قایم کرے اور واقعی خلوص و رواداری سے کام لیکر مسلمانوں کے تمام مطالبات کو تسلیم کرے، لیکن ہم جانتے ہیں کہ ہندو اس پر کبھی طیار نہ ہوں گے اور یہ جھگڑا کبھی ختم نہ ہوگا

کانگرسی وزارت کی وہ ذہنیت جس کا ذکر ابھی میں کر چکا ہوں ہر جگہ یکساں ہے، چنانچہ صوبۂ متوسط و برار کو دیکھئے کہ وہاں کے وزراء تو باوجود کانگرسی ہونے کے کھلم کھلا مہا سبھائی ہیں جس کا ادنیٰ ثبوت یہ ہے کہ جسوقت مسٹر ساورکر (جنھیں مہا سبھائیوں میں وہی خصوصیت حاصل ہے جو سانپوں میں کالے ناگ کو) ناگپور پہونچتے ہیں تو تمام ارکانِ وزارت اس طرف ڈھل پڑتے ہیں اور جلسہ میں وہ سب کچھ ہوتا ہے جو ہندو راج کی اسکیم کو سامنے رکھ کر ہونا چاہئے وہاں کی وزارت مدرسہ یا اسکول کو اب "ودیا مندر" کہنا پسند کرتی ہے۔ سی۔ پی یا صوبۂ متوسط کے بجائے "مہا کوشل" کا نام تجویز کرتی ہے، برار کا لفظ بھی ان کو گوارا نہیں اور یہ تحریک کہ آیندہ تعلیم بالکل ہندی زبان کے ذریعہ سے دی جائے اس میں تو خیر تمام کانگرسی صوبے شامل ہیں

سی پی وزارت کی طرف سے کچھ عرصہ ہوا ایک بیان شایع ہوا تھا کہ مسلمان طلبہ اور طالبات کو کتنے وظایف وہاں کی حکومت نے دئیے ہیں اور آل انڈیا کانگرس کمیٹی نے بھی اس پروپاگنڈا میں کافی حصہ لیا تھا۔ حالانکہ ان میں ایک وظیفہ بھی ایسا نہیں جو کانگرسی حکومت کی یادگار ہو، اور کوئی مدرسہ ایسا نہیں جو مسلمانوں کے لئے اس نے جاری کیا ہو، بلکہ ضلع بیتول کا واحد اردو مدرسہ بھی ختم کر دیا گیا۔ سی۔ پی میں اس وقت امدادی مدارس کو تین لاکھ سے زیادہ کی مدد دیجا رہی ہے لیکن اردو مدارس کا حصہ اس میں صرف ۲۵ ہزار ہے

سرکاری مدارس سوائے ایک دو کے سب ہندی اور مرہٹی کے طلبہ کے لئے مخصوص ہیں، یہاں تک کہ

جبلپور اور ناگپور ایسے مرکزی مقامات کے سرکاری مدارس میں بھی جہاں مسلمانوں کی تعداد کافی ہے، اُردو کا نام و نشان نہیں پایا جاتا

جس وقت مسٹر جینا نے اُردو زبان کے متعلق اپنا بیان شایع کیا، تو مولانا ابوالکلام آزاد نے سختی سے اسکی تردید کی تھی اور کانگرس کے حسنِ نیت کی تائید، لیکن افسوس ہے کہ مولانا کے حسنِ ظن کے اسباب و دلائل آج تک ہمکو معلوم نہ ہوسکے۔ خود مہاتما گاندھی کو دیکھئے کہ وہ کس زبان میں تقریر کرتے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ وہ مولانا کے وجدان کو مطمئن کرنے والی ہو، لیکن اور تمام مسلمانوں کے نزدیک وہ اسی قسم کی ہندوستانی ہے۔ جو پنڈت مالوی اور مہاشے پرمانند ہی کی زبان سے اچھی معلوم ہوتی ہے — قہر تو یہ ہے کہ وہ زبان کے مسئلہ کو نہایت معمولی مسئلہ بتاتے ہیں، حالانکہ ہندو مسلم نزاع کا اصل سبب یہی مسئلہ ہے اور اسی نے مسلمانوں کو باور کرایا ہے کہ ہندو ملک کی آزادی کو اتنا عزیز نہیں سمجھتے جتنا ہندی کے رواج کو، کیونکہ ان کا اصل مقصود (یعنی آریہ ورت سے مسلمانوں کے وجود کو محو کرنا) اسی طرح حاصل ہوسکتا ہے کہ پہلے مسلمانوں کے اس لٹریچر کو تباہ کیا جائے جو ان کے کلچر کا حامل ہے اور اس کے بعد پھر اس قوم کا مٹا دینا کیا مشکل ہے جو اپنے کلچر کو برباد کر چکی ہے

پھر جب حالات یہ ہیں تو مسلمانوں کو غور کرنا چاہئے کہ انھیں کیا کرنا ہے مُسلم لیگ کی طرف سے تو کوئی توقع پیدا کرنا بیکار ہے۔ وہ اس بات پر تو لڑ سکتی ہے کہ کانگرسی جھنڈے میں سبز رنگ جو مسلمانوں کا رنگ ہے نیچے کیوں رکھا گیا، فلاں عمارت پر مسلم لیگ کا جھنڈا کیوں نہ نصب کیا گیا، بندے ماترم کے ساتھ مُسلم لیگ کا ترانہ کیوں نہ پڑھا گیا، لیکن کسی ٹھوس تعمیری اُصول پر کام کرکے کوئی انقلابی تحریک پیدا کرنا اس کے بس کی بات نہیں

اگر مسلمانوں نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ وہ اجتماعی حیثیت سے کانگرس میں شریک ہو کر ہندوؤں کے زور کو نہیں توڑ سکتے تو پھر ان کے لئے چارۂ کار سوائے اس کے کچھ نہیں کہ وہ بالکل اشتراکیت کے اُصول پر اپنی جماعت کی تنظیم کریں اور قربانی کے لئے طیار ہو کر باہر نکل پڑیں

جینا اینڈ کمپنی سوائے اس کے کچھ نہیں کر سکتی کہ وہ مطالبات کی فہرست بناتی رہے، وہ اس سے زیادہ کی ہمت کرکے اپنے آپ کو خطرہ میں ڈالنا پسند نہیں کر سکتی، اس لئے مسلمانوں کو ان کا دامن چھوڑ دینا چاہئے اور ہر متنفس کو اپنی مدد کے لئے خود کمربستہ ہو جانا چاہئے

شیر شو، شیرانہ در صحرائے شیراں پائے نہ
مرد شو، مردانہ پندِ ناصحاں را گوش گیر

مسئلۂ خلافت و امامت

(مسلسل)

فاضل مضمون نگار کے قلم سے تحریف قرآن کے متعلق شیعوں پر جو الزام عائد کیا گیا ہے اب میں اس کی تحقیق پر توجہ کرتا ہوں۔

ان کا قیاس ہے کہ شیعہ حضرات جب قرآن سے عقیدہ خلافت الٰہیہ ثابت نہ کر سکے تو تحریف قرآن کی آڑ پکڑی اور شیعی مجتہدین نے اپنے متشکک مریدوں کو یہ کہکر مطمئن کرنے کی کوشش کی کہ سنیوں نے وہ آیات حذف کر دیں جن میں بتصریح امامت کے متعلق احکام مذکور تھے

لیکن فاضل مضمون نگار نے یہ بھی تحریر فرمایا ہے کہ عام طور پر شیعہ تحریف قرآن کے قایل نہیں ہیں (شکریہ) پھر جب شیعوں کی عمومی حالت معلوم ہو گئی تو تحریف قرآن کا ذکر نہ جانے کس قسم کی منطق ہے

طبعاً سوال ہوتا ہے کہ شیعوں میں تو روایات تحریف کی بنا پر متشکک مریدوں کو تسلی دی گئی لیکن کتب سنیہ میں جو ان کا طومار پایا جاتا ہے اس کا سبب کیا ہے۔ کبھی اس طرف توجہ فرمائی گئی ہے۔ ہاں میں عرض کرتا ہوں

یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ جامعین قرآن نے اس ترتیب کو باقی نہیں رکھا جو ہونی چاہئے تھی۔ پھر جن جن ترکیبوں سے قرآن جمع ہوا ہے وہ ترکیبیں بھی سامنے موجود ہیں۔ عہد ثالث میں جو قرآن جلائے گئے وہ تاریخ کے ایک معمولی متعلم سے بھی مخفی نہیں ان کے جلانے کی اس کے سوا اور کیا وجہ ہو سکتی تھی کہ وہ قرآن کی اس ترتیب کو پسند نہ کرتے تھے اور موجودہ ترتیب کے حامی تھے۔ پھر میں ارباب عقل سے پوچھتا ہوں کہ ایک آیت کہیں سے اُٹھا کر کہیں رکھ دیجائے اور دوسری آیت اس کے مقام میں آجائے۔ کیا اسے "یحرفون الکلم عن مواضعہ" (وہ کلمات کو ان مقام سے تحریف کرتے ہیں) نہیں کہہ سکتے

اب یہ اعتراض باقی ہے کہ "عقیدہ خلافت الٰہیہ قرآن میں بالتصریح مذکور نہیں" میں نہیں سمجھ سکا کہ صراحت سے کیا مراد ہے۔ کیا اس سے یہ مراد ہے کہ علی کا نام صراحت کے ساتھ مذکور نہیں ہوا۔ لیکن ادنیٰ غور سے یہ معمہ حل ہو سکتا ہے کہ دعوت قرآن، صاحب عقل اور صاحب تفکر کے لئے ہے

نام اگر صراحت کے ساتھ ہوتا تو اسی طرح ہو سکتا تھا کہ "اے رسول تیرے بعد تیرا خلیفہ علی ہے" لیکن اس کی کیا ضمانت

لوگ اس قول پر سکوت کرلیتے۔ نہایت آسان امر تھا یہ کہنا کہ " علی "نام نہیں ہے بلکہ خلیفہ کی صفت ہے۔ یعنے اسے رسول تیرے بعد تیرا خلیفہ بلند مرتبہ والا ہے۔

تعجب دیکھئے۔ حدیث مدینہ مشہور حدیث ہے۔ محدثین اہل سنت اس حدیث کو باب فضائل علوی میں نقل کرتے ہیں۔ مگر آج اس کے معنی نکالے جاتے ہیں کہ " میں شہر علم ہوں جس کا دروازہ بلند ہے "

اگر نام علی اس حیثیت سے درج قرآن ہوتا یقیناً یہی حشر ہوتا۔ ہاں یہ کہا جاسکتا ہے کہ تمام آئمہ کے نام کھلم کھلا درج کئے جاتے مثلاً " ثم الحسن ثم الحسین "۔ اہل بصیرت جانتے ہیں کہ یہ قرآن ہے جسکا نام حکمائی اصطلاح میں عقل اجمالی ہے اور صاحبان عقل وہ ہیں جو اجمال میں تفصیل کا مشاہدہ کرتے ہیں

عام فہم اور سادہ زبان میں یوں سمجھنا چاہئے کہ قرآن کی بنیاد ایجاز و اختصار پر رکھی گئی ہے اور یہی اس کا حسن ہے اگر اس طرح نام درج کئے جاتے تو اچھا خاصہ شجرہ بن جاتا۔ اس ایجاز کی مثالیں قرآن میں کافی موجود ہیں۔ مثلاً خدا نے اصطفائے آل ابراہیم کا ذکر کیا ہے۔ اس میں مختلف صورتیں ہوتی ہیں:۔

(۱) تنہا بنو اسحٰق مراد ہیں ؟ اور پھر ان میں بھی کل یا بعض

(۲) فقط بنو اسمٰعیل مراد ہیں ؟ اور وہ بھی کلاً یا بعضاً ؟

(۳) دونوں مراد ہیں ؟ اور پھر بہ حیثیت کل یا بہ حیثیت بعض ؟

پس ان سوالات کا سمجھنا اور حقیقت تک رسائی حاصل کرنا ہمارا کام ہے۔ اسی طرح قرآن نے بیان کر دیا " اہل البیت " اب یہ معلوم کرنا ہمارا فرض ہے کہ اہل بیت مطہرین کون ہیں ؟

الغرض تصریح و صراحت کے متعلق جو شکوک پیش کئے جاتے ہیں وہ اہل عقل کے لئے قابل توجہ نہیں ہیں۔ آخر میں ایک اور پہلو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس کو ختم کیا جاتا ہے۔ معلوم ہے کہ حضرات اہل سنت نہایت اطمینان سے فتویٰ دیتے ہیں کہ شیعوں کے پاس خلافت الٰہیہ کے لئے کوئی قرآنی دلیل نہیں ہے۔ میرا خیال ہے کہ شیعوں کو ان کی حالت پر چھوڑ دیا جائے لیکن ان حضرات نے کبھی خلافت اجماعی و شوریٰ پر بھی نظر ڈالی ہے کہ یہ طریقہ خلافت اصول قرآنی کے مطابق ہے یا نہیں۔

اہل سنت کے پاس اس بارے میں بس ایک آیت ہے جس سے وہ تمسک کرنا چاہتے ہیں۔ یعنی

" وامرہم شوریٰ بینہم "

مشورہ کے بہتر ہونے میں کسی عاقل کو کلام نہیں۔ بہت سے امور ایسے ہیں جن میں انسان کو مشورے کی ضرورت پڑتی ہے علاوہ ازیں مشورے سے باہمی ارتباط اور تعلقات بھی محکم ہوتے ہیں۔ رسول اللہ سے ارشاد ہوتا ہے کہ:۔

" فبما رحمۃ من اللہ لنت لہم ولو کنت فظاً غلیظ القلب لانفضوا من حولک فاعف عنہم واستغفر لہم و شاورہم فی الامر فاذا عزمت فتوکل علی اللہ ان اللہ یحب المتوکلین " (آل عمران)

(ترجمہ) اس رحمت کے سبب سے جو تیرا حصہ ہے تو ان کے ساتھ نرمی سے پیش آیا۔ اور اگر تو بدخو اور سنگدل ہوتا تو یہ تیرے پاس سے متفرق ہو جاتے۔ پس ان سے درگزر کر۔ ان کے لئے استغفار کر اور ان سے مشورہ کر اور جب تو عزم کر چکا تو اللہ پر توکل کر۔ بالتحقیق کہ اللہ توکل کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

اس سے ظاہر ہے کہ تالیف قلوب کے لئے دوسروں کی غلطیوں سے درگزر کرنا ان کے لئے استغفار کرنا اور ان سے مشورہ کرنا نہایت مفید چیزیں ہیں۔ علی مرتضیٰ کا ارشاد ہے۔ "الاستشارۃ عین الہدایہ وقد خاطر من استغنی برایہ" مشورہ لینا عین ہدایت ہے اور اپنی رائے پر بھروسہ کرنے والا خطرے میں ہے۔

ان امور کو مدنظر رکھتے ہوئے آیت کا مفہوم صرف اتنا ہے کہ جب کسی کو کوئی اہم کام درپیش ہو تو وہ ضرور مشورہ کرے کہ عین فلاح یہی ہے ۔ میں اس مقام پر صاحبانِ عقل سلیم سے پوچھتا ہوں کہ اس آیت سے کیونکر یہ مفہوم پیدا ہو سکتا ہے کہ چند انسان اغراض خاص کے ماتحت ایک جگہ مل کر بیٹھیں اور باہر آ کر کہدیں کہ ہم نے فلاں شخص کو تمہارا حاکم بنا دیا

اس تمام بحث کے علاوہ لفظ "امرہم" واقع ہوا ہے یعنی "ان کا امر" اور پہلی بحث تو یہی ہے کہ خلافت الٰہیہ "امر اللہ" ہے یا "امر الناس" اس بحث کو طے کرنے کے بعد اس مسئلہ کو آیت کے زیر سایہ لانے کی کوشش ہو سکتی ہے ورنہ بیکار ہے

خیالات کی نیرنگیاں ہر رنگ میں حیرت افزا ہیں۔ خلافت ثانیہ میں تو مشورہ کو دخل نہیں دیا گیا۔ صرف جانے والے کا علم تھا۔ دوسرے لفظوں میں ولی عہدی۔ پھر یہاں کیا ہوگا۔ الغرض آیۂ شوریٰ حضرات اہلِ سنت کے مانے ہوئے معنی کو محیط نہیں ہے اور نہ خلافت کی نصیب کے لئے اس سے استدلال پیش کیا جا سکتا ہے

خلفائے راشدین

یہ وہ بحث ہے جسے لوگ بخیال خود دنیائے تشیع پر وہ بار رکھدیا گیا ہے کہ گویا قیامت تک سبکدوشی نہیں ہو سکتی مگر پہلا سوال اس مسئلہ میں یہ ہے کہ "خلفاء" کے ساتھ "راشدین" کی نسبت کہاں سے آئی۔ خدا سے؟ رسول سے؟ یا خود ساختہ؟

اس لفظ پر ایراد کرنے سے میرا مطلب یہ ہے کہ خلافت کے متعلق اسلام میں دو ہی نظریئے پائے جاتے ہیں یعنی (۱) خلافت من اللہ اور (۲) خلافت من الناس۔ ان میں پہلا عقیدہ تو گویا ہی نہیں۔ لامحالہ دوسرا نظریہ پسندیدہ قرار پائے گا۔ اب اگر کوئی شخص پہلے عقیدے کو چھوڑ دے جو بخیال حضرات موہوم ہے تو دوسرے موہوم میں تو مبتلا نہیں ہوگا وہ صریحاً دیکھے گا کہ جتنے سلاطین مع خلفاء اسلام میں گزرے ہیں وہ سب انھیں اصول کے تحت میں ہیں جو تمام دنیا میں پائے جاتے ہیں۔ لہٰذا کسی کو خلیفہ کہنا اور کسی کو سلطان۔ یہ افتراق بے معنی ہے۔ پھر طرہ یہ کہ کچھ لوگوں کو راشدین سے ملقب کرنا اور کچھ لوگوں کو غیر راشدین قرار دینا بالکل بے ربط ہے۔ اگر خلفاء کہنے میں کوئی خاص بات ہے

توسب کو خلیفہ کہئے اور راشدین کہنے کو جی چاہتا ہے تو سب کو راشدین کہئے "یک بام و دو ہوا" ایک قسم کا تمسخر ہے

اب رہا یہ امر کہ کسی کی نیکیاں زیادہ ہیں کسی کی کم ہیں۔ ہوا کریں ہمیں کیا؟ اپنی اپنی گور اور اپنا اپنا عمل۔

میں اس کی مزید توسیع کئے دیتا ہوں کہ عنوان کے تحت میں جن حضرات کی سیرت نگاری کی جاتی ہے مطلب صرف یہی ہے نا؟ کہ اس تجلی سے اعتقاد آبائی کی آنکھوں میں چکا چوند پیدا کی جائے۔ اسے آزادی خیال نہیں کہتے۔ استدلال کا ایک جھونکا اس ساری تعمیر کو بیخ و بن سے اُکھاڑ کر پھینک سکتا ہے۔ ان حضرات کے محاسن لاکھ گنوائے جائیں بہرحال وہ منصوص من اللہ تو نہیں ہیں۔ انسان ہی کے مقرر کردہ ہیں۔ اس لئے لوگوں پر ایمان لانا ضروری نہیں۔ اس مقام میں ایک شیعہ کے نزدیک علی کی بھی کوئی خصوصیت نہیں اس لئے کہ شیعہ جو حضرت علی کو مان رہے ہیں وہ صرف اس لئے کہ منصوص من اللہ ہیں اور جب یہ عقیدہ ہی اُڑ گیا تو پھر علی بھی یکے از دیگراں ہیں۔ وہ کسی جماعت میں شامل ہوں یا نہ ہوں۔ یہ ان کا ایک ذاتی فعل ہوگا۔ جو قطعاً کسی کے لئے حجت نہیں۔ خلاصہ یہ کہ یہ "راشدین" کا ضمیمہ لفظ "خلفاء" کے ساتھ محض ایک خوش اعتقادی ہے

اب میں اس طرف متوجہ ہوتا ہوں کہ حضرات خلفاء کے ساتھ علی مرتضیٰ کا سلوک ایک شیعہ کی نگاہ میں کیا معنی رکھتا ہے

واضح ہو کہ شیعہ خلافت الٰہیہ کے جس عقیدے کو دل میں جگہ دئے ہوئے ہیں اس عقیدے کی رو سے صرف حضرت علی ہی امام نہیں ہیں بلکہ دوسرے حضرات آئمہ بھی ہیں اور اس عقیدے کی بنا پر ان میں اور حضرت علی میں کوئی فرق نہیں ہے اور یہ ایک دوسرے کے قول و فعل کے شارح ہیں۔ ان دوسرے بزرگواروں نے اپنے زمانے کی حکومتوں کے مقابل صلح و آشتی ہی کو اپنا طریقہ قرار دیا لیکن ان بزرگواروں کے اس صلح و آشتی کو مدنظر رکھتے ہوئے ان حکومتوں کو شیعوں نے کبھی حکومت حقہ تسلیم نہیں کیا اور نہ خود ان بزرگواروں کا کوئی ایسا ارشاد یا ہدایت ہے بلکہ اس کے خلاف ان کے اقوال موجود ہیں۔ آئمہ اہل بیت کا یہ عمل ہمارے نزدیک علی مرتضیٰ کے فعل اور عمل کا شارح ہے جس طرح وقتی مصلحتوں کی بنا پر علی مرتضیٰ نے حکومت وقت کے ساتھ صلح و آشتی کے ساتھ گزاری اسی طرح دیگر ائمہ نے بھی۔ پس جس طرح ائمہ کا یہ فعل حکومت وقت کی حقانیت کی دلیل نہیں ہے اسی طرح علی مرتضیٰ کی مصالحت سے عندالشیعہ حقانیت حکومت وقت پر استدلال نہیں ہوسکتا۔

شیعہ اگر خلافت الٰہیہ کے نظریے کا حامی ہے تو اس کا یہی اصولی جواب ہے جو عرض کیا گیا۔ پھر کیا حق ہے دنیا کو کسی کے معتقدات کو نہ سمجھتے ہوئے اس پر وہ بار رکھے جس کا وہ اصولاً منکر ہے اور اگر شیعہ اس عقیدے سے دست بردار ہو کر اس دائرے سے نکل رہا ہے تو پھر اس کی آزادی خیال کے سامنے امتیازات کی کوئی دیوار حائل نہ ہونی چاہئے کہ کس راشدین اور کس کے غیر راشدین :-

خوش نباشد جامہ نیمے اطلس و نیمے پلاس

اس بحث میں یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ "اگر میں شیعہ حضرات کی مستند احادیث سے اپنے قول کو ثابت کرنے میں کامیاب ہو جاؤں تو غالباً میں اپنی ذمہ داری سے باحسن الوجوہ عہدہ برآ ہو جاؤں گا"

خواب نہایت اچھا ہے۔ تعبیر ناظرین کے سامنے آجائے گی۔ میرے کہنے کی ضرورت نہیں اور یہ بھی اندازہ ہو سکیگا کہ کسی سطحی مناظر کی تصنیف پر اعتماد کر کے حوالے اور عبارتیں لکھ دی گئی ہیں۔ اصل کتاب کے مطالعہ کی نوبت نہیں آئی۔ کتابوں کے نام تک صحیح نہیں ہیں۔ مثلاً لکھا گیا ہے شیعوں کی مشہور کتاب حدیث "کلینی"! میں عرض کروں گا کہ شیعوں کے ہاں اس نام کی کوئی کتاب نہیں ہے۔ البتہ ایک کتاب حدیث "کافی" ہے۔ اس کے مصنف کا نام ہے محمد بن یعقوب کلینی (کلین کے رہنے والے) ایسی دلچسپیاں بہت ہیں۔ ناظرین عنقریب ملاحظہ کریں گے

اب اس عنوان "خلفاء راشدین" کے متعلق میں مجملاً کہہ آیا ہوں۔ لیکن ناانصافی ہوگی اگر مندرجہ ذیل خیال کے متعلق معروضہ نہ کیا جائے

"اگر خلفائے ثلثہ کا زمانہ واقعی غاصبانہ دور خلافت ہوتا تو حضرت علی جیسا جلیل القدر مسلمان اپنی عمر کا بڑا حصہ اس غیر اسلامی زمانے کا ساتھ دینے میں بسر نہ کرتا اور پوری طاقت کے ساتھ صدائے احتجاج بلند کر کے خدا اور رسول کے منشا کو پورا کرنے کی کوشش کرتا جس کے بعد یا تو وہ اعلاء کلمۃ الحق میں کامیاب ہو کر مسند خلافت پر متمکن ہو جاتے اور یا حسین کی طرح میدان کارزار میں تڑپتے نظر آتے"

صلح و آشتی کی پالیسی کے متعلق تو میں کہہ چکا ہوں اور اس کے متعلق شیعی نمائندہ کا جواب جو درج کیا گیا ہے معقولیت پر مبنی ہے۔ ہاں یہ آخری سطور پر رائے زنی باقی ہے۔

یہ خیال جو آخر میں ظاہر کیا گیا۔ یہ کوئی نیا خیال نہیں ہے بالفاظ مختلفہ اسے ہمیشہ دہرایا گیا ہے اور غالباً جب تک دنیا باقی ہے دُہرایا ہی جائے گا

بہت خوب! علیؑ قتل ہو جائے۔ قتل ہو جانا کوئی اہمیت نہیں رکھتا مگر نتیجہ؟ شہادت حسینؑ سے جو نتیجہ مترتب ہوا وہ علیؑ کے قتل پر ہرگز نہیں ہو سکتا تھا۔ ہر فعل کی تاثیر میں زمانے کو بھی بہت بڑا دخل ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں قتل علیؑ کے معنے یہ تھے کہ حسنینؑ بھی قتل ہو جاتے۔ بلکہ تمام عائد بنی ہاشم موت کے گھاٹ اُترتے۔ نتیجہ کیا ہوتا؟ صاف ظاہر ہے کہ حکومت بے کھٹکے اغیار کے ہاتھوں میں کھیلتی اور بہی خواہان حکومت کی طرف سے بیرونی دنیا کے لئے جو تاریخی مواد پیش کیا جاتا۔ ظاہر ہے وہ کیسا ہوتا!

تاریخی واقعہ ہے کہ مالک ابن نویرہ نے زکوٰۃ بھیجنے میں عذر کیا کہ رسول اللہ نے حکومت وقت کے لئے کوئی وصیت نہیں کی بلکہ وصیت کسی اور کے لئے ہے۔ فوراً فوج بھیجی گئی۔ اس قبیلہ پر کامل بربریت کے ساتھ حملہ کیا گیا بالآخر اس قبیلہ کا نام "مرتدین" کی فہرست میں لکھ دیا گیا۔ کیا قتل ہو جانے کے بعد علیؑ اور دیگر بنو ہاشم کا نام اس فہرست میں آتا

اور کیوں نہ آتا؟ البتہ یہ موقع علی نے نہیں دیا

علاوہ ازیں علی کے قتل ہو جانے پر یہ بھی ممکن نہ تھا کہ بنو تیم اور بنو عدی اس حکومت پر رہ سکیں۔ بنو امیہ موقعہ کی تاک میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ابوسفیان زندہ تھا۔ بنو ہاشم ہی تھے جن کو وہ اپنی ٹکر کا سمجھتا تھا۔ ان کے بعد میدان صاف تھا باقی بنو تیم اور بنو عدی اس کی ایک دھمکی سے خانہ نشین ہو جاتے۔ ابتدا سے ہی بنو امیہ سریر سلطنت پر آتے اور وہیں سے۔

ولعبت ہاشم بالملک لا
خبر جاء ولا وحی نزل

کے ترانے بلند ہو جاتے

تاریخ بتاتی ہے کہ جسوقت حضرت ابوبکر خلیفہ ہوئے تو ابوسفیان نے علی سے آکر کہا کہ اٹھو۔ مدینہ کو سواروں اور پیادوں سے بھر دوں گا اگر علی اس کے دم میں آجاتے تو عین میدان کارزار میں مخالفین سے ملکر بنو ہاشم کا خاتمہ کرا دیتے اور ان کے بعد پھر دوسرے تھے ہی کیا۔ لیکن علی اس راز سے واقف تھے اس نے جو نقشہ ڈالا تھا اسے سمجھتے تھے۔ لہذا جھڑک دیا اور صاف کہا کہ تو منافق ہے

یہ ہیں وہ اندرونی ریشہ دوانیاں جن پر نظر کرتے ہوئے اہل بصیرت نے ہمیشہ سے کہا ہے کہ اسوقت مدینہ میں جنگ داخلی کا واقع ہو جانا نفس اسلام کے لئے مضر تھا۔ ایسا مضر کہ ابتدائے بعثت میں جو نتیجہ حضرت پیغمبر کی شہادت سے نکلتا وہی ابتدائے خلافت میں حضرت علی کے قتل ہو جانے سے برآمد ہوتا

اب اس کے علاوہ فتح یاب ہو کر تخت سلطنت پر متمکن ہو جانے میں علی کی حیثیت بادی النظر میں اسی بادشاہ کی سی ہوتی جو اپنے مخالفین کو تہ تیغ کر کے سریر سلطنت پر قدم رکھا کرتا ہے اسی لئے ارشاد ہوا ہے "فصبرت علی طول المدۃ وشدۃ المحنۃ" اس طویل مدت اور رنج والم کی شدت پر میں نے صبر کیا

حقیقت یہ ہے کہ اغراض ذاتی کا قدم اگر درمیان میں ہوتا تو شاید علی یہی کر گزرتے لیکن وہ اس سطح سے بلند ہیں

ایں زمیں را آسمانے دیگر است

اب میں ان منقولات پر نظر ڈالنا چاہتا ہوں جو فاضل مضمون نگار کو خدا جانے کتنی زحمت سے دستیاب ہوئے ہیں

(۱) ایک خط کا مضمون رقم کیا گیا جو حضرت علی نے حاکم شام کو جنگ صفین کے دوران میں لکھا ہے۔ اس میں حضرات شیخین کی تمجید کی گئی ہے

"کتاب الفتوح" "ابن عاصم کوفی" اور "شرح نہج البلاغۃ" کا حوالہ دیا گیا ہے۔ اس مقام پر یہ عرض کرنا ہے کہ "ابن عاصم" میرے خیال میں صحیح نہیں بلکہ صحیح لفظ "ابن اعثم" ہے۔ لیکن وہ "ابن عاصم" ہو یا "ابن اعثم" اس کو شیعہ ظاہر کرنا ایک دلچسپ تحقیق کی ابتداء کرنا ہے

شرح نہج البلاغۃ کا حوالہ بھی مشکوک ہے۔ نہج البلاغۃ کی شرحیں کئی ہیں۔ فارسی بھی عربی بھی۔ علیٰ ہذا شارح شیعہ بھی ہیں اور سُنّی بھی۔ اگر بالفرض شیعہ کی شرح ہو تو بھی اس پر حجت قائم نہیں ہوسکتی

حضرت امیرؓ کا وہ خط جسے "محاسن کتب" سے تعبیر کرتے ہیں خود نہج البلاغۃ میں موجود ہے جس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مخالفت کی تحریر کا کیا مضمون ہوگا۔ اس کے چند فقرات درج کر دیتا ہوں :۔

"وزعمت ان افضل الناس فی الاسلام فلان وفلان امر ان تم اعتزلک کلہ وان نقص لم یلحقک ثلمتہ"

ارباب نظر جانتے ہیں کہ امیر شام نے اپنے دعوے کی بنیاد خون عثمان پر رکھی تھی اور جہاں عرب اور خصوصاً شام میں اس دعوے کی حقانیت کے لئے کافی پروپیگنڈہ کیا گیا تھا۔ یہ بھی معلوم ہو کہ حضرت عثمان۔ حضرات شیخین ہی کے سلسلہ کی ایک کڑی ہیں وہ چاہتا تھا کہ علی کے ہاتھ کی ہی لکھی ہوئی کوئی ایسی تحریر مل جائے جسے مخالفت شیخین پر محمول کیا جاسکے اور دنیا کو بتایا جاسکے کہ علی اس خلافت کے ابتداء ہی سے مخالف ہیں اور وہ شیخین کو اپنے مکتوبات میں بُرا کہہ رہے ہیں۔ انکے وقت میں وہ کچھ نہ کر سکے۔ لیکن عثمان کے وقت میں انھیں موقعہ مل گیا اور چونکہ عثمان شیخین کے قائم مقام تھے اور سیرت شیخین پر عمل کرنا ان کا شعار تھا لہذا انھیں قتل کیا اور وہ اس خون میں قطعاً شریک ہیں۔ مگر علی کی طرف سے جو جواب ملتا تھا وہ ایسا ہوتا تھا کہ سوائے مایوسی کچھ اس کے ہاتھ نہ آتا تھا۔ چنانچہ اس خط میں فرماتے ہیں :۔

"وزعمت انی لکل الخلفاء حسدت وعلی کلھم بغیت فان یکن ذلک کذلک فلیس الجنایۃ علیک فیکون العذر الیک"

"تیرا یہ گمان ہے کہ میں نے تمام خلفاء سے حسد کیا اور سب پر بغاوت کی۔ اگر یہ معاملہ ایسا ہی ہے تو تیری تو کوئی خطا نہیں کیگئی کہ تیرے سامنے اس کا عذر کرنے کی ضرورت ہو۔ (تجھے کوئی حق مداخلت حاصل نہیں)"

اس کے بعد ایک طعن اور بھی تیز ہے اور اس کا جواب بھی مرقوم ہے۔ اسی سے علی کی روحانی عظمت ان کے مخالفین کی ذہنی لپستی معلوم ہو جاتی ہے۔ فرماتے ہیں :۔

"تو نے کہا ہے کہ میں بیعت کے لئے اس طرح لایا گیا جیسے اونٹ کو نکیل سے کھینچتے ہوئے لاتے ہیں یہاں تک کہ میں بیعت کروں۔ خدا کی قسم تو نے میری مذمت کا ارادہ کیا مگر میری مدح کر گیا تو نے مجھے فضیحت کرنا چاہا مگر خود رسوا ہو گیا اس لئے کہ مظلوم ہونے میں مسلم کا کوئی نقصان نہیں جب تک وہ اپنے دین میں شک کرنے والا اور اپنے یقین کو شک سے نہ بدلنے والا ہو"

اس خطبہ کے الفاظ سے حقیقت امر واضح ہو جاتی ہے اور یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ علی کی بیعت کس طرح حاصل کی گئی۔ معاویہ اس پر طعن کرتا ہے۔ علی اس واقعہ کا انکار نہیں کرتے بلکہ اس کی وہ توجیہ کرتے ہیں جو علی ہی سے مخصوص ہے۔ اب غیر جانبدارانہ فیصلہ اہل انصاف کے ہاتھ ہے

(۲) الواثق الحمایۃ۔ یحییٰ بن حمزہ شیعہ زیدی کی تصانیف بتائی گئی ہے اور اس کی ایک روایت ہے جس کے راوی

سوید بن غفلہ ہیں اور جس سے شیخین کی کامل مدح ظاہر ہوتی ہے استدلال کیا گیا ہے یہ اتواق الحمایہ مجھے مجالج السالکین کی بہت معلوم ہوتی ہے اگر بالفرض یہ کتاب وجود خارجی بھی رکھتی ہو تب بھی کوئی حرج نہیں لیکن جب تک صحیح عبارت نہ دیکھ لی جائے اس پر کسی رائے کا اظہار نہیں کیا جا سکتا۔ جیسے زید ابن علی کا ایک واقعہ یاد آتا ہے کہ جب اموی فوج سے مقابلہ ہوا تو عین کارزار میں ایک شخص نے سوال کیا کہ شیخین کے بارے میں آپ کیا کہتے ہیں۔ اس سوال کا مطلب ظاہر ہے کہ اس موقعہ پر اس کا ذکر کیا معنی رکھتا ہے چنانچہ جناب زید نے ٹال دیا اور کہا کہ اس کا جواب پھر دیا جائے گا۔ لڑائی شروع ہوئی۔ عین جنگ میں ایک تیر زید کی پیشانی پر لگا وہ گھوڑے سے گر پڑے۔ کچھ لوگ گرد جمع ہو گئے پوچھا وہ سائل کہاں ہے۔ وہ بھی آگیا۔ اس سے کہا کہ دیکھ انھیں کے سبب سے مجھے یہ حالت دیکھنی پڑی۔

غرض علی یا بنو علی سے یہ توقع رکھنا کہ شیخین کی کوئی خاص عظمت ان کے دل میں ہو ایک غلط توقع ہے۔

(۳) تفسیر قمی کے حوالے سے سورۃ توبہ کی آیۃ "ثانی اثنین" کی تفسیر میں حضرت صادق سے ایک روایت نقل ہوئی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ روایت موجود ہے لیکن اس سے فائدہ کیا ہے۔ اس سے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ نے حضرت ابوبکر کی آنکھوں پر ہاتھ پھیرا اور انھوں نے جعفر اور ان اصحاب کو سمندر میں دیکھ لیا اور عرض کی یا رسول اللہ آپ صدیق ہیں

اب کوئی بتائے کہ اس میں شیعوں کے خلاف کیا بات نکلی۔ یہ معجزہ اگر ہے تو رسول اللہ کا ہے۔ شیعہ کب اس امر سے منکر ہیں کہ رسول اللہ کے ہمراہ حضرت ابوبکر غار میں نہ تھے یقیناً تھے مگر محزون و ملول تھے۔ ممکن ہے حضرت نے اس طرح ان کو سکون دینا چاہا ہو

دوسری روایت اسی واقعہ کے متعلق جو تفاسیر شیعہ میں مروی ہے۔ میں اسے نقل نہیں کرتا اس سے یہ بھی پتہ چل جاتا ہے کہ حضرت ابوبکر نے اس واقعہ سے کیا اثر لیا

اہل انصاف صرف اتنا دیکھ لیں کہ اگر ایسی ہی کوئی روایت علی کا استحقاق جتانے کے لئے شیعوں کی طرف سے پیش ہوتی تو ان کو "سفیہ" بنانے کے لئے کوئی لغت باقی نہ رکھا جاتا

(۴) سورۂ نور کی آیت " ان الارض یرثہا عبادی الصالحین" کے متعلق ایک مضمون تفسیر خلاصۃ المنہج سے نقل ہوا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ یہ وعدہ خلفاء کے عہد میں پورا ہوا

اس میں پہلی غلطی یہ ہے کہ یہ آیت سورۂ نور میں نہیں بلکہ سورۂ انبیاء میں ہے دوسرا امر یہ ہے کہ "صالحین" نہیں ہے بلکہ "صالحون" ہے۔ یہ صفت ہے عباد کی اور عباد از روئے قانون عربیت مقام رفع میں ہے

ان غلطیوں سے چشم پوشی کرتے ہوئے اور بغیر اصل کتاب کی طرف رجوع کئے ہوئے عرض کرتا ہوں کہ تفسیر عامہ میں یہ مضمون موجود ہے اور حسب عادت اہل علم مفسر نے اس قول کو بھی نقل کیا ہوگا۔ باقی تفسیر خاصہ میں اس آیت کے متعلق

جو کچھ آئمہ سے نقل ہوا ہے اس سے قطعاً مطابقت نہیں رکھتا

(۵-۶) ان دو نمبروں میں کشف الغمہ کے حوالے سے دو عجیب و غریب روایتیں نقل ہوئی ہیں:۔

(۱) علیؑ کا قول ہے کہ جو ابو بکر کو صدیق نہ کہے خدا اس کی عاقبت خراب کرے

(۲) حضرت ابو بکر کی وفات پر حضرت علیؑ بہت روئے اور کہا " آج نبوت کی خلافت منقطع ہو گئی"۔

اہل علم سے گزارش ہے کہ کتاب "کشف الغمہ" موجود ہے۔ شیعی عالم کی تالیف ہے۔ کتاب کا پورا نام ہے "کشف الغمہ فی مناقب الآئمہ" نام ہی سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ موضوع کتاب کیا ہے؟ حضرت رسول اللہ سے لیکر امام دوازدہم تک کے مناقب و فضائل بیان ہوئے ہیں۔ التزام یہ کیا ہے کہ ہر دو فریق کی روایات بسلسلہ مناقب و فضایل میں درج کر دی جائیں

اہل عقل خود انصاف فرمائیں کہ مولف کتاب ہر دو روایات مندرجۂ بالا کو درج کتاب کرکے اپنے موضوع کو کونسی قوت پہونچا سکتا تھا گر پھر بھی میں نے حالات حضرت امیر غور سے پڑھے اور افسوس ہے کہ مجھے ان دونوں روائتوں کا کہیں اشارہ بھی نہ ملا۔ اس کے برعکس مولف کتاب کسی اور شے کو درج کر رہا ہے جو قابل ملاحظہ ہے

" فی ذکر الصدیقین۔ من مناقب ابن المغازلی عن ابن عباس "۔ اس روایت کا ماحصل یہ ہے کہ تحت آیت " السابقون السابقون " ابن عباس سے مروی ہے کہ یوشع ابن نون نے موسیٰ کی طرف سبقت کی اور صاحب " آل یٰسین " نے عیسیٰ کی طرف اور علی ابن ابی طالب نے محمد ابن عبداللہ کی طرف اور وہ ان سے افضل ہے

دوسری روایت مسند امام بن حنبل سے نقل کی ہے ابن عباس کہتے ہیں کہ میں نے خود علیؑ کی زبان سے سنا کہ میں اللہ کا بندہ ہوں۔ اس کے رسول کا بھائی ہوں اور میں صدیق اکبر ہوں اور میرے سوا جو کوئی بھی اس کا قائل ہو وہ مفتری و کاذب ہے میں نے تمام لوگوں سے سات برس قبل نماز پڑھی ہے۔

یہی مضمون صدیقیت ابولیلی سے نقل ہوا ہے۔ اس کے بعد کتاب شیعہ بصائر الدرجات سے ایک حدیث اس بارے میں نقل ہوئی ہے اور یہ مضمون دیگر کتب شیعہ میں بکثرت پایا جاتا ہے۔ خود مولف کتاب نے بحث القاب میں حضرت علی کا لقب صدیق اکبر تحریر کیا ہے۔ اب بتایا جائے وہ حدیث کس گوشے میں چھپی ہوئی ہے جس سے استدلال فرمایا گیا ہے اور یہ حدیث ختم خلافت نبوت تو اور بھی مزیدار ہے

(۷) " فصول امامیہ" سے ایک حدیث حضرت باقرؑ سے درج کی گئی ہے روایت کا سلسلہ کیا ہے؟ خدا ہی جانے۔

لیکن اس نام کی کوئی کتاب شیعی تصنیفات میں نہیں ہے مجھے حیرت تھی کہ یہ فصول امامیہ کونسی کتاب ہے اور کس فن میں ہے۔ کم از کم میرے علم میں تو نہیں لیکن ظاہر ہے کہ میرا محدود علم حجتہ نہیں ہے لہذا ایک عراقی بزرگوار سے رجوع کی گئی جو ایک وسیع نظر کے مالک ہیں انھوں نے بھی کانوں پر ہاتھ رکھے۔ آخر سوچتے سوچتے خیال ہوا کہ عجب نہیں " فصول المہمہ" مراد ہو جو ابن صباغ مالکی کی تالیف ہے اور چونکہ یہ کتاب مناقب آئمہ اہل بیت میں ہے لہذا مصنف کو شیعہ ظاہر کر دینے کے لئے

بہت کافی ہے۔ اسی شبہ پر "فصول المہمہ فی معرفت الآئمہ" کو دیکھا گیا۔ حضرت باقر کے حالات میں تلاش کی گئی کہ یہ حدیث یا روایت جو کچھ بھی ہے دہیں ملتی چاہئے۔ کئی گھنٹے خراب کئے اور نتیجہ کچھ نہ ہوا۔ میں نہ سمجھ سکا کہ اس قسم کے غلط حوالوں کا مطلب کیا ہے؟ تحقیق حق ہے یا مخاطب کو پریشان کرنا۔ مذہب کی حمایت جب ایسے جعلی حوالوں پر منحصر رہ جائے تو یہ وقت اس مذہب کے لئے نہایت بیکسی کا وقت ہوتا ہے

یہ تو حوالے کی حالت ہے۔ اب رہی حدیث اس کے متعلق چند الفاظ کہنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے

فاضل مضمون نگار نے احادیث کے متعلق یہ رائے ظاہر فرمائی ہے :-

"احادیث میں اتنا اختلاف ہے کہ سعی و کوشش کے تمام مراحل طے کرنے کے باوجود بھی کسی شخص کو اس ذریعہ سے مطمئن کر دینا محال نہیں تو ناممکن ضرور ہے"

یہ گویا عذر فرمایا گیا ہے اس امر کا کہ شیعہ متکلمین جو احادیث کتب اہل سنت سے پیش کرتے ہیں وہ قابل استناد نہیں ہیں سوال یہ ہے کہ آیا یہ حق شیعوں کو بھی حاصل ہے یا نہیں اور نہیں تو کیوں؟ اگر شیعہ استدلال کریں تو ہر غیر مشہور کتاب ہر مقبول راوی ناقابل اعتبار اور اگر حضرات اہل سنت استدلال کریں تو شیعوں کا فرض ہے کہ مجہول روایت اور ہر نامعلوم کتاب کو مستند تسلیم کرلیں ۔ ایں چہ بوالعجبی است

اب میں دیکھتا ہوں نفس مضمون حدیث کہ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ خلفاء ثلثہ کے بارے میں ان لوگوں کو خوض کرنے سے منع کیا گیا

معلوم ہے کہ حضرت باقر کا زمانہ بنو امیہ کے شباب کا زمانہ ہے اور بنو امیہ کی نگاہیں اہل بیت کی طرف کیسی تھیں۔ اسکا جواب تاریخ دے سکتی ہے اور آپ خود بھی واقف ہیں یہ بھی ظاہر ہے کہ بنو امیہ کی خلافت کی بنیادیں خلافت شیخین پر قائم ہوئی تھیں اور حضرات ثلثہ یا ان کی حکومتوں پر تنقید کرنا حکومت وقت کو برا کہنا تھا۔ ایسے وقت میں ان عوام کو جو گزرگاہ پر بیٹھ کر یہ تذکرے کرتے تھے اگر حضرت نے سختی کے ساتھ روکا تو اس میں تعجب کیا ہے؟

حضرت باقر علیہ السلام کی تمام زندگی ہمارے سامنے موجود ہے۔ جابر ابن یزید کو ایک کتاب دیجاتی ہے کہ اسے حفظ کرو لیکن جب تک بنو امیہ کی حکومت ہے اس کتاب کا ایک لفظ ظاہر نہ کرو[1]

اگر جناب باقر کے ان اشاروں پر جو بہ نظر مصلحت تھے آپ استدلال کر رہے ہیں تو حضرت کے دوسرے ارشادات پر بھی آپ کو نظر فرمانی چاہئے

---

[1] شیعہ مسئلہ تقیہ کو مانتے ہیں۔ فاضل مضمون نگار نے طنزاً حاشیہ پر اشارہ بھی کیا ہے میں عرض کرتا ہوں کہ "دل میں بت۔ زبان پر خدا" اسے نفاق کہتے ہیں اور "دل میں خدا زبان پر بت" تقیہ ہے وہ بھی عند الضرورت۔ پڑھئے سورۂ نحل کی یہ آیت "من کفر باللہ من بعد ایمانہ الا من اکرہ و قلبہ مطمئن بالایمان"

(۸) ہاں نہج البلاغۃ میں یہ خطبہ مذکور ہے۔ حضرت امیر نے جناب خلیفہ دوئم کو میدان میں جانے سے روکا ہے۔ بہتر ہو گا کہ مناظرین اہل سنت اس خطبہ کو درمیان میں لانے سے اجتناب فرمائیں کیونکہ اس صورت میں سب سے پہلے حضرت خلیفہ دوئم کی مہارت جنگ پر ایک تنقیدی نظر ڈالنے کی ضرورت ہوگی۔ یہاں صرف اس قدر وضاحت کافی ہے کہ علی کے زمانہ میں جتنی لڑائیاں ہوئیں۔ علی بنفس نفیس ان میں شریک تھے۔ اس سے بڑھکر یہ کہ غزوات میں خود رسول اللہ شریک ہوتے تھے گویا غزوات میں خود شریک ہونا سنت پیغمبر ہے۔ پھر حضرت خلیفہ دوئم کو اس سنت رسول سے کیوں روکا گیا؟ بات یہ ہے کہ رسول اللہ کا یا علی مرتضیٰ کا لشکر کے ساتھ ہونا ہر جہت سے مفید تھا اور حضرت ممدوح کی ہمراہی جنگی نقطۂ نگاہ سے لشکر کے لئے مضر تھی اور علی جانتے تھے کہ اس مضرت کا اثر اسلام کی عمومی حالت پر اچھا نہ پڑے گا لہٰذا تالیف قلب کے ساتھ روک دیا۔

(۹) "جلاء العیون" کے باب الوصایا سے حضرت علی کی وصیت نقل کی گئی ہے:

"اصحاب رسول کی رعایت کرو کہ انھوں نے خدا کے دین میں کوئی نئی بات جاری نہیں کی اور نہ بدعتی کو اپنے پاس آنے دیا"

یہ حوالہ صحیح ہے مگر بغیر کتاب دیکھے ہوئے نقل ہوا ہے، میں عین عبارت نقل کرتا ہوں:۔

"از خدا بترسید در باب اصحاب پیغمبر خود در رعایت نمائید آنہا را کہ در دین خدا بدعتے نکردہ اند وصاحب بدعتے را پناہ ندادہ اند بدرستیکہ حضرت پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وصیت فرمودہ در حق ایں گروہ از صحابہ خود و لعنت کردہ برکسیکہ بدعتی کند از صحابہ وغیر صحابہ کے را کہ صاحب بدعتی را پناہ دہد ویاری کند"۔

ترجمہ:- "اپنے پیغمبر کے ان اصحاب کے بارے میں خدا سے ڈرو کہ جنھوں نے دین خدا میں کوئی بدعت نہیں کی اور صاحب بدعت کو پناہ نہیں دی۔ بدرستیکہ حضرت رسول نے اپنے اصحاب کے اس گروہ کے بارے میں وصیت کی ہے اور لعنت کی ہے اس شخص پر جو بدعت کرے۔ وہ صحابہ سے ہو یا غیر صحابہ سے اور اس پر جو کسی بدعتی کو پناہ دے اور اس کی مدد کرے"

شکر ہے کہ ابھی ہندوستان میں پڑھے لکھے لوگ موجود ہیں۔ وہ دیکھیں کہ عبارت کتاب کیا کہتی ہے اور مفہوم کیا لیا گیا ہے۔ مجھے کہنا پڑتا ہے کہ تحریف معنوی کی اتنی دلچسپ مثالیں وقت ہی سے دستیاب ہوتی ہیں۔

روایت کا آخری ٹکڑا بتا رہا ہے کہ وصیت ان اصحاب کے بارے میں کی گئی ہے جو بدعتی نہوں اور بدعتی کو پناہ دینے والے نہوں اور جو بدعتی ہوں خواہ وہ صحابی ہوں یا غیر صحابی ان پر تو لعنت کی گئی ہے۔ مترجم نے پہلی سطر کو دیکھکر دھوکہ کھایا ہے اور "آنہا را" کو پہلے جملے سے متعلق کرکے جملہ ختم کر دیا ہے اور اس طرح عبارت اپنے آخر جزو سے نامربوط ہو کر رہ گئی ہے۔ اس کو مفید سمجھا ہے اور اسی پر اکتفا فرمائی گئی ہے

"الوہی خلافت"

ابتک جسقدر توضیح کی گئی ہے اس کے لحاظ سے اہل نظر غالباً شیعی عقیدۂ خلافت کو سمجھ گئے ہوں گے اور یہ بھی معلوم ہوا ہوگا کہ وہ جو کچھ کہتے اور سمجھتے ہیں اس کی صحیح ترجمانی نہیں کی جاتی

اب اس عنوان کے تحت فاضل مضمون نگار کے اعتراضوں کا جواب بھی پیش کیا جاتا ہے۔ اگرچہ اس میں بیشتر وہی امور ہیں جن کی تفصیل کی جاچکی ہے

تحریفِ قرآن کے متعلق حیات القلوب کی عبارت "ثلث قرآن در فضائل اہل بیت و ثلثے در مثالب دشمنان ایشان است" کے سمجھنے میں اشتباہ ہوا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہی قرآن جو اسوقت موجود ہے اور مسلمانوں کے تمام فرقوں کی مسلم الثبوت کتاب ہے اس کا ثلث حصہ مناقب اہل بیت پر اور ثلث مثالب دشمنانِ اہل بیت پر مشتمل ہے۔ اس کا وہ مفہوم ہرگز نہیں جسے فاضل مقالہ نگار ظاہر کرنا چاہتے ہیں۔ اسی طرح وہ روایتیں جو کتب شیعہ سے پیش کی گئی ہیں اور جو عدم نص امامت علوی پر (بخیال مضمون نگار) دلالت کرتی ہیں۔ لائق غور ہیں

(۱) اہل تشیع کے مشہور مجتہد سجرانی نے شرح نہج البلاغۃ (مطبوعہ طہران) میں یہ روایت نقل کی ہے۔ خلاصہ روایت یہ ہے کہ حضرت رسول اللہ نے حضرت حفصہ کو خبر دی کہ میرے بعد ابوبکر خلیفہ ہوگا اور اس کے بعد تیرا باپ۔ حضرت حفصہ نے یہ راز حضرت عائشہ سے کہدیا' الخ

یہ مضمون دوسری روایات میں بھی موجود ہے اور یہ چیزیں ہمیشہ سے شیعوں کے پیش نظر رہی ہیں۔ شیعہ نظریہ ان روایات کے متعلق ہمیشہ سے یہ رہا ہے کہ اگر کوئی پیشین گوئی کیجائے تو پیشین گوئی کسی واقعہ کی حقانیت یا عدم حقانیت کی دلیل نہیں ہوسکتی۔ فرض کیجئے آج یہودی فلسطین یا اس کے کسی حصہ پر قابض ہیں اور اس کے متعلق کوئی پیشین گوئی کسی کتاب سماوی میں پائی جائے تو کیا اس سے یہود کی حقانیت پر دلیل لائی جاسکتی ہے

حضرت رسول اللہ نے حضرت علی کو وصیتیں کرتے ہوئے خبر دی ہے کہ میرے بعد یہ امور ظہور میں آئیں گے جس پر علی نے پوچھا کہ میرا رویہ کیا ہونا چاہئے۔ فرمایا "صبر" یہی وہ راز باطنی ہے جس پر اہل دل حیرت کرتے ہیں اور اہل دنیا کوئی طعنہ اُٹھا نہیں رکھتے ۔ الغرض یہ پیشین گوئی حضرات خلفاء کی حقیت کو ثابت نہیں کرتی

(۲) جلاء العیون میں لکھا ہے کہ حضرت رسول پر جب مرض کا غلبہ شدید ہوا تو آپ نے چاہا کہ اپنی میراث و جانشینی اپنے چچا حضرت عباس کے سپرد کردیں۔ حضرت عباس نے کہا یہ کام مجھ سے نہ ہوگا۔ میری بجائے حضرت علی کے سپرد کردیا جائے" نتیجہ یہ نکالا گیا ہے کہ رسول کریم اپنی وفات کے بعد صرف حضرت علی ہی کو خلافت کا حقدار تصور نہ کرتے تھے

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اصل عبارت نقل کردوں تاکہ مبصر کو مطلب سمجھنے میں آسانی ہوجائے

"اے عم پیغمبر قبول کن وصیت مرا و را اہل من و در زنان من دیگیر میراث مرا و ادا کن دین مرا و وعدہ ہائے مرا بعمل بیاور و ذمۂ من بری بگردان ۔ عباس گفت یا رسول اللہ من مرد پیر عیال دارم و تو از ابر بہاری بخشندہ تری و مال من وفا نمی کند بوعدہ ہائے تو و بخششہائے تو این را از من بگردان بسوئے کسے کہ طاقتش از من بیشتر باشد و حضرت سہ مرتبہ این سخن را اعادہ کرد و در ہر مرتبہ او چنیں جواب گفت پس حضرت فرمود کہ میراث خود را بکسے دہم کہ قبول کند آن را کہ حق قبول کردنی

است و سزاوار آں باشد و چنانچہ تو گفتی جواب نگوید پس با حضرت امیر المومنین خطاب کرد و فرمود یا علی تو بگیر میراث مرا کہ مخصوص تست دکسے را با تو نزاعے نیست و قبول کن وصیت مرا و عمل بیار در وعدہ ہائے مرا و ادا کن قرضہائے مرا یا علی خلیفہ من باش در اہل من و تبلیغ رسالات من بعد از من بمردم بکن۔"

(ترجمہ) "اے چچا میرے اہل کے بارے میں اور میری عورتوں کے بارے میں میری وصیت کو قبول کرو اور میری میراث لے لو۔ میرا قرض ادا کرو اور میرے وعدوں کو عمل میں لاؤ اور مجھے بری الذمہ کردو۔ عباس نے کہا یا رسول اللہ میں بوڑھا آدمی ہوں عیال دار ہوں آپ ابر بہاری سے بڑھ کر بخشش کرنے والے۔ میرا مال آپ کے وعدوں اور آپ کی بخششوں کے لئے وفا نہیں کرسکتا۔ اس وصیت و میراث کو اس کی طاقت پلٹا سے جس کی طاقت مجھ سے بیشتر ہو حضرت نے تین مرتبہ اسی ارشاد کو دوہرایا اور ہر مرتبہ عباس نے یہی جواب دیا پس حضرت نے فرمایا کہ اپنی میراث ایسے کو دونگا کہ جو اسے اس طرح قبول کرے جو قبول کرنے کا حق ہوتا ہے اور وہ اس کے لئے سزاوار ہو اور جس طرح تونے کہا اس طرح جواب نہ دے پس حضرت امیر المومنین سے خطاب کیا اور فرمایا یا علی تو میری میراث لے کہ تجھ ہی سے مخصوص ہے اور کسی کو تجھ سے نزاع کا حق نہیں میری وصیت قبول کر۔ میرے وعدوں کو عمل میں لا۔ میرے قرضوں کو ادا کر اور اے علی میرے اہل میں میرا خلیفہ ہو۔ اور لوگوں پر میرے پیغاموں کی تبلیغ کر۔" یہ ہے عین عبارت اور اس کا ترجمہ۔ میں اس روایت پر از روئے روایت کوئی بحث نہیں کرنا چاہتا۔ صرف نفس مضمون کے متعلق عرض کرتا ہوں کہ اس روایت میں میراث کا تذکرہ ہے۔ حضرت رسول اپنے چچا سے فرماتے ہیں کہ اگر میری میراث لینی چاہتے ہو تو ان شرائط کے تحت لے سکتے ہو۔ عباس اپنے افلاس کا عذر کرتے ہیں۔ تین مرتبہ یہی بات دھرائی جاتی ہے تاکہ عباس کے لئے کوئی عذر باقی نہ رہ جائے اور آخر یہ شے علی مرتضیٰ کو تفویض ہوتی ہے۔ نزاکت کلام یہ بھی ہے کہ عباس سے فرماتے ہیں "قبول کن وصیت من در اہل من و در زنان من" اور علی سے فرماتے ہیں "علی خلیفہ من باش در اہل من و تبلیغ رسالات من بعد از من بمردم کن" رسول اللہ کے اس ارشاد اور وصیت کا مطلب کیا تھا وہ اس جواب سے ظاہر ہے "یا رسول اللہ من مرد پیر و عیال دارم" ظاہر ہے کچھ خرچ کا معاملہ تھا اور اہل رسول و زنان رسول کی خبر گیری کا بار پڑتا تھا اس لئے انکار کردیا

میں نہ سمجھ سکا کہ خلافت و امامت سے اسے ربط کو نسا ہے۔ واقعی عباس کے خیال میں بھی یہ بات نہ گزری تھی جو معترض نے پیدا کی اور علی کو بھی جو اس مقام میں خلافت دی گئی ہے وہ خلافت خاصہ ہے یعنی وہ اہل رسول و زنان رسول کے مثل رسول محافظ و نگراں رہیں اور ان کا حکم مثل رسول ان پر جاری ہو۔ غرض معترض کے پیش کردہ نتیجہ سے اس روایت کو کوئی تعلق نہیں

(۴) ملا باقر مجتہد نے حضرت امام جعفر صادق سے روایت کی ہے کہ ایک بار نبی کریم نے بارگاہ ایزدی سے ہزار حاجتیں طلب کیں۔ خدا تعالٰے نے سب روا کردیں آخر شب میں حضرت علی بھی مسجد میں تشریف لائے۔ رسول خدا نے فرمایا اے

علی تمہاری خلافت و امامت کے واسطے ہم نے جو دعا کی وہ بارگاہ خداوندی سے منظور نہیں ہوئی۔ (حیات القلوب جلد ۲)

فاضل مقالہ نگار نے اس مقام پر یہ فخریہ عبارت بھی تحریر فرمائی ہے کہ اگر میں حدیث گڑھنے پر آتا تب بھی اس سے زیادہ صاف۔ واضح اور غیر مبہم حدیث گڑھنے میں شاید مشکل کامیاب ہوسکتا۔

اب ذرا اصل عبارت ملاحظہ ہو:۔

"حضرت رسول شبے در مسجد ماند چوں نزدیک بصبح شد حضرت امیر المومنین داخل مسجد شد پس حضرت رسول او را ندا کرد کہ یا علی گفت لبیک فرمود بیا بسوئے من چوں نزدیک شد حضرت فرمود تمام ایں شب را دیدی در اینجا بسر آوردم و ہزار حاجت خود را از خدا سوال کردم و ہمہ را بر آورد و مثل آنہا را نیز برائے تو سوال کردم و باز ہمہ عطا کرد و سوال کردم از برائے تو کہ ہمہ امت را جمع گرداند برائے تو کہ ہمہ اقرار کنند بخلافت تو، قبول نکرد و ایں آیات را فرستاد" الم احسب الناس ان یترکوا ان یقولوا آمنا وہم لایفتنون ولقد فتنا من قبلہم فلیعلمن اللہ الذین صدقوا ولیعلمن الکاذبین"

(ترجمہ) ایک شب رسول نے مسجد میں قیام فرمایا جب صبح نزدیک ہوئی تو حضرت امیر المومنین داخل مسجد ہوئے پس حضرت رسول نے آواز دی یا علی، عرض کی لبیک۔ فرمایا میرے پاس آؤ۔ جب نزدیک آئے فرمایا تم نے دیکھا کہ یہ رات میں نے یہیں بسر کی ہے اپنی ہزار حاجتیں خدا سے طلب کیں۔ خدا نے انھیں پورا کیا اور انھیں کی مانند (ہزار حاجتیں) تیرے لئے بھی سوال کیا۔ وہ تمام سوال بھی پورے ہے اور میں نے سوال کیا کہ تمام امت کو تیرے واسطے جمع کردے کہ سب تیری خلافت کا اقرار کریں اور سب تیرے تابع ہوں۔ یہ سوال قبول نہ ہوا اور یہ آیت بھیجی گئیں۔ الم۔ کیا لوگوں نے گمان کرلیا ہے کہ اتنا کہدینے پر کہ ہم ایمان لے آئے چھوڑ دئے جائیں گے اور ان کی آزمائش نہ کی جائے گی اور البتہ ہم نے ان کو بھی آزمالیا ہے جو ان سے پہلے گزر چکے اور البتہ خدا جانتا ہے جو سچے ہیں اور البتہ خدا خوب جانتا ہے انھیں جو جھوٹے ہیں"

اہل بصیرت جانتے ہیں کہ منزل وحی نے حقایق کو نہایت سادہ زبان میں بیان فرمایا ہے۔ علی کو بتایا جارہا ہے کہ مشیت الٰہی کسی کو کسی فعل پر مجبور نہیں کرتی۔ لہٰذا ایسا نہیں ہوگا کہ تمام لوگوں کو خداوند عالم مجبور کرکے تیری خلافت پر مجتمع کرے اور جبر سے کام لیکر انھیں تیرا تابع بنائے۔ بلکہ ایک شان اختیاری کے ساتھ انھیں معرض امتحان میں رکھا گیا ہے اور تو انکے لئے وجہ امتحان ہے۔ اور یہ آیات سورۂ عنکبوت اس مسئلہ پر روشنی ڈال رہی ہیں"

یہ ہے وہ مطلب جو اہل عقل اس حدیث سے اخذ کرتے ہیں۔ اب کیا اہل انصاف میری طرف سے دریافت کرسکتے ہیں کہ فاضل مضمون نگار نے یہ مفہوم کہاں سے پیدا کیا ہے اور "اے علی ہم نے تمہاری ولایت و خلافت کے واسطے دعا مانگی نا منظور ہوئی" یہ کونسی عبارت کا ترجمہ ہے

(۳) ایک روایت عیون الاخبار سے نقل فرمائی گئی ہے کہ حضرت خضر نے علی مرتضیٰ کو رابع الخلفا کہکر سلام کیا

فاضل مناظر نے عیون الاخبار تو نہیں دیکھی۔ اس کا تو یقین ہے لیکن خیر اس امر سے قطع نظر کرتے ہوئے عرض

بتاتا ہوں کہ یہ مضمون شیعوں میں مشہور ہے اور معمولی معمولی اہل ممبر بھی اسے بیان کرتے ہیں۔ یہ ایک اصطلاحی جملہ ہے جسکی تشریح یہ ہے کہ خلفائے اربعہ شیعوں کے نزدیک حسب ذیل ہیں:۔
(۱) حضرت آدم (۲) حضرت داؤد (۳) حضرت ہارون (۴) حضرت علی۔ کہا جائے گا کہ یہ تاویل ہے اور خدا جانے کیا ہے میں عرض کروں گا کہ جس قوم کی اصطلاح ہو وہی اس کی تشریح کی حقدار ہوتی ہے۔ عقلاً کبھی اس پر ایراد نہیں کرتے۔ تمام علوم و فنون میں یہی قاعدہ جاری ہے

(۵) نہج البلاغۃ کے حوالے سے یہ عبارت نقل ہوئی ہے:۔
"ان امیر المؤمنین قال الناس جماعتنا ویداللہ علیہم غضب اللہ علی من خالف الجماعۃ انا واللہ اہل السنۃ والجماعۃ"
امیر المؤمنین نے فرمایا کہ لوگ جماعت ہیں اور جماعت پر اللہ کا ہاتھ ہے اور جو شخص جماعت کی مخالفت کرتا ہے۔ خدا اسپر غضبناک ہوتا ہے۔ خدا کی قسم میں اہل سنت والجماعت ہوں (یعنی سنت رسول کا پابند ہوں اور مسلمانوں کی مجموعی جماعت کا فرد ہوں)

آخر کلام میں افتخاراً ارشاد ہوا ہے کہ ان روایات کو پیش کر دینے کے بعد غالباً مجھے مزید توضیح کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔
اہل علم جانتے ہیں کہ عبارتوں سے جو مطالب وضع کئے جاتے ہیں ان کی صحت پر یقین کرنے کی ایک میزان ہے جس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ مفہوم صحیح ہے یا غلط اسی معیار پر پیش کردہ عبارت کے مفہوم کو جانچنا چاہتا ہوں۔ ملاحظہ ہو:۔
(۱) لوگ جماعت ہیں (۲) اور جماعت پر اللہ کا ہاتھ ہے (نتیجہ) پس لوگوں پر اللہ کا ہاتھ۔ (مفہوم اول)
(۲) لوگ جماعت ہیں (۲) اور جماعت کی شان یہ ہے کہ اس کی مخالفت سے اللہ غضبناک ہوتا ہے (نتیجہ) پس لوگوں کی مخالفت سے اللہ غضبناک ہوتا ہے (مفہوم ثانی) ماشاءاللہ کیا خوب عبارت اور کیا خوب مفہوم۔
"انا واللہ اہل السنۃ والجماعۃ" یہ تو معلوم ہے کہ اصطلاحی معنوں میں تو یہ کلمہ "اہل السنۃ والجماعۃ" استعمال نہیں ہوا کیونکہ یہ اصطلاح مولد ہے اور بعد کو وضع کی گئی ہے اسی لئے ترجمہ میں بھی اس کی توجیہ فرمائی گئی اب معلوم نہیں ہوتا کہ اس جملہ سے کیا فائدہ اٹھانے کی توقع کی گئی ہے

اس کے علاوہ یہ دریافت کرنے کا حق رکھتا ہوں کہ نہج البلاغۃ کے کس خطبہ میں یہ عبارت مرقوم ہے۔ آیا خطبات میں ہے؟ فرامین میں ہے۔ کلمات مختصرہ میں ہے؟ کہاں ہے؟

ارباب علم ہرگز تعجب نہ فرمائیں۔ مذہب عمومی کی بنیاد انھیں بے سبب صداقتوں پر اٹھائی جاتی ہے اور عوام کو قابو میں رکھنے کے لئے ہمیشہ سے یہی نسخہ استعمال ہوا ہے

سیاسی اختلاف

اس عنوان کے ماتحت اس امر پر زور دیا گیا ہے کہ مذہب شیعہ کی ابتدا عبداللہ بن سبا ایک نومسلم یہودی سے ہوئی۔

میں پہلے یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ عبداللہ بن سبا کو طنزاً نومسلم کہنا درست نہیں اس لئے کہ اسوقت جو لوگ مسلمان ہوئے وہ مشرکین قریش ہوں یا غیر قریش - یہودی ہوں یا نصرانی - سب کے سب نومسلم تھے - سوائے ایک مخصوص خانوادہ کے مخصوص افراد کے کہ ملت ابراہیمی جن کے سینوں میں بطور امانت چلی آرہی تھی - اس کے بعد فاضل استرآبادی کی تحریر سے استدلال کیا گیا ہے اور یہ تحریر پیش کی گئی ہے :-

"وکان (عبداللہ بن سبا) اول من شرع بالقول الفریضۃ امامۃ علی"

"عبداللہ بن سبا پہلا شخص تھا جس نے یہ بات نکالی کہ حضرت علی کی امامت مذہبی فریضہ ہے"

اب ارباب نظر انصاف کی آنکھوں سے اس دعوے کو ملاحظہ فرمائیں میں فاضل مضمون نگار کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انکی بدولت کتب رجال کی ورق گردانی کا موقعہ ملا - فاضل استرآبادی کا پورا نام ہے "مرزا محمد بن علی بن ابراہیم استرآبادی" کتاب کا نام ہے "تلخیص المقال فی اسماء الرجال" اس کتاب کی عبارت یہ ہے :-

"عبداللہ بن سبا غال ملعون، کان یزعم ان علیا الہ وانہ نبی لعنہ اللہ"

بس عبداللہ بن سبا کے ترجمے میں بھی دو تین سطریں اس کتاب میں مرقوم ہیں - اس سے زیادہ ایک حرف نہیں یعنی عبداللہ بن سبا "غالی ہے ملعون ہے - وہ گمان کرتا تھا کہ علی خدا ہے اور وہ خود نبی ہے خدا اس پر لعنت کرے"

اگر اس زمین کے اوپر اور اس آسمان کے نیچے کہیں انصاف ہے تو اس علمی خیانت کو دیکھئے اور عبرت حاصل کیجئے -

مزید توضیح کے لئے علامۂ بہبہانی کا قول بھی نقل کئے دیتا ہوں کہ :-

"عبداللہ بن سبا اصحاب امیرالمومنین سے تھا جو کفر کی طرف پلٹ گیا اور جس غلو کا اظہار کیا - حضرت صادق سے منقول ہے کہ عبداللہ بن سبا نبوت کا مدعی تھا اور گمان کرتا تھا کہ امیرالمومنین خدا ہے - یہ خبر امیرالمومنین کو پہونچی - آپ نے اسے بلایا اور پوچھا اس نے اقرار کیا اور کہا تو ہی خدا ہے اندمیرے دل میں یہ بات ڈالی گئی ہے کہ تو خدا ہے اور میں نبی ہوں امیرالمومنین نے اس سے فرمایا کہ تجھے شیطان نے مسخرہ بنایا ہے - اس قول سے رجوع کر تیری ماں تیرے ماتم میں بیٹھے - آپ نے اصرار کیا اور اس نے انکار - حضرت نے اسے تین دن قید رکھا اور چاہا کہ توبہ کرے مگر اس نے توبہ نہ کی سلئے قید خانہ سے نکالا اور آگ میں جلا دیا"

ناظرین ملاحظہ فرمائیں کہ عندالشیعہ "عبداللہ بن سبا" کی کیا ہستی ہے -

اب یہیں سے عین اللہ و یداللہ وغیرہ کی بابت سن لیجئے اگر بروایت صحیحہ یہ کلمات علی کی زبان سے یا کسی دوسرے معصوم کی زبان سے نکلے ہوئے ثابت ہو جائیں تو بیشک ان پر گفتگو ہو سکتی ہے گو یہ بھی شیعی معتقدات کے آسمانی تخیل کو متاثر نہیں کر سکتے - البتہ علمائے سنت والجماعت میں بہ کثرت ایسے حضرات مل سکتے ہیں جنھوں نے اس سے بھی بڑھ کر کہا ہے ان کے متعلق کیا رائے ہے ؟

علامہ مجلسی کا قول حضرت امام حسین کی بابت جو نقل کیا گیا ہے کہ وہ زندہ آسمان پر اٹھا لئے گئے یہ ایک گروہ کا قول نقل ہوا ہے اس سے شیعی اصول مذہب کا کیا تعلق اور کسی طائفہ گمنام کا قول نقل کر دینا کس برم میں داخل ہے ؟

شیخ ابوجعفر طوسی سے جو روایت نقل کی گئی ہے اس کی صحت بھی اگر تسلیم کر لی جائے تو اس کے معنی یہ ہیں " کہ محبت اہل بیت تمام اعمال کی روح ہے " یہ عقیدہ شیعہ سب حضرات اہل سنت نہیں مانتے نہ مانیں۔

اب رہا دوست دشمن کے متعلق ارشاد علوی۔ اس کے متعلق " کلینی " اور " مسدی " کا بے تکا جوڑ ملانے کی ضرورت نہیں۔ یہ قول نہج البلاغۃ میں موجود ہے :- " **هلك فی رجلان محب غال و مبغض قال** " میرے بارے میں دو شخص ہلاک ہوئے۔ وہ دوست جو غلو کرے اور وہ بغض رکھنے والا جو میرے مرتبہ میں کلام کرے

غلو کی حالت تو معلوم ہو گئی اب یہ مراتب علویہ میں کلام کرنے والا کون ہے ؟ ارباب نظر اس کی تنقید فرمائیں

منقولات کے متعلق انتہائی اختصار کے ساتھ مجھے جو لکھنا تھا لکھ چکا۔ اس تحریر میں میرا نقطۂ نگاہ اس مجیب کا سا ہے جس نے صرف دفع ایراد کے لئے قلم اٹھایا ہو۔ ورنہ اثبات مطلب کے لئے میدان دوسرا ہے

آخر میں یہ سوال ضرور کرنا چاہتا ہوں کہ " عبداللہ بن سبا " کے واقعہ کو سیاسیات سے کیا تعلق ہے۔ ایک شخص اسلام لایا پھر کفر اختیار کیا۔ علی کو خدا کہنے لگا۔ اسے جلا دیا گیا، اس میں کونسا سیاسی پہلو ہے اگر کہا جائے کہ وہ اصحاب علی میں سے تھا اس سے ذات علی یا دیگر اصحاب علی یا تشیع پر کیا الزام ؟ بات دور جا رہی ہے اور میں اس عنوان کو ختم کرنا چاہتا ہوں۔

اب میں اس ایراد کی طرف توجہ کرتا ہوں جسے طرح طرح کی رنگ آمیزیوں کے ساتھ پیش کیا گیا ہے اور کیا جا رہا ہے اور وہ یہ ہے کہ شیعہ مسلک کی بنیاد دوسروں سے نفرت پر قائم ہوئی ہے

قارئین کرام کی خدمت میں التماس ہے کہ مذہب شیعہ کے اصول یہ ہیں :- (۱) خدا کو واحد و یکتا ماننا (۲) خدا کو عادل ماننا (۳) نبوت خاتم النبیین پر ایمان لانا اور انبیا کو معصوم سمجھنا (۴) خلافت و امامت کو من اللہ قبول کرنا (۵) روز جزا پر اسی حیثیت سے ایمان لانا جس حیثیت سے پیغمبر نے تعلیم دی ہے

ان اجزا پر نظر کرتے ہوئے مجھے نہیں معلوم ہوتا کہ کس جزو کی بنا پر مذکورۂ بالا الزام درست ہو سکتا ہے

ہاں خلافت کے معاملے میں وہ لوگ جو دنیوی حیثیت سے مسلمانوں کے حاکم بنے، شیعوں کے نزدیک انھیں مذہبا کوئی اہمیت نہیں دی جاتی اور ایسے چند اشخاص کے خلاف جو مبعوث یا منصوص من اللہ ہیں وہ اپنے نقطۂ نظر سے مخالفانہ اظہار خیال پر مجبور ہیں

یہ ایک فطرت انسانی ہے کہ انسان جس شے کو اچھا نہیں سمجھتا۔ اس سے اظہار برأت کر ہی دیتا ہے۔ اگر انبیا کا عمل قابل اقتدا ہے تو سورۂ توبہ کی اس آیت کو پڑھئے :- " **وما کان استغفار ابراھیم لابیہ الا عن موعدۃ**

وعدھا ایاہ فلما تبین لہ انہ عدو للہ تبرا منہ ان ابراہیم لاواہ حلیم ؕ

اس سے پتہ چلتا ہے کہ جو شخص اپنے دوست کا دشمن ہو اس سے اظہار برات کرنا علم کے خلاف نہیں ہے۔
اس مسئلہ کی نظری حیثیت اتنی ہی ہے۔ اب رہا دوسروں کے جذبات کا احترام البتہ یہ ضروری شئے ہے لیکن مثل مشہور ہے کہ "اکرم تکرم" اکرام کرو تمہارا بھی اکرام کیا جائے گا۔ تالی دونوں ہاتھوں سے بجتی ہے۔ اگر کوئی طبقہ اپنی کثرت کے اعتبار پر خود جس طرح چاہے عمل کرے اور قلت سے اپنے جذبات کے احترام کا متمنی رہے تو یہ نباہ کی باتیں نہیں ہیں۔

ذاکر حسین

جب دولت مغلیہ برزوال آیا تو ریاستوں نے اپنے آپ کو آزاد سمجھنا شروع کیا اور ایسٹ انڈیا کمپنی کی عملداری تک تقریباً سب کے سب خود مختار ہوگئے، لیکن اس آزادی و خود مختاری کی عمر بہت تھوڑی ثابت ہوئی کیونکہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے اقتدار کے ساتھ ساتھ ریاستوں کی آزادی بھی کم ہوتی گئی اور باوجودیکہ جو معاہدے ہوئے ان میں ریاستوں کی محکومیت ہی کا پلہ جھکا ہوا ہوتا تھا مثلاً ۱۸۱۸ء کے معاہدۂ اُدے پور کی رو سے ریاست کمپنی کا محکوم ہوگیا اور ۱۸۱۸ء میں ہولکر کی گدی کے لئے گود لینے کا سوال اس شرط پر منظور کیا گیا کہ وہ حکومت برطانیہ کو اپنا آقا سمجھتا ہے۔

تاریخی حیثیت سے ریاستوں کے نشوونما پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جب چارلس دوم کے زمانہ میں کمپنی کو غیر عیسائی طاقتوں سے صلح و جنگ کا اختیار دیا گیا تو کمپنی نے سب سے پہلے ۱۷۲۳ء میں راجہ ٹراونکور سے معاہدہ کیا، اس کی رو سے کمپنی نے سامانِ جنگ رکھنے کے لئے ایک قلعہ تعمیر کرایا۔ دوسرا معاہدہ ۱۷۳۰ء میں (Savantavadi) سے ہوا جو (Savantavadi) کے بحری قزاقوں کے استیصال کے لئے عمل میں آیا تھا۔ اسی طرح کا ایک معاہدہ ۱۷۳۳ء میں ریاست کھمبایت سے ہوا، لیکن یہ تمام معاہدے چھوٹے چھوٹے سرداروں سے ہوئے تھے جنہیں کوئی سیاسی اہمیت حاصل نہ تھی۔

جنگ پلاسی کے بعد کمپنی اور حیدرآباد کے معاہدے سے جو ۱۷۶۶ء میں ہوا تھا کمپنی کے اختیارات میں بہت اضافہ کردیا۔ اس وقت کمپنی کو مرہٹوں، فرانسیسیوں اور افغانوں کی طرف سے خطرہ کا اندیشہ تھا، اس لئے اس نے یہی مناسب سمجھا کہ وہ ان ریاستوں سے جو کمپنی کے علاقہ سے متصل تھیں (Subsidiary Alliance) کرے چنانچہ اس معنے میں سب سے پہلا معاہدہ اس قسم کا نواب اودھ سے ہوا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب انگریزی فوجیں لکھنؤ میں فاتحانہ داخل ہو چکی تھیں اور اگر کمپنی چاہتی تو لکھنؤ کو اپنے قبضہ میں کر لیتی لیکن مالی مشکلات کی وجہ سے کمپنی نے ایسا نہ کیا اور شجاع الدولہ کو اودھ کے تخت پر اس شرط کے ساتھ بحال رکھا کہ نواب اس فوج کے مصارف برداشت کرے گا جو کمپنی کو اس کی مدد کے لئے رکھنا پڑے گی۔

اس معاہدہ کی رو سے نواب وزیر اودھ اندرونی معاملات میں خود مختار تھا، لیکن جوں جوں کمپنی کی طاقت میں اضافہ ہوتا گیا، اس کی حیثیت محکوم کی سی ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ ہیسٹنگز کے زمانہ میں وزیر پورے طور پر انگریزی حکومت کا تابع ہوگیا اور اس نے کمپنی کو معاہدوں میں ردوبدل کا پورا اختیار دیدیا۔ اس کے بعد بنارس کے معاہدہ کی رو سے اودھ کی حیثیت ایک صوبہ کی سی ہوگئی اور پھر کارنوالس اور جان شور کے بعد نواب کے اختیارات بالکل سلب ہوگئے۔ اس کے بعد جب مارکوئس ولزلی گورنر جنرل ہوکر آئے تو وزیر سے دوآبہ کا علاقہ چھین کر کمپنی کی حکومت میں شامل کرلیا گیا اور گورنر جنرل کو نواب کے اندرونی معاملات میں بھی دخل دینے کا حق حاصل ہوگیا۔

کرناٹک کی تاریخ بھی ایسی ہی ہے۔ نواب ارکاٹ کو کمپنی کی نگرانی میں گدی پر بٹھایا گیا اور اندرونی معاملات میں اس کو بالکل آزاد کیا گیا یہاں تک کہ شاہِ انگلستان کی طرف سے ایک ایلچی وہاں رہا کرتا تھا، لیکن بعد کو میسور کی طاقت کا خاتمہ

ہونے کے بعد کرناٹک پر بھی قبضہ کر لیا گیا

ولزلی کے زمانہ میں اعانتی عہدناموں (Subsidiary Alliance) کی طرف زیادہ
توجہ کی گئی اور یہی مناسب سمجھا گیا کہ انہیں ریاستوں کے بقا سے انگریزی حکومت کو بہت مدد ملے گی، چنانچہ نظام، پیشوا، ہولکر اور
راجپوتانہ کی بعض ریاستوں سے اسی طرز عمل کے تحت معاہدے کئے گئے ۱۸۰۰ء میں نظام کا معاہدہ اور اس کے بعد
سندھیا اور بھونسلا کا معاہدہ اور پھر ۱۸۰۵ء میں گیکوار کا معاہدہ سب اسی قسم کے اعانتی معاہدے تھے

ان تمام عہدناموں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی حیثیت بظاہر ایسی ہی تھی جیسی خود مختار حکومتوں کے معاہدے
کی ہونی چاہئے لیکن یہ عہد و پیمان زیادہ دیر پا ثابت نہ ہوا۔

ولزلی کے زمانہ تک تو حالات میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہوئی، کیونکہ وہ اس پالیسی کے خلاف تھا کہ ریاستوں کے
اندرونی نظم و نسق میں مداخلت کر کے ان کو کمزور بنا دیا جائے لیکن اس کے بعد بارلو اور کارنوالس کے زمانہ میں یہ پالیسی بالکل
بدل گئی اور پھر ولزلی کے زمانہ کے عہدناموں کو تقریباً کالعدم کر دیا گیا

اس کے بعد ہیسٹنگز کا زمانہ آیا۔ یہ چاہتا تھا کہ ہندوستان میں بالکل برطانوی ملوکیت قائم ہو جائے، اس لئے تمام قدیم
معاہدوں کو بدل کر رکھ دیا اور اعانتی عہدناموں سے جو پوزیشن ریاستوں کا قائم ہو چکا تھا اس کی جگہ (Feudalary
System) نے لیلی اور کمپنی تمام ہندوستان کی حاکم [illegible] گئی تھی [illegible] ریاستوں
کی مدد کی ضرورت نہ تھی اس لئے اس [illegible] کے تمام معاہدے محض برطانیہ کے وقار کو دوبالا کرنے کے لئے تھے۔ چنانچہ راجپوتانہ
کی ریاستوں سے اسوقت [illegible] کا مقصود ریاستوں کا محکوم بنانا تھا نہ کہ ان سے اتحاد پیدا کرنا۔ یہی
[illegible] معاہدے ہوئے ان سب کا مقصود ریاستوں کا محکوم بنانا تھا نہ کہ ان سے اتحاد پیدا کرنا۔ یہی
حال وسط ہند کی ریاستوں کا ہوا کہ سوائے اورچھا، دتیا اور سمتھر کے باقی سب کو اسناد، معافیاں یا اقرارناموں سے ٹال دیا گیا۔

الغرض اس طرح ۵۶۴ ریاستیں کمپنی کی محکوم ہو گئیں

کاٹھیاوار کی ریاستوں سے براہ راست معاہدے نہیں کئے گئے بلکہ گیکوار کی ریاست کی وساطت سے۔ کئے گئے انکا
نتیجہ یہ ہوا کہ وہ بالکل برطانوی حکومت کے تحت میں آگئیں۔ اس کے بعد پنجاب کی چھوٹی ریاستوں کے اختیارات محدود
کر کے ان کو جاگیردارانہ حیثیت دیدی گئی

کشمیر کی حکومت گلاب سنگھ کے ہاتھ فروخت کی گئی لیکن شرط یہ تھی کہ اس کے ورثا نرینہ میں سے کوئی تخت نشین ہوا
کرے گا اور اس کا فیصلہ انگریزی حکومت کرے گی۔ اس طرح گویا کشمیر کو بھی اپنا محکوم بنا لیا۔ اس کے بعد لارڈ ڈلہاوزی نے
تو کھلم کھلا ریاستوں کو انگریزی حکومت میں شامل کرنا شروع کر دیا اور کسی نہ کسی بہانہ سے تمام ان چھوٹی ریاستوں
کو جن کا انتظام خراب تھا ضبط کر لیا

الغرض یہ واقعہ ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانہ میں بھی معاہدوں کا لحاظ نہیں کیا گیا اور کمپنی کے ٹوٹنے کے بعد

جب ہندوستان تاج برطانیہ سے متعلق ہوگیا، ہمیشہ معاہدات کا مفہوم، حکومت ہند کے مصالح پالیسی کے لحاظ سے بدلتا رہا اور رفتہ رفتہ رئیسوں کی آزادی محدود ہوتی گئی

اس میں شک نہیں کہ ہندوستان کی ریاستیں اپنی جغرافی، مالی و سیاسی حیثیت سے مختلف مزاج رکھتی ہیں اور یہ بھی درست ہے کہ بعض اہم ریاستوں کے معاہدات اپنے مفہوم کے لحاظ سے اب بھی کافی اہمیت رکھتے ہیں اور ان کی بنا پر رئیسوں کو آزادی کے مطالبہ کا حق پہونچتا ہے لیکن اس سے انکار ممکن نہیں کہ عملی نقطۂ نظر سے معاہدات کا مفہوم ہمیشہ حکومت کی پالیسی کے لحاظ سے بدلتا رہا ہے اور اس سے قبل کبھی کسی ریاست کو ہمت نہیں ہوئی کہ وہ قوتِ بالادست کو معاہدوں کی طرف متوجہ کر سکتی، کیونکہ یہ بالکل بے نتیجہ بات تھی

پھر جب معاہدوں کی ترمیم و تنسیخ ان کے مفہوم کا تغیر و تبدل کمپنی کے زمانہ سے لیکر اسوقت تک تاریخی حقیقت بھی رکھتا ہے اور سیاسی واقعیت بھی، تو پھر اب آئین جدید کے نفاذ کے وقت ریاستوں کا یہ مطالبہ کہ ان کی خود مختاری و آزادی کو بحال رکھا جائے کوئی معنے نہیں رکھتا، اس سے قبل ہی وہ طلب آزاد و خود مختار تھے کہ وفاقی طرزِ حکومت میں اس کا سوال اٹھایا جائے

میں ریاستوں کے اس اصرار یا انکار کو جب اس نقطۂ نظر سے دیکھتا ہوں کہ اگر قوتِ بالادست آج یہ فیصلہ کرے کہ ریاستوں کو مٹا کر برطانوی ہند کے صوبوں سے ان کے علاقوں کو ملا دینا چاہئے، تو ریاستیں کیا کریں گی کیا وہ متفقہ قوت کے ساتھ قوتِ بالادست سے جنگ کریں گی اور کیا اس جنگ میں وہ کامیاب ہو جائیں گی۔ ریاستوں کا مسئلہ ایسا مسئلہ ہے کہ اس میں برطانوی ہند کی آبادی کو بھی کوئی خاص ہمدردی ان سے نہیں ہے بلکہ وہ خود یہ چاہتی ہے کہ کسی طرح ریاستوں کا وجود ختم ہو جائے اس لئے ملک بھی ریاستوں کا طرفدار نہیں ہو سکتا اور قوتِ بالادست پر کوئی دباؤ ایسا نہیں پہونچ سکتا جو اسے ریاستوں کی بقا کا طرفدار بنا دے

پھر جب حالات یہ ہیں تو ریاستوں کے تمام موجودہ مطالبات محض اس لئے کہ قوتِ بالادست کو برطانوی ہند کے مقابلہ میں اپنا پہلو قوی بنانے کے لئے ان کو ساتھ رکھنے کی ضرورت ہے، بالکل کچے دھاگے کا سہارا ہے

برطانوی پالیسی وقت و حالات کے سانچہ میں ڈھل جایا کرتی ہے اور ہمیشہ اس مطالبہ کے سامنے سر جھکا دیتی ہے جس کی پشت پر کوئی انقلابی تحریک کام کر رہی ہے۔ پھر اگر ہندوستان اسوقت نو آبادیاتی آزادی پر قناعت کے لئے طیار ہے تو یہ یقیناً برطانیہ کے اس اندیشہ سے بہت کم ہے، جس کے لئے وہ اس سے بھی کچھ زیادہ دینے کے لئے طیار ہو سکتا تھا جو اسوقت دیا جا رہا ہے اور بالکل ممکن ہے کہ اس سودے میں ریاستیں بالکل ختم ہی ہو جائیں۔ بہر حال موجودہ حالات میں ریاستوں کو سمجھنا چاہئے کہ وفاقی حکومت میں جس نوع کی آزادی انھیں مل رہی ہے وہ نہ صرف یہ کہ غنیمت ہے بلکہ حالات کے اقتضا کو دیکھتے ہوئے بہت زیادہ ہے

اس سے قبل ریاستیں جس چیز کو خود مختاری سے تعبیر کیا کرتی تھیں وہ حکومت ہند کے محکمۂ سیاسیات کے نظر نیک سے زیادہ کچھ نہ تھی۔ نہ وہاں معاہدات کو کوئی پوچھتا تھا، نہ خدمات وفاداری کو۔ معاملہ۔ نہ بزور و نہ بہ زاری نہ بہ زری آید۔ کا تھا۔ وفاقی حکومت میں محکمۂ سیاسیات کی اس گرفت سے ریاستوں کو چھٹکارا مل رہا ہے اور براہ راست نمایندہ تاج سے تعلق پیدا ہو رہا ہے اور یہ اتنی بڑی نعمت ہے کہ ریاستوں کو اس پر وفاق کا ممنون ہونا چاہئے اور اگر بعض مسایل میں وفاقی حکومت کو ریاستوں کے اندر درخور حاصل ہو جائے تو بھی اس کو گوارا کر لینا چاہئے

کمپنی کے زمانہ میں ڈائرکٹروں اور پھر گورنر جنرلوں کی مرضی کے مطابق ریاستوں کی حالت بدلتی رہی، اس کے بعد بھی ملکی مطالبات و ضروریات کے لحاظ سے ولیسرائے نے اپنی پالیسی ریاستوں کے ساتھ جداگانہ مقرر کی، اس لئے اب کہ حکومت کی نوعیت ہی بالکل بدل رہی ہے، ریاستیں کیونکر یہ توقع کر سکتی ہیں کہ ان کے حالات میں کوئی تبدیلی نہ ہوگی۔ جدید حکومت اپنی ضروریات کے لحاظ سے مجبور ہے کہ وہ ایک آل انڈیا نظام حکومت اختیار کرے جس میں ریاستوں کی شرکت ضروری ہو پھر اب یہ ریاستوں کی مرضی ہے خواہ وہ خوشی سے ان شرایط کو منظور کر لیں جو یقیناً ان کے لئے کسی طرح مضرت رساں نہیں ہیں، یا جبر و اکراہ کے ساتھ۔ پہلی صورت میں برطانوی ہند کی ہمدردیاں حاصل کرنے کا امکان ہے اور دوسری صورت میں یہ بھی نہیں۔

"نگار" کے پرانے پرچے

نگار کے مندرجہ ذیل پرچے دفتر میں موجود ہیں جن کی دو دو تین تین کاپیاں دفتر میں رہ گئی ہیں جن اصحاب کو ضرورت ہو طلب کر لیں۔ قیمتیں وہی ہیں جو سامنے درج ہیں:۔

(سنہ ۲۲ء) ستمبر ۴؍۔ (سنہ ۲۶ء) جنوری، جون، نومبر ۵؍ فی پرچہ۔ (سنہ ۲۷ء) اپریل، مئی و جون ۴؍ فی پرچہ (سنہ ۲۹ء) دسمبر ۵؍۔ (سنہ ۳۰ء) مئی ۴؍۔ (سنہ ۳۱ء) جولائی تا دسمبر ۴؍ فی پرچہ۔ (سنہ ۳۲ء) فروری تا دسمبر (علاوہ اپریل) ۴؍ فی پرچہ۔ (سنہ ۳۳ء) فروری، جولائی و اکتوبر ۴؍ فی پرچہ۔ (سنہ ۳۴ء) مارچ ۴؍ (سنہ ۳۵ء) نومبر ۵؍ (سنہ ۳۶ء) فروری، مارچ، اپریل، جون، نومبر، دسمبر ۵؍ فی پرچہ۔ (سنہ ۳۸ء) مارچ، اپریل، مئی، جون، جولائی، اگست، اکتوبر، نومبر و دسمبر ۸؍ فی پرچہ۔

منیجر نگار لکھنؤ

اُردو ادب اور مقالہ نگاری[1]

اُردو نثر اگر اپنی پیدائش کے لئے نہیں تو اپنے ارتقاء اور نشو ونما کے لیے ضرور انگریزی ادب کی مرہون منت ہے گو محققین نے اب اُردو نثر کی بنیاد دکن میں چودھویں صدی عیسوی سے رکھی ہے اور ثبوت کے لئے دکن کی قدیم نثر کے نمونے پیش کئے جاتے ہیں اور اس سے پیشتر کی تحقیقات نے بتایا تھا کہ نثر کی ابتدا سنہ ۱۷۳۲ء سے شمالی ہند میں فضلی کے مقدر دہ مجلس سے ہوئی تھی لیکن حقیقتاً اُردو نثر کی صحیح پیدائش فورٹ ولیم کالج اور گلکرسٹ کے دم سے وابستہ ہے اور اسی ماحول کے زیر اثر میر امن نے وہ باغ لگایا اور وہ بہار دکھائی کہ جو اس کو دیکھیگا گویا باغ کی سیر کریگا بلکہ باغ کو آفت خزاں بھی ہے اور اس کو نہیں یہ ہمیشہ سرسبز رہیگا۔

اپنے بچپن کے ماحول سے نکلکر اُردو نثر مختلف ماحول اور مختلف فضاؤں میں پلتی بڑھتی رہی۔ لکھنؤ میں سرور کے ہاتھوں انتہا سے زیادہ مسجع و مقفی ہوئی۔ غالب نے اسکو سادہ و شوخ بنا دیا۔ سرشار کے یہاں اس کے حسن میں نکھار پیدا ہوا۔ سرسید، آزاد، حالی، نذیر، ذکاء اللہ، شبلی کی محبت بھری آغوش میں شباب کی سیڑھیوں پر چڑھنے لگی اور پھر سجاد، نیاز، پریم چند، حسن نظامی، ابوالکلام، عبدالحق، سروری، آزاد، چغتائی وغیرہ کی تیز نفسیوں اور گرم گرم صحبتوں نے تو اس کو سراپا شباب بنا دیا۔ پھر یہ سب کچھ ہوا۔ اس کی فضا اس کے ساز، اس کے نغمے سب ہندوستانی اور "اُردو" ہی کے رہتے پھر بھی ان نغمات کی لے انگریزی ادب کی "نشر کردہ تیز تیز" برقی شعاعوں سے برابر متاثر رہی۔ اسی لئے اُردو نے گو ان تاثرات کے ماتحت نثر کی کوئی صنف بغیر خامہ فرسائی کئے نہ چھوڑی، مگر وہ اصناف جن میں ادب مستقلاً طور پر قائم ہے، مقالہ نگاری۔ تاریخ۔ ڈرامہ اور تنقید ہی ہیں۔

ہمارے یہاں "مقالہ" کے مفہوم میں مختلف اقسام کے مضامین شامل کر لئے جاتے ہیں لیکن حقیقتاً وہ مضامین ان کو ہم مقالہ کے صحیح مفہوم میں کچھ کھینچ تان کر اور کسی حد تک ایمانداری کے ساتھ لاسکتے ہیں، زیادہ تر انگریزی مقالوں کے ترجمے ہیں۔ اور یہ جنبل مقالوں میں، چراغ علی، محسن الملک۔ حالی سرسید وغیرہ کے وہ مضامین شامل ہیں جو

---

[1] انگریزی لفظ (Essay) کا ترجمہ ہے۔

تہذیب الاخلاق' میں وقتاً فوقتاً چھپتے رہتے تھے (اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ تہذیب الاخلاق نے اس لحاظ سے اُردو کے لئے وہی کام کیا جو انگریزی کے لئے (Spectator & Tatler) نے ایک خاص وقت میں کیا تھا) نذیر احمد و سرسید کے لکچر بھی ایک مقالہ ہی کی حیثیت رکھتے ہیں اور آزاد۔ سرسید۔ حالی۔ نواب محسن الملک کے مختلف مذہبی، ادبی اور فلسفیانہ مضامین اور دلگداز۔ مخزن۔ ادیب۔ اُردو۔ نگار اور ہمایوں وغیرہ کے مختلف مضامین بھی اسی زمرہ میں شمار کئے جاسکتے ہیں

موجودہ دور میں عام رجحان صحافت۔ افسانہ اور تنقیدی مضامین کی طرف زیادہ ہے تنقیدی یا تاریخی مضامین لکھنے والوں کے موضوعات گوناگوں مسایل پر حاوی ہوتے ہیں مثلاً سائنس سینما۔ فلسفہ سیاسیات وغیرہ اور انھیں کو عام طور پر "مقالہ" سمجھا جاتا ہے

قبل اس کے کہ ہم اُردو کے ان مضامین پر تنقید کریں، دیکھنا چاہئے کہ دراصل مقالہ (Essay) کیا چیز ہے؟ انگریزی ادب میں، جہاں سے یہ چیز آئی ہے، اس کا رتبہ اور معیار کیا ہے؟ اور اس صنف میں شروع سے اب تک زمانہ کے ساتھ ساتھ کیا تغیرات ہوئے اور اس کا قدیم و جدید مفہوم کیا ہے؟

کہا جاتا ہے کہ انگریزی زبان میں غالباً بجز لفظ (Gentleman) کسی لفظ کا بھی اتنا ناموزوں اور لامحدود استعمال نہیں ہوا جتنا کہ لفظ (Essay) کا!! ایک مشہور فلاسفر کی کتاب کے لئے یہی لفظ استعمال کیا جاتا ہے اور ایک طالب علم کی مشقی تحریر کے لئے بھی یہی شاید صحیح ہے کہ دونوں جگہ یہ لفظ ایک "کوشش و فکر" کے مفہوم میں استعمال ہوتا ہے اور شاید اس کے لغوی معنی یہی بھی ہیں۔ لیکن حقیقتاً اس لفظ کو استعمال کرتے وقت یہ مفہوم ہمارے ذہن میں نہیں ہوتا (Essay) لکھنے کی قابلیت عمر کی پختگی کے ساتھ پیدا ہوتی ہے محض ادبی ذوق یا زبان پر قابو حاصل کرلینا کافی نہیں

مثال کے طور پر بیکن کو لیجئے، وہ انگریزی کے ابتدائی دور کے ادبی کمالات کا نمونہ مجسم تھا۔ ایک خاص طریقۂ اظہار خیال اور فلاسفی کا ناخدا تھا۔ لاجواب امثال استعمال کرتا تھا۔ سب کچھ تھا اور اب بھی ہے۔ مگر بحیثیت مقالہ نگار (Essayist) اب اس پر (Addison & Lamb) وغیرہ کو ترجیح دیجاتی ہے۔ آخر کیوں؟ گو اس کو فنی کمال حاصل تھا۔ دنیا کا تجربہ بھی تھا۔ فلسفیانہ دماغ بھی تھا مگر اس کے پاس وہ ذہنیت نہ تھی جو مقالہ نگاری کے لئے ضروری ہے

زندگی کی پیچیدگیوں اور رازوں کو سمجھنا اور اس کو ظاہر کرسکنا یہ ہے اصل میں معیار "مقالہ نگاری" کا اور یہ اہلیت بغیر پختگی عمر کے پیدا ہوسکتی ہے اور نہ اس میں اُستواری آتی ہے

مقالہ نگاری دراصل عمر، تجربہ، اور مشاہدہ کا نچوڑ ہے جو صرف انسانی عمر کے ہیجان انگیز حصے کے بعد ہی حاصل ہوتا۔

گو یہ صاف اور شفاف پانی کی طرح چمکتا ہے پھر بھی اس میں انسانی زندگی لہراتی رہتی ہے اس میں ایک خاص مہک ہوتی ہے، ایک خاص مزہ ہوتا ہے۔ اس کے پڑھنے سے سوئی ہوئی یا بھولی ہوئی باتیں یاد آجاتی ہیں اس کی خوشبو کی لپٹیں دل کو گرما دیتی ہیں ایک خاص دماغی کیف حاصل ہوتا ہے اور سوئے ہوئے خیالات بیدار ہو جاتے ہیں کسی نے سچ کہا ہے کہ مقالہ نگاری ایک سکون آمیز لطیف شے ہے لیکن قبل اس کے کہ کوئی انسان اس سکون آمیز شراب کو خود ڈھال کر کسی اور کو پلائے اس کے لئے ضروری ہے کہ اس کو پہلے خود حاصل کرے۔ دنیا میں بہت کم لوگ ایسے ہیں جو چالیس سال کی عمر سے قبل اس قسم کا سکون حاصل کر سکیں۔ بہت سے تو عمر بھر محروم رہتے ہیں مگر جو حاصل کر لیتا ہے اور دوسروں کو دے سکتا ہے وہی درحقیقت مقالہ نگار کہلاتا ہے

انسان کی عمر میں شباب کا ہیجان انگیز دور گذر جانے کے بعد وہ دور آتا ہے جب وہ کسی نظریہ کو پہلے سے اپنے دماغ میں قائم کر کے اس پر بحث و مناظرہ نہیں کرتا اور نہ کسی موضوع کو بغیر اچھی طرح سمجھے ہوئے اس پر گفتگو کرتا ہے بلکہ وہ اس ہنگامہ عالم میں بغیر اپنے پارٹ کا فکر کئے ہوئے ایک تماشہ دیکھنے والے کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔ اس کا سبب یہ نہیں کہ اس کا جوش زندگی کم ہو جاتا ہے بلکہ اب وہ زندگی کی ولولہ انگیزیوں کو سمجھنا چاہتا ہے اور اس طرح رفتہ رفتہ زندگی کے سربستہ راز اس پر افشا ہونے لگتے ہیں اور وہ صرف "خود" نہیں رہ جاتا بلکہ "دنیا" بن جاتا ہے "شخصیت" کے اس پھیلاؤ کی وجہ سے اس کے مزاج میں قوت برداشت حلم اور خطاپوشی کی صفت پیدا ہو جاتی ہے صبر و سکون کی ابدی مسرتیں اسکو حاصل ہو جاتی ہیں اور ہر چیز کے متعلق آزادانہ بات چیت کرنے کے لئے تیار ہوتا ہے

انگریزی ادب کے بہترین مضمون نگار مثلاً لیمب۔ ایڈیسن۔ کاؤلے اور موجودہ دور میں چسٹرٹن اور ماکس بربھیم وغیرہ سب کی زندگی پر یہ قول صادق آتا ہے

انگریزی ادب میں مقالہ نگاری کے ارتقا و ترقی پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوگا کہ مقالہ نگاری کا یہ مفہوم مختلف درمیانی منزلوں سے گزرنے کے بعد متعین ہوا ہے

طوالت کے خوف سے اس کو واضح کرنے کے لئے تمام تبدیلیاں نہیں دکھائی جا سکتیں۔ مگر پھر بھی اتنا کہے بغیر کام نہیں چلیگا کہ پندرھویں صدی کے اختتام اور سولھویں صدی کے آغاز میں بیکن اگرچہ (Essay) کو (Montaigne) کے نمونہ پر لانا چاہتا تھا مگر پھر بھی اس کے زمانہ میں (Essay) کو "تصویر پریشاں" (Dispersed Meditation) کہا جاتا تھا۔ بیکن اور اس کے متبعین نے زیادہ تر خارجی انداز بیان اختیار کیا ہے جسے (Impersonal note) کہتے ہیں

سترھویں صدی میں (Sir Thomas Brown) نے مضمون میں نفس مضمون پر کم اور اسٹائل پر زیادہ [illegible] دیا اور اس صدی کے اختتام پر (Cowley) نے داخلی انداز بیان (Personal note) پیدا کر دیا اور

ر رائیڈن نے تنقید بھی شروع کردی

اٹھارھویں صدی میں ایڈیسن اور اسٹیل نے مضمون میں داخلی پہلو پیدا کر دیا۔ مگر طرزِ تحریر اور موضوع میں
تبدیلی آگئی۔ معاشرتی مسائل بھی ان میں شامل کئے گئے اور طنز یہ انداز بھی۔ گولڈ اسمتھ نے سوانح اور تنقید کو ملا دیا۔
اسی زمانہ میں ہیوم نے مضامین میں سنجیدگی۔ خیال آفرینی پیدا کردی

میکالے نے مقامین میں تاریخ تنقید اور سوانح تینوں کو ملا دیا۔ کارلائل نے "شخصیت نوازی" شروع کردی۔
انیسویں صدی میں (Lockhart, Leigh Hunt, De Quincey) نے مضامین
ٹھوس اور عالمانہ بنا دیا لیکن اس زمانہ کے شعراء نے جو مضمون نگار بھی تھے۔ اس کو کلاسزم اور شکل پسندی کے
بود سے آزاد کر دیا خصوصاً (Lamb) نے داخلی اور ذاتی انداز بیان کو بہت نمایاں کر دیا اور اپنی تحریروں
ں باوجود اپنی بیزاری بہن کی پرورش اور مصیبت زدہ زندگی کے اپنی ذاتی خوبیوں کے وہ مرقعے اپنے مضامین میں پیش کیے
لئے جن کا جواب آج تک انگریزی ادب پیش نہ کر سکا۔ چنانچہ اسی وقت سے کہا جاتا ہے کہ "the style is the man" ...
... وغیرہ نے لیمب کی اس سادگی، صفائی، فطرت شناسی اور اپنے ذاتی تاثرات سے کام لینے کے طریقہ کو قائم رکھا

انیسویں صدی کے اختتام سے اب تک اس قسم کے مضامین کو بڑی ہر دلعزیزی حاصل ہوئی اور لاتعداد مقالہ نگار
پیدا ہوئے۔ موجودہ زمانہ میں (Belloc, Max Beerbohm, Chesterton, Lucas) اور
(E. V. Lucas) سب سے زیادہ مشہور ہیں

موجودہ دور میں خاص طور پر (Personal Essay) کا دور دورہ ہے (Impersonal essay)
صرف ناپسند ہی نہیں کیا جاتا بلکہ لوگ اس کو اب (Essay) کہنا بھی گوارا نہیں کرتے (Impersonal essay
یا سے ہے) "ایک خوبصورت پیرائے میں مفہوم کو ایک مقررہ قانون، قاعدہ اور منطق کے ساتھ وسعت دینا اور اپنے آپ کو
پس پشت ڈال دینا تاکہ ذاتی تاثرات و جذبات اس میں شامل نہ ہو سکیں

(Personal essay) اس کے بالکل متضاد ہے۔ اسی میں مضمون نگار مضمون کا تابع نہیں ہوتا بلکہ
اس کو اپنا تابع رکھتا ہے وہ اس کو جس طرح چاہتا ہے پیش کر دیتا ہے۔ وہ اپنے موضوع کے ساتھ کھیلتا ہے اور اس میں
سے جتنا چاہتا ہے منتخب کر کے اپنے کیفیات و احساسات کے مطابق پیش کر دیتا ہے"

اس قسم کے مقالہ نگاروں کا مقصد اپنے مقالہ کو نہیں بلکہ اپنی ذات کو نمایاں کرنا ہوتا ہے۔ اس کی مثال یوں سمجھئے کہ
جب کوئی ہمارا محبوب ہم سے گفتگو کرتا ہے تو ہم اس کی باتیں موضوع کے لحاظ سے نہیں سنتے بلکہ اس لئے کہ وہ ہمارا عزیز
ہے اور ہم کو اس کی ذات سے وابستگی ہے۔ ممکن ہے کہ ہم اس کی رائے سے موافقت نہ کریں لیکن ہمیں اس کی آواز۔ اسکے
خیال اور محسوسات کے علم سے ایک خاص لطف حاصل ہوتا ہے

اسی لئے مقالہ نگار کا کام یہ ہے کہ جو کچھ کہے اچھوتے پیرایہ میں اور نئے انداز سے کہے۔ ہماری توجہ کو ہماری زندگی اور دنیا کی ان باتوں کی طرف مبذول کرے، جن کو ہم کسی وجہ سے نظرانداز کر چکے ہیں۔ زندگی کے معمولی معمولی واقعات میں اثر اور سوز و گداز پیدا کرے اور ہم کو بتائے کہ زندگی کی چھوٹی چھوٹی باتیں بھی اپنے اندر خاص لطف رکھتی ہیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ ممکن نہیں جب تک مقالہ نگار کو خود ان سب چیزوں سے پوری واقفیت اور دلچسپی نہ ہو اس کے لئے اس کی قوتِ مشاہدہ و احساس کو بہت تیز ہونا چاہئے۔ دنیا کی ہر شے میں اسکی نگاہوں کو ایک خاص کیف۔ دلچسپی اور حسن کی تلاش ہونی چاہئے اور جہاں یہ ملے اس سے پوری طرح متاثر ہونا چاہئے، اپنے تاثر کو خیالات میں تبدیل کرنا چاہئے اور پھر ان کو الفاظ میں، الغرض مقالہ نگاری کے لئے قوتِ احساس اور غور و فکر بہت ضروری ہے۔ آج کل دنیا کے بڑے بڑے مقالہ نگار ایسے موضوع لیتے ہیں جو بظاہر نہایت حقیر، معمولی۔ بھدے اور مضحکہ انگیز معلوم ہوتے ہیں۔ مگر وہ اپنے دماغ و قلم کی سحرکاری سے زور، تاثیر، مزاح اور سوز و گداز کا ایک ایسا خوشنما جال پھیلا دیتے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے یہی کمال ہے (Personal essay) کا!!

اس معیار کو حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ:۔

(۱) اس میں تصنع و آورد کی جھلک نہ آنے پائے۔ نہ صرف اسٹائیل سادہ اور نیچرل بلکہ دماغی کیفیت بھی پرسکون اور خاموش ہونا چاہئے۔ (۲) اس میں کسی چیز کے لئے کاوش، کا شائبہ نہ آنے پائے نہ زیادہ جوش ہو نہ زیادہ غم و یاس اور نہ زیادہ جستجو۔ (۳) ہلکی ہلکی شوخی و مزاح نگاری بھی ہو اور انسانی ہمدردی کی جھلک بھی۔ (۴) دنیا کو مکمل طور پر سمجھنے کے لئے مقالہ نگار کو یاد رکھنا چاہئے کہ دنیا میں غم و نشاط۔ اشک و تبسم۔ قنوطیت و رجائیت دونوں لازم و ملزوم ہیں مقالہ نگار کا کام اصلاح یا دنیا کی از سرِ نو تعمیر کرنا نہیں، اس کا کام دنیا کی موجودہ حالت کا جائزہ لینا اور ہر بات سے متاثر ہونا ہے

اس اُصول کو سامنے رکھ کر اگر ہم اُردو کے مقالوں کو دیکھیں تو ہم کو کہنا پڑے گا کہ ایسے مقالے ہمارے یہاں اگر مفقود نہیں تو کم ضرور ہیں۔ تہذیب الاخلاق اور اس کے مقالہ نگاروں کا مدعا زیادہ تر قوم کی گری ہوئی مذہبی، تمدنی اور سیاسی حالت کو سنبھالنا تھا۔ ان کی ہر کوشش مسلمانوں کی بیداری کے لئے ہوتی تھی۔ ایسے مضامین زیادہ ہوتے تھے جن سے پُرانی باتوں اور قیود سے آزادی کا سبق پڑھانا مقصود ہوتا تھا اور ہم دیکھ چکے ہیں کہ مقالہ نگار کا مقصد اصلاح نہیں ہونا چاہئے اس میں کسی قسم کا پروپیگنڈا یا جوش یا مطلب براری کے لئے جدوجہد نہیں ہونا چاہئے۔ اس میں ہلکا سا مزاح۔ سکون، سادگی، اور بے لوث تنقیدِ زندگی ہونی چاہئے۔ کیا ان لوگوں کے مضامین میں یہ سب باتیں تھیں ؟ شاید نہیں

موجودہ زمانہ میں لوگ افسانہ، تنقیدی مضامین اور صحافت کی طرف زیادہ مائل ہیں، مقالہ نگاری کی طرف سے سب غافل ہیں۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ ہمارے ادیب عام طور پر مقالہ نگاری کے صحیح مفہوم سے ناآشنا ہیں تو غالباً بیجا نہ ہوگا۔

شریف (بی۔ اے)

سیاسیات یورپ

(۶)

اسپین کی خانہ جنگی

۱۸ جولائی ۳۶ء کو اسپین میں خانہ جنگی کا آغاز ہوا اور صورت یہ ہوئی کہ بعض فوجی افسران نے جو وہاں کی جمہوری حکومت کے خلاف اور فاسستی خیال کے موافق تھے، بغاوت کردی اور دفعتاً سارے جزیرہ نمائے اسپین میں یہ آگ بھڑک اٹھی۔ جرمنی اور اٹلی نے باغی فوج کی مدد کی اور روس نے حکومت اسپین کی (لیکن کچھ دنوں بعد اور وہ بھی بہت کم)

اس جنگ میں خونریزی کے جو مناظر دیکھنے میں آئے ان کی مثال دورِ حاضر کی کسی جنگ میں اس وقت تک نظر نہیں آئی۔ یوں سمجھئے کہ پہلے ہی سال دس لاکھ آدمی جان سے مارے گئے اور متعدد شہر خاک سیاہ کردئے گئے۔ چونکہ جرمنی اور اٹلی کھلم کھلا مداخلت کر رہے تھے اور بحر روم میں باغی فوج کی آبدوز کشتیاں بے تعلق حکومتوں کے تجارتی جہازوں کو بھی تباہ کرنے سے باز نہ آتی تھیں، اس لئے عالمگیر جنگ کا خطرہ سامنے تھا اور سارا یورپ نہایت تشویشناک انداز سے ان تمام حالات کا مطالعہ کر رہا تھا

جس اختلاف نے اس جنگ کو رونما کیا اس کے عناصر متعدد تھے۔ یہ جنگ گویا لڑائی ہے غریبوں کی امراء کے ساتھ مزدوروں کی فوجوں کے ساتھ، کسانوں کی زمینداروں کے ساتھ اور جمہوریت کی فاسسزم کے ساتھ۔ جنرل فرانکو کے طرفداروں میں ہم کو افسران، جاگیرداران، شاہ پسند جماعت، سرمایہ دار اور فاسسٹ نظر آتے ہیں اور ان کی عسکری قوت مشتمل ہے جرمن، اطالوی اور ریاست ہائے مراکش کے سپاہیوں پر۔ حکومت کے طرفداروں میں جمہوریت پسند، سوشلسٹ، کمیونسٹ انارکسٹ اور تمام طبقۂ متوسط شامل ہے اور اس کی فوج میں سوائے عوام کے اور کوئی نہیں ہے۔ یہ جنگ گویا حکومت اسپین کے دست راست و دست چپ کی لڑائی ہے۔ جس میں دست راست والی جماعت جنرل فرانکو کی ہے اور دست چپ والی عوام کی

اسپین اپنی شخصی حکومت کے دوران میں حد درجہ پست حالت میں تھا (بالکل ویسا ہی جیسے روس زار کے زمانہ میں) اور یورپ بھر میں پرتگال چھوڑ کر جہل کا اوسط (۴۵ فی صدی) سب سے زیادہ یہیں تھا۔ بیسویں صدی میں یہاں کی ملوکیت

الفانسو سیز دہم کے ہاتھ میں تھی جس کی تین جماعتیں طرفدار تھیں، ایک طبقہ امراء کا، دوسرا فوج کا، تیسرا اہل کلیسا کا۔ اسپین کی آبادی ۲/۳ فی صدی زراعت پیشہ ہے، لیکن ان میں شاید چند ہزار ہی کاشتکاروں کے پاس کچھ زمین ہو تو ہو، ورنہ سب زمینداروں کے قبضہ میں تھی، چنانچہ نواب آلبا المجیہ کے بارہ حصہ زمین کا مالک تھا۔ پھر ان زمینداروں کی حالت یہ تھی کہ وہ کاشتکاروں سے لگان تو ایک ایک کوڑی وصول کر لیتے تھے، لیکن زمین کی ترقی پر ایک پیسہ صرف نہ کرتے تھے، اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سی قابل کاشت زمین چراگاہ میں تبدیل ہو گئی اور زمین صرف یک فصلی ہو کر رہ گیا

اب اسی کے ساتھ اس کے فوجی مصارف کو دیکھئے۔ یہ کہنا غالباً غلط نہ ہوگا کہ الفانسو کے زمانہ میں اسپین پر جتنا بار فوج کا تھا، دنیا کے کسی ملک پر نہیں تھا۔ ۷۵ ہزار تو صرف سپاہیوں کی تعداد تھی اور ۱۲ ہزار افسران کی (حالانکہ ۱۹۱۴ء میں جب جرمنی نے جنگ شروع کی ہے اس کی فوج میں بھی ۱۰ ہزار افسر تھے) فوج کو اقطاعی حقوق حاصل تھے اور فوجی عدالتوں ہی میں ملکی معاملات کا فیصلہ ہوتا تھا۔ یہ تھا ناقابل برداشت بوجھ اسپین کی فوج کا جس نے ۱۸۹۶ء کے بعد سے اسوقت تک کوئی کارنمایاں انجام نہ دیا تھا

اب اہل کلیسا کی قوت کو دیکھئے۔ وہاں ۸۰ ہزار پادری تھے جن میں سے ہر ایک کی معقول تنخواہ مقرر تھی۔ یہ سب امراء اور افسرانِ فوج سے ملے ہوئے تھے اور وہاں کی تجارت اور کاروبار پر چھائے ہوئے تھے۔ سیاسی معاملات میں بھی ان کا اثر بڑا زبردست تھا اور مکاری، دسیسہ کاری اور اخلاقی انحطاط کی نہایت شرمناک صورتیں اس جماعت کی وجہ سے ملک بھر میں پیدا ہو گئی تھیں۔ آخر کار ۱۹۳۱ء میں اسپین کی ملوکیت خود اپنے بوجھ سے دبکر فنا ہو گئی اور وہ خاندان جو پانچ صدی سے یہاں حکمراں چلا آرہا تھا ہمیشہ کے لئے معزول کر دیا گیا۔ دنیا کی تاریخ میں صرف اسپین ہی کا یہ انقلاب ایسا انقلاب تھا جس میں ایک قطرۂ خون کسی کا ضایع نہ ہوا اور چشم زدن میں بساط ملوکیت اُلٹ کر رکھدی گئی

زوالِ ملوکیت کے بعد اسپین میں جمہوریت قایم ہوئی، جو اوسط طبقہ کے اہل علم پر مشتمل تھی یعنی اب سیاست اہل کلیسا یا فوجی افسران کے ہاتھ میں نہ تھی، بلکہ مصنفوں، انشاپردازوں، ڈاکٹروں اور پروفیسروں کے ہاتھ میں تھی۔ انھوں نے جس جدید کانسٹی ٹیوشن کو مرتب کیا اس کا نصب العین یہ تھا کہ حکومت کو کلیسا سے علحدہ کر لیا جائے، ابتدائی تعلیم لازم کر دی جائے عورتوں کو رائے دینے کا حق دیا جائے اور مزدوروں اور کاشتکاروں کی اصلاح کی طرف توجہ کی جائے اور ہر شخص کو نہایت آزادی سے نکتہ چینی کا موقعہ دیا جائے، لیکن چونکہ ان لوگوں کو نظم و نسق کا تجربہ نہ تھا اور عملی سیاست سے بیگانہ تھے، اسلئے نظریوں کے لحاظ سے تو سب کچھ ہوا لیکن عملاً بہت کم۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ امراء، اہل کلیسا اور افسران فوج، مخالفین جمہوریت کا استیصال نہ ہو سکا اور ان کی قوت باقی رہی

۱۹۳۲ء میں جنرل سنجر جو نے امراء کی سفارش سے جمہوریت کے خلاف بغاوت کی اور جب یہ بغاوت دبا دی گئی تو حکومت نے تمام امراء کی جایدادیں ضبط کرنے کا حکم صادر کیا، لیکن یہ حکم کاغذ ہی تک محدود رہا اور اس کی تعمیل نہ ہو سکی۔

اہلِ کلیسہ کے قبضہ میں اس وقت دس کروڑ پونڈ قیمت کی جایداد تھی اور یہ سب جایداد ضبط بھی کرلی گئی لیکن قبضہ بدستور اہل کلیسہ کا رہا۔ فوجی اصلاح کے سلسلہ میں بجز اس کے کہ دس ہزار افسروں کو پنشن دیدی گئی اور کچھ نہ کیا گیا۔ یہ زمانہ وہ تھا جب ازانہ برسراقتدار تھا۔ ۳۳ء میں یہ اپنے عہدے سے علٰحدہ کر دیا گیا اور اس طرح دست چپ کی جمہوریت ڈھائی سال کے بعد ختم ہوگئی اور دستِ راست کی جماعتیں برسرِ اقتدار ہوگئیں۔ یہ بھی جمہوریت کے موافق تھیں لیکن صرف نظریوں کی حد تک اور سوشلسٹ کی مخالف۔ اکتوبر ۳۴ء میں سوشلسٹ جماعت نے بغاوت کردی اور شدید خونریزی کے بعد تقریبًا ۳۰ ہزار سوشلسٹ جیل بھیجدئے گئے

دست راست کی حکومت کو جب تین سال ہوچکے انتخاب کا زمانہ آیا، لیکن چونکہ لوگوں کے دلوں سے دست چپ کی حکومت کی یاد محو نہ ہوئی جو ۳۱ء سے لیکر ۳۳ء تک برسراقتدار رہی تھی، اس لئے کثرت رائے سے پھر دستِ چپ کی حکومت کو اقتدار حاصل ہوگیا۔ یہ واقعہ فروری ۳۶ء کا ہے۔ لیکن چھ مہینے کے بعد ہی جولائی ۳۶ء میں جنرل فرانکو نے بغاوت کردی اور وہ خانہ جنگی شروع ہوگئی جس کی نظیر تاریخ یورپ میں نہیں ملتی

جیسا کہ ابھی ہم نے ظاہر کیا ہے کثرت رائے سے دستِ چپ کی جماعتیں برسرِ اقتدار ضرور ہوگئی تھیں، لیکن ملک میں امن و سکون مفقود تھا، چنانچہ ۴ ماہ کے اندر سیکڑوں سیاسی افراد قتل ہوگئے اور اس میں شک نہیں کہ فاسسٹ جماعت نے بدامنی پیدا کرنے میں زیادہ حصہ لیا۔ اتفاق سے اسی زمانہ میں دست چپ کا ایک فوجی افسر مارا گیا اور ادھر سے جواب میں دستِ راست کے ایک لیڈر کو قتل کر دیا گیا اس قتل کا ہونا تھا کہ دفعتًا آگ بھڑک اُٹھی اور ۱۸ جولائی کو فوجوں نے بغاوت کردی۔ جنرل فرانکو جو اسوقت جزایر کناری کا گورنر تھا فورًا مراکش پہونچا اور اطالیہ کے ہوائی جہازوں کے ذریعہ سے وہاں سے عربوں کی فوج لے آیا جو چاروں طرف اسپین پر چھا گئی۔ ہم اس جگہ جنگ کے واقعات سے بحث کرنا نہیں چاہتے کیونکہ انکا علم سب کو ہے، لیکن یورپ کے دیگر ممالک نے اس جنگ کو کس نگاہ سے دیکھا اس کا بیان ضروری ہے ۔ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ اطالیہ اور جرمنی کا ہاتھ اس جنگ میں شامل ہے اور یہ خیال بالکل درست ہے، جنگ سے پہلے ہی اطالیہ کے متعدد ہوائی جہاز مراکش پہونچ گئے اور جب جنگ شروع ہوئی تو اسو ہوائی جہاز اور روانہ ہوئے ۔ اس کے دوسرے مہینے جرمن طیارے، جرمن آبدوز اور جرمن تباہ کن کشتیاں سب جنرل فرانکو کی مدد کو پہونچ گئے اور رفتہ رفتہ ان دونوں ملکوں نے سامان حرب، طیارہ شکن توپوں اور فوجوں سے کھلم کھلا فرانکو کی مدد شروع کردی۔

جنرل فرانکو اس مدد کے قبول کرنے پر اس لئے مجبور تھا کہ اسپین کی آبادی سے وہ کوئی سپاہی بھرتی نہ کرسکتا تھا اور اطالیہ و جرمنی اس لئے مدد کر رہے تھے کہ جنرل فرانکو کی کامیابی فاسسٹ جماعت کی کامیابی تھی گویا یہ جنگ فاسزم اور اشتراکیت کی جنگ تھی ۔ علاوہ اس کے اطالیہ اور جرمنی یوں بھی عرصہ سے اسپین میں اپنے اثرات قایم کرنے کی فکر میں تھے تاکہ یہاں کی معدنیات و پیداوار سے فایدہ اُٹھایا جاسکے، چنانچہ آغاز جنگ سے ۶ ماہ قبل ہی تانبہ اور لوہا بکثرت جرمنی بھیجا جا رہا تھا تاکہ وہ وقت پر مدد دے۔ اطالیہ اور جرمنی نے جنرل فرانکو کی جتنی مدد کی اس کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ تقریبًا دس ہزار جرمن ماہرین فن اور

ستر ہزار اطالوی سپاہی ۳۸ء میں جنرل فرانکو کے شریک کار تھے۔ روس اور فرانس، حالات کو دیکھ کر جل رہے تھے لیکن وہ کچھ کر نہ سکے روس نے کچھ ہوائی جہاز حکومت اسپین کی مدد کیلئے ضرور روانہ کئے لیکن وہ زیادہ مفید ثابت نہ ہوئے، فرانس اتنا بھی نہ کر سکا۔ بین الاقوامی قانون یہ ہے کہ اگر کسی ملک میں بغاوت ہو جائے تو حکومت بغاوت فرو کرنے کے لئے آزادی سے اسلحہ و سامانِ حرب خرید سکتی ہے، لیکن حکومت اسپین اس قانون سے فائدہ نہ اٹھا سکی۔ اس کا ایک سبب تو یہ تھا کہ جنرل فرانکو نے ناکہ بندی کر رکھی تھی اور دوسرا یہ کہ دول یورپ نے "عدم مداخلت" کا معاہدہ کر لیا اور حکومت بیرونی امداد سے بالکل محروم ہو گئی۔ پھر اس عدم مداخلت کا اثر جنرل فرانکو پر بھی پڑتا رہا ہے لیکن اول تو جرمنی و اطالیہ اس معاہدہ سے قبل ہی کافی مدد کر چکے تھے، دوسرے انھوں نے اس معاہدہ کی کوئی پرواہ نہیں کی اور بعد کو بھی امداد کا سلسلہ جاری رکھا۔ عدم مداخلت کی تحریک فرانس اور برطانیہ نے ملکر تجویز کی تھی تاکہ لڑائی جلد ختم ہو جائے، لیکن اس تجویز نے سات مہینے گفت و شنود میں لے لئے کیونکہ جرمنی، اطالیہ اور پرتگال اسکے مخالف تھے، آخر کار اپریل میں جا کر مشکل سے بین الاقوامی بحری ناکہ بندی کی تجویز پر ۲۷ ملکوں نے دستخط کئے۔ فرانس کبھی فرانکو کی کامیابی کو پسند نہیں کر سکتا کیونکہ اسپین میں فاسسٹی جماعت کی کامیابی کے معنے یہ ہیں کہ اگر کبھی اطالیہ یا جرمنی سے اس کی لڑائی ہو تو اسے ایک تیسرا محاذ قائم کرنا پڑے، علاوہ اس کے فرانس یہ بھی سمجھتا ہے کہ اگر اسپین میں نازی یا فاسسٹی حکومت قائم ہو گئی تو اسکے مقبوضات افریقہ خطرہ میں پڑ جائیں گے اور وہاں کی فوجوں کو وہ آسانی سے فرانس نہ لا سکے گا۔ جنرل فرانکو کی کامیابی سے فرانس کی طرح انگریزوں کو بھی خطرہ ہے کیونکہ اس طرح بحرِ روم میں فاسسٹی اقتدار بڑھ جائے گا اور ان کے استحکامات جبرالٹر ضعیف ہو جائیں گے، لیکن ساتھ ہی ساتھ چونکہ وہ یہ بھی پسند نہیں کرتے کہ اسپین میں اشتراکیت یا بالشویت قائم ہو کر سرمایہ داری کو نقصان پہنچے اس لئے وہ یہ بھی چاہتے ہیں کہ جنرل فرانکو جیت جائے تو اچھا ہے۔ برطانیہ کی یہی دو رخی پالیسی تھی جس کی وجہ سے "عدم مداخلت" کی تجویز کو اس نے عرصہ تک جھلائے رکھا اور اب بھی جرمنی و اطالیہ کی زیادتیوں اور گستاخیوں کو برابر برداشت کرتا چلا آ رہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ عالمگیر جنگ کے خیال سے برطانیہ بہت گھبراتا ہے اور سمجھتا ہے کہ اگر وہ الجھ گیا تو پھر سوال صرف بحرِ روم کی حفاظت و اقتدار کا نہ ہوگا، بلکہ بحرِ ہند کا بھی ہوگا اور ہو سکتا ہے کہ کوئی زبردست انقلاب خود اندرونِ ملک بھی ایسا رونما ہو جو اس کو نہ مغرب کا رکھے نہ مشرق کا۔ اطالیہ اور جرمنی سواحل اسپین پر برطانیہ کی جتنی توہین کر رہے ہیں کسی سے مخفی نہیں، جہاز پر جہاز ان کے ڈبوتے چلے جا رہے ہیں، لیکن دنیا کی اس سب سے بڑی طاقت کے سر پر جوں تک نہیں رینگتی، اس کا سبب یہ نہیں ہے کہ وہ کمزور ہے یا دشمن کا جواب ترکی بہ ترکی نہیں دے سکتا، بلکہ صرف یہ کہ اس آغاز کا انجام اسے بہت تاریک نظر آتا ہے

مسٹر چیمبرلین وزیر اعظم برطانیہ کی اس نرم پالیسی کے خلاف سخت نکتہ چینیاں ہو رہی ہیں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ موجودہ حالات میں اس کی یہی پالیسی انگلستان کو اس طوفان سے محفوظ رکھ سکتی ہے جو روم اور برلن سے گزر کر اسوقت تمام وسط یورپ کے پہاڑوں سے ٹکرا رہا ہے۔

مولانا نسبتی واسطی تھانیسری

(۱)

ادب فارسی کے ایک گم شدہ مقدس صحیفہ کی بازیافت

پیش لفظ | جس طرح اکثر اہم و مفید معلومات اتفاقاً حاصل ہو جاتی ہیں، اسی طرح کلام نسبتی کی بازیافت بھی محض اتفاقی امر ہے۔ میں لکھنؤ کے کتب خانہ مولوی صاحب کی فہرست مخطوطات مرتب کر رہا تھا کہ یہ نایاب کلیات میرے ہاتھ لگا۔ جس وقت میں نے اس کو دیکھا تو نسبتی کا نام پڑھ کر میں سوچنے لگا کہ یہ عجیب شاعرانہ تخلص کس کا ہے۔ میں نے اپنے دماغ پر زور دیا، شعرالعجم، میخانۂ عبدالنبی قزوینی، خندانِ پارس، نگارستان پارس اور تذکرۃ الشعراء دولت شاہ سمرقندی ایک ایک کو دیکھا لیکن نسبتی کا نام کہیں نظر نہ آیا، میں نے سوچا کہ خود کلیات سے پتہ چلانا چاہئے۔ اسوقت اس کام کے لئے میرے پاس پندرہ بیس منٹ تھے اس مختصر سے عرصہ میں خود نسبتی کے متعلق تو خیر کیا معلوم ہو سکتا تھا لیکن اشعار نے جو اثر دل پر پیدا کیا اسے کبھی نہیں بھول سکتا

اس کے بعد ایک مضمون لکھنے کے سلسلہ میں کلیات سودا دیکھ رہا تھا کہ رسالہ عبرۃ الغافلین کی تمہید میں فیضی، غنی، نسبتی، ناصر علی، بیدل، خان آرزو اور میر شمس الدین فقیر کے اسمائے گرامی نظر آئے۔ مرزا رفیع نے انھیں فارسی گو ہندی شعراء لکھا تھا۔ اتنا معلوم ہو جانے کے بعد میں نے مناسب سمجھا کہ مولانا نیاز کی خدمت میں عریضہ لکھوں۔ جب آپ سے عرض کی تو آپ نے جواب میں فرمایا کہ مجموعۂ استفسارات و جوابات جلد اول دیکھئے۔ خوشی خوشی مجموعہ لیا۔ اس میں تذکرہ روز روشن کی مدد سے نسبتی کے مختصر سوانح حیات درج تھے۔ ساتھ ہی یہ بھی تحریر تھا کہ "کلام نسبتی" اب نایاب ہے۔ یہ پڑھ کر اور اپنے پاس کلیاتِ نسبتی دیکھ کر میں پھولا نہ سمایا اور اس خیال سے کہ اس کی اشاعت کر سکوں۔ الٰہ آباد گیا، وہاں کے عمائد علم و ادب سے ملا۔ کلام نسبتی دکھایا مگر کامیابی نہ ہوئی، ہر مطابع نے کہا کہ "اب ایسی چیزوں کی مانگ نہیں" اور علماء نے کہا کہ فارسی پڑھنے والے ہندوستان میں ہیں کتنے؟ آخر کار جب اشاعت کا کوئی بندوبست نہ ہو سکا تو مایوس ہو کر میں نے نگار و نیاز کے دامن میں پناہ لی۔ اس بات کا ظاہر نہ کرنا کفرانِ نعمت ہوگا کہ اس زمانہ میں جب کہ فارسی زبان دم توڑتی نظر آتی ہے۔ اگر فارسی ادب و شعر کا ملجا و ماوا کوئی ہے تو وہ صرف نگار اور نیاز کی ذات ستودہ صفات ہے۔ ان کی ذرہ نوازی نے مجھے اس قابل بنایا ہے کہ نسبتی کو ناظرین نگار سے روشناس کرانے کی جرأت کرتا ہوں۔

نام و نسب

نام دارد گرچہ در گم گشتگی عنقا و لے
ننگ دارم ز شہرت و ہیچ نام من کجا
(نسبتی)

تذکرہ لکھنے کا رواج بہت قدیم ہے لیکن ان تذکروں کا عام انداز یہ ہوتا ہے کہ شاعر کے سوانح حیات کے متعلق چند معمولی باتیں بیان کر دی جاتی ہیں اور پھر انتخاب اشعار دے دیا جاتا ہے۔ ورق پر ورق الٹتے چلے جائیے تاریخی اہمیت رکھنے والی ایک بات بھی نظر نہ آئے گی۔ درحقیقت ان کتابوں کے لکھنے کا مقصود کسی شاعر کے سوانح حیات قلمبند کرنا نہ ہوتا تھا۔ بلکہ تذکرہ کے پردہ میں خود اپنی انشاپردازی کا کمال دکھایا جاتا تھا۔ مصنف کس پایہ کا نثر نویس ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عام تذکروں میں شعراء کے اشعار زیادہ اور حالات زندگی بہت کم ملتے ہیں اگر کوئی بات زندگی کی ہے تو اس کی حیثیت اتفاقی یا ثانوی ہوتی ہے حقیقی نہیں

مولانا نسبتی کا ذکر۔ عمل صالح مصنفہ محمد صالح کنبوہ۔ کلمات الشعراء افضل سرخوش۔ مجمع النفائس خان آرزو۔ مخزن الغرائب احمد علی سندیلوی۔ شمع انجمن نواب صدیق حسن خان بھوپال۔ سفینۂ بے خبر میر عظمت اللہ بے خبر بلگرامی۔ گل رعنا شفیق اورنگ آبادی اور روز روشن مظفر حسین صبا میں ملتا ہے۔ تذکرہ روز روشن اور کسی میں ان کا نام درج نہیں سب نے تخلص پر اکتفا کیا ہے

روز روشن میں جو ۱۲۹۷ھ کی تصنیف ہے یوں مرقوم ہے:-

نسبتی ۔ شاہ محمد صالح متوطن قصبہ تھانیسر از سادات عالی درجات ۔ ۔ ۔ بود ۔ در عہد جہانگیر بادشاہ از بطون بظہور رسیدہ

شاہ محمد صالح نسبتی تھانیسر کے رہنے والے عالی مقام سید تھے آپ جہانگیر بادشاہ کے زمانہ میں کتم عدم سے عالم وجود میں آئے

مگر معلوم نہیں صبا کی تحقیقات کی بنیاد کیا ہے۔ کیونکہ ماخذ کا ذکر نہیں کیا گیا ہے۔ اوپر جن کتابوں کا ذکر کیا جا چکا ہے وہ سب روز روشن سے پہلے کی تصانیف ہیں اور اپنی قدامت کے لحاظ سے روز روشن پر فوقیت رکھتی ہیں خان آرزو نے اپنے تذکرہ میں نسبتی کے حالات ان کے بھتیجے عزت سے دریافت کرکے درج کئے تھے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:-

برادر زادہ او عزت نامی کہ با فقیر آشنا بود می گفت مولانا از سادات است پدرش از ولایت آمدہ در قصبۂ مذکور (تھانیسر) تمدن اختیار نمود

مجھ سے ان کے بھتیجے عزت نے جو میرا دوست تھا۔ وہ کہتا تھا۔ مولانا سید ہیں۔ ان کے والد نے ولایت سے آکر تھانیسر میں بودوباش اختیار کی

محمد صالح کنبوہ نے (۱۰۶۲ھ مطابق ۱۶۵۱ء میں) خود نسبتی سے ملاقات کی۔ سرخوش آرزو کا معاصر تھا اور اس کا تذکرہ کلمات الشعرا مجمع النفائس سے قدیم ہے۔ یہ سب لوگ نسبتی کے نام کے متعلق خاموش ہیں۔ بہرحال صبا نے ان کا نام محمد صالح لکھا ہے

وطن | خان آرزو کے بیان کے مطابق نسبتی کے والد ایران سے آئے۔ اور نسبتی تھانیسر میں پیدا ہوئے یہیں پلے پھولے

پروان چڑھے اور سپرد خاک ہوئے

مجمع الغرائب ۔ گل رعنا ۔ سفینۂ بے خبر ۔ شمع انجمن ۔ کلمات الشعرا ۔ عمل صالح اور روز روشن میں انھیں تھانیسری لکھا ہے ۔ مرزا سودا بھی انھیں ہندی نژاد کہتے ہیں ۔ مگر خود نسبتی کو اس سے انکار ہے، فرماتے ہیں :-

دُر از دریا بر آمد ۔ لعل از کاں
ز واسط نسبتی ۔ طالب ز آمل
اگرچہ نسبتی، از واسطم من
دل من طالب آمل فتاد است

اس اندرونی شہادت کی موجودگی میں کوئی اور بیان تسلیم کرنے کو جی نہیں چاہتا، رہ گئی یہ بات کہ انھیں تھانیسری کیوں کہتے ہیں، سو اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ چونکہ نسبتی نے اپنی ساری زندگی تھانیسر میں بسر کی اس لئے وہ اسی جگہ سے منسوب ہو گئے۔
یہاں واسط کے متعلق جو نسبتی کا وطن اصلی ہے چند سطریں لکھنا غالباً بے محل نہ ہوگا۔

"اخبار الدول و آثار الاول" میں لکھا ہے کہ " واسط" بصرہ اور کوفہ کے درمیان ایک شہر ہے، جسے حجاج بن یوسف نے سنہ 84ھ میں آباد کیا۔ صاحب قاموس نے واسط نام کے کئی شہروں کا ذکر کیا ہے مثلاً وادی نخلہ میں مکہ کے قریب ایک شہر کا نام " واسط" ہے۔ مضافات بلخ میں ایک شہر واسط ہے۔ جہاں کے دو محدث محمد بن محمد اور بشر بن میمون مشہور ہیں عراق میں ایک شہر ہے جسے حجاج نے دو سال کی مدت میں آباد کرایا وغیرہ وغیرہ" مولانا ہوش بلگرامی اپنے ایک مضمون میں جو نگار سنہ ۱۹۲۶ء کی اشاعت دسمبر میں شایع ہوا، تحریر فرماتے ہیں :-

" واسطی النسل مسلمان ہندوستان میں دو مقامات پر پھیلے۔ ایک نے بارہہ (مظفر نگر) کو بسایا اور دوسرے نے بلگرام (ہردوئی) کو۔ دونوں ایک ہی خاندان کے چشم و چراغ ہیں۔ اور سید ابو الفرح واسطی کی اولاد - - - - - - سید ابو الفرح کے لئے جب واسط میں عرصۂ حیات تنگ ہو گیا۔ تو اپنے چاروں بیٹوں کو لے کر پہلے غزنیں میں پناہ لی۔ غزنیں میں جب جی نہ لگا تو اپنے چھوٹے صاحبزادے سید عزالدین کو ساتھ لے کر واسط لوٹ گئے"

مولانا نسبتی بھی اسی واسط کے رہنے والے معلوم دیتے ہیں۔ جو نواح بلخ میں خراسان کا ایک شہر ہے۔ اور جہاں کی دو چیزیں " نیزۂ واسطی" اور " قلم واسطی" بہت مشہور رہیں۔

تعلیم | اگرچہ آپ کی تعلیم کا حال معلوم نہیں مگر قیاساً کہا جا سکتا ہے۔ کہ آپ رسمی علوم سے کما حقہ واقف تھے کیونکہ تمام تذکرہ نویسوں نے آپ کو ملا نسبتی اور مولانا نسبتی لکھا ہے۔ آپ جس زمانہ کے بزرگ ہیں۔ اس میں فاضل شخص ہی کو کہا جاتا تھا۔ مثلاً ملا عبد اللہ سلطان پوری (مخدوم الملک) ۔ ملا مبارک اللہ (ابو الفضل کا والد) ملا عبد القادر بدایونی ۔ ملا فیضی

مذہب صاحب تذکرۂ روز روشن لکھتے ہیں :-

صوفی و صافی مشرب و درویش پاکیزہ مذہب بود بعد سنِ شعور لفقر و درویشی میل نمودہ و تکیۂ بکنارۂ تھانیسر بکمال نزہت و صفا ترتیب دادہ، ہمانجا بطاعت و ریاضت مشغول می ماند

بے تعصب، صوفی مزاج، مرنجاں مرنج اور پاکیزہ مذہب درویش تھے جوانی کے دنوں ہی میں فقر و درویشی کا شوق پیدا ہوا تھانیسر سے باہر ایک کنارے پر نہایت پاکیزہ اور لطیف تکیہ بنا کر اسی میں طاعت و ریاضت میں مشغول رہا کرتے تھے

آپ کے کلام سے جہاں آپ کی آزادمشی اور درویشی کی شہادت ملتی ہے وہاں یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ آپ غالباً مائل بہ تشیع تھے۔ ایک قصیدہ کی تشبیب میں جو حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی منقبت میں کہا ہے فرماتے ہیں :-

چار سُو ایست ایں جہانِ خراب
یک قدم چار سو نتواں رفت

نہایت لطیف پیرائے میں اپنی شیعیت کا اظہار کرتے ہوئے اہل تسنن پر چوٹ کر گئے ہیں۔ کبھی کبھی وہ غزل میں بھی بے اختیارانہ حضرت علی کی تعریف شروع کر دیتے ہیں۔ اس میں ان کے قصد و ارادہ کا دخل مطلق معلوم نہیں ہوتا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر آپ شیعہ نہ تھے تو مائل بہ تشیع ضرور تھے

امرائے وقت سے تعلقات متقدمین و متاخرین خواہ صوفیائے کرام ہوں یا شعرائے عظام اپنے اپنے عہد کے ارباب دول سے کسی نہ کسی رنگ میں ضرور متعلق ہوتے تھے لیکن نسبتی ہمیشہ آزاد رہے۔ شاہزادہ داراشکوہ ولی عہد شاہجہاں نے، جسے صوفیوں سے دلی محبت تھی اور یہی تصوف پرستی اس کی جان لیکر رہی، آپ کو بلوایا تو آپ نے جواب دیا کہ :-

بروں نیامدہ ام ہیچ گہ ز خانۂ خویش
سفر چہ داند عنقا ز آشیانۂ خویش
نمی پرم بہ پر و بالِ عاریت چوں تیر
نشستہ ام چو کماں روز و شب بخانۂ خویش

اس غزل کے باقی اشعار بھی لطف سے خالی نہیں ؎

ہزار شکر کہ بارے بکامِ خود نزدیم | گزشت عمر دریں کہنہ آشیانۂ خویش
دگر بدامِ ہوا و ہوس نمی اُفتم | کہ سیر خوردہ ام از آبِ خویش و دانۂ خویش

صاحب روزِ روشن کا بیان ہے کہ :-

بحدے استغنا بر مزاجش مستولی بود کہ شاہزادۂ داراشکوہ...

ان کے مزاج پر استغنا اور بے پرواہی کا غلبہ اس قدر تھا

... ہر چند طلب فرمود۔ دست انگشتِ اجابت بر دیدۂ قبول گذاشت

کہ دارا شکوہ نے بارہا بلوایا۔ مگر آپ نے اس بات کو قبول نہ کیا۔

مولانا کے ضخیم دیوان میں ایک لفظ تک کسی دنیادار کی تعریف میں نہیں جس سے سعدی ایسے معلم اخلاق دامن ملوث ہوئے بغیر نہ رہ سکا

ایسے بڑے شاعر کا اور اس زمانہ میں جبکہ شعرا کو سونے چاندی سے تولا جاتا تھا۔ اہل دنیا سے الگ تھلگ رہنا حیرتناک امر ہے۔ شاعر بھی وہ جس کو ولی دشت بیاضی کے بعد فارسی کا میر تقی میر کہہ سکتے ہیں اور جس کے کلام پر میرزا صائب کا ایسا شاعر عاشق ہو[1]

مرزا صائب در حینِ توجہ از کشمیر بمنزلش رفتہ باہم صحبتے داشتہ خیلے بایک دگر خوش بر آمدند بعد ازاں کہ مرزا با ایران رفت ہر کرا از ہند می رفت از وے می پرسید برائے ما چہ تحفہ از ہند آوردہ آں کس می گفت۔ چہ تحفہ می خواہی۔ مرزا می فرمود اشعار مولانا نسبتی۔ (مخزن الغرائب)

مرزا صائب کشمیر جاتے ہوئے ان کے یہاں گئے دونوں خوب گھل مل گئے کئی دنوں تک یہ صحبت گرم رہی بعد ازاں جب مرزا ایران چلے گئے تو جب کبھی کوئی شخص ہندوستان سے ایران جاتا اس سے کہتے میرے لئے کیا تحفہ لائے ہو۔ پوچھتا کیا؟ فرماتے۔ مولانا نسبتی کے اشعار! (احمد علی سندیلوی)

---

[1] دیوان غنی کے شارح نے مجمع النفائس کے حوالہ سے لکھا ہے کہ " ملاں مصنف کہ شارح در مقدمہ ثانیہ شرح او چند سانحہ معتبرہ رحمہم اللہ تعالیٰ نگاشتہ۔ سراج الدین علی خاں آرزو تخلص گوالیاری در تذکرۃ الشعرا مسمی بمجمع النفائس می آرد کہ ملا طاہر غنی کشمیری شاگرد شیخ محسن فانی است گویند چوں کسے از ہند وارد ایراں می شد مرحومی مرزا صائب می فرمود کہ برائے ما تحفہ از ہند آوردہ؟ و آں عبارتست از اشعار غنی"

جب میں نے یہ بیان پڑھا۔ تو ادب فارسی کے مشہور محقق علامہ دوراں حافظ محمود خاں صاحب شیرانی لکچرار پنجاب یونیورسٹی لاہور کی خدمت میں ایک عریضہ لکھ کر رفع التباس کی درخواست کی۔ آپ نے تحریر فرمایا کہ:۔ "میں نے مجمع النفائس از سراج الدین علیخاں آرزو الماری میں سے نکلوا کر دیکھا۔ اس میں عیناً وہی عبارت درج ہے۔ جو آپ کہتے ہیں۔ خان آرزو اور احمد علی سندیلوی میں خان آرزو زیادہ ثقہ اور قابلِ اعتبار ہیں جس طرح کہ قدیم بھی ہیں آپ خان آرزو کے بیان کو صحیح تسلیم کیجئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ احمد علی کو سہو ہو گیا ہے اور اسنے صائب کا جو بیان غنی کے حق میں تھا، نسبتی کی طرف منتقل کر دیا"

نسبتی اور صائب۔ غنی اور صائب کا ہم عصر ہونا۔ باہمی ملاقاتیں اور کشمیر کی آمد و رفت تذکروں سے ثابت ہے۔ صائب دوسرے اکابر شعرا کا نام جس ادب سے لیتا تھا۔ وہ بھی معلوم ہے۔ اس لئے یہ امر قرین قیاس ہے کہ صائب نے نسبتی کے متعلق بھی ایسا ہی فرمایا ہو جیسا کہ غنی کے متعلق۔

البتہ مرزا احسن اللہ[1] مخاطب بہ ظفر خاں احسن تخلص مرزا صائب کے ممدوح سے مولانا کو ضرور تعلق تھا مگر وہ تعلق ایسا تھا۔ جیسے ایک مرشد اور ہادیِ طریقت کو اپنے مرید سے ہوتا ہے " مرزا ظفر خان احسن بادے نسبت را سخہ داشتہ ازیں رو اکثر بہ کشمیر ہم اقامت کردہ " (روز روشن)

شفیق اورنگ آبادی لکھتے ہیں۔ " مولانا نسبتی در فقر صاحب نسبتِ تام است ۔ ظفر خاں صوبہ دار کشمیر با سے سلوک معتقدانہ داشت (گلِ رعنا)

اس کے سوا کسی امیر سے ان کا تعلق ثابت نہیں باوجودیکہ مولانا کو ظفر خاں سے گونہ تعلق تھا لیکن اسکی مدح سے زبان قلم کو کبھی آسودہ ہونے نہ دیا

اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ ظفر خاں اُن سے اس طرح ملتا تھا جیسے کوئی اپنے مرشد سے ملتا ہے۔ ان کے تعلق کی ایک اور وجہ بھی دل میں آتی ہے۔ مولانا فنا فی الشعر تھے اور ظفر خاں " ناقدِ سخن " علامہ شبلی مرحوم شعر العجم جلد سوم

---

[1] مرزا احسن اللہ مخاطب بہ ظفر خاں رکن السلطنت اور خواجہ ابوالحسن قزوینی کا (پروفیسر آزاد مرحوم نگارستان میں سبزواری لکھتے ہیں) کا بیٹا تھا۔ خواجہ ابوالحسن اکبر کے زمانہ میں ہندوستان آکر شاہزادہ دانیال کا وزیر اور دکن کا دیوان مقرر ہوا۔ جب جہانگیر سریر آرائے سلطنت ہوا تو اسے وزارتِ عظمیٰ کا قلمدان اور منصب پنج ہزاری تفویض ہوا ۱۰۳۳ھ میں کابل کی حکومت بھی وزارت عظمےٰ سے متعلق کرا دی گئی اور ظفر خاں باپ کی نیابت میں صوبہ دار کابل بنایا گیا۔ شاہجہاں نے ۱۰۴۲ھ میں ابوالحسن کو کشمیر کا صوبہ دار مقرر کیا۔ جہاں وہ اسی سال دنیا سے کوچ کر گیا۔ خواجہ کی وفات کے بعد ظفر خاں کو مستقل طور پر کشمیر کی صوبہ داری سہ ہزاری منصب۔ علم اور نقارہ مرحمت ہوا۔ اس نے اپنے ایام حکومت میں تبت فتح کیا۔ علاوہ ازیں کابل کا گورنر رہا۔ شاہجہاں کے ہمراہ دکن کی یلغاروں (۱۰۳۷ھ تا ۱۰۴۱ھ) میں بھی شامل رہا۔ اپنے زمانہ کے چوٹی کے امرا میں شمار ہوتا تھا۔ عالی دماغ۔ بلند فطرت۔ صاحب جوہر اور جوہر شناس عالم تھا۔ نہایت فیاض قدردانِ علم و فن اور شاعری کا نباض تھا۔ علامہ شبلی مآثر الامرا کے حوالے سے لکھتے ہیں " در با برہم ایران می ورد۔ خصوصاً در حقِ شعرا طرفہ بذل و کرم می فرمود۔ " الغرض ارباب کمال کی پرورش کرنا فرض سمجھتا تھا ہمیشہ اس کے دربار میں علما۔ اُدبا اور شعرا کا جمگھٹا رہتا تھا۔ خود شاعر تھا۔ احسن تخلص کرتا تھا۔ علاوہ ازیں شعر کا زبردست نقاد تھا۔ صائب کو صائب بنانا اسی کے فیضِ تربیت کا نتیجہ ہے۔ اس نے شعرا کا ایک عجیب و غریب تذکرہ مرتب کرایا تھا۔ جس میں اپنے ہمعصر شعرا کے سوانح حیات اور منتخب کلام خود شاعر کے اپنے ہاتھ سے لکھوائے تھے۔ ساتھ ہی ہر شاعر کی تصویر تیار کرا کر لگا دی تھی۔ (مآثر الامرا) محمد افضل سرخوش نے اس دلچسپ کتاب کا ایک ورق دیکھا تھا جس پر کلیم کی تصویر تھی۔ آہ! یہ نادر کتاب جو بڑے اہتمام سے لکھوائی گئی تھی دست بردِ حوادث کی نذر ہو گئی۔ اگر مل جاتی تو بڑے کام کی چیز تھی (کلمات الشعرا) مرزا صائب جب بسلسلۂ تجارت ہندوستان آیا اور شاہجہاں کے دربار میں حاضر ہوا یہاں ہی ظفر خاں سے واقفیت پیدا ہوئی۔ پھر یہ تعلقات اس قدر بڑھے کہ اب ظفر خاں اور صائب دونوں کے نام اکٹھے لئے جاتے ہیں

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۵۲ پر ملاحظہ ہو)

کے مدعا پر لکھتے ہیں "ظفرخاں صوبہ دار کشمیر اس رتبہ کا شخص تھا کہ کلیم اور مرزا صائب کو اس کی اُستادی کا اعتراف ہے صائب ایک مدت تک اس کے دربار میں رہا اور اس کی بدولت شاعری میں ترقی کی۔ ظفرخاں اس کے کلام میں موقع بموقع دخل اور تصرف کرتا تھا"۔ نسبتی کے دیوان میں صرف ذیل کے دو شعروں میں ظفرخاں کا نام آیا ہے

نسبتی ما ہم زباتی باظفرخاں کردہ ایم
گفتگوئے ایں غزل زاں اوسراپا نازک است

من و دل چو از شوق افغاں کنیم ظفرخاں ... ظفرخاں ۔ ظفرخاں کنیم

ممکن ہے ان کے کلام کے صفحۂ عالم سے محو ہونے کی بڑی وجہ یہی بے نیازی۔ استغنا۔ زاویہ نشینی اور عزلت گزینی ہو۔

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۵۱)

صائب نے اس کی تعریف میں پرزور قصاید لکھے۔ احسن کو بھی اس سے بڑی محبت تھی۔ اپنی غزلوں کے اکثر مقطعوں میں صائب کو یاد کرتا ہے۔

طرز یاراں پیش احسن بعد ازیں مقبول نیست
تازہ گوئی ہائے او از فیض طبع صائب است

صائب اسے اپنا استاد سمجھتا ہے

حقوق تربیت را کہ در ترقی باد زباں کجاست کہ در حضرتت فروخوانم
تو جاں ز دخل بجا مصرعہ مرادادی تو در فصاحت دادی خطاب سحبانم
ز دقت تو بمعنی چناں شدم باریک کہ می تواں بدل مور کرد پنہانم
چو زلف سنبل ابیات من پریشاں بود نہ داشت طرۂ شیرازہ روئے دیوانم

تو غنچہ ساختی اوراق باد بردۂ من
دگرنہ خار نمی ماند از گلستانم

جب والد کی محبت صائب کو کشاں کشاں ایران لے گئی۔ تو وہ وہاں جاتے ہی شاہ عباس ثانی کے دربار میں ملک الشعرا بن گیا۔ مگر ہندوستان کی قدردانی کب بھولنے والی تھی۔ ظفرخاں کی تعریف میں وہاں سے بھی اشعار بھیجا کرتا۔ ایک دفعہ ایک شعر لکھ بھیجا ؎

دوردستاں را باحساں یاد کردن ہمت است
ورنہ ہر نخلے بپائے خود ثمر می افگند

تو ظفرخاں نے پانچ ہزار روپیہ اور بقول بعض پانچ ہزار اشرفی بھجوائیں۔ مولانا آزاد نگارستان میں یہ واقعہ ظفرخاں سے منسوب کرتے ہیں۔ مگر مولانا شبلی نے خزانۂ عامرہ کی روایت سے اسے نواب جعفر خاں وزیر اعظم عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ سے منسوب کیا ہے۔ مگر قرین قیاس یہی ہے کہ وہ سخی مرد ظفرخاں احسن ہی ہوگا

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۵۳ پر ملاحظہ ہو)

تاریخ شاہد ہے کہ اکثر نااہل متعلق بہ دربار شاہی ہونے کے باعث مشہور ہوئے (گو ان کی شہرت چشمکِ شرار سے زیادہ نہ تھی) اور فضلائے بے مثال اپنی آزاد منشی کے باعث "لالۂ صحرا" بنے رہے۔ مجد الدین ہمگر شیخ کے معاصر اور اس دربار سے تعلق رکھتے تھے

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۵۲)

اس کی وفات بقول علامہ شبلی ۱۰۵۱ھ میں ہوئی اور خانصاحب مولوی عبدالمقتدر ناظم پبلک خدا بخش لائبریری کی عربی فارسی مخطوطات کی فہرست کے مولف ۱۰۷۵ھ بتاتے ہیں، لیکن سراج کے خیال میں ظفر خاں کی وفات ۱۰۷۳ھ یا ۱۰۸۱ھ میں واقع ہوئی۔

اس نے ۱۰۳۳ھ میں شعر کہنا شروع کیا۔ ۱۰۴۶ھ میں جب وہ شاہجہاں کے ہمراہ دکن گیا تو ایک دیوان مرتب کیا جس کا ایک نسخہ بوڈلین لائبریری میں موجود ہے جس کے شروع میں ایک مفصل دیباچہ نثر میں ہے اس نسخہ پر ۲ شعبان ۱۰۴۶ھ درج ہے۔ گو یہ دیوان احسن کا ابتدائی کلام ہوگا۔ علامہ حافظ محمود خاں صاحب شیرانی کے ذاتی کتب خانہ میں بھی ایک نسخہ دیوان احسن کا موجود ہے جسے میں قلت وقت کے باعث دیکھ نہ سکا۔ آپ نے تو میری خاطر الماریاں کھلوا دی تھیں اگر قصور ہے تو میرا۔ اس لئے میں نہیں کہہ سکتا کہ وہ دیوان وہی ابتدائی مجموعۂ سخن ہے یا ظفر خاں کے عہد پختگی کا سرمایۂ شعر و شاعری۔ علامہ فرماتے تھے دیوان احسن اکثر کتب خانوں میں موجود ہے۔ سرخوش لکھتا ہے کہ ایک دیوان رنگین جس میں چند مثنویاں بھی ہیں اس سے یادگار ہے۔ نواب صدیق حسن خاں صاحب مصنف شمع انجمن نے بھی ان کا ایک دیوان مختصر دیکھا تھا۔ بانکی پور لائبریری میں بھی اس کا ایک نسخہ محفوظ ہے۔ نمونہ کلام یہ ہے:-

دلم بکوئے تو امید وار می آید — نگاہ دار کہ دزدے بکار می آید

درگوشۂ میخانہ ہمیں گفت و شنید است — یاران بر سانید دماغ شب عید است

شادم بہ دل شکستگی خود کہ پیش من — قدر دل شکستہ چو زلف شکستہ است

گوشۂ چشمے اگر ساقی بمن دارد بجاست — عمرہا در گوشۂ میخانہ خدمت کردہ ایم

بہ تیغ بے نیازی تا توانی قطع ہستی کن — فلک تا افگند از پا ترا خود پیش دستی کن

بہر کجا کہ روم وصف دوستاں گویم — برائے یار فروشی دکاں نمی باید

زبہر ستیم کہ کار با جام و شراب افتد — مرا از گفتگوئے بادہ سرخوش می تواں کردن

بسکہ برخاک درش ناصیہ سودیم احسن — آیۂ سجدہ تواں خواند ز پیشانی ما

ظفر خاں کا بیٹا محمد طاہر مخاطب بہ عنایت خاں المتخلص آشنا ایک دلچسپ نوجوان تھا۔ اسے انشا پردازی میں کامل دسترس حاصل تھی۔ شاہجہاں نامہ کے مصنفین میں سے ایک ہے اس نے شاہجہاں کے وقایع حکومت ملا حمید وغیرہ کی نسبت زیادہ شگفتہ اور فصیح لکھے ہیں۔ اس نے اپنا دیوان بھی زندگی ہی میں مدون کر لیا تھا۔ شعر میں دقت آفرینی اور مشکل پسندی اسے پسند نہ تھی چنانچہ اس کا قول ہے کہ جو شعر ایک دفعہ پڑھنے سے سمجھ میں نہ آئے اور جس کو سمجھنے کے لئے دماغ پر بوجھ ڈالنا پڑے وہ بے معنی ہے۔ اس کی وفات ۱۰۷۷ھ میں ہوئی۔ خدا بخش لائبریری پٹنہ میں اس کا دیوان محفوظ ہے۔ نمونۂ کلام یہ ہے:-

درد و درماں را دہد گر عرض عشق ادیا — زخم بردایم و بگذاریم مرہم را بجا

ناقصاں ہم بدرش چشم طمع دوختہ اند — کو بپیوستہ نظر جانب بالا دارد

بہ نشیں بہ گوشۂ اگر آزادۂ ز خلق — پائے شکستۂ تو بجائے نرفتہ است

جس سے شیخ کو تھا۔ آج تو کوئی ان کا نام بھی نہیں جانتا۔ لیکن اسی زمانہ میں فارسی کی ملک الشعرائی جو سعدی کا حق تھا قسمت نے ان کو عنایت کیا تھا

سعد بن ابوبکر سعد زنگی ان کی تعظیم و تکریم شیخ سے زیادہ کرتا تھا۔ اسی زمانہ میں اتنی ایک شاعر تھے، زمانہ کی بے بصری نے ان کو بھی شیخ کا حریف بنا دیا تھا۔ (شعر العجم جلد دوم صفحہ ۔) بیسوں ایسی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں جنھیں بخوف طوالت نظر انداز کیا جاتا ہے۔ زمانہ لاکھ مٹائے حق ظاہر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ہندوستان کی ادبی محفلوں میں نسبتی کا نام ضرور گونجتا رہا۔ بحالیکہ ان کا کلام نایاب ہو گیا۔ آخر وہ وقت بھی آ گیا جب کہ زمانہ کی سنت جاریہ کے مطابق ان کا گم گشتہ دیوان پھر سے مل گیا۔

معلوم ہوتا ہے ایک شخص سعادت خاں سے (جس کا حال معلوم نہیں ہو سکا) مولانا نسبتی کو قلبی لگاؤ تھا۔ ایک درد آمیز غزل میں اپنی لگاوٹ کا اظہار کرتے ہیں:—

گوازما سعادت خانِ مارا	کہ از نے بشنود افغانِ مارا
خورد چوں بادہ دخواہد کبابے	بیاد آرد دلِ بریانِ مارا
بگو گوشے نہد بر صوتِ بلبل	کہ بالگل می زند دستانِ مارا
بہا کن شیوۂ بلبل۔ کہ دانی	بقدرے قیمتِ افغانِ مارا
بجانت می خورم سوگند جاناں	کہ جاں دادہ است در د ہجرانِ مارا
چہ شد اکنوں کہ تاثیرے ندارد	اثرہا بودہ ات افغانِ مارا
چکیدہ چوں آب زہرابِ جدائی	بیفشاری اگر دامانِ مارا
سرے شوریدہ و جانِ خرابے	چہ می پرسی سرو سامانِ مارا

گوا اے پند گو مارا ملامت
ملامت کن دلِ نادانِ مارا

نہ دست و پا۔ نہ بال و پر۔ نہ پرواز	چہ پرسی شوقِ بے سامانِ مارا

بماند نسبتی در چشم تر آب
بخوں شاداب کن مژگانِ مارا

وفات نواب صدیق حسن خاں شمع انجمن کے صفحہ ۴۵۹ پر لکھتے ہیں "در اواسط ۱۰۵۵ھ بدار البقا آرامید" "روز روشن" جو اس سے تین سال بعد کی تصنیف ہے اس کی تصدیق کرتا ہے۔ مولانا نیاز فتحپوری مجموعۂ استفسارات وجوابات جلد اول کے صفحہ ۴۲۹ پر تحریر فرماتے ہیں "گیارھویں صدی ہجری کے وسط میں آپ کا انتقال ہوا"۔ خانصاحب مولوی عبدالمقتدر عربی فارسی مخطوطات کی فہرست جلد سوم میں طاہر نصیر آبادی کے تذکرۃ الشعرا کے

حوالے سے (جو سنہ ۱۰۸۳ھ) کی تصنیف ہے یوں رقم طراز ہیں "نسبتی نے اسوقت وفات پائی جب ظفر خاں احسن ناظم کابل تھا۔

اگر ان سب بیانات پر ایک تنقیدی نگاہ ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ طاہر نصیر آبادی کا قول غلط ہے کیونکہ ظفر خاں سنہ ۱۰۳۹ھ میں اپنے باپ کی طرف سے کابل کا ناظم تھا۔ پھر سنہ ۱۰۴۲ھ میں شاہجہاں نے اسے کشمیر کا گورنر مقرر کیا۔ اس طرح اس کی نظامت کابل کا زمانہ سنہ ۱۰۳۹ھ سے پہلے ختم ہو جاتا ہے۔ کیونکہ وہ سنہ ۱۰۳۹ھ میں شاہجہاں کے ساتھ دکن چلا گیا اور واپسی پر (سنہ ۱۰۴۲ھ) کشمیر کا حاکم بنایا گیا ہے۔ صائب نے کشمیر جاتے ہوئے نسبتی سے ملاقات کی تھی۔ یہ تو معلوم ہے کہ صائب کشمیر سے ہی ایران چلا گیا تھا۔ پھر واپس نہیں آیا۔ صائب کی ملاقات بھی سنہ ۱۰۴۲ھ کے بعد ہی کا واقعہ ہے۔ گویا نسبتی گیارھویں صدی ہجری کے وسط میں فوت ہوگئے۔

مولانا نیاز کے بیان کی بنیاد روزِ روشن کے قول پر قائم ہے جس کی اصل عبارت یوں ہے "وفاتش در اواسط مائۂ حادی عشر واقع شد" آپ کو دھوکا ہو گیا اور سنہ ۱۱۰۰ھ کے بجائے گیارھویں صدی ہجری لکھ گئے۔ مصنف شمعِ انجمن نے انھیں شعرائے عالمگیری میں شمار کیا ہے، عالمگیر کا عہد حکومت سنہ ۱۰۶۸ھ سے شروع ہوتا ہے۔ اس لئے نہ تو ان کی وفات گیارھویں صدی ہجری کے وسط میں تسلیم کی جا سکتی ہے۔ نہ سنہ ۱۰۳۳ھ اور سنہ ۱۰۴۲ھ کے درمیان طاہر نصیر آبادی کے قول کے مطابق

طاہر کے بیان کی تردید ایک اور چشم دید شہادت سے بھی ہوتی ہے۔ محمد صالح کنبوہ مصنف عمل صالح (شاہجہاں نامہ) اپنی کتاب کی دوسری جلد کے صفحہ ۷۴۲ پر لکھتے ہیں کہ "میں نے سنہ ۱۰۶۲ھ مطابق سنہ ۱۶۵۱ء میں نسبتی سے تھانیسر کے مقام پر ملاقات کی جب کہ میں لاہور سے واپس ہو رہا تھا" اتنا تو یقینی طور پر معلوم ہوگیا کہ سنہ ۱۰۶۲ھ تک نسبتی زندہ تھے۔ نواب صدیق حسن خاں کا بیان "وسط سنہ ۱۱۰۵ھ" میں وفات پانا اس لئے غلط ہے کہ طاہر نصیر آبادی نے اپنا تذکرہ (بقول علامہ شبلی) سنہ ۱۰۸۳ھ میں مکمل کیا۔ ہو سکتا ہے کہ اُس نے تاریخِ وفاتِ نسبتی کے متعلق کسی روایت کو بلا تحقیق لے لیا ہو۔ لیکن اس غلطی کا امکان قطعاً ناممکن ہے کہ وہ زندہ نسبتی کو مردہ نسبتی لکھتا۔

لہٰذا ان کی وفات کا زمانہ سنہ ۱۰۶۲ھ اور سنہ ۱۰۸۳ھ کے درمیان قرار پاتا ہے اگر یہ قیاس کر لیا جائے کہ مرزا طاہر نے غلطی سے ظفر خاں کی "حکومت کشمیر" کی جگہ "حکومت کابل" لکھ دی تو پھر نسبتی کی وفات کم از کم سنہ ۱۰۶۲ھ اور سنہ ۱۰۷۰ھ کے درمیان واقع ہوئی ہوگی۔ مگر اس میں بھی تو اختلاف ہے کہ ظفر خاں کب فوت ہوئے۔ مولوی عبدالمقتدر سنہ ۱۰۷۳ھ۔ سراج سنہ ۱۰۸۱ھ یا سنہ ۱۰۶۳ھ اور علامہ شبلی سنہ ۱۰۷۰ھ لکھتے ہیں۔ علامہ شبلی نے ظفر خاں کا حال مآثر الامراء کے حوالے سے لکھا ہے۔ اس لئے میں ان کا قول مرجح سمجھتا ہوں۔ پس اس عاجز کے خیال میں نسبتی کی وفات عہدِ عالمگیر کے ابتدائی ایام کا حادثہ ہے یعنی سنہ ۱۰۶۹ھ اور سنہ ۱۰۷۰ھ کے درمیان۔

مرزا صائب جب ایران گئے تو جاتے ہی دربار ایران میں ملک الشعراء بن گئے۔ ان کا مشہور شعر: "دور دستاں را با احساں یاد کردن ---" عہد عالمگیر میں ہندوستان آیا۔ اس لئے قیاس یہ چاہتا ہے کہ صائب

کا ایران جانا اور شعر کا بھیجنا یہ سب باتیں ایک دو سال کے اندر وقوع پذیر ہوئی ہوں گی۔ اگر "جعفر خاں" اور "ظفر خاں" کو کتابت کی غلطی کہا جائے تو نسبتی کی وفات کم از کم سنہ ۱۰۶۸ھ اور سنہ ۱۰۷۰ھ کے درمیانی سالوں میں ہوئی ہوگی۔ میرے پاس تذکرۃ الشعراء نصیر آبادی ہے نہ مآثر الامرا۔ ممکن ہے اگر ان دو کتب کا بدقت نظر مطالعہ کیا جائے اور زیادہ تفحص سے کام لیں تو کوئی صحیح تر اور مفید مطلب بات معلوم ہو سکے۔ اس بارہ میں شاہجہاں اور عالمگیر اعظم کے عہد حکومت کی تاریخی کتب سے بھی مدد لی جا سکتی ہے۔ آیندہ قسط میں ان کا کلام پیش کیا جائے گا

(باقی) فضل حسین تبسم

(نگار) جناب فضل حسین تبسم نے نسبتی پر یہ مقالہ لکھ کر، اس میں شک نہیں بڑا کام کیا ہے۔ اول اول جب تبسم صاحب نے مجھے اطلاع دی کہ کلیات نسبتی دستیاب ہو گیا ہے، تو مجھے بڑی خوشی ہوئی، کیونکہ دو چار اشعار نسبتی کے جو مجھے یاد تھے۔ اُن سے میں نے اندازہ کیا تھا کہ نسبتی کا معیار تغزل وہی ہے جو سعدی کا تھا اور یہ مسلم ہے کہ سعدی سے بہتر غزل کسی نے نہیں کہی

تبسم صاحب نے جس محنت و شوق سے اس کام کو انجام دیا ہے، اس کی داد زمانہ سے ملنا تو مشکل ہے کیونکہ فارسی کا ذوق اب تقریباً معدوم ہو چکا ہے، لیکن خود تبسم صاحب کا یہ احساس کہ انھوں نے نسبتی کو دوبارہ زندہ کر دیا، بجائے خود اتنی بڑی داد ہے کہ اس سے زیادہ کی تمنا کوئی معنی نہیں رکھتی

اگر کلیات نسبتی انھوں نے میرے پاس بھیج دیا، جیسا کہ انھوں نے وعدہ کیا ہے تو میں خود بھی اختتام مقالہ پر اپنی رائے پیش کروں گا اگر اس کی ضرورت محسوس ہوئی۔ کلیات نسبتی کا ایک نسخہ رامپور کے کتاب خانہ میں بھی ہے جس کا ذکر مولانا عرشی ناظم کتاب خانہ نے خود مجھ سے کیا تھا، اگر کبھی رامپور گیا تو دیکھوں گا کہ تبسم صاحب کے دریافت کئے ہوئے نسخے سے وہ کس حد تک مطابق ہے۔ اس مقالہ کی آیندہ قسط جس میں نسبتی کی غزلگوئی سے بحث کی گئی ہے، دیکھنے کے قابل ہوگی، کیونکہ وہی اس مضمون کی جان ہے

(نیاز)

مکتوبات نیاز

مکرمی - تسلیم - عنایت نامہ پہونچا۔ معاذ اللہ! یہ تلخی و درشتی، یہ گرمی و برہمی!

اور بات ہے تمھاری بات، حرف کل سے اور آج

میں آپ کو کیونکر باور کراؤں کہ میرا مقصود وہ نہیں تھا جو آپ سمجھے ہیں۔ قبلہ، تعریض و اعتراض میں بڑا فرق ہے، لیکن مشکل تو یہی ہے کہ میرا انداز بیان، لب و لہجہ سے آپ کبھی پڑھتے ہی نہیں

میں تو صرف اپنے "دعوئے وارستگی" کی داد آپ سے چاہتا تھا، آپ نے اسے اپنے خلاف "فریاد" کے رنگ میں سنا، حالانکہ میری طرح آپ بھی اس حقیقت سے واقف ہیں کہ

شہیدان نگہ کا خونبہا کیا

وہ شخص جس نے کبھی آپ کی "پاکدامنی" پر غبطہ نہ کیا ہو، اسے آپ اس کی "تردامنی" کی حکایت کیا سناتے ہیں۔
میں شکریہ کا عادی نہیں، لیکن آپ کی یہ شکایت ایسی نہیں کہ اظہار تشکر نہ کروں

سنئے، اگر واقعی خدا ہے تو یہ کیا ضرور ہے کہ میں اسے اپنی بیچارگی ہی سے پہچاننے کی کوشش کروں اور اگر نہیں ہے تو پھر یہ "طعن بیکسی" کیا!

آپ کو تو خیر، اپنی پارسائی پر ناز بھی نہیں ہے، میں نے تو ان کے ایمان کو بھی اپنے کفر سے فروتر پایا ہے، جن کے طواف کے لئے (بقول ان کے) خود کعبہ اپنی جگہ سے ہلا پڑتا ہے

نگہ گر نشد قابل روئے دوست

فغاں می رسانم بجائے کہ اوست

یعنی اگر آپ کو دیکھنے کی فرصت زمانہ نہیں دیتا تو کم از کم "حسرت دیدار" تو آپ تک پہونچا ہی دوں

زچاک سینہ آہے می نویسم

کتانم حرف ماہے می نویسم

کسقدر تڑپا ہوں یہ سنکر کہ آپ یہاں آئے بھی اور چلے بھی گئے۔ کس قدر دل دکھا دینے والی بات ہے کہ میں تو عدم حاضری کا عذر لنگ بھی پیش نہ کرسکوں اور آپ کے پاس یاد نہ کرنے کے سو بہانے موجود ہوں۔ خوش رہنے، میں کیا اور میری یاد ہی کیا،

با کدا ئیں ذرہ سنجم خویشتن را اعتبار
آنقدر ہیچم کہ از خود شرمسارم کردہ اند

امید بنا بابا، کل گرامی نامہ پہونچا اور اس میں وہ کچھ بھی پایا جس کی توقع نہ تھی، توقع کا کیا ذکر ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ نہ ہوں تو میری دنیا بھی خالی اور اگر دین کوئی چیز ہے تو وہ بھی خالی

میں یقیناً اس پر عمل کروں گا، جو آپ نے لکھا ہے اور نامہ و پیام نہیں بلکہ خود پہونچکر وہ سب کچھ کہوں گا جو آپ نے فرمایا ہے، لیکن یہ دیکھ لیجئے کہ اگر اس پر بھی ان کی تلخیاں دور نہ ہوئیں تو پھر میرے لئے سوائے کھلی ہوئی بغاوت کے اور کوئی راستہ نہیں رہتا

عجز و بندگی بُری نہیں اگر واقعی بندہ نوازی بھی کوئی چیز ہو، ورنہ پھر سر پھوڑنے سے بہتر سرکشی ہے کہ اس طرح کم از کم اپنے متعلق تو یہ سمجھنے کا موقع مل جاتا ہے کہ

آئینہ برائے خود بہارے دارد

عزیز یہاں نہیں ہے، جسوقت واپس آیا، فوراً آپ کی خدمت میں روانہ کروں گا۔ یہ آپ نے کیا فرمایا۔ اس کے لئے اس سے زیادہ سعادت اور کیا ہوسکتی ہے کہ وہ اپنی زندگی آپ کی خدمت کے لئے وقف کردے — اس باب میں اب اور کچھ نہ لکھئے گا، میں آپ کی رُکی رُکی باتوں سے سمجھ گیا کہ آپ کے دل میں کیا ہے

میری حالت پہلے سے اچھی ہے، لیکن نہ اتنی اچھی کہ اس پر صحت کا اطلاق ہوسکے۔ زندگی نام ہے صحت کا اور صحت کہتے ہیں ولولہ و نشاط کو، سو جب یہی نہیں تو پھر یہ پوچھئے کہ جی کیوں رہا ہوں۔ ایام دولت مستدام!

ماشاءاللہ، کیا کہنے ہیں، اس صداقت و صفا کے۔ آپ نے دنیا میں کبھی کاہے کو جھوٹ بولا ہوگا، آپ کے اصول نے کب کسی مصلحت کو گوارا کیا ہوگا

آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ "انسانیت" کا تقاضہ اتنی بڑی چیز ہے کہ اس کے مقابلہ میں، ملازمت کے اصول و فرائض تو خیر کیا ہیں، میں شریعت مذہب کو بھی کوئی چیز نہیں سمجھتا اگر وہ اخلاق کے منافی ہے۔ اسی لئے فدک کے جھگڑے میں، میں بالکل حضرات شیعہ سے متفق ہوں۔ کیسا ترکہ، کہاں کا استحقاق۔ کیسا اصول، کہاں کی فقہ، دیکھنا یہ تھا کہ

سائل کون ہے، اور کیا چیز طلب کر رہا ہے ۔۔ رسول کی بیٹی کی درخواست ہے جس نے اپنی ساری عمر چکی پیس پیس کر کاٹ دی اور باغ فدک حاصل کرنے کی درخواست ہے جس کی آمدنی شاید "بقدر کفاف" سے زیادہ نہ تھی، لیکن اصول مذہب کو سامنے رکھ کر (اگر وہ واقعی اصول تھے) فاطمہ کی اس التجا کو ٹھکرا دیا جاتا ہے۔ کیا انسانیت کا تقاضہ یہی تھا اور کیا ایسی "عدم انسانیت" شریعت پر عمل کرنا کسی کے لئے قابل فخر ہو سکتا ہے۔ بعض وقت میں سوچتا ہوں کہ نہیں یہ سب کچھ اس لئے تو نہیں ہوا کہ فاطمہ علی کی بیوی تھیں۔ بہرحال مدعا یہ ظاہر کرنا ہے کہ انسان کو کبھی کبھی اصول سے بھی ہٹ جانا چاہئے اور بقول اقبال، دل کو بھی کبھی عقل کی گرفت سے آزاد بھی کر دینا چاہئے

میں نے مانا کہ اس نے غلطی کی اور سخت غلطی کی، لیکن آپ نے جو کچھ کیا وہ اس سے بھی زیادہ کچھ۔ وہ چیز ہے میرے پاس اس کے ظاہر کرنے کے لئے الفاظ موجود ہیں۔ لیکن نہیں کہتا کہ آپ اور زیادہ برا مان جائیں گے

معاف فرمائیے جو کچھ میں نے لکھا اس لئے نہ تھا کہ آپ اپنے کئے کی تلافی کریں، بلکہ صرف یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ دنیا میں اس بات کے سمجھنے والے بھی موجود ہیں کہ " تو آں نئی کہ جفائے توانی دکنی"

بندہ نواز،

میں تو آپ کا صرف نیازمند ہوں ۔ نہ کبھی اپنے دعوئے خلوص کو ذریعۂ افتخار سمجھا، نہ اخلاقِ گرامی کو وسیلۂ کار۔ آپ سے محبت کرتا ہوں بغیر کسی وجہ کے اور آپ کی عزت میرے دل میں ہے بغیر کسی حجت و دلیل کے۔ اگر آپ مجھ سے خفا ہیں محض اس لئے کہ میں نے کیوں نہ آپ کے لئے رسمی نمود و نمائش سے کام لیا، تو افسوس ہے کہ اس بدقسمتی کا علاج میرے پاس کوئی نہیں۔ کس قدر حیرتناک امر ہے کہ جن سے دل کو تعلق ہوتا ہے وہی دل کی باتیں نہیں سمجھتے

آپ اس جذبہ کا جو نام چاہے رکھئے، لیکن یہ یقینی ہے کہ میں احساس پستی (Inferiority complex) کا شکار نہیں ہوں۔ اور بڑی سی بڑی ہستی خواہ کتنا ہی بڑا عمامہ اس کے سر پر ہو اور کتنی ہی طویل عبا در بر مجھے مرعوب نہیں کر سکتی۔ اپنی عقل پر بھروسہ کرتا ہوں، ہمیشہ اسی پر اعتماد کیا ہے اور

شادم از زندگیِ خویش کہ کارے کردم

اب دہلی کا آنا جانا بند ہے۔ لیکن اس دوران میں کوئی صورت وہاں جانے کی پیش آگئی تو ضرور حاضر ہوں گا لیکن آپ کے یہاں قیام کا وعدہ نہیں کرتا

مکرمی ۔ جلال امیر بہت اچھا شاعر تھا اور عرفی، نظیری اور کلیم کی صف میں لایا جا سکتا ہے ۔ غالب کو انھیں چاروں کا نچوڑ سمجھئے ۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں :۔

برنمی آید دلم با ۔ ۔ روزگار   شیشۂ طاقت بہ سنداں می زنم
سینہ بسانی، باغ من، بستان من   خندہ بر الفت پرستاں می زنم

مسلماں کافرم، کافر مسلماں   نہ دینم رونقے دارد نہ دنیا

اسیر از دوست پرسیدن چہ حاجت   سوالے را کہ دشنامش جواب ست

دل را در آتش افگنم و بوئے او کنم   منت نمی تواں ز نسیم و صبا کشید

از غبار شوق طرح کعبۂ دل ریختند   گردِ رہ برداشتند و سنگِ منزل ریختند

شمع را ہمدرد بلبل کرد عشق   برگ گل چید و پر پروانہ ساخت

در گلستاں دیدمش نشناختم   بر تنش پیراہن گل تنگ بود

لیکن یہ بالکل صحیح ہے کہ اس قسم کے اشعار جلال اسیر کے یہاں کم ہیں اور اسی لئے نہ وہ عرفی ونظیری کا ہمسر ہوسکا اور نہ ہم غالب پر اسے ترجیح دے سکتے ہیں

مکرمی ۔ خیال نہایت پاکیزہ اور اچھوتا ہے ۔ بلبل و آشیاں، برق و گلچیں پر بہت توجہ صرف کی گئی اور لوگوں نے ڈھونڈھ ڈھونڈھکر ایسے اشعار کو جمع بھی کیا، لیکن "آئینہ" کے متعلق کوئی صورت کاوش کی اختیار نہیں کی گئی

بیشک حیرانی کا تلازمہ تو باقی رہے گا، لیکن اس میں بھی بات پیدا کرنے والے پیدا کر ہی لیتے ہیں۔ یہ موضوع بیدل کو بہت پسند تھا۔ اس سے بہتر اشعار آپ کو کسی اور جگہ نہ ملیں گے ۔ اس وقت دو شعر یاد آگئے ہیں، انھیں تو سن ہی لیجئے :۔

یار در آغوش و نامِ او نمیدانم کہ چیست
سادگی ختم ست چوں آئینہ بر نسیاں مارا
بدل نقشے نمی بندد کہ با وحشت نہ پیوندد
نمیدانم کدامیں بیوفا آئینہ چید اینجا

باب الاستفسار

مانسون

(جناب سید خلیل احمد صاحب ۔ چھپرہ)

مانسون (Monsoon) کسے کہتے ہیں اور ملک کے مختلف حصوں میں [illegible] بارش کی کیوں ہوتی ہے ؟

(نگار) مانسون سے مراد وہ ہوا ہے جو کسی موسم میں یکساں طور پر چلتی رہے ۔ یہ ہوا خشکی و تری کی باد نسیم ہی زیادہ وسیع پیمانہ پر۔ گرمی میں زمین کا بڑا حصہ گرم ہو جاتا ہے اور یہاں کی ہوا بہ نسبت متعلقہ سمندروں کی ہوا کے زیادہ ہلکی ہو جاتی ہے، گویا بالفاظ دیگر یوں سمجھیے کہ خشکی پر ہوا کا دباؤ کم ہو جاتا ہے اور سمندر پر زیادہ ۔ اس لئے سمندر کی طرف سے خشکی کی طرف ہوا کا رُخ ہو جاتا ہے جو اپنے ساتھ سمندر کے ابخرات لاکر پانی برساتا ہے ۔ جاڑوں میں صورت بالکل برعکس ہو جاتی ہے اس لئے اس موسم میں خشکی کے سمندر کی طرف ہوا چلتی رہتی ہے ۔ بارش کی کمی یا زیادتی کے اسباب مختلف ہیں ۔ ایک سبب زمین کی بلندی ہے ۔ پہاڑ ہمیشہ ہوا کو زیادہ بلندی کی طرف مائل کر دیتے ہیں، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہوا پھیل کر سرد ہو جاتی ہے اور جب وہ واپس لوٹتی ہے تو نسبتاً گرم ہوتی ہے اور اس لئے کم بارش پیدا کرتی ہے ۔ دوسرا سبب سمندر کا فاصلہ ہے ۔ جو مقام سمندر سے زیادہ دور ہوگا اتنی ہی کم بارش وہاں ہوگی

خط استوا پر ہمیشہ زیادہ بارش ہوتی رہتی ہے کیونکہ باد موافق (Trade Wind) کی وجہ سے وہاں کی ہوائیں ہمیشہ تموج پایا جاتا ہے ۔ منطقہ حارہ (Tropics) پر بہت کم بارش ہوتی ہے ۔ ان مقامات پر جو زیرین منطقہ حارہ (Sub tropical) میں ہیں، جاڑوں میں بارش ہوتی ہے جب پچھم کی ہوا ان سے گزرتی ہے ۔ وہ مقامات جو زیرین منطقہ حارہ کے مشرق میں واقع ہیں وہاں گرمی میں زیادہ بارش ہوتی ہے ۔ منطقہ معتدلہ میں ساحلی مقامات پر بارش زیادہ ہوتی ہے اور میدانی علاقوں میں کم، یہاں بارش گرمی میں زیادہ ہوتی ہے جو ہوا سمندر کی طرف سے چلتی ہے

مانسون کی زمینیں وہی کہلاتی ہیں جہاں سخت گرمی پڑنے کے بعد بارش شروع ہوتی ہے ۔ شروع میں آپ نے بری و بحری باد نسیم کا ذکر کیا ہے، اسے بھی سمجھ لیجیے ۔ دن کے وقت خشکی کا حصہ بہ نسبت سمندر کے زیادہ گرم ہو جاتا ہے اور وہاں کی ہوا زیادہ ہلکی ہو جاتی ہے اس لئے وہ خشکی سے سمندر کی طرف چلتی ہے ۔ اس کا نام بری نسیم ہے رات کے وقت صورت برعکس ہو جاتی ہے یعنی سمندر کی ہوا زیادہ گرم اور ہلکی ہو جاتی ہے اس لئے وہ پانی سے خشکی کی طرف جاتی ہے اور اس کا نام بحری نسیم ہے ۔

مطبوعات موصولہ

اسٹینڈرڈ انگلش اُردو ڈکشنری
The Slandard English-Urdu Dictionary.

یہ وہی لغت ہے جس کا عرصہ سے ملک کو انتظار تھا اور جسکی تکمیل پر انجمن ترقی اُردو یا مولوی عبدالحق صاحب کو جتنی داد دیجائے کم ہے۔ یوں تو انگریزی اُردو کی ڈکشنریاں متعدد پائی جاتی ہیں لیکن وہ یا تو سکول کے چھوٹے بچوں کے لئے کار آمد ہیں یا ان لوگوں کے لئے جو اردو سے واقف نہیں ہیں۔ کوئی ایسا لغت جو مصنفین و مؤلفین کے لئے کار آمد ہوسکتا موجود نہیں تھا۔ انجمن ترقی اُردو کے اس لغت سے اس کمی کو پورا کردیا ہے اور بلا تامل کہا جاسکتا ہے کہ اسوقت تک اس سے زیادہ جامع و مکمل قاموس انگریزی اُردو کا کوئی شایع نہیں ہوا

انگریزی زبان میں اسوقت تک جتنے جدید الفاظ کا اضافہ ہوا ہے وہ سب اس میں موجود ہیں اور اس لئے علوم و فنون کی عام و مشہور اصطلاحات بھی اس میں آگئی ہیں۔ ہر زبان میں ایک ایک لفظ کے معانی موقع و محل کے لحاظ سے مختلف ہوا کرتے ہیں اور انھیں کا سمجھنا زبان جاننا ہے چنانچہ اس لغت میں انگریزی الفاظ کے جتنے مختلف معانی ہوسکتے ہیں وہ سب دیدئے گئے ہیں اور ان میں باہمد گر جو نازک فرق پایا جاتا ہے اس کو مثالوں کے ذریعہ سے واضح کردیا گیا ہے۔ ایک اور خصوصیت اس لغت کی یہ ہے کہ انگریزی لفظ اور محاورہ کے لئے ایسا اُردو لفظ یا محاورہ استعمال کیا گیا ہے جو مفہوم کو صحیح طور پر ادا کرسکے، چنانچہ اس غرض کیلئے تمام اُردو ادب، بول چال کی زبان اور پیشہ وروں کی اصطلاحات سے مدد لی گئی ہے۔ علاوہ اس کے ایسے الفاظ کے لئے جن کا مفہوم ادا کرنے کے لئے کوئی لفظ اُردو میں موجود نہ تھا، نئے مفرد و مرکب الفاظ وضع کئے گئے ہیں جو بہت موزوں ہیں۔

یہ لغت انگریزی کے مشہور لغت آکسفورڈ ڈکشنری کو سامنے رکھ کر مرتب کیا گیا ہے اور اس ڈکشنری کا ہر لفظ خواہ مفرد ہو یا مرکب اس میں موجود ہے۔ اس لغت کو ایک کمیٹی نے مرتب کیا ہے اور اس کی ترتیب و تہذیب مولوی عبدالحق صاحب نے کی ہے۔ کاغذ نہایت قیمتی استعمال کیا گیا ہے جسے بائبل پیپر کہتے ہیں، ٹائپ کی چھپائی انگریزی اُردو کی بہت صاف و روشن ہے۔ جلد بھی نہایت خوشنما و مضبوط ہے ۔۔ مولوی عبدالحق صاحب نے ابتدا میں ایک دیباچہ کے ذریعہ سے ان تمام خصوصیات کو ظاہر بھی کردیا ہے جو اس لغت میں پائے جاتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ اس کی اشاعت میں غیر معمولی تاخیر ہوئی لیکن اب جو اشاعت کے بعد ہم اس لغت کی خصوصیات پر نگاہ ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ تعویق بالکل درست تھی

اس کی قیمت سولہ روپیہ ملک کی اقتصادی حالت کو دیکھتے ہوئے ضرور زیادہ ہے، کیا اچھا ہوتا اگر بالاقساط خریداری کا بھی انتظام کردیا جاتا۔

انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد دکن سے خط و کتابت کی جائے

بھولی ہوئی باتیں

وہ دامنِ کہسار کے پُرکیف نظارے
سینے سے چٹانوں کے وہ پھوٹے ہوئے دھارے
مہتاب کی کرنوں کے وہ خاموش فسانے
وہ نیچی نگاہوں کے پُراسرار اشارے
وہ تشنگیِ دل، وہ تقاضائے نظر...
[illegible] سرشاریاں چشمے کے کنارے
وہ تیری نگاہوں سے محبت کا ترشح
جذبات کی موجوں میں جوانی کے شرارے
وہ راستہ ہموار نہ ہونے کی شکایت
وہ بیٹھ کے تھک کر مرے بازو کے سہارے
آہٹ سے وہ پتوں کی ترا چونکنا جیسے
بندوق کی آواز سے ڈر جائیں چکارے

ہم عشق کی آغوش میں جب محو تھے باہم
خاتون! تجھے یاد ہے وہ وقت، وہ عالم؟

وہ مجھ کو ترا ازسرِ نو ہوش میں لانا
دانستہ ترا دوش سے آنچل کو گرانا
وہ آنکھ بچا کر تری برجستہ شرارت
وہ کنج میں چھپ کر مجھے سایوں سے ڈرانا
وہ میری نگاہوں میں فرشتوں کا تقدس
وہ تیرے لبِ ناز پہ حورول کا ترانا
وہ ڈوبی ہوئی کیفِ محبت میں جوانی
مجروح وہ ٹھوکر سے تری فرقِ زمانا
وادی میں درختوں سے الجھتا ہوا بادل
وہ جھیل کی موجوں پہ ترا تان اڑانا

ہم عشق کی آغوش میں جب محو تھے باہم
خاتون! تجھے یاد ہے وہ وقت، وہ عالم؟

فضل الدین اثر ایم۔ اے

غزل

سیماب اکبرآبادی

طولِ رہِ حیات سے گھبرا رہا ہوں میں
گھبرا رہا ہوں اور چلا جا رہا ہوں میں

چھوتی نہیں ہے مجھ سے پرِ جبریل کی ہوا
یہ کن بلندیوں پہ اُڑا جا رہا ہوں میں

تیری صدا یہ کان، زباں تیری ترجمان
جو گیت سن رہا ہوں وہی گا رہا ہوں میں

کچھ یوں بھی ہے کہ فطرتِ غم ہے سکوں پسند
کچھ یہ بھی ہے کہ ضبط کئے جا رہا ہوں میں

آ، اور دیکھ محویت، بیخودی مری
تجھ سے بھی بے نیاز ہوا جا رہا ہوں میں

منظور ہے مجھے کششِ حسن کی شکست
لے آج تجھ میں جذب ہوا جا رہا ہوں میں

اُٹھتا ہوں میکدے سے اگر آج پی کے بھی
جام و شراب کو بھی لئے جا رہا ہوں میں

کیوں میرے ترکِ بادہ پہ تجھ کو یقیں نہیں
ساقی ترے لبوں کی قسم کھا رہا ہوں میں

سیماب کس نے عرش سے آواز دی مجھے؟
کہہ دو کہ انتظار کرے، آ رہا ہوں میں

اُسے نہ صرف قدما کے کلام پر عبور حاصل تھا بلکہ خود بھی نہایت پاکیزہ شعر کہتا۔ فنِ طب کا ایسا مجتہدانہ ذوق رکھتا تھا کہ خود مریضوں کا علاج کرتا۔ فنِ کتابت میں ایسا ملکہ اُسے حاصل تھا کہ بڑے بڑے خوشنویس اس سے شرماتے تھے۔ مذہب کا حد درجہ احترام کرتا اور فرائض کے علاوہ نوافل و مستحبات بھی کبھی اس سے ترک نہ ہوتے تھے۔ شراب کو اس نے کبھی منہ نہیں لگایا اور دیگر مشاغل لہو ولعب جو امرا و سلاطین کے ساتھ مخصوص ہیں اس نے کبھی اختیار نہیں کئے بخشش وکرم کی یہ کیفیت تھی کہ اگر کسی درویش کو خزانہ بھی اُٹھا کر دیدیتا تو یہی سمجھتا کہ میں نے کچھ نہیں دیا۔ ممکن نہیں تھا کہ کسی بیوہ یا غریب وضعیف کی فریاد اس تک پہونچ جائے اور وہ اُسے مالا مال نہ کردے عراق وخراسان، ماوراءالنہر، و ترکستان، روم وعربستان، کے علماء، فضلاء، ماہرینِ فنون اس کے دربار میں کھنچے ہوئے چلے آرہے تھے اور وہ دونوں ہاتھوں سے زر وجواہر کی بارش ان پر کر رہا تھا

تاتار خاں والی سنارگاؤں کو جب اس نے بہرام خاں کا خطاب دیا تو اس کے ساتھ ایک ہی دن میں سو ہاتھی، ہزار گھوڑے اور ایک کرور تنکۂ سرخ (اشرفی) بھی مرحمت فرمایا

ملک سنجر بدخشانی کو اسی لاکھ تنکہ۔ ملک عماد الدین کو ستر لاکھ تنکہ اور مولانا ظفر الدین اپنے اُستاد کو چالیس لاکھ تنکہ ایک دن میں اُٹھا کر دیدیا۔ اسی طرح مولانا ناصر الدین اور ملک نظامی کو جو ایک فاضل شاعر تھا سالانہ لاکھوں تنکے انعام میں دیدیتا[1]

پھر اس کے ساتھ جرأت وبہادری، علوئے حوصلہ پختگی عزم، رسوخ تدابیر کو بھی شامل کیجئے اور اس کے بعد غور کیجئے کہ ان صفات کا بادشاہ کیا چیز ہوسکتا ہے اور اس کو کتنا کامیاب ہونا چاہئے

صاحب مسالک الابصار[2] نے سراج الدین ابوالفتح عمر (جو اودھ کا رہنے والا اور محمد تغلق کے دربار سے عرصہ تک متعلق رہا تھا) اور شیخ مبارک کی روایت سے مفصل حالات اس عہد کے لکھے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ محمد تغلق کس

---

[1] فرشتہ ۱۳۳ طبقات اکبری ۹۹–۱۰۰ — [2] "مسالک الابصار فی ممالک الامصار" کا مصنف شہاب الدین ابوالعباس احمد دمشقی تھا۔ یہ ۶۹۷ھ/۱۲۹۷ء میں پیدا ہوا اور ۷۴۹ھ/۱۳۴۸ء میں بمقام دمشق مر گیا مصنف نے اپنے اور اپنے خاندان کے حالات بالکل نہیں لکھے، البتہ اتنا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اور اُسکا خاندان سلاطین مصر سے وابستہ تھا اس کا باپ قاضی محی الدین دمشق میں سیغۂ راز کا سکریٹری تھا۔ جب وہ یہاں سے علٰحدہ ہوگیا تو اس کے چند دن بعد اسی خدمت پر مصر میں مامور ہوگیا۔ شہاب الدین دونوں جگہ اپنے باپ کا معاون رہا لیکن آخرکار وہ دمشق چلا آیا اور یہیں اپنی عمر گزار دی

شہاب الدین بڑا فاضل شخص تھا اس نے تمام علوم متداولہ میں تبحر تام حاصل کیا تھا اور بہت سی کتابیں اس نے تصنیف کیں جو آج بالکل مفقود ہیں مسالک الابصار بیس جلدوں میں تمام کی لیکن اب صرف ۵ جلدیں نظر آتی ہیں اور وہ بھی یوروپ کے کتب خانوں میں۔ ہندوستان میں اسکا کوئی نسخہ موجود نہیں ہے — شہاب الدین نے عہد محمد تغلق کے حالات نہایت معتبر ذرایع سے فراہم کرکے لکھے ہیں اور تحقیق وجستجو اس کی تمام تصانیف کی خصوصیت بتائی جاتی ہے مصنف نزہت القلوب نے بھی اپنی تصنیف میں شہاب الدین کی تصانیف کا حوالہ دیا ہے

آبادی کی ہر جماعت کے لئے خاص اصول

شوکت وجبروت کا بادشاہ تھا اس کے دربار کا کیا آئین تھا اور اس کے زمانہ میں دہلی اور دیوگیر (دولت آباد) کی رونق کا کیا عالم تھا۔ دولت آباد کا نام اس نے قبۃ الاسلام رکھا تھا اور کثرت سے عمارتیں بنوا کر مخصوص جماعتوں کے قیام کے لئے شہر کو وقف کر دیا تھا۔ علماء، فقراء، مشائخ، امراء، ملوک، خواتین، فوج، وزراء، تجار، پیشہ ور لوگ، انگریزی، بنجار، حداد وغیرہ کے لئے الگ الگ محلے مقرر کئے اور وہاں ان کے لئے مسجدیں، بازار، حمام، چکیاں، اور ضرورت کی تمام عمارتیں قائم کرادیں۔ ہر محلہ گویا ایک مستقل قصبہ تھا اور اپنی ضروریات کے لحاظ سے دوسرے محلہ کا محتاج نہ تھا

دہلی کا یہ حال تھا کہ یہاں چھوٹے بڑے مدارس ایک ہزار کے قریب تھے، اور ستر ہسپتال (دار الشفاء) تھے جن میں غرباً کا علاج ہوتا تھا ... مسجدیں تھیں اور خانقاہوں اور حماموں کا کوئی شمار نہ تھا کنوئیں کثرت سے موجود تھے

افسران سلطنت کی تقسیم

افسران ریاست درجہ بدرجہ خان، ملک، امیر، سپہ سالار اور جند کہلاتے تھے۔ اور سواروں کی تعداد نو لاکھ تھی جن میں ترک، ایرانی اور ہندوستانی لوگ شامل تھے ان کے گھوڑے عمدہ، وردی نفیس، اور اسلحہ کی حالت بغایت پسندیدہ تھی)۔

ایک خان کی ماتحتی میں دس ہزار سوار اور ایک ملک کی ماتحتی میں ایک ہزار سوار ہوتے تھے۔ امیر سو سواروں کے دستہ کا افسر تھا اور سپہ سالار اس سے کم درجہ کا۔ سپہ سالار بادشاہ کی حضوری میں نہیں جا سکتا تھا۔ ان کی تنخواہوں کے عوض میں جاگیریں مقرر تھیں جن میں کبھی کمی نہ ہوتی تھی۔ ہر خان کو دو لاکھ تنکہ (ہر تنکہ آٹھ درم کے برابر) ہر ملک کو پچاس اور ساٹھ ہزار تنکہ کے درمیان ہر امیر کو تیس اور چالیس ہزار تنکہ کے درمیان اور سپہ سالار کے بیس ہزار تنکہ کی جاگیر اس کے ذاتی مصارف کے لئے مقرر تھی۔ سپاہیوں اور مملوکوں کی تنخواہ علاوہ خوراک، لباس اور مصارف اسپ کے ۔۔ دس تنکہ مقرر تھی، جو خزانہ شاہی سے نقد ملتی تھی

غلاموں کو دس تنکہ ماہوار تنخواہ دیجاتی تھی اور چار جوڑے کپڑے ہر سال مرحمت ہوتے۔ اس کے علاوہ ماہوار دو من گیہوں اور چاول اور روزانہ تین سیر گوشت معہ ضروری سامان گھی اور مسالہ وغیرہ کے ہر غلام کے لئے مقرر تھا

پارچہ بافی کا ذاتی کارخانہ، خلعتوں کی تقسیم

سلطان کا ایک ذاتی کارخانہ کپڑا بننے کا تھا جس میں چار سو آدمی ہر قسم کا ریشمی کپڑا بُنا کرتے تھے۔ اس کارخانہ میں جو کپڑے طیار ہوتے، ان سے خلعت وغیرہ بھی طیار کئے جاتے۔ سلطان ہر سال موسم بہار میں ایک لاکھ اور موسم خزاں میں ایک لاکھ خلعت تقسیم کرتا۔ موسم بہار کی خلعتیں اسکندریہ کے ریشمی کپڑوں کی ہوتیں اور موسم خزاں کے خلعت دہلی یا چین وعراق کے کپڑے کی طیار کیجاتیں۔ خلعتیں، خانقاہوں میں مشائخ وعلماء وغیرہ کو بھی تقسیم کی جاتی تھیں

سلطان کے ۵۰۰ ذاتی کارخانے

صرف سلطان کے ذاتی کارخانے زردوزی اور کارچوب کے ۵۰۰ تھے جن میں خواتین حرم و دیگر معزز خواتین کے لئے ہر وقت کام ہوتا رہتا تھا

سلطان ہر سال دس ہزار عرب گھوڑے نہایت اچھی نسل کے معہ ساز و یراق کے امراء کو تقسیم کرتا تھا اور معمولی گھوڑوں کا تو کوئی شمار نہ تھا

سلطان کا ایک نائب بھی ہوتا تھا جو خوانین سے منتخب کیا جاتا تھا۔ اس کی جاگیر کا رقبہ صوبہ عراق سے کم نہ تھا۔ اسی طرح ایک وزیر بھی ہوتا تھا وزیر کی ماتحتی میں چار اس کے معاون ہوتے تھے۔ جن کی جاگیریں بیس ہزار اور چالیس ہزار تنکہ کے درمیان ہوتی تھی۔ علاوہ ان کے چار دبیر (یا میر منشی) بھی ہوتے تھے۔ بعض محرروں کی جاگیریں تھی اور نقد تنخواہ بھی

ایک عہدہ قاضی القضاۃ کا بھی ہوتا تھا جسے صدر جہاںؔ اور صدر اسلام بھی کہتے تھے۔ اس کی جاگیر میں دس قصبات ہوتے تھے جن کی آمدنی ساٹھ ہزار تنکہ سے کم نہ ہوتی تھی۔ ایک شخص شیخ الاسلام بھی ہوتا تھا اور اس کی جاگیر بھی اسی قدر ہوتی تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ صدر جہاں کا کام مقدمات کی سماعت اور احکام سزا وغیرہ دینا تھا، اور شیخ الاسلام صرف قاضی تھا جو شرع کے مطابق مسائل عامہ طے کیا کرتا تھا۔ ایک عہدہ محتسب (کوتوال) کا بھی تھا اس کی تنخواہ ۸۰۰ تنکہ تھی۔ سلطان کے دربار میں ۱۲۰۰ طبیب تھے اور دس ہزار شکاری جو گھوڑوں پر سوار ہو کر ہاتھوں پر باز اور شاہین بٹھائے ہوئے نکلتے تھے۔ ۳۰۰۰ ہانکا کرنے والے بھی نوکر تھے اور علاوہ ان کے تین ہزار ایسے لوگ بھی تھے جو اس شکار کے تمام اور ضروریات کو مہیا کرتے تھے

سلطان کے دسترخوان پر ۲۰۰ امرا کھانے میں شریک ہوتے، اور ۱۲۰۰ مغنی ہر وقت حاضر رہتے اس میں ان ایک ہزار مغنیوں کی تعداد شامل نہیں ہے جو موسیقی کی تعلیم دینے کے لئے قصر شاہی کے اندر رہتے تھے ایک ہزار شاعر بھی دربار سے متعلق تھے جن میں سے بعض عربی بعض فارسی اور بعض ہندی زبان میں شاعری کرتے۔ ان مغنیوں اور شعراء میں بعض کی بڑی بڑی جاگیریں مقرر تھیں، اور بعض نقد تنخواہیں بیس ہزار سے ۴۰ ہزار تنکہ تک پاتے تھے۔ انعام و اکرام اس کے علاوہ تھا

شیخ مبارک کا بیان ہے کہ سلطان روزانہ صبح و شام دربار کرتا تھا اور اس کے بعد کھانا ہوتا تھا جس میں بیس ہزار خواتین و ملوک، امراء و اراکین شامل ہوتے تھے خاص بادشاہ کے دسترخوان پر بڑے بڑے علماء (جن کی تعداد ۲۰۰ تھی) بیٹھتے تھے اور بادشاہ کھانے کے دوران میں ان سے علمی مباحث پر گفتگو کیا کرتا تھا

شیخ ابوبکر بن خلال کا بیان ہے کہ شاہی مطبخ کے لئے روزانہ ۲۵۰۰ بیل یا گائے اور ۲۰۰۰ بکریاں ذبح ہوتی تھیں چڑیوں کا تو کوئی شمار نہ تھا

فوج اور رعایا کا انتظام نائب السلطان کے سپرد تھا۔ علماء و فقہا، ہندی ہوں یا اجنبی سب کا تعلق صدر جہاں سے تھا۔ اسی طرح مشائخ و فقراء کا معاملہ شیخ الاسلام کی وساطت سے طے ہوتا تھا۔ سیاحین و سفراء۔ شعراء و دیگر اہل کمال دبیروں (سکریٹریوں) سے متعلق تھے

صدر جہاں اور شیخ الاسلام کے فرائض

مطبخ کے مصارف

لہ جس زمانہ کا ذکر صاحب مسالک الابصار نے لکھا ہے اس وقت کمال الدین ابن برہان الدین اس عہدہ پر ممتاز تھا

جب بادشاہ شکار کو جاتا تو ایک لاکھ سوار اور ۲۰۰ ہاتھی اس کے جلو میں ہوتے۔ لکڑی کے سفری مکان دو دو منزل کے ساتھ ہوتے جنھیں دو سو اونٹ کھینچتے۔ خیمے اور قناتیں وغیرہ بھی کثرت سے ساتھ ہوتیں

جب بادشاہ ایک مقام سے کسی دوسرے مقام پر کسی غرض سے سفر کرتا تو تیس ہزار سوار ۲۰۰ ہاتھی اور ایک ہزار کوتل گھوڑے جو اسپ کار ساز و یراق سے آراستہ ہمراہ ہوتے

بادشاہ بہت منکسر مزاج تھا۔ ابو الصفا عمر بن اسحاق کا بیان ہے کہ خود اس نے بادشاہ کو ایک فقیر کے جنازہ کو کاندھا دیتے ہوئے دیکھا تھا وہ کلام مجید کا حافظ تھا اور شرعِ حنفی کی تمام کتابوں پر اس کو پورا عبور تھا۔ وہ علما کبار سے برابر مسائل علمیہ میں مباحثہ کرتا شعر و شاعری میں حد درجہ پاکیزہ مذاق رکھتا اور فن کتابت کا زبردست ماہر تھا

شراب کا رواج کہیں نہ تھا۔ بادشاہ کو اس سے سخت نفرت تھی اور یہ ممکن نہ تھا کہ کوئی شخص ایک قطرہ شراب کا اپنے مکان میں رکھ لے۔ پان کا رواج عام تھا اور اس کی ممانعت بھی نہ تھی

خبر رسانی کا انتظام بھی سلطان نے نہایت مکمل کیا تھا علاوہ جاسوسوں کے، ڈاک کی آمد و روانگی کے لئے ہرکارے بھی مقرر تھے ہر محکمہ میں شاہی جاسوس ہوا کرتے تھے اور وہاں کی خبریں اپنے افسران کے ذریعہ سے بادشاہ پہونچاتے تھے۔ دور دراز مقامات کے حالات ڈاک کے ذریعہ سے پہونچتے تھے اس کا انتظام اس طور پر تھا کہ سڑکوں پر چار تیر کی مسافت سے چوکیاں بنی ہوئی تھیں، ہر چوکی پر دس ہرکارے متعین تھے جن کا فرض تھا کہ وہ ڈاک کو ہر ممکن سرعت کے ساتھ اگلی چوکی تک پہونچا دیں اس صورت سے ڈاک ادھر سے اُدھر بہت جلد پہونچ جاتی تھی۔ ہر چوکی پر ایک مسجد تعمیر کی گئی تھی جہاں مسافر قیام کرتے، نمازیں ادا کرتے اور شیریں پانی کے لبریز حوضوں سے اپنی تشنگی رفع کرتے۔ اسی طرح ہر چوکی کے پاس ایک بازار بھی تھا جس میں تمام ضروری اشیا غذا کی ملتی تھیں اور جانوروں کی بھی خرید و فروخت ہوتی تھی۔ دہلی اور دولت آباد کے درمیان ہر چوکی پر ایک نقارہ بھی رکھا رہتا اور کسی خاص امر کے وقوع پر وہ بجایا جاتا اس سے یہ فائدہ تھا کہ بادشاہ دہلی میں ہو یا دولت آباد میں اس کو دوسرے شہر کے تمام واقعات کی اطلاع فوراً ہو جاتی۔

ابن بطوطہ نے اپنے سفرنامہ میں زیادہ تفصیل کے ساتھ ڈاک کی انتظامی حالت بیان کی ہے وہ لکھتا ہے کہ "اُس وقت ڈاک دو قسم کی تھیں ایک، برید الخیل (گھوڑے کی ڈاک) دوسرے، برید الرجال (قاصدوں یا ہرکاروں کی ڈاک) ہر میل کے اندر تین چوکیاں ڈاک کی ہوتی ہیں۔ یہاں ہرکارے متعین ہوتے ہیں۔ جس وقت کسی ہرکارے کے پاس ڈاک پہونچتی ہے وہ فوراً اپنی کمر کستا ہے اور ایک ہاتھ میں ڈاک اور دوسرے میں گھونگرو دار چابک لئے ہوئے جسے وہ راستہ بھر بجاتا جاتا ہے، دوسری چوکی کی طرف روانہ ہوتا ہے اسی طرح وہاں کا ہرکارہ آگے لیجاتا ہے

اسی ڈاک کے ذریعہ سے خراسان کے میوے، طباقوں کے اندر سربمُہر روزانہ بادشاہ کے پاس پہونچتے تھے، اور گنگا کا پانی بھی چالیس دن کے راستے سے شاہی استعمال کے لئے اسی ذریعہ سے روزانہ پہونچتا تھا

شراب کی ممانعت

ڈاک اور خبر رسانی کا انتظام

ڈاک کے ذریعہ سے خراسان کے میووں کا آنا

جب کوئی اجنبی ہندوستان آتا تو انھیں ہرکاروں کے ذریعہ سے بادشاہ کو فوراً معلوم ہو جاتا کہ فلاں شخص اس شکل وحلیہ اس صورت ولباس کا فلاں مقام پر آیا ہے اور اس کے متعلق مناسب احکام صادر کئے جاتے۔ خاص خاص قیدی بھی ڈاک ہی کے ذریعہ سے بادشاہ تک پہونچائے جاتے تھے

طلائی تنکہ کو تنکۂ سرخ کہتے تھے جس کا وزن تین مثقال کا تھا۔ نقرئی تنکہ کی قیمت ۸ درہم ہشت کانی تھی اور درہم ہشت کانی کا وہی وزن تھا جو اسوقت مصروشام کے ایک نقرئی درہم کا ہوتا تھا

ایک درہم ہشت کانی، چار درہم سلطانی کے برابر سمجھا جاتا تھا جنھیں دوکانی بھی کہتے تھے۔ ایک سکہ نصف درہم سلطانی کا بھی تھا جس کو یکانی کہتے تھے اور اس کی قیمت ایک جیتل تھی۔ ایک درہم کا نام دوازدہ کانی بھی تھا جو ڈیڑھ ہشت کانی کے برابر تھا۔ ایک سکہ شانزدہ کانی بھی تھا جس کی قیمت دو درہم کے برابر تھی کل چھ نقرئی سکے اسوقت رائج تھے۔ شانزدہ کانی دوازدہ کانی، ہشتکانی، ششش کانی، سلطانی، اور یکانی۔ درہم سلطانی ۸ فلوس (پیسوں) کے برابر تھا اور جیتل چار فلوس کے برابر۔ درہم ہشتکانی کے ۳۲ فلوس ملتے تھے۔ سیر ستر مثقال کا تھا اور ایک من چالیس سیر کا ہوتا تھا

ایک من گیہوں ڈیڑھ ہشتکانی میں ملتا تھا، ایک من جو ایک درہم میں، چاول ایک درہم میں ۱۲ من مٹر اور چنا ایک درہم ہشتکانی میں دو من ملتا تھا۔ گوشت بکری کا ایک درہم سلطانی میں ۶ سیر ملتا تھا۔ بڑی بط دو درہم ہشتکانی میں ملتی تھی اور ایک ہشتکانی کی چار مرغیاں فروخت ہوتی تھیں شکر ایک ہشتکانی میں ۵ سیر ملتی تھی اور نہایت نفیس اور فربہ بھیڑ ایک تنکہ میں۔ اسی طرح ایک عمدہ بیل دو تنکہ میں فروخت ہوتا تھا[1]

ابن بطوطہ نے جو حالات دربار وغیرہ کے لکھے ہیں وہ بھی نہایت دلچسپ ہیں اس لئے مختصر الفاظ میں ان کا اظہار یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے، لکھتا ہے کہ:۔

"سلطان نے جو قصر دہلی میں تعمیر کرایا ہے اس کا نام ہزار ستون ہے اور اس میں متعدد دروازے ہیں پہلے دروازہ پر محافظ فوج کا ایک دستہ ہر وقت متعین رہتا ہے اور نقارے، نفیریاں، اور قرنا وغیرہ بھی موجود رہتے ہیں جو امرا و کبار کی آمد پر بجائے جاتے ہیں۔ یہی حال دوسرے اور تیسرے دروازہ کا ہے آخری دروازہ کے بعد قصر ہزار ستون[2] ملتا ہے جہاں بادشاہ لوگوں سے ملاقات کرتا ہے۔ نقیبوں کے سر پر زریں دستار، کمر میں پٹکا، ہاتھ میں طلائی یا نقرئی دستہ کا کوڑا رکھنا ضروری ہے۔ نقیب اعظم کے ہاتھ میں سونے کی جریب ہوتی ہے اور سر پر زریں کلاہ جس میں جواہر جگمگاتے رہتے ہیں

دربار کی نشست اکثر عصر کے بعد ہوتی ہے۔ ایک چبوترہ پر سفید فرش بچھا کر اس پر شاہی تخت رکھا جاتا ہے،

---

[1] یہ تمام حالات سوائے ان بیانات کے جہاں ابن بطوطہ کی صراحت کر دیگئی ہے مسالک الابصار (الیٹ) جلد سوم صفحہ ۵۸۲ - ۵۸۴ سے ماخوذ ہیں۔

[2] قصر ہزار ستون کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ اس میں ایک ہزار چوبی ستون لگے ہوئے تھے اس قصر کی چھت بھی لکڑی کی تھی

جب بادشاہ برآمد ہوکر اپنی نشست پر جاتا ہے تو تمام نقیب اور حاجب باآواز بلند بسم اللہ کہتے ہیں اور ملک کبیر جنوز لے کر کھڑا ہوجاتا ہے۔ سلطان کے داہنے اور بائیں جانب سو سو مسلح سپاہی کھڑے ہوتے ہیں جن کے ہاتھوں میں تلواریں اور شانوں پر کمانیں ہوتی ہیں تمام امراء درجہ بدرجہ بٹھائے جاتے ہیں۔ یہاں ساٹھ کوتل گھوڑے بھی جواہر کار ساز ویراق کے ساتھ رہتے ہیں۔ گھوڑوں کے بعد پچاس ہاتھی کھڑے ہوتے ہیں ان کی جھولیں حریر کی ہوتی ہیں جن پر زردوزی کا کام ہوتا ہے اور ان کے دانتوں پر لوہے کا خول چڑھا رہتا ہے۔ ان ہاتھیوں پر ہودہ ہوتا اور ہر ہودہ پر چار علم بھی ہوتے ہیں

عید کی صبح کو ہاتھی آراستہ کئے جاتے ہیں اور ان پر جواہر کار زردوزی کی جھولیں ڈالی جاتی ہیں، سولہ ہاتھی بادشاہ کی سواری کے لئے مخصوص ہیں جن پر مرصع چھتر ہوتے ہیں، چھتر کی ڈنڈی خالص سونے کی ہوتی ہے۔ بادشاہ جس ہاتھی پر سوار ہوتا ہے اس کی مستک پر ایک روشن ستارہ جواہرات کا لگا دیا جاتا ہے، اس ہاتھی کے آگے غلاموں کی قطار ہوتی ہے جن کے سروں پر سونے کی کلغیاں ہوتی ہیں اور کمر میں جواہر کار پٹکے۔ ان کے آگے ۳۰۰ نقیب ہوتے ہیں جو سر سے پاؤں تک زرہ جواہر سے لدے رہتے۔ ان کے آگے امراء ہاتھیوں اور گھوڑوں پر سوار ہوتے ہیں اور پھر فوج اور ماہی مراتب عید گاہ کے دروازہ پر پہونچ کر ٹھہر جاتا ہے اور جب تمام علماء و امراء اندر چلے جاتے ہیں تو پھر خود ہاتھی سے اتر کر اندر جاتا اور نماز سے فارغ ہوکر اونٹ کی قربانی کرتا ہے

عید کے دربار میں حد درجہ تزک و احتشام سے کام لیا جاتا جس کا بیان ابن بطوطہ نے نہایت تفصیل سے کیا ہے لیکن ہم اس کا ذکر یہاں نہیں کرتے بیان ماسبق سے اس کی شان و شوکت کا اندازہ ہوسکتا ہے

سفر سے واپسی

جب بادشاہ کسی سفر سے واپس آتا تو ہاتھی آراستہ کئے جاتے اور ۱۶ ہاتھیوں پر جواہر کار ہودے رکھے جاتے، ہر ایک کی مستک پر ایک ستارہ لگایا جاتا جس میں موتی و الماس ٹنکے ہوتے۔ علاوہ ان کے کئی کئی منزل کے چوبی قبے بنائے جاتے اور ان پر ریشمی کپڑا لپیٹ دیا جاتا۔ ان قبوں کی ہر منزل میں خوبصورت کنیزیں پر تکلف لباس اور قیمتی زیور پہنے ہوئے نغمہ و رقص میں مصروف نظر آتیں۔ راستہ میں تمام ریشمی فرش ہوتا اور اس پر سے سلطان کی سواری گزرتی۔ شہر کے دروازہ سے لیکر قصر کے دروازہ تک راستے آراستہ کئے جاتے اور اُن پر بھی ریشمی فرش کیا جاتا۔ بادشاہ کے آگے ہزار غلام ہوتے اور پیچھے فوج کے دستے۔ بادشاہ جس وقت شہر کے اندر داخل ہوتا تو دینار و درم کی بارش ہونے لگتی تھی، غرباء انھیں لوٹتے تھے اور سلطان اسی حال میں قصر کے اندر داخل ہوجاتا

طریق طعام

طریق طعام یہ تھا کہ جب مطبخ سے کھانا چلتا تو نقیب باآواز بلند بسم اللہ کہتے ہوئے آگے ہوتے جب کھانا بادشاہ کے قریب پہونچ جاتا تو سوائے بادشاہ کے سب کھڑے ہوجاتے اور کھانا فرش پر چُنا جاتا اس کے بعد نقیب اعظم، بادشاہ کی مدح و تعریف کرتا اور تمام نقیب بادشاہ کو مجرا کرکے ہٹ جاتے پھر بادشاہ کے سامنے تمام حاضرین کی فہرست پڑھی جاتی اور اس کے بعد کھانا کھایا جاتا۔ صدر دسترخوان پر فقہاء، علماء، یا قضاۃ و مشایخ، ہوتے اس کے بعد بادشاہ کے

اقارب و امرا و کبار اور پھر تمام آدمی اپنی اپنی معین جگہ پر بیٹھ جاتے۔ اس کے بعد شراب دار سونے چاندی کے برتن لئے ہوئے آتے جن میں مصری کا شربت ہوتا، پہلے یہ پی لیا جاتا اس کے بعد کھانا شروع کیا جاتا۔ فراغتِ طعام کے بعد جو اور مویز کا افشردہ پینے کو دیا جاتا اور پھر ریشمی تاگے سے بندھی ہوئی پان کی گلوریاں تقسیم ہوتیں

عدل و انصاف

سلطان عدل و انصاف کے معاملہ میں بہت سخت تھے کہ وہ اپنے وجود کو بھی اس سے مستثنیٰ نہ سمجھتا تھا۔ ایک بار کسی ہندو امیر نے قاضی کے یہاں نالش کی کہ سلطان نے اس کے بھائی کو بے سبب قتل کر ڈالا ہے۔ قاضی نے سلطان کو طلب کیا چنانچہ یہ گیا اور قاضی کو سلام کرکے کھڑا ہو گیا۔ جب قاضی نے بیٹھنے کی اجازت دی تو بیٹھا اور اسوقت تک عدالت سے باہر نہ گیا جب تک مدعی راضی نہیں ہو گیا[1]

ان تمام بیانات سے یہ امر بخوبی ثابت ہوتا ہے کہ محمد تغلق اپنی صفات کے لحاظ سے ایک بے مثل حکمراں تھا، عزم و استقلال، سطوت و جبروت، بذل و کرم، زہد و اتقا، شجاعت و بسالت، اس میں بدرجۂ اتم پائی جاتی تھیں۔ وہ خود تمام اُمور کا انتظام کرتا، قوانین نافذ کرتا اور خود اپنے کو بھی اس سے مستثنیٰ نہ سمجھتا، خود میدان جنگ میں فوج کے ساتھ جاتا اور دشمن کا مقابلہ کرتا لیکن باوجود ان تمام باتوں کے وہ کامیاب بادشاہ ثابت نہ ہوا اور تمام صوبے اس کے آخر عہد میں خود مختار ہو گئے

وسعتِ فتوحات

تخت نشین ہوتے ہی وہ ایک سیلاب کی طرح تمام دور دراز علاقوں پر چھا گیا اور سلسلۂ فتوحات شروع ہوا تو گجرات، مالوہ، تلنگانہ، جھجر، دور سمندر، لکھنوتی، (بنگال) سٹگاؤں (چٹگام) کرناٹک وغیرہ یکے بعد دیگرے اس کے قبضے میں آ گئے[2]۔ لیکن یہ بھی ایک تلخ حقیقت ہے کہ اس کی حکومت میں کثرت سے بغاوتیں رونما ہوئیں

انتشارِ سلطنت

اس کی وہی رعایا جس پر وہ اپنی دولت بیدریغ صرف کیا کرتا تھا اس سے متنفر ہو گئی، تمام دور دراز کے صوبے سوائے گجرات کے خود مختار ہو گئے۔ یہاں تک کہ جب ۲۷ سال کے بعد وہ ساحلِ سندھ پر دم توڑ رہا تھا تو اس کی ساری سلطنت میں شورش برپا تھی اور ہنگامہ و بغاوت سے سارا نظام حکومت متزلزل ہو رہا تھا

جب ہم اس کے اسباب پر غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ محمد تغلق کی انھیں صفاتِ حسنہ میں بعض صفات نے اک معیوب صورت اختیار کر لی تھی اور چونکہ ان میں حد سے زیادہ غلو ہو گیا تھا اس لئے چند در چند خرابیاں انسے پیدا

---

[1] ابن بطوطہ (تاریخ ہندوستان مولوی ذکاء اللہ) ۱۴۷ - ۱۵۰

[2] صاحب مسالک الابصار نے حسب روایت سراج الدین ابوالفتح عمر مقبوضات محمد تغلق کی یہ فہرست پیش کی ہے۔ دہلی، دیوگر دولت آباد ملتان، کہرام، سامانہ، سوستان، اوچ، ہانسی، سرستی، معبر، تلنگانہ، گجرات، بدایوں، اودھ، قنوج، لکھنوتی، بہار، کڑہ، مالوہ، لاہور، کلانور، جاجنگر، دور سمندر

ہوئیں اور بڑھتی رہیں

اقتصادی اسباب

یہ ہم بیان کر چکے ہیں کہ وہ حد درجہ بلند حوصلہ اور بے انتہا فیاض تھا اور غالباً یہی دو سبب ایسے تھے جو محمد تغلق کے لئے سب سے زیادہ مضر ثابت ہوئے

یہ بالکل صحیح ہے کہ جس وقت غیاث الدین تغلق کا انتقال ہوا تو خزانہ شاہی معمور تھا، اور سلطنت کی حالت نہایت اچھی تھی، لیکن اس میں بھی کلام نہیں کہ محمد تغلق کے عزائم اور جذبات بذل و عطا، کو دیکھتے ہوئے خزانہ اور حکومت کی تمام موجودات بہت کم تھیں۔ محمد تغلق نے تخت نشین ہوتے ہی، جو نصب العین مقرر کیا وہ یہ تھا کہ ساری دنیا اسکے قبضہ میں چلی آئے اور لوگوں کو اتنی دولت تقسیم کردے کہ کوئی شخص محتاج و غریب نہ رہے۔ چنانچہ اس نے بیدریغ دولت لٹانی شروع کردی اور تسخیر ایران[1] و چین[2] کے لئے کثیر افواج فراہم کرکے اور بھی خزانہ کو خالی کردیا چونکہ روپیہ برابر صرف ہو رہا تھا اور آمدنی کم تھی، اس لئے محمد تغلق نے اس کے لئے دو تدبیریں اختیار کیں ایک یہ کہ دوآبہ کے خراج میں دہ فیصدی اور اضافہ کردیا اور دوسرے یہ کہ بجائے نقرئی و طلائی تنکہ کے تانبہ کا سکہ جاری کیا۔ اس کی یہ دونوں تدبیریں کامیاب نہ ہوئیں۔ کیونکہ اضافۂ خراج سے رعایا سخت بددل ہوگئی اور کاشتکاروں نے کاشت چھوڑ دی۔ بادشاہ نے نہایت سختی سے خراج وصول کرنے کا حکم دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عمال نے بے انتہا تشدد سے کام لے کر خراج وصول کرنا شروع کردیا اور رعایا بھاگ نکلی، گاؤں ویران ہوگئے زراعت بالکل مسدود ہوگئی اور سارا ملک تباہ ہوگیا۔ اتفاق سے اسی وقت

---

[1] شاہزادہ چغتائی کا داماد بہت سے امراء عراق و خراسان کے ساتھ ہندوستان آیا اور محمد تغلق کا ملازم ہوگیا۔ ان لوگوں نے بادشاہ کو تسخیر ایران و توران کے لئے آمادہ کیا، چونکہ محمد تغلق خود فتوحات کو وسیع کرنا چاہتا تھا اس لئے اس تجویز کو بہت پسند کیا اور ان لوگوں کے تالیف قلوب میں بے شمار دولت صرف کرنے لگا اسی کے ساتھ چونکہ اس مہم میں علاوہ مستقل فوج کے عارضی سپاہ کی بھی ضرورت تھی اس لئے تین لاکھ ستر ہزار سپاہ اور فراہم کی گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایران و توران کی تسخیر کی نوبت تو آئی نہیں لیکن اس عارضی سپاہ اور ان امراء ایران پر سارا خزانہ صرف ہوگیا

[2] بادشاہ نے ارادہ کیا کہ کوہ ہمالیہ کی طرف سے چین پر حملہ کرے چنانچہ ۷۳۸ھ ۱۳۳۷ء میں ایک لاکھ سوار اپنے بھانجے خسرو ملک کی ماتحتی میں دئے اور حکم دیا کہ پہلے کوہستان ہمالیہ پر قبضہ کیا جائے اور اس کے بعد سرحد چین میں پیشقدمی کی جائے۔ ہر چند امراء دربار اور خود ملک خسرو اس مہم کے خلاف تھے لیکن بادشاہ کی مخالفت نہ کرسکتے تھے اس لئے فوج روانہ ہوئی جب سرحد چین میں پہونچے تو معلوم ہوا کہ آگے بڑھنا سخت دشوار ہے کیونکہ کوہستانی راستے نہایت تنگ و دشوار گذار ہیں، سامان رسد بالکل فراہم نہیں ہوسکتا اور علاوہ اس کے اجنبی ملک کی راہیں بھی معلوم نہیں ہیں۔ پھر اس پر قیامت یہ ہوئی کہ بارش شروع ہوگئی اور چاروں طرف سے کوہستانی سیلاب نے اس فوج کو گھیر لیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ چینی فوج نے ان کو سخت نقصان پہونچایا اور سوائے چند نفوس کے اور کوئی زندہ نہ بچا۔ اس مہم میں بھی خزانہ پر ناقابل تلافی بار پڑا

نہایت سخت قحط پڑ گیا جس نے ان تباہیوں میں اور اضافہ کر دیا، ہرچند محمد تغلق نے انسداد گرانی کے لئے پوری کوشش کی اور شاہی ذخیرہ سے لوگوں کو غلہ تقسیم کیا گیا لیکن اللہ کی ڈالی ہوئی مصیبت انسانی تدابیر سے دور نہیں ہو سکتی تھی، اسلئے مشکلات میں کوئی کمی نہ ہوئی اور اضافہ خراج کی تدبیر سخت ناکام ثابت ہوئی۔ اس کے بعد سلطان محمد تغلق نے اپنی غلطی کو محسوس کرکے پھر اس امر کی کوشش کی کہ ویران گاؤں آباد ہو جائیں کاشت کی حالت بہتر ہو جائے اور اس کے لئے اس نے خزانہ شاہی سے ستر لاکھ تنکہ بطور تقاوی کے رعایا کو تقسیم کیا لیکن افسوس ہے کہ کارکنوں نے بہت کچھ اس میں سے خود غصب کر لیا۔ تھوڑا بہت جو رعایا کو ملا بھی اس میں سے ہزارواں حصہ بھی خزانہ میں نہ آسکا، اب چونکہ خزانہ بالکل خالی ہو چکا تھا اور روپیہ کی ضرورت شدید تھی، اس لئے سلطان نے خیال کیا کہ سکہ کی قیمت بڑھا دینی چاہیئے اور اسی خیال کو پیش نظر رکھ کر اس نے تانبہ کا سکہ بجائے طلائی سکہ کے جاری کیا لیکن اس تدبیر نے اور زیادہ نقصان پہونچایا۔ چونکہ دار الضرب میں سکہ ڈھالنے کا کوئی ایسا مخصوص طریق نہ تھا کہ عام طور سے لوگ اس کی نقل نہ کر سکیں اس لئے تمام ملک میں گھر گھر خفیہ ٹکسالیں قائم ہو گئیں اور لوگوں نے کروڑوں سکے تانبہ کے بنا کر بازار میں سونے چاندی کے ہموزن سکوں سے بدلنا شروع کئے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تمام تاجر، زمیندار، گاؤں کے مکھیا اور ہندو راجہ دولتمند ہو گئے اور خزانہ سست ہی خالی ہونے لگا آخر کار سلطان نے اس معاملہ میں بھی اپنی غلطی کو تسلیم کیا اور مجبوراً اس سکے کے رواج کو بھی مسدود کرنا پڑا

سلطان محمد تغلق کی یہ بھی فطرت تھی کہ جب وہ کسی بات کا عزم کر لیتا تو مشکل سے باز آتا اور چونکہ وہ خود اپنی رائے قائم کیا کرتا تھا اور امراء و ارکین سے مشورہ کرنے کا عادی نہ تھا اس لئے بسا اوقات اپنی تدابیر کے نقائص اسے بعد میں معلوم ہوتے۔ اس کے مزاج میں عجلت بہت تھی چنانچہ جب وہ کسی انتظام کی طرف مایل ہوتا تو چاہتا کہ ایک ہی دن میں مکمل ہو جائے اور جب وہ اس میں تاخیر دیکھتا تو برہم ہو جاتا اور نہایت سختی کا عمل شروع کر دیتا

جب سلطان محمد کو اپنی ان تدابیر میں ناکامیابی ہوئی تو ایک خود مختار اور مطلق العنان بادشاہ کی طرح وہ سخت غضبناک ہو گیا اور رفتہ رفتہ اس کے مزاج کی نزاکت اس حد تک بڑھ گئی کہ بات بات میں قتل کرا دینا اس کے دربار کا معمولی منظر ہو گیا۔ چنانچہ ابن بطوطہ نے اس کے دربار کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اگر شاہی قصر کے کسی دروازہ پر بارش انعام ہوتی ہوگی تو دوسرے دروازہ پر تم کسی لاش کو بھی ضرور پھڑکتے ہوئے دیکھوگے

پھر چونکہ محمد تغلق کی یہ برہمی، ہر ناکامی کے ساتھ روزانہ بڑھتی جاتی تھی اور تمام رعایا اس سے متاثر ہو رہی تھی، اس لئے رفتہ رفتہ اس کی طرف سے بددلی عام ہو گئی اور اس کے تمام امراء و ارکین میں جذبات بغاوت موجزن ہونے لگے

اس میں شک نہیں کہ بعض تدبیریں اس کی نہایت مناسب ہوتیں تھیں، لیکن جس انداز سے وہ ان پر

عمل درآمد چاہتا تھا وہ نہایت سخت ہوتا تھا۔ مثلاً دہلی سے پایہ تخت بدل کر دیوگیر (دولت آباد) قایم کرنا[1] بجائے خود اک عمدہ تجویز تھی، کیونکہ دیوگیر درمیان میں واقع تھا اور یہاں سے مختلف صوبوں پر اقتدار آسانی سے قایم رہ سکتا تھا۔ لیکن اس کا یہ حکم دینا کہ تین دن کے اندر دہلی کی تمام آبادی معہ اپنے اسباب کے دیوگیر منتقل ہوجائے اور ایک متنفس بھی یہاں باقی نہ رہے نہایت جابرانہ حکم تھا اور اس میں شک نہیں کہ جہاں اور اسباب امراء و ارکین کی بددلی کے تھے انھیں میں سے یہ بھی ایک قوی سبب تھا

یہاں ایک امر اور قابل غور ہے کہ جن صوبوں نے اس کے عہد میں بغاوت کی ان میں سے اکثر وہی تھے جہاں خود اس کے مقرر کئے ہوئے مسلمان امراء حکومت کر رہے تھے اور ظاہر ہے کہ سلطان کے جبر و تشدد کا اثر ان پر براہ راست نہ پڑتا تھا، پھر جو انھوں نے بغاوت کرکے خودسری اختیار کی تو اس کی وجہ کچھ اور بھی تھی۔ وہ یہ کہ غلام خاندان کے زمانہ میں صوبہ کے گورنر جاگیردار ہوتے تھے اور چونکہ وہ خود بھی اپنے بادشاہوں کی طرح ترک نژاد تھے اس لئے سلطنت کی خدمت کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ جب ان ترک فرمانرواؤں کے بعد خلجیوں کا دور شروع ہوا تو اس نظام میں کچھ تغیر پیدا ہوا لیکن نہ اس قدر، کیونکہ خلجی

---

[1] ابن بطوطہ نے اس کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ دلی کے بعض آدمیوں نے سلطان کو ایک گمنام خط بھیجا جس میں بہت سی گالیاں لکھی ہوئی تھیں اس پر برہم ہوکر بادشاہ نے حکم دیا کہ دہلی خالی کردی جائے اور ہر شخص دیوگیر (دولت آباد) میں جاکر قیام کرے لیکن یہ بالکل بازاری افواہ معلوم ہوتی ہے جو ابن بطوطہ نے دلی آنے پر کسی شخص سے سن لی ہوگی ۔۔ اصل وجہ یہ تھی کہ سلطنت وسیع ہوجانے کی وجہ سے سلطان محمد تغلق نے پایۂ تخت ایسی جگہ کو بنانا چاہا جو وسط میں واقع ہو اور وہاں سے ہر جگہ بآسانی اثر ڈالا جاسکے بعض لوگوں نے اجین کو تجویز کیا۔ لیکن خود اس نے دیوگیر کو پسند کیا اور اسی کو اپنا دارالحکومت بنانا چاہا۔ اس میں شک نہیں کہ یہ خیال ایک حد تک بالکل درست تھا لیکن چونکہ وہ اپنی عجلت پسند فطرت سے مجبور ہوکر یہ چاہتا تھا کہ دولت آباد فوراً آباد ہوجائے اور دہلی کی تمام رونق وہاں آناً فاناً منتقل ہوجائے، اس لئے اس نے عام حکم دیدیا کہ تمام امراء و ارکین، تمام دوکاندار و پیشہ ور، امیر و غریب مرد و عورت الغرض دہلی کا ہر متنفس تین دن کے اندر دولت آباد چلا جائے ہرچند اس نے بہت سے لوگوں کو زاد راہ دیا، ان کے گھروں کی قیمت دلوائی سفر کے لئے آسانیاں فراہم کیں لیکن ظاہر ہے کہ جس شہر نے ایک صدی سے زائد زمانہ میں رونق و آبادی حاصل کی تھی وہ دفعتہ دوسری جگہ منتقل نہ ہوسکتا تھا اور نہ رعایا کسی طرح اس کو گوارا کرسکتی تھی کہ وہ اس زحمت کو برداشت کرے۔ تاہم بادشاہ کے خوف سے اس کی تعمیل کی گئی اور دہلی ویران ہوگیا

سلطنت کے زمانہ میں صوبوں کے گورنر پھر بھی مرکزی حکومت سے قریب کا تعلق رکھتے تھے۔ لیکن جب عہد تغلق شروع ہوا تو یہ تعلقات بالکل ختم ہو گئے اور صوبوں کی حکومت بالکل اجنبی سرداروں (ایرانیوں خراسانیوں، تغلقیوں، افغانوں) کے سپرد کی گئی۔ جو بادشاہ سے نہ خون کا تعلق رکھتے تھے نہ قومیت کا۔ بادشاہ جس قدر ان پر انعامات کی بارش کرتا جاتا تھا۔ ان کی طمع بڑھتی جاتی تھی اور یہ خود اپنی خود مختار سلطنتیں قایم کرلینی چاہتے تھے۔ چنانچہ اسی کا نتیجہ تھا کہ عہد تغلق کی وسیع سلطنت (ایسی وسیع کہ پھر دو صدی بعد تک ایسی وسعت حاصل نہ ہو سکی) ٹکڑے ٹکڑے ہو کر منتشر ہو گئی۔ ہر چند ان بغاوتوں کے فرو کرنے میں بادشاہ نے پوری کوشش کی اور وہ کامیاب بھی ہوا لیکن ظاہر ہے کہ وہ ہر جگہ نہ پہونچ سکتا تھا اور وہاں حالت یہ تھی کہ آج ملتان باغی ہوا تو کل بنگال، کل لاہور میں فتنہ اٹھا تو پرسوں ورنگل میں۔ اسوقت اودھ کی بغاوت کی خبر ملی تو دوسرے وقت گجرات کی بادشاہ کہاں کہاں پہونچ سکتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بعض صوبے جن میں بنگال اور دکن بھی شامل تھے، بالکل خود مختار ہو گئے اور پھر کبھی تغلق سلطنت میں شامل نہ ہو سکے

محمد تغلق کا عہد

سلطان محمد تغلق نے ۲۷ سال تک حکومت کی اور اس میں شک نہیں کہ ابتدائی زمانہ باعتبار وضع قوانین نظم سلطنت، کثرت فتوحات، ایک یادگار زمانہ تاریخ ہندوستان کا شمار کیا جاتا ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ بعض اسباب کی وجہ سے جن کا اجمالی بیان ہم نے ابھی کیا ہے، اس کا درمیانی اور آخری عہد صد درجہ اضطراب واضطرار میں بسر ہوا۔ جس سال وہ مرنے والا تھا اسی سال سندھ میں بغاوت رونما ہوئی۔ محرم کا مہینہ تھا کہ اس نے دریائے سندھ کو عبور کیا اور بے شمار افواج لئے ہوئے ٹھٹہ کی طرف بڑھا

محمد تغلق کی وفات

محرم ۷۵۲ھ (۱۳۵۱ء) کی دسویں تاریخ تھی اور ٹھٹہ صرف تیس کوس رہ گیا تھا کہ شام کو روزہ افطار کرنے کے بعد اس نے مچھلی کھائی طبیعت پہلے سے بھی کچھ خراب تھی اس بدپرہیزی سے بخار بڑھ گیا۔ لیکن بادشاہ نے سفر کو ملتوی نہیں کیا اور تیسرے دن ٹھٹہ سے صرف چودہ کوس کا فصل رہ گیا تھا کہ بادشاہ کی حالت زیادہ ردی ہو گئی اور مجبوراً حملہ ملتوی کرنا پڑا۔ ایک ہفتہ تک سلطان اسی حال میں مبتلا رہا یہاں تک کہ[۱] ۲۱ محرم کو دریائے سندھ کے ساحل پر اس نے انتقال کیا اور اس طرح خاندان تغلق کے اس جلیل القدر بادشاہ کا عہد حکومت ختم ہو گیا۔ جس کا مثل تاریخ ہندوستان پھر کوئی اور پیدا نہ کر سکی

[۱] تاریخ فیروز شاہی برنی (الیٹ) جلد سوم۔ ۲۶۴ - ۲۶۵ - فرشتہ - ۱۴۳۔

سلطان فیروز شاہ

۷۵۲ھ = ۷۹۰ھ
۱۳۵۱ء ۱۳۸۸ء

فیروز شاہ کی تخت نشینی

"محمد تغلق" کی وفات کے ساتھ ہی "ہندوستان" کی حالت میں پھر ردِ عمل شروع ہوا اور بقول "لین پول" کے ہندوستان، اسی طرح ہوش میں آگیا جیسے نہایت تیز بخار کے رفع ہونے پر ایک بیمار اپنے حواس میں آجاتا ہے۔

چونکہ محمد تغلق نے اپنے بعد کوئی اولاد نرینہ نہیں چھوڑی تھی اور اپنے آخری وقت میں بھی وہ "فیروز شاہ"[1] کی تخت نشینی کے لئے وصیت کرگیا تھا، اس لئے ۲۴ محرم ۷۵۲ھ کو وہیں "وادیِ سندھ" کے اندر تمام امرار کے انتخاب و اصرار سے تخت نشین ہوا۔ اور باغیوں کی سرکوبی کے بعد "دہلی" کی طرف روانہ ہوا۔ ہر چند اس تخت نشینی پر "تغلق شاہ" کی لڑکی "خداوندزادہ" (داور ملک کی ماں) کی طرف سے اعتراض ہوا کہ بھانجے کے ہوتے ہوئے برادرِ عم زاد کا کوئی حق نہیں ہے، لیکن امرار نے خداوندزادہ کو سمجھایا کہ داور ملک حکومت کا اہل نہیں ہے۔ اور اسوقت جبکہ ہم لوگ دہلی سے بہت بعید فاصلہ پر ہیں اور مغلوں نے چاروں طرف سے گھیر لیا ہے، کسی ہوشیار اور قابل دماغ کی ضرورت ہے

---

[1] غیاث الدین تغلق کے دو بھائی اور تھے ایک کا نام رجب تھا اور دوسرے کا ابوبکر۔ سلطان علاؤالدین خلجی کے عہد میں تینوں بھائی خراسان سے آئے۔ غیاث الدین تغلق ملازمت شاہی میں داخل ہوکر رفتہ رفتہ دیپالپور کا گورنر مقرر ہوا اور باقی دونوں بھائی بھی مناصب جلیلہ پر پہونچے تغلق کی خواہش تھی کہ اس کے بھائی رجب کی شادی دیپالپور کے کسی راجہ کے خاندان میں ہوجائے۔ اتفاق سے اسی زمانہ میں اس کو خبر معلوم ہوئی کہ رانا مل بھٹی کی لڑکی بہت حسین ہے، رانامل نے پہلے تو انکار کیا لیکن پھر راضی ہوگیا اور رجب سے اپنی لڑکی کی شادی کردی۔ چند سال کے بعد اس کے بطن سے فیروز پیدا ہوا اور تغلق نے بڑا جشن اس تقریب مسرت میں برپا کیا۔ فیروز سات سال کا تھا کہ اس کا باپ رجب مرگیا۔ اور تغلق نے اس کی پرورش اپنے بچوں کی طرح کی۔ فیروز ۲۱ سال کا تھا کہ تغلق تخت نشین ہوا اور اس نے فیروز کو کبھی اپنے پاس سے جدا نہیں کیا۔ سفر و حضر میں اپنے ساتھ رکھ کر ملکداری و آئین فرمانروائی کی پوری تعلیم دی۔ فیروز ۲۸ سال کا تھا کہ تغلق شاہ کا انتقال ہوگیا اور محمد تغلق فرمانروا ہوا۔ محمد تغلق نے اسے نائب باربک کا خطاب دیکر نائب امیر حاجب بنادیا اور بارہ ہزار سوار اس کی ماتحتی میں دیدئے۔ محمد تغلق، فیروز پر بہت مہربان تھا اور ہمیشہ معاملات سلطنت کے نشیب و فراز اُسے سمجھاتا رہتا تھا چنانچہ جب محمد تغلق نے اپنی سلطنت کو چار حصوں میں تقسیم کیا تو ایک حصہ فیروز کے سپرد کیا تاکہ وہ عملی طور سے امور حکومت کو سمجھ جائے۔ الغرض پورے ۲۶ سال تک فیروز محمد تغلق کی تعلیم و نگرانی میں رہا اور آخر وقت میں اس نے اپنے حسن خدمات سے محمد تغلق کو اس قدر خوش رکھا کہ مرتے وقت وہ اسی کیلئے تخت نشینی

گیارھواں باب

جماعتِ آوارگان

دنیا کے حالات بدل گئے ہیں اور فضائے تمام سیارہ والوں کو معلوم ہوچکا ہے کہ معلم اکبر کی روح نے اپنے قیام کے لئے کرۂ زمین کو منتخب کرلیا ہے اور اب یہی سیارہ سب کی گفتگو کا مرکز بن کر رہ گیا ہے

یہاں کا کتاب خانہ اور اس کا دارالمطالعہ ہروقت شائقین سے بھرا رہتا ہے اور دوسرے سیاروں کے رہنے والے اپنی اپنی رصدگاہوں سے ہروقت یہاں کے حالات دریافت کرتے رہتے ہیں۔ بےشمار درخواستیں سوسائٹی میں شامل ہونے کی آرہی ہیں اور متعدد شاخیں اس کی کھول دی گئی ہیں

یہ کیفیت روز بروز بڑھتی ہی رہی یہاں تک کہ اندیشہ یہ پیدا ہوگیا کہیں اور کرے ویران نہ ہوجائیں۔ اس علم نے کہ معلم اکبر کی روح اب کرۂ زمین کو اپنا مستقر بنانا چاہتی ہے، فضا میں ہیجان برپا کر دیا تھا اور کائنات کی ساری آبادی مضطرب نگاہوں سے ان حالات کا مطالعہ کررہی تھی

معلم اکبر کی آمد سے قبل کرۂ زمین مرکز تھا افلاس وجہل کا، بغض وعناد کا، سیاسی رقابتوں کا، روحانی تعصبات کا، اور زبانوں کے اختلاف کا۔ لیکن اب یہ تمام لعنتیں دور ہو رہی تھیں۔ فساد کی جگہ امن نے لےلی تھی اور اختلاف کی جگہ اتفاق نے، جہل کی تاریکی کو علم نے دور کردیا تھا اور ساری آبادی صرف ایک مذہب کی تبیع تھی۔ جس کا نام "مذہب محبت" تھا۔

تمام سیاسی جماعتیں متفق ہوکر ایک ہی مقصود کی طرف مائل تھیں اور وہ مقصود نوعِ انسانی کی فلاح تھا۔ رواداری اور آزادیٔ ضمیر، دو ابتدائی اصول تھے جن پر ہر فرد کاربند تھا اور ایک ہی زبان ایک ہی خط میں وہ اپنے مافی الضمیر کا اظہار کرتے تھے

اس وقت یہاں جن اصول پر کام ہورہا تھا وہ یہ تھے کہ ایک "حزب الاتحاد" پیدا کیا جائے اور اس کے سلسلہ کو اتنا وسیع کیا جائے کہ یہاں کا ہر بسنے والا اس سے متعلق ہوجائے، ہر ممبر کا فرض تھا کہ وہ اٹھارہ "جانباز" پیدا کرے اور پھر ہر "جانباز" اسی طرح اٹھارہ اٹھارہ "جانباز" اور پیدا کرے۔ جس وقت میری باری آئی تو میں نے غلطی سے اپنے اٹھارہ "جانباز" فضا کے چند منتشر وآوارہ سیاروں سے منتخب کئے۔ سب سے پہلے جلسہ میں انھوں نے تجویز کی کہ ان کی جماعت کا نام "جماعتِ آوارگان" رکھا جائے۔ میں نے اس کی مخالفت کی کیونکہ آوارگی کی نسبت میں

اپنے نام کے ساتھ پسند کرتا تھا، لیکن میری کسی نے نہیں سنی اور باوصف اس کے کہ میں ان کا افسر تھا، مجھے مجبوراً ان کے اصرار کے سامنے سرجھکا دینا پڑا۔ اس جماعت کے افراد چونکہ آوارہ سیاروں سے تعلق رکھتے تھے اسلئے ان کے جذبات میں بھی آوارگی پائی جاتی تھی اور انھوں نے سوائے لہو ولعب کے اور کچھ نہ کیا

جام زر اور دوست پرست نے تو اس طرف زیادہ توجہ نہیں کی، لیکن دلآرام نے ایک دن مجھے سمجھایا اور کہا کہ اگر یہ جماعت تمھارے قابو سے باہر ہے تو اس کو توڑ دو اور دوسرے "جانباز" پیدا کرو، کیونکہ ان کے لہو ولعب اور تفریحی ہنگاموں نے اصل مقصود کی طرف سے لوگوں کو منحرف کر رکھا ہے۔ میں پہلے ہی سے محسوس کر رہا تھا اور اب دلآرام کے کہنے سے زیادہ محسوس کرنے لگا، آخر کار ان کو جمع کر کے میں نے ایک دن کہا کہ اگر وہ اپنے کھلنڈرے پن سے باز نہ آئیں گے تو میں ان کا دستہ توڑ دوں گا اور دوسرا دستہ طیار کروں گا۔ اس کے بعد وہ چند دن تو چین سے بیٹھے رہے لیکن پھر اس سے زیادہ بدتمیزیاں شروع کر دیں۔ اس کا ایک بڑا سبب یہ بھی تھا کہ خود لوگوں کو ان سے دلچسپی پیدا ہو گئی تھی اور وہ ان کے ہنسی ٹھٹھوں سے لطف اُٹھاتے تھے

مجبور ہو کر جام زر نے یہ تمام شکایتیں معلم اکبر تک پہونچائیں، میں بھی اسوقت موجود تھا۔ معلم اکبر پہلے میری طرف دیکھ کر مسکرایا اور پھر جام زر کی طرف مخاطب ہو کر بولا:۔

"اے جام زر، یہ لوگ تمھارا کیا بگاڑ رہے ہیں یہ تو تمھیں ہنساتے ہیں، خوش رکھتے ہیں، فضا میں مسرت نشاط کی لہریں دوڑا رہے ہیں۔ اس سے زیادہ کی توقع تم ان سے کیا رکھ سکتے ہو۔ تم اور کام کرنے والوں کو دیکھو کہ وہ اپنے مشاغل میں اتنے مصروف ہیں کہ وہ خوش رہنا بالکل بھول گئے ہیں، مسرت و تبسم کا مفہوم ان کے دماغ سے محو ہو گیا ہے

"اے جام زر، اپنی پیشانی سے یہ شکنیں دور کر دو اور عقل و فراست کے بوجھ سے اپنے کو ہلکا کر کے کبھی کبھی بچہ بھی بن جایا کرو۔ فضا کی یہ آوارہ گرد جماعت دنیائے مسرت کی پیامبر ہے، میرے فردوسِ نشاط کی باد نسیم ہے۔ تم سمجھتے ہو ان کا کوئی مقصود زندگی نہیں، لیکن میں جانتا ہوں کہ ہے اور بہت اہم مقصود ہے۔ وہ یہ کہ جب تم شکست و ناکامی سے بددل ہو جاؤ، جب تم پر یاوسی کے بادل چھا جائیں تو یہ تمھارے اندر ولولۂ عمل اور کیفیت نشاط پیدا کریں اور تم باطل کے خلاف اپنی جنگ قایم رکھ سکو۔ اس سے زیادہ اور کیا چاہئے۔ بولو"

یہ سنکر مجھے بہت اطمینان ہوا کیونکہ معلم اکبر نے یہ خیال میری ہی جماعت، میرے ہی جانبازوں کے دستہ کے متعلق ظاہر کیا تھا۔ جام زر البتہ خاموش ہو گیا اور وہ اس آوارہ گرد دستے کی طرف چلا تاکہ اپنے کئے کی تلافی کرے، لیکن میں نے اسے منع کر دیا کہ معلم اکبر نے جو کچھ کہا ہے اس کا اظہار ان کے سامنے نہ کرے، ورنہ وہ اور کھل کھیلیں گے اور ہر جگہ ہنگامہ بپا ہو جائے گا

میں سیارۂ اکبر چلا گیا تاکہ جامعۃ الجامعات کے والیس پریسیڈنٹ گورگور سے تمام حال بیان کر دوں کیونکہ وہ

میری جماعت کا اتنا زیادہ مخالف نہ تھا۔ گور گور نہایت سنجیدہ مخلوق تھا اور ہر کام انتہائی صبر و تحمل سے کرتا تھا، اسی لئے معلم اکبر اس پر بہت بھروسہ کرتا تھا اور انسانی معاملات کا مہتمم اسی کو بنا دیا گیا تھا

معلم اکبر نے ایک بڑی اہم خدمت گور گور کے سپرد یہ کر رکھی تھی کہ طلبائے سیارگان کو مملکت تحت الثریٰ کے پایۂ تخت "اندھیر نگری" (Pandemonium) کی طرف بھیجتا رہے تاکہ وہاں جاکر تاریک قوتوں کا مقابلہ کریں

میرے یہاں پہونچنے کے کچھ دن بعد ایک مباحثہ "مذہب و علم" کے عنوان سے قائم ہوا۔ اور مباحثہ کے دوران ہی میں کسی مقرر نے "اندھیر نگری" کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ اس کا بہت برا اثر کائنات پر پھیل رہا ہے۔ میں نے اس بیان کی مخالفت کی، کیونکہ بہت ملسی میں مجھے یہ بتایا گیا تھا کہ برائی نام ہے نیکی کے فقدان کا، جہل نام ہے علم کے نہ ہونے کا، بیماری نام ہے صحت کے زائل ہو جانے کا اور ان منفی کیفیات کا کوئی مستقل وجود نہیں ہے۔ میں نے ہر ایک سے "اندھیر نگری" کے متعلق صحیح کیفیات معلوم کرنا چاہیں، لیکن کسی نے مجھے صاف جواب نہیں دیا، یہاں تک کہ انھیں یہ بھی معلوم نہ تھا کہ وہ ہے کہاں۔ معلم اکبر نے بھی اپنی تقریروں میں اس کا ذکر نہ کیا تھا۔ ورنہ حاکم حاکمیان نے جو فضا کا بڑا زبردست مورخ و جغرافیہ داں تھا کبھی اس کا حوالہ دیا تھا

میں نے ایک دن حاکم حاکمیان سے پوچھا "یہ اندھیر نگری کہاں ہے"۔ اس نے کہا "مجھے نہیں معلوم" میں نے کہا "میں خیال کرتا ہوں کہ "سیارۂ اکبر میں شیاطین کا وجود نہیں ہے"۔ اس نے کہا کہ "بڑا اچھا خیال ہے، نہایت پاکیزہ تمنا ہے"

میں۔ "مجھ سے کہا گیا ہے کہ سیارۂ محبت میں نفرت کا وجود نہیں [illegible] وہاں [illegible] رحمت ہے"

وہ۔ "یہ خیال تمہارا بہت سطحی ہے، میں سمجھتا ہوں کہ برائی ہر نیکی کے پیچھے موجود ہے اور کائنات کیلئے سب سے بڑا خطرہ یہی ہے"

میں چلا اٹھا کہ "یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ بیٹے تو تم نے یہ کہکر ہلاک کر ڈالا، میرے علم و یقین کی بنیاد متزلزل کر دی۔ کیا برائی کے وجود کے معنے یہ نہیں ہیں کہ خدا موجود نہیں ہے اور کیا تاریکی روشنی کے فقدان کا نام نہیں ہے"

وہ۔ "نہیں — برائی ایک سرطان ہے جو نیکی کے قلب کو کھائے جا رہی ہے، تاریکی ایک قوت ہے جو نور سے مقابلہ میں صف آرا ہے۔ تم ایک بھوکے کے پاس جاؤ اور کہو کہ بھوک بالکل خیالی چیز ہے اور اس کا وجود کہیں نہیں تو کیا وہ اس کا یقین کرے گا۔ اگر ظلمت کا وجود نہیں ہے تو پھر یہ جنگ کس کے خلاف ہے؟

اے میرے عزیز دوست، سوچو اور یہ وہم دور کر دو، تمہارا کسی چیز سے انکار کر دینا اس کے وجود کو باطل نہیں کرسکتا۔ معصیت و برائی، ظلمت و تاریکی ہر طرف پھیلی ہوئی ہے اور وہ نیکی و روشنی کو فنا کر دینے پر تلی ہوئی ہے۔ تم عالم نور کے سپاہی ہو، تمہارا فرض ہے کہ تاریکی کے خلاف پوری مستعدی سے جنگ کرو۔ کیونکہ یہ جنگ تو بہر حال ہونا ہے اور بغیر اسکے

کامیابی محال ہے"
میں ۔ "کیا روشنی تاریکی کو دور نہیں کرتی، کیا محبت نفرت کو فنا نہیں کر سکتی"
وہ ۔ "ہاں، کر سکتی ہے، لیکن کس قسم کی محبت ؟ ـــــ زندہ محبت، یعنی وہ محبت جو قوا رعمل میں حرکت پیدا کر دے، جو احساس کے ساتھ کردار میں بھی زندگی کی روح پھونک دے اور جو دشمن کے مقابلہ کے لئے ہمارے دلوں میں غیر معمولی جوش و ولولہ بھر دے"
میں ۔ "معاذ اللہ، میں نے تو تمام عمر یہی درس دیا کہ مقابلہ اچھا نہیں، مخالفت بُری چیز ہے، عفو و درگزر سے بہتر کوئی طریقہ نہیں"
وہ ـــ "لیکن اس درس نے کیا فایدہ پہونچایا، ہر شخص نے تمھیں کچلا، پامال کیا اور برائی "بڑھتی رہی"
میں ۔ "پھر اب میں کیا کروں ۔ مجھے کیا کرنا چاہئے"
وہ ـــ "وہی جو پہلے کہہ چکا ہوں ـــ زندہ محبت ۔ زندہ یقین اور زندہ علم و اعتقاد!"
میرا خون کھول رہا تھا، میری روح بے چین تھی، فضا میں ہر طرف نعرۂ جنگ گونجتا ہوا محسوس کر رہا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ لڑائی کا اعلان ہو چکا ہے اور مجھے اس میں شرکت کے لئے کوئی کھینچے لئے جا رہا ہے ۔

باب بارھواں

"اندھیر نگری" کی طرف جانے کی طیاریاں ہو رہی ہیں ۔ مختلف سیاروں کے طلبہ سے ہال بھرا ہوا ہے ۔ معلم اکبر اٹھا اور اس نے جلسہ کو مخاطب کیا کہ :۔
"اے میرے عزیزو ، تمھیں اپنے آپ کو صیقل شدہ آئینہ کی طرح بنانا چاہئے اور اس آئینہ کی صیقل کو ہمیشہ قائم رکھنا چاہئے، رشک و حسد، خوف و مکر، عُجب و ریا کا زنگ اس پر نہ چڑھنا چاہئے ۔ بُرائی کے وجود کی طرف سے آنکھیں بند کر لینا، بُرائی کی حمایت کرنا ہے ۔ بُرائیوں کو دیکھنا اور کچھ نہ کہنا اپنے آپ کو اس روح اعلیٰ سے علٰحدہ کر دینا ہے جو تمھارا مقصود حقیقی ہے ۔

خدا کی بادشاہت امن و محبت ہے اور وہ تمھارے ہی اندر پائی جاتی ہے ۔

شیطان کی مملکت جنگ و نفرت ہے اور وہ تم سے باہر ہونا چاہئے ۔

میں چاہتا ہوں کہ تم ایک عالمگیر اتحاد روحانی کی بنیاد ڈالو اور اس راہ میں جن مشکلات سے واسطہ پڑے انھیں صبر و استقلال کے ساتھ جھیل جاؤ ۔ یہی تمھارا امتحان ہے، یہی تمھاری آزمائش ہے ، جاؤ، آگے بڑھو، خدا تمھاری مدد کرے گا"

نیاز فتحپوری کی دیگر تصانیف

نگار بک ایجنسی لکھنؤ

ترغیبات جنسی (یا) شہوانیات

اس کتاب میں فحاشی کی تمام فطری اور غیر فطری قسموں کے حالات، ان کی تاریخ و نفسیاتی اہمیت پر نہایت شرح و بسط کے ساتھ تبصرہ کیا گیا ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ فحاشی دنیا میں کب اور کس کس طرح رائج ہوئی اور مذاہب عالم نے اسکے رواج میں کتنی مدد کی۔ اس کتاب میں آپ کو حیرت انگیز واقعات نظر آئیں گے۔

قیمت تین روپیہ (سے) علاوہ محصول

خریداران نگار سے ایک روپیہ کم

مجموعۂ استفسار و جواب ۳ جلد

ان تینوں جلدوں میں ۱۹۲۲ء سے لیکر ۱۹۳۶ء تک کے استفسار و جواب شایع کئے گئے ہیں۔ اس مجموعہ کی اہمیت کا اظہار بیکار ہے کیونکہ نگار کو جو خصوصیت اس باب میں حاصل ہے وہ کسی سے مخفی نہیں ان تینوں جلدوں میں سیکڑوں ادبی، تاریخی و تنقیدی مسائل شامل ہیں اور اسکی حیثیت ایک مختصر سی سائیکلوپیڈیا کی ہے

قیمت فی جلد تین روپیہ (سے) علاوہ محصول

خریداران نگار سے فی جلد ایک روپیہ کم

جذبات بھاشا

جناب نیاز نے ایک دلچسپ تمہید کے ساتھ بہترین ہندی شاعری کے نمونے پیش کرکے ان کی ایسی تشریح کی ہے کہ دل بیتاب ہو جاتا ہے۔ اردو میں یہی سب سے پہلی کتاب اس موضوع پر لکھی گئی ہے اور ہندی کلام کے بے مثل نمونے نظر آتے ہیں۔

قیمت علاوہ محصول بارہ آنہ (۱۲؍)

خریداران نگار سے تین آنہ (۳؍) کم

فلاسفۂ قدیم

اس مجموعہ میں حضرت نیاز کے تین علمی مضامین شامل ہیں:۔

۱۔ چند گھنٹے فلاسفۂ قدیم کی روحوں کے ساتھ۔

۲۔ ملحدین کا مذہب۔

۳۔ حرکت کے کرشمے۔

نہایت مفید و دلچسپ کتاب ہے۔

قیمت ایک روپیہ (عہ)

علاوہ محصول

خریداران نگار سے چار آنہ (۴؍) کم

شاعر کا انجام

جناب نیاز کے عنفوان شباب کا لکھا ہوا افسانہ حسن و عشق کی تمام نشہ بخش کیفیات اس کے ایک ایک جملہ میں موجود ہیں، یہ افسانہ اپنے پلاٹ اور انشاء کے لحاظ سے اس قدر بلند چیز ہے کہ دوسری جگہ اس کی نظیر نہیں مل سکتی۔

قیمت دس آنے (۱۰؍)

علاوہ محصول

خریداران نگار سے دو آنہ (۲؍) کم

فراست الید

مولفۂ نیاز فتحپوری جس کے مطالعہ سے ایک شخص آسانی ہاتھ کی شناخت اور اس کی لکیروں کو دیکھ کر اپنے یا دوسرے شخص کے مستقبل سیرت عروج و زوال، موت و حیات، صحت و بیماری، شہرت و نیکنامی وغیرہ پر صحیح پیشین گوئی کرسکتا ہے۔

قیمت ایک روپیہ (عہ)

علاوہ محصول

خریداران نگار سے چار آنہ (۴؍) کم

مذاکرات نیاز

یعنے حضرت نیاز کی ڈائری جو ادبیات و تنقید عالیہ کا عجیب و غریب ذخیرہ ہے ایک بار اسکو شروع کردینا آخر تک پڑھ لینا ہے۔ اس کتاب کی بہت کم جلدیں باقی رہ گئی ہیں۔

قیمت بارہ آنے (۱۲؍)

علاوہ محصول

خریداران نگار سے تین آنہ (۳؍) کم

گہوارۂ تمدن

یہ وہ معرکۃ الآرا کتاب ہے جس میں تاریخ و اساطیر سے ثابت کیا گیا ہے کہ تمدن کی ترقی میں عورت نے کتنا زبردست حصہ لیا اور دنیا کی تہذیب و شائستگی اس کی کس قدر ممنون ہے اردو میں اس موضوع پر اس سے قبل کوئی کتاب نہیں لکھی گئی مصنف کو اس کتاب پر ریاست بھوپال سے ایک ہزار روپیہ انعام ملا تھا۔

قیمت دو روپیہ (عہ)

علاوہ محصول

رجسٹرڈ نمبر اے ۱۱۰۴

پرنٹر لیاقت حسین ہاشمی منیجر مختار پرنٹنگ ورکس، پبلشر شاہد حسین دفتر نگار لکھنؤ

قیمت
۸ر

مشترک ہندوستانی زبان کا نمونہ

جس کی سفارش کانگریس ہائی کمانڈ نے کی ہے

مولانا ابوالکلام آزاد داد دیں

شکشا۔ سنگھٹن سمت کے سمکش

سنیکت پرانت کے شکشا سچیو

مانئے شری سمپورنانند جی کا دیا کھیان

(پرکاشن وبھاگ، سنیکت پرانتئے گورنمنٹ)

آدھنک کال جس میں کہ ہم رہ رہے ہیں اس کی یہ بھی ایک وشیشتا ہے کہ شکشنز شمیا کے پرت لوگوں کا آگرہ سنتڈ بہت وشتدر اور ویاپک ہوگیا ہے۔ یہ بات آدھکانش سبھے سنسار پر گھٹیت ہوتی ہے اور تدنوسار ہم اپنے دیش میں بھی اس پشیو ویاپی اندولن کے بھن بھن پہلوؤں کو دیکھ رہے ہیں اور ان کا انوبھو کر رہے ہیں۔ آج کل ہم اپنے کو بس مانسک اور بھادتک پرستھیت میں پاتے ہیں اور ہماری اس استھیت کا جو سماجک راج نیتک اور آرتھک آدھار ہے اور ساتھ ہی ساتھ ہم نے اپنے پوروجوں سے جو سنسکرت پائی ہے اُس سے اس وشیو ویاپی پرگت کو ہمارے سنکمرنش سمندھ یہ ایک وشلیس روپ میں اپستھت کیا ہے اور ایک وشیش بھارتئے سمسیہ بنادیا ہے۔

آخر میں یہ عرض کردینا ضروری ہے کہ یہ دیوالی کی رات میں بیر جگانے کا کوئی منتر نہیں ہے بلکہ ترجمہ ہے آنریبل سری سمپورنانند جی وزیر تعلیمات کے ایک حصہ تقریر کا جسے محکمہ اطلاعات یوپی گورنمنٹ نے شایع کیا ہے۔

(ایڈیٹر)

امامیہ مشن کے رسالے

نمبر شمار	نام رسالہ	قیمت	محصول
۱	قاتلان حسین کا مذہب	۰۴/	۱/
۲	تحریف قرآن کی حقیقت تیسرا ایڈیشن زیر طبع	—	—
۳	مولود کعبہ (ختم)	—	—
۴	وجود حجت	۰۴/	۱
۵	اصول دین اور قرآن	۰۴/	۱/
۶	اتحاد الفریقین حصۂ اول	۰۴/	۱/
۷	حسین اور اسلام (اردو)	۰۱/	ـ
۸	" " (ہندی)	۱/	ـ/
۹	" " (انگریزی ختم)	—	—
۱۰	متعہ اور اسلام	۹/	۱۰/
۱۱	امامت ائمۂ اثنا عشر اور قرآن	۰/	ـ/
۱۲	تجارت اور اسلام (ختم)	۳/	۱/
۱۳	اتحاد الفریقین حصہ دوم (ختم)	۰۴/	۱/
۱۴	علی اور کعبہ (ختم)	۱/	ـ/
۱۵	رجال بخاری حصۂ اول	۰۶/	۱۰/
۱۶	مذہب باب بہا حصۂ اول	۰۵/	۱/
۱۷	نوروز و غدیر	۱/	ـ/
۱۸	مجاہدۂ کربلا	۲/	ـ/
۱۹	کربلا کا آتم بلیدان (ہندی ختم)	—	—
۲۰	دی مارٹرڈم آف حسین (انگریزی)	۲/	ـ/
۲۱	اسوۂ حسینی	۰۴/	۱۰/
۲۲	جنگ صفین	۳/	ـ/
۲۳	تذکرۂ حفاظ شیعہ حصۂ اول	۰۲/	۱۰/
۲۴	" " حصۂ دوم	۰۵/	۱/
۲۵	مقصود کعبہ	۱/	ـ/
۲۶	مذہب باب بہا حصۂ دوم	۹/	۱۰/
۲۷	مذہب اور سائنس	۱/	ـ/
۲۸	معرکۂ کربلا (ختم)	۲/	ـ/
۲۹	کربلا کا مہایودھ "	۲/	ـ/
۳۰	دی ٹریجڈی آف کربلا (انگریزی)	۲/	ـ/
۳۱	اسلام کی حکیمانہ زندگی	۹/	۱۰/
۳۲	دور استبداد	۰۴/	۱/
۳۳	حقیقت بداء	۲/	ـ/
۳۴	خطیب آل محمد	۰۴/	۱/
۳۵	تدوین حدیث	۱/	ـ/
۳۶	مطلوب کعبہ	۱/	ـ/
۳۷	محاربۂ کربلا	۰۲/	ـ/
۳۸	اسلام کا پیغام (اردو)	۰/	ـ/
۳۹	دی میسج آف اسلام (انگریزی)	۰/	ـ/
۴۰	اثبات عزاداری	۰۴/	۱/
۴۱	مسئلۂ فدک	۰۵/	۱/
۴۲	تاجدار کعبہ	۱/	ـ/
۴۳	خلافت و امامت حصۂ اول	۰۵/	۱/
۴۴	" " حصۂ دوم	۰۴/	۱/
۴۵	" " حصۂ سوم	۰۴/	۱/
۴۶	تحقیق اذان	۱/	ـ/
۴۷	ذوالجناح	۰/	ـ/
۴۸	شہدائے کربلا	۳/	۱/
۴۹	کربلا کا مہاسمر (ہندی)	۲/	ـ/
۵۰	حسین اِن دی لائیٹ آف کربلا (انگریزی)	۱۰/	ـ/
۵۱	مشہد اعظم	۱/	ـ/
۵۲	لا تفسدوا فی الارض	۸/	۱۰/
۵۳	نہج البلاغہ کا استناد	۴/	۱/
۵۴	خلافت و امامت حصۂ چہارم	۳/	۱/
۵۵	شہدائے کربلا حصۂ دوم	۰۵/	۱/
۵۶	ابوالائمہ کی تعلیمات	۴/	۱/
۵۷	حسین کا پیغام عالم انسانیت کے نام	۱/	ـ/
۵۸	اسلامی عقاید	۲/	ـ/
۵۹	آثار باقیہ (زیر طبع)	—	—
۶۰	صحیفۂ سجادیہ کی عظمت (زیر طبع)	—	—

کتب امامیہ مشن بک ایجنسی

نمبر شمار	نام کتاب	قیمت	محصول
۱	حسین دی مارٹر (انگریزی ختم)	۱۲/	۲۰/
۲	الشہید (اردو)	۱۰/	۱۰/
۳	کائنات قبل از اسلام	۴/	ـ/
۴	قاتلان حسین کی گرفتاری	۸/	۲/
۵	حج و بینات	عہ/	۲/
۶	وجیزۃ الاحکام	۴/	۱
۷	صحیفۂ تجلی (رباعی)	۸/	۱/
۸	رسول کی بیٹی	۲/	ـ/
۹	گل عصمت	۱۰/	ـ/
۱۰	رجال بخاری حصۂ دوم	۶/	۱/
۱۱	ٹیررزم اینڈ فریڈم آف طامحمود (انگریزی)	عہ/	۱۰/
۱۲	تاریخ ازدواج	۸/	۱/
۱۳	الہامی حکمات	۳/	۱/
۱۴	شہید اسلام	عہ/	۵/

ملنے کا پتہ :- آنریری سکریٹری امامیہ مشن رجسٹرڈ- لکھنؤ

ضروری اعلان

۱۔ اگر جنوری ۱۹۳۸ء سے اس وقت تک کے مسلسل پرچے آپ کے پاس نہیں ہیں تو اب طلب فرما لیجئے، تاکہ اسلامی ہند کی تاریخ اور نغمۂ کارواں (دونوں کتابیں، آپ کے پاس مکمل ہو جائیں۔ یہ کتابیں علیحدہ کتابی صورت میں شایع نہ ہوں گی

۲۔ چونکہ اسلامی ہند کو دسمبر ۱۹۳۸ء تک ختم کر دینا ہے، اس لئے "نغمۂ کارواں" کی اشاعت فی الحال ملتوی کر کے "اسلامی ہند" کے صفحات میں اضافہ کر دیا گیا ہے

منیجر نگار

جلد (۳۴) | فہرست مضامین ستمبر ۱۹۳۸ء | شمار (۳)

ہندوستان کے اندر سالانہ چندہ پانچ روپیہ ششماہی تین روپیہ
ہندوستان سے باہر صرف سالانہ چندہ آٹھ روپیہ یا بارہ شلنگ

ششماہی چندہ میں نگار کا جنوری نمبر جو بلحاظ
ضخامت و قیمت شامل نہ ہوگا۔

اڈیٹر:- نیاز فتحپوری

جلد ۳۴	ستمبر ۱۹۴۸ء	شمار ۳

ملاحظات

واردھا اسکیم اور مولانا سید سلیمان ندوی

ابتدائی جبریہ تعلیم کی جو اسکیم گاندھی جی کے مشورہ سے ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب شیخ الجامعہ دہلی نے مرتب کی ہے۔ اسے "واردھا اسکیم" کہتے ہیں اور اس کا مقصود یہ ہے کہ ابتدا ہی سے بچوں میں کچھ کام کرنے کا شوق پیدا ہو جائے اور بڑے ہو کر وہ صرف نوکری ہی کی توقع پر ہاتھ پاؤں توڑ کر نہ بیٹھ جائیں

جس وقت یہ اسکیم شایع ہوئی تھی میں اسی وقت سمجھ گیا تھا کہ ہمارے یہاں کے علمار کرام حسب عادت ضرور اس میں کوئی نہ کوئی نقص پیدا کر کے مسلمانوں کو اس کا مخالف بنا دیں گے اور آخر کار یہ اندیشہ پورا ہو کر رہا

عام طور پر علمار کی تقسیم علمار سوء و علمار خیر میں کی جاتی ہے اور اس میں شک نہیں کہ جس حد تک ذاتی اخلاق و عادات کا تعلق ہے ہزار میں دو چار علمار ایسے مل جاتے ہیں جنھیں ہم علمار خیر کی صف میں جگہ دے سکیں لیکن اگر ذہنی بیداری یا حاسۂ اجتماعی (Common Sense) کے لحاظ سے ان کی تقسیم اعلیٰ و ادنیٰ میں کی جائے تو قسم ادنیٰ میں تو ہمیں ادنیٰ، ادنیٰ تر اور ادنیٰ ترین سبھی مدارج کے نمونے مل جائیں گے لیکن دوسری طرف قسم اعلیٰ کے خانہ میں بھی انشار اللہ صفر ہی نظر آئے گا، تدریجی علو کی اور تقسیموں کا کیا ذکر ہے

سرسید مرحوم نے جب انگریزی تعلیم کی طرف مسلمانوں کو متوجہ کیا تو یہی علمار تھے جنھوں نے مخالفت کرکے پچاس سال پیچھے اپنی قوم کو ہٹا دیا اور جب ملکی آزادی کا سوال پیدا ہوا تو ہمارے یہی علمائے کرام تھے جنھوں نے ہندؤں کے ساتھ اشتراک عمل کو ناجایز قرار دیکر سیاسی حیثیت سے ہمیں پیچھے گرادیا، اور اب کہ عام جبریہ تعلیم کا سوال اٹھا ہے تو ہمارے یہی مذہبی اجارہ دار اسے شجر ممنوع قرار دیکر مسلمانوں کو اس سے دور رہنے کی تلقین کر رہے ہیں

میں یہ سمجھتا تھا کہ اس اسکیم کی مخالفت علما، کی طرف سے ضرور ہوگی لیکن اسی کے ساتھ یہ حسن ظن بھی تھا کہ شاید اونچے درجے کے مولوی اس میں حصہ نہ لیں، لیکن میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب میں نے علامہ سید سلیمان ندوی ایسے حضرات کو بھی اس کی مخالفت پر کمر بستہ پایا۔ اچھا تو آئیے ان کے دلایل پر بھی اک نظر ڈال لیں،

معارف میں مسلسل تین ماہ سے اس مسئلہ پر شذرے شایع ہو رہے ہیں اور ان سب کا خلاصہ وہ ہے جو اگست کے معارف میں شایع ہوا ہے یعنی یہ کہ "بچوں کی ابتدائی تعلیم کی اہمیت اس لئے نہیں ہے کہ اس سے بچپن ہی میں ہر بچہ کو لکھنے پڑھنے اور کچھ کمانے کا ڈھنگ آجائے گا بلکہ اس لئے کہ اس عمر کی تعلیم کا نقش ان کی زندگی میں ہمیشہ کے لئے قایم رہ جائے گا مسلمانوں کا اسی اہم عمر کی تعلیم کو مذہبی تعلیم سے خالی رکھنا، عملاً اپنے مذہب سے ارتداد کے ہم معنی ہے۔ جس جبری تعلیم کے نفاذ کی اسکیم میں یہ پہلو نظرانداز ہوگا، اس کے معنے یہ ہیں کہ یا تو اس کا مقصد یہ ہے کہ مسلمان اس جبری تعلیم سے محروم رہیں یا یہ ہے کہ مسلمان آیندہ عملاً مسلمان نہ رہیں"

اس اعتراض کو اگر ہم اور زیادہ مختصر کر دیں تو مفہوم یہ قرار پائے گا کہ واردھا اسکیم ان کے نزدیک گویا بیدینی کی ترویج ہے

ہر چند ڈاکٹر ذاکر حسین خانصاحب نے اس اعتراض کا یہ جواب دیدیا ہے کہ "اس اسکیم میں مذہبی تعلیم کی پوری گنجایش رکھی گئی ہے اور اسکول کے اوقات کے علاوہ ہر فرقہ اپنی ضرورت کے مطابق اس کا انتظام کر سکتا ہے" لیکن سید سلیمان اس سے مطمئن نہیں ہیں کیونکہ ان کے نزدیک اسکول کے اوقات کے علاوہ جو تعلیم دیجاتی ہے اس کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی، علاوہ ازیں وہ یہ بھی سوال کرتے ہیں کہ اس تعلیم کا بار کون اٹھائے گا ؟ یعنی ہم کیوں اٹھائیں

ان تمام باتوں کو سامنے رکھکر حسب ذیل تنقیحات ہمارے سامنے آتی ہیں :۔

۱ ۔ کیا واردھا اسکیم واقعی اسلام سے ارتداد کی مترادف ہے

۲ ۔ کیا اسکول کے اوقات کے علاوہ مذہبی تعلیم خواہ وہ گھر پر ہو یا مدرسہ میں کوئی اہمیت نہیں رکھتی

۳ ۔ کیا مسلمانوں پر اپنی مذہبی تعلیم کا بار اٹھانا فرض نہیں ہے

تنقیح اول کے سلسلہ میں ارتداد کے لغوی و اصطلاحی معنے کو معرض بحث میں لاکر کوئی منطقی حجت لانا پسند نہیں کرتا، ورنہ میں ان سے تسلیم کرالیتا کہ لفظ ارتداد انھوں نے بالکل غلط استعمال کیا ہے اور زیادہ سے زیادہ اگر وہ کوئی اعتراض کر سکتے تھے تو صرف یہ کہ واردھا اسکیم میں مسلمانوں کو ان کے مذہبی عقاید سے باخبر رہنے کا کوئی انتظام نہیں ہے۔ لیکن اس بحث سے قطع نظر ان سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ انھوں نے "مسلمان" کا کیا مفہوم قرار دیا ہے، یعنی انھوں نے اسلام کے عقایدی پہلو کو سامنے رکھکر :

اعتراض کیا ہے یا اخلاقی و کلچرل پہلو کو سامنے رکھ کر۔ اگر ان کی مراد اس سے صرف "ایمان مجمل و ایمان مفصل" کی تعلیم ہے تو یہ کوئی بڑی بات نہیں، ہر مسلمان بچہ کو ابتداہی میں کلمۂ شہادت، کلمۂ تمجید اور اسی طرح کے بہت سے کلمات کی تعلیم مل جاتی ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ اور ان تمام باتوں کی جو اسلام نے نقطۂ نظر سے ضروری ہوں یا نہ ہوں لیکن مولویوں کے زاویۂ نگاہ سے ضروری ہیں۔ اور اس صورت میں وارد ھا اسکیم پر اعتراض کرنا تحصیل حاصل پر اصرار کرنا ہے۔ لیکن اگر مذہبی تعلیم سے ان کی مراد وہ تمام مذہبی لٹریچر ہے جو ندوۃ العلماء یا دارالعلوم دیوبند میں پڑھایا جاتا ہے اور جس کی ترویج و تبلیغ کے لئے ایک جگہ لمبی داڑھی رکھنے کے لئے وظائف مقرر کئے جاتے ہیں اور دوسری جگہ انقاسم ایسے خالص مذہبی رسائل کے ذریعہ سے رسول اللہ کی قوت رجولیت کے افسانے بیان کئے جاتے ہیں، تو پھر زیادہ صحیح اعتراض یہ ہونا چاہئے کہ جدید جبری تعلیم کا انتظام ندوۃ العلماء اور دیوبند کے سپرد کیوں نہ کردیا گیا تاکہ سوائے مسلمانوں کے (اور مسلمانوں میں بھی کچھ ایسے نہیں بلکہ خالص سید سلیمان کی قسم کے) کسی اور قوم کا بچہ اس سے مستفید ہی نہ ہوسکتا۔ لیکن اگر مراد اس سے اسلامی کلچر کی تعلیم ہے، سو اس کا تعلق نہ دین اسلام سے ہے اور نہ کسی اٹل قانون معاشرت سے۔ تاریخ شاہد ہے کہ مسلمانوں کی جو معاشرت عہد نبوی میں تھی وہ عہد بنی امیہ کی معاشرت سے مختلف تھی اور جو کلچر بنو عباس کا تھا وہ شاہان مغلیہ کا نہ تھا، پھر ہوسکتا ہے کہ جس معاشرت کو آج ہم مسلمانوں کا کلچر کہتے ہیں کل اس میں تبدیلی پیدا ہوجائے۔ ایک قوم کی تمدنی خصوصیات پر مذہبی تعلیم کا اثر ضرور پڑتا ہے لیکن اسی کے ساتھ ماحول بھی کم موثر نہیں ہوتا اور اس نئے تہذیب و معاشرت کے مسائل کو مذہب میں داخل کرنا یا ان میں کسی تغیر و تبدل کے اندیشہ کو خطرۂ ارتداد سے تعبیر کرنا سخت ناروا جسارت ہے۔ (میں یہاں اس مسئلہ پر گفتگو نہ کروں گا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کا کلچر زندہ رہنے والا کلچر نہیں ہے اور اس میں تبدیلی ضروری ہے)۔ اب اگر کوئی اور تیسرا مفہوم مذہب کا ہوسکتا ہے تو براہ کرم سید سلیمان صاحب اسے واضح فرمائیں تاکہ اسکو بھی سامنے رکھ کر ان کے اندیشۂ ارتداد کی حقیقت معلوم کی جائے۔ حیرت ہے اور کسقدر حیرت کہ سید سلیمان صاحب یہ اعتراض تو کر بیٹھے کہ وارد ھا اسکیم میں مذہبی تعلیم کا کوئی انتظام نہیں، اور یہ بات ان کی سمجھ میں نہ آئی کہ یہ اسکیم آل انڈیا اسکیم ہے اور صرف مسلمانوں ہی کے لئے مخصوص نہیں ہے، اس میں شیعہ، سنی، خارجی، وہابی، قادیانی، معتزلی، اشعری، ہندو، جین، سکھ، زردشتی، عیسائی، یہودی، گبر و ترسا سبھی شامل ہیں، اور ظاہر ہے کہ اگر اس اسکیم میں مذہبی تعلیم کو شامل کیا گیا تو مسلمانوں میں کوئی سرخاب کا پر تو لگا نہیں کہ صرف انھیں کے مذہب کی تعلیم کا انتظام کیا جائے اور باقی تمام مذاہب کو نظر انداز کر دیا جائے اور اس صورت میں ان تعلیم گاہوں کی جو حالت ہوگی وہ ظاہر ہے مدرسہ کے ایک گوشہ میں مولوی یہ بتا رہا ہوگا کہ گائے کی قربانی میں کئی آدمی شریک ہوسکتے ہیں، دوسری طرف پنڈت سمجھا رہا ہوگا کہ گائے کا مرتبہ ماں کے برابر ہے اور جو اسے ذبح کرتا ہے وہ ظالم و ناپاک ہے۔ ایک طرف بعض بچوں کو یہ بتایا جا رہا ہوگا کہ غیر اللہ کے نام کا ذبیحہ حرام مطلق ہے، دوسری طرف یہ کہ گوشت جھٹکہ ہی کا کھانا چاہئے، کہیں قرآن پڑھا جا رہا ہوگا، کسی جگہ گیتا، کوئی انجیل کا درس دے رہا ہوگا اور کوئی گرنتھ کا، کسی گوشہ میں تثلیث پر بحث ہو رہی ہوگی اور کسی گوشہ میں وحدانیت پر، کہیں مدح صحابہ کے فضائل بیان ہو رہے ہوں گے اور کہیں تبرا کے ۔۔۔ مولانا کو معلوم ہونا چاہئے کہ مذہب کا تجربہ بہت کافی ہوچکا ہے اور انسانی خون سے زمین کی پیاس بجھانے میں وہ جس حد تک اپنا فرض ادا کرسکتا تھا، ادا کرچکا ہے۔ دنیا کے جتنے مذاہب ہیں سبھی اپنے آپ کو الہامی کہتے ہیں

اور سوائے اپنے سب کو گمراہ — دنیا میں ہزاروں بار حق و باطل کی تمیز کے لئے مناظرے اور مجادلے ہوئے، لیکن آج تک کوئی مذہب اپنے آپ کو برتر ثابت نہ کر سکا، اس لئے اب ان تجربات کی گنجائش مطلق باقی نہیں ہے اور اس پر اصرار کرنا، انتہائی قصور فہم ہے — اگر ابھی ہندوستان کا جہل اس حد تک دور نہیں ہوا کہ وہ مروجہ مذاہب کو خیرباد کہہ کر "مذہب انسانیت" و پاکیزگی اخلاق کے مندر دلوں میں تعمیر کرسکے اور مولویوں اور پنڈتوں کے عذاب سے چھٹکارا حاصل کر سکے، تو سید سلیمان صاحب کو "امن و سکون" کی رعایت اتنی تو ضرور کرنا چاہئے کہ اگر وہ کوئی معقول رائے نہیں دے سکتے تو کم از کم خاموش ہی رہیں۔

دوسری تنقیح یہ تھی کہ کیا اسکول کے اوقات کے علاوہ مذہبی تعلیم کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ اس پر زیادہ بحث کی ضرورت نہیں کیونکہ اس کی لغویت اتنی واضح ہے کہ اگر خود سید سلیمان صاحب سے یہ سوال کیا جائے تو وہ گھبرا کر کہہ اٹھیں گے کہ "میرا مطلب یہ تو نہ تھا" دراصل اس کے سوا ان کے اعتراض کا کوئی اور مفہوم ہو ہی نہیں سکتا۔ وہ خوب جانتے ہیں کہ اگر مذہبی تعلیم نام ہے کسی مخصوص عقیدہ پر قائم کر دینے کا تو اس کی تعلیم گھر کے گہوارہ اور ماں کی آغوش سے شروع ہوتی ہے اور اگر مقصود پیشہ ور مولوی بنانا ہو (جس کی تخلیق اسکول کی حدود سے باہر ہی خوب ہوتی ہے) تو بھی سید سلیمان صاحب مجھ سے زیادہ اس حقیقت سے آگاہ ہیں کہ علماء سلف میں کتنے ایسے تھے جنھوں نے کسی مدرسہ میں زانوئے ادب تہ کیا اور کتنے ایسے جن کا فضل و کمال ان کی انفرادی کوشش کا مرہون منت تھا۔ حیرت ہے کہ ان کے قلم سے یہ بات کیسے نکل گئی کہ "اسکول کے اوقات کے علاوہ جو مذہبی تعلیم دی جائے گی اسکو کوئی اہمیت حاصل نہ ہوگی"

تیسری تنقیح یہ ہے کہ "کیا اپنی مذہبی تعلیم کا بار اٹھانا مسلمانوں کا فرض نہیں ہے"۔ کیا میں سید سلیمان صاحب سے یہ پوچھ سکتا ہوں کہ جب خود ان کی نگاہ میں بھی مذہب کی اہمیت اتنی نہیں ہے کہ وہ جمعیت اسلامیہ کو اس کا ذمہ دار قرار دیں تو حکومت کو کیا غرض پڑی ہے کہ وہ یہ عذاب مول لے — اگر مذہبی تعلیم کا انتظام نہ ہونے کی وجہ سے واردھا اسکیم پر مسلمانوں کو مرتد بنا دینے کا الزام قائم کیا جا سکتا ہے تو سید سلیمان صاحب بھی اسی جرم کے مجرم قرار دئے جائیں گے، کیونکہ مذہبی تعلیم کے لئے نہ واردھا اسکیم روپیہ صرف کرنے کے لئے طیار ہے اور نہ سید سلیمان صاحب

اس سلسلہ میں البتہ ایک بات ضرور غور طلب ہے اور وہ یہ کہ اگر نصاب اور زبان کے لحاظ سے یہ اسکیم کوئی ایسی فضا پیدا کرنے والی ہے جس سے مسلمانوں کے قومی احساس، اجتماعی وقار یا سیاسی وحدت کو صدمہ پہونچ سکتا ہے (اور یہ نفاذ اسکیم سے پہلے نہیں معلوم ہو سکتا) تو بیشک اس کی مخالفت کرنا چاہئے اور پوری قوت کے ساتھ۔ یعنی محض معارف کے شذرات سے نہیں، بلکہ عمل سے، ایثار و قربانی سے، دار المصنفین کے گوشہ میں بیٹھکر نہیں بلکہ میدان میں نکل کر اور آستینیں چڑھا کر۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ اگر یہ وقت کبھی آیا تو "رندان قدح خوار" میں سے کوئی نکل آئے تو نکل آئے، اس "فرقۂ زہاد" سے کسی کا اٹھ کھڑا ہونا محال ہے۔ بلکہ میرا تو خیال یہ ہے کہ اسوقت شاید معارف کے شذرات میں بھی اس کا ذکر نہ آئے گا اور ہو سکتا ہے کہ بد قسمتی سے یہ خطرہ اسی وقت پیش آئے جب مولانا مذکور کو بوجہ علالت ڈاکٹروں نے سختی کے ساتھ زبان و قلم کی جنبش سے روک دیا ہو۔

کیا چین شکست کھا جائے گا؟

چین و جاپان کی جنگ، ابھی تو نہیں، لیکن ایک وقت آنے والا ہے جب اس کے نتائج سے نہ صرف ایشیا بلکہ ساری دنیا کو متاثر ہونا ہے، خواہ کامیابی چین کو ہو یا جاپان کو۔ اس لئے ضروری ہے کہ قارئین نگار کو

اس کی رفتار سے باخبر رکھا جاسکے۔ اس جنگ کے نتیجہ پر حکم لگانے کے لئے واقعات کو مختلف زاویہ ہائے نگاہ سے دیکھنے کی ضرورت ہے۔ ایک یہ کہ چین وجاپان کی اندرونی سیاسی حالت کیا ہے، دوسرے یہ کہ عسکری تنظیم، جغرافی ماحول، اقتصادیات اور بین الاقوامی سیاسیات کے لحاظ سے فریقین کے لئے کیا آسانیاں اور کیا دشواریاں ہیں۔ اس جنگ پر اس وقت تک جو کچھ لکھا گیا ہے وہ یا تو اُن ماہرینِ سیاست کا بیان ہے جو محاذِ جنگ سے علٰحدہ صرف واقعات وحالات کو سامنے رکھ کر نتیجا خذ کرتے ہیں، یا اُن سپاہیوں اور اخباری نمائندوں کا جو اس وقت وہاں موجود ہیں اور یہ دونوں اس باب میں متحد الخیال ہیں کہ "چین تو اس جنگ میں کامیاب نہیں ہو سکتا، لیکن جاپان کا ہار جانا بھی یقینی ہے"۔ بظاہر یہ بات بہت عجیب معلوم ہوتی ہے لیکن ہے بالکل صحیح، کیونکہ جاپان کے لئے چین اتنا بڑا لقمہ ہے کہ وہ اسے چبا نہیں سکتا اور ناچار ایک دن اسے اُگلنا پڑے گا۔ اس وقت تک جو حصہ ملک جاپان نے فتح کیا ہے اسے آپ نقشہ سامنے رکھ کر دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ وہ صرف شمالی حصہ ہے اور جنوبی حصہ کی طرف وہ کوئی اقدام نہیں کر سکا ہے۔ اس کا سبب صرف یہ ہے کہ شمالی حصہ میں ریلوں اور دریاؤں کی وجہ سے فوجی نقل وحرکت وہ بآسانی کر سکتا ہے اور جنوبی حصہ میں چونکہ یہ آسانیاں نہیں ہیں اس لئے وہ مجبور ہے۔ جاپان کی بڑی کوشش یہ ہے کہ چین کی ہر طرف سے ناکہ بندی کر دی جائے تاکہ باہر سے اسلحہ وغیرہ کی مدد اسے نہ پہونچ سکے، لیکن وہ اس میں کامیاب نہیں ہوا اور نہ آئندہ اسکا امکان ہے۔ یہ ممکن ہے کہ وہ ہانگ کانگ اور کینٹن کا تعلق اندرون ملک سے قطع کردے، لیکن اس سے چین بالکل بے دست وپا نہیں بنایا جاسکتا۔ اسکے کئی سبب ہیں اول تو سامانِ حرب آنے کے اور متعدد راستے ایسے ہیں جنھیں جاپان بند نہیں کر سکتا۔ مثلاً ایک ہنوئی (فرانسیسی انڈو چائنا) کا راستہ ہے کہ یہاں سے چین کی سرحد تک ریل بھی ہے، سڑکیں بھی ہیں اور کہا جاتا ہے کہ اس طرف سے کثیر سامانِ حرب چین کو پہونچ رہا ہے، اس کے علاوہ دوسرا راستہ برما کا ہے، جہاں سے یونانفو تک سڑک طیار ہوگئی ہے اور نہایت آسانی سے چین کو سب کچھ پہونچ سکتا ہے۔ تیسرا راستہ براہ لانچو، روس تک پہونچتا ہے، جہاں سے بھری ہوئی لاریاں برابر چین میں آرہی ہیں اور اسی راستہ سے چین چائے کی بڑی مقدار روس روانہ کر رہا ہے

اب اسی کے ساتھ اس حقیقت کو بھی سامنے رکھئے کہ چینی انسان کے مصارف زندگی بہت کم ہیں اور وہ قدرتاً بے انتہا جفاکش ومتحمل واقع ہوا ہے اس لئے چین کے لئے مصارف کا مسئلہ زیادہ پیچیدہ نہیں ہے اور اگر ہو بھی تو وہ دیوالیہ نہیں ہو سکتا کیونکہ اسکی کرنسی کے لحاظ سے سونا اس کے پاس بہت کافی مقدار میں موجود ہے۔ جس وقت ہم چین کے اندرونی جغرافیہ پر نگاہ ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہاں سڑکیں بہت کم ہیں اور کوئی راستہ دو فٹ سے زیادہ چوڑا نہیں ہے، اس لئے جاپان نہ وہاں بھاری بھاری توپخانے پہونچا سکتا ہے، نہ ٹینک۔ اگر اس کی کوشش بھی کیجائے تو نتیجہ یہ ہوگا کہ دھانوں کے کھیت میں وہ دھنس کر رہ جائیں گے، اور پھر کوئی صورت ان کے اِدھر سے اُدھر لیجانے کی نہ ہوگی۔ البتہ ہوائی جہاز ضرور جاسکتے ہیں اور ریلوے لائن سے (جو ایک ہی ہے) مشین گنیں بھی پہونچ سکتی ہیں، لیکن جب تک فوج کی کافی تعداد مع جدید ترین آلاتِ آتش فشاں کے وہاں نہ پہونچے کوئی نتیجہ نہیں نکل سکتا۔ الغرض چین کو مفتوح کرنے کے لئے بجائے توپوں اور ٹینکوں کے انسانوں سے زیادہ کام لینے کی ضرورت ہے اور یہ ظاہر ہے کہ جاپان کے پاس اتنی حملہ آور فوج نہیں ہے، جتنے چین کے پاس جان دینے والے انسان موجود ہیں

یہ بالکل صحیح ہے کہ اس وقت تک چینی سپاہ زیادہ ہلاک ہوئی ہے، لیکن ساتھ ہی ساتھ اس حقیقت کو بھی پیشِ نظر رکھنا چاہئے کہ جاپان نے اپنے ملک سے آکر دوسرے ملک پر حملہ کیا ہے اور چین اپنے ملک کے اندر ہی مدافعت کر رہا ہے اور اس صورت میں اگر دونوں ملکوں کی آبادی برابر ہوتی تو بھی چین کا پلہ بھاری رہتا، چہ جائیکہ جاپان کی آبادی ۸ کرور ۴۰ لاکھ ہے اور چین کی ۴۵ کرور ۳۰ لاکھ۔

جاپان کا حقیقی مقصود اس حملہ سے چین پر حکومت کرنا نہیں ہے بلکہ اس کو مغلوب کر کے اپنی تجارت کی منڈی بنانا اور وہاں سے خام پیداوار حاصل کرنا ہے جس کی جاپان کو سخت ضرورت ہے، لیکن اس مقصود کا پورا ہونا آسان نہیں، کیونکہ اول تو چینیوں کے وطن پرستانہ جذبات اب بہت قوی ہو گئے ہیں اور وہ کبھی جاپانی مال استعمال نہیں کریں گے علاوہ اس کے اسوقت جاپان جو کچھ جنگ میں صرف کر رہا ہے وہ اتنا زیادہ ہے کہ عرصہ تک وہ اسے برداشت نہیں کر سکتا۔ اندازہ کیا جاتا ہے کہ جاپان اسوقت ۵ لاکھ جاپانی ڈالر یعنی تقریباً ایک کروڑ تیس لاکھ روپیہ روزانہ صرف کر رہا ہے اور اس وقت تک ۲ ارب ڈالر (یا چھ ارب روپیہ) خرچ ہو چکا ہے اور نہیں کہا جا سکتا کہ کب تک اس صرف خطیر کو برداشت کرنا پڑے گا اور اس کے بعد بھی نتیجہ کیا ہوگا۔ جاپان میں اسوقت ٹیکسوں کی بھرمار ہے اور اس کے مال کی برآمد ۔ فیصدی گھٹ گئی ہے

خود جاپان اس لڑائی کی الجھنوں کو جس نقطۂ نظر سے دیکھ رہا ہے اس کا اندازہ یوں ہو سکتا ہے کہ وہاں کے نام لیڈر لوگوں سے یہی کہہ رہے ہیں کہ ان کو اس جنگ سے جلد اختتام کی توقع نہ رکھنا چاہئے، لیکن دوسرے ملکوں کے ماہرین جنگ سوچ رہے ہیں کہ آیا جاپان اس غیر معمولی بار کو دو تین سال تک برداشت کر سکتا ہے یا نہیں اور چونکہ چینیوں کو بھی اس کا علم ہے کہ جاپان زیادہ عرصہ تک اس بوجھ کو سنبھال نہیں سکتا اس لئے وہ بھی از سر نو جنگ پر طیار ہو گئے ہیں اور انھیں یقین ہے کہ جنگ جتنی زیادہ طوالت پکڑے گی ان کا اتنا ہی زیادہ فایدہ ہے

اب جنگی نقطۂ نظر سے ہٹ کر انتظامی زاویۂ نگاہ سے دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ جب تک وہ چین کے اس جذبۂ مقاومت کو نہ توڑ لے وہ کسی مفتوحہ علاقہ پر قابض نہیں رہ سکتا یعنی اگر وہ کوئی حصہ ملک حاصل کرے تو بھی اسے قبضہ میں رکھنے کے لئے کم از کم ۲ لاکھ سپاہ رکھنے کی ضرورت ہوگی، اور اس کے بعد بھی یقین نہیں کہ چینی لوگ جاپانیوں کے ساتھ ان کی مرضی کے مطابق معاملۂ تجارت کرنے پر رضامند ہو جائیں گے

اب اسی کے ساتھ آپ جاپان کی اندرونی حالت پر غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ وہ بھی امید افزا نہیں ہے۔ کہا جاتا ہے کہ چین اندرونی اختلافات کا شکار ہے، یہ درست ہے، لیکن جاپان بھی ان اندرونی اختلافات سے پاک نہیں ہے۔ وہاں اسوقت دو جماعتیں ہیں، ایک عسکری اور دوسری مدبرین سیاست کی اور ان دونوں میں سخت اختلاف پایا جاتا ہے۔ ہرچند کچھ عرصہ سے وہاں عسکری جماعت برابر برسر اقتدار ہے لیکن ملک کی عام آبادی اس کو اچھی نگاہوں سے نہیں دیکھتی اور دوسری جماعت کا کسی نہ کسی وقت برسر اقتدار ہو جانا یقینی ہے، کیونکہ چیزوں کی قیمت بہت بڑھ گئی ہے اور کاروبار کی خرابی کی وجہ سے وہاں کا متوسط طبقہ بہت برہم ہے

پھر علاوہ ان دو جماعتوں کے اختلاف کے لطف یہ ہے کہ خود عسکری جماعت کے اندر دو گروہ پائے جاتے ہیں، چنانچہ وہاں کی بری اور بحری فوج کی مخالفت مشہور چیز ہے۔ شنگھائی کی بربادی کا سبب صرف یہی تھا کہ جاپان کی بری فوج منچوریا میں کامیابی حاصل کر چکی تھی اور اس کے مقابلہ میں بحری فوج کو بھی اپنا کارنامہ دکھانا ضروری تھا۔ بظاہر یہ جذبۂ مسابقت فال نیک معلوم ہوتا ہے، لیکن جسوقت اقتصادی دشواریاں بڑھ جائیں گی تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ یہ دونوں فوجیں خود دست و گریباں ہو جائیں گی اور جاپان نہایت ہی ہولناک قسم کے انقلاب کا شکار ہو جائے گا

اب اس کے مقابلہ میں چین کو دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ ۱۹۱۱ء کے انقلاب کے بعد وہاں اتنا اتحاد کبھی نہیں پایا گیا جتنا اسوقت پایا جاتا ہے سیاسی جماعتوں کا اختلاف وہاں اب بھی پایا جاتا ہے اور اگر جاپان نے جنگ نہ چھیڑ دی ہوتی تو یہ اختلاف بدستور تباہیاں پھیلاتا رہتا لیکن اب ایک مشترک دشمن کے مقابلہ کے لئے انھوں نے اپنے اندرونی اختلافات کو ملتوی کر دیا ہے

چین میں ایک جماعت اشتراکیوں کی ہے جن کا سردار مارشل شنگ کائی شیک ہے اور دوسری جماعت قومیت پسندوں کی ہے جس کا سردار اسوقت جنرل پائی تنگ ہسی ہے اور اس میں شک نہیں کہ اشتراکیوں کو نہایت ہی نفرت و حقارت کی نگاہ سے دیکھتا ہے، لیکن اسوقت دونوں جماعتیں ایک ہوگئی ہیں اور مارشل شنگ کائی شیک نے اپنی ستر ڈویژنوں اور جنرل پائی تنگ ہسی کی افواج کو ایک دوسرے سے بالکل متحد کردیا ہے

اب اسباب جنگ کی فراہمی اور تربیت افواج کا معاملہ لیجئے۔ اس میں شک نہیں کہ اگر سامان حرب مل بھی جائے تو غیر تربیت یافتہ فوج اس سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتی۔ اسپین کی موجودہ جنگ کی ابتدا میں یہی ہوا کہ بہت سے ہوائی جہاز غیر ماہر انجنیروں کی وجہ سے تباہ ہوگئے۔ چین کے پاس غیر ملکی ماہرین فن موجود ہیں لیکن کم اور تجربہ کہ وہ بہت زیادہ ہوشیار بھی نہیں۔ کہا جاتا ہے کہ روسی ہوا باز چین میں زیادہ کام کر رہے ہیں لیکن یہ صحیح نہیں ہے اور اگر ہوں بھی تو وہ اس لئے زیادہ مفید نہیں ہوسکتے کہ وہ زیادہ خود رائی سے کام لیتے ہیں۔ جرمن ماہرین فن وہاں زیادہ ہیں اور اس میں شک نہیں کہ نہایت ہوشیار ہیں۔ اول اول جب ہنگ کانگ پر جاپان نے حملہ کیا تو چینی جنرلوں نے ان کے مشوروں کو نہیں مانا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ چین کو شکست کھانا پڑی، لیکن اب جرمن افسران کا اثر بڑھتا جاتا ہے — جب ۲۰ فروری کو ہر ہٹلر نے منچکو پر جاپان کے اقتدار کو تسلیم کرلیا تو یہ اندیشہ پیدا ہوگیا تھا کہ شاید جرمن افسران واپس بلائے جائیں گے، لیکن اول تو ابھی تک کوئی کارروائی ایسی ہوئی نہیں اور اگر ہو بھی تو خیال یہی ہے یہ واپس نہ جائیں گے کیونکہ وہ چین کی کامیابی کے لئے بہت کوشاں ہیں۔ بہرحال اس میں شک نہیں کہ چین کے پاس نہ ویسے آلات حرب موجود ہیں جیسے جاپان کے پاس ہیں اور نہ فوج اتنی تربیت یافتہ ہے تاہم اس کی تلافی تعداد کی زیادتی اور اندرون ملک کے ان دشوار گزار راستوں سے ہوسکتی ہے جہاں جاپان اپنے جدید اسلحہ سے کام نہیں لے سکتا۔ علاوہ اس کے چین کو سب سے زیادہ اعتماد اپنی غیر آئینی (گوریلا)[1] قسم کی جنگ پر ہے۔ ہرچند اس کا نتیجہ یہ ضرور ہوگا کہ چین کی عسکری مرکزیت بہت متزلزل ہوجائے گی اور جنگ ختم ہونے پر ان جماعتوں کو سنبھالنا دشوار ہوجائے گا لیکن اس وقت جاپان کا اقدام و تسلط ضرور رک جائے گا — یہ ہے چین و جاپان کی موجودہ حالت اور یہ ہے وہ صحیح پوزیشن جس کو دیکھ کر ہر شخص اس نتیجہ پر پہونچ سکتا ہے کہ چین کی کامیابی تو جاپان کے مقابلہ میں ممکن نہیں، لیکن جاپان بھی فائدہ میں نہیں رہ سکتا اور جس مقصد کو لیکر وہ اٹھا ہے وہ پورا ہوتا نظر نہیں آتا۔

حال ہی میں روس اور جاپان کے درمیان جو سرحدی نزاع ہوگئی تھی اس سے چین کی توقعات بہت بلند ہوگئی تھیں، کیونکہ جاپانی اقدامات چین کی طرف رک گئے تھے، لیکن اس نزاع کے ختم ہوجانے پر پھر وہی صورت عود کر آئی ہے جو پہلے پائی جاتی تھی۔ دریائے زرد کے سیلاب اور ہیضہ وغیرہ کی وجہ سے گو جاپانی فوجوں کو کافی نقصان پہونچا اور پہونچ رہا ہے، لیکن یہ قدرتی موانع ایسے نہیں جو انسانی عزائم کو پست کرسکیں۔ جاپان تو اسوقت جوا کھیل رہا ہے اور اس نے داؤں پر اپنا سب کچھ لگا دیا ہے۔ اگر اس کو کامیابی ہوگئی تو پھر یہ یقینی ہے کہ ایشیا میں مغربی اقوام کا زور بالکل گھٹ جائے گا، ورنہ کم از کم ۵ سال کے لئے پھر اسے سر اٹھانے کی فرصت نہیں مل سکتی — مغربی ممالک یہ تو یقیناً نہیں چاہتے کہ چین پامال کردیا جائے، لیکن اسی کے ساتھ وہ یہ بھی نہیں چاہتے کہ جاپان جنگ ختم کردے، کیونکہ وہ تو بہرحال اس کے زور و طنطنہ کو توڑنا چاہتے ہیں اور اس کی بہترین صورت یہی ہے کہ جنگ کے غیر معمولی مصارف سے اس کی اقتصادی حالت کو تباہ کردیا جائے اور تجارتی منڈیوں کو اس کے مصنوعات سے خالی

---

[1] (Guerrilla) ہسپانوی زبان سے آیا ہے۔ اس سے مراد وہ بے قاعدہ جنگ ہے جس میں عسکری جماعتیں دشمن پر حملہ کرتی ہیں۔ ۱۸۰۸ء میں ہسپانیوں نے فرانسیسیوں کے خلاف اسی طریق سے جنگ کی تھی اور اسی وقت سے یہ لفظ اس معنی میں رائج ہوگیا۔

مولانا نسبتی واسطی تھانیسری

(۲)

کلیات آپ نے سولہ ہزار اشعار فارسی زبان میں کہے ہیں۔ بارہ قصائد و قطعات اور مختصر سے مرثیہ کے علاوہ باقی سب غزلیں ہیں۔ کلیات نسبتی کے زیرِ نظر نسخہ میں قصائد وغیرہ کے اشعار کی تعداد چار سو اڑسٹھ اور غزلوں کے شعروں کی پندرہ ہزار پانسو ترانوے ہے۔ چند غزلیں دوبارہ لکھی ہوئی ہیں۔ ان مکرر اشعار کی تعداد ساڑھ اشعار کے قریب ہوگی رباعی کے مقررہ اوزان میں چار شعروں کی ایک غزل ہے۔ اس کے علاوہ ان کے مجموعۂ سخن میں کوئی رباعی نہیں -
کلمات الشعراء اور روزِ روشن کے قول کے مطابق فارسی کے علاوہ ہندی (بھاکا) میں بھی طبع آزمائی کرتے تھے اور نسبتی جس کے معنی محمد افضل سرخوش نے "چاند" لکھے ہیں تخلص فرماتے تھے۔ آپ کا ہندی کلام بالکل نہیں ملتا۔ فارسی کلیات بھی خان آرزو المتوفی ۱۱۶۹ھ کے عہد کے بعد گم ہو گیا تھا علاوہ اس نسخہ کے جو مجھے دستیاب ہوا ہے۔ "دیوان نسبتی" کے دو مختصر سے انتخابات اورنٹیل لائبریری پٹنہ میں محفوظ ہیں ـــــ ایک نمبر ۲۱۸ ہے اس کا پہلا شعر یہ ہے:-

در زلزلہ آوردۂ از ناز زمیں را ،　　　یک رہ سرپائے مزن این خاک نشیں را

میرے نسخہ میں یہ شعر پچھوٹیں غزل کا مطلع ہے:-

مہت گفتم برخ پردہ فگندی　　　مرا از روئے خود شرمندہ کردی

میرے نسخہ میں یہ شعر آخری غزل سے پہلی غزل کا تیسرا شعر ہے
اس نسخہ پر تاریخ تحریر درج نہیں۔ مولوی عبدالمقتدر صاحب کے خیال میں یہ نسخہ انیسویں صدی عیسوی کا ہے -
دوسرے نسخہ کا نمبر ۲۱۹ ہے اور یہ پہلے سے زیادہ مختصر ہے۔ یہ اس شعر سے شروع ہوتا ہے ؎

بکوئے یار بنا کردہ اند خانۂ ما　　　بہ شاخِ زلف نہادند آشیانۂ ما

اس میں ۲۸ رباعیاں بھی پائی جاتی ہیں، پہلی رباعی یہ ہے ؎

از ما زچہ روست اختلافِ دُنیا　　　لافِ دنیا بما - گزافِ دُنیا
ایں ہر دو مخالفت بمن آید راست　　　دنیا بخلافِ ما و ما خلافِ دُنیا

میرے پاس جو کلیات ہے اُس میں بجز چار اشعار کے جو ذیل میں درج کئے جاتے ہیں کوئی رباعی موجود نہیں، وہ چار شعر یہ ہیں:-

از جور من شکستہ خاطر شادم ‏ ‏ ‏ ‏ بشکن بشکن کہ دل بدستت دادم
زاد است بہاں روز بلایم یارب ‏ ‏ ‏ ‏ زاں روز سیہ کہ من زمادر زادم
از من غلط اوفتاد او را چہ گنہ ‏ ‏ ‏ ‏ جاں می طلبید یار من دل دادم
اے اشک مباد اگر برد سیل مرا ‏ ‏ ‏ ‏ اے آہ مبادا گر دہی بربادم

میں نہیں کہہ سکتا کہ پٹنہ لائبریری کے یہ انتخابات کن نسخوں سے کئے گئے ہیں۔ میرے نسخہ میں نسبتی کے جتنے مشہور اشعار ہیں۔ سب موجود ہیں اور دیوان کے ابیات کی تعداد بھی بالکل وہی ہے جو مشہور ہے۔ کاغذ کی رنگت اور کتابت بھی نسخہ کی قدامت پر دال ہے۔ مگر صحیح تاریخ تحریر کا علم دشوار ہے، کیونکہ نہ کاتب کا نام درج ہے نہ تاریخ نقل و تحریر البتہ بعض جگہ حواشی پر کاتب نے اشارہ کردیا ہے کہ یہ نسخہ اصل نسخہ کی بعینہٖ نقل ہے۔ کاتب کسی کسی مقام پر پڑھ نہیں سکا۔ اس لئے وہ جگہیں اس نے خالی چھوڑ دی ہیں۔ جہاں تک میں سمجھ سکتا ہوں زیرِ نظر نسخہ تمام معلومہ نسخوں میں سب سے زیادہ مکمل ہے

خانِ آرزو نے دیوانِ نسبتی کا ایک انتخاب کیا تھا۔ چنانچہ لکھتے ہیں "میں نے آج سے بیس برس پہلے اسکے دیوان سے تین ہزار اشعار کا انتخاب کیا تھا۔ جو شاہ مبارک آبرو (میرا شاگرد تھا اور قرابتِ قریبہ بھی رکھتا تھا) لے گیا اس کی وفات کی وجہ سے وہ کاغذات مجھے نہ مل سکے۔ میں ان کی گم شدگی پر کفِ افسوس ملتا تھا۔ اتفاقاً پندرہ برس کے بعد شیخ مبارک محی الدین کی سعی سے جو اس تذکرہ (مجمع النفائس) کی تصنیف کے محرکِ اصلی ہیں، وہی کھویا ہوا انتخاب دستیاب ہوگیا"۔ مختلف تذکروں میں ان کے سو دو سو اشعار ملتے ہیں بجز ان کے اور کوئی نسخہ کلیاتِ نسبتی کا کہیں موجود نہیں انڈیا آفس اور بوڈلین لائبریری کی فہرستیں پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں میری نظر سے گزری ہیں ـــــ ان میں بھی دیوانِ نسبتی موجود نہیں۔ علامہ شیرانی اور علامہ شبلی کے کتب خانے بھی اس سے خالی نظر آتے ہیں۔ مجھے جو نسخہ کلیاتِ نسبتی کا ملا ہے وہ مولوی صاحب مکھڈ کے کتب خانہ کا ہے

کلام پر تبصرہ

اگرچہ نسبتی کا کلام دستِ بُردِ زمانہ کی نذر ہوگیا، مگر آپ کا نام شاعری کے حلقوں میں برابر گونجا کیا اور جب کبھی ہندوستان نے ایران کے مقابلہ میں اپنے فارسی گو شعرا پیش کئے تو نسبتی کا نام بھی ان میں ہوتا تھا۔ چنانچہ صائب شاہ عباس صفوی کے دربار کا ملک الشعراء نسبتی کے سحرِ کلام کا قایل تھا[1]۔ ذیل میں چند اکابرِ ادب و اساطین شعر کی رائیں پیش کی جاتی ہیں جن سے معلوم ہوگا کہ اسلاف کا ان کی شاعری کے متعلق کیا خیال تھا

---

[1] گزشتہ اشاعت میں صائب کی رائے اور اُس پر علامہ شیرانی کی رائے گزر چکی ہے

اور علما حال کس نظر سے دیکھتے ہیں:۔

۱۔ "اشعارش نہایت گداختہ۔ پختہ و خوش قماش واقع شدہ" مخزن الغرائب (احمد علی سندیلوی)

۲۔ "ان کا ہر شعر پر معانی ہوتا ہے، یہ شعر ذیل متقدمین میں بہت مشہور ہے:۔

نسبتی دل بدرد معتبر است ہر لالہ کہ داغ آبرو دارد۔ کلمات الشعرا (محمد افضل سرخوش)

۳۔ در شاعری خداوند علو کلام۔ اکثر گفتوہائے عشق در دو ہر ابیات او کلام دلی دارد۔ گل رعنا (شفیق اورنگ آبادی)

۴۔ نسبتی تھانیسری شاعر خوش خیال است۔ سفینۂ بے خبر (میر عظمت اللہ بے خبر بلگرامی)

۵۔ بندہ آرزو معتقد سخن او است۔ خیلے بدرد و سوز حرف می زند۔ مجمع النفائس (سراج الدین علی خاں آرزو)

۶۔ طبعے با سوز و گداز داشت کہ اثرش از اشعارش تراوش می کند، ہنگام خواندن اشعار اشک از چشم او می تراوید۔ روز روشن (مظفر حسین صبا)

۷۔ کہتے ہیں نسبتی ہمہ تن درد ہے۔ شعر پڑھتے ہی آنکھوں میں آنسو بھر لاتا ہے۔ عمل صالح (محمد صالح کنبوہ)

۸۔ ملک الشعرائے زمان خود سودا نے انھیں فارسی کے اکابر شعرا میں شمار کیا ہے

۹۔ خزانۂ عامرہ کی رائے گزر چکی ہے

۱۰۔ مولانا نسبتی کا کلام تذکرہ میں پڑھا ہے۔ کلام پختہ ہے۔ کہیں کہیں تشبیہیں بھی نادر ہیں (سید سلیمان ندوی)

۱۱۔ نسبتی بے مثل کہنے والے تھے (مولانا نیاز مدیر نگار)

ادب و شعر کے نقاد، نسبتی کے متعلق جو رائے رکھتے ہیں، مجملاً عرض کر چکا ہوں۔ اب ان کے کلام سے مثالیں پیش کر کے میں یہ بتانے کی کوشش کروں گا کہ نسبتی کیا تھے[1]۔ کسی نے کہا ہے کہ شاعری دل کا معاملہ ہے۔ حساس طبیعتیں جب

---

[1] رفع التباس کے لئے یہ بتانا ضروری ہے کہ مولانا نسبتی واسطی تھانیسری کے علاوہ ایک اور شاعر بھی یہ تخلص کیا کرتا تھا، وہ مشہد کا رہنے والا اور شاہ طہماسپ صفوی کے زمانہ کا مشہور شاعر ہے۔ بہت عرصہ آذربیجان میں رہا آخر الامر شاہ مذکور کے عہد حکومت میں دارالارشاد اردبیل میں وفات پائی اور وہیں سپرد خاک ہوا۔ (آتشکدۂ آذر اصفہانی)

نمونۂ کلام یہ ہے:۔

غائب: دیدہ ناشدہ جاں داد نسبتی، بے چارہ تاب ہجر از ین بیشتر نداشت
می نگری زماں زماں روز وصال سوئے من تا شب ہجر سوزدم حسرت ہر نگاہ تو
بسوئے گر کم آیم بر دلم نبود غبار از تو کہ از آمد شد بسیار گشتم شرمسار از تو
(منقول از آتشکدۂ آذر اصفہانی)

در اول بے دانستمت بر پائے سرت چہ می کردم اگر دل می نہادم بر وفائے تو
سر نخت و عالمے نگران زبہ کسی آنکہ بدل فرود کہ تاب نظر نداشت
منقول از خریطۂ جواہر میرزا مظہر

دردمند کہ بیدوفائے تو بود صبر او کاش بمقدار جفائے تو بود
نسبتی سادہ جرائی شدہ قاصد ہمہ شوق اضطرابش بے رفتن نہ برائے تو بود
(منقول از مجمع النفائس خان آرزو)

اپنے واردات قلب بیان کرنے پر آتی ہیں تو سننے والوں کو جگر تھام لینا پڑتا ہے۔ نسبتی چونکہ ایک آزاد منش صوفی تھے اسلئے انھوں نے زیادہ تر غزلیں ہی لکھیں۔ یا یوں کہئے کہ آنسوؤں۔ آہوں۔ نالوں۔ دل کے ٹکڑوں اور جگر پاروں کا ایک انبار ہے۔ جس کا نام دیوان نسبتی ہے۔ قصائد ہیں تو وہ بھی اس والہانہ محبت کا نتیجہ ہیں جو انھیں داماد رسول اور زوج بتول سے تھی ۔۔ مدحیہ شاعری کو وہ ننگِ انسانیت سمجھتے تھے

چرا مدح کردند مخلوق را بہ ننگم ز خاقانی و انوری

تذکرہ نویسوں کا متفق اللفظ ہو کر کہنا کہ عشق ان کے کلام سے ٹپکتا ہے اور درد ان کے اشعار سے برستا ہے۔ مبالغہ نہیں حقیقت ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں اور کتنا صحیح لکھتے ہیں ؎

جُز شعر تو نسبتی ندیدیم خونِ جگرے بایں روانی

نسبتی کا اندازِ سخن وہی ہے جو کلیم۔ صائب۔ غنی اور سلیم کا ہے۔ مگر یہ ساتھ ہی ساتھ متقدمین کی سادگی کے بھی دلدادہ ہیں۔ ان کے سیکڑوں اشعار پڑھ جائیے ایک لفظ ایسا نہ ملے گا جس کے لئے لغت دیکھنے کی ضرورت پڑے۔ کلیم کا ہم سخن کہنے سے میرا یہ مطلب نہیں کہ مضمون آفرینی اور خیال بندی میں یہ بھی اسی فضا میں اُڑتے ہیں۔ بلکہ جب تک خیال بندی حسنِ تعلیل کی حد سے نہیں نکلتی نسبتی اس کے ہمدوش رہتے ہیں اور مثالیہ میں تو یہ یقیناً کلیم کو پیچھے چھوڑ جاتے ہیں۔

علامہ شبلی شعر العجم جلد سوم میں تحریر فرماتے ہیں:۔ "مثالیہ مضامین پہلے بھی خال خال پائے جاتے تھے، امیر خسرو کا ایک مشہور قصیدہ سراپا اسی صنف میں ہے لیکن کلیم۔ صائب اور غنی نے گویا اس کو ایک خاص فن بنا دیا۔ چونکہ تینوں شاعر کشمیر میں مدت تک ہمدم و ہم قلم رہے تھے، اور باہم مشاعرے رہتے تھے۔ اس لئے قیاس یہ ہے کہ ہم صحبتی کے اثر نے اس طرز کو مشترک جولاں گاہ بنا دیا"

یہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ نسبتی کو ظفر خاں احسن سے یک گونہ تعلق تھا اور وہ اس تعلق کی بنا پر کبھی کبھی کشمیر جایا کرتے تھے۔ اس لئے ممکن ہے ان کی شاعری پر کشمیر کے اس قیام گاہ گاہی کا اثر ہوا ہو اور صائب کی ملاقات اور دوستی سمندِ طبع پر تازیانہ ہوئی ہو، گو نسبتی طبعاً حافظ شیراز کے رنگ کو پسند کرتے تھے، چنانچہ لکھتے ہیں کہ:۔

من نسبتیم معتقدِ حافظِ شیراز در فارسیم بیں کہ ہمہ فرس طراز است
راہِ زمینِ حافظِ شیراز رفتہ ایم تا ہمتش بہ فیضِ سخن راہبر شود

اور حسن دہلوی کے بھی معتقد تھے ؎

احسن احسن زہے سخن پرداز حسنِ ہند سعدی شیراز

مگر ماحول سے متاثر ہونا ضروری تھا۔ علامہ ایک جگہ شعر العجم میں رقمطراز ہیں کہ "مثالیہ یعنی کوئی دعویٰ کرنا اور اس پر شاعرانہ دلیل پیش کرنا۔ یہ طرز نہایت مقبول ہوا۔ یہاں تک کہ شاعری کے خاتمہ تک قائم رہا"

یہی وجہ ہے کہ اگر نسبتی اپنے سوز دروں کی وجہ سے سعدی۔ حسن دہلوی اور حافظ کے معتقد تھے وہاں صائب کے مثالیہ کے بھی شیدا تھے۔ مثالیہ شاعری بظاہر ایک قسم کا تصنع و آورد ہے۔ بسا اوقات یہ پھبتی کی حد سے نہیں بڑھتی۔ لطیف تغزل ایسی پھبتی کب برداشت کرسکتا ہے۔ مگر مثالیہ کی اثر آفرینی کی اسوقت کوئی حد نہیں رہتی، جب وہ حسب حال ہونے کے علاوہ بے ساختہ معلوم دے، مثلاً

نسبتی دل بدرد معتبر است ——— لالہ با داغ آبرو دارد

دل بدرد آمد مرا در بزم وصلش نسبتی ——— در بہاراں تازہ می گردد جنوں دیوانہ را

شدم از خاطر آں مست بدخو ——— چو حرفِ حالتِ مستی فراموش

چوں ناوکے کہ در جگرِ صید نی خسلد ——— در دل ہمی خلد نگہِ ناتمام او

رواں شد محمل لیلیٰ و مجنوں با دلِ سوزاں ——— جُدا از کارواں اُفتادہ چوں از کارواں آتش

مانند غریقے کہ بخاشاک زند دست ——— چسپیدہ بداماں مژۂ چشم ترِ ما

از دیدنِ تو دیدۂ من سیر نگردد ——— کس پُر نتواند کہ کند چشم گدا را

مثالیہ کی دُھن میں تغزل کی لطافت ہاتھ سے جانے نہ دینا نسبتی کو اپنے ہمعصروں میں ممتاز بنا دیتا ہے۔ اسکی وجہ غالباً وہی ہے جو سعدی کے ذکر میں علامہ شبلی نے تحریر فرمائی ہے "شیخ میں یہ جذبہ (عشق) فطری تھا۔ اور چونکہ وہ تمام عمر ہر قسم کے دنیاوی تعلقات سے آزاد رہا۔ اس لئے اس جذبہ کی گرمی اور تیزی اسی طرح مشتعل رہی۔ اسی آگ کے شعلے ہیں جو اس کی زبان سے نکلتے ہیں"۔ سعدی کو دنیا داروں سے تعلق رکھنا پڑتا تھا اور وہ ان کی طرف سے یکسر بے نیاز نہیں ہوسکتے تھے جیساکہ ان کی زندگی کے واقعات ثابت کرتے ہیں۔ مگر نسبتی ان سب باتوں سے پاک تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی آتشِ شوق کا التہاب کم اور اُن کا کلام سراپا سوز بن گیا۔ مثلاً

ایں عشقِ بے قرار و ایں صبر بے تحمل ——— فرصت نداد کیدم از ترکتاز ما را

ہست از آشنائی تو بمن ——— ایں کہ بیگانگی است خویشاں را

آشنامی شوی و می ترسم ——— آشنائی شود بلا نشود

رہے است راہِ محبت کہ بغیر دل نرود ——— بیا دسر نتواں کرد جستجوے ترا

شوق گو دود دم برآرد عشق گو جانم بسوز ——— نیست غم در خانہ گر آتش فتد پروانہ را

جانِ ازاں بیش ما عزیز تر است ——— کہ بجا نہا سپردیست جاناں را

می کنم سخت یادِ او امروز ——— غالباً یاد کردہ است مرا

تفرقۂ ہجر و وصل لازمۂ عاقلی است ——— ہست یکے روز و شب عاشقِ دیوانہ را

سخت می ترسم کہ من بیمار می خواہم ترا | آرزو خولیست اما ایں قدر ہا خوب نیست
ما اندوہ دل . دلگیر کردہ است | در آغاز جوانی پیر کردہ است
نسبتی می رود زحال بحال، | باز بر حال خویشس می آید
بر خاک فگندم دل وہم خواہش دل را | دیوانہ چو شوریدہ با سباب نشا زد
حسرت بے حسرتی از غم مرا ساز د ہلاک | حسرت او یک نفس گر از دلم بیروں شود
دور آخر گشت و ساقی رفت و مجلس بر شکست | من ہماں خونم کہ در مینائے خود مستم ہنوز
دیدیم عاقبت کہ ہمیں داغ بود گل | عمر عبث تلف شدہ در انتظار گل
گفتی احوال بگو . حالِ دگر گونم شد | حال ایں است کہ از حال بجائے شدہ ام
علوم درد با وراقِ لالہ درج شدہ است | زعلم داغ ہمیں یک رسالہ می بینم،
شرح و بیانِ داغ در اوراقِ لالہ نیست | اے دل بجاں مطالعۂ ایں رسالہ کن،
خیز زخاکِ شہید تو باد ہم نگرفت | خوشا غبار کہ بادے بگیر دش خبرے

شعر اسی قدر لطیف اور پُر درد ہوتا ہے، جتنی تشبیہات نادر و لطیف ہوں نسبتی کے کلام کا اس زاویۂ نظر سے مطالعہ کیا جائے تو تختۂ گلزار سامنے آجاتا ہے۔

بے روئے تو بیمار شد از بسکہ نگاہم | از جا بعصائے مژہ خیزد نظرِ ما

مژہ کو نظر کا عصا کہنا تشبیہ و محاکات کا نہایت پاکیزہ امتزاج ہے

چشمِ مخمور ت زند بر دل چو زخم تازہ را | زخمہائے کہنہ لب وامی کند خمیازہ را

زخم کو خمیازہ کہنا کتنا پیارا انداز بیان ہے

مانندِ غریقے کہ بخاشاک زند دست | چسپیدہ بداماں - مژۂ چشم ترِ ما

قاآنی کا یہ شعر ؎

دو زلفِ تابدار او بچشم اشکبار من | چو چشمۂ کہ اندروں شنا کنند مار ہا

مرکب تشبیہ کا لاجواب نمونہ کہا جاتا ہے۔ مگر قاآنی سے بہت پہلے نسبتی یوں فرماتے ہیں :-

وقتِ گریہ یادِ رویش می کنم | خام کارم نقش می بندم بر آب

قاآنی نے پانی میں سانپ لہرائے اور نسبتی نے تصویر کھینچی "نقش بر آب بستن" محاورہ بھی ہے اور عاشق کی سعیِ لاحاصل کی حسرتناک تصویر بھی ۔ جب آدمی نئی نئی محبت کرتا ہے تو اس کی نظر میں حسن یار کی کشش بھی ہوتی ہے اور خطرات کا اندیشہ بھی اس تذبذب و پس و پیش کو نسبتی یوں ظاہر کرتے ہیں :-

دلم ہمی رود و باز پس ہمی نگرد   چگونہ راہِ بیاباں رود کہ نو سفر است

محبوب کے چلے جانے کے بعد دل میں جو خلش سی پیدا ہوتی ہے اس کو اس طرح ظاہر کرتے ہیں

تو رفتی ز ما خارے ہست در دل   گذشتہ موسمِ گل، خار باقی است

تشبیہ شاعری کی جان ہے اور اس کی خوبی یہ ہے کہ ما بہ اور وجہ اتحاد پر اسکی بنیاد قایم ہو۔ اس رنگ کا شعر ملاحظہ ہو:۔

می رود بے تو بزیرِ مژہ ہا جوئے سرشک   سایۂ بید بر آں آب روان است ہنوز

جس نے کسی دریا کے کنارے بید کے سایہ کو متحرک دیکھا ہے وہ سمجھ سکتا ہے کہ نبتی نے مصرعہ اول پیدا کرنے میں کیا کمال دکھایا ہے۔ راز کے جلد تر افشا ہو جانے کو یوں بتایا ہے کہ آدھی رات کے وقت سورج طلوع کر آیا۔ ندرتِ بیان اور پاکیزگیٔ تشبیہ کی لاجواب مثال ہے ؎

راز ما زود در روئے روز افتاد   نیم شب صبح شد بخانۂ ما

ذوق مرحوم کا ایک شعر ہے جو سادگی جوش اور واقعیت کی بہترین مثال ہے

رہتا ہے اپنا عشق میں یوں دل سے مشورہ   جس طرح آشنا سے کرے آشنا صلاح

نبتی کا بھی یہ شعر ملاحظہ ہو ؎

چوں دو ہمدرد کہ گریند بہم از پئے دل   می کند دیدہ جدا گریہ، دلِ زار جدا

میر تقی میر کا شعر ہے :۔

زمیں پر میں جو پھینکا خط کو کر بند   بہت تڑپا کیا جوں مرغِ پر بند

نبتی بہت عرصہ قبل اس مضمون کو یوں ادا کر چکے ہیں

نبتی مکتوب را در زمیں افگندہ ایم   ہمچو مرغِ نیم بسمل خود بخود پر می زند

کسی مضمون کو جوں کا توں لے لینا سرقہ کہلاتا ہے لیکن اگر مضمون میں کوئی ترقی پیدا کی جائے تو معیوب نہیں یہی حال ترجمہ کا ہے۔ کسی مضمون کا ایک زبان سے دوسری زبان میں منتقل کرنا اسی وقت جایز ہو سکتا ہے۔ جب اصل خیال کا حسن قایم رہے۔ مثلاً نظیری نیشاپوری کا شعر ہے ؎

بوئے یار من ازیں سست وفا می آید   گلم از دست بگیرید کہ از کار شدم

سودا نے اس کو اردو میں منتقل کیا اور زیادہ حسن کے ساتھ

کیفیتِ چشم اس کی مجھے یاد ہے سودا   ساغر کو مرے ہاتھ سے لیجو کہ چلا میں

خاقانی کا ایک شعر ہے :۔

ہمسایہ شنید نالہ ام گفت   خاقانی را دگر شب آمد،

اُردو میں یہ شعر اس طرح منتقل ہوا کہ اصل اور نقل کا امتیاز اُٹھ گیا

پھر چھیڑا حسن نے اپنا قصہ ۔۔۔ بس آج بھی رات سو چکے ہم

میر نے اس مضمون کو یوں لیا

یونہی میر گر رات روتا رہے گا ۔۔۔ تو ہمسایہ کاہے کو سوتا رہے گا

حاجی جان محمد قدسی عہد شاہجہانی کا مشہور شاعر کہتا ہے:۔

زود بہ کرد مرا من بے صبر داغِ خویش را ۔۔۔ اولِ شب می کُشد مفلس چراغِ خویش را

یہی خیال میر نے اُردو میں ادا کیا اور زیادہ حُسن کے ساتھ

شام ہی سے بجھا سا رہتا ہے ۔۔۔ دل ہوا ہے چراغ مفلس کا

ہاں تو میں نسبتی اور میر کے اشعار کا تقابل دکھا رہا تھا۔ شیخ غلام ہمدانی مصحفی کا ایک شعر ہے جس کا اس مضمون سے تو کوئی تعلق نہیں مگر اس کے خیال کی بنیاد یہی نسبتی کا "مکتوب بر زمیں اُفتادہ" معلوم ہوتی۔ اس لئے وہ بھی سُن لیجئے:

مرے سینہ میں دل بے تابیوں سے ۔۔۔ پھڑکتا ہے مثالِ مرغِ پر بند

عاشق مے کشی میں مصروف ہے، لیکن چونکہ معشوق شریک نہیں۔ اس لئے وہ مصروفِ نالہ بھی ہے۔ معشوق کی ستم ظریفی دیکھئے کہ وہ نالۂ عاشق کو پیالہ کی "کھنک" کہتا ہے۔ وجہ شبہ وہی آواز ہے سے

پیالہ می خورم و دل بنالہ می آید ۔۔۔ تُرا گماں کہ صدا از پیالہ می آید

معاملہ بندی

عشق و ہوسناکی کے واقعات اہلِ لکھنؤ کی زبان میں معاملہ بندی کہلاتے ہیں۔ فارسی میں معاملہ بندی کے موجد شیخ سعدی مانے جاتے ہیں۔ امیر خسرو نے اس میں نمایاں اضافہ کیا۔ مرزا اشرف جہاں قزوینی۔ ولی دشت بیاضی۔ وحشی یزدی نے اس کو مستقل فن بنا دیا۔ (شعر العجم) نسبتی نے بھی اس فن میں بساط بھر خوب داد دی سعدی کا مشہور شعر ہے:۔

دوستاں منع کنندم چرا دل بتو دادم ۔۔۔ باید اول بتو گفتن کہ چنیں خوب چرائی

امیر خسرو نے ایک جدید اسلوب پیدا کر کے یہی مضمون باندھا

جراحتِ جگرِ خستگاں چہ می پرسی ۔۔۔ زغمزہ پرس کہ ایں شوخی از کجا آموخت

نسبتی کے تیور ملاحظہ کیجئے:۔

نسبتی را ملامتے مکنید ۔۔۔ ناصحاں روئے یار را نگزید

رئیس المتغزلین نظیری نیشاپوری نے کہا تھا۔

تا منفعل ز بر بخشش بیجانہ بنیمش ۔۔۔ می آرم اعتراف گناہ نبودہ را

نسبتی یک جرم را صد عذر گفت گرچہ تقصیرے کہ می باید نداشت

محفل جمی ہے، معشوق کی دزدیدہ نظریں رقیب پر پڑ رہی ہے۔ دفعتاً عاشق کی نظر بھی معشوق کی طرف اُٹھتی ہے۔ وہ اس حال سے آگاہ ہو کر گھبرا سا جاتا ہے لیکن فوراً سنبھل کر عاشق کو بری نظروں سے دیکھنے لگتا ہے عاشق نادم ہوتا ہے، اور رقیب بھی شرمندہ ہو جاتا ہے۔ اس منظر کی تصویر نسبتی نے جس خوبی سے کھینچی ہے اسکی مثالیں شاعری میں بہت کم ملتی ہیں لکھتے ہیں

سوئے اغیار ہمی دید نہانے دیدم من خجل گشتم و اغیار خجل۔ یار خجل

ناکام عاشق جانتا ہے کہ محبوب کا اس کے یہاں آنا محال ہے، لیکن پھر بھی وہ جھوٹی باتوں سے دل کو تسلی دیتا رہتا ہے، اس کیفیت کو نسبتی یوں بیان کرتے ہیں:۔

دروغ می گفتم در کار و می گویم کہ یار آمد نمی دانم کہ تا کے ایں روش دل را بجا دارم

دوسرے مصرعہ سے سوز و گداز کی جو تصویر پیش کی گئی ہے۔ اس کا جواب نہیں۔ آدمی عالم تنہائی میں محبوب کی غیبت میں سیکڑوں منصوبے باندھتا ہے اور دل ہی دل میں کہتا ہے کہ اب کے ملاقات ہونے پر یہ کہوں گا، یوں کہوں گا، مگر سامنا ہوتے ہی سب کچھ بھول جاتا ہے اور پھر وہ سوچتا ہے کہ کیا بات تھی، مجھ سے کیوں نہ کچھ کہا گیا، رعب حسن تھا۔ سحر کلام تھا۔ کیا تھا۔ نسبتی اس کو یوں ظاہر کرتے ہیں:۔

ہیچ بتو نمی تواں گفت کہ ایں چہ حکمت است لب بسخن چو وا کنی بستہ شود زبان من

اسی رنگ و مضمون کے اشعار چند اور ملاحظہ ہوں:۔

می پرسی و ما دلشدگاں نطق نداریم ایں چیست کہ از کار فتادہ است زبانہا
پرسید کہ چونی و نگفتم کہ چسانم امروز زباں سخت ز تقریر فتادہ است
می رسی و خشک می گردد زبانِ گفتگو می روی و می تراود از لبم گفتار ہا

رہگزر کی ملاقات کے بہت سے پہلو ہوا کرتے ہیں، ایک یہ بھی ہے کہ محبوب انجان بن کر عاشق کے قریب سے گزر جاتا ہے اور نگاہ نہیں اُٹھاتا، عاشق سوچتا ہے کہ میں نے کیا جرم کیا جسکی پاداش میں یہ ظلم روا رکھا گیا۔

نمی دانم چہ دیدہ از من بے چارہ آں بدخو بہ بیند چوں مرا در رہ نماید دیدہ را دیدہ

عاشق شکایتوں سے بھرا بیٹھا ہے، معشوق آنکھوں آنکھوں میں اُس سے پوچھتا ہے کہ کیا حال ہے وہ کیا جواب دے۔ باتیں تو ہزار ہیں، لیکن بیان کیونکر ہوں۔ نسبتی اس کیفیت کو یوں بیان کرتے ہیں:۔

چو زحالِ من بمستی بنگہ سوال کردی ز ہجوم گفتگوہا۔ گلہ پائمال کردی

شیخ سعدی کا ایک شعر ہے:۔

دل و جانم بتو مشغول و نظر در چپ و راست تا ندانند رقیباں کہ تو منظورِ منی

اسی مضمون کو مولانا نسبتی یوں ادا کرتے ہیں :۔

نگاہ می کنم و در کساں ہمی بینم — مباد راز من و توکس از نگہ یابد

حسن وعشق کی دُنیا غیر محدود ہے، اس میں ہزاروں قسم کے واقعات پیش آتے ہیں۔ وصال کی نشاط آفرینیوں اور ہجر کی زہرہ گدازیوں کے دامن میں جس قدر حوادث و واردات پنہاں ہیں، ان کے اظہار کا نام ہی غزل ہے۔ لیکن غزل کا بہترین شعر وہی ہو سکتا ہے جس میں سوز و ساز کے ساتھ زبان کی شیرینی اور بیان کی نقادگی بھی پائی جائے۔ چنانچہ سعدی، خسرو، حافظ اور نظیری کے قبول عام کا سبب یہی ہے۔ اب ہم نسبتی کے رنگ کی مختلف مثالیں پیش کرتے ہیں :۔

نسبتی مارا بعالم عالمے دیگر شدہ است — ہستم اندر عالم و عالم نمی دانم کہ چیست

دُنیا میں ہونا اور پھر دُنیا کو نہ جاننا۔ اور اسی جہاں میں ایک نیا جہاں آباد کرنا محویت کی بہترین صورت ہے۔ مجبوری کی صورتیں ملاحظہ ہوں :۔

ہر چند دوختیم دل پارہ نسبتی، — پہلوئے ہر شگاف شقے چند ماندہ است

بلبل چہ کند گناہ او نیست — آں گلبن سرکشیدہ خوب است

نظر بروئے تو بے اختیار می افتد — نگاہ از رخ خوبت نگاہ نتواں داشت

درد محبت کی گرانمایگی ملاحظہ ہو :۔

ہزار جانِ گرامی فدائے یک دردت — کہ نیم دردِ تو سرمایۂ دو صد جگر است

معشوق کی طرف سے معمولی سی معمولی تکلیف بھی سیکڑوں راحتوں کی حامل اور ہزاروں لذتوں کا سرمایہ ہوتی ہے۔

آرزوئے دوست کے جانگزا نتائج کی طرف اشارہ کرتے ہیں :۔

سخت می ترسم کہ من بسیار می خواہم ترا — آرزو خوبست اما ایں قدرہا خوب نیست

میر نے اس مضمون کو یوں باندھا ہے :۔

یاد اس کی اتنی خوب نہیں میر باز آ — ناداں پھر وہ جی سے بھلایا نہ جائے گا

لفظ "سخت" کا استعمال ملاحظہ ہو :۔

می کنم سخت یادِ او امروز، — غالباً یاد کردہ است مرا،

کہتے ہیں کہ اگر کسی کو یاد کیا جائے تو وہ بھی اس کا اثر محسوس کرتا ہے۔ اس مفروضہ کے ماتحت نسبتی کہتے ہیں کہ میری بے قراری کا باعث اس کا یاد کرنا ہے

رشک جوں جوں حسن میں اضافہ ہوتا ہے۔ عاشق کی پریشانیاں بڑھتی جاتی ہیں۔ وہ سمجھتا ہے کہ حسن کی یہ عالمگیری دُنیا کو اپنا مسحور کرلے گی اور یہی اسے گوارا نہیں۔ اس جذبۂ رشک کو اس طرح ظاہر کرتے ہیں :۔

رشک من چوں عشق من - ہر روز می گردد فزوں خوب تر می گردی و من بدگماں تر می شوم

رشک کے اور بعض اشعار ملاحظہ ہوں :-

نہ طربہا نہ شادمانیہا ست عشق وسواس بدگمانیہاست

چہ بری تو نام دشمن بہ بہانۂ شکایت گلہ گر مراد داری گلہ کن ولے زما کن

من تلخکام گشتم ازیں رشک و مرداں نامِ لبت برند دہاں پُر شکر کنند

ہر کہ سودائے کند اول بہ بیند سود را در زیانِ چند دادم جانِ غم فرسود را

سودا کرنے والے کی نظر پہلے نفع پر پڑتی ہے - لیکن میری تجارت دیکھئے کہ جان کے عوض چند نقصان خرید لئے لیکن اس زیانکاری کے "سود" کو دیکھئے کتنا بلند ہے -

قیمت دوستی چہ می پرسی عاشقی صد زیاں ویک سوداست

عاشق چاہتا ہے کہ یار کی نظر بار بار اس پر پڑے ذرا اس کا حسنِ طلب اور اندازِ بیان کا فریب ملاحظہ فرمائیے :-

نگاہے چند باید کرد تا فارغ کند ما را یکے جاں می بردا ما - یکے دل را یکے دیں را

نظیری کا ایک لاجواب شعر ہے ؎

ز فرق تا بہ قدم ہر کجا کہ می نگرم کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجاست

بابا فغانی کا ایک مشہور مطلع ہے ؎

خوبی ہمیں کرشمہ و ناز و خرام نیست بسیار شیوہ ہاست بتاں را کہ نام نیست

نظیری اور فغانی کے اشعار میں جو فرق ہے - اہلِ نظر سے پوشیدہ نہیں - نظیری فرماتے ہیں :- "سر سے پاؤں تک جہاں کہیں نظر جا پڑتی ہے کرشمہ، دامنِ دل تھام لیتا ہے کہ دیکھنے کے قابل جگہ اگر ہے تو یہی"۔ گویا نظیری کے نزدیک قامتِ یلد کی "ادائیں اور کرشمے" اصل حسن ہیں - مگر فغانی فرماتے ہیں - کرشمہ و ناز و خرام ہی کا نام حسن نہیں - اور بھی بیسیوں جانستاں ادائیں ہیں جن کا کوئی نام نہیں

ورائے عشوہ و ناز و خرام و رعنائی دگر ہزار بلا ہمرہ است بالا را

عام خیال ہے کہ وصل سے دل کا اضطراب ختم ہو جاتا ہے - مگر اہلِ بصیرت جانتے ہیں - کہ وصل میں شوق کی آگ اور بلند ہوتی ہے اس رمز کو نسبتی یوں ظاہر کرتے ہیں :-

دل بدر آمد مرا در بزمِ وصلش نسبتی در بہاراں تازہ می گردد جنونِ دیوانہ را

حافظ نے بھی یہ نکتہ سمجھایا ہے لیکن دو شعروں میں ؎

بلبلے برگِ گلِ خوش رنگ در منقار داشت واندراں برگ و نوا خوش نالہائے زار داشت

گفتمش در عین وصل این نالہ و فریاد چیست　　گفت مارا جلوۂ معشوق در این کار داشت

مرزا غالب فرماتے ہیں ؎

ایک ہنگامہ پہ موقوف ہے گھر کی رونق　　نوحۂ غم ہی سہی ۔ نغمۂ شادی نہ سہی

نسبتی اس سے پہلے یوں کہہ گئے تھے ؎

عیش گر نیست "کارِ دیگر" است　　نیست بے کار کارخانۂ ما

اگرچہ مرزا کا شعر زیادہ چست ہے، لیکن نسبتی نے "کارِ دیگر" کے ابہام سے ایک خاص لطف پیدا کر دیا۔

دعا و دشنام کے پامال مضمون کو نسبتی نے یوں لکھا ہے:۔

گفتیم دعا و دو دشنام　　یعنی کہ شنیدہ ام دعا را

باز آکہ باز رنگ بکار آورد کسے　　آب رفتہ باز بیاید بجوئے ما

کہنے کو تو عاشق کہتا ہے کہ تو لوٹ آئے گا تو ہم پھر زندہ ہو جائیں گے مگر اس واپسی کو "آب رفتہ بجوئے باز آمدن" سے تعبیر کر کے دلی خدشات و ناامیدی کا اظہار بھی کر رہا ہے۔ یعنی اس دعا کی حیثیت طفل تسلی سے زیادہ نہیں۔ روزمرہ محاورہ کو کس خوبی اور حسن کے ساتھ نظم کیا ہے

بعض اوقات انسان کا دل نامعلوم طور پر اندر ہی اندر بیٹھنے لگتا ہے۔ لیکن انسان اس اذیت کے باوجود چپ رہتا ہے

گشتہ ام آزردہ دل ۔ اما نمی دانم ۔ چرا　　شکوہ ات کردن نیارم باہمہ آزارہا

رندی و سرمستی کے خیالات ۔ دنیا کی بے ثباتی اور صلائے عشرت و نشاط کے مضامین خیام اور حافظ نے جس جوش و خروش کے ساتھ ادا کئے ہیں فارسی شاعری میں کسی نے کم ادا کئے ہوں گے ۔ نسبتی نے اس موضوع پر نسبتاً کم خامہ فرسائی کی ہے ۔ مگر جو کچھ لکھا ہے خوب لکھا ہے، چند اشعار ملاحظہ ہوں :۔

نیست دوراں را بقائے دور۔ دور ساغر است　　غم مخور از دورِ گردوں۔ خوش بگرداں جام را

نسبتی مے خوردۂ۔ اسباب قیل و قال چیست　　اینک اینک آتش است و اینک اینک فرہست

نسبتی بادۂ برباد لب او نز دیم　　فصل گل برمن و توخندہ زناں می گزرد

بے وجد مرد کہ راہ عشق است　　مستانہ بزن دو گام و می رقص

تاکے غم صبح و شام خوردن　　مے می خور و صبح و شام می رقص

از پا منشیں بپائے خم ہم　　در دست بگیر جام و می رقص

شراب خوردم و افروختم ستارۂ خویش　　نہ ذرہ اخترو از اختر آفتاب شدم

مے باقی و ماہتاب باقی ست　　مارا بتو صد حساب باقی ست

رودے و سرودے و شرابے و کبابے ــــ از عمر بگیرید حریفانہ حسابے
خرقہ بردوش، صراحی بہ بغل، جام بکف ــــ می خورم بادہ ببازار ببانگِ نَے و دف

کوئے یار میں پہونچ کر عاشق کے قدم رُکنے لگتے ہیں۔ گویا کسی نے پاؤں سے طاقت رفتار سلب کر لی۔ یہ مضمون بہت ہی عام ہے۔ تقریباً تمام شعراء نے اس پر خامہ فرسائی کی۔ لیکن نسبتی نے جس انداز سے اس کو پیش کیا ہے وہ بھی دیکھئے :۔

یارب! سرِ کوچہ کہ باشد؟ ــــ ایں راہ۔ کہ دیر می شود سطے
از سرِ کوئے تو ہر گہ روئے در رہ می کنم ــــ راہ کم کم می سپارم۔ گام کوتہ می کنم
ایں سرِ کو، راست بگو، جائے کیست؟ ــــ بے سببے۔ پائے زجا می رود

کہنا تو یہ ہے کہ معشوق بے وفا ہوتے ہیں اور ان کے وعدوں کا کوئی اعتبار نہیں، لیکن طرزِ ادا کی بلاغت دیکھئے

نمود وعدۂ قتلم دو چشم او۔ لیکن ــــ چہ اعتماد تواں کرد قولِ مستاں را

جب عشق کمل ہو جاتا ہے، تو پھر ہجر و وصال کی تمیز اٹھ جاتی ہے

تفرقۂ ہجر و وصل لازمۂ عاقلی است ــــ ہست یکے۔ وزو شب عاشقِ دیوانہ را

تکالیف سہتے سہتے آدمی ان تکالیف کو بھی لذت محسوس کرنے لگتا ہے۔ اس خیال کو محتشم کاشی نے یوں ادا کیا ہے

ایں جور دیگر است کہ آزار عاشقاں ــــ چنداں نمی کنی کہ بہ بیداد خو کنند

نسبتی کہتے ہیں :۔

جور تو التفات دگر بود بردنم ــــ گم کردہ براے چہ ایں التفات را
لباسِ عربدہ بر قدِ غمزہ ات تنگ است ــــ چہ دشمنی تو کہ جنگِ تو آشتی رنگ است

عشاق کے دل چھیننے والی چیز "غمزہ و ادا" ہوتی ہے، اس لحاظ سے "غمزہ" جنگ ہوا لیکن وہی چیز جس کا نام غمزہ ہے عاشق کو سب سے زیادہ محبوب ہے اس لئے اسے آشتی سے تعبیر کیا

در وصل عیش مے کشد و در فراق غم ــــ مانند شعلہ حُسن ترا پشت و رو یکے است

شعلہ کا کام جلانا ہے۔ سیدھے۔ اُلٹے جس رُخ اس کے سامنے جائیں گے۔ وہ جلائے گا۔ یہی مثال ترے حُسن کی ہے وصل و فراق دونوں حالتوں میں تباہ کن ہے

زندگی شدائد و نوائب کے مجموعہ کا نام ہے۔ اگر ایک مشکل حل ہو جائے تو اس کا مطلب یہ نہیں۔ کہ اب جادۂ حیات کی ساری اُلجھنیں اور تمام پیچیدگیاں دور ہو گئیں۔ اس کو نسبتی یوں ظاہر کرتے ہیں :۔

یک گرہ گر وا شد از کاکل۔ چہ سود، ــــ شانہ را صد کار با ہر موئے اوست

دنیا دل لگانے کے قابل نہیں۔ اوروں نے کیا نفع پایا۔ جو تمہیں کسی فایدہ کی امید ہو۔ یہ مضمون ہزاروں طرح بندھ چکا ہے۔ شیخ سعدی نے یوں فرمایا ہے :۔

دل دریں پیرزنِ عشوہ گر دہر مبند کیں عروسے است کہ در بند بسے داماد است

خواجہ حافظ یوں نصیحت کرتے ہیں :۔

مجو درستیٔ عہد از جہانِ بے بنیاد کہ ایں عجوزہ عروسِ ہزار داماد است

لیکن نسبتی نے ایک نیا اسلوبِ بیان اختیار کیا ہے ؎

یکے ز باغِ ہوس "نو بر مراد" نخورد ہزار مرغ بریں کہنہ شاخسار نشست

مضمون آفرینی اور جدت بیان کی مثال ملاحظہ ہو :۔

فہمید ز بانِ آں دو ابرو گویا کہ دو چشم من دو گوش است

خندہ خندہ ہیچ گہ عالم نپرسیدی بناز گریہ گریہ آبروئے دیدۂ خونبار رفت

خندہ خندہ اور گریہ گریہ کی تکرار و تقابل نے شعر میں جان ڈال دی ہے

ہزار دے بگزشت و ہزار فصل بہار ولیک از دل پرخونِ لالہ داغ نرفت

اس مضمون کا مشہور شعر ہے :۔

تہی دستانِ قسمت را چہ سود از رہبر کامل کہ خضر از آبِ حیواں تشنہ می آرد سکندر را

لیکن نسبتی کا انداز بیان بہت شاعرانہ ہے، شاعر بھی انھیں چیزوں کو دیکھتا ہے جنھیں عام لوگ دیکھتے ہیں۔ لیکن شاعر کا نقطۂ نظر بدلا ہوا ہوتا ہے۔ فرہاد و شیریں کے معاملہ کو نسبتی جس نگاہ سے دیکھتے ہیں وہ یہ ہے :۔

لالہ است از قتل گاہِ کوہکن در بیستوں خونِ ناحق رفتہ رفتہ دامنِ صحرا گرفت

مرزا غالب نے جب لالہ و گل کو دیکھا تھا تو ان کے دل نے یہ صدا دی تھی :۔

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہوگئیں خاک میں کیا صورتیں ہونگی جو پنہاں ہوگئیں

مصیبت اور تکلیف عشق کی پہلی منزل ہے، بہت پامال مضمون ہے مگر نسبتی نے اس انداز سے تازگی پیدا کی ہے :۔

ہرکس کہ براہ تو بیفتاد در افتاد پیچیدنِ پا۔ قاعدۂ اولِ گام است

انسان اپنی غلطیاں دوسری کے سر تھوپنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور اس بات پر کبھی راضی نہیں ہوتے کہ اپنی خطا کا اعتراف کرلیں۔ اگر کوئی ایسا موقع پیش آئے کہ ماننے کے سوا کوئی چارہ کار باقی نہ رہے۔ تو پھر یہ کہ کر "میرا قصور تو نہ تھا فلاں نے مجھے اس غلط راستہ پر لگا دیا" الزام سے اپنی بریت ثابت کی جاتی ہے۔ ذیل کے شعر میں انسانی فطرت کے اسی پہلو کو تمثیل کے پیرایہ میں بے نقاب کرنے کی کوشش کی گئی ہے ؎

نسبتی دل از مزاج خویشتن افتادہ است	بے دماغیہاے خود را خردہ بر مینا گرفت

کسی دلیل کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ لفظ آخر ہے اور اس کو رد نہیں کیا جا سکتا۔ سخت سے سخت دلائل ٹوٹ سکتی ہیں۔ اور رد کر دی جاتی ہیں۔ فلاسفہ کو جو لوگ گمراہ کہتے ہیں۔ ان کے پاس یہی بڑی دلیل ہے ؎

اے نسبتی تو چند بری نام چون و چند	چندیں ہزار دسوسہ زیں چند و چوں تست

عارفِ روم نے اسی مسئلہ کو ان دو اشعار میں سمجھایا تھا

پاے استدلالیاں چوبیں بود	پاے چوبیں سخت بے تمکیں بود

گر باستدلال کار دیں بُدے	فخر رازی راز دار دیں بُدے

لیکن نسبتی نے ایک شعر میں ادا کر دیا اور زیادہ پُر لطف انداز سے۔

بلند بالا ہونا حُسن سمجھا جاتا ہے۔ لیکن نسبتی فرماتے ہیں۔ نہیں وہ چیز جس کا نام حُسن ہے کچھ اور ہے ؎

قامتش سخت دلکش افتادہ است	ورنہ قد بلند بسیار ست

نسبتی لفظ سخت کا استعمال اکثر کرتے ہیں اور نہایت خوبی کے ساتھ

نظیری نے بھی اسی مضمون کا ایک شعر کہا ہے :-

حسن تو زیور تو لیس است ایں قدر چرا	بر گوش و سینہ زحمتِ زیور نہادۂ

جب تک امتحان۔ آزمائش اور مقابلہ نہ ہو، کھرے کھوٹے کی تمیز نہیں ہو سکتی۔ نسبتی کا شاعرانہ اندازِ بیان ملاحظہ ہو :-

شمع روشن کن کہ تا روشن شود احوالہا	در تہ بال و پر پروانہ چندیں دفتر است

خاموش گشتۂ تو و لے گفتگو بجاست	چندیں حدیث بالب خاموش رفتہ است

یعنی تری خاموشی لاکھ زبانوں کی ایک زبان ہے۔ اس لئے اگر تو خاموش ہو گیا تو کیا ہوا۔ ہنگامۂ گفتگو اسی طرح گرم ہے

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ہمارے حافظہ میں کوئی چیز چٹکیاں لیتی ہے۔ لیکن یاد نہیں آتی۔ نسبتی اس خیال کو یوں ظاہر کرتے ہیں :-

چہ حکمت است ندانم کہ نام من او را	بدل ہمی رسد و ہمچناں فراموش است

اسی مضمون کو دوسرے زاویۂ نگاہ سے اس طرح ادا کیا ہے :-

نسبتی ہر چہ در دل است از تو	بر زباں آید و ادا نشود

دیر و حرم کے جھگڑے اور یہ ظاہر پرستیاں اسی وقت تک ہیں۔ جب تک انسان خدا شناس نہیں ہوتا۔ عرفان حاصل ہونے کے بعد مسجد و مندر کے جھگڑے ختم ہوتے ہیں، نسبتی اس خیال کو اس طرح ظاہر کرتے ہیں :-

مرا از دیر پیدا گشت آں گم گشتۂ مسجد   مگر ہیں کوچۂ از کعبہ در بتخانہ مے آید

عرفی نے اسی مسئلہ کو یوں سلجھایا ہے :۔

عاشق ہم از اسلام خرابست وہم از کفر   پروانہ چراغ حرم و دیر نداند

کسی دوسرے عارف نے اسی باب میں یوں اظہار خیال کیا ہے :۔

ہر جا کنیم سجدہ بداں آستاں رسد   مقصود ما ز دیر و حرم جز حبیب نیست

نسبتی کے کلام کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں زندگی ہے۔ اس کا ہر شعر زندگی کے متفاول رُخ سے بحث کرتا ہے اور متشائم پہلو کو بہت کم سامنے رکھتا ہے، ملاحظہ ہو :۔

تا ہست دست و بازو، در کار دار دستے   انداز دست، شاید یکرہ بدامن افتد

یعنی بڑے بڑے تارک الدنیا جب دنیا کی دلفریبیوں کو دیکھتے ہیں تو حسرت بھری نظریں اس پر ڈالتے ہیں۔ نسبتی نے اس خیال کو کیسے اچھوتے انداز سے ظاہر کیا ہے، فرماتے ہیں :۔

نگاہ از پس سر می کند بصد حسرت   ہر آں شکار کہ از پیش دام می گزرد

عرفی نے کہا تھا :۔

عرفی از صید گہ ابن نظر دور مرو   کہ گہے گوشۂ چشمے بشکارے دارند

عرفی کو یقین ہے کہ کسی کا التفات ضرور کسی وقت شکار کی طرف پھر مایل ہوگا اس لئے وہ دور جانا نہیں چاہتا۔ لیکن نسبتی کہتے ہیں :۔

بر امیدے زندہ می باشم دریں نخچیر گاہ   یار، می گویند، گاہے قصد لاغر می کند

"می گویند" کہہ کر شک کا اظہار کرتا ہے۔ یعنی معلوم تو ہے۔ کہ لاغر کو کوئی شکار نہیں کرتا۔ لیکن محض دل خوش رکھنے کے لئے ہم نے اس ناقابل یقین بات پر امید کی عمارت کھڑی کر رکھی ہے۔ اور اس نخچیر گاہ میں جی رہے ہیں۔ صحیح رنگ تغزل ملاحظہ

بودیم ز خود بے خبر افتادہ ولیکن   در سینہ خلیدی و بیک بار خبر شد

ہم اپنے آپ سے بھی بے خبر پڑے تھے کہ اچانک تو نے دل میں چٹکی لی، اور ہم خبردار ہو گئے

ایک اور شعر :۔

ملامتہائے پے در پے ندامتہائے گوناگوں   کسے داند کہ او چوں من بہر افسانہ می سوزد

وہی شخص پے بہ پے ملامتوں اور گوناگوں ندامتوں سے واقف ہو سکتا ہے جو میری طرح ہر افسانہ پر تڑپ اُٹھے۔

فضل حسین تبسم

(باقی)

سیاسیات یوروپ

(۷)

جمہوریت فرانس کا نقطۂ نظر

یورپ میں فرانس ہی ایک ایسا ملک ہے جہاں زراعت و حرفت دونوں کا وزن برابر پایا جاتا ہے اور اس لئے وہ بہ نسبت جرمنی اور برطانیہ کے بیرونی بازاروں سے زیادہ بے نیاز ہے اور اسے غیر ملک سے بہت کم سامان غذا منگانا پڑتا ہے

فرانس کی ریڑھ کی ہڈی وہاں کا متوسط طبقہ ہے جس میں چھوٹے چھوٹے زمیندار و کاشتکار شامل ہیں اور ان کی مالی حالت ایسی ہے کہ حکومت مفلس ہوجائے تو ہو جائے لیکن ملک نادار نہیں ہوسکتا۔ لورین کے آہنی معدنیات فرانس کی صنعت و حرفت کو اتنا اُبھارے ہوئے ہیں کہ اسے مزید کسی چیز کی ضرورت نہیں

یہ ہے فرانس کی اقتصادی حالت جس سے وہ بہر حال مطمئن ہے، لیکن اسی کے ساتھ ایک تلخ حقیقت بھی سن لیجئے جس کا دور کرنا نہ جمہوری حکومت کے بس کی بات ہے نہ کسی سرمایہ دار کی اس کا تعلق نہ اندرونی اقتصادیات سے ہے نہ سرحد رہائن سے اور نہ قدیم دشمن جرمنی سے بلکہ اس کا تعلق صرف سماج سے ہے اور وہ یہ کہ وہاں کی پیدائش کا اوسط بہت کم ہوتا جارہا ہے

سنہ ۳۴ء میں وہاں کی پیدائش ۶۷۷،۳۶۵ تھی اور اموات ۶۳۸۵۲۵، یعنی صرف ۴۰ ہزار زیادہ۔ سنہ ۳۵ء کے ابتدائی تین ماہ میں پیدائش کا اوسط بہ نسبت سنہ ۳۴ء کے ۱۰ ہزار اور کم رہا۔ سنہ ۳۴ء میں پیدائش کا اوسط ۱۶ فی ہزار تھا اور اموات کا ۱۵ فی ہزار۔ لیکن اب یہ اوسط بھی برابر گھٹتا جارہا ہے۔ اس کے مقابلہ میں جرمنی کو دیکھئے وہاں پیدائش کا اوسط ۱۸ فی ہزار ہے اور اموات کا ۱۰ فی ہزار۔ اٹلی میں ۲۳ اور ۱۴ کی نسبت ہے اور روس میں ۴۴ اور ۲۶ کی

ہرچند جرمنی میں بھی یہ اوسط قابل رشک نہیں ہے پھر بھی فرانس سے زیادہ ہے، کیونکہ جرمنی آبادی میں سالانہ گیارہ لاکھ کا اضافہ ہوتا ہے اور فرانس کی آبادی میں صرف سات لاکھ کا اس لئے اگر فرانس کی ۴ کرور ۲۰ لاکھ کی آبادی مادرار ربائن کی جرمن آبادی کو جو ۶ کرور ۵۰ لاکھ ہے، بیم و ہراس کی نگاہوں سے دیکھ رہی ہے تو تعجب کی بات نہیں، چنانچہ یہی وہ اندیشہ تھا جس کی بنا پر مارشل فوش نے ایکبار مزاحیہ انداز میں کہا تھا کہ فرانس اور جرمن کے مسئلہ کا حل یہی ہے کہ دو کرور جرمن مردوں کو آختہ کر دیا جائے

ہرچند فرانس میں اسلحہ کی تجارت بہت وسیع ہے، لیکن عام طور پر وہاں کے لوگ بہت صلح پسند ہیں اور تاجروں زمینداروں اور کاشتکاروں میں کوئی ایسا نہیں جو جنگ کو پسند کرتا ہو۔ جو مختلف حکومتوں نے اپنا نصب العین ظاہر کرنے کے لئے مختلف جملے وضع کئے ہیں۔ مثلاً جرمنی کا مقولہ یہ ہے کہ "جرمنی ہر چیز سے بلند ہے"[۲] برطانیہ کا مقولہ ہے کہ "حکومت تو برطانیہ کی ہے"[۱] لیکن فرانس کا کہنا صرف یہ ہے کہ "فرانس کو زندہ رہنے دو"[۳]

الغرض فرانس صرف یہ چاہتا ہے کہ وہ مرے نہیں زندہ رہے، اپنی زمینوں کی کاشت کرتا رہے اور اپنی چھوٹی چھوٹی دوکانوں کو قایم رکھے۔ فرانس کے انسان کی تین خصوصیات بہت عجیب ہیں:۔ صحت فکر، توازن اور صداقت۔ وہ مبالغہ، شیخی اور بڑھ چڑھ کے باتیں بنانا پسند نہیں کرتا، اور امن و سکون چاہتا ہے۔ سیاسی حیثیت سے وہ محض اپنی حفاظت چاہتا ہے اور اقتصادی حیثیت سے روپیہ بچانا پسند کرتا ہے۔ وہ ترقی چاہتا ہے لیکن اپنے اجتماعی حرکت و عمل سے، اپنی محنت و ذہانت سے، دوسروں کا حق غصب کرکے نہیں

فرانس کو گزشتہ جنگ عظیم میں بظاہر جو کچھ ملا ہے کم نہیں ہے اور وہ صرف یہی چاہتا ہے کہ وہ اس کے پاس باقی رہے۔ درانحالیکہ انصاف سے دیکھئے تو اُن قربانیوں کے لحاظ سے جو اس نے کی ہیں، اس کو بہت کم فایدہ رہا۔ اس کو گزشتہ جنگ کے اختتام پر کیا ملا؟ ۔ السیک لورین۔ پندرہ سال کے لئے حصۂ سار، جزائر کا مرون، شام کا حق وکالت (Mandata) اور تاوان۔ سو السیک لورین فرانسیسی علاقہ تھا ہی جو جرمنی نے چھین لیا تھا، سار جرمنی کو واپس مل گیا، شام کی وکالت میں جتنا صرف ہو جاتا ہے اتنا ملتا نہیں، رہگیا تاوان جنگ، سو جرمنی نے وہ بھی ادا نہیں کیا

سچ پوچھئے تو ۱۹۱۸ء کی صلح فرانس کو بھلی نہیں اور اب پندرہ سال بعد وہ جرمن عسکریت کا دباؤ اپنی مغربی سرحد پر دیکھ رہا ہے۔ گزشتہ ایک صدی میں جرمن، فرانس پر تین بار حملہ کر چکا ہے اور اب فرانس کسی طرح نہیں چاہتا کہ پھر اس پر حملہ کیا جائے

---

[۱] Rule Britimia. [۲] Germany on top of everything [۳] Let France live.

گزشتہ جنگ عظیم کے متعلق یہ کہنا کہ اس میں غلطی جرمنی ہی کی تھی درست نہیں۔ یقیناً فرانس بھی اس غلطی میں شریک تھا، لیکن اس میں شک نہیں کہ جرمن افواج نے زیادتیاں بہت کیں۔ فرانس کو اس جنگ میں جو نقصان پہونچا وہ فرانسیسی قوم کی کفایت شعار اور امن پسند ذہنیت کے لئے یقیناً ناقابل برداشت تھا۔ دو کرور انسانوں کا اتلاف اور ناقابل اندازہ مالی نقصان ایسی بات نہ تھی کہ فرانس اسے اتفاق کہکر خاموش ہو جاتا۔ اس نے سوچا کہ آیندہ اس امکان کا سدباب کرنا چاہئے اور اس نے اپنے مستقبل کا تعمیری پروگرام یہ قرار دیا:-

(۱) مغربی یوروپ میں قوی ترین بری و ہوائی قوت۔ (۲) توپخانہ اور آہن پوش موٹروں کی بڑی تعداد۔ (۳) مشرقی سرحد کی قلعہ بندیاں (۴) اسلحہ و سامان حرب کی صنعت کا فروغ (۵) دنیا میں سب سے زیادہ سونے کی مقدار (۶) جرمنی کی عسکری قوت کو کم کرنا (۷) بین الاقوامی انجمن (۸) معاہدہ لوکارنو (۹) وسطی یوروپ کی چھوٹی چھوٹی سلطنتوں (رومانیا، زیکوسلاویکیا، جگوسلیویا) اور پولینڈ سے عسکری و سیاسی اتحاد (۱۰) محاذ اسٹریا کے متعلق برطانیہ و اٹلی سے مفاہمت۔

لیکن باوجود اس پروگرام کی تکمیل کے بھی فرانس مطمئن نہیں ہے اور اس کا عدم اطمینان بالکل بجا ہے۔ فرانسیسی فوج اسوقت یوروپ کی قوی ترین فوج نہیں ہے، روسی فوج تعداد میں اور جرمن فوج قوت میں اس سے زیادہ ہے۔ فرانس اچھی طرح جانتا ہے کہ اس کی لازمی فوجی خدمت کرنے والی سپاہ جرمن توپخانوں کے سامنے ایک دن نہیں ٹھہر سکتی اور ہوائی طاقت میں بھی جرمنی بالکل فرانس کے برابر ہے۔ رہیں مشرقی سرحد کی قلعہ بندیاں سو وہ زمیں دوز ہیں اور جرمن طیارے ان پر آسانی سے گزر سکتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ سنہ ۱۹۱۴ء میں فرانس کی جنگی طیاریاں سنہ ۱۸۷۰ء کی جنگ کیلئے موزوں نہیں اور سنہ ۳۸ء کی طیاریاں سنہ ۱۴ء کی جنگ کے لئے

لیگ اقوام کو جو ضرب کاری جاپان نے منچوریا میں اور اٹلی نے حبشہ میں پہونچائی ہے اس نے لیگ کا اقتدار بالکل ختم کر دیا اور اب اس کے اعتماد پر فرانس یا کوئی اور سلطنت اپنے آپ کو محفوظ نہیں سمجھ سکتی۔ وسط یوروپ کی چھوٹی چھوٹی سلطنتوں کے ساتھ فرانس کا اتحاد بیشک مستحکم ہے، لیکن پولینڈ پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ رہا جرمنی کے غیر مسلح کرنے کا مسئلہ سو وہ اس طرح ختم ہو گیا کہ جرمن نے لیگ سے علحدگی اختیار کر لی اور اب اس پر کوئی دباؤ باقی نہیں رہا۔ روس کے ساتھ فرانس کی صلح بیشک کار آمد چیز ہے، لیکن وہ اتنی دور واقع ہوا ہے کہ کوئی فوری مدد فرانس کو اس سے نہیں مل سکتی۔ رہا محاذ اسٹریا کا معاملہ سو اسے انگلستان و جرمنی کے بحری معاہدہ اور اٹلی کی جنگ حبشہ نے ختم کر دیا۔ الغرض یہ ہیں مشکلات فرانس کے جنھوں نے اس کو پریشان کر رکھا ہے

بریانڈ کی صدارت کے زمانہ میں فرانس کا طرز عمل جرمن کے ساتھ مصالحانہ رہا، کیونکہ وہ سمجھتا تھا کہ جرمنی کی ۶ کرور ۵۰ لاکھ کی آبادی عرصہ تک دبی حالت میں نہیں رہ سکتی، علاوہ اس کے وہ یہ بھی جانتا تھا کہ جرمن کی جائے وقوع وسط یوروپ میں ایسی ہے کہ اگر یہ کمزور ہو گیا تو پھر دل یوروپ کا توازن بھی باقی نہ رہے گا۔ لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جرمنی بے لگام ہو کر

اور منھ زور ہوگیا۔ فرانسیسیوں نے رہائن خالی کیا اور اس کا جواب یہ ملا کہ تاوان جنگ بھی ختم ہوگیا۔ جرمنی کو برابر کا عسکری اقتدار دیا گیا اور اس کے جواب میں کیا ملا؟ ۔ ہٹلر ۔ جرمنی کو انھوں نے سار واپس دیا اور اس کے بدلے انھیں کیا ملا؟ جرمنی میں لازمی فوجی خدمت اور ایک زبردست ہوائی بیڑا

اب اسی کے ساتھ اور الجھنوں کو دیکھئے۔ فرانس نے اسلحہ بندی کے معاملہ میں امریکہ اور انگلستان کے مقابلہ میں اپنی نسبت ۵ء ۱ منظور کرلی ہے۔ اس لئے کیوں نہ جرمنی اپنے لئے بھی اسی نسبت کا مطالبہ کرے، اسی کے ساتھ فرانس یہ بھی دیکھ رہا ہے کہ معاہدہ ورسیلز بیکار ہوکر رہ گیا ہے اور جرمنی کے مطالبہ کرنے پر اس کے کھوئے ہوئے ملاقہ کا واپس مل جانا بالکل قرین قیاس ہے۔ پھر جب حالات یہ ہیں تو فرانس کیا ہر وہ ملک جو جنگ عظیم میں کامیاب رہا تھا بجز اس کے اور کسی نتیجہ پر نہیں پہونچ سکتا کہ لڑائی میں نقصان فی الحقیقت انھیں کو پہونچا جنھوں نے فتح حاصل کی تھی

فرانس کی ڈپلومیسی یہ ہے کہ جن ممالک سے اس کا اتحاد ہے وہ لیگ اقوام میں شامل ہوکر باہد گر متحد رہیں۔ پھر اب دیکھئے کہ فرانس کا اتحاد کن ممالک سے ہے۔ انھیں سے جن کو جنگ میں کچھ نہ کچھ مل رہا تھا یعنی بلجیم، زیکوسلاویکیا، رومانیہ، یوگوسلاویا، روس کو بھی بوجہ اتحاد فرانس اسی میں شامل کرلیجئے۔ اب ان کے مقابلہ میں ان ممالک کو لیجئے جنھیں جنگ سے کچھ فایدہ نہ ہوا یعنی جرمنی، اٹلی، آسٹریا، ہنگری اور بلغاریہ۔ یہی وہ دو گروپ جن کے درمیان اختلاف قایم ہے اور فاتح گروپ آیندہ تحفظ کے لئے جتنی تدبیریں کرتا جاتا ہے دوسرا گروپ اتنا ہی زیادہ معیار تحفظ کو سخت کرتا جارہا ہے

اب فرانس کی اور تدابیر کو ملاحظہ کیجئے:-

(۱) وہ مغربی حصۂ یورپ کے ممالک کے درمیان ایک معاہدہ ہوائی طاقت کے متعلق چاہتا تھا تاکہ اس طرح انگلستان اور اٹلی کے ساتھ اس کے تعلقات زیادہ مضبوط ہوجائیں لیکن اسی کے ساتھ ضرورت اس کی بھی تھی کہ مشرقی حصۂ یورپ سے بھی اس کے تحفظ کا اطمینان ہوجائے، لیکن جرمنی نے اس کو گوارا نہیں کیا اور اس لئے فرانس کی یہ تدبیر خاک میں مل گئی

(۲) وہ ایک معاہدہ ایسا چاہتا تھا کہ فرانس اور اٹلی ملکر اس کے ذمہ دار ہوجائیں کہ وسط یورپ کے ممالک کی جو سرحدیں اسوقت قائم ہیں وہ بدستور قایم رہیں گی، لیکن ہٹلر نے اسے بھی کامیاب نہیں ہونے دیا اور اب کہ اسکا قبضہ آسٹریا پر بھی ہوگیا ہے، اس کا امکان ہی باقی نہیں رہا

(۳) اسی طرح کا ایک معاہدہ وہ اور بھی چاہتا ہے جس سے پولینڈ، روس اور جرمن کی سرحدیں محفوظ ہوجائیں۔ روس تو اس پر راضی ہے لیکن پولینڈ اور جرمنی طیار نہیں۔

فرانس کے اس تمام داؤ پیچ میں قابل اعتماد بات صرف وہ معاہدہ ہے جو ۱۹۳۵ء میں روس کے ساتھ ہوا ہے اس کی رو سے ایک ملک دوسرے کی مدد کرنے پر مجبور ہے۔ زیکوسلاویکیا نے بھی روس اور فرانس کے ساتھ الساہی

معاہدہ کرلیا ہے۔ لیکن جرمنی بھی، جو روس و فرانس کے اس اتحاد کو کبھی اچھی نگاہ سے نہیں دیکھ سکتا تھا، خاموش نہیں رہا اور اس نے ایک طرف جاپان سے اتحاد کرلیا اور دوسری طرف روم برلن محور (Rome Berlin Axis) قایم کرکے فرانس کے اطمینان کو خاک میں ملادیا!

الغرض جس طرح سنہ ۱۹۱۴ء میں یوروپ کے دو ٹکڑے تھے اسی طرح اب بھی ہیں اور فرق صرف اتنا ہے کہ پہلے تفریق ملوکیت و جمہوریت کی تھی اور اب فاسزم و اشتراکیت کی ہے۔

غیر فرانسیسی لوگ فرانس کے سمجھنے میں اکثر غلطی کرتے ہیں، اور اس کا بڑا سبب وہاں کے صحافت کی اخلاقی پستی ہے۔ اسوقت پیرس سے ۱۰۲ روزنامے نکل رہے ہیں لیکن ایک دو کو چھوڑ کر سب غدار و ملت فروش ہیں جسوقت جاپان منچوریا میں جنگ کر رہا تھا تو فرانس کا پریس جاپان کی طرفداری میں تھا کیونکہ جاپان ان کی مدد کر رہا تھا۔ اسی طرح سنہ ۳۵ء میں اٹلی نے ۶ کرور ۵۰ لاکھ فرانک، یہاں کے پریس کو دیکر جو چاہا لکھوایا۔ لیکن اگر اس بدنما داغ کو ہم علحدہ کردیں تو اس میں شک نہیں کہ فرانس ہر لحاظ سے عجیب ملک ہے۔ وہاں کی زبان، وہاں کا لٹریچر، اور وہاں کی تہذیب پر سارے یوروپ کو رشک ہے۔ لیکن جنگ کے بعد سے فرانس سمجھنے لگا ہے کہ دنیا میں محض تہذیب و شایستگی سے کام نہیں چلتا بلکہ یہاں بدتمیزی و درندگی بھی کبھی کبھی درکار ہوتی ہے اور اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ "خوبی" اس میں کیونکر پیدا ہو۔

مغرب کی سیاسیات کا مطالعہ کرنے والے کے لئے یہ بڑی الجھن کی بات ہے کہ وہ کس ملک کو واقعی صلح پسند قرار دے اور کس کو سبب جنگ، کیونکہ ہر وہ ملک جو اپنے آپ کو امن و سکون کا حامی سمجھتا ہے وہی فی الحقیقت جنگ کا باعث ہے۔

یہ حقیقت مخفی نہیں کہ موجودہ سیاسیات یوروپ کی پیچیدگی کا ایک بڑا سبب تجارتی مقابلہ (Competition) بھی ہے اور جس وقت ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اس سلسلہ میں ایک بڑی تجارت اسلحہ و سامان حرب کی بھی ہے تو حیرت ہوتی ہے کہ ایک طرف امن و صلح کی خواہش کا اظہار بھی کیا جاتا ہے اور دوسری طرف اسی چیز کی تجارت بھی کی جاتی ہے جو یکسر امن شکن ہے۔

جنگ میں سامان حرب کتنا صرف ہوتا ہے اور اس کی کتنی بڑی تجارت یوروپ میں ہوتی ہے، اس کا صحیح اندازہ شاید آپ کو نہ ہو۔

یوں تو ایک گولی جس سے ایک انسان ہلاک کیا جاتا ہے اس کی لاگت صرف ایک آنہ اور قیمت تین آنے ہوتی ہے لیکن اگر ایک گھنٹے میں دس لاکھ گولیاں چلائی جائیں (جو معمولی بات ہے) تو ان کی قیمت چھ ہزار پونڈ ہو جاتی ہے۔ ایک رائفل کی قیمت صرف پانچ پونڈ ہوتی ہے لیکن جب آپ دس لاکھ آدمیوں کی فوج کو اس سے آراستہ کریں گے تو پچاس لاکھ پونڈ صرف رائفل پر خرچ ہو جائیں گے۔ ایک مشین گن کی قیمت ۱۲۸ پونڈ ہوتی ہے، لیکن یہ دیکھئے کہ

فرانس کو اپنی ۴۰ ہزار مشین گنوں کے نئے کتنا صرف کرنا پڑا ہوگا۔ ۷۵ ملی میٹر والی توپ کی قیمت ۲۰۰ پونڈ ہوتی ہے اور ایک گولہ کی تین پونڈ۔ فرانس کی بڑی توپ کی قیمت ۱۴۰۰ پونڈ ہے اور ہر فیر پر پانچ پونڈ لاگت آتی ہے، ایک ٹینک کی قیمت ۱۶۰۰ پونڈ ہوتی ہے اور بم گرانے والے جہاز کی بیس ہزار پونڈ۔ ایک کروزر ۲۲ لاکھ پونڈ میں طیار ہوتا ہے اور ایک جنگی جہاز ۶۰ لاکھ پونڈ میں۔ الغرض جنگ سے زیادہ صرف کسی مشغلہ میں نہیں، لیکن لطف یہ ہے کہ سامان حرب ہی کی تجارت سے نفع بھی زیادہ حاصل ہوتا ہے

سنہ ۳۴ء میں اقوام عالم نے ۸۵۵۳۶۰۰۰۰ پونڈ اپنی اسلحہ بندی پر صرف کئے تھے اور سنہ ۳۶ء میں یہ مصارف دو ارب پونڈ تک پہونچ گئے

اگر ہم سنہ ۳۴ء کے مصارف اسلحہ بندی کو سامنے رکھیں تو اس کے معنے یہ ہیں کہ اگر ہمارے پاس اتنی رقم موجود ہو اور ہم روزانہ دو پونڈ کے حساب سے خرچ کریں تو دس لاکھ سال کے بعد بھی کچھ بچ ہی رہیگا اور اگر اس کا شمار کرنا چاہیں تو ۲۶۲ سال سے کم زمانہ اس کے لئے درکار نہ ہوگا

حقیقت یہ ہے کہ اس تجارت میں بڑا زبردست فایدہ ہے لیکن اس کو صرف وہی حکومتیں کر سکتی ہیں جو بہت ترقی یافتہ و مالدار ہیں اور چھوٹی چھوٹی سلطنتوں کے ہاتھ سامان حرب فروخت کرکے کثیر نفع حاصل کرتی ہیں

تمام دنیا میں اسلحہ کی ۹۸ فی صدی برآمد دس ملکوں سے ہوتی ہے۔ ان میں ۶۵ فی صدی کے مالک برطانیہ، امریکہ، فرانس، سویڈن اور زیکوسلاویکیا ہیں اور فرانس کے مشہور کارخانہ اسلحہ سازی (شنیڈر) نے سنہ ۳۲ء میں ۷۰ فی صدی سے زیادہ اسلحہ و سامان حرب طیار کرکے فروخت کیا۔

آپ شنیڈر اور دوسری اسلحہ ساز کمپنیوں کے ڈائرکٹروں کو دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ فطرتاً وہ نہایت متین و سنجیدہ، بہت نیک نفس و شریف ہیں، لیکن انکا مشغلہ ہلاکت بار اسلحہ کی اختراع و تجارت ہے

اسلحہ سازی کی کمپنیوں کی حالت وہی ہے جو محرمات سے مباشرت کرنے والے سفید جو ہوں کی ہوتی ہے کہ ساتھ کھیلتے بھی ہیں اور نسل کشی بھی کرتے ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ان کمپنیوں میں تجارتی مقابلہ کا جھگڑا زیادہ نہیں ہے فرض کیجئے اگر ایک ملک شنیڈر کے کارخانہ سے اسلحہ طلب کرتا ہے تو دوسرا فریق دوسرے ملکوں سے سامان حرب خریدتا ہے۔ اگر ایک ملک کوئی نئی جنگی اختراع خریدتا ہے تو دوسرے ملک بھی اس کے لینے پر مجبور ہوتے ہیں۔ یہ تو ہوسکتا ہے کہ کسی ایک ملک کو سامان حرب فراہم کرنے میں یہ کمپنیاں مقابلہ پر آجائیں اور کسی کو گھاٹا ہو جائے لیکن بین الاقوامی حیثیت سے یہ سب فایدہ میں رہتی ہیں اور ان کے تعلقات ایک دوسرے سے ایسے گتھے ہوئے ہیں کہ اس وقت ساری دنیا ان کے جال میں پھنسی ہوئی ہے

مشہور بات ہے (اور غالباً غلط نہیں) کہ اسلحہ ساز کمپنیاں اپنے کاروبار میں سیاسی حیثیت سے بالکل غیر جانبدار

رہتی ہیں، یعنی جب جنگ شروع ہوتی ہے تو وہ دوست دشمن دونوں کو اسلحہ فراہم کرتی ہیں، چنانچہ ہوسکتا ہے کہ سرحد پر کسی گورے کے سینے سے جو گولی نکالی جائے، وہ انگلستان ہی کے کارخانہ کی بنی ہو۔ اور یہ تو واقعہ ہے کہ گزشتہ جنگ میں ترکی اور بلغاریہ نے جو کارتوس فرانس کی فوجوں پر چلائے وہ فرانس ہی کے بنے ہوئے تھے اور عبدالکریم نے ریف میں جو اسلحہ فرانسیسیوں کے خلاف استعمال کئے وہ بھی فرانس ہی کے اسلحہ ساز کارخانوں نے فراہم کئے تھے درۂ دانیال میں ترکوں نے جن توپوں سے انگریزوں کو مار بھگایا تھا وہ توپیں انگریزی کارخانوں کی تھیں اور بارہا ایسا ہوا کہ برطانیہ کے جنگی جہاز جن سرنگوں سے اُڑائے گئے وہ برطانیہ ہی میں طیار ہوئی تھیں

بہرحال تمام وہ ممالک جو اسلحہ طیار کرتے ہیں کبھی یہ نہیں چاہتے کہ جنگ کا امکان جاتا رہے، جنگ اور جنگ کا خطرہ ان کی دولت و سرمایہ داری کی بنیاد ہے۔ پھر فرانس یونہی تو جنگ سے بیزاری کا اظہار کرتا ہے، لیکن ایک عظیم الشان اسلحہ ساز ملک ہونے کی وجہ سے وہ کبھی دنیا کے امن و سکون سے خوش نہیں ہوسکتا

اقبال کی نگاہ میں عورت کی حیثیت

جسوقت ہندوستان کے نشاۃ الثانیہ کی تاریخ لکھی جائے گی اسوقت اقبال کی اہمیت کا لوگوں کو صحیح اندازہ ہوگا محض اُردو شاعری ہی نہیں بلکہ ہندوستان کے حرکت و عمل کے مظاہرے بھی اس شاعر اعظم کے مرہون منت ہیں، اسنے محض شاعری نہیں کی، قوم کو حرکت و عمل جد و جہد اور تگ و دو کے جو روح پرور نغمے سنائے اور زندگی اور زندہ دلی کا جو پیغام دیا وہ بہت حد تک ہماری بے حسی کو دفع کرنے میں ممد و معاون ثابت ہوا

اس نے زندگی کے مسایل حل کرنے میں اکثر ٹھوکریں کھائیں لیکن اس نے کبھی زندگی سے گریز نہیں کیا اور تمام سیاسی و معاشرتی مسایل پر گہری نگاہ ڈالی۔ اُردو شاعری میں یہ گہرائی اور بلندی ایک نئے دور کی بنیاد ڈالتی ہے مثالاً چند اشعار پیش ہیں ؎

خدا تجھے کسی طوفاں سے آشنا کردے کہ تیری بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں
مرد بے حوصلہ کرتا ہے زمانہ کا گلا بندۂ حُر کے لئے نشتر تقدیر ہے نوشں

— — — — — — — — — — — — — —

دے ولولۂ شوق جسے لذت پرواز کر سکتا ہے وہ ذرۂ مہ و مہر کو تاراج

صرف یہی نہیں بلکہ الفاظ کی جدت اور بیان کی ندرت کے لحاظ سے بھی اُردو کا کوئی شاعر ان کا مدمقابل نہیں ہو سکتا۔ کہا گیا ہے کہ اعلیٰ ترین شاعر نہ صرف اپنے تجربات سے محفوظ ہوتا ہے بلکہ ان پر غور و خوض بھی کرتا ہے۔ نیز اپنے ذہن میں ہم آہنگی کا ایک احساس پیدا کر لیتا ہے جس کی روشنی میں وہ اپنے سارے تجربات کی جانچ کرکے ایک انتہائی کوشش میں اس کو عالمگیر اور مثالی قالب عطا کرتا ہے۔ اقبال اس معیار پر پورا اُترتا ہے اور اس لحاظ سے اُردو شاعری میں منفرد اہمیت کا مالک ہے

اقبال کی موت ایک سانحۂ عظیم ہے اور اس سے ہمارے دلوں پر ایسی شدید ضرب کاری لگی ہے کہ اس کے کلام کا تشریحی تجزیہ ابھی ممکن نہیں معلوم ہوتا لیکن ان کے سامنے سب سے بڑی نیاز عقیدت جو پیش کی جا سکتی ہے وہ یہی ہے کہ ہم ان کے کلام و پیام کو تحقیق کی روشنی میں جانچنے کی کوشش کریں اور دیکھیں کہ کہاں تک وہ ہم کو ہمارے مسائل کے

حل کرنے میں مدد دیتے ہیں۔ اقبال ایک خاص دور اور ایک خاص ذہنیت کی پیداوار تھے اور باوجود وسعت علم اور فلسفہ پر کامل عبور کے انھوں نے جو لائحۂ عمل ہمارے سامنے پیش کیا وہ ایک رجعت پسندانہ ذہنیت کا حامل ہے۔ اقبال کے پیام کے مدّاح ممکن ہے اس بیان پر چیں بجبیں ہوں لیکن یہ ان کی زیادتی ہے۔ جب تک شخصیت پرستی کی یہ رکیک ذہنیت ہم سے دور نہیں ہوگی ہماری عقل پر پردہ پڑا رہیگا اور ہم عمل کے لئے بیکار رہیں گے۔ اقبال کے پیام کے ارتقا اور نصب العین پر کبھی فرصت کے وقت بحث کی جائے گی۔ اسوقت موضوع زیر بحث ان کے پیام کا صرف ایک پہلو ہے

سوسائٹی میں عورت کی حیثیت ہی وہ محور ہے جس کے گرد ہمارے سارے معاشرتی مسایل چکر لگاتے ہیں اور یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ ہم ہندوستانیوں نے نہ تو وہ لائحۂ عمل تجویز کیا ہے جس پر ہمارے سوسائٹی کے نصف مظلوم حصہ کو کامزن ہونا ہے اور نہ اس بات کا تصفیہ کیا ہے کہ ہم جدھر جا رہے ہیں وہ راہ ہم کو کدھر لے جا رہی ہے۔ نا ممکن تھا کہ ایسا بنیادی مسئلہ اقبال کی وسعت بیں نگاہوں سے مخفوظ رہجاتا۔ چنانچہ "بانگ درا" ہی میں اس نے اکبر کے طنزیہ انداز میں اس مسئلہ پر روشنی ڈالی۔ اس کے بعد "ضرب کلیم" میں جس میں اس نے اکثر مسائل حاضرہ پر تبصرہ کیا ہے، ایک پورا باب اس کے لئے وقف ہے اور پھر اپنی معرکۃ الآرا اور عہد آفریں کتاب "تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ" (بزبان انگریزی) میں بھی اس پر ایک سرسری نظر ڈالی ہے۔ کہتا ہے۔ مثنوی رموز بیخودی میں بھی اس موضوع سے متعلق چند اشعار ہیں

لڑکیاں پڑھ رہی ہیں انگریزی ڈھونڈلی قوم نے فلاح کی راہ
روش مغربی ہے مدِّنظر وضع مشرق کو جانتے ہیں گناہ
یہ ڈرامہ دکھائے گا کیا سین پردہ اٹھنے کی منتظر ہے نگاہ (بانگ درا)

اسی سلسلہ میں ایک جگہ اور فرمایا ہے ؎

یہ کوئی دن کی بات ہے اے مرد ہوشمند غیرت نہ تجھ میں ہوگی نہ زن اوٹ چاہیگی
آتا ہے اب وہ دور کہ اولاد کے عوض، کونسل کی ممبری کے لئے ووٹ چاہیگی

کون کہہ سکتا ہے کہ ان اشعار میں اکبر کی شاعری کی روح حلول نہیں کرگئی ہے۔ وہی رجعت پسندی، وہی قدامت پرستی وہی جدید تمدن کے خلاف احتجاج! لیکن افسوس ہے کہ ان بزرگان قوم کے سامنے تاریخ کا یہ مسئلہ نہیں تھا کہ معاشرتی اور اقتصادی تحریکیں، بنیادی مسایل کا پرتو ہوتی ہیں اور فرسودہ نظام کے نام لیوا طنز کے ذریعہ سے پانی کے دھارے کو نہیں روک سکتے۔ اکبر کی شاعری میں وہ تنازع منعکس ہے جو پرانی اور نئی روشنی کے ملاپ سے، متوسط طبقہ کے مسلمانوں کو درپیش ہے۔ اقبال کی شاعری بھی اسی جذباتی ردِّ عمل کا آئینہ ہے۔ مگر چونکہ وہ محقق بھی ہیں اور مفکر بھی اس لئے انھوں نے اپنے جذبات پر فلسفیانہ رنگ چڑھا دیا ہے

اقبال کے فلسفیانہ کردار کی ترتیب اور ذہنی نشوونما میں جو اثر سب سے زیادہ فیصلہ کن ثابت ہوا وہ ان کا

یورپ کا سفر تھا، شرقی فلسفہ کی تحقیق کے سلسلہ میں ان کو اکثر جرمن اکابر کے خیالات کے مطالعہ کا اتفاق ہوا۔ ان کے ذہنی افق کی تشکیل میں اس تعلق نے زبردست کام کیا اور اگرچہ یہ قطعی غلط ہے، جیسا بعض لوگ ان پر اعتراض کرتے ہیں، کہ اصولاً و فروعاً ان کا فلسفہ نطشے اور برگساں کے فلسفہ کا چربہ ہے کیونکہ ایک ایسے طباع شخص پر اندھی تقلید کا الزام صداقت پسندی کے منافی ہے، لیکن یہ ضرور صحیح ہے کہ اقبال کے فلسفہ میں اور ان دو حضرات کے فلسفہ میں واضح اور بین مماثلت ہے۔ اس وقت گنجائش نہیں کہ نطشے اور برگساں کے فلسفہ پر گہری روشنی ڈالی جائے لیکن موضوع زیر بحث کو سمجھنے کے لئے ان حضرات کے فلسفہ کا موجودہ سیاسی تحریکوں سے تعلق کا ذکر کرنا از بس لازمی ہے۔

شوپنہار کا فلسفہ قدیم ہند و فلسفہ اپانشاد کے فیضان کا منت کش ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ ساتھ موجودہ رجعت پرست فسطائی تحریک کا مورث اعلیٰ بھی شوپنہار ہی ہے۔ فسطائی فلسفہ کا قریبی تعلق نطشے سے ہے جو شوپنہار کا "شاگرد" تھا۔ فلسفیانہ بحث اس موقعہ پر ہمارے موضوع سے خارج ہے ورنہ میں یہ دکھاتا کہ وہ حضرات جو شوپنہار اور نطشے کے فلسفے میں بنیادی فرق جتاتے ہیں کس حد تک غلط ہیں۔ یہ غلط فہمی بہت حد تک شوپنہار کے فلسفہ کے متناقض براہین کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ اسی سلسلہ کا تیسرا شخص فرانسیسی فلسفی برگساں ہے۔ یہاں پر صرف اتنا بتانا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اگر صوفی "شوپنہار" فسطائیت کا مورث اعلیٰ تھا اور رجعت پسند کلبی "نطشے" اس تحریک کا ملہمانہ نقیب، تو فسطائیت کے فلسفہ کی بنیادی تدوین کا سہرا، مادیت اور روحانیت کے امتزاج کی کوشش کرنے والے فلاسفر برگساں کے سر ہے۔ اقبال کے فلسفہ کا ان ہر سہ حضرات کے بنیادی فلسفہ سے جو تعلق ہے وہ بحث کا محتاج نہیں۔ "فلسفۂ شاہین" "نظریۂ فوق البشر" "فقط مستی کردار" اور بیشمار جزوی اور اساسی نکتے ہیں جو اس دعوے کو ثابت کرتے ہیں۔

پھر قبل اس کے کہ ہم اقبال کے فلسفہ میں عورت کی حیثیت پر روشنی ڈالیں لگے ہاتھوں ذرا شوپنہار کے نظریہ پر بھی غور کر لیجئے اور اس فلسفہ کا جو عملی مظاہرہ فسطائی جرمنی میں پیش ہو رہا ہے اس کو بھی بھول نہ جایئے۔ شوپنہار عورت کی شہری حیثیت کو کبھی تسلیم نہیں کرتا تھا، وہ عورت کو قطعی نکما خیال کرتا تھا اور ان کا کام محض افزائش نسل تجویز کرتا تھا۔ شوپنہار کے رویہ میں اور قدیم ہندو فلسفہ کے معمار منو میں بہت یکسانیت پائی جاتی ہے۔ شوپنہار کا یہ نظریہ جو قرون وسطیٰ کی خصوصیت تھی آج اس بیسویں صدی میں فسطائی تحریک کے علمبرداروں کا الہام ثابت ہوا ہے۔ اور فسطائیت کا جو رویہ نسوانی تحریک کے خلاف ہے وہ نتیجہ ہے اس قریبی تعلق کا جو شوپنہار کے فلسفہ کو فسطائیت سے ہے۔ آج جرمنی کی عورتوں کے سامنے جو لائحۂ عمل پیش کیا جا رہا ہے وہ "بندگی، بچّہ، باورچی خانہ" کے تین عنوانوں سے پیش کیا جا سکتا ہے۔ "بندگی" یا مذہب پرستی اس لئے کہ اس کے بغیر عورتیں اپنی آزادی کو بیچنے کے لئے آسانی سے تیار نہ ہوتیں۔ "بچے" اس لئے کہ ہٹلر کی فوج کی تعداد میں کمی کا خطرہ نہ پیدا ہو "باورچیخانہ" اس لئے کہ مرد کی فوقیت و برتری برقرار رہے اور اس لئے بھی کہ جب، مردوں ہی کو روزگار نہیں ملتا تو عورتوں کو اس کشمکش میں شریک کر لینے سے

مصیبتوں کا اور اضافہ ہو جائے گا۔ ہٹلر بیانگ دہل اعلان کرتا ہے " عورتوں کا فرض محض بچے پیدا کرنا ہے جو سپاہی ہو سکیں۔ میدان جنگ میں قتل ہونے سے زیادہ اعلیٰ تخیل انسانیت کے پیش نظر نہیں!" " مادریت " کا یہ نظریہ قدیم ہندو کھشتری تخیل کی صدائے بازگشت معلوم ہوتا ہے۔ ہٹلر کا دست راست گورنگ کہتا ہے " عورت کی جگہ گھر میں ہے۔ اس کا فرض تھکے ماندے سپاہی کی تفنن طبع " اور ہٹلر کا پارٹی ایجنٹ گیبس رقمطراز ہے " عورت کا فرض خوبصورت بننا اور بچے جننا ہے۔ مادہ طیور اپنے کو نر پرندوں کے لئے سنوارتی اور انڈوں پر بیٹھتی ہیں، اس کے بدلے نر حفاظت کا کام اپنے ذمہ لیتا ہے "۔ بالکل درست، اس وحشیانہ و حیوانی تحریک کے سامنے ایسا ہی نصب العین ہونا چاہئے جو حیوانوں کا طریقہ کار ہو!

ان حقایق بالا کی روشنی میں دیکھئے تو آپ پر ظاہر ہو جائے گا کہ از کم اس معاملہ میں نطشے کا نظریہ اقبال کے تخیل پر کس حد تک اثر انداز ہوا۔ آگے میں یہ بھی دکھانے کی کوشش کروں گا کہ فسطائیت کے وہ دعاوی جن کا اوپر ذکر ہوا ہے اقبال کے نصب العین سے کتنے متفق ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ اقبال چونکہ مسلمان تھا اور فلاسفر تھا اس لئے وہ شوپنہار اور منو کا ہمنوا ہو کر عورت کو برائیوں کا ملجا و ماویٰ نہیں قرار دے سکتا اور نہ عورت کی ذات کو برائیوں کا پیش خیمہ تصور کر سکتا ہے چنانچہ اپنے ناقابل تقلید شاعرانہ انداز بیان سے کہتا ہے ؎

وجود زن سے ہے تصویر کائنات میں رنگ　　اسی کے ساز سے ہے زندگی کا سوز دروں
شرف میں بڑھ کے ثریا سے مشت خاک اس کی　　کہ ہر شرف ہے اسی درج کا در مکنوں

یہ تمجید و تجلیل ممکن ہے کہ بنیادی مسئلہ کی طرف سے ہم کو بہکا دے لیکن یہ صاف گو انسان کبھی الفاظ چباتا نہیں اور اپنے خیالات عورت کی حیثیت کے متعلق نہایت واضح الفاظ میں ظاہر کرتا ہے۔ " آزادی نسواں " کے عنوان کے تحت کہتا ہے ؎

اس بحث کا کچھ فیصلہ میں کر نہیں سکتا　　گو خوب سمجھتا ہوں کہ یہ زہر ہے وہ قند
اس راز کو عورت کی بصیرت ہی کرے فاش　　مجبور ہیں معذور ہیں مردان خردمند

جب اس راز کے انکشاف کا موقع آتا ہے تو اس کو اگرچہ شاعرانہ استدلال سے بیان کیا ہے لیکن اس کے معنی و مطلب قطعی آشکارا ہیں۔ کہتے ہیں ؎

کیا چیز ہے آرائش و قیمت میں زیادہ　　آزادیٔ نسواں کہ زمرد کا گلوبند؟

اے کاش آزادی کا یہ پیغام بر، حرکت و عمل کا یہ نقیب غور کرتا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ آزادیٔ نسواں یا زمرد کا گلوبند؟ اس منطق کو یہیں پر کیوں محدود کر دیا۔ اس کو ذرا اور وسعت دی ہوتی تو " خودی " کا سارا پیغام بے معنی ہو جاتا۔ زمرد کا گلوبند ہو یا یاقوت و ہیرے کا، یہ مادی اشیا خودی کا کس طرح نعم البدل ہو سکتی ہیں مگر یہاں تو عورت کے لئے

خودی کا ذکر ہی نہیں آتا ہے اور یہ اعلیٰ پیام ان کے لئے شرمندۂ معنی نہیں! عورت کی حفاظت کے عنوان سے فرماتے ہیں :-

نے پردہ نہ تعلیم نئی ہو کہ پرانی ، نسوانیت زن کا نگہباں ہے فقط مرد

یہ ایسا فاش قسم کا تناقص دعوے ہے کہ اس کی بوالعجبی ہم کو یقیناً انگشت بدنداں ہونے پر مجبور کرتی اگر ہم اس نظریہ کی تلخ حقیقت کو قابل قبول سمجھتے۔ وہ تلخ حقیقت یہ ہے کہ ہم عورت کی "انسانیت" کو تسلیم نہیں کرتے۔ عورت اس نقطۂ نگاہ سے ایک انسانی ہستی نہیں رہتی، بلکہ یا تو وہ ایک عجیب الخلقت چیز ہے یا ایک ماورائے انسانی ہستی۔ ہمارا سارا جنسی بیوپار، کسبی و غیر کسبی کا معاملہ اسی بات کا ممنون ہے کہ جب ہم عورت کی جنسی حیثیت ہی پر غور کریں گے تو اس کی انسانی حیثیت معرض خطر میں پڑ جائے گی۔ ہمارے اخلاق کے نام نہاد پاسباں فضول شور مچاتے ہیں۔ دراصل ان ہی کے تخیل اور نظریہ کا اثر ہے کہ بے اخلاقی کا سیلاب مذہب اور قانون کی نت نئی دیواروں کے باوصف اب تک روکے نہیں رکا۔ رکے بھی کیسے۔ ہمارا دماغی افق اس حد تک تاریک ہو چکا ہے کہ ہم عورت کا تصور جنسی و نفسانی حیثیت کے بغیر کرنے سے قاصر ہیں۔ ہم تو عورت کو محض ایک نفسانی پیکر سمجھتے ہیں۔ پھر یہ واویلا و شیون کہ "اخلاقیات" کو بروئے کار لانا قدرت اور انسانی فطرت سے جنگ کے مترادف ہے۔ اور کیوں اعتراض کیا جاتا ہے کہ ؎

ہند کے شاعر و صورت گر و افسانہ نویس آہ بیچاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار

"یہ زمرد کی گلوبندی" اور "مرد کی نگہبانی" کے سے الفاظ ہٹلر کو زیادہ زیب دیتے ہیں، ایک ایسے ملک اور نظام کے لئے زیادہ مناسب ہیں جہاں سلم یک سر بے معنی شئے قرار دی جاتی ہے اور انسانیت کا انتہائے مقصد محض جنگجوئی اور جنگ پرستی قرار دیا جاتا ہے۔ اقبال کے الفاظ قریب قریب گیبلس کے الفاظ کے ہم معنی ہیں (یعنی مادہ پرندے اپنے کو نر پرندوں کے لئے "سجاتے" سنوارتے ہیں، اور انڈوں پر بیٹھتے ہیں، اس کے بدلے نر "حفاظت" کا کام اپنے ذمہ لیتا ہے)۔ اقبال اور ہٹلر کا یہ اتحاد کتنا عجیب اتحاد ہے۔ ایک طرف اسلام کا پرستار، مساوات کا نام لیوا، آزادی کا علمبردار۔ اقبال! اور دوسری طرف جنگ کا پرستار، بربریت کا شیدا، آزادی کو بے معنی لفظ قرار دینے والا "چنگیز" ـــــ ہٹلر!

اصلی وجہ یہ ہے کہ اقبال مغربی تہذیب سے بیزار ہے اور ہر وہ چیز جو اس تہذیب سے تعلق رکھتی ہے اسکی نگاہوں میں کھٹکتی ہے۔ وہ اس بات کو ضرور محسوس کرتا ہے کہ بنیادی مسئلہ کی طرف ہمیشہ نگاہ غلط انداز ڈالی گئی ؎

ہزار بار حکیموں نے اس کو سلجھایا مگر یہ مسئلۂ زن رہا وہیں کا وہیں

ظاہر ہے کہ اس سے صرف ایک نتیجہ نکلتا ہے کہ ہماری ساری کوشش محض اس لئے شرمندۂ کامیابی نہیں ہوئیں کہ ہم نے ہمیشہ غلط نظرئے قائم کئے جس کی وجہ سے ہماری بحث بنیادی مسئلہ سے دوچار نہیں ہوئی۔ ہم نے ہمیشہ آزادی پردہ، تعلیم کے الفاظ میں اس مسئلہ کی طرف اپنی توجہ مبذول کی لیکن کبھی اس حقیقت پر غور نہیں کیا کہ جب تک معاشی و

واقتصادی آزادی نہ حاصل ہو، ہماری تمام نہاد آزادی محض فریب خیال ثابت ہوگی۔ یہ شکایت کرنے کے بعد کہ ؎

فکر او از تاب مغرب روشن است ظاہرش زن، باطن او نازن است

وہ پریشان ہوکر پکار اٹھتا ہے ؎

جس علم کی تاثیر سے زن ہوتی ہے نازن کہتے ہیں اسی علم کو ارباب نظر موت

میری تو شکایت یہی ہے کہ ہماری معاشرت اور ہماری تعلیم "زن" کو "نازن" نہیں بناتی یعنی زن کا جو جنسی، صنفی اور تفریحی تخیل ہم نے قایم کیا ہے اور جو ماوراے دیگر انسانی فرائض ہے وہ بدستور برقرار رہتا ہے اور ہم زن کو صرف اس قابل بنا دیتے ہیں کہ وہ سوسائٹی کے باغ میں خوشنما، خوش رنگ، دلفریب تتلیوں کا کام دے۔ اگرچہ سوچنے اور غور کرنے کی بات یہ ہے کہ افزائش نسل عورت کے فرائض کا محض ایک رخ ہے (جو یقیناً لازمی ہے) لیکن سوسائٹی کی بقا و بہبود کے لئے عورت کے ذمے دیگر فرائض بھی عاید ہوتے ہیں۔ جہاں تک نسل کی حفاظت کا سوال ہے مرد اور عورت جداگانہ حیثیت کے مالک ہیں کیونکہ اعضا اور عمل کی تفریق دونوں کو ایک دوسرے سے جدا کرتی ہے۔ یہ "تحفظ نسلی" کا فرض ہے، لیکن "تحفظ شخصی" کے لئے مرد و عورت یکساں اعضا رکھتے ہیں، یکساں فرض دونوں کے ذمہ ہے دونوں کا دائرہ عمل ایک ہے۔ آرٹ، سائنس، صنعت، حرفت، زراعت، تجارت، سیاست، مذہب، تہذیب و تمدن یہ سب تحفظ شخصی کے مظاہرے ہیں، ان کی بقا و تحفظ، ان کی برقراری و ترقی ایک عام فرض ہے جو مرد و عورت دونوں پر عاید ہوتا ہے جس کے لئے مرد و عورت دونوں کلیتہً یکساں حیثیت سے ذمہ دار ہیں ــــــ اقبالؔ اگرچہ اپنے کو "مظلومی نسواں سے ہوں غمناک بہت" بتاتے ہیں لیکن وہ اس "عقدۂ مشکل کی کشود" اس لئے نہیں کر پاتے کہ انھوں نے ان دونوں فرائض کو خلط ملط کر دیا ہے۔ یہ کہنے کے بعد کہ

راز ہے اس کے تپ غم کا یہی نکتۂ شوق آتشیں لذت تخلیق سے ہے اس کا وجود

وہ یہ سمجھ گئے کہ عورت کی کل کائنات اسی لذت تخلیق سے محفوظ ہونا ہے۔ یہ کہنا کہ

جوہر مرد عیاں ہوتا ہے بے منت غیر غیر کے ہاتھ میں ہے جوہر عورت کی نمود

محض لفظی بحث ہے۔ اعضا اور عمل کی یہ تفریق دونوں کے فرائض کو اتنا جدا نہیں کرتی کہ عورت محض افزائش نسل کو اپنی کل حرکت، سارا عمل، پورا فرض سمجھے اور تمام وہ ذہنیتیں اور عمل کی تمام وہ موجیں جو اس کی "انسانی" دنیا میں اٹکھیلیاں کرتی رہتی ہیں ان کو فعل عبث قرار دے اور اپنے سے بعید سمجھے اور پھر جب اس پر جایز حرکت و عمل کی دنیا حرام قرار دی جا چکی اور وہ سوسائٹی میں کوئی مہتم بالشان کام سرانجام نہ دے سکی تو کہا جاتا ہے:۔ "مکالمات فلاطون نہ لکھ سکی" اور پھر اس کو یہ کہکر بہلایا جاتا ہے ؎

اسی کے شعلے سے ٹوٹا شرار افلاطون

اقبالؔ کی علمی اور فلسفی دنیا میں عورت کا کام محض افلاطون پیدا کرنا ہے، ہٹلر کی دنیا میں محض سپاہی پیدا کرنا ــــ

اقبال کی "زندہ حقیقت" یہ ہے کہ عورت مرد کی دست نگر رہے، مرد اس کا محافظ رہے، عورت بچے پیدا کیا کرے اور مرد "خودی" کے مسائل حل کیا کرے! اور جو قوم اس قعر مذلت میں گرنا قبول نہیں کرتی اس کے لئے یہ حکم صادر ہوتا ہے۔ "اس قوم کا خورشید بہت جلد ہوا زرد"۔ لیکن تاریخ محض خواہشات سے بدلی نہیں جا سکتی، یونان و روما، ہند و بابل کا تنزل و انحطاط بوسیدگی و فرسودگی اس بات کی شاہد ہے کہ واقعہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ اقبال کا آزاد عورت کے متعلق کہنا کہ

این گل از بستان ما را رستہ بہ   داغش از دامان ملت شستہ بہ

مجھے ان بوڑھی عورتوں کا خیال دلاتا ہے جو تعلیم یافتہ اور آزاد عورت کو دیکھ کر کہتی ہیں اپنے مخصوص نظریہ کا اعادہ وہ اس سلسلہ میں بھی کرتا ہے ؂

فساد کا ہے فرنگی معاشرت میں ظہور   کہ مرد سادہ ہے بیچارہ زن شناس نہیں

اگرچہ یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ "فرنگی معاشرت" کیا چیز ہے۔ سائنتی تہذیب یا حرفتی تہذیب، سامراجی نظام یا فسطائی یا اشتراکی، بورژوا نظام یا پرولیتاری، کیونکہ ہر ایک میں عورت کے سامنے جداگانہ مطمح نظر ہے۔ یہ صحیح ہے کہ وہ حرفتی تہذیب جو صنعتی انقلاب کے بعد منصۂ شہود پر آئی وہ اپنے دن گزار چکی ہے اور دنیا کے سامنے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ یا تو آگے بڑھے یا پیچھے ہٹے، ایک جگہ پر قیام ناممکن معلوم ہوتا ہے۔ فسطائیت کے صوفی فلاسفر اسپنگلر نے تو خیر اپنی شہرۂ آفاق کتاب "زوال مغرب" میں انقلاب فرانس ہی کو مغربیت کے زوال کا پہلا زینہ قرار دیا ہے۔ (اسپنگلر نے جو تجزیہ کیا ہے، اقبال نے اپنی کتاب تشکیل جدید میں اس کی صداقت پر مہر لگائی ہے) لیکن اسپنگلر کی یہ مذہوبی تشریح اس بات پر پردہ نہیں ڈال سکتی کہ جس چیز سے تہذیب کا "زوال" ظاہر ہوتا ہو وہ وہ افراتفری اور ابتری ہے جو موجودہ معاشرت کی بظاہر خصوصیت معلوم ہوتی ہے۔ اگرچہ یہ صرف ایک نئے دور کی پیدائش کا پتہ دیتی ہے اور یہ درد و کرب محض یہ ظاہر کرتا ہے کہ ہم ایک عبوری دور سے گزر رہے ہیں۔ ہاں اس بات کا تصفیہ بخش جواب آسان نہیں کہ آئندہ دور انسانی معراج اور معاشرتی ترقی کا دور ہوگا یا دنیا پھر کئی صدی پیچھے لوٹے گی اور رجعت پرست فسطائی تحریک میں اپنے کو روپوش کرے گی۔ اقبال کا یہ سوال کہ ؂

کیا یہی ہے معاشرت کا کمال؟   مرد بیکار و زن تہی آغوش

بہت معنی خیز سوال ہے کہ ہم کو ایک بنیادی مسئلہ کی طرف متوجہ کر دیتا ہے۔ ہمارے موجودہ نظام میں بے روزگاری ایک وبا کی طرح پھیل رہی ہے اور ہمارے تہذیب کے دعوے کو جھٹلاتی ہے لیکن غور طلب امر یہ ہے کہ دنیا میں آج غریبی اور بے روزگاری کا مسئلہ اشیا کی کمی کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ صرف یہ ہے کہ ہم نے سائنس کی مدد سے اشیا کی پیداوار کا مسئلہ تو حل کر لیا ہے لیکن ان کی تقسیم کا اور استعمال کرنے کا مسئلہ اب تک حل نہ کر سکے۔ زن کی تہی آغوشی کی شکایت ذرا فضول سی ہے۔ اگرچہ شاعرانہ تضاد کے لحاظ سے "مرد بیکار اور زن تہی آغوش" ایک نہایت ہی عمدہ طرز ادا ہے

لیکن اگر موخر الذکر الزام میں کچھ حقیقت ہے تو وہ اتنی بنیادی نہیں۔ یہ صحیح ہے کہ پیدائش کی تعداد میں کمی ہماری موجودہ تہذیب کا ایک مریضانہ پہلو ہے لیکن اس کا احساس عام ہو چلا ہے اور اس کا تدارک تھوڑے عرصہ کی بات ہے۔

اوپر کی بحث ہم کو لا محالہ اس ناخوشگوار نتیجہ کی طرف لیجاتی ہے کہ اقبال نے اس مسئلہ کے حل میں جو مطمح نظر پیش کیا ہے وہ ہمارے معیار پر پورا نہیں اُترتا۔ "شاعر مشرق" کا نظریہ اس ذہنیت کا غیر محسوس طور پر شکار ہے جس کے تحت مشرق اپنی پستی کا احساس کرکے مغرب پر کیچڑ اُچھالنے کی کوشش میں سرگرم ہے اور اگر نہیں کہیں مغرب کے داغ کو نمایاں کرنے میں کامیابی حاصل ہوتی ہے تو اکثر اس فعل عبث کا نتیجہ محض ہماری کمزوری کو اور مستحکم کرنے کی صورت میں ظہور پذیر ہوا ہے، بہرحال یہ ضروری نہیں کہ کوئی مفکر یا شاعر ہر مسئلہ کا صحیح حل پیش کر سکے اور اگر اقبال اس مسئلہ میں ناکام رہے تو یہ ہماری بدقسمتی ہے اور اس سے ان کی عظمت پر حرف نہیں آتا

ضرورت ہے کہ ہم میں سے ہر ایک ترکی کے قومی شاعر اعظم "ضیاء" کے وہ اشعار پڑھے جس میں اس نے اپنی قوم کو خواب غفلت سے بیدار کرنے کی کوشش کی تھی۔ کہتا ہے :-

"جب تک عورت کی صحیح اور مکمل اہمیت نہ پہچانی جائے گی، قومی زندگی نامکمل رہے گی"

"میں نہیں جانتا کہ ہم نے عورت کو پس پشت کیوں ڈال رکھا ہے"

"تو پھر کیا اس کو اپنی سوئی نیزہ میں تبدیل کر دینی چاہئے تاکہ وہ ہم سے زبردستی اپنے حقوق حاصل کرے"

کاش یہ الفاظ ہمارے "ترجمان حقیقت" کے ہوتے!

سعید جعفری (ایم۔ اے۔ سی)

"نگار" کے پرانے پرچے

نگار کے مندرجہ ذیل پرچے دفتر میں موجود ہیں جن کی دو دو تین تین کاپیاں دفتر میں رہ گئی ہیں جن اصحاب کو ضرورت ہو طلب کر لیں قیمتیں وہی ہیں جو سامنے درج ہیں :-

(سنہ ۲۲ء) ستمبر ۴؍ ـــ (سنہ ۲۶ء) جنوری، جون، نومبر ۵؍ فی پرچہ ـــ (سنہ ۲۸ء) اپریل، مئی و جون ۴؍ فی پرچہ (سنہ ۲۹ء) دسمبر ۵؍ ـــ (سنہ ۳۰ء) مئی ۴؍ ـــ (سنہ ۳۱ء) جولائی تا دسمبر ۴؍ فی پرچہ ـــ (سنہ ۳۲ء) فروری تا دسمبر (علاوہ اپریل) ۴؍ فی پرچہ ـــ (سنہ ۳۳ء) فروری، جولائی و اکتوبر ۴؍ فی پرچہ ـــ (سنہ ۳۶ء) فروری، مارچ، اپریل، جون، نومبر، دسمبر ۵؍ فی پرچہ ـــ (سنہ ۳۷ء) مارچ، اپریل، مئی، جون، جولائی، اگست، اکتوبر، نومبر و دسمبر ۵؍ فی پرچہ

منیجر نگار لکھنؤ

روایت و معجزہ کا دور

زندگی کا صحیح مقصود حصولِ مسرت ہے اور ذہن انسانی مجبور ہے کہ وہ مسرت کے واقعی اسباب و شرائط معلوم کرے ۔ واضح رہے کہ مسرت سے مراد میری صرف کھانا پینا نہیں محض جسمانی راحت و آسائش نہیں بلکہ بلند قسم کی وہ مسرت ہے جو ادائے فرائض کے بعد حاصل ہوتی ہے، جو لوگوں کے ساتھ بھلائی کرنے کے بعد محسوس ہوتی ہے، جو فطرت کے مطالعہ اور حسن مجرد کے احساس سے پیدا ہوتی ہے اور جو آزادی ذہن و ضمیر کی پیداوار ہے

لیکن آپ دیکھیں گے کہ دنیا میں ایک گروہ ایسا بھی ہے جو مسرت کی خواہش کو ٹھکراتا ہے جو حریت فکر و رائے کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور جس نے عقل انسانی کو شل کر دینا ہی اپنا مقصود زندگی قرار دے رکھا ہے۔ یہ گروہ اپنے آپ کو اہل مذہب اور "روحانیت پرست" کہتا ہے۔ یہ وہ گروہ ہے جو احساسات مسرت کو وسوسۂ شیطانی کہتا ہے۔ یہ اس دنیا کی زندگی سے نفرت کرتا ہے اور اس کی تمام خواہشات کا تعلق کسی دوسری دنیا سے ظاہر کرتا ہے، جس کا اصطلاحی نام اس نے "حیات بعد الموت" رکھا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ خدا نے اس کو اپنی "تسبیح و تہلیل" کے لئے منتخب کر لیا ہے، پیام ربانی کے لئے اس کی زبان مخصوص ہے اور صداقت و حقیقت نام ہے صرف اس چیز کا جو اس کے دل و دماغ سے پیدا ہو

اس جماعت نے ہمیشہ عقل و علم سے دشمنی کی، ذہن انسانی کو اس نے ہمیشہ کند رکھنا چاہا اور اس نے علم و یقین کا ماخذ ہمیشہ غیر فطری کرامات و معجزات کو قرار دیا۔ اس نے دنیا میں صرف نفرت، تعصب اور خوف کی اشاعت کی، اس نے مفکرین کو ہمیشہ اپنا دشمن سمجھا اس نے محنت و عمل سے ہمیشہ جی چرایا اور اسی کو برگزیدہ قوم سمجھا جس کے لئے غیب سے من و سلویٰ نازل ہو سکتا ہے۔

یہ جماعت اپنا ایک لٹریچر بھی رکھتی ہے، جسے مختلف ناموں سے مختلف قوموں کے سامنے پیش کیا جاتا ہے اور اس لٹریچر میں وہ سب کچھ ہے جسے عقل انسانی کبھی تسلیم نہیں کر سکتی، اس میں تخلیق کائنات کا بھی ذکر ہے اور آفرینش انسان کا بھی، اس میں تاریخ قدیم کے ٹکڑے بھی نظر آتے ہیں اور اخلاق کے درس بھی، لیکن بایں ہمہ یہ محض روایت و داستان ہے جس کو حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں یا پھر ان ہدایات کا مجموعہ ہے جو محض تعـ

و تنگ نظری کی پیداوار ہیں۔

انھوں نے ہمیشہ خدا کا ڈر دکھا کر اپنا اثر قایم کیا، انھوں نے ہمیشہ دُنیا کو یہی یقین دلایا کہ اگر ان کی دعائیں شامل حال نہ ہوں تو بارش بند ہو جائے، کھیتیاں برباد ہو جائیں، دنیا قحط و وبا سے فنا ہو جائے اور جب کبھی کوئی مصیبت نوع انسانی پر نازل ہوئی تو انھوں نے اس کو اپنی ہی بد دعاؤں کا نتیجہ بتایا۔ پھر انھوں نے صرف یہی نہیں کیا۔ بلکہ جب کبھی انھیں اقتدار حاصل ہوا، علم کو روندا گیا، عقل پامال کی گئی، آزادی کو مٹایا گیا، متکرین عالم کو قید میں ڈالا گیا۔ ارباب فضل و کمال کو ذبح کیا گیا اور خدا کے نام پر وہ سب کچھ کیا گیا جسے شیطان بھی گوارا نہ کر سکتا تھا

لیکن مذاہب کا ظہور، مذہبی کتابوں کی پیداوار، خانقاہوں کی تعمیر اور اہل خانقاہ کا وجود، کوئی غیر فطری بات نہ تھی، بلکہ عہد وحشت کے غاروں سے لیکر موجودہ دور تہذیب تک انسان نے جو تدریجی ترقی کی ہے اسی کے یہ لازمی مظاہر تھے، دنیا کی تاریخ میں اتفاق کوئی چیز نہیں ہے، اس میں معجزہ و خرق عادات کو کوئی دخل حاصل ہے اور نہ غیبی مداخلت کو۔ ہر شے اور ہر حالت واقعات سے پیدا ہوتی ہے۔ اس لئے اگر ہمارے اسلاف کے دلوں میں مذہب و روحانیت کا خیال پیدا ہوا تو وہ بالکل فطری خیال تھا، کیونکہ ان کی عقل زیادہ سے زیادہ یہیں تک پہونچ سکتی تھی اور اسی کو وہ سچ سمجھ کر پیش کرتے تھے

تمام زمانوں میں انسان نے اپنے اور اپنے ماحول کے سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ وہ دیکھتے تھے اور تعجب کرتے تھے کہ پانی کیوں بہتا ہے۔ درختوں کا نشو و نما کیوں ہوتا ہے۔ بادل کیونکر معلق فضا میں اُڑتے ہیں، ستاروں میں چمک کہاں سے آتی ہے، چاند سورج کو کون اِدھر سے اُدھر لیجاتا ہے۔ وہ سوچتا تھا کہ زندگی کے بعد موت کا سکون کیا، بیداری کے بعد نیند کیسی، روشنی کے ساتھ تاریکی کیا معنی۔ بجلی اور کڑک کو دیکھ کر وہ سہم جاتا تھا، زلزلوں اور پہاڑوں کی آتش فشانیوں کو دیکھ کر وہ لرزہ براندام ہو جاتا تھا، اور چونکہ وہ ان کے طبعی حدوث کے اسباب سے ناواقف تھا اس لئے وہ سمجھتا تھا کہ ان تمام حوادث کے پیچھے کوئی عظیم الشان، ذیحیات ہستی ضرور ایسی موجود ہے جو ان تمام مناظر و مظاہر کی پیدا کرنے والی ہے اور انھیں کو وہ دیوتا یا دیوی سمجھ کر ان سے ڈرنے لگا اور ان کی پوجا کرنے لگا

طلوع صباح کو وہ سمجھنے لگا کہ یہ کوئی نہایت ہی حسین و جمیل دیوی ہے، آفتاب کو اس نے ایک جنگجو عاشق مزاج دیوتا فرض کر لیا، رات کو اس نے سانپ یا ناگ سمجھ لیا اور ہوا کو مغنی جاڑے کو اس نے ایک ایذا رساں درندے سے تعبیر کیا اور خزاں کو ایسی دیوی سے جو دنیا کے سب پھول چُن کر لیجاتی ہے۔ الغرض اسی طرح کی سیکڑوں تعبیریں، ہزاروں تفسیریں اپنے مناظر فطرت اور حوادث طبیعی کی اپنی ذہانت سے پیدا کیں۔ اور ان کو حقیقت بنا کر پھیلانا شروع کیا۔ اقوام عالم کی روایات مذہبی یا "اساطیر الاولین" پر غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ ان کی بنیاد یکسر انھیں شاعرانہ تعبیروں اور اسی قسم کے قیاسات ضعیفہ پر قایم ہے۔ چنانچہ باغِ عدن کی روایت کو دیکھئے کہ وہ دنیا کی ہر قوم میں پائی جاتی ہے، کیونکہ جب وہ مصائب سے گھبرا

مکین کے لئے اس نے ایک ایسی دنیا کا تخیل پیدا کیا جہاں راحت ہی راحت ہے

اسی طرح طوفان کی روایت ایشیا، یورپ کے تمام قدیم قوموں میں پائی جاتی ہے۔ انھوں نے گھونگھے، سیپیاں، اور، ہیروں کے نشانات، پہاڑوں، وادیوں اور میدانوں میں دیکھ کر خیال کیا کہ کسی وقت ضرور ساری دنیا پر طوفان آیا تھا جس سے سوائے چند مقبول بندوں کے کوئی جانبر نہ ہوسکا۔ توریت انجیل اور کلام مجید کے علاوہ ہندؤں میں بھی یہ روایت موجود ہے۔ منو نے ایک بار گنگا میں کوئی ظرف ڈبوکر پانی لیا، اس میں ایک مچھلی بھی آگئی مچھلی نے التجا کی کہ مجھے پھر پانی میں چھوڑ دیجئے، منو نے رحم کھا کر اسے چھوڑ دیا لیکن مچھلی نے اس احسان کے عوض میں ان کو بتایا کہ ایک بڑا زبردست طوفان آنے والا ہے، آپ ایک کشتی بنا کر اس میں اپنے ساتھیوں کو معہ مواشیوں کے بٹھا لیجیے، میں بروقت پہونچکر آپ کی مدد کرونگی چنانچہ منو نے اس کی تعمیل کی اور جب طوفان آیا تو وہ مچھلی حاضر ہوئی لیکن اب وہ بہت بڑی مچھلی ہوگئی تھی جس کے سر پر ایک سینگ بھی نکلا ہوا تھا۔ منو نے ایک رسی اس کے سینگ سے باندھ کر کشتی میں اٹکا دی اور وہ طوفان سے کشتی کو بچا کر ایک پہاڑ کی چوٹی پر لے گئی اور طوفان ختم ہونے تک منو جی یہیں ٹھہرے رہے — ان تمام روایات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان نے زندگی اور موت کے اسرار کو کس کس طرح سمجھنے کی کوشش کی اور ان کوششوں میں اسکے کتنے اندیشے کتنی امیدیں کتنی مسکراہٹیں اور کتنے آنسو شامل تھے۔ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کا اولین مذہب "آفتاب پرستی" تھا اور یہ بالکل فطری بات تھی، کیونکہ روشنی ہی زندگی ہے، اور اسی سے زندگی میں حرارت قایم رہتی ہے، اپالو بھی سورج تھا جو رات کے ناگ کو شکست دیکر بھگا دیتا تھا۔ اگنی بھی سورج تھا جو انسان کے ہر ہر جھونپڑے کی حفاظت کرتا تھا، کرشن بھی سورج ہی تھے کہ ان کی ولادت کے وقت تمام درخت ہرے بھرے ہوگئے۔ ہرقلس بھی سورج دیوتا تھا، جونا (یونس) بھی وہی تھا اور یہ سب کے سب ۲۵ دسمبر ہی کے لگ بھگ پیدا ہوئے، سب نے چالیس دن کا روزہ رکھا، سب غیر طبعی موت سے مرے اور پھر زندہ ہوئے — اب مسیح کے حالات کا ان روایات سے موازنہ کیجئے تو معلوم ہوگا کہ وہاں بھی سب کچھ یہی ہے، ۲۵ دسمبر کو ایک غار میں پیدا ہوئے، ہیرو ڈ نے بہت سے بچوں کو ان کے دھوکے میں ہلاک کیا، چالیس[1] دن کا روزہ رکھا، غیر طبعی موت سے مرے اور پھر زندہ ہوئے۔ عیسیٰ بھی سورج دیوتا تھے اور یقیناً تمام مذاہب کی ابتدا آفتاب پرستی ہی سے ہوئی، چنانچہ اس وقت بھی عبادت کے وقت لوگوں کا آنکھیں بند کرلینا اسی زمانہ کی یادگار ہے کیونکہ وہ سورج کی طرف دیکھ نہ سکتے تھے اور آنکھیں بند ہوجاتی تھیں

اس کے علاوہ جب ہم امم سابقہ کی دیگر مذہبی روایات کا مطالعہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ کے مذاہب میں بھی کوئی نئی بات نہیں پائی جاتی، ان کے تمام مراسم و عبادات کا رشتہ عہد قدیم کے مذاہب ہی سے جاکر ملجاتا ہے۔

[1] چالیس کا عدد مذاہب عالم کی تاریخ میں بہت نظر آتا ہے۔ طوفان سے پہلے چالیس دن بارش ہوتی رہی۔ موسیٰ چالیس دن کوہ سینا پر رہے، چالیس سال تک بنی اسرائیل صحرا میں پھرتے رہے،

آپ نے دیکھا ہوگا کہ عیسائیوں میں بپتسمہ یا اصطباغ کی رسم پائی جاتی ہے۔ لیکن یہ عیسویت سے بہت پہلے کی چیز ہے، ہندؤں، مصریوں، یونانیوں اور رومیوں میں بھی متقدس پانی کا وجود پایا جاتا تھا صلیب کا خیال بھی نہایت قدیم خیال ہے۔ یہ علامت تھی غیر فانی ہونے کی، زندگی کی، اگنی کی، تیز الناقی کی۔ اٹلی کی قدیم آبادی (رومیوں سے بہت پہلے کی) قبروں پر صلیب ہی کا نشان قایم کرتی تھی۔ وسطی امریکہ کے قدیم معبدوں میں صلیبی نشان کثرت سے دریافت ہوئے ہیں بابل کی سرزمین سے جو اسلوانے یا نینگ دریافت ہوئے ہیں ان پر بھی صلیب کا نشان موجود ہے۔ اسی طرح تثلیث کا خیال بھی بہت پرانا ہے اور قدیم مصر میں پایا جاتا تھا

ہم کو سمجھ لینا چاہئے کہ اساطیر و معجزات میں بہت فرق ہے۔ اساطیر نام ہے کسی بات کی تخیلی تصویر پیش کرنے کا اور معجزہ کہتے ہیں کوئی بات گھڑ کر بیان کرنے کو

اگر تم کسی سے کہو کہ دو ہزار سال قبل مردے زندہ ہوگئے تھے، تو وہ غالباً کہے گا "ہاں ہوا ہوگا" اگر تم اس سے کہو کہ ایک لاکھ سال بعد تمام مردے زندہ ہو جائیں گے تو وہ کہے گا "دیکھو کیا ہوتا ہے" لیکن اگر تم یہ کہو گے کہ تم نے خود قبر کے اندر سے کسی مردہ کو باہر نکلتے ہوئے دیکھا تو وہ تمھیں دیوانہ سمجھ کر کوئی جواب نہ دے گا

مذہبی کتابیں اسی قسم کے بیانات سے معمور ہیں۔ خدا نے یہودیوں کے لئے جتنے معجزات سے کام لیا وہ سب کو معلوم ہیں۔ ان کو غلامی سے آزاد کرانا بھی معجزوں ہی کے ذریعہ سے ہوا، اور جب وہ مصر سے باہر نکلے ہیں تو دن کو بادل اور رات کو روشنی کا ایک ستون آگے آگے رہنمائی کے لئے ہوتا تھا، دریائے نیل ان کے لئے شق کیا گیا، من و سلویٰ ان کے لئے آسمان سے نازل کیا گیا، لیکن یہودیوں نے ان میں سے کسی معجزہ کی پرواہ نہیں کی اور جب تک بچھڑا بناکر پوج نہیں لیا انھیں چین نہ آیا

اسی طرح مسیح نے بہت سے معجزے پیش کئے لیکن بالکل بے نتیجہ، وہی مردے جن کو انھوں نے زندہ کیا، وہی اندھے جن کو انکھیارا بنایا اور وہی کوڑھی جنھیں چنگا کیا ان پر ایمان نہ لائے۔ آپ کو معلوم ہے کہ اس کا کیا سبب تھا؟ صرف یہ کہ معجزے کبھی ظاہر ہی نہیں ہوئے بلکہ یہ سب داستانیں ہیں جو صدیوں بعد گھڑی گئیں

پانی کو شراب بنا دینا، سیکڑوں آدمیوں کو صرف ایک روٹی سے سیر کر دینا، اندھے کو مٹی لگا کر بینا بنا دینا، طوفان کو خاموش کر دینا، پانی پر چلنا، یہ سب وہ باتیں ہیں جنھیں انسان سوچتا تھا، جن کے پورا ہونے کی تمنائیں رکھتا تھا اور انھیں کی تکمیل کو سب سے بڑی نعمت سمجھ کر اظہار عظمت و تقدس کے لئے اس نے پیغمبروں سے منسوب کر دیا

یہ وہ زمانہ تھا جب دنیا جہل و خوف سے معمور تھی اور اپنی ہر مشکل میں ما فوق الفطرت ہستی سے امداد کی توقع رکھتی تھی۔ چنانچہ انھوں نے ان مفروضہ غیر انسانی ہستیوں کو خوش کرنے کے لئے مندر بنائے، قربانگاہیں طیار کیں، ان کے سامنے ناک رگڑی، قربانیاں چڑھائیں اور وہ سب کچھ کیا جس سے وہ خوش ہو سکتے تھے، لیکن ان آسمانی قوتوں نے

ایک نہ سنی، ان میں سے کوئی انسان کی فریاد کو نہ پہونچا، طوفان بھی آئے، کھیتیاں بھی برباد ہوئیں، وبائیں بھی پھیلیں، جنکو بُرے حال جینا تھا وہ بُرے حال ہی جئے اور جنھیں مرنا تھا وہ مر ہی گئے

انسان یہ سمجھتا تھا اور اب بھی مذہبی انسان یہی سمجھتا ہے کہ دنیا میں جو کچھ پیدا ہوا ہے وہ اسی کے لئے ہے، اسی کی ضروریات پورا کرنے کے لئے کائنات وجود میں آئی، چنانچہ وہ ہر چیز پر قابض ہونا چاہتا تھا اور جب ناکام رہتا تھا تو سمجھتا تھا کہ خدا ضرور اس کی مدد کرے گا، حالانکہ اگر دنیا میں ایک انسان نہ ہوتا تو بھی سورج کا یہی طلوع وغروب ہوتا، یہی بہار و خزاں ہوتی، گلاب اسی طرح کھلتا، انگور کی بیلیں اسی طرح پھل لاتیں، وہی سمندر کا مد و جزر ہوتا اور وہی رات دن، وہی طوفانی ہوائیں ہوتیں اور وہی رعد و برق

ایک زمانہ، ایک غیر محدود زمانہ انسان پر اسی جہل و بے بصری کی حالت میں گزر گیا کہ کچھ لوگ سوچنے والے پیدا ہوئے اور انھوں نے ان روایات ومعجزات کو شک کی نگاہوں سے دیکھنا شروع کیا۔ انھوں نے غور کیا کہ کسوف و خسوف کیوں مقررہ وقفہ کے بعد ہوتا ہے اور آخرکار انھوں نے اس کی وجہ معلوم کرکے سمجھ لیا کہ اجرام فلکی کی گردش اولادِ آدم سے بالکل بے نیاز ہے اور انسان خود بھی مظاہر طبیعی کا ایک معمولی مظہر ہے

گلیلیو، کوپرنیکس اور کیپلر نے مذہب کی بتائی ہوئی ہیئت کو درہم برہم کر دیا، زمین چپٹی ہونے کے بجائے گول ہوگئی ساکن ہونے کے بجائے متحرک ہوگئی، آسمان بجائے ٹھوس ہونے کے خلاء محض بن گیا اور سارا بنا بنایا کھیل مذہب والوں کا بگڑ گیا

ظاہر ہے کہ مذہب اپنی روایات کی اس تکذیب و توہین کو برداشت نہ کر سکتا تھا، وہ تاریکی جو زمانۂ نامعلوم سے دماغوں پر مسلط تھی یوں آسانی سے دور نہ ہو سکتی تھی، آخرکار جہل نے علم کے خلاف ایک محاذ جنگ قایم کیا اور مذہب کے درندے جس کے پنجے ہمیشہ خون سے رنگین رہے ہیں، برونو (Bruno) کے خلاف اپنا چنگل بڑھایا اور محض اس خطا پر کہ وہ اس کرہ کے علاوہ اور کروں کا بھی قایل تھا

اسے کافر و ملحد قرار دیکر سات سال کے لئے قید کر لیا گیا اور کہا گیا کہ اگر وہ اپنے الحاد سے باز آجائے تو رہا کیا جا سکتا ہے، لیکن اس نے کہا کہ ایک حق بات سے انکار کیونکر ممکن ہے اور آخرکار پابزنجیر اسے قصاص گاہ میں لے گئے اور بہت سی لکڑیاں جمع کرکے چتا میں آگ لگا دی گئی اور وہ جلکر راکھ ہوگیا۔ الغرض مذہب نے عقل و علم کو شکست دینے کی ہر امکانی کوشش کی، لیکن جہل کے پاؤں جب ایکبار اُکھڑ جاتے ہیں تو مشکل سے جمتے ہیں، عقل کی روشنی پھیلتی رہی اور مذہب کی تاریکی سمٹتی رہی

جانبازان علم اُٹھے اور انھوں نے سمندروں، پہاڑوں اور وادیوں میں جانیں دے دیکر وہ باتیں دریافت کیں جو مذہب کی دسترس سے باہر تھیں، انھوں نے بخار و برق کی قوت دریافت کرکے انسان کو دیوتا بنا دیا، لیکن اہل مذہب

بدستور دیوتاؤں کے غلام ہی بنے رہے۔ مذہب والے مفروضہ معجزے روایت ہی کرتے رہے اور انھوں نے انھیں کر کے دکھا دیا یعنی انسان کی جن تمناؤں کو دیوتا پورا نہ کر سکے تھے اسے علم و عقل نے پورا کر دیا

سائنس بتاتی ہے کہ نہ تخلیق کوئی حیثیت نہ فنا کوئی چیز، ایک نامحدود ہستی ہے جو ایک لاحد و دا ستحالہ عقلی ہے، کائنات کے تمام مظاہر و آثار اسباب و نتیجے سے وابستہ ہیں اور اشیاء کے اسی فطرتی رابطہ کو ایک نے نہ سمجھا اور مذہب بن گیا، دوسرے نے سمجھ لیا اور علم کہلایا

مذہب کا تجربہ انسان نے ہزاروں سال کیا لیکن کوئی آسمانی مدد اسے نہ پہونچی۔ خدا کا رتبہ حاصل کرنے کے لئے ماؤں نے اپنے بچوں کی قربانیاں پیش کیں لیکن اسے ان پر رحم نہ آیا، برہنہ وحشی انسان کو لاکھوں کی تعداد میں درندوں نے کھایا، سانپوں نے ڈسا، طوفانوں نے ڈبویا، زلزلوں نے تباہ کیا لیکن خدا نے اپنا اصول کا نہ بدلا، انسان نے لاکھوں مندر بنا کے رات دن اس کی پوجا کی لیکن ظالموں کا ظلم بدستور قائم رہا اور غلاموں کی پیٹھ پر جو کوڑے پڑا کرتے تھے بدستور پڑتے رہے۔ یہاں تک کہ انسان نے لاکھوں سال کے تلخ تجربات کے بعد سمجھا کہ خدا انسانی معاملات میں دخل نہیں دیتا اور اس کے نزدیک گدا اس کی پتی اور انسان سب برابر ہیں، اس لئے اس کی ترقی کا انحصار صرف اس کی محنت و کاوش اور رہبری عقل پر ہے، آخر کار رفتہ رفتہ معجزات کا زمانہ گزر گیا، روایات مذہبی کا دور ختم ہو گیا اور اب انسان اس کے لئے طیار نہیں کہ وہ مذہب کے بتائے ہوئے اصول پر بے سمجھے بوجھے عمل کر کے اپنی دنیا کو تباہ کرے اور بیوقوف کہلائے

قیامت قائم ہے، حشر و نشر کا ہنگامہ برپا ہے۔ مسیح اپنے تخت پر جلوہ افروز ہیں کہ ایک روح سامنے آتی ہے

مسیح :۔ "تیرا کیا نام ہے"

روح :۔ "طارکومیڈا" [1]

مسیح :۔ "کیا تو عیسائی تھا؟"

طار :۔ "تھا"

مسیح :۔ "کیا تو نے اوروں کو مسیحی بنانے کی کوشش نہیں کی"

طار :۔ "کی اور پوری طرح کی"

---

[1] اسپین کا وہ ظالم انسان جس نے سب سے پہلے غیر مسیحی لوگوں کے لئے جسمانی سزائیں دینے کا محکمہ قائم کرایا۔ ۱۴۲۰ء میں پیدا ہوا اور ۱۴۹۸ء میں مرا

مسیح :- "کیونکر"

طارد :- "میں نے منکرین کو قید کیا، ان کے پاؤں میں خاردار زنجیریں ڈالیں، ان کی زبانیں کھنچوالیں، ان کی آنکھیں نکلوائیں، شکنجے میں کسوا کر ان کی رگ رگ توڑ دی اور اگر اب بھی زندہ رہے تو کھال کھنچوا کر زندہ آگ میں ڈلوا دیا"

مسیح :- "خوب کیا، اے میرے وفادار خادم خوب کیا۔ اچھا جاؤ اور قرب خداوندی میں، بکرنجات ابدی کی راحتیں حاصل کرو"

دوسری روح حاضر ہوتی ہے

مسیح :- "تیرا کیا نام ہے"

روح :- "برونو"

مسیح :- "کیا تو مسیحی تھا"

برونو :- "کچھ عرصہ تک مسیحی رہا لیکن اس کے بعد میں نے خود اپنی عقل سے سچائی کی تلاش شروع کی"

مسیح :- "کیا تو نے لوگوں میں تبلیغ کی"

برونو :- "کی، لیکن مسیحیت کی نہیں، آزادی فکر و ضمیر کی، اچھا کام کرنے کی بغیر طمع ثواب اور برے کام سے بچنے کی بلا خوفِ عذاب، میں نے لوگوں کو بتایا کہ انسانیت نام ہے صرف بھلائی کا، ہمدردی کا اور دوسروں کے لئے ایثار و قربانی کا"

مسیح :- "یہ تو گویا تو نے انجیل کو جھٹلایا اور معجزات سے انکار کیا، اچھا تو جا، اسفل سافلین میں تیرا ٹھکانا ہے اور وہیں تجھے ابدالآباد تک دوزخ میں جلنا ہے"

کیا خدا اور مسیح کے اس فیصلہ کو دنیا اب بھی قرینِ انصاف سمجھ سکتی ہے؟ اور کیا مذہب کا دورِ معجزہ و کرامات اب پھر واپس آسکتا ہے؟

اگر دنیا میں ڈاکٹر نہ ہوتے

اب سے دور ایک حکیم تھے، بے روزگار اپنے سے مایوس دوسروں سے بیزار۔ یہ دیکھ کر کہ وطن میں لوگ بیمار بھی پڑتے ہیں، اچھے بھی ہوتے ہیں اور مر بھی جاتے ہیں لیکن ان تمام باتوں میں سے کسی ایک میں بھی انکا دخل نہیں ہوتا انھوں نے وطن سے ہجرت کی اور دیار غیر میں پہونچکر قسمت آزمائی پر آمادہ ہوئے۔ تضارا پہلا ہی مریض ان کے ہاتھوں اس دنیا سے چل بسا، ورثا ان کو خبر کرنے آئے، انھوں نے بھی رسماً اظہار ہمدردی کیا۔ تھوڑی دیر بعد ان کی فرمایش ہوئی "حضور والا ہمارے ہاں کا دستور ہے کہ جو مریض جس طبیب کے علاج سے وفات پائے، اس کی تجہیز و تکفین بھی اسی طبیب کے ہاتھوں عمل میں آئے۔" طب کے قانون میں یہ دفعہ اس سے پہلے حکیم صاحب کی نظر سے نہیں گزری تھی۔ مجبوراً یا اخلاقاً اٹھ کھڑے ہوئے میت کے گھر پہونچکر غسل میت کے فرائض انجام دئے کفن پہنایا اور میت کو تابوت میں رکھا۔ رسماً تابوت اٹھانے میں پیش قدمی کر کے ایک طرف کاندھا بھی دیا۔ لیکن اب جو دیکھتے ہیں تو معلوم ہوا کہ ہر طرف کا کاندھا تو لوگ بدلتے رہتے ہیں ان کی طرف کوئی متوجہ نہیں ہوتا۔ قبرستان بستی سے بہت دور واقع تھا۔ اُفتاں و خیزاں وہاں تک پہونچے میت کو قبر میں اُتارا، مٹی دی اور بڑی رات گئے گھر پہونچے

دوسرے دن سے جب کوئی مریض اُنکے مطب میں آتا تو اُس کا حال سنتے سنتے قطع کلام کر کے پوچھ بیٹھتے "اور کیوں جناب آپ کا قبرستان کتنی دور ہے؟" ظاہر ہے یہ سوال ایسا نہ تھا کہ مریض یا اس قبیل کے دوسرے لوگ ان سے مزید گفتگو کرتے۔ یہاں سے بھی پریشان ہو کر نکلے۔ اس درماندگی کے دوران میں ان کی ملاقات ایک ایسے بزرگ سے ہوئی جو بظاہر نہایت بھلے مانس معلوم ہوتے تھے۔ بڑی شفقت فرمائی۔ حکیم صاحب نے نام اور پتہ پوچھا انھوں نے مسکرا کر فرمایا "انسان مجھے فرشتہ کہتے ہیں اور فرشتے مجھے شیطان کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ میں انسانوں کا اعمال نامہ اور شیطان کا کارنامہ ہوں میں دیکھتا ہوں تم بڑی مصیبت میں ہو۔ فرشتے تمھارے لئے دعا مانگیں یا نہ مانگیں میں تمھاری مدد کرنے کو حاضر ہوں۔ دیکھو میں تمھیں ایک گر بتاتا ہوں۔ جب کبھی تمھارا سابقہ کسی مریض سے ہو تو یہ علامت دیکھنا، اگر ملے تو سمجھنا مریض اچھا نہ ہوگا، اُسے ہاتھ نہ لگانا۔ اگر یہ علامت نہ ملے تو جو کچھ دیدو گے، فایدہ ہوگا اور مریض تندرست ہو جائے گا۔" حکیم صاحب بہت خوش ہوئے۔ کہنے لگے "خدا آپ کو جزائے خیر دے، آپ نے بڑا احسان کیا، میرے لایق جو خدمت ہو فرمایئے۔" شیطان مسکرایا جس میں زہر کی تلخی اور پھول کی خوشبو اور روپ تھا، کہنے لگا "آخر حکیم ہی ٹھہرے وہی ہوا شافی اور وہی بندھے ٹکے بنفشہ اور نیلوفر تم میری خدمت کیا کروگے جو اب تک جزائے خیر اور احسان کا مفہوم بھی نہ سمجھے" حکیم صاحب

شیطان کے تیور سے گھبرا سے، فوراً آداب بجالا کر رخصت ہوگئے ایک دوسرے شہر میں پہونچکر مطب کا ڈول ڈالا
صبح کے وقت ایک مریض آیا اس میں وہی علامت ملی جو شیطان نے بتائی تھی۔ انھوں نے فوراً مریض سے کہدیا علاج کرانے سے کچھ حاصل نہیں تم جلد ہی مرجاؤ گے۔ یہ گیا تو دوسرا مریض آیا اس میں بھی وہی علامت ملی اسے بھی موت کی بشارت دیکر ٹالا غرض کئی دن متواتر ان غریب کے ہاں وہی لوگ آئے جن کی زندگی کا پیمانہ لبریز ہوچکا تھا۔ جن جن کو یہ مژدہ سنا چکے تھے وہ جاں بحق ہوتے رہے۔ چنانچہ تھوڑے ہی دنوں میں ان کی شہرت ایسی عام ہوئی کہ مریض تو درکنار تندرست بھی ان کے سائے سے بھاگنے لگے۔ اور یہ بیچارے جہاں کے تہاں رہ گئے!

یہ واقعہ سچا ہے نہ ہوتا ہو لیکن اس کے دلچسپ ہونے میں یوں بھی شبہ نہیں ہوسکتا کہ اس میں شیطان کا کافی دخل ہے اور شیطان و ڈاکٹر جب یکجا ہوں تو آپ جانتے ہیں، تندرست اور مریض کا حشر یکساں ہوتا ہے۔ تندرستوں کے ساتھ شیطان کو وہی دلچسپی ہوتی ہے جو مریضوں کے ساتھ ڈاکٹروں کو ہوتی ہے۔ یا ان سب کو ریڈیو سے! - آپ کو تو معلوم ہوگا بعض ڈاکٹر ایسے ہوتے ہیں جو ہر مریض کو صرف یہ بتا سکتے ہیں کہ وہ کتنے دنوں میں اس جہاں سے گذر جائے گا۔ لیکن یہ بات میں نے کچھ قبل از وقت کہدی۔ ہاں تو جیسا کہ آپ جانتے ہیں آج شب کا موضوع گفتگو یہ ہے کہ اگر ڈاکٹر یا طبیب نہ ہوں تو کیا ہو۔ میں نے اس سلسلہ میں آپ کو کچھ باتیں سنائیں۔ جو بظاہر صرف لطیفہ معلوم ہوتی ہیں۔ لیکن لطیفہ بجائے خود زندگی کے بعض سنگین اور تلخ حقائق کی صرف ایک دلچسپ تعبیر ہوتا ہے!

آپ نے یہ بھی محسوس کیا ہوگا بعض ڈاکٹروں کا برزخ ہی کچھ ایسا ہوتا ہے کہ اُن کی پیشانی پر مریض کی موت لکھی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ مجھے تو اکثر اپنے تمدن کا وہ دور اچھا معلوم ہوتا ہے جب ہر شخص ہر کام کے لئے موزوں نہیں خیال کیا جاتا تھا اور سوسائٹی اسبات کی اجازت نہیں دیتی تھی کہ ہر شخص جو پیشہ چاہے اختیار کرلے۔ آپ نے اکثر ایسے ڈاکٹروں کو دیکھا ہوگا جنھیں مطب کرنے کے بجائے اسپیکیولیشن سٹہ بازی قسم کے مشغلہ میں مصروف ہونا چاہئیے تھا یا مشرقی لندن میں قہوہ کی دوکان رکھنی چاہئے تھی۔ بعض ڈاکٹروں کو دیکھ کر مجھے کچھ ایسا محسوس ہوا ہے جیسے یہ شخص کبھی کوکین بیچنے میں سزایاب ہوچکا ہے یا بچے اور مویشیاں چرایا کرتا ہے۔ آپ ہی غور کیجئے اگر آپ بیوی سے عاجز نہ ہوں یا کسی جاہل دولتمند کے دستِ نگر نہ ہوں تو ایسے ڈاکٹر کو اپنی زندگی کیسے حوالہ کردیں گے۔ پھر آپ ہی غور کیجئے ایسے بزرگوں سے مردہ شوئی، گورکنی یا میت برداری کا کام لیا جاتا ہو تو کسی کا قصور! اور یہ کچھ ڈاکٹروں ہی پر منحصر نہیں ہے۔ ہر پیشہ میں ایسے لوگ ملیں گے جو اس پیشہ کے لئے قطعاً موزوں نہیں! محض پروفیسروں کو آپ ایسا پائیں گے جو نوجوانوں کو علم و اخلاق سے روشناس کرانے کے بجائے امرا کے تفننِ طبع کا ذریعہ بن سکتے ہیں اور جن کو مسندِ درس پر بیٹھنے سے زیادہ پرچون کی دوکان رکھنے میں لطف آتا ہے!

لیکن یہاں ڈاکٹر کے ہونے نہ ہونے کا سوال ہے، پروفیسروں کی داستان سے بحث نہیں!

میں ابھی ابھی عرض کرچکا ہوں اور بہت ممکن ہے عرض نہ کرچکا ہوں تو اب کئے دیتا ہوں کہ سائنس [illegible]

دوسرے فنون کی طرح ڈاکٹری کے فن کو جتنا نفع پہونچایا ہے اس سے زیادہ نقصان ڈاکٹر کو پہونچایا ہے۔ فن سے شخصیت معدوم ہونے لگی ہے۔ اب ڈاکٹر اپنی طبیعت یا اپنے وجدان پر نہ بھروسہ کرتا ہے اور نہ صحیح وجدان کی تربیت کو کوئی اہمیت دیتا ہے۔ وہ آلات پر بھروسہ کرنے لگا ہے یا اُن پٹینٹ دواؤں پر جن کو تجارت نے فروغ دیا ہے۔ وہ نُولو کا قائل ہے۔ اصل کے اسرار سے بالکل نا آشنا ہوگیا ہے۔ ڈاکٹروں کی ذہنیت کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس کو صرف مرض سے دلچسپی ہوتی ہے مریض سے کوئی ہمدردی نہیں !

بقول آپ کے اسی دلّی کے ایک مشہور طبیب کے اصلی طبیب اور عطائی میں فرق صرف یہ ہے کہ دونوں مریض کی جان لیتے ہیں لیکن طبیب قاعدہ کے ساتھ اور عطائی بے قاعدگی سے اس مقولہ کے صحیح ہونے میں کوئی شبہ نہیں اور یہ کچھ طبابت اور ڈاکٹری ہی پر منحصر نہیں ہے۔ ہمارے تمدن کا تمام تار و پود اسی با قاعدہ اور بے قاعدہ طریقۂ کار سے وابستہ ہے۔ ایک بادشاہ اور لٹیرے میں کوئی فرق نہیں ہے سوائے اس کے کہ ایک باقاعدہ لٹیرا ہے اور دوسرا بے قاعدہ بادشاہ۔ اسے بھی جانے دیجئے، اسی قاعدہ اور بے قاعدہ طریقۂ عمل نے ہم کو اپنے خالق سے بیگانہ یا یگانہ کر رکھا ہے۔ کوئی شخص خدائے رحم و رحمت کا اس وقت تک مستحق نہیں سمجھا جاتا جب تک کہ وہ اپنے آپ کو کسی خاص مسلک یا مذہب سے وابستہ نہ کرلے۔ حالانکہ میرے ایسے بہتوں کا ایمان ہے کہ خدا اپنی مشیت کو پورا کرنے کے لئے نہ خود کسی مسلک کا پیرو ہے اور نہ اس کی پروا کرتا ہے !

ہاں تو بات ڈاکٹروں کی تھی یعنی یہ نہوں تو کیا ہو۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہو کہ باقاعدہ اور بے قاعدہ مرنے کا جھگڑا ختم ہوجائے لوگ مرنے سے پہلے نہ مریں۔ ڈاکٹروں میں ایک قوم (Specialist) یا ماہرین خصوصی کی نکل آئی۔ جسم کا کوئی عضو ایسا نہیں ہے جس کے مخصوص معالج نہ ہوں۔ اچھا تھوڑی دیر کے لئے فرض کر لیجئے کہ آپ کے دماغ میں فتور ہے اور آپ ایمانداری سے کام لیں تو فرض کرنے کی بھی ضرورت نہیں۔ آپ کسی امراض دماغ کے ماہر کے پاس چلے جائیے وہ بہت ساری ترکیبیں کرکے آپ پر یہ حقیقت واضح کردے گا کہ آپ کے دماغ میں واقعتاً فتور ہے۔ اس کے پاس ایسے آلات ہوں گے، اس کی شہرت ایسی ہوگی اور آپ خود کچھ ایسے نیازمند ہوں گے کہ آپ کو اس کا یقین ہوجائیگا کہ آپ کا دماغ خراب ہے ! آپ کو ایک دفعہ اس امر کا شک ہوا نہیں اور آپ ہاتھ سے بے ہاتھ ہوئے نہیں۔ شک کرنا انسانی فطرت کا نہایت آسان اور محبوب وظیفہ ہے جسکے بارہ میں بعضوں کا خیال ہے کہ اس کا علاج افلاطون کے پاس بھی نہ تھا! تو اس کے ہرگز یہ معنی نہیں کہ جو چیز ارسطو و افلاطون کے پاس نہ تھی وہ کسی دیہاتی اسکول کے مدرس یا پولیس کے سپاہی کے پاس بھی نہ ہو !

میرے ایک دوست ہیں جن کا مقولہ ہے کہ آج کل کے ڈاکٹروں اور طریقۂ علاج سے سابقہ پڑجائے تو جان و مال دونوں کا بس خدا ہی حافظ ہے۔ اول تو یہ لوگ مرض کے تشخیص کرنے میں اتنے روپے خرچ کرا دیتے ہیں کہ مریض قلاش ہوجاتا ہے۔ پھر مریض میں قدرے توانائی بھی ہونی چاہئے۔ ورنہ تشخیص کے سلسلہ میں اکثر اس کو دربدر پھراتے پھراتے ہی مار ڈالتے ہیں۔ ڈاکٹر کے نزدیک تشخیص کی جو اہمیت ہے اس سے بحث نہیں لیکن مریض کے نزدیک تشخیص نام ہے مرض کی شدت بڑھا دینے کا۔

اس کے بعد علاج کا دور آتا ہے۔ اس میں قیمتی دوائیں، مہنگے مقامات جہاں اسے جلاوطن کرتے ہیں اور تیمارداری کے وہ ضوابط ہیں جن کو برتنے کے بعد تیماردار خود مریض بنجاتا ہے۔ ان سب سے عہدہ برا ہونے کے بعد جب موت واقع ہوتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ گھر کا سارا اندوختہ ختم ہوچکا ہے۔ ڈاکٹر کا بل ادا کرنا باقی ہے اور مقدمہ قائم ہونے کی دیر ہے

ایک ڈاکٹر ہیں جن سے مجھے بڑی دلچسپی ہے، بحیثیت ڈاکٹر کے بھی اور بحیثیت ایک عجیب و غریب انسان کے بھی۔ آپ کے ایک پھنسی بھی نکل آئے اور آپ اُن سے رجوع کریں تو پہلے وہ پھنسی کو اُس نگاہ سے دیکھیں گے جس سے کوئی مراقی اپنی بیوی کو دیکھتا ہے پھر نہایت پُراسرار اور رازدارانہ ہمدردی کے ساتھ دریافت فرمائیں گے، آپ کبھی کوڑھ یا اس قبیل کے دوسرے ناگفتہ بہ امراض میں تو نہیں مبتلا ہوئے ہیں اور آپ نہیں تو آپ کے بزرگ کبھی اس سے دوچار ہوئے ہیں۔ زکام کی ابتداء وہ نمونیا سے کریں گے۔ اور نمونیا کو دق کا مقدمہ بتائیں گے ہر بخار کو ٹائیفائڈ یا میعادی بخار کا پیش خیمہ قرار دیں گے اور اس کے ساتھ اسکی انتہائے مدت کا بھی تذکرہ کردیں گے اور ضمناً مریضوں کا بھی نام بتادیں گے جو اسی مرض میں اپنی میعادِ حیات ختم کرچکے۔ دواؤں کے بارہ میں انھیں یقین ہے کہ مقررہ مقدار سے کم سے کم دس حصہ کم دینا چاہئے۔ اس سے دوا کی تاثیر، مریض کا امکانِ صحت، ڈاکٹر کی عافیت دس گنا بڑھ جاتی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ چالیس سال میں ہر انسان کا انتقال ہوجاتا ہے۔ اگر وہ زندہ ہے تو اس کا قصور ہے۔ ایسوں کا علاج بھی، وہ ایک خاص اُصول پر کرتے ہیں یعنی قضا تو مسلم ہے سکرات کو آسان بنانے کی کوشش کرنا چاہئے۔

ایک دن کھانا کھاکر میں فوراً لکھنے پڑھنے بیٹھ گیا، چونک پڑے، فرمایا، غضب خدا کا ایسی غلطی نہ کیا کیجئے۔ کھانا کھانے کے بعد دورانِ خون تیز ہوجاتا ہے اور آپ کو معلوم ہے کہ چالیس سال کی عمر میں شریان سخت ہوجاتی ہیں۔ بہت ممکن ہے دورانِ خون کی تیزی سے کوئی شریان پھٹ جائے۔ فالج گرے اور موت واقع ہوجائے۔ میں نے عرض کیا ڈاکٹر صاحب کیا یہ علامتیں مجھ میں نظر آرہی ہیں فرمانے لگے تم لوگ تو ہو احمق، مرض کے اسوقت قائل ہوتے ہو جب اس میں مبتلا ہوجاتے ہو، ڈاکٹر امکان کا قایل ہوتا ہے۔ میں نے بات کاٹ کر کہا ڈاکٹر صاحب آپ لوگ کس کے قایل ہوتے ہیں امکانِ مرض یا امکانِ موت! ڈاکٹر صاحب خفا ہوکر اُٹھ کھڑے ہوئے اور فرمایا مخول کرلو، جب آن پڑے گی تو سر پکڑ کر روؤگے۔ ڈاکٹر صاحب چلے گئے لیکن انکی گفتگو کا نتیجہ یہ ہوا کہ اب مجھے سر پھٹنے کا اتنا خوف نہیں رہتا جتنا شریان پھٹنے کا

سائنس نے امراض کے اسباب دریافت کرنے اور اس کا قلع قمع کرنے میں بڑے کارنمایاں کئے ہیں لیکن سائنس کا علمبردار بن کر امراض کا قلع قمع کرنا اور بات ہے اور مریض کی تکلیف سے تکلیف محسوس کرنا اور اس کو اس سے نجات دلانے کی کوشش کرنا بالکل جداگانہ بات ہے۔ ہمارا ڈاکٹر لکیر کا فقیر ہوگیا ہے۔ وہ صرف یہ دیکھتا ہے کہ جو کچھ کتابوں میں لکھا ہے اس کی حرف بہ حرف تعمیل کردی گئی یا نہیں۔ وہ مرض کا ماہر ہو تو ہو مریض کا غمگسار نہیں ہوتا۔ اس کے علاوہ پہلے طبیب کے پیشہ کا محرک خدمتِ خلق ہوتا تھا۔ اب صرف ضوابط کی خانہ پُری رہ گئی ہے

ڈاکٹروں میں دواؤں سے علاج کرنے والوں کے علاوہ سرجن بھی ہوتے ہیں۔ ان کی اہمیت مسلم ہے ڈاکٹر ہی

اس شعبے نے واقعتاً معجزے سر انجام دئے ہیں۔ ان سے منحرف ہونا بڑی ناانصافی ہوگی۔ اس فن کی ترقی انسان کی راحت و عافیت کے لئے نہایت نیک فال ہے لیکن (Specialisation) کے جنون نے اس شعبہ میں بھی خطرہ کے امکانات پیدا کر دئے ہیں۔ ذرا ذرا سی تکلیف میں بھی آپریشن ناگزیر سمجھا جانے لگا ہے۔ اس طریقہ کار نے وجدان کو مزید نقصان پہونچایا ہے فوج یا صنعت و حرفت یا دیگر فنون کی مانند طریقہ علاج بھی (Mechanised) ہونے لگا ہے یعنی آلات و مشین کو ہاتھ کے ہنر یا عقل کی جودت پر ترجیح دیجانے لگی ہے۔ اس میں شک نہیں سرجری کے وسیلہ سے ہم بعض تکالیف کا نہایت آسانی سے ازالہ کر سکتے ہیں لیکن ہر چیز کو مشین آشنا کر دینے سے انسانیت کے بعض جوہر رفتہ رفتہ فنا ہوتے جائیں گے اور یہ چیز انسانیت کے لئے بڑی محرومی ہے:

لیکن توپخانہ میں طوطی کی آواز کون سنے گا۔ اور قبل از نماز بیٹھ کر الم ترکیف پڑھنے سے کیا حاصل۔ اب ہماری زندگی تمام تر مشین کی زد میں آگئی ہے۔ ہمارا تصور ہمارا تفکر، ہمارا اخلاق غرض سارے صفات حسنہ مشین کی زد میں آچکے ہیں۔ انسانیت کا عنصر انسانی زندگی سے بڑی سرعت کے ساتھ ناپید ہو رہا ہے۔ غریبوں کسانوں اور مزدوروں کے لئے اس وقت دنیا میں کیا کچھ نہیں ہو رہا ہے، ان کے نام پر

جو گناہ کیجئے ثواب ہے آج !

اُن کی حالت بہتر و برتر بنانے کے لئے زندگی کے تمام قدیم رویئے یکسر و یکلخت منقلب کئے جا چکے ہیں۔ یہ بڑی اچھی بات ہے لیکن مجھے تو کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس تمام تہلکہ و طغیان میں غربت و افلاس کے دور کرنے کی جتنی جد و جہد کی جا رہی ہے اتنی فکر غریب و مفلس کے لئے روا نہیں رکھی جاتی۔ غربت و افلاس کے خلاف بغاوت اور چیز ہے اور مفلس و غریب کی دلدہی اور چیز۔ مشین سے ذہن و دماغ کو بدل سکتے ہیں۔ قلب کو گداز نہیں کر سکتے

مطلب یہ کہ وقت پورا ہو گیا۔ اور مختصر یہ کہ ڈاکٹر ہوں تو برا اور نہ ہوں تو اور برا !!

(آواز)

رشید احمد صدیقی

مکتوبات نیاز

عزیز گرامی۔ اس میں شک نہیں "ناسخ" کا وجود شاعری میں ایک مرض متعدی کی حیثیت رکھتا تھا جو صرف لکھنؤ ہی تک محدود نہیں رہا بلکہ اس نے دہلی کو بھی تباہ کیا۔ یقیناً شاہ نصیر اور ذوق کے علاوہ اور شعراء نے بھی اس طلسم بندی کو اختیار کیا لیکن غالب کا ذکر اس دریان میں نہ لائیے تو بہتر ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ لکھنوی شاعری کا وہ رنگ جس نے حد سے گزر کر اسے معیوب بنا دیا اس کا "ایہام" تھا۔ ایک ہی لفظ اگر محل استعمال کے لحاظ سے مختلف معانی دیتا ہے تو وہ نہایت بے تکلفی سے ان سب کو مخلوط کر دیتے تھے اور یہ بات ضلع جگت سے پیدا ہوئی تھی۔ امیر مینائی کا مشہور شعر ہے:۔

انگوریوں میں بہ گئی پانی کی چار بوندیں ۔۔۔ پر جب سے کھنچ گئی ہے تلوار ہو گئی ہے

چونکہ کھنچنا شراب کے لئے بھی مستعمل ہے اور تلوار کے لئے بھی اس لئے شاعر نے بلا تکلف شراب کو تلوار کہدیا۔ اس قسم کی لفظی "وجہ شبہ" یقیناً نہایت مکروہ چیز ہے

غالب کے یہاں تلاش سے آپ کو شاید دس پانچ ہی شعر اس رنگ کے ملیں، مثلاً

جذبۂ بے اختیار شوق دیکھا چاہئے ۔۔۔ سینۂ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا

چونکہ لفظ دم سانس کے معنے میں بھی آتا ہے اس لئے اس کے لئے سینۂ شمشیر بھی پیدا کر دیا اور دم کا باہر آنا بھی لکھدیا، حالانکہ "دم شمشیر" کا جس سے مراد "تیزیٔ شمشیر" ہے، سینۂ شمشیر سے باہر آنا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ اسی انداز کا ایک اور شعر ملاحظہ ہو

نقش کو اسکے مصور پر بھی کیا کیا ناز ہیں ۔۔۔ کھینچتا ہے جسقدر اتنا ہی کھنچتا جائے ہے

تصویر بھی کھنچتی ہے اور آدمی بھی کھنچتا ہے لیکن مفہوم دونوں کا جدا جدا ہے۔ غالب نے محض اس لئے کہ کھنچنا دونوں محل پر مستعمل ہے ایک مہمل سی بات کہدی ورنہ ظاہر ہے کہ نقش یا تصویر کا کھنچنا (احتراز کرنے کے معنے میں) کوئی مفہوم ہی نہیں رکھتا۔ امیر مینائی کے مذکورۂ بالا شعر کے ساتھ ہی ساتھ غالب کا یہ شعر بھی پڑھئے:۔

صحبت رنداں سے واجب ہے حذر ۔۔۔ جائے مے اپنے کو کھینچا چاہئے

یہاں بھی وہی کھینچنے اور کھنچنے کی کشمکش ہے

ایک اور شعر غالب کا یاد آیا:۔

نہ چھوڑی حضرت یوسف نے یاں بھی خانہ آرائی ۔۔۔ سفیدی دیدۂ یعقوب کی پھرتی ہے زنداں پر

سفیدی دیوار پر بھی ہوتی ہے اور آنکھ میں بھی پائی جاتی ہے اس لئے دونوں کو ملا کر شعر کو مہمل کر دیا

ان چند اشعار کے علاوہ غالب کا کوئی اور شعر میری نگاہ سے ایسا نہیں گزرا جس پر نامخیت کا اطلاق ہو سکے۔ آپ کو اگر یاد ہوں تو بتائیے

غالب کے کلام میں کہیں کہیں معیوب قسم کا مبالغہ بھی ہے اور نقص تعبیر کی مثالیں بھی پائی جاتی ہیں، لیکن ناسخ کا رنگ اس کے یہاں یقیناً نہیں ہے۔ محض دو چار شعروں کو دیکھ کر یہ حکم لگانا قرین انصاف نہیں

مخلص نواز۔ شرمندہ ہوں کہ محبت نامے کا جواب غیر معمولی تاخیر سے جا رہا ہے۔ چند دن سے دل کی عجیب حالت ہے دنیا کی بے ثباتی کا خیال تو مجھے خیر کبھی نہیں آیا۔ اس میں ایک نوع کی حوصلہ حسرت ناکامی پائی جاتی ہے، لیکن نشاط و مسرت کا مفہوم البتہ لایعنی سا ہو کر رہ گیا ہے۔ اگر آپ کہیں کہ یہ احساس کا کند ہو جانا ہے تو یہ بھی صحیح نہیں، کیونکہ درد و غم کا احساس بدستور باقی ہے، اگر آپ اسے دنیاوی مصائب و تکالیف کا نتیجہ بتائیں تو یہ بھی غلط ہے، کیونکہ مجھے معلوم ہے اوروں پر کیا گزرتی ہے اور مجھ پر نہیں ۔۔۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اب میں بہت تھک گیا ہوں اور میرے دماغ کو سکون کی ضرورت ہے، لیکن نہ اتنا قدر کہ یہ سمجھ سکوں کہ دماغ کا سکون خود تھکا دینے والی چیز ہے ۔۔۔ مجھے آجکل سب سے زیادہ جس خیال نے مضطرب بنا رکھا ہے وہ صرف یہ کہ میں یہاں کیوں ہوں؟ یہ معاملہ "بہ چہ کار گشت ورا" کا نہیں بلکہ اجنبیت کا ہے۔ میں دیکھتا ہوں کہ یہاں کی سرزمین اور یہاں کے رہنے والوں سے اجنبی تر ہوتا جا رہا ہوں اور کوئی صورت اس بعد روحانی کی کم کرنے والی نظر نہیں آتی آپ اسے جو چاہے کہئے لیکن میں اسے ذہنی غلامی کے احساس شدید کا ردعمل سمجھتا ہوں

پہلے مجھے ان لوگوں پر ہنسی آتی تھی، اب تکلیف ہوتی ہے۔ پہلے خیال تھا شاید یہ تنگ نظری کم ہو جائے، لیکن اب میں مایوس ہو چلا ہوں، پہلے دل کی بھڑاس نکالنے کو جی چاہتا تھا، اب دل ہی دل میں گھٹ کر رہ جاتا ہوں

واردھا اسکیم کا ذکر کر کے آپ نے زخموں پر اور نمک چھڑک دیا۔ غضب خدا کا، جب سید سلیمان ندوی ایسے لوگ (جو اپنے آپ کو نہایت روشن خیال عالم دین سمجھتے ہیں) اس پر یہ اعتراض کریں کہ مذہبی تعلیم کا کوئی ذکر اس اسکیم میں نہیں ہے، تو پھر آپ ہی بتائیے کہ سوائے سر پھوڑ کر مر جانے کے چارہ کیا۔ اور کیا رہ جاتا ہے۔ اگر یہ سب عقلمند ہیں تو مجھ ایسے بیوقوف کو ان کے ساتھ رہنے کا کیا حق حاصل ہے اور اگر میں عقلمند ہوں تو احمقوں کی اتنی بڑی جماعت میں میرا کیا کام! ہائے کوئی ایسا نہیں جو مجھے یہاں سے نکال باہر کرے، جلاوطن کر دے ۔۔۔ آزاد ملک، آزاد فضا اور آزاد خیال انسانوں کے درمیان چند سانسیں لینا اور مر جانا! اس سے زیادہ اب میری کوئی تمنا نہیں

ہندوستان کی آزادی کی طرف سے میں بہت مایوس ہوں اور اگر اتفاق سے ملک آزاد ہو بھی جائے تو یہاں کا مسلمان قیامت تک آزاد نہیں ہو سکتا، وہ خود اپنے ہاتھ سے اپنے آپ کو جکڑتا جا رہا ہے، خود زنجیریں بنا بنا کر اپنے پاؤں

ہیں ڈال رہا ہے، اس کی حالت ایسے آسیب زدہ کی سی ہے جو خود اپنے سایہ سے ڈر ڈر کر بھاگ رہا ہے، وہ ایک ایسی صرع زدہ قوم ہے جسے اپنے اعضاء پر مطلق اختیار باقی نہیں، اس کی دماغی کیفیت بالکل وہی ہے جسے "اللذی یتخبطہ الشیطان من المس" سے تعبیر کیا جاتا ہے اور اس کے ذہنی و اجتماعی اختلال و اضطراب نے عالم سے اسے جتنا بیگانہ بنا دیا ہے اس کی تصویر غالب نے ان الفاظ میں کھینچی ہے کہ

سایہ میرا مجھ سے مثل دود بھاگے ہے اسد
پاس مجھ آتش بجاں کے کس سے ٹھہرا جائے ہے

لوگ کہتے ہیں، مایوسی شیوۂ مردانگی کے خلاف ہے، قومیں پستی ہی سے نکلکر دنیا میں اُبھرتی ہیں، حالانکہ مجھے بیسیوں ایسی قوموں کے نام معلوم ہیں جو ایک بار ڈوبنے کے بعد پھر ابھری ہی نہیں اور یہاں کے مسلمانوں کو میں انھیں میں شامل سمجھتا ہوں

حضرت سلامت ۔ فرمان گرامی پہونچا، لیکن اسوقت جب میں تمام فرائض و واجبات کی طرف سے "غیر مکلف" ہو چکا ہوں ۔ تعمیل ارشاد نہ مجھ سے ممکن ۔ نہ اس پر آپ کی بازپرس قرین انصاف ۔ میں دیوانہ ہوں تو ہوا کروں، آپ کیوں بچہ بنکر مجھے ستاتے ہیں!

ذرا صبر کیجئے، چند دن میں یہ جھگڑا بھی مٹا جاتا ہے، اگر زندگی کا اہتمام ہی آپ کے نزدیک زندگی ہے

ماشاء اللہ، کیا کہنے ہیں، وہ تو کہئے خیر سے آپ کی دعا پوری طرح قبول نہیں ہوئی، ورنہ شاید حالت اور زیادہ خراب ہو جاتی۔ خدا کے لئے حواس پر قابو رکھئے، اس قدر اپنے آپ سے گزر جانا اچھا نہیں

پیمانہ یراں رند حرام ست کہ غالب
در بیخودی اندازۂ گفتار نداند

جس چیز کو آپ نے "مایۂ عز و وقار" سمجھا ہے، اس کی حقیقت آفتاب لب بام سے زیادہ نہیں، اور جن کو آپ نے رفیق و ہمدم بنایا ہے ان کی تدبیریں درماندگی سے بیش نہیں۔ ذمہ دار لوگ ایسی باتیں زبان سے نہیں نکالا کرتے

معاف کیجئے، تعلق خلوص رکھتا ہوں اس لئے کہہ رہا ہوں، ورنہ مجھے کیا غرض ہے کہ ہر وہ شخص جو پہاڑ سے سر ٹکرائے اسے سمجھاتا پھروں

باب الاستفسار

ہندوستان

(جناب جگدیش پرشاد صاحب - الہ آباد)

آپ نے انقلاب فرانس پر گزشتہ اشاعت میں نہایت مختصر لیکن بہت مکمل مضمون شایع کیا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ اگر تمام تاریخی واقعات اور دنیا کی تاریخ بھی اسی طرح مختصر طور پر لکھ دی جائیں تو اس سے طالب علموں کو بھی بہت مدد ملیگی اور عوام بھی فائدہ اُٹھا سکیں گے۔ کیونکہ تاریخ کی کتابیں نہ ہر شخص پڑھ سکتا ہے نہ اتنی فرصت لوگوں کو ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اگر باب الاستفسار کے بجائے یہ سلسلہ مستقل طور پر نگار میں قائم کر دیا جائے تو دو چار سال میں ایک نہایت مفید کتاب تیار ہو سکتی ہے۔ میری رائے میں سب سے پہلے جغرافیہ اور تاریخ کو لینا چاہئے اور اس کے بعد دوسرے علوم و فنون کو

میں چاہتا ہوں کہ جغرافیہ و تاریخ کے سلسلہ میں سب سے پہلے ابتدا ہندوستان سے کی جائے۔ امید ہے کہ آپ نہایت مختصر طور پر ہندوستان کی موجودہ حالت اور گزشتہ تاریخ پر روشنی ڈالکر مدارس کے طلبا، مدرسین اور عام پبلک کو ممنون فرمائیں گے

(نگار) بیشک یہ سلسلہ بہت مفید ہے اور ہو سکتا ہے کہ میں کسی آیندہ اشاعت سے ایک مستقل باب اس موضوع کے لئے وقف کردوں لیکن فی الحال کوئی قطعی وعدہ نہیں کرتا۔ اگر مدرسین و طلبہ کی طرف سے اصرار ہوا اور مجھے یقین دلا دیا گیا کہ واقعی اس چیز کی ضرورت ہے تو پھر میں اس کو شروع کردوں گا سب سے پہلے یقیناً جغرافیہ و تاریخ ہی کو لینا چاہئے اور اس کے بعد طبقات الارض (جیالوجی) بشریات (انتھراپالوجی) عضویات (فزیالوجی) اصول صحت (ہائی جین) طبیعیات (فزکس) فلکیات (اسٹرانومی) وغیرہ کو۔ اچھا اب ہندوستان کا بیان سنئے، اور بتائیے کہ کیا اس قسم کے مختصر مقالے مفید ہوں گے

ہندوستان ایک جزیرہ نما ہے ایشیا کے جنوب میں اور ملک ہے برطانیہ کی حکومت سے متعلق۔ اسکا رقبہ ۱۸۰۸۶۷۹ مربع میل ہے۔ شمال میں اسکے ہمالیہ اور افغانستان واقع ہے اور باقی تین طرف خلیج بنگال و بحیرۂ عرب جو بحر پاسفک کے حصے ہیں جزیرہ نمائے ہند میں برما شامل نہیں ہے لیکن ہے وہ برطانوی حکومت ہی سے متعلق۔ اسی طرح بعض مقامات ایسے ہیں جو جزیرہ نمائے ہند میں داخل ہیں لیکن برطانوی حکومت سے علیحدہ ہیں مثلاً مغربی ساحل پر گوا جو پرتگال کی حکومت میں

شامل ہے اور پانڈیچری جو فرانسیسیوں کے قبضہ میں ہے۔ لنکا برطانوی مقبوضہ ہے لیکن جزیرہ نمائے ہند سے علٰحدہ ہے

ہندوستان کے شمال میں ایک وسیع سلسلۂ کوہستان (ہمالیہ) پایا جاتا ہے جس کی بعض چوٹیاں دنیا کی سب سے اونچی پہاڑی چوٹیاں سمجھی جاتی ہیں۔ اس سلسلۂ کوہ سے نیچے وہ وادیاں شروع ہوتی ہیں جہاں متعدد دریا بہتے ہیں اور آگے چلکر میدانی علاقوں کو سیراب کرتے ہیں۔ گنگا اور دریائے سندھ سے سیراب ہونے والے علاقوں سے آگے جنوب میں دکن کا میدانی علاقہ ہے جہاں نیلگری اور گھاٹ پہاڑیوں کے سلسلے بھی پائے جاتے ہیں اور زیادہ جنوب میں ایک بڑا دریا دریائے برہمپترا پایا جاتا ہے۔ الغرض ہندوستان کا اکثر حصہ اپنے دریاؤں کی وجہ سے بہت سیراب ہے

اس کی آبادی ۱۹۳۱ء میں ۳۵۲۸۳۷۷۷۸ تھی، جس میں مختلف قومیں مختلف زبانیں بولنے والی شامل ہیں۔ ان زبانوں کی تعداد ۲۲۲ ہے اور اس کی تقسیم سات سلسلوں میں کی گئی ہے:۔ مغربی حصہ کی ہندی، بنگالی، تلگو، مرہٹی، تامیل، پنجابی، راجستھانی اور ہندوستانی جو یہاں کی تنہا لٹریری زبان ہے۔ انگریزی بولنے والوں کی تعداد بھی تقریبًا ۳۰ لاکھ ہے۔

مذہبی تقسیم میں ہندؤں کی تعداد ۲۳۹۱۹۵۱۴۰ ہے، مسلمانوں کی ۷۷۶۷۷۵۴۵ اور بودھ مت والوں کی ۱۲۷۸۶۸۰۶

شہروں میں کلکتہ اور بمبئی سب سے بڑے شہر ہیں، ان کے بعد مدراس، حیدرآباد، رنگون، دہلی، لاہور، لکھنؤ، احمد آباد، بنگلور، کراچی، امرتسر، کانپور، اور پونا کا مرتبہ ہے — ہندوستان سیاسی حیثیت سے دو حصوں میں منقسم ہے۔ برطانوی ہند اور ریاستی ہند۔ ریاستیں گو بظاہر آزاد ہیں لیکن ہیں وہ برطانیہ ہی کے اثر میں۔ برطانوی ہند کا رقبہ ۱۳۱۸۳۴۶ مربع میل ہے۔ سب سے بڑا صوبہ برما تھا جو اب ہندوستان سے علٰحدہ کر دیا گیا ہے۔ اس کے بعد صوبۂ مدراس ہے اور پھر صوبۂ بمبئی۔ یوپی پنجاب، سی پی تقریبًا برابر ہیں۔ ان کے بعد بہار، بنگال، آسام اور بلوچستان کا نمبر ہے۔ صوبۂ سرحد، اجمیر مارواڑ اور کورگ بہت چھوٹے صوبے ہیں، جزائر انڈمان و نکوبار کا صوبہ سب سے علٰحدہ ہے اور دہلی بھی اب علٰحدہ صوبہ ہو گیا ہے جہاں حکومت کا پایۂ تخت ہے۔ بمبئی میں سندھ اور عدن بھی شامل تھے، لیکن اب سندھ کا صوبہ الگ ہو گیا ہے اور عدن کو بھی جدا کر لیا گیا ہے۔ بڑے صوبوں کے حاکم اعلےٰ گورنر اور چھوٹے صوبوں کے چیف کمشنر کہلاتے تھے، لیکن اب یہ تفریق باقی نہیں رہی اور سب گورنر کہلاتے ہیں

ریاستی ہند کا رقبہ (جس میں کئی سو ریاستیں شامل ہیں) ۳۲۳۰۹۴ مربع میل ہے اور ہر ریاست کا فرمانروا علٰحدہ ہے، بڑی بڑی ریاستیں یہ ہیں:۔ حیدرآباد، کشمیر، میسور، گوالیار، بڑودہ۔ باقی ریاستیں ایجنسیوں سے متعلق ہیں۔

تمام ہندوستان کے نظم حکومت کا ذمہ دار گورنر جنرل یا وسیرائے کہلاتا ہے جو وزیر ہند مقیم لندن کے سامنے جوابدہ ہے۔ وسیرائے کی حکومت دو ایوانوں سے متعلق ہے ایک کو اسٹیٹ کونسل کہتے ہیں اور دوسری کو لجسلیٹو اسمبلی جو ۱۹۲۱ء میں قائم کی گئی تھی اور جس کے ممبروں کا انتخاب ہوتا ہے — ۱۹۱۹ء کی اصلاحات کی رو سے صوبوں میں بھی لجسلیٹو کونسل قائم ہو گئی۔

اصل انتظام وسیرائے کی اگزیکٹو کونسل اور صوبوں کی اگزیکٹو کونسلوں کے ذریعہ سے ہوتا ہے، مرکزی (یعنی وسیرائے کی) اگزیکٹو کونسل کا ہر ممبر ایک یا ایک سے زاید محکموں کا انچارج ہوتا ہے اور انڈین سول سروس کے ذریعہ سے اپنے فرائض کو انجام دیتا

ریاستوں کے معاملات پر بحث کرنے کے لئے رؤسائے ہند کا ایوان ہے جس میں مرکزی حکومت کی طرف سے ریزیڈنٹ صاحبان بھی شامل ہیں۔ وزیر ہند کو مشورہ دینے کے لئے لندن میں انڈیا کونسل بھی قائم ہے جسکے بارہ ممبروں میں سے دو ہندوستانی ہوتے ہیں اور ایک ہائی کمشنر بھی ہوتا ہے ــــ یہاں کی آبادی کا ذریعۂ معاش زیادہ تر زراعت ہے۔ چاول، گیہوں اور کپاس کی پیداوار بہت ہوتی ہے۔ کوئلہ اور پٹرول کی کانیں بھی یہاں پائی جاتی ہیں اور ان سے کم سونے چاندی کی بھی۔ جنگلی علاقہ بہت بڑا ہے جو ایک خاص محکمہ کی نگرانی میں ہے۔ ریلیں بھی بکثرت جاری ہیں۔ سکۂ رائج الوقت یہاں کا روپیہ ہے جو ایک شلنگ چھ پنس کے برابر سمجھا جاتا ہے یہاں کا خاص بنک امپیریل بنک ہے لیکن اب جدید آئین کی رو سے ایک اور بنک ریزرو بنک کے نام سے قائم ہو گیا ہے ہندوستانی فوج میں افسر زیادہ تر انگریز ہیں۔ انگریزی فوج کی تعداد ستر ہزار ہے ہوائی فوج بھی ہے اور بحری فوج بھی۔ پولیس کی تعداد ۲۰ لاکھ ہے۔

تاریخ مسلمانوں کے حملے سے قبل یہاں کی ابتدا ۱۰۰۰ء سے ہوتی ہے، ہندوستان کا ایک حصہ یونانیوں نے بھی فتح کیا تھا لیکن کوئی سلطنت انھوں نے قائم نہیں کی۔ البتہ مسلمانوں کے حملوں نے جو ۳۰۰ سال تک جاری رہے دکن تک تسلط قائم کر لیا تھا ۱۳۹۸ء میں تیمور نے حملہ کیا اور ۱۵۲۶ء میں مغلیہ سلطنت کی بنیاد یہاں قائم ہوئی۔ اٹھارویں صدی میں اس پر زوال آیا جسکا سبب ایرانیوں کا حملہ اور مرہٹوں کا خروج تھا۔ پندرھویں صدی میں پرتگالیوں نے ہندوستان کے ساتھ تجارت شروع کی اور اس سلسلہ میں یہاں آکر مقیم ہوئے۔ اس کے بعد ڈچ، فرانسیسی اور انگریز آئے اور ہر ایک نے اپنی اپنی تجارتی کمپنیاں قائم کر لیں۔ انگریزوں کی کمپنی کا نام ایسٹ انڈیا کمپنی تھا جس نے آہستہ آہستہ اپنی فتوحات بڑھا کر ۱۸۵۷ء تک تقریباً سارے جزیرہ نمائے ہند پر اپنا تسلط قائم کر لیا

۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی توڑ دی گئی اور ہندوستان تاج برطانیہ سے متعلق ہو گیا۔ ۱۸۷۷ء میں وکٹوریہ یہاں کی ملکہ قرار دی گئی۔ اس کے بعد انگریزوں کو متعدد چھوٹی چھوٹی لڑائیاں لڑنا پڑیں اور ہر لڑائی کے بعد انکا تسلط بڑھتا گیا

بیسویں صدی میں ہندوستان کے باشندوں میں آزادی کا خیال پیدا ہوا اور جنگ عظیم کے بعد یہ خیال زیادہ قوی ہو گیا۔ گاندھی جی نے برطانوی مال کا مقاطعہ کیا اور ستیاگرہ کو پھیلایا، لیکن اس تحریک سے پہلے ہی مطالبۂ آزادی پر حکومت نے کچھ اصلاحات کی تھیں لیکن ۱۹۲۱ء میں اصلاح کا ایک اور قدم اٹھایا گیا یعنی مجلس قانون ساز میں اہل ملک کی نمایندہ جماعت کو جگہ دی گئی۔ ۱۹۲۷ء میں ایک کمیشن سر جان سائمن کی سرکردگی میں قائم کیا گیا تاکہ آیندہ نظم و نسق کے متعلق اپنی رائے پیش کرے ۱۹۳۰ء میں اس کمیشن کی رپورٹ شایع کی گئی۔ اس میں ایک سفارش یہ بھی تھی کہ برما کو ہندوستان سے علحدہ کر دیا جائے اور رائے دینے والوں میں ۶۶ لاکھ عورتیں بھی شامل کی جائیں ــــ ۱۹۳۰ء سے ۱۹۳۲ء تک گول میز کانفرنس کے اجلاس لندن میں منعقد ہوئے اور وفاقی حکومت کا آئین مرتب کیا گیا۔ مارچ ۱۹۳۳ء میں وائٹ پیپر کے نام سے حکومت کی تجاویز اصلاحات شایع کی گئیں اور ۱۹۳۵ء میں ایک ایکٹ نافذ کیا گیا جسکے رو سے برما ہندوستان سے علحدہ کر دیا گیا، عدن کا تعلق ہندوستان سے جدا ہو گیا اور صوبوں کو خود مختار حکومت تفویض کی گئی۔ وفاقی حکومت میں صوبوں کی حکومتیں اور ریاستہائے ہند شامل ہوں گی۔

جدید آئین چونکہ ایک علحدہ موضوع ہے اس لئے اس پر اس سلسلہ میں بحث کرنا مناسب نہیں

مطبوعات موصولہ

ریاض رضواں ریاض مرحوم کے کلیات کا مجموعہ ہے، جو ان کی زندگی میں تو شایع نہ ہوسکا، لیکن اب ان کے احباب گورکھپور اور خصوصیت کے ساتھ جناب تلمذ حسین صاحب ایم۔ اے کی کوششوں سے شایع ہوا ہے

ریاض جس رنگ کے شاعر تھے اس کا علم ہر شخص کو ہے، گذشتہ دور شاعری کی یادگار یہی ایک رہ گئے تھے اور بڑا ظلم ہوتا اگر ان کا کلام شایع نہ ہوتا یا اگر شایع بھی ہوتا تو اس اہتمام کے ساتھ نہیں

کاغذ، کتابت، طباعت سب نفیس ہیں اور جلد بھی اچھی ہے۔ قیمت چھ روپیہ بظاہر زاید معلوم ہوتی ہے لیکن قدرشناسانِ ریاض کے لئے اس عروس سخن کا یہ رونما کچھ نہیں ہے۔ دائرۃ الادب حیدر گڑھ، حیدر آباد دکن یا دفتر شاہکار گورکھپور سے یہ مجموعہ ملسکتا ہے

مکاتیب مہدی یعنی مہدی حسن افادی الاقتصادی کے ان خطوط کا مجموعہ جو انھوں نے اپنے احباب کے نام لکھے تھے، مہدی حسن مرحوم ایک خاص رنگ کی انشاء لکھنے والے تھے اور جنھوں نے مقالات مہدی کا مطالعہ کیا ہے، وہ جانتے ہیں کہ ان کا انداز بیان کتنا شوخ اور لطیف ہوتا تھا، جس کے نمونے ان خطوط میں بکثرت نظر آتے ہیں۔ مہدی بیگم نے اس مجموعہ کو شایع کرکے اُردو ادب پر یقیناً بڑا احسان کیا ہے۔ قیمت درج نہیں ہے۔ مہدی بیگم صاحبہ سے ذریعہ احمد حسن صاحب ڈپٹی کلکٹر لکھنؤ مراسلت کی جائے

اقبال کی شاعری ہمارے فاضل دوست مولانا عبدالمالک آروی کا علمی مقالہ ہے جو انھوں نے ۹ جنوری ۱۹۳۸ء کو شاہ آباد اُردو لائبریری کے جلسہ میں پڑھا تھا۔ اس مقالہ میں ابتداءً مختصر طور پر اُردو شاعری کے ادوار سے بحث کی گئی ہے اور پھر بطریق گریز یہ بتاکر کہ اقبال کس اسکول کی پیداوار تھے ان کی شاعری پر تبصرہ کیا گیا ہے

اس سلسلہ میں جیساکہ عبدالمالک کی محققانہ فطرت کا تقاضا ہے، انھوں نے اقبال کی شاعری کے ہر پہلو پر نہایت عالمانہ انداز سے گفتگو کی ہے اور مختصراً میں اس مقالہ کی تعریف میں صرف یہ کہنے پر اکتفا کرتا ہوں کہ

"ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا!" وہ حضرات جو اقبال کی عمیق شاعری کا مطالعہ عمیق نگاہ سے کرنا چاہتے ہیں، انکو اس مقالہ میں بعض باتیں بہت عجیب و غریب ملیں گی۔ سکریٹری شاہ آباد اُردو لائبریری (آرہ) سے خط و کتابت کی جائے۔

ذکرِ غالب

جناب مالک رام صاحب ایم۔اے کی تالیف ہے۔ موضوع نام سے ظاہر ہے۔ اسوقت تک غالب پر متعدد کتابیں شایع ہو چکی ہیں بعض اچھی اور بعض معمولی، تاہم بقول ڈاکٹر عابد حسین صاحب (جنکا دیباچہ اس میں شامل ہے) ایک ایسی کتاب کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی جو جامع بھی ہو اور مختصر بھی۔ چنانچہ مالک رام صاحب نے اس ضرورت کو پورا کر دیا

اس کتاب میں نہ صرف وہ تمام واقعات درج ہیں جو غالب کے متعلق دوسری کتابوں میں پائے جاتے ہیں، بلکہ بعض نئی معلومات بھی اس میں شامل ہیں۔ واقعات کو سلسلہ وار بہ حساب سنین درج کیا گیا ہے، جس سے سمجھنے میں بہت آسانی ہو جاتی ہے۔ میرزا صاحب کی بالکل ایک نئی تصویر اس میں شامل ہے اور اُن کے آگرے والے مکان کی بھی۔ اس کتاب کا وہ باب جس میں غالب کی تصانیف فارسی و اُردو سے بحث کی گئی ہے، مجھے بہت پسند ہے۔ اندازِ بیان آسان بھی ہے اور محققانہ بھی

مالک رام صاحب کو فارسی و اُردو لٹریچر سے غیر معمولی شغف ہے اور وہ ہمیشہ اس ادبی خدمت میں مشغول رہتے ہیں جن میں سے بعض کا علم لوگوں کو ہو گیا ہے اور اکثر کا نہیں۔ اس کتاب کو بھی جامعۂ ملیہ نے شایع کیا ہے۔ قیمت ۸ر ہے۔

سبدِ چین

میرزا غالب کا وہ کلام جو کلیات میں شامل نہ ہو سکا تھا، ۱۸۶۷ء میں سبدِ چین کے نام سے شایع ہوا لیکن اب وہ بھی دستیاب نہ ہوتا تھا۔ اتفاق سے ہمارے عزیز دوست مالک رام صاحب کو اس کا ایک نسخہ حبیب الرحمان خانصاحب شروانی کے کتب خانہ سے دستیاب ہو گیا اور انھوں نے اس کو ایڈٹ کر کے جامعۂ ملیہ کو دیدیا۔

مالک رام صاحب نے اس میں میرزا کا وہ کلام بھی شامل کر دیا ہے جو کسی مجموعہ میں شامل نہ ہوا تھا۔ گویا کلیاتِ غالب کے علاوہ جتنا کلام غالب کا ملسکتا ہے وہ سب اس میں موجود ہے، اس میں میرزا کی وہ تصویر بھی ہے جو ذکرِ غالب میں دیگئی ہے ملک کو مالک رام صاحب کا ممنون ہونا چاہئے کہ انھوں نے غالب پر یہ دو کتابیں پیش کر کے بڑی کمی کو پورا کر دیا۔
یہ کتاب ۶ر میں مکتبہ جامعہ سے ملسکتی ہے

بنی اسرائیل کا چاند

"بنی اسرائیل کا چاند" سر رائڈر ہیگرڈ کا نہایت مشہور تاریخی ناول ہے، جسے غالباً ہر انگریزی داں نے پڑھا ہوگا۔ عبدالمجید صاحب حیرت بی اے نے اسی کا ترجمہ اس نام [illegible] پیش کیا ہے اور مجھے سخت حیرت ہوتی ہے یہ دیکھ کر کہ انھوں نے اس سلسلہ میں کس صبر و تحمل سے کام لیا ہوگا

ہیگرڈ کے ناولوں کا ترجمہ کرنا آسان کام نہیں کیونکہ اس کے افسانوں کا پس منظر ایسا پیچیدہ ہوتا ہے کہ زبان و خیال دونوں میں از خود غیر معمولی اشکال پیدا ہو جاتا ہے، لیکن حیرت صاحب نے واقعی کمال کیا ہے کہ شروع سے اخیر تک کسی جگہ اس اُلجھن کو ظاہر نہیں ہونے دیا جو قدرتاً اس ناول کا ترجمہ کرتے وقت ان کے دل و دماغ میں پیدا ہونی چاہئے تھی

زبان و محاورہ دونوں حیثیتوں سے ترجمہ بہت کامیاب ہے۔ اس کتاب کو مکتبہ پنجاب لاہور نے مجلد شایع کیا ہے

اور قیمت دو روپیہ رکھی ہے جو زیادہ نہیں ہے

بیوہ منشی پریم چند مرحوم کا ناول ہے جس کا دوسرا اڈیشن مکتبۂ جامعہ دہلی نے نہایت اہتمام کے ساتھ مجلد شایع کیا ہے۔ منشی پریم چند ہوشل فسانے لکھنے میں یوں بھی خاص ملکہ رکھتے تھے، لیکن چونکہ یہ فسانہ انھوں نے کافی تجربہ و مہارت کے بعد لکھا ہے اس لئے ان کے فن افسانہ نگاری کا بہترین نمونہ کہا جا سکتا ہے۔ اس میں انھوں نے ظاہر کیا ہے کہ ہندو معاشرت میں بیوہ کی زندگی کیا چیز ہے اور اس میں کیا اصلاح ہونا چاہئے۔ قیمت ایک روپیہ اور ملنے کا پتہ مکتبۂ جامعہ دہلی ہے

دلی کی دو سو برس کی تاریخ یہ مقالہ ہے مولوی سید حسن صاحب برنی کا جو انھوں نے جامعہ ملیہ کے اُردو اکاڈمی کے جلسہ میں پڑھا تھا۔ اس میں حملۂ تیمور سے قبل دلی کی دو سو سال کی تاریخ مختصر و جامع طور پر درج کی گئی ہے۔ واقعات کے استقصا و تحقیق میں پوری کوشش سے کام لیا گیا ہے اور ہندوستان کی تاریخ کے جتنے ممکن الحصول ماخذ ہو سکتے ہیں اُن سب سے کام لیا گیا ہو، اسے بھی جامعہ ملیہ نے شایع کیا ہو قیمت درج نہیں ہو لیکن غالباً ۸ سے زیادہ نہ ہوگی

دہلی اس چار جزو کے رسالہ میں دہلی کے آثار و صنادید کی تاریخ بیان کی گئی ہے اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ اس سے قبل سات جگہ دلی شہر کس کس جگہ آباد ہوا اور اُجڑا۔ نقشوں اور تصاویر سے اس کو زیادہ مفید و دلچسپ بنایا گیا ہے زبان و بیان کے لحاظ سے اس قدر سلیس ہے کہ ایک بچہ بھی آسانی سے سمجھ سکتا ہے۔ قیمت ۱۲ ہے اور ملنے کا پتہ مکتبۂ جامعہ دہلی

ضرب الامثال خواجہ عبدالمجید دہلوی کی تصنیف ہے جس میں انھوں نے بعض مشہور امثال کی توجیہ بیان کی ہے اور اس سلسلہ میں جو قصہ طلب باتیں تھیں ان کو قلمبند کر دیا ہے۔ اس رسالہ میں ۸۰ ضرب الامثال درج ہیں اور ہر ایک کے متعلق وہ واقعہ یا افسانہ بھی بیان کر دیا گیا ہے جس نے اسے مشہور کیا۔ یقیناً یہ کتاب کوئی تاریخی اہمیت نہیں رکھتی، لیکن ذکاہی حیثیت سے خوب ہے۔ ملنے کا پتہ جامعۂ ملیہ دہلی، اور قیمت ۸ ہے

ایوان تمدن ڈاکٹر ریاض احمد بیگ صاحب چغتائی کا ناول ہے جو سرزمین عراق سے تعلق رکھتا ہے انھوں نے اس فسانہ میں موجودہ عراق کے تمدن کو پیش کرتے ہوئے وہاں کی عورت کے میلان سے بحث کی ہے اور نتیجہ کے طور پر یہ ظاہر کیا ہے کہ تہذیب حاضر کی آزادیاں عورت کی زندگی کے لئے کچھ زیادہ مفید نہیں ہیں

اکثر جگہ انداز بیان عربی ناولوں سے ملتا جلتا ہے۔ اس کا سبب غالباً یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے دیار عرب کی کافی سیاحت کی ہے اور اس طرح قدرتاً وہاں کے طرز انشا سے انھیں متاثر ہونا چاہئے تھا۔ پلاٹ بہت سادہ و مختصر ہے لیکن دلچسپ عبارت صاف و سلیس ہو لیکن زبان کی لغزشوں سے پاک نہیں۔ مکالموں کے ذریعہ سے پلاٹ کو آگے بڑھانے میں بھی پوری کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ بعض جگہ ایسے خلا پائے جاتے ہیں جن کو پُر کرنا ضروری تھا اور بعض جگہ ضرورت سے زیادہ اطناب پایا جاتا ہے۔ یہ پہلا حصہ ہے اس لئے ہم نہیں کہہ سکتے کہ دوسرے حصہ میں فسانہ کا انجام واقعی کیا ہوگا۔ تاہم یہ حصہ بھی بُرا نہیں ہے اور کتابت چھپائی بھی غنیمت ہے۔ قیمت ایک روپیہ ہے۔ اور ملنے کا پتہ الامان برقی پریس دہلی

مرثیۂ اقبال جناب اسد ملتانی نے رحلت اقبال پر ایک ترجیع بند لکھا تھا جسے روزنامہ شمس ملتان نے شایع کیا ہے ۔ نظم اچھی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ خاص تاثر کی حالت میں لکھی گئی ہے ۔ قیمت ۸؍ ہے

ابوالائمہ کی تعلیمات امامیہ مشن لکھنؤ کا چھپنواں رسالہ ہے جسے مولانا سید علی نقی صاحب نے مرتب کیا ہے اس میں نہج البلاغۃ کے اُن حصوں کی تشریح کی گئی ہے جو اپنے مفہوم کے لحاظ سے ما بہ النزاع ہیں اور ثابت کیا گیا ہے کہ اس کتاب کا کوئی حصہ ایسا نہیں ہے جو تعلیمات مذہب شیعہ کے منافی ہو

جناب امیر کی تصنیف اور مولانا علی نقی صاحب کی تفسیر ان دونوں کا اجتماع کوئی معمولی چیز نہیں ہو سکتا میں سمجھتا ہوں کہ یہ رسالہ سنیوں کے مطالعہ میں بھی آنا چاہئے ۔ قیمت ۴؍ ہے اور ملنے کا پتہ امامیہ مشن لکھنؤ

یادگار جناب مایل انصاری خیرآبادی کی چند نظموں اور غزلوں کا مجموعہ ہے ۔ جستہ جستہ دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مایل صاحب کی مشق سخن اچھی ہے ۔ کتابت و طباعت بہت روشن ہے اور قیمت ۶؍ ہے یہ مجموعہ جناب مایل سے خیرآباد سیتاپور کے پتہ پر مل سکتا ہے

سلسلۂ داستان گو حیدرآباد کے نوجوانوں نے سلسلہ داستان گو کے نام سے ہر ماہ ایک مختصر سا رسالہ شایع کرنے کا ارادہ کیا ہے تاکہ اس کے ذریعہ سے اچھے اچھے طبعزاد اور مترجم افسانے اردو میں پیش کئے جائیں ۔ یہ پہلی اس سلسلہ کی پہلی اشاعت ہے جس میں دو افسانوں کے ترجمے "کیوں" اور "رقاصہ" کے عنوان سے شایع ہوئے ہیں ۔ پہلا افسانہ سید محمد احسن بی ۔ اے کا ترجمہ کیا ہوا ہے اور دوسرا شیخ احمد صاحب بی ۔ اے کا ۔ اس سلسلہ کا مقصود یہ ہے کہ جامعۂ عثمانیہ کے طلبہ میں ادب و انشاء کا ذوق پیدا کیا جائے اور ان کے کارناموں کو ملک سے روشناس کیا جائے ۔ اس کی سالانہ قیمت ۱؍ رکھی گئی ہے جو کسی طرح زاید نہیں ہے ۔ اس اشاعت میں جو ترجمے شایع ہوئے ہیں وہ صاف و سلیس ہیں اور پڑھنے کے قابل ۔ میری رائے میں اگر ساتھ ہی ساتھ یہ بھی ظاہر کر دیا جاتا کہ وہ کس زبان کا ترجمہ ہیں تو افادی حیثیت زیادہ بڑھ جاتی ۔ غلام دستگیر تاجر کتب رحیم خاں بلڈنگ عابد روڈ حیدرآباد سے اس باب میں خط و کتابت کی جائے

ماہنامۂ دستکاری کے دو رسالے "الخضاب" اور "سونا بنانا" ہمیں ملے ہیں جو ڈاکٹر شفیع احمد صاحب کی تصنیف ہیں ۔ ایک میں تمام قدیم و جدید نسخے خضاب کے درج کر دئے ہیں اور دوسری میں بتایا گیا ہے کہ سونا بنانے کا دعویٰ کرنا یکسر مکر و فریب ہے، لیکن اس کے ساتھ بعض ترکیبیں ادنیٰ قسم کے پتھروں کو قیمتی پتھروں میں تبدیل کر دینے کی بھی درج کر دی ہیں

رسالۂ دستکاری دہلی ایک زمانہ سے صنعت و حرفت کی خدمت انجام دے رہا ہے اور لوگ اس سے فایدہ اُٹھا رہے ہیں ۔ جن حضرات کو ان باتوں سے دلچسپی ہو وہ اڈیٹر دستکاری ۔ دہلی سے خط و کتابت کریں

مقدس ٹائم چارٹ روغنی نقشہ ہے جس میں آنحضرت کے تمام اہم واقعات زندگی کو ابتدا سے آخر تک بہت

خوش سلیقگی سے دکھایا گیا ہے۔ بعض بعض واقعات کو نقشوں سے بھی ذہن نشین کرایا گیا ہے۔ بچوں اور عورتوں کو سمجھانے کے لئے سیرت نگاری کا یہ طریقہ اچھا ہے۔ نذیر محمد خاں صاحب مُسکرا (ہمیر پور) سے خط وکتابت کی جائے۔ قیمت ۱۲ ر ہے۔

آگ ہفتہ وار اخبار ہے جو لکھنؤ کی سر زمین سے حال ہی میں نکلنا شروع ہوا ہے، پریم بندھو صاحب اس کے ڈائرکٹر ہیں اور خلیق ابراہیم صاحب چیف اڈیٹر۔ سوشلسٹ خیال کی ترویج اس کا مقصد ہے اور ملک کی کامل آزادی اس کا نصب العین۔ مذہب انقلاب میں چونکہ یہ دونوں مقاصد "ایمان مجمل" کی حیثیت رکھتے ہیں، اس لئے ان سے اختلاف کی جرأت شاید ہی کسی کافر کو ہو سکتی ہو

تمام مقالے، تمام نظمیں اور جملہ اداریہ تحریریں اسی مدعا کو سامنے رکھ کر پیش کی جاتی ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ اس کے تمام کارکن اپنے دلوں میں ملک وملت کا غیر معمولی جوش رکھتے ہیں۔ ادب وانشاء کے لحاظ سے بھی اس کو خصوصیت خاصہ حاصل ہے۔ اس میں تصویریں بھی ہوتی ہیں لیکن معیاری نہیں۔ فلمی تصاویر سے اگر اس کو پاک رکھا جائے تو بہتر ہے۔ نمونہ دفتر آگ جھوائی ٹولہ لکھنؤ سے مل سکتا ہے

آیندہ جنوری سنہ ۳۹ء کا "نگار"

"مصحفی" نمبر ہوگا

اساتذۂ قدیم میں "مصحفی" جس مرتبہ کا شاعر ہوا ہے، اس کا اندازہ یوں نہ کرنا چاہئے کہ میر کے ساتھ ساتھ اس کا نام بھی لیا جاتا ہے بلکہ اس طرح کہ شاعری کی جن جن اصناف میں اس نے اپنا کلام پیش کیا اُن کو چھونے کی ہمت میر کو بھی نہیں ہوئی

تمام اُردو شعراء میں یہ خصوصیت صرف مصحفی کو حاصل تھی کہ اس نے ہر رنگ کو اختیار کیا اور جس رنگ کو اختیار کیا اسے اپنا بنا لیا۔ خصوصیت کے ساتھ مشکل زمینوں کو مانوس بنا دینا کہ اس باب میں تو اس کا ہمسر کوئی پیدا ہی نہ ہوا

مصحفی نمبر بہت ضخیم ہوگا اور مومن نمبر کی طرح انتہائی احتیاط کے ساتھ مرتب کیا جائے گا۔ اس سلسلہ میں جن جن عنوانات پر مقالے درکار ہیں ان کی مختصر سی فہرست یہ ہے:- (۱) مصحفی کی شاعرانہ خصوصیات۔ (۲) مصحفی تذکرہ نگار کی حیثیت سے۔ (۳) مصحفی اور اس کے ہمعصر اساتذہ۔ (۴) مصحفی اور اس کے تلامذہ (۵) مصحفی کی شاعری پر ماحول کا اثر۔ (۶) مصحفی بحیثیت ایک انسان کے۔ (۷) مصحفی ایک نقاد کی حیثیت سے۔ (۸) مصحفی اور مختلف اصناف سخن وغیرہ وغیرہ۔ ان کے علاوہ آپ اور جو عنوان مناسب سمجھیں اس پر لکھ سکتے ہیں۔ مضمون مع تصویر زیادہ سے زیادہ اکتوبر سنہ ۳۸ء کے آخر تک پہونچ جانا چاہئے۔

منیجر نگار لکھنؤ

غزل

امید امیٹھوی

روئی شبنم، گل ہنسا، غنچہ کھلا میرے لئے
جس سے جو کچھ ہوسکا اُس نے کیا میرے لئے

ہستیِ موہوم کا اُف رے فریبِ اعتبار
گرچہ سب کچھ تھا مگر کچھ بھی نہ تھا میرے لئے

جھاڑ کر پھر سے بچھائی جائے دُنیا کی بساط
پھر نئے سر سے قیامت ہو بپا میرے لئے

ہنسنے والے رو دئے اور رونے والے ہنس پڑے
دل کے ہاتھوں جو نہ ہونا تھا ہوا میرے لئے

جو نہ ہونا چاہئے تھا وہ تو سب کچھ ہوچکا
کیا وہ ہوگا جو نہ اب تک ہوسکا میرے لئے

کیا خبر جیتے ہیں اب امید کس امید پر
ایسے جینے سے تو مرنا سہل تھا میرے لئے

بہکی بہکی باتیں

پھر مری تنہائیاں ہیں اور میں،
سُونی بزم آرائیاں ہیں اور میں

چاند چُپ، ساکت ہوا، شاعر خموش
سامنے پرچھائیاں ہیں اور میں

دُنیائے تصور میں جو کھو جاتا ہوں
اک آئینۂ خیال ہو جاتا ہوں

کٹتے نہیں جب رات کے ساکت لمحے
تقدیر پہ روتا ہوا سو جاتا ہوں،

ہم اُنھیں جی سے بھلائے جائیں گے
وہ ہمیشہ یاد آئے جائیں گے

چند "وعدے" چند جلے ناتمام
نت نیا جادو جگائے جائیں گے

[illegible]

غزل :- ہادی مچھلی شہری

ہے یہ مشکل کہ موت دور نہیں، ورنہ جینا کوئی ضرور نہیں
شوق کی خامکاریوں کے سبب دل ہے مجبور، ناصبور نہیں،
خود پرستی بھی میری کیا کم ہے میری جنت میں کوئی حور نہیں،
بیدلی کو خدا کرے غارت اب طبیعت میں وہ سرور نہیں
ہم نے مانا کہ دور ہے منزل شوق اگر ہو تو کچھ بھی دور نہیں
عشق کی بے خودی، معاذ اللہ! اب مجھے ہوش کا غرور نہیں
جلوہ خارا گداز تھا اُس کا طور کا اس میں کچھ قصور نہیں
حسن اور جلوہ ہائے رنگارنگ عشق اور کچھ اُسے شعور نہیں
ڈھونڈھ ہادی دلِ حزین و خراب ورنہ جینے میں کچھ سرور نہیں

غزل :- دلؔ شاہجہانپوری

اب تو اُس مرحلہ کا ہے آغاز نہ رہا اعتبارِ محرمِ راز
روح پُرکیف ہو نظر کی طرح مطربِ مستِ ناز چھیڑ وہ ساز
سرگزشت اُس نظر کی طولانی، جس نظر سے ہے عشق کا آغاز
گونجتی ہے ابھی صدائے الست سُن رہا ہوں فضا میں وہ آواز
نہ رہا فرقِ عابد و معبود عشق کی بندگی بھی ہے اک راز
کیوں نہ ہوں مائلِ ترانۂ عشق، پندِ واعظ میں ہے نہ سوز نہ ساز
ان حدوں سے گزر چکا ہے دل، اب نہیں شکوۂ نشیب و فراز
صبحِ پیری ہے شمعِ بزمِ خموش ختم کر داستانِ سوز و گداز
فطرتِ عشق پر نظر اے دلؔ، شمع کی زندگی ہے سوز و گداز

اس لئے فیروز شاہ کا تخت نشین ہونا ہر طرح مناسب ہے۔ رہا داور ملک تو اس کو نائب باربک بنا دیا جائے گا۔ یہ سن کر "خداوند زادہ" خاموش ہو گئی۔ اور پھر "فیروز شاہ" کی حکومت کے خلاف کوئی کارروائی نہیں ہوئی سوائے اس کے کہ "خواجہ جہاں" نے دہلی میں "محمد تغلق شاہ" کا حال معلوم کر کے اس کا ایک فرضی بیٹا قرار دیکر تخت نشین کر دیا تھا (سوا اس کے متعلق بھی شمس سراج عفیف[1] نے اپنی "تاریخ فیروز شاہی" میں مفصل حالات لکھ کر ثابت کیا ہے کہ اس طرز عمل میں خواجہ جہاں[2] کی کوئی بدنیتی شامل نہ تھی) لیکن فیروز شاہ بغیر کسی مقابلہ کے دہلی میں داخل ہوا اور محل میں جا کر خداوند زادہ کے قدموں پر گر پڑا اس نے فیروز کے سر پر تاج رکھا اور اس کے بعد کئی دن تک جشن شاہانہ قایم رہا

---

[1] ضیاء الدین برنی کی تاریخ فیروز شاہی بہت مشہور کتاب ہے لیکن اس میں فیروز شاہ کے حالات بہت کم درج ہیں۔ البتہ شمس سراج عفیف نے اپنی تاریخ فیروز شاہی میں نہایت تفصیلی حالات اس عہد کے لکھے ہیں اور غالباً اس سے بہتر کوئی تصنیف حالات فیروز شاہ کے متعلق نہیں ہو سکتی۔

شمس سراج عفیف کون تھا؟ اس کے متعلق زیادہ حالات نہیں معلوم ہو سکے۔ وہ موضع ابوہر کا رہنے والا تھا۔ اسی گاؤں کی رہنے والی بی بی نایلہ فیروز کی ماں بھی تھی۔ عفیف کا دادا ابوہر میں وصولی خراج کا افسر تھا اور غیاث الدین تغلق اس سے بہت خصوصیت سے پیش آتا تھا

شمس سراج عفیف نے نہ صرف فیروز شاہ کے حالات (اس کی ولادت کے زمانہ سے) لکھے ہیں بلکہ اس کے آئین جہانداری ... رعایا کے حالات اور نظم و نسق سے بھی بحث کی ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ مورخین مابعد نے اس سے بہت کم فایدہ اٹھایا اور زیادہ تر برنی کی تاریخ فیروز شاہی کو اپنا ماخذ قرار دیا۔ اس کی وجہ شاید یہ رہی ہو کہ اس کتاب کا اسوقت تک کسی کو علم نہ ہوا ہوگا بہر حال ہم نے فیروز شاہ کے حالات لکھنے میں زیادہ تر اسی کتاب سے مدد لی ہے یا پھر فتوحات فیروز شاہی سے جو خود فیروز شاہ کی تصنیف ہے ہندوستان میں اس کے صرف دو نسخے نظر آتے ہیں ایک جنرل عظمٰی کی لائبریری میں اور دوسرا لوہارو کے کتب خانہ میں مسٹر ایلیٹ نے اس کا ترجمہ کر کے اپنی تاریخ میں شامل کیا ہے

عفیف نے اپنی کتاب میں مناقب سلطان تغلق کا جابجا حوالہ دیا ہے لیکن یہ کتاب بالکل نایاب ہے

[2] جب سلطان محمد تغلق اپنے آخری عہد میں دولت آباد گیا تو دہلی تین شخصوں کے سپرد کر دی۔ ملک کبیر، قتلغ خاں اور فیروز (شاہ) نائب امیر حاجب۔ جب ملک کبیر اور قتلغ خاں کا انتقال ہو گیا تو محمد تغلق نے فیروز کو اپنے پاس ٹھٹھہ میں بلا لیا اور ٹھٹھہ سے خواجہ جہاں کو دہلی روانہ کیا کہ وہاں کا انتظام کرے اس کے ساتھ قوام الملک خان جہاں، ملک حسن اور ملک ہشام الدین اتابک وغیرہ دیگر امراء سلطنت بھی روانہ کئے گئے

اس کے بعد جب محمد تغلق کا انتقال ہوا تو امراء خراسان نے جو اس کی مدد کے لئے مختلف صوبوں سے آ گئے تھے لشکر کا مال و اسباب اور بازار وغیرہ لوٹنا شروع کیا۔ فیروز شاہ ابھی تک تخت نشین نہ ہوا تھا اتفاق سے اسوقت خواجہ جہاں کا ایک غلام (مالح) یہاں کی خبر لینے پہونچا اس نے جو یہ ہنگامہ دیکھا تو فوراً دہلی واپس گیا اور خواجہ جہاں سے محمد تغلق کی وفات، مغلوں کا حملہ، بازار کا لوٹنا، شاہی افواج کا باہم کشت و خون وغیرہ تفصیل سے بیان کیا اور یہ بھی کہا کہ تاتار خاں اور امیر حاجب فیروز کا بھی پتہ نہیں ہے معلوم نہیں مغلوں نے انھیں قید کر لیا یا مارے گئے خواجہ جہاں یہ سنکر بہت متاسف ہوا کیونکہ فیروز سے اس کو بہت تعلق تھا اور اسے اپنا بیٹا کہا کرتا تھا) اور سوائے اس کے اور کوئی چارہ کار نہ دیکھا کہ سلطان محمد تغلق کے ایک فرضی بیٹے کو رفع فساد کی غرض سے دہلی میں تخت نشین کر دے۔

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۲۱۲ پر ملاحظہ ہو)

فیروز شاہ کا نصب العین

سلطان فیروز حد درجہ رحیم المزاج، نیک نفس، پابند مذہب بادشاہ تھا۔ اور وہ خونریزی سے اتنا ہی بچتا تھا جیسا کہ اس کا ہمنام فیروز شاہ خلجی۔ اس نے خود فتوحات[1] "فیروز شاہی" میں جابجا اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے جور ظلم سے پناہ مانگی ہے اور اس نے اپنا نصب العین یہی بنایا ہے کہ "ملک میں ہر طرف امن و سکون نظر آئے۔ خوں ریزی مفقود ہو جائے، رعایا خوشحال رہے

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۲۱۱)

جب خواجہ جہاں کو اس کے بعد معلوم ہوا کہ فیروز شاہ زندہ ہے اور دہلی کی طرف آ رہا ہے تو اس نے اپنی غلطی کو محسوس کیا لیکن چونکہ وہ ایک شخص کو تخت نشین کر چکا تھا۔ اس لئے اس نے بھی فوج فراہم کرنی شروع کی اور بیس ہزار سوار جمع کر لئے۔ خواجہ جہاں، دہلی کا سارا خزانہ وہاں کی رعایا کو دے دیکر اپنا طرف دار بنا رہا تھا اور سب طمع سے اس کا ساتھ بھی دے رہے تھے لیکن حالت یہ تھی کہ دل ہی دل میں فیروز شاہ کی آمد اور اس کی کامیابی کی دعائیں مانگ رہے تھے۔ جب فیروز شاہ ملتان میں داخل ہوا تو یہاں کے تمام تاجروں نے لاکھوں تنکہ اس کی خدمت میں پیش کئے۔ چونکہ فیروز شاہ کو اسوقت روپیہ کی سخت ضرورت تھی اس لئے ان روپیوں کو لے لیا مگر یہ وعدہ کیا کہ دہلی پہونچکر ساری رقم واپس کر دیجائے گی (اور یہ وعدہ اس نے پورا کیا) اب فیروز شاہ جس قدر آگے بڑھتا جاتا تھا، اطراف و جوانب کے لوگ اس کی فوج میں شامل ہوتے جاتے تھے یہانتک کہ ۲۳ راجہ قرب و جوار کے بھی اسکے ساتھ ہو گئے جب سرستی سے فیروز سلطان فیروز شاہ آگے بڑھا اور ہانسی میں پہونچا تو بیاں خان جہاں وغیرہ دہلی سے آکر اس سے مل گئے اور وہاں کے سارے حالات بیان کئے۔ اتفاق سے یہیں فیروز کے ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام اس نے فتح خاں رکھا اور اس کی یادگار میں وہیں ایک قصبہ فتح آباد کے نام سے تعمیر کر کے آباد کرایا

جب خواجہ جہاں کو معلوم ہوا کہ خان جہاں وغیرہ سب فیروز شاہ سے جا کر مل گئے ہیں تو یہ اور زیادہ مضطرب ہوا اور اس نے سلامتی اسی میں دیکھی کہ خود بھی فیروز شاہ کے پاس جا کر اپنی غلطی کا اظہار کر دے اور معافی چاہے۔ خواجہ جہاں کی عمر اس وقت ۸۰ سال کی تھی اور تمام بال سفید ہو گئے تھے ضعف بھی بہت بڑھ گیا تھا لیکن یہ ہمت کر کے روانہ ہوا اور برہنہ سر گلے میں زنجیر ڈالے ہوئے فتح آباد فیروز شاہ کے حضور میں پہونچا۔ فیروز شاہ نے اس کی بہت عزت کی اور اس کے حقوق دیرینہ اور اپنے اس کے تعلقات قدیم پر نگاہ کر کے معاف کر دینا چاہا۔ اول اول لوگوں نے سخت اختلاف کیا لیکن جب فیروز شاہ کے رنج و ملال کو دیکھا تو یہ رائے قرار پائی کہ اس کو سامانہ کا حاکم کر دیا جائے تاکہ اپنی بقیہ عمر عبادت میں صرف کرے۔ خواجہ جہاں اس فیصلہ سے بہت خوش ہوا اور سامانہ کی طرف روانہ ہوا لیکن اس کے بعد ہی امراء فیروز شاہ نے مشورہ کر کے ایک شخص شیر خاں نامی کو اسکے پیچھے روانہ کیا تاکہ راستہ ہی میں اس کو ہلاک کر دے۔ چنانچہ خواجہ جہاں نے چند منزلیں طے کی تھیں کہ شیر خاں وہاں پہونچ گیا اور خواجہ جہاں سے ملا۔ خواجہ سمجھ گیا اور اُس کو بلا کر کہا کہ میں تیرے آنے کی وجہ سمجھ گیا ہوں لیکن جب میں نماز شروع کروں اسوقت تم اپنا کام کرنا۔ چنانچہ خواجہ وضو کر کے سجدہ میں گیا تو شیر خاں نے اس کا سر اپنی تلوار سے قلم کر دیا۔ (ماخوذ از تاریخ فیروز شاہی شمس سراج عفیف)

[1] فتوحاتِ فیروز شاہی میں خود فیروز شاہ نے اپنے حالات لکھے ہیں اور جو جو اصلاحیں اس نے کی تھیں اُن کا ذکر تفصیل سے ... اس نے یہ تاریخ مرتب کی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فیروز شاہ کس فطرت کا شخص تھا۔ ہر چند یہ کتاب بہت مختصر ہے لیکن معلومات ... مسٹر ٹامس کے پاس ۱۲۳۹ھ کا لکھا ہوا موجود ہے۔ جس سے مسٹر ایلیٹ نے فائدہ اٹھایا اور اسکا ترجمہ کر کے اپنی تاریخ میں شامل کیا ... نوادر میں شامل ہے فیروز آباد کی جامع مسجد میں فیروز شاہ نے ایک ثمن (ہشت پہل) گنبد بنوایا تھا اور اسکے ہر پہلو میں اس کتاب کا ایک باب کندہ ...

فیروز شاہ کی غریب نوازی

اور اس کی طرف سے کسی کو ایذا نہ پہونچے

جب فیروز شاہ جشن سے فارغ ہوا تو "خواجہ فخر شادی" نے جو سلطنت کا محاسب اعظم تھا ایک فہرست پیش کی کہ خواجہ جہاں نے فلاں فلاں لوگوں کو اس قدر زر و جواہر تقسیم کیا تھا اور محمد شاہ تغلق نے جو روپیہ کہ تقاوی تقسیم کرنے کی غرض سے دیا تھا، اس میں سے فلاں فلاں کو اتنا اتنا ملا ہے۔ فیروز شاہ نے قوام الملک خان جہاں[1] سے رائے طلب کی۔ اس نے کہا کہ جب کوئی نیا بادشاہ تخت نشین ہوتا ہے، تو وہ گزشتہ تقصیریں لوگوں کی معاف کر دیتا ہے۔ اگر محمد شاہ تغلق کی تقسیم کردہ تقاوی اور خواجہ جہاں کے لٹائے ہوئے زر و جواہر کا مطالبہ کیا جائے گا، تو لوگ بد دل ہو جائیں گے اور وصول کچھ نہ ہوگا۔ فیروز شاہ نے اس رائے کو پسند کیا اور اسی وقت تمام کاغذات جن میں حساب درج تھا، مجمع عام میں جلا کر نیست و نابود کر دئے اور ہر شخص اپنی جگہ پر مطمئن ہو گیا۔

اصلاحات فیروز شاہی خود اس کے بیان کے مطابق

فیروز شاہ نے اپنے عہد میں بہت سے انتظامات کئے اور قوانین رائج کئے۔ متعدد اصلاحیں کیں لیکن ان میں سے کوئی اصلاح ایسی نہ تھی جس کی بنیاد رحم و انصاف پر نہ ہو

چنانچہ وہ خود فتوحات فیروز شاہی میں لکھتا ہے کہ: (۱) مجھ سے قبل بہت سے ناجائز اور نامشروع ٹیکس[2] قایم تھے۔

---

[1] خان جہاں پہلے ہندو تھا اور قبل اسلام اسکا نام کٹو تھا۔ یہ تلنگانہ کا رہنے والا تھا اور اپنی صفات کی وجہ سے راجہ تلنگانہ کا مقرب سردار ہو گیا تھا جب سلطان محمد تغلق نے راجہ تلنگانہ کو دہلی بھیجا تو کٹو بھی ساتھ تھا۔ راستہ میں راجہ کا انتقال ہو گیا اور کٹو محمد تغلق کے پاس حاضر ہو کر مسلمان ہو گیا۔ بادشاہ نے اس کا نام مقبول رکھا۔ یہ بالکل جاہل شخص تھا لیکن ذہین حد درجہ کا تھا محمد تغلق نے اس کی عقل و فراست کو دیکھ کر چند دن بعد خان جہاں اور قوام الملک کا خطاب دیکر ملتان اسکی جاگیر میں کر دیا۔ اسکے بعد دہلی کا نائب وزیر بنا دیا جب فیروز بادشاہ ہوا تو اس نے عہدۂ وزارت اسکے سپرد کر دیا۔ خان جہاں نے جس تدبیر و فراست سے فیروز شاہ کے عہد میں وزارت کی وہ تاریخ کے اہم واقعات میں شمار کئے جانے کے قابل ہے۔ درحقیقت یہ ہے کہ فیروز شاہ کی کامیابی کا انحصار تمام تر اسی وزیر کی دانشمندی پر منحصر تھا۔ بارہا ایسا ہوا کہ بادشاہ دہلی سے مہینوں بلکہ برسوں باہر رہا لیکن انتظام سلطنت میں کوئی فرق نہیں ہوا اور تمام معاملات بدستور جاری رہے۔ فیروز شاہ بھی اسکی بہت عزت کرتا تھا اور کہا کرتا تھا کہ دہلی کا بادشاہ تو حقیقتاً خان جہاں ہی ہے۔ خان جہاں، عورتوں کی طرف بہت مایل تھا چنانچہ کہا جاتا ہے کہ دو ہزار خواتین روم و چین کی اسکے حرم میں داخل تھیں۔ فیروز شاہ کا حکم تھا کہ خان جہاں کے جو اولاد نرینہ پیدا ہو، گیارہ ہزار تنکہ اس کی تنخواہ اور ہر لڑکی کا شادی کے بعد پندرہ ہزار تنکہ مقرر کر دیا جائے۔ خان جہاں نے سلطنت فیروز شاہ کے اٹھارھویں سال ۷۷۰ھ/۱۳۶۸ء میں جبکہ اس کی عمر ۸۰ سال کی تھی انتقال کیا۔ فیروز شاہ کو بہت رنج ہوا اور اس کے بیٹے جونان شاہ کو وزیر مقرر کیا جو بیس سال تک عہد فیروز شاہ میں نہایت قابلیت سے اپنی خدمات انجام دیتا رہا لیکن آخر میں شاہزادہ محمد خاں (جو بعد کو سلطان محمد شاہ کے نام سے تخت نشین ہوا) اس سے برہم ہو گیا اور اس نااتفاقی نے سلطنت میں سخت بدامنی پیدا کر دی۔

[2] ان کی فہرست بھی فیروز شاہ نے دی ہے جن میں سے خاص خاص ٹیکس کے نام یہ تھے:۔ گل فروشی، دلالی بازاری، جنگلی غلہ، ماہی فروشی، صابون گری، ریسمان فروشی، روغن گری، نخود بریانی، تہ بازاری، قمار خانہ، کوتوالی، چرائی۔

میں نے ان کو یک قلم منسوخ کر دیا اور حکم دیا کہ صرف شرع کے مطابق خراج وصول کیا جائے یعنی زمین مزروعہ کی پیداوار کا دسواں حصہ، معدنی پیداوار کا ایک خمس، اور مسلمانوں کی صدقہ وزکوٰۃ کی رقم خزانہ میں داخل ہونی چاہئے

(۲) میرے عہد سے پہلے مال غنیمت کا پانچواں حصہ سپاہیوں کو دیا جاتا تھا باقی خزانہ میں داخل ہوتا تھا میں نے اس کو بھی موقوف کیا کیونکہ حکم شرعی اس کے بالکل خلاف تھا چنانچہ میں نے ہمیشہ خزانہ میں مال غنیمت کا ایک خمس داخل کیا اور باقی سپاہیوں کو تقسیم کر دیا

(۳) شرع کے خلاف مسلمانوں میں عام طور سے یہ رواج ہو گیا تھا کہ انکی عورتیں شہر کے باہر مزاروں پر جاتی تھیں چونکہ اوباشوں کو بدمعاشی کا زیادہ موقع ملتا تھا اس لئے میں نے حکم دیا کہ آیندہ جو عورت مزاروں پر جائے گی اس کو سخت سزا دیجائے گی چنانچہ یہ دستور بالکل موقوف ہو گیا

(۴) مجھ سے قبل یہ دستور تھا کہ شاہی دسترخوان پر سونے چاندی کے برتنوں میں کھانا کھایا جاتا تھا اور تلواروں کے قبضے وغیرہ زر وجواہر سے مرصع ہوتے تھے میں نے ان باتوں کو ممنوع قرار دیا اور حکم دیا کہ ہتھیاروں میں صرف ہڈیوں کے دستے لگائے جائیں اور ظروف نقرئی وطلائی کا استعمال یک قلم موقوف کر دیا جائے

(۵) امراء زریں لباس پہنا کرتے تھے اور زین، لگام، گلوبند، صراحی، خیمے، پردے، کرسیاں اور تمام چیزیں تصویروں سے آراستہ کی جاتی تھیں، میں نے ان ناجائز نقش ونگار کو محو کرا کے آیندہ کے لئے ممانعت کر دی

(۶) ریشمیں و زربفت کے لباس کا بھی امراء میں عام رواج تھا میں نے اس کی بھی ممانعت کی اور شریعت کے مطابق ایک انگل سے زیادہ عریض ریشمی کپڑے کا استعمال ممنوع قرار دیا

(۷) میرے مربی اور آقا سلطان محمد تغلق کے عہد میں جو لوگ قتل ہوئے ان کے وارثوں کو اور جو مفلوج الاعضاء تھے خود انھیں بلا کر اتنی بخشش کی کہ انھوں نے رضامندی کا اظہار کر کے اقرارنامے لکھدئے کہ ہم کو اب سلطان محمد تغلق پر کوئی دعوےٰ نہیں ہے میں نے یہ سارے اقرارنامے ایک صندوق میں بند کرا کے محمد تغلق کی قبر کے سرہانے رکھدئے اس امید کے ساتھ کہ خدا میرے آقا کے ساتھ مہربانی فرمائے گا

(۸) مجھ سے قبل جو وظایف اور دیہات معافی وغیرہ کے ضبط ہو گئے تھے ان کے متعلق میں نے عام حکم دیدیا کہ از روئے سند جس کا حق ثابت ہو اس کے حق میں تمام وظایف وغیرہ بحال کر دئے جائیں

سراج عفیف نے فیروز شاہ کی زندگی کی تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے اور اس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حقیقتاً فیروز نہایت اچھے صفات کا بادشاہ تھا اور محمد تغلق کے بعد ہندوستان کو ایسا فرمانروا مل جانا ایک ایسا مرہم تھا جس نے تمام جراحتوں کو مندمل کر دیا۔ فیروز شاہی عہد میں جو انتظامات ہوئے، ان کا نتیجہ یہ ہوا کہ:۔

(۱) بازار نفیس اور عمدہ اسباب تجارت سے معمور ہو گئے۔ (۲) مزدوروں کو پوری اُجرت ملنے لگی اور انکی اقتصادی حالت بہتر ہو گئی

(۳) پیشہ ور لوگ نہایت اطمینان سے اپنے مشاغل میں مصروف ہو گئے اور شہر کی رونق بڑھنے لگی

(۴) ایک ایک کوس کے اندر چار چار گاؤں آباد ہوگئے
(۵) رعایا کے پاس غلہ اور تمام ضروری سامان زندگی مہیا ہوگیا اور تمام سلطنت میں امن و سکون و مسرت و خوشحالی نظر آنے لگی
ہر چند ان ٹیکسوں کے موقوف کر دینے سے سلطنت کی آمدنی کم ہوگئی لیکن اس کے عوض میں مخلوق خدا کو جو راحت و آسائی حاصل ہوئی وہ کافی سے زیادہ معاوضہ اس کمی کا تھا جس پر فیروز شاہ قانع تھا

سلطنت کے امراء و اراکین افسران وغیرہ علاء الدین خلجی سے پہلے جاگیریں رکھتے تھے اور وہی ان کی خدمات کا معاوضہ سمجھی جاتی تھیں۔ لیکن علاء الدین خلجی نے اس دستور کو مٹا کر نقد تنخواہیں کر دی تھیں اور تمام جاگیریں وغیرہ خالصہ میں شامل کر لی تھیں۔ اس کے بعد بھی یہی دستور جاری رہا۔ لیکن جب فیروز شاہ نے عنان سلطنت اپنے ہاتھ میں لی تو اس نے اپنی فطری فیاضی اور نرمی سے مجبور ہو کر جاگیریں پھر بحال کر دیں اور کامل چالیس سال تک اس کے عہد سلطنت میں اس قاعدہ کی پابندی کی گئی اور کسی جاگیردار یا معافی دار کی طرف سے اظہار سرکشی و بغاوت نہیں ہوا جس کے خوف سے علاؤ الدین خلجی نے جاگیریں ضبط کر لی تھیں[1]

فوجی ملازمین کے لئے اس نے ایک قانون اور بنایا وہ یہ تھا کہ کوئی فوجی مر جائے یا ضعیف ہو جائے تو اس کے بیٹے کو جگہ دی جائے اگر بیٹا نہ ہو تو داماد کو، اگر یہ بھی نہ ہو تو غلام کو اور اس کے بعد اور کسی قریبی رشتہ دار کو۔ جب تک فیروز شاہ زندہ رہا اس قانون پر اس نے عمل کیا اور اس طرح فوجی خدمات کی طرف لوگوں کو بہت زیادہ توجہ ہوگئی[2]

فیروز شاہ کو چونکہ غلاموں کے جمع کرنے کا بہت شوق تھا اس لئے بطور نذرانہ میں تحفہ اور نذرانوں کی صورت سے اسقدر کثیر تعداد میں غلام جمع ہوگئے کہ سلطان کو مستقل ان کا انتظام کرنا پڑا۔ بہت سے غلام تو اس نے مختلف اقطاع ملک میں بھیجدیے اور وہاں ان کی تعلیم و تربیت کا انتظام کیا۔ جو غلام شہر میں رہ گئے ان کو مشاہرہ دس تنکہ سے دس تنکہ تک حسب حیثیت مقرر کیا۔ علاوہ اس کے ہر غلام کو اس کی میلان طبیعت کے موافق تعلیم بھی دلائی کسی کو حافظ بنایا اور کسی کو فقیہ کسی کو حدیث کا درس دلایا اور کسی کو علم کلام کا کسی کو خوشنویسی کی تعلیم دلائی اور کسی کو سپاہ گری کی۔ اسی طرح دوسرے

---

[1] جاگیردار ملوک و امرا کی خوش حالی کا یہ عالم ہوگیا تھا کہ ہر شخص اپنی جگہ رئیس بنا ہوا تھا اور باغات، قصبات، دیہات اور پرگنوں کی آمدنی سے بڑے بڑے کارخانے انکے ہاں جاری تھے رعایات لیکر جاگیردار تک، امیر سے لیکر غریب تک، کاشتکار، تاجر، مقدم، چودھری تمام شخص اپنی اپنی جگہ خوش اور نہایت بےفکری سے زندگی بسر کر رہا تھا۔

[2] جب ملک عماد الملک دیوان عرض ضعیف ہوگیا تو اسکا بیٹا ملک اسحٰق اسکی جگہ کام کرنے لگا ایک دن اسحاق نے بادشاہ سے کہا کہ سپاہ میں بعض آدمی بہت ضعیف ہوگئے ہیں انکی جگہ دوسرے جوان آدمی بھرتی کرنا چاہئے بادشاہ نے کہا یہ رائے مناسب ہے لیکن پہلے تمہارے باپ کو علیحدہ کرنا چاہئے کیونکہ وہ بھی بہت ضعیف ہے یہ سنکر اسحٰق خاموش ہوگیا۔ [3] فیروز شاہ کے عہد میں اسی نوے ہزار سوار شاہی سپاہ میں تھے

علاوہ اس کے امراء کو جاگیریں دیں — سلطنت کا اعلان — غلاموں کی تعلیم و تربیت

پیشوں اور حرفوں کی طرف ان کو راغب کیا۔ چنانچہ ایک لاکھ اسی ہزار غلاموں میں بارہ ہزار غلام صرف وہ تھے جو مختلف پیشوں اور صنعتوں کے ماہر تھے۔ بادشاہ نے غلاموں کا محکمہ ہی جدا کر دیا تھا اور اس محکمہ کے دیوان، خزانچی، محاسب، وزیر الگ کر دئے تھے۔ جن امراء کو غلام دئے جاتے تھے اُن کو سخت تاکید کی جاتی تھی کہ اپنے بچوں کی طرح انکی پرورش کریں اور تعلیم و تربیت کی خاص نگرانی رکھیں

زراعت و آبادی کی ترقی کا یہ عالم تھا کہ دوآبہ کے ۵۲ پرگنے تھے اور تمام پرگنوں میں ایک گاؤں بھی غیر آباد نہ تھا اور ایک بیگھ زمین کاشت سے خالی نہ تھی، صوبہ سامانہ میں بھی ایک ایک کوس کے اندر چار چار گاؤں آباد ہوگئے تھے۔ اور تمام رعایا خوش حال نظر آتی تھی۔

ارزانی کی یہ کیفیت تھی کہ خاص دہلی میں (جہاں پایۂ تخت تھا اور بڑا شہر ہونے کی وجہ سے غلّہ کو قدرتاً گراں ہونا چاہیئے) ایک من گیہوں ۸ جیتل میں ایک من جو ۴ اور چنا ۴ جیتل میں عام طور سے فروخت ہوتا تھا۔ ایک سوار اپنے گھوڑے کے لئے دس سیر دلا ہوا غلّہ جسے سراج عفیف نے "دلیدہ یعنی" "دلیہ" سے تعبیر کیا ہے ایک جیتل میں خرید لیتا تھا۔ گھی ڈھائی جیتل کا ایک سیر اور شکر ۲ یا ۳ ½ جیتل کی ایک سیر ملتی تھی[1]۔ اگر کبھی امساک باراں ہوتا تو ایک تنکہ فی من سے زیادہ کبھی نرخ نہ بڑھتا، چالیس سال تک فیروز شاہ نے حکومت کی اور اس زمانہ میں قحط عام یا گرانی کی شکایت کسی کو نہیں ہوئی۔ کپڑے کی ارزانی کا بھی یہی عالم تھا۔

اس کے عہد میں صرف دوآبہ کی آمدنی ۸۰ لاکھ تنکہ اور کل سلطنت کی ۶ کروڑ ۸۵ لاکھ تنکہ تھی لیکن یہ سب خزانۂ شاہی میں نہ آتی تھی بلکہ مختلف امراء و اراکین، ملوک و وزراء، ملازمین مال و فوج پر جاگیروں کی صورت میں منقسم تھی۔ خان جہاں وزیر کی ذات خاص کا تیرہ لاکھ تنکہ مقرر تھا۔ اسی طرح کسی کی جاگیر آٹھ لاکھ کی تھی، کسی کی ۷ لاکھ کی، کسی کی ۴ لاکھ تنکہ کی۔ چنانچہ امرا کی دولت کا یہ حال ہوگیا تھا کہ جب ملک شاہین تحنہ (جو مجلس خاص کا نائب امیر بھی تھا) مرا ہے تو علاوہ قیمتی گھوڑوں اور جواہرات کے پچاس لاکھ تنکہ نقد اس کے گھر سے نکلا تھا۔ اسی طرح عماد الملک کی دولت کا کوئی اندازہ نہ ہو سکتا تھا۔ مشہور ہے کہ اس نے روپیہ رکھنے کے لئے جو تھیلیاں سلوائی تھیں ان میں ڈھائی ہزار تنکہ صرف ہوگیا تھا۔ (حالانکہ اُس وقت ایک ٹاٹ کا تھیلا چار جیتل میں آتا تھا) کہا جاتا ہے کہ سترہ کروڑ تنکہ نقد اس کے پاس موجود تھا۔ پھر یہ دولت و خوشحالی مخصوص افراد کا حصہ نہ تھی بلکہ تمام امراء و اراکین، ملازمین و متوسلین یہاں تک کہ کاشتکار اور مزدور بھی ایک دوسرے سے مستغنی نظر آتے تھے اور حد درجہ راحت و آرام سے زندگی بسر کر رہے تھے۔ علماء و مشائخ کے لئے ۳۶ لاکھ تنکہ اور سائلین و فقراء کے لئے ایک لاکھ تنکہ بطور وظائف کے تقسیم کیا جاتا تھا

فیروز شاہ کے لئے یہ امر بہت تکلیف دہ تھا کہ کوئی شخص اس کی سلطنت میں بیکار پھرے اور تکلیف سے زندگی بسر کرے چنانچہ اس نے ایک عام حکم دیدیا تھا کہ جب کوئی بیکار آدمی نظر آئے، تو کوتوال اہل محلہ سے اس کے حالات تحقیق کرکے بادشاہ کے روبرو پیش کرے۔ پھر بادشاہ ہر بیکار کو اس کی حسب حیثیت مشاغل بتا دیتا۔ کسی کو کارخانہ میں بھیج دیتا کسی کو وزیر کے پاس

---

[1] گھی اور شکر کا نرخ سراج عفیف نے نہیں لکھا بلکہ مارکوس ہسٹنگر نے اپنی تحقیق سے لکھا ہے جسے ایڈورڈ ٹامس نے اپنی کتاب کرانکلس آف دی پٹھان کنگس میں درج کیا ہے

بھیجدیتا اگر کوئی کسی جاگیردار کے پاس رہنا چاہتا تو وہاں بھیجدیا جاتا۔ ان لوگوں کے رہنے کے لئے مکان ملتے اور ان کی معاش کا پورا انتظام کیا جاتا

بادشاہ نے کل ۳۶ کارخانے قایم کر رکھے تھے۔ ان کی دو قسمیں تھیں معمولی اور غیر معمولی۔ معمولی قسم میں فیل خانہ یا پائیگاہ (اصطبل)، مطبخ، شترخانہ، سگ خانہ، آبدارخانہ وغیرہ شامل تھے ان کارخانوں کا خرچ ہوا ایک لاکھ ساٹھ ہزار تنکہ تھا اور اسقدر صرف ملازمین وغیرہ کے مشاہرہ کا تھا

غیر معمولی قسم میں جامدار خانہ، علم خانہ، فراش خانہ، کتاب خانہ وغیرہ داخل تھے ان کارخانوں کے لئے ہر سال نیا سامان خریدا جاتا۔ جامدار خانہ کے لئے موسم سرما میں (بہار و گرمی کی خریداری علحدہ تھی) ۶ لاکھ تنکہ کا، علم خانہ کے لئے ہر سال ۸۰ ہزار تنکہ کا، اور فراش خانہ کے لئے ہر سال دو لاکھ تنکہ کا اسباب خریدا جاتا۔ ہر کارخانہ ایک امیر کے سپرد تھا اور سب کا حساب جداگانہ مرتب کیا جاتا تمام کارخانوں کی نگرانی خواجہ ابو الحسن کے ذمہ تھی۔

سلطان محمد تغلق کی طرح فیروز شاہ کو بھی سکوں کی طرف بہت توجہ تھی اس نے بڑی احتیاط کی کہ سکے عمدہ اور خالص طیار ہوں۔ اس کے عہد کے خاص سکے علاوہ طلائی اور نقرئی تنکے جو پہلے سے رائج تھے۔ چہل و ہشت گانی۔ بست و پنج گانی (یہ سکے خاص فیروز شاہ کی اختراع تھے) بست و چہار گانی، دوازدہ گانی۔ دہ گانی، ہشت گانی، شش گانی تھے۔ ان کی قیمتیں علی الترتیب ۴۸ سے لیکر ۶ جیتل تک تھیں

ایک بار بادشاہ کو خیال آیا کہ خرید و فروخت کے وقت ایک جیتل سے کم کا حساب ہوتا ہوگا تو بیچنے والا کیونکر فاضل رقم واپس کرتا ہوگا، جبکہ جیتل سے کم کوئی سکہ نہیں ہے[1]، چنانچہ اس نے دو سکے اور رائج کئے ایک نصف جیتل کا جسے آدھا کہتے تھے اور دوسرا پاؤ جیتل کا جس کا نام بکھ[2] رکھا گیا

ایک دفعہ بادشاہ کو دو آدمیوں نے خبر دی کہ شش گانی سکہ میں کچھ خفیف سی کھوٹ ہے اور بازار میں اس کا چرچا ہو رہا ہے۔ بادشاہ نے وزرا کو حکم دیا کہ اس کی کامل تحقیقات کی جائے۔ یہ واقعہ ۷۷۲ھ کا ہے۔ خان جہاں زندہ تھا جب اس کو بھی خبر ہوئی تو بادشاہ سے عرض کیا کہ سکہ کی حالت نا کتخدا لڑکی کی سی ہے کہ اگر اس کی عصمت پر جھوٹا الزام بھی لگ جائے تو پھر اسے کوئی نہیں پوچھتا، اس لئے اگر علانیہ تحقیقات کی گئی اور کھوٹ ثابت ہو گیا تو شاہی سکہ کا اعتبار اٹھ جائے گا۔ اس لئے پہلے خفیہ جانچ مناسب ہے اس وقت کبیر شاہ ٹکسال کا مہتمم تھا۔ اس سے خان جہاں نے دونوں مخبروں کو حراست میں لیکر کہا کہ کیا تم اپنی طور پر تحقیق کر کے مجھے اطلاع دو گے۔ چنانچہ اس نے تفتیش کی اور خان جہاں سے کہا کہ واقعی ٹکسال کے بعض شریر

---

[1] جیتل سے کم قیمت سکے، فلوس (پیسے) کہلاتے تھے لیکن کوئی سکہ جیتل کی قسم کا اس سے کم قیمت نہ تھا۔ اس نے چاندی اور تانبہ ملا کر نہایت چھوٹے چھوٹے دو سکے ½ اور ¼ جیتل کی قیمت کے اور رائج کئے۔ [2] غالباً اس لفظ کی حقیقت "بھیک" رہی ہوگی یعنی وہ سکہ جو گداگروں کو بھیک میں آسانی سے دیا جاسکے

آدمیوں نے سکہ میں کچھ کھوٹ ملا دی ہے۔ خان جہاں یہ سن کر خاموش ہو گیا۔ اور پھر کچھ سوچ کر حکم دیا کہ سناروں کو بلا کر بادشاہ کے سامنے اس طور سے جانچ کرائی جاوے کہ وہ سکہ کے کھرے ہونے کی طرف سے مطمئن ہو جائے۔ کجر شاہ نے سناروں سے حالات بیان کئے انھوں نے مشورہ دیا کہ ہم لوگ بادشاہ کے سامنے بغیر کسی سامان کے برہنہ طلب کئے جائیں لیکن تھوڑی سی چاندی کسی کوئلے کے اندر رکھ کر سوراخ یا شگاف کو موم سے بند کر دیا جائے۔ جب ہم سکہ گلائیں گے تو اس کوئلہ کو بھی اس میں ڈالدیں گے اور اس کی چاندی سکہ کی چاندی سے ملکر وزن کو پورا کر دیگی۔ چنانچہ اس پر عمل کیا گیا اور مجمعِ عام میں بادشاہ کے سامنے سکہ کی جانچ کی گئی۔ چونکہ اس ترکیب سے کسی کو کھوٹ کا پتہ نہ چلا اور سکہ کا وزن صحیح نکلا اس لئے بازاروں میں عام اعلان کر دیا گیا کہ جانچ سے سکہ ششگانی بالکل کھرا معلوم ہوتا ہے اور اس میں کوئی کھوٹ نہیں ہے۔ کجر شاہ کو خلعت دیا گیا اور مخبروں کو شہر بدر کر دیا گیا۔ لیکن چند دن بعد خان جہاں نے کسی اور بہانے سے کجر شاہ کو علحدہ کر دیا

اس سے نہ صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ خان جہاں کس قابلیت کا وزیر تھا بلکہ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ معاملات سلطنت میں فیروز شاہ کیسا امین اور متدین تھا

جب بادشاہ نے بنگال کی مہم سے فارغ ہونے کے بعد شہر حصار فیروزہ کی بنیاد ڈالی (جس کا حال ہم آگے بیان کریں گے) تو اس نے اس نواح کی زمین کو (جس میں فتح آباد اور حصار فیروزہ دونوں داخل تھے) بہت آباد کیا[1] اور نہریں جاری کر کے تمام قصبات و دیہات (جس میں ہانسی، جنید[2]، اور دہاترہ بھی شامل تھے) کی پیداوار کو بہت بڑھایا

بادشاہ کو آبادیِ املاک کا اس قدر خیال تھا کہ بارش کے زمانہ میں وہ خاص خاص سرداروں کو متعین کرتا کہ نہروں کے کنارے پھر کر دیکھیں کہ سیلاب کہاں تک پہونچتا ہے اور وہ بہت خوش ہوتا جب اُسے معلوم ہوتا کہ کاشتکار نہروں سے فایدہ اُٹھا رہے ہیں۔ فیروز شاہ کے یہی انتظامات تھے جنھوں نے نہ صرف اس کی جاگیر بلکہ سارے ملک کو آباد و خوش حال بنا دیا تھا۔

فیروز شاہ کے عہد میں جو چیز سب سے زیادہ نمایاں نظر آتی ہے وہ اس کی تعمیرات ہیں جنھوں نے ایک طرف ملک کو پُر رونق بنانے میں مدد دی تو دوسری طرف رفاہِ عام میں غیر معمولی اضافہ کیا

اس کو تعمیرات[3] کا غیر معمولی شوق تھا اور آثار قدیمہ کی طرف توجہ کرنے میں اوّلیت کا فخر اسی بادشاہ کو حاصل ہے۔

---

[1] ان اضلاع میں تقریباً ۵۰ کوس تک نہروں کے ذریعہ سے آبپاشی ہوتی تھی اور کوئی حصۂ زمین زراعت سے خالی نہ تھا

[2] اس سے مراد غالباً دہی جنید ہے جہاں آجکل ایک سکھ خاندان فرمانروا ہے

[3] فیروز شاہ کے عہد میں ملک غازی شحنہ میر تعمیرات تھا جو اس فن کا بہت بڑا ماہر تھا اسکا نائب ایک شخص عبدالحق تھا جسے جاہر سوندھا بھی کہتے تھے چوب تراشوں، سنگ سازوں، آہنگروں، وغیرہ کی جماعتیں الگ الگ تھیں اور ہر ایک جماعت پر ایک شحنہ یا داروغہ مقرر تھا جب کوئی عمارت زیر تجویز ہوتی تو دیوان وزارت کے سامنے نقشہ پیش کیا جاتا اور وہ اسکو دیکھنے کے بعد خزانہ سے ضروری روپیہ تعمیر کے لئے پیشگی منظور کر دیتا

علاوہ فتح آباد[1] و فیروزہ حصار[2] کے اس نے حسب تفصیل ذیل اور نئے شہر تعمیر کئے :-
فیروز آباد[3] - فیروز آباد ہارنی کھیڑا ، تغلق پور کاسنہ ، تغلق پور ملوک کموت ، اور جونپور[4] ، اس نے محلات بھی کثرت سے تعمیر کرائے جس میں فیروز کوشک ، نزول کوشک مہندواری ، کوشک حصار فیروزہ ، کوشک فتح آباد ، کوشک جونپور ، کوشک شکار (جسے اب فیروز شاہ کا کوٹلہ کہتے ہیں اور جو دلی سے نظام الدین جاتے ہوئے راستہ میں ملتا ہے ، کوشک بند فتح خاں ، کوشک سامورہ ، خاص شہرت رکھتے تھے

---

[1] جب فیروز شاہ سندھ سے دہلی کی طرف عنانِ حکومت ہاتھ میں لینے کی غرض سے چلا اور سرستی سے گزر کر منزلِ اگلار میں پہونچا تو وہاں اس کے لڑکا پیدا ہوا جس کا نام اس نے فتح خاں رکھا اور وہیں اس ست کی یادگار میں ایک شہر فتح آباد کے نام سے تعمیر کرایا
[2] جب بادشاہ بنگال کی مہم سے فارغ ہو کر دہلی آیا اور انتظام مملکت کی طرف متوجہ ہوا تو اسے اسی سلسلہ میں حصار فیروزہ کی بھی تعمیر کی جہاں حصار طیار کیا گیا وہاں پہلے ایک گاؤں (لہراس بزرگ) آباد تھا پانی یہاں تقریبًا معدوم تھا اور عراق و خراسان کی طرف سے جب مسافر یہاں آکر ٹھہرتے تھے تو انھیں ایک گھڑے پانی کے لئے چار چار جیتل ادا کرنا پڑتا تھا فیروز شاہ نے اس جگہ کو پسند کیا اور حصار کی تعمیر شروع کرادی۔ تمام امرا کو خدمتیں تقسیم کردیں اور چند سال میں یہ حصار (جو پتھر اور چونے سے بنایا گیا ہے) مکمل ہو گیا اور اسکا نام حصار فیروزہ رکھا۔ اسکے بعد چاروں طرف خندق کھدوائی اور اسی مٹی سے حصار کے گرد دمدمہ بنوایا۔ حصار کے اندر ایک بہت بڑا تالاب تعمیر کرایا۔ جسکے پانی سے خندق بھی ہر وقت لبریز رہا کرتی تھی یہیں اس نے ایک بہت بڑا قصر بھول بھلیاں کی طرح تعمیر کرایا اور متعدد دیگر محل بنوائے۔ پہلے صدر مقام تحصیل الگذاری کے لئے ہانسی مقرر تھا لیکن جب یہ شہر مکمل ہو گیا تو صدر مقام اس نواح کا حصار فیروزہ کر دیا گیا
[3] فیروز آباد کی تعمیر دہلی سے پانچ کوس کے فاصلہ پر شروع ہوئی اور تقریبًا ۸ دیہات کی زمین اس میں داخل کر لی گئی خاص خاص دیہات کے نام یہ تھے۔ اندرپت سرائے شیخ ابوبکر طوسی ، کھیتواڑہ ، مہرولہ (غالبًا موجودہ مہرولی یا قطب صاحب) مقبرہ رضیہ سلطان کی زمین بھی اس شہر کے اندر آگئی تھی
اس شہر میں اس کثرت سے عمارتیں بنوائی گئیں کہ اندرپت سے لیکر کوشک شکار (جسے اب کوٹلہ فیروز شاہ کہتے ہیں) تک ۵ کوس میں ایک جپہ زمین بھی ایسی نہ تھی جہاں کوئی نہ کوئی عمارت نہ ہو۔ تمام مکانات پختہ اور وسیع تھے۔ ۸ مسجدیں صرف نماز جمعہ کے لئے اتنی وسیع بنوائیں کہ ہر مسجد میں دس ہزار آدمی نماز پڑھ سکتے تھے۔ ۸ مسجدیں امراء نے تعمیر کرائی تھیں جو انھیں کے نام سے موسوم کی گئیں (کہا جاتا ہے کہ دہلی کی موجودہ کالی مسجد اور مسجد ترکمان دروازہ انھیں مسجدوں میں سے ہیں)
جب تک فیروز شاہ زندہ رہا دہلی اور فیروز آباد کے درمیان کثرت سے لوگوں کی آمد و رفت جاری رہی اور ہر وقت اس پانچ کوس کے اندر میلا سا لگا رہتا تھا۔ صبح نماز کے وقت سے اونٹ ، گھوڑے ، خچر ، گاڑیاں ، چھکڑے ، پالکیاں ، تیار رہتی تھیں اور لوگ دہلی سے فیروز آباد اور فیروز آباد سے دہلی تک آیا جایا کرتے تھے گاڑی کا کرایہ چار جیتل ، اونٹ کا ۶ جیتل ، گھوڑے کا بارہ جیتل ، پالکی کا نصف تنکہ تھا
[4] جب فیروز شاہ دوبارہ لکھنوتی کی مہم پر گیا اور قنوج و اودھ ہوتا ہوا اس مقام پر پہونچا جہاں اب جونپور ہے تو یہاں اس نے مناسب جگہ دیکھ کر ایک شہر آباد کرنا چاہا چنانچہ اس نے ساحل گومتی پر ۶ ماہ کے اندر ایک شہر تعمیر کرایا اور اپنے آقا و برادر عم زاد سلطان محمد تغلق کے نام پر (جسے جونا خاں بھی کہتے تھے) اس کا نام جوناپور رکھا جو بعد کو کثرت استعمال سے جونپور ہو گیا۔ یہ شہر بعد میں شرقی سلطنت کا پایۂ تخت ہو گیا جس کا حال آپ آئندہ معلوم کریں گے

اس نے پانی کے بند بھی کثرت سے بنوائے۔ ان میں "بند فتح خاں"، "بند مالجا"، "بند مہپالپور"، "بند شکر خاں"، بند سالورہ اور بند وزیر آباد، بہت مشہور ہیں اور چھوٹے چھوٹے بندوں کا کوئی شمار نہیں ہے

دہلی اور فیروز آباد میں اس نے ایک سو بیس خانقاہیں اور سرائیں تعمیر کرائیں۔ یہ ہمیشہ مسافروں سے بھری رہتیں اور بادشاہ کی طرف سے سب کو کھانا وغیرہ دیا جاتا تمام مصارف خزانۂ شاہی سے نقد دئے جاتے تھے اور ایک امیر ان کا متولی تھا

فیروز آباد میں اس نے اپنے دربار کے لئے تین محل طیار کئے تھے ایک کا نام "محل صحن گلی" اس کو محل انگور بھی کہتے تھے۔ دوسرے کا نام "محل چھجہ چوبیں" تھا اور تیسرے کو محل بار عام "کہتے تھے۔ (صحن میانگی اس کا دوسرا نام تھا) پہلے محل میں صرف خوانین، ملوک، امرا، اور خاص خاص اہل قلم سے ملاقات ہوتی تھی۔ دوسرا محل گویا خلوت کدہ تھا اور نہایت ہی مخصوص امرا کے ساتھ وہاں نشست ہوتی تھی، تیسرا محل عام دربار کے لئے تھا[1]

فیروز شاہ کو باغوں کا بھی بہت شوق تھا، دہلی کے قریب اس نے بارہ سو باغات خود نصب کرائے اور علاء الدین کے زمانہ کے تیس باغات کو بھی از سر نو آباد کر کے بہت ترقی دی۔ اسی طرح سلورہ کے قریب اس نے ۸۰ باغ طیار کرائے اور چیتو میں چوالیس تمام باغوں میں علاوہ اور میووں اور پھلوں کے صرف انگور سات قسم کے پیدا ہوتے تھے اور بحساب فی سیر ایک جیتل فروخت کئے جاتے تھے۔ اسّی ہزار تنکہ صرف ان پھلوں کی آمدنی تھی۔ جب حصار فیروزہ میں نہر کا پانی آنے لگا تو یہاں بھی کثرت سے باغات نصب کرائے

فیروز شاہ کے تمام کاموں میں جو رفاہ عام سے متعلق ہیں سب سے بڑا اور اہم کام نہروں کا اجراء تھا۔ یہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ حصار فیروزہ[2] جس جگہ بنایا گیا تھا، وہاں پانی کی بہت تکلیف تھی اس لئے اس نے یہ مصیبت دور کرنے کے لئے اور نیز مزارعین کو فایدہ پہونچانے کے لئے دو نہریں بنوائیں۔ ایک نہر اس نے دریائے جمن سے نکالی جس کا نام اس نے رجبواہ (رجیواہ) رکھا اور دوسری نہر دریائے ستلج سے جس کا نام الغ خانی تھا۔ یہ دونوں نہریں کرنال کے قریب ہو کر گزرتی تھیں اور ۸۰ کوس کے بعد دونوں ملکر شہر فیروزہ حصار میں پہونچتی تھیں[3]

---

[1] فیروز شاہ نے دہلی کا قیام ترک کر دیا تھا اور فیروز آباد ہی میں رہا کرتا تھا۔ جب دربار وغیرہ کی ضرورت ہوتی تھی تو وہ ان محلات میں آتا تھا۔ دربار میں تمام امرا کی جائے نشست مقرر تھی۔ خان جہاں وزیر تخت سے متصل داہنی جانب بیٹھتا تھا اور سراج عفیف (مصنف تاریخ فیروز شاہی) بھی کبھی کبھی دربار میں شریک ہوتا تھا۔

[2] قبل اجرائے نہر فیروزہ حصار میں بوجہ قلت آب صرف خریف کی فصل ہوتی تھی اور وہ بھی ناقص لیکن جب نہر جاری ہو گئی تو ربیع و خریف دونوں فصلیں نہایت اچھی ہونے لگیں۔ ان نہروں سے ہزاروں بیگہ زمین کی آبپاشی ہوتی تھی اور وہ وسیع رقبہ جو نہروں کے قرب و جوار میں تھا چند دن کے بعد حد درجہ زرخیز اور آباد نظر آنے لگا۔

[3] اصل عبارت سراج عفیف کی یہ ہے: "یک جوئے از لب آب جون کشیدہ، وجوئے دوم از دہانہ لب آب ستلج آوردہ از لب آب جون، چنانچہ رجیواہ وجوئے الغ خانی دہانہ ایں ہر دو جوئے از اتصال کرنال بیرون آوردہ میان ہشتاد کروہ کردہ در شہر حصار فیروزہ بردہ"

نہر چیتواہ جس کا اوپر ذکر ہوا اب بھی موجود ہے اور پورے ۰۰ میل کے رقبہ زمین میں اس وقت بھی آب پاشی ہوتی ہے
اسی طرح نہر ستلج اب بھی روپڑ اور سرہند کے درمیان موجود ہے

۱۸۳۳ء میں کرنل کالون نے نہر چیتواہ کے متعلق تحقیق کی تھی جس سے معلوم ہوا تھا کہ اس نہر کی تعمیر اس جگہ سے شروع کی گئی تھی جہاں سے جمنا نکلی ہے (اب اس مقام کا نام بادشاہ محل ہے) اور چچرولی، بوریہ، ہوتی ہوئی کرنال تک آتی تھی اور یہاں سفیدوں[1] کے قریب دریائے چتانگ کی شرقی شاخ سے مل کر ہانسی اور حصار تک چلی گئی تھی[2]

اس نہر کا ثبوت عہد اکبری کی ایک سند (۹۷۵ھ) سے بھی ملتا ہے جس کے شروع میں لکھا ہے کہ "دریائے چتانگ سے ۲۱۰ سال ہوئے سلطان فیروز شاہ نے نہر نکالی تھی۔ نالوں وغیرہ کا پانی بہتا ہوا سادھورہ[3] کے قریب ہانسی حصار کی پہاڑی کے دامن میں پہنچتا ہے"

علاوہ ان نہروں کے فیروز شاہ نے اور بھی متعدد نہریں جاری کی تھیں جن میں سے ایک کا ذکر تیمور نے اپنی ملفوظات میں قلعہ لونی کا حال لکھتے ہوئے بیان کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ "قلعہ لونی دریائے جمنا اور ہنڈوان کے درمیان واقع ہے۔ ہنڈوان حقیقتاً ایک بڑی نہر ہے جسے فیروز شاہ نے دریائے کالی ندی سے نکال کر فیروز آباد کے محاذ میں جمنا سے ملا دیا تھا"

ان تمام بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ فیروز شاہ کو عمارات اور رفاہ عام کے کاموں کی طرف بہت توجہ تھی اور اس نے کثرت سے اس قسم کی عمارتیں بنوائیں جن سے پبلک کو فائدہ پہنچے

آثار قدیمہ کو محفوظ رکھنے کا خیال سب سے پہلے سلطنت ہند میں فیروز شاہ کو پیدا ہوا۔ اس خیال کے ماتحت جن جن عمارتوں کی اس نے مرمت کرائی ان کا ذکر خود اس نے اپنی فتوحات میں کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ: "پرانی عمارتیں جو خراب و ویران ہو گئی تھیں میں نے ان کی مرمت کرائی اور ان کی آبادی کو میں نے اپنے محلات کی تعمیر پر مقدم جانا۔ چنانچہ:

(۱) دہلی کی جامع مسجد جو سلطان معز الدین سام نے تعمیر کرائی تھی اور کہنگی کے سبب سے خراب ہو گئی تھی میں نے اسکو بالکل نیا کرا دیا۔ (۲) سلطان معز الدین سام کے مقبرے کی مغربی دیوار بوسیدہ ہو گئی تھی۔ میں نے اس کو از سر نو تعمیر کرایا اور منقش محرابیں صندل کی لگوا دیں۔ سلطان معز الدین کا مینار بھی بجلی سے گر پڑا تھا میں نے اس کو پہلے سے بھی زیادہ بلند بنوا دیا۔
(۳) حوض شمسی (سلطان التمش کے حوض) میں بعض شریر آدمیوں نے پانی آنے کی راہیں بند کر دی تھیں میں نے ان

---

[1] دریائے چتانگ، ہندوؤں کے متبرک دریاؤں میں سے شمار ہوتا ہے

[2] اس نہر سے بعد کو سترھویں صدی عیسوی میں علی مردان خاں نے ایک شاخ دہلی کے اندر پہنچائی

[3] سادھورہ ضلع انبالہ کا ایک قصبہ جو جمنا سے ۲۰ میل جانب مغرب واقع ہے۔ اس کے قریب مرکنڈا ندی بہتی ہے لیکن چتانگ دریا کے چشمے بھی اس سے آٹھ میل کے فاصلہ پر پائے جاتے ہیں

لوگوں کو سزا دی اور پانی کے منبع پھر جاری کر دئے۔ اسی طرح حوض علائی (سلطان علاء الدین کا حوض) مٹی سے بھر گیا تھا۔ اور وہاں کھیتی ہونے لگی تھی میں نے اس کو بھی صاف کرایا۔ (۴) سلطان التمش کا مدرسہ (جو التمش کے مقبرہ سے ملحق تھا) بالکل خراب ہوگیا تھا میں نے اسے بھی از سر نو بنایا اور صندل کے دروازے اس میں لگوا دئے۔ جو ستون گر گئے تھے ان کو پہلے سے زیادہ اچھا بنوایا، مقبرہ کا صحن مدور نہ تھا میں نے اسے مدور کرا دیا۔ چاروں برجوں کا پشتہ گر گیا تھا وہ بھی میں نے وسیع کرا دیا۔ (۵) سلطان شمس الدین کے بیٹے معز الدین سام کا مقبرہ جو ملک پور میں تھا بالکل کھنڈر ہو گیا تھا اور قبر کا کہیں نشان نہ تھا میں نے از سر نو پھر تعمیر کرائی۔ اور احاطہ کی دیوار کھنچوا کر قبر کا چبوترا بنوا دیا۔ (۶) سلطان شمس الدین کے بیٹے سلطان رکن الدین کا مقبرہ جو ملک پور میں تھا بالکل خراب ہوگیا تھا میں نے اس کی دیوار احاطہ کھنچوائی اور نیا گنبد بنوا کر ایک خانقاہ بھی وہیں تعمیر کرا دی۔ (۷) سلطان علاء الدین کے مقبرہ کی مرمت کرائی اور صندلی دروازے اس میں لگوا دئے آبدار خانہ کی دیوار اور مدرسہ کے اندر جو مسجد تھی اس کی مغربی دیوار بنوائی اور چوبی کا فرش طیار کرایا۔ (۸) سلطان قطب الدین کا مقبرہ اور سلطان علاء الدین کے بیٹوں، خضر خاں، شادی خاں، فرید خاں، سلطان شہاب الدین، سکندر خاں، محمد خاں، عثمان اور اس کے پوتوں اور پرپوتوں کے مقبروں کی مرمت کرائی اور از سر نو تعمیر کرایا۔ (۹) شیخ الاسلام نظام الدین (اولیا) کے مقبرہ کے دروازے اور قبر کی صندلی جالیاں خراب ہوگئی تھیں ان کی مرمت کرائی اور چاروں محرابوں میں سونے کے جھاڑ طلائی زنجیروں سے آویزاں کرا دئے ایک مجلس خانہ[1] بھی بنوا دیا جو اس سے قبل نہیں تھا۔ (۱۰) سلطان علاء الدین کے وزیر اعظم تاج الملک کافوری کی قبر ہموار ہوگئی تھی اور گنبد گر پڑا تھا میں نے اسکی بھی از سر نو تعمیر کرائی۔ (۱۱) دار الامان (یہ بڑے بڑے آدمیوں کے دفن ہونے کی جگہ تھی) میں نئے دروازے صندل کے لگوائے اور مشہور آدمیوں کی قبروں کے غلاف اور پردے بنوائے۔ (۱۲) سلطان محمد تغلق نے "جہاں پناہ"[2] کی بنیاد ڈالی تھی میں نے اُسے مکمل کر دیا کیونکہ سلطان محمد تغلق میرا مربی اور استاد تھا۔ (۱۳) دہلی میں اگلے بادشاہوں نے جتنے قلعے اور حصار بنوائے تھے ان سب کی میں نے مرمت کرائی۔ (۱۴) ان مدرسوں و مقبروں کی تعمیر کا خرچ ان کی قدیم املاک اوقاف کی آمدنی سے کیا گیا۔ بعض عمارتیں ایسی بھی تھیں جن کے فرش، روشنی اور مسافرین و زائرین کی مہمان نوازی کے لئے کوئی آمدنی نہ تھی، میں نے ان کے لئے دیہات وقف کئے تاکہ ان کی آمدنی سے مصارف پورے ہوتے رہیں۔ (۱۵) نامور سلاطین اور اولیاء کے مقابر کے لئے دیہات وقف تھے میں نے انکو بدستور قائم رکھا۔ اور بعض جدید مقابر و مزارات کے لئے بھی

---

[1] اس وقت مزارات اولیاء کے ساتھ مجلس خانوں کی تعمیر کا عام رواج تھا شیخ صلاح الدین (عہد محمد تغلق کے مشہور بزرگ) کا مقبرہ جو [illegible] کھڑکی میں بنایا گیا تھا اس میں بھی مجلس خانہ شامل تھا۔ (آثار قدیمہ دہلی اسٹیفن)

[2] سلطان محمد تغلق نے قلعۂ علائی سے قلعۂ رائے پتھورا تک (جو سلطان جلال الدین فیروز خلجی کے وقت پرانی دہلی کے نام سے مشہور تھا) [illegible] شہر پناہ کے انداز پر بنائی تھیں ایک سرا ان دیواروں کا قلعہ علائی یا قلعہ سیری سے ملا دیا تھا اور دوسرا قلعہ رائے پتھورا سے اور اس کا نام جہاں پناہ [illegible] (آثار الصنادید)

زمین وقف کردی - (۱۰۱) میں نے دارالشفا بھی تعمیر کرایا - اس میں ادنے واعلے تمام طبقوں کے مریضوں کا علاج ہوتا ہے اطبائے حاذق تشخیص امراض و معالجہ کے لئے مقرر ہیں ۔ غذا دوا وغیرہ سب جایداد موقوفہ کی آمدنی سے مہیا کی جاتی ہے"۔

فیروز شاہ نے جو مدارس قایم کئے تھے ان میں سے ایک فتح خاں کے مقبرہ کے پاس تھا جسے "قدم شریف"[1] کہتے ہیں۔ اسی کے ساتھ ایک مسجد بھی تھی اور ایک حوض بھی۔ فتح خاں فیروز شاہ کا بہت محبوب فرزند تھا اور یہ مدرسہ مع مسجد کے اسی کی یادگار میں تعمیر کیا گیا تھا

دوسرا مشہور مدرسہ فیروز آباد میں تھا جو "فیروز شاہی مدرسہ" کے نام سے مشہور تھا۔ ضیا برنی نے لکھا ہے کہ "یہ مدرسہ بہ لحاظ عمارت و تنظیم اپنی نظیر نہ رکھتا تھا"

اس مدرسہ کی عمارت بہت وسیع تھی اور اس کے گنبد بڑے شاندار تھے یہ مدرسہ ایک بہت بڑے باغ کے اندر تالاب کے کنارے واقع تھا ہر وقت سیکڑوں طلبہ اور کثیر علما و فضلا یہاں موجود رہتے تھے اور سارا باغ ان کے لئے وقف تھا۔ یہاں ان کی تعلیم و تعلم، درس و تدریس، عبادت و تفریح کے لئے مکانات بنے ہوئے تھے اور وہ نہایت آزادی کے ساتھ تالاب کے کنارے باغ کے کنجوں میں سنگ مرمر کے صیقل کئے ہوئے فرش پر اپنے مشاغل علمیہ میں منہمک نظر آتے تھے[2]

اس مدرسہ سے متعلق ایک مہمان خانہ بھی تھا جہاں سیاح آکر قیام کرتے تھے اور مسجد مدرسہ کے ساتھ ایک لنگر خانہ یا خیرات خانہ بھی تھا جس سے تمام غربا اور مساکین کو امداد ملتی تھی[3]

فیروز شاہ کے تمام کاموں میں سے سب سے زیادہ اہم اور موجودہ زمانہ کے نقطۂ نظر سے بے انتہا قابل قدر کام یہ ہے کہ اس نے قدیم شہر کے دو سنگین مینار میرٹھ اور خضر آباد کے قریب سے اکھڑوا کر کوشک شکار میں نصب کرائے یہ دونوں مینار ۲۲۰ سال قبل مسیح کے ہیں جن پر پالی حروف میں اسوکا (بدھ مذہب کے بہت بڑے مبلغ) کے احکام مذہبی منقوش ہیں جب یہ دونوں مینار دہلی پہونچے تو فیروز شاہ نے تمام پنڈتوں کو جمع کیا لیکن کوئی منقوش عبارت کو نہ پڑھ سکا[4]

---

[1] قدم شریف موجودہ دہلی کے "لاہوری دروازہ" سے ڈیڑھ میل جانب جنوب واقع ہے۔

[2] مسٹر اسٹیفن نے دہلی کے آثار قدیمہ پر ریویو کرتے ہوئے ایک مدرسہ کا ذکر کیا ہے کہ "۷۵۳ھ/۱۳۵۲ء میں فیروز شاہ نے ایک مدرسہ حوض علائی کے قریب تعمیر کرایا تھا اب یہ عمارت مدرسہ شکستہ حالت میں ہے اور گاؤں کے لوگ وہاں رہتے ہیں اس مدرسہ کے متولی سید یوسف بن جمال نے سنہ ۷۸۹ھ/۱۳۸۸ء میں انتقال کیا"۔ یقیناً یہ مدرسہ "مدرسۂ فیروز شاہی" سے علحدہ تھا کیونکہ حوض علائی کسی باغ کے اندر نہ تھا اور "فیروز شاہی مدرسہ" کا باغ کے اندر پایا جانا ثابت ہے۔

حوض علائی اب بھی موجود ہے اور اس کے مشرقی جانب متعدد عمارتیں ہیں انھیں میں مقبرہ فیروز شاہ کی عمارت بھی (مع ایک مسجد و مدرسہ کے) پائی جاتی ہے۔

[3] تاریخ فیروز شاہ برنی

[4] اب مسٹر جیمس پرنسپ نے جو آثار قدیمہ کے مشہور ماہر ہیں ان کتبوں کو پڑھ لیا ہے ان میں بدھ مذہب کی کچھ ہدایات درج ہیں اور خاص خاص مذہبی اصول بتلائے گئے ہیں۔

ہرچند یہ دونوں مینار ہندو یا بودھ مذہب سے تعلق رکھتے تھے، لیکن فیروز شاہ نے بے انتہا کاوش وسعی محنت وصرف سے ان دونوں میناروں کو اپنی دارالحکومت میں منتقل کرایا[1]۔ صرف اس وجہ سے کہ وہ آثار قدیمہ کی حفاظت کا فطری ذوق رکھتا تھا اور اس مسئلہ میں بھی وہ مذہبی تعصب سے کام نہ لیتا تھا۔ بالکل ممکن تھا کہ وہ ان دونوں میناروں کو مسمار کرا کے تباہ کرا دیتا یا یہ کہ وہ انکی حفاظت نہ کرتا اور وہ خود ٹوٹ کر پامال ومعدوم ہوجاتے لیکن فیروز شاہ نے ایسا نہیں کیا اور حقیقت یہ ہے کہ اس کا یہ احسان ایسا معمولی نہیں ہے جسے فنِ آثار قدیمہ اور بودھ مذہب فراموش کر سکے

اس قدر بیان سے یہ امر بخوبی واضح ہوگیا ہوگا کہ فیروز شاہ کو عمارات کا بڑا شوق تھا۔ ہمارے پاس کوئی مکمل فہرست ان تمام

---

[1] ٹھٹھہ کی مہم سے فارغ ہونے کے بعد فیروز شاہ نے دوران سیر وشکار میں خضر آباد کے قریب (جو دہلی سے ۹۰ کوس کے فصل پر واقع ہے) ایک گاؤں (توبرہ) میں ایک سنگین منار پہاڑی پر نصب دیکھا اور ارادہ کیا کہ اسے دہلی لے جائے چنانچہ اس نے قرب وجوار کے تمام لوگوں کو جمع کیا اور فوج کو بھی طلب کیا اس کے بعد اس نے سیمل روئی منگوا کر مینار کے گرد لپیٹی، زمین پر چاروں طرف موٹے موٹے تکیے اسی روئی کے زمین پر بچھوا دئے اور پھر زمین کھدوا کر مینار کو اس نرم جگہ پر لٹا دیا۔ اس کی بنیاد کے نیچے ایک بڑا چوکور پتھر تھا اسے بھی کھود کر نکالا۔ خیر یہاں تک تو کوئی ایسا دشوار کام نہ تھا، لیکن بڑی دقت اس مینار کو دہلی تک پہونچانے میں تھی، بادشاہ نے اس غرض کے لئے ایک چھکڑا ۴۲ پہیوں کا طیار کرایا اور ہر پہیے کے دُھرے میں مضبوط رسّے بندھوائے اور ہر رسّے پر ۲۰۰ آدمی کھینچنے والے متعین کئے۔ اس طرح وہ ساحل جمنا تک لایا گیا یہاں بڑی بڑی کشتیاں (جن میں سات سات ہزار من غلہ لادا جاتا تھا) مہیا کی گئیں اور ان پر یہ مینار نہایت احتیاط سے بار کر کے فیروز آباد تک لایا گیا (بادشاہ خود اس اہتمام کے وقت موجود تھا) یہاں جامع مسجد کے قریب پتھر چونے کی ایک عمارت پایہ دار بنائی گئی جب ایک پایہ بن جاتا تو منار اس پر چڑھایا جاتا پھر دوسرا پایہ بن جاتا تو اس پر رکھا جاتا اس صورت سے وہ اوپر تک پہونچایا گیا۔ اس کو سیدھا کرنے میں بڑی محنت صرف کی گئی اس کے سرے میں رسّا باندھا گیا اور رسّے کا دوسرا سرا پہیّے سے باندھ کر اس کو گھمایا گیا۔ جب مینار آدھ گز بلند ہوجاتا تو اس کے نیچے سیمل روئی کے تکیے رکھے جاتے اور وہ بلند کیا جاتا اسی طرح جب وہ سیدھا عمود کی طرح کھڑا ہوگیا تو بنیاد میں پہلے وہی چوکور پتھر رکھا گیا اور اسکے بعد وہ مینار نصب کیا گیا اور اس کے بعد وہ مینار نصب کیا گیا۔ مینار کے گرد سنگ مرمر اور سنگ سیاہ کا کام کیا گیا چوٹی پر سونے کا کلس لگایا گیا (اس لئے اس کو مینار زریں کہنے لگے) اب بھی یہ مینار دہلی میں کوشک فیروز شاہ کے اندر (جسے کوٹلہ کہتے ہیں) موجود ہے۔ سراج عفیف نے لکھا ہے کہ اس کا طول ۴۲ گز تھا (۸ گز زمین کے اندر اور ۳۴ گز باہر) مگر اب اس کا طول ۴۲ فٹ ۷ انچ ہے جس میں سے چار فٹ ایک انچ زمین کے اندر ہے

دوسرا مینار میرٹھ میں تھا لیکن یہ کچھ چھوٹا تھا۔ بادشاہ نے اسے بھی نہایت احتیاط سے منتقل کرا کے کوشک شکار میں نصب کیا جس وقت یہ مینار نصب ہوگیا تو بادشاہ نے بڑا جشن کیا اور پبلک کو عام اجازت اس کے دیکھنے کی دی گئی۔ شربت کی سبیل قائم کی جو کوئی دیکھنے آتا اُسے شربت پلایا جاتا۔ فرخ سیر کے عہد میں بارود اُڑنے کی وجہ سے اس کے پانچ ٹکڑے ہوگئے لیکن انگریزوں نے اس کو جوڑ کر پھر ہندو راؤ کے باڑے میں نصب کیا جہاں وہ اب تک موجود ہے

عمارات کی نہیں ہے جو فیروز شاہ نے تعمیر کرائیں۔ البتہ فرشتہ نے اور صاحب طبقات اکبری نے حسب ذیل فہرست مرتب کی ہے:
۵۰ بند جن سے آب پاشی ہوتی تھی --- ۴۰ مسجدیں --- ۳۰ مدارس جن کے ساتھ مسجدیں بھی تھیں --- ۲۰ خانقاہیں۔
۱۰۰ محل --- ۵۰۰ شفاخانے --- ۱۰۰ مقبرے --- ۱۰ حمام --- ۱۵۰ کنوئیں --- ۱۰۰ پُل

فہرست مرتبہ طبقات اکبری:- ۵۰ بند (غالباً ۵۰) --- ۴۰ مساجد (غالباً ۴۰) --- ۳۰ مدرسے --- ۲۰ خانقاہیں ---
۱۰۰ محل --- ۲۰۰ رباط (کارواں سرائے) --- ۲۰۰ شہر --- ۵ [illegible] --- ۴ شفاخانے --- ۱۰۰ مقبرے --- ۱۰ حمام۔
۱۰ مینارے --- ۱۵۰ کوئیں --- ۱۰۰ پل --- باغوں وغیرہ کا کوئی شمار نہیں ہے ان میں سے ہر عمارت کے لئے اس نے
جاید اد وقف کی تاکہ وہ خراب نہ ہونے پائے اور ہمیشہ [illegible] درست ہوتے رہیں۔

مدارس کے متعلق مورخین کا اختلاف ہے [illegible] لکھتے ہیں کہ طبقات اکبری اور
تاریخ فرشتہ میں تیس کی تعداد درج ہے اگر ان میں سے کوئی تعداد صحیح نہ ہو تو بھی اس سے نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ اس نے
متعدد مدرسے قایم کئے

ان شفاخانوں کا جو انتظام تھا اس کا حال خود فیروز شاہ نے اپنی فتوحات میں لکھدیا ہے اور جسے ہم درج کر چکے ہیں۔
غربا کے فایدہ و سہولت کے لئے اس نے دیوان خیرات [illegible] قایم کیا تھا۔ [illegible] سے مقصود یہ تھا کہ جن غربا و مساکین کی
لڑکیاں جوان ہوگئی ہوں اور بوجہ افلاس ان کی شادی نہ ہو سکتی ہو [illegible] پچاس سے بیس تنکہ تک، ہر شخص کی
مدد کی جاتی تھی۔ سراج عفیف لکھتا ہے کہ "اس [illegible] خدا جانے کتنی نا کتخدا لڑکیوں
کی شادی ہوگئی"۔

یہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ علماء و مشائخ کے لئے اس نے [illegible] مقرر کئے (مقابر کے لئے ایک لاکھ تنکہ
اس کے علاوہ تھے) لیکن اس نے خدمت علم صرف اسی حد تک نہیں کی بلکہ [illegible] کی طرف بھی خاص توجہ کی جب سلطان
نے نگرکوٹ[2] فتح کرنے کے بعد وہاں کے راجہ کو بدستور حکمراں قایم رکھا تو اس نے چند دن وہاں قیام بھی کیا۔ اس دوران میں اس
نے لوگوں سے کہا کہ جب سکندر ذوالقرنین یہاں آیا تھا تو [illegible] (سکندر کی [illegible]) تیار کرکے اس کی پرستش

---

[1] ماثر رحیمی کا مصنف محمد عبدالباقی الرحیمی النہاوندی تھا۔ یہ عہد اکبری کے خاص لوگوں میں اور عبدالرحیم خانخاناں کے متوسلین خصوصی میں سے
تھا۔ اس کتاب میں سلاطین دہلی کی تاریخ درج ہے اور خصوصیت کے ساتھ [illegible] امرا و ملوک کے حالات نہایت تفصیل سے درج کئے گئے ہیں عبدالرحیم خانخاناں
کے حالات اس قدر شرح و بسط کے ساتھ لکھے ہیں کہ بعض لوگوں نے اس کو خانخاناں ہی کی سیرۃ قرار دیدیا۔ چونکہ یہ کتاب عبدالرحیم خانخاناں کے نام منسوب ہے
اسی لئے اس کا نام ماثر رحیمی رکھا گیا۔ [2] فتح کے بعد نگرکوٹ کا نام سلطان محمد تغلق کی یادگار میں (کیونکہ تغلق یہاں آیا تھا) محمد آباد رکھا
[3] نگرکوٹ آنے سے قبل فیروز شاہ سرہند کی طرف فتوحات میں مصروف تھا اور وہاں اس نے ایک شہر فیروزپور کے نام سے تعمیر کرایا تھا

شروع کردی تھی۔ چنانچہ اب بھی یہاں کے لوگ اسی مجسمہ کو پوجتے ہیں، علاوہ اس کے فیروز شاہ سے یہ بھی کہا گیا کہ مندر میں ۱۳۰۰ کتابیں قدیم زمانہ کی رکھی ہوئی ہیں۔ چنانچہ فیروز شاہ اس بت خانہ[1] میں جس کو "جوالاکھی" کہتے تھے گیا اور وہاں تمام علماء کو طلب کرکے بعض کتابوں کا ترجمہ کرایا، انھیں کتابوں میں سے ایک کتاب حکمت نظری وعملی کی تھی جس کو اعز الدین خالد خانی نے (جو اس وقت کے مشہور شعراء میں سے تھا) نظم کرکے دلائل فیروز شاہی نام رکھا۔[2] ایک کتاب عروض علم موسیقی کی اور ایک فن پٹہ بازی کی بھی سنسکرت سے فارسی میں ترجمہ کی گئی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فیروز شاہ کے عہد میں حاکم و محکوم کے درمیان ایسے تعلق پیدا ہوگئے تھے کہ ایک دوسرے کی زبان کو سیکھتا تھا اور تعصب بڑی حد تک مٹ چکا تھا۔ ضیا برنی کی تاریخ فیروز شاہی (جس میں عہد فیروز شاہی کے ابتدائی دس سال کے حالات بھی درج ہیں) اسی کے عہد میں ختم ہوئی تفسیر تاتارخانی فتاوائے تاتارخانی[3] (جو فن تفسیر و فن فقہ کی بے مثل کتابیں ہیں) اور عین الملکی[4] بھی اسی عہد کی مشہور تصانیف ہیں۔

---

[1] جوالاکھی، کہ آتش فشاں کو کہتے ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مندر میں کوئی آتشکدہ قایم تھا اور وہاں آتش پرستی ہوتی تھی۔ [2] فرشتہ ۱۴۸۔

[3] غیاث الدین تغلق کے عہد میں خراسان کے فرمانروا نے ملتان اور دیبل پور پر حملہ کیا اسکی بیوی بہت خوبصورت تھی جس سے وہ ایک لمحہ کے لئے جدا نہ ہوسکتا تھا اور ساتھ ساتھ رکھتا تھا چنانچہ حملۂ ملتان کے وقت بھی وہ ہمراہ تھی یہیں اس سے ایک لڑکا پیدا ہوا۔ جب سلطان تغلق نے مغلوں کی فوج کو شکست دی اور فرمانروائے خراسان بھاگا تو اضطراب میں یہ لڑکا یہیں رہ گیا۔ محمد تغلق نے اس کی پرورش اپنے بچوں کی طرح کی، اور اس کا نام تاتار ملک رکھا۔ وہ ابھی کمسن ہی تھا کہ سلطان محمد تغلق کا انتقال ہوگیا لیکن محمد تغلق نے بھی اس کی تربیت کا خاص خیال رکھا بعد کو تاتار ملک نے اپنی قابلیت سے بہت جلد مناصب جلیلہ حاصل کئے۔ فیروز شاہ کے عہد میں تاتارخاں کا خطاب ملا۔ اس کو علم کی طرف بہت شغف تھا اور خود بھی ایک فاضل شخص تھا اس نے اس عہد کے تمام اکابر علماء و فقہاء کو جمع کرکے فن تفسیر میں ایک کتاب تفسیر تاتارخانی اور ایک کتاب فقہ میں فتاوائے تاتارخانی مرتب کرائی۔ فیروز شاہ کی تخت نشینی کے چند سال بعد اس کا انتقال ہوگیا

[4] عین الملک کا نام عین ماہرو بھی تھا۔ یہ نہایت قابل و ذہین شخص تھا سلطان محمد تغلق کے عہد میں ایک بار اس کے بھائیوں کی طرف سے کوئی نامناسب حرکت سرزد ہوئی تھی تو سارے خاندان پر زوال آگیا تھا لیکن اس کے بعد ایک بار محمد تغلق دربار کررہا تھا کہ اس کی نگاہ عین پر پڑی۔ چونکہ محمد تغلق اس کی ذاتی قابلیت سے واقف تھا اس لئے اس کا قصور معاف کرکے پھر دربار میں اس کو جگہ دی۔ اس نے محمد تغلق اور فیروز شاہ کے عہد میں متعدد تصانیف کیں انھیں میں سے ایک عین الملکی ہے

فیروز شاہ کے عہد میں یہ اشرف الملک کے درجہ تک پہونچ گیا تھا لیکن کسی بات پر خان جہاں وزیر اور اس کے درمیان کچھ نااتفاقی ہوگئی اور یہ اختلاف اس حد تک پہونچ گیا کہ فیروز شاہ نے مجبور ہوکر اسے ملتان، بھکر اور سوستان کی جاگیر دیکر دربار سے چلے جانے کا حکم دیا۔ عین الملک نے کہا کہ میں صرف اس شرط سے اس جاگیر کو قبول کرتا ہوں کہ اس کا حساب خان جہاں کے پاس نہ بھیجوں گا۔ بادشاہ نے یہ بھی منظور کیا جب اور درباریوں کو یہ معلوم ہوا تو وہ ڈرے کہ کہیں خان جہاں ان پر بھی حملہ نہ کرے اسلئے انھوں نے بادشاہ سے کہا کہ خان جہاں کے حوصلوں کا اس قدر وسیع کردینا مناسب نہیں ہے اور عین الملک کا دربار سے علٰحدہ رہنا خلاف مصلحت ہے چنانچہ وہ ابھی صرف ۳۰ کوس گیا ہوگا کہ فیروز شاہ نے اسے طلب کیا اور خلوت میں بلاکر خان جہاں کے بابت مشورہ کیا اور لوگ بھی موجود تھے سب نے یہی رائے دی کہ خان جہاں کو وزارت سے علٰحدہ کردینا چاہئے لیکن عین الملک نے اس کی مخالفت کی اور فیروز شاہ سے کہا کہ خان جہاں سے زیادہ مناسب شخص اور کوئی اس عہدہ کے لئے نہیں ہوسکتا اسکا ہٹادینا سلطنت کے لئے بہت مضر ہوگا۔ فیروز شاہ اس کے اس انصاف پسندی سے بہت خوش ہوا اور بعد کو خان جہاں اور اس کے درمیان صفائی کرادی جب خان جہاں کو یہ معلوم ہوا کہ عین الملک نے باوجود دشمن ہونے کے بادشاہ سے اسکی تعریف کی تو وہ بہت گرویدہ ہوگیا اور عین الملک کو نہایت عزت کی نگاہ سے دیکھنے لگا۔

کمال صحت
کمال نوجوانی
کمال جوانمردی
کمال حوصلہ
کمال اُمنگ
KAMAL کمال
REGD. رجسٹرڈ
خون کی افزائش کے لئے دُنیا کی بہترین دوا ہے۔ رگ و ریشہ میں خون پہنچا کر جوش اور اُمنگ پیدا کرتی۔
اعصاب کو تقویت دے کر اعضا کو قوی اور مضبوط بناتی، دل و دماغ کو قوت دیتی، کسل و ماندگی، سستی و کاہلی کو دفع کر کے چستی و چالاکی پیدا کرتی ہے،
غرض کہ جو قوت ایک مرد کو صحیح معنی میں مرد کہلا سکتی ہے وہ "کمال" ہی کی رہین منت ہے
نشے والی اور زہریلی چیزوں سے پاک ہے
قیمت فی شیشی آٹھ روپے
مزید معلومات کیلئے فہرست طلب کیجئے
TAYYEBI DAWAKHANA UNANI
INDORE BOMBAY
طیبی دواخانہ یونانی

رجسٹرڈ نمبر اے ۱۱۰۳

قیمت
۸ر

تصانیف نیاز فتحپوری

نگارستان

حضرت نیاز کے بہترین ادبی مقالات اور افسانوں کا مجموعہ نگارستان نے ملک میں جو درجۂ قبول حاصل کیا اُس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس کے متعدد مضامین غیر زبانوں میں منتقل کیے گئے۔

قیمت دو روپیہ (عگار)
علاوہ محصول

جمالستان

اڈیٹر نگار کے مقالات ادبی کا دوسرا مجموعہ جس میں ۳۲ افسانے ۱۹۳۳ء تک کے درج ہیں۔ زبان، قدرت بیان، علو تخیل اور پاکیزگیٔ خیال کے بہترین شاہکار کے علاوہ بہت سے اجتماعی و معاشری مسائل کا حل بھی آپ کو اس مجموعہ میں نظر آئے گا۔ ہر افسانہ اور ہر مقالہ اپنی جگہ معجزۂ ادب کی حیثیت رکھتا ہے

قیمت چار روپیہ (للعہ)
علاوہ محصول
خریداران نگار سے ایک روپیہ کم

مکتوبات نیاز

اڈیٹر نگار کے تمام وہ خطوط جو نگار میں شائع ہوئے ہیں نیز وہ جو شائع نہیں ہوئے جذبات نگاری اور سلاست بیان رنگینی اور البیلے پن کے لحاظ سے فن انشا میں یہ بالکل پہلی چیز ہے جس کے سامنے خطوط غالب بھی پھیکے معلوم ہوتے ہیں مع تصویر حضرت نیاز ۲۰ پونڈ کے کاغذ پر مجلد شایع ہوئی ہے۔

قیمت دو روپیہ آٹھ آنے (۲/۸)
علاوہ محصول

شہاب کی سرگزشت

حضرت نیاز کا وہ عظیم الشان افسانہ جو اُردو زبان میں بالکل پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے اصول پر لکھا گیا ہے اس کی زبان اس کی فصاحت اس کی نزاکت بیان اس کی بلندیٔ مضمون اور اس کے انشاء عالیہ سحر حلال کے درجہ تک پہونچتی ہے۔

قیمت ایک روپیہ (عہ)
علاوہ محصول

اُردو شاعری

یعنی جنوری ۱۹۳۳ء کا نگار جس میں اُردو شاعری کی تاریخ، اس کی عہد بہ عہد ترقی اور ہر زمانہ کے شعراء پر بسیط نقد و تبصرہ کیا گیا ہے مع انتخاب کلام، اس کی موجودگی میں آپ کو کسی اور تذکرہ دیکھنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ اور جس میں سات مضامین اڈیٹر نگار کے لکھے ہوئے ہیں حجم ۲۵۰ صفحات۔ قیمت ۶ر علاوہ محصول

ہندی شاعری

یعنی جنوری ۱۹۳۶ء کا نگار جس میں ہندی شاعری کی تاریخ، اس کے تمام ادوار کا بسیط تذکرہ موجود ہو اس میں تمام مشہور شعراء کے کلام کا انتخاب معہ ترجمہ کے درج ہے۔ ہندی شاعری کی ابتدا و قیمت کا اندازہ مقصود ہو تو اُردو میں آپ کے لئے صرف یہی ایک مجموعہ کافی ہے۔ قیمت علاوہ محصول عہ

"نگار" جنوری ۱۹۳۷ء

(۱) "ڈرامہ اصحاب کہف" یہ ڈرامہ مصری انشا پرداز توفیق الحکیم کی کتاب "اہل الکہف" سے ماخوذ ہے جس سے ... ذوق الشاعری کو آسودہ کرنے والی ہے۔ اس کے علاوہ (۲) اسکر وائلڈ کے خطوط جو اُسنے ساتھ (مشہور ... [illegible]

[illegible]

آیندہ "نگار" کے خریدار رہنے کا فیصلہ یوں نہ کیجئے

پہلے یہ سمجھ لیجئے کہ اگر آپ نے خریداری جاری نہ رکھی تو آپ کا کیا نقصان ہوگا اول تو جنوری ۳۹ء کے پرچہ سے آپ محروم ہو جائیں گے جو مصحفی کے لئے مخصوص ہے اور دو چند ضخامت کے ساتھ شایع ہو رہا ہے دوسرے یہ کہ نغمہ کارواں کا باقی حصہ جو ۳۹ء میں پورا ہو جائے گا، آپ کو نہ مل سکے گا

جنھوں نے نگار کے مومن نمبر اور ظفر نمبر وغیرہ دیکھے ہیں وہ جان سکتے ہیں کہ اس قسم کی خصوصی اشاعتیں کتنی مفید ہوا کرتی ہیں اور مصحفی نمبر کتنی قیمتی چیز ہوگی' اسی طرح "نغمہ کارواں" جو اپنی انتشار و بلند تخیل کے لحاظ سے بے مثل چیز ہے، اسی طرح ہاتھ سے دینے کے قابل نہیں، جبکہ اُسے علٰحدہ کتابی صورت میں شایع ہونا نہیں ہے۔

غیر خریداران نگار کو صرف مصحفی نمبر عہ میں علاوہ محصول مل سکے گا۔

نیجر نگار لکھنؤ

(ب)
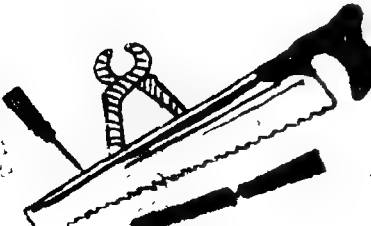
امامیہ مشن کے رسالے

نمبر	نام رسالہ	قیمت	محصول	نمبر شمار	نام رسالہ	قیمت	محصول	نمبر شمار	نام رسالہ	قیمت	محصول
۱	قاتلان حسین کا مذہب	۰۴ر	ار	۲۱	اسوۂ حسینی	۰۷ر	ار	۴۱	مسئلہ فدک	۰۵ر	لہ
۲	تحریف قرآن کی حقیقت تیسرا ایڈیشن زیر طبع	-	—	۲۲	جنگ صفین	۳ر	۔ر	۴۲	تاجدار کعبہ	ار	۔ر
۳	مولود کعبہ (ختم)	--	—	۲۳	تذکرۂ خاندان شیعہ حصۂ اول	۰۶ر	ار	۴۳	خلافت و امامت حصۂ اول	۵ر	ار
۴	وجود حجت	۰۴ر	ار	۲۴	〃 〃 حصۂ دوم	۰۵ر	ار	۴۴	〃 〃 حصۂ دوم	۰۴ر	ا
۵	اصول دین اور قرآن	۰۴ر	۔ر	۲۵	مقصود کعبہ	ار	۔ر	۴۵	〃 〃 حصۂ سوم	۴ر	ار
۶	اتحاد الفریقین حصۂ اول	۰۴ر	ار	۲۶	مذہب باب و بہا حصۂ دوم	۹ر	ار	۴۶	تحقیق اذان	ار	۔ر
۷	حسین اور اسلام (اردو)	۰۱	۔	۲۷	مذہب اور سائنس	ار	۔ر	۴۷	ذوالجناح	۰ر	۔ر
۸	〃 (ہندی)	ار	۔ر	۲۸	معرکۂ کربلا (ختم)	۲ر	۔ر	۴۸	شہدائے کربلا	۴ر	ار
۹	〃 (انگریزی)	--	--	۲۹	کربلا کا مہایدھ 〃	۲ر	۔ر	۴۹	کربلا کا مہا ستیر (ہندی)	۲ر	۔ر
۱۰	متعہ اور اسلام	۵ر	ار	۳۰	دی ٹریجڈی آف کربلا (انگریزی)	۲ر	۔ر	۵۰	حسین اینڈ دی ٹیمپل آف کربلا (انگریزی)	۰۱ر	۔
۱۱	امامت ائمہ اثنا عشر اور قرآن	۰	۔ر	۳۱	اسلام کی حکیمانہ زندگی	۹ر	ار	۵۱	مشہد اعظم	ار	۔ر
۱۲	تجارت اور اسلام (ختم)	۳ر	ار	۳۲	دور استبداد	۰۴ر	ار	۵۲	لاتفسدوا فی الارض	۸ر	ار
۱۳	اتحاد الفریقین حصۂ دوم (ختم)	۰۴ر	ار	۳۳	حقیقت بدا	۲ر	۔ر	۵۳	نہج البلاغہ کا استناد	۴ر	ار
۱۴	علی اور کعبہ (ختم)	ار	۔ر	۳۴	خطیب آل محمد	۰۴ر	ار	۵۴	خلافت و امامت حصۂ چہارم	۴ر	ار
۱۵	رجال بخاری حصۂ اول	۰۶ر	ار	۳۵	تدوین حدیث	!	۔ر	۵۵	شہدائے کربلا حصۂ دوم	۵ر	ا
۱۶	مذہب باب و بہا حصۂ اول	۰۵ر	ار	۳۶	مطلوب کعبہ	ار	۔ر	۵۶	ابو الائمہ کی تعلیمات	۴ر	ار
۱۷	نوروز و غدیر	ا	۔ر	۳۷	معارف کربلا	۲ر	۔ر	۵۷	حسین کا پیغام عالم انسانیت کے نام	ار	۔
۱۸	مجاہدۂ کربلا	۲ر	۔ر	۳۸	اسلام کا پیغام (اردو)	۰ر	۔ر	۵۸	اسلامی عقائد	۲ر	۔
۱۹	کربلا کا آتم بلیدان (ہندی ختم)	—	—	۳۹	دی میسج آف اسلام (انگریزی)	۰ر	۔ر	۵۹	آثار باقیہ	ار	-
۲۰	دی مارٹرڈم آف حسین (انگریزی)	۲ر	۔ر	۴۰	اثبات عزاداری	۰۴ر	ار	۶۰	صحیفۂ سجادیہ کی عظمت (زیر طبع)	—	--

کتب امامیہ مشن بک ایجنسی

نمبر	نام کتاب	قیمت	محصول	نمبر	نام کتاب	قیمت	محصول	نمبر	نام کتاب	قیمت	محصول
۱	حسین دی مارٹر (انگریزی ختم)	۱۲ر	۰۲ر	۶	وجیزۃ الاحکام	۴ر	ار	۱۱	ڈیریم زم اینڈ فری ... محمود (انگریزی)	ہ	
۲	الشہید (اردو)	۱۰ر	ار	۷	صحیفۂ تجلی (رباعی)	۸ر	ار	۱۲	تاریخ ازدواج		
۳	کائنات قبل از اسلام	۲ر	۔ر	۸	رسول کی بیٹی	۲ر	۔ر	۱۳	الہامی حکمات		
۴	قاتلان حسین کی گرفتاری	۸ر	۲ر	۹	گل عصمت	۱۰ر	۔ر	۱۴	شہید اسلام		
۵	حج و میقات	عہ	۲ر	۱۰	رجال بخاری حصۂ دوم	۶ر	ار				

ملنے کا پتہ:- آنریری سکریٹری امامیہ مشن، رجسٹرڈ لکھنؤ

ضروری اعلان

۱- اگر جنوری ۱۹۳۹ء سے اسوقت تک کے مسلسل پرچے آپ کے پاس نہیں ہیں تو اب طلب فرمائیے تاکہ "اسلامی ہند کی تاریخ" اور "نغمۂ کارواں" (دونوں کتابیں) آپ کے پاس مکمل ہو جائیں یہ کتابیں علٰحدہ ۔۔۔۔۔۔ شائع نہ ہوں گی

۲- چونکہ "اسلامی ہند" کو دسمبر ۱۹۳۹ء تک ختم کر دینا ہے، اس لئے "نغمۂ کارواں" کی اشاعت فی الحال ملتوی کر کے "اسلامی ہند" کے صفحات میں اضافہ کر دیا گیا ہے

منیجر نگار

جلد ۳۴	فہرست مضامین اکتوبر ۱۹۳۸ء	شمار ۴

ہندوستان کے اندر سالانہ چندہ پانچ روپیہ ششماہی تین روپیہ
ہندوستان سے باہر صرف سالانہ چندہ آٹھ روپیہ یا بارہ شلنگ

ششماہی چندہ میں نگار کا جنوری نمبر
بہ وجہ اضافۂ ضخامت و قیمت شامل نہ ہوگا،

نگار

اڈیٹر:- نیاز فتحپوری

جلد - ۳۴	اکتوبر ۳۸ء	شمار - ۴

ملاحظات

برطانوی اقتدار کا جنازہ

آخر کار زیکوسلوکیا میں وہی ہوکر رہا جس کا اندیشہ تھا اور جو ہمیشہ ایک کمزور قوم کے ساتھ طاقتور قوموں نے کیا ہے پنجۂ آہنی کی قوت کے سامنے جس طرح خروج مسیح سے قبل سر جھکا دینا پڑتا تھا، اسی طرح تعلیمات مسیح کی اشاعت کے بعد ہمیشہ جھکایا گیا اور جھکایا جائے گا، لیکن دنیا کی تاریخ میں، اس بلند اخلاق کی نظیر یقیناً نہیں ملیگی جو ۲۲ ستمبر ۳۸ء کو دُنیا کی سب سے بڑی حکومت کی طرف سے پیش کیا گیا - وہ حکومت جس کے طول و عرض میں آفتاب کبھی نہیں ڈوبتا جس کی عسکری قوت کے سامنے مریخ فلک بھی لرزہ براندام رہتا ہے اور جس کی دولت و ثروت دنیا کی اقتصادی توازن کی ذمہ دار ہے! - پھر جس وقت اس زبردست قوت و جبروت رکھنے والی سلطنت کا وزیر اعظم اعلان کرتا ہے کہ وہ زیکوسلوکیا کی سرزمین کو جرمنی کی قشونِ قاہرہ سے پامال نہ ہونے دے گا، وہ فرانس کی فوجوں کو تنہا نہ چھوڑیگا اور وہ اس معاہدۂ اتحاد کا پورا احترام کرے گا جو زیکوسلوکیا کے باب میں فرانس اور روس سے ہو چکا ہے، تو دنیا میں امن کو کونا کی سی لہر دوڑ جاتی ہے اور ڈماکریٹک حکومتوں کی وہ امیدیں جن کو نازیت و فسطائیت عرصہ سے پامال کرتی چلی آتی تھیں

از سرنو زندہ ہو جاتی ہیں ــــ لیکن چند ساعتیں نہیں گزرتیں کہ جرمنی کا آمر اعظم، ہر ہٹلر جو مکانہ ڈیماکریٹک حکومتوں کی دکھتی ہوئی رگ کو پکڑنا جانتا ہے، جو دغا باز دعویداران امن وسکون کے دلوں سے پورے طور پر اچھی طرح واقف ہے، نیورنبرگ میں صاف صاف کہدیتا ہے کہ سوڈیٹن علاقہ، فلسطین نہیں ہے جہاں عربوں پر برٹش تیغ و خنجر کی آزمائش جاری ہے اور کوئی انکی فریاد سننے والا نہیں، یہ وہ علاقہ ہے جہاں جرمنی کی زندہ قوم بستی ہے، جہاں گھونسہ کا جواب گھونسہ سے دیا جاتا ہے اور جہاں انسانی خون کا سودا انسانی خون ہی سے ہوتا ہے ـــ تو برطانوی وزیر اعظم گھبرا اٹھتا ہے ـ صید زبوں کی طرح ہر ہٹلر کے قدموں پر جا گرتا ہے اور امن وسکون کے نام سے دنیا میں غریب آزاری کی وہ مثال قایم کر جاتا ہے جسے چنگیز و ہلاکو کی خون آشام تلواریں بھی قایم نہ کر سکی تھیں

اس نے یقیناً ہوا کا رخ بدلدیا اور کچھ عرصہ کے لئے تلواریں نیاموں میں رکھدی گئیں، لیکن جو قیمت اسکی برطانوی حکومت نے ادا کی ؟ اس کو مسٹر چیمبرلین برداشت کرلیں تو کرلیں، لیکن کوئی غیرت دار قوم کبھی برداشت نہیں کر سکتی اور اگر برطانوی قوم میں احساس عزت و خودداری بالکل محو نہیں ہو گیا ہے تو یقیناً اسے بھی برداشت نہ کرنا چاہئے

مسٹر چیمبرلین غالباً خوش ہوں گے کہ اسوقت انھوں نے عالمگیر جنگ کے خطرہ سے دنیا کو بچا لیا، لیکن عالم انسانیت سرنگوں ہے، دنیائے اخلاق سوگوار ہے اور خود برطانوی قوم کو بھی آج نہیں تو کل محسوس کرنا پڑے گا کہ زیکوسلیوکیا کی موت حقیقتاً برطانوی اقتدار کی موت ہے اور ارباب فہم کے مشام میں ابھی سے اس کفن کی بو آنے لگی ہے جو برطانیہ قوم کے لئے مسٹر چیمبرلین نے زیکوسلیوکیا کی لاش سے طیار کیا ہے

مسٹر ایڈن فرماتے ہیں کہ "ہم کو ایسا امن وسکون نہیں چاہئے جو ہماری قومی شہرت اور احساس انصاف کو صدمہ پہونچانے والا ہو، کیونکہ یہ امن وسکون ناپایدار اور غیر حقیقی امن وسکون ہوگا ـ قوم ہونے کی حیثیت سے ہم کو استقلال سے کام لینا چاہئے ورنہ ہماری خودداری فنا ہو جائے گی یہ ہماری تاریخ میں پہلا واقعہ نہیں ہے کہ ہمکو اس قسم کا چیلنج دیا گیا ہو، بارہا ایسا ہوا اور ہم ہمیشہ آزادی اور قانون کی حمایت پر قایم رہے"

مسٹر ایڈن کا یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ زیکوسلوویکیا کا معاملہ برطانوی اقتدار اور احساس دیانت کا امتحان تھا، لیکن یہ دعوی کہ برطانوی تاریخ میں بارہا یہ صورتیں پیش آئیں اور اس قوم نے ہمیشہ راستی و صداقت کی حمایت کی، یقیناً غلط ہے ـ اب سے چند سال قبل جب جاپان نے لیگ اقوام کو ٹھکرا کر منچوریا پر اپنا اقتدار قایم کرنا چاہا تھا، تو کیا یہ برطانوی غیرت و خودداری کا امتحان نہ تھا اور اب بھی شنگھائی کے سواحل پر جو سلوک وہ برطانوی جہازوں، برطانوی رعایا اور برطانوی افسران کے ساتھ کر رہا ہے تو کیا یہ ملکی و ملی غیرت کا سوال نہیں ہے

جسوقت مسولینی نے حبشہ پر حملہ کیا ہے تو کیا برطانیہ کے احساس دیانت و صداقت کا یہی اقتضا تھا کہ وہ اسپر اعتماد کرنے والے ملک کو پامال ہوتے ہوئے دیکھے اور کچھ نہ کہے ـ پھر اس کے علاوہ سواحل اسپین پر جنرل فرانکو کا

برطانوی جہازوں کو ڈبونا اور مسٹر چیمبرلین کا کچھ نہ کہنا، جرمنی کا آسٹریا پر قابض ہوجانا اور انگلستان کا خاموش رہنا، کیا یہ سب کچھ آزادی وقانون کی حمایت میں ہوا اور کیا مسٹر ایڈن کو اپنی قوم کے اس طرزِ عمل پر فخر کرتے ہوئے شرم نہ کرنا چاہئے۔

پھر ہوسکتا ہے کہ اسوقت وہ چند مخصوص افراد جن کے کمزور و ناعاقبت اندیش ہاتھوں میں برطانیہ کی عنانِ حکومت دیدی گئی ہے، اس توہین کو بھول جائیں، لیکن تاریخ اسے کبھی فراموش نہیں کرسکتی اور زیکوسلوویکیا کے باب میں مسٹر چیمبرلین کے طرزِ عمل نے برطانیہ کی پیشانی پر بزدلی، بے غیرتی، عہد شکنی اور خود غرضی کا جو بدنما داغ لگادیا ہے وہ ابدالآباد تک نہیں مٹ سکتا

برطانوی تاریخ میں ہمیں انسانی ہمدردی کی بھی مثالیں نظر آتی ہیں اور اس کی جرأت وشہامت کی بھی، چنانچہ اسوقت فلسطین میں جو کچھ ہورہا ہے وہ انسانی ہمدردی ہی کا تقاضہ ہے، ایک مفلوک الحال یہودی قوم کی اعانت و حمایت کے لئے ہے۔ لیکن کس قدر عجیب وغریب بات ہے کہ برطانوی قوم کے اس اخلاق بلند کی نمائش ہمیشہ اسی حکومت اور اسی جماعت کے مقابلہ میں ہوتی ہے جو بے یارو مددگار ہے جس کے تاب مقاومت نہ لاسکنے پر اسے یقین ہوتا ہے اور جو سیاسی مکاید میں ان کی حریف نہیں ہوسکتی

آج فلسطین کے عربوں کو پامال کرنے کے لئے انگلستان وہندوستان دونوں جگہ سے فوجوں پر فوجیں روانہ ہورہی ہیں، کیونکہ یہودیوں کے ساتھ ہمدردی کرنے کا جواب دینے والا کوئی موجود نہیں ہے، لیکن جب اسی انسانیت کے اظہار کا وقت حبشہ میں آتا ہے تو ایک فوجی دستہ بھی باہر نہیں نکالا جاتا، بحر روم میں اقتدار کھودینا گوارا کرلیا جاتا ہے، لیکن مسولینی کے سامنے جانے کی ہمت نہیں ہوتی۔ پھر اس کو بھی جانے دیجئے کیونکہ حبشہ کا تعلق سیاسیات یوروپ سے نہ تھا۔ لیکن زیکوسلوویکیا کا مسئلہ تو وسط یوروپ کی اُن حکومتوں کا مسئلہ تھا جن کے توازن پر دنیا کے امن وسکون کا انحصار بتایا جاتا ہے ایک ایسی حکومت کا مسئلہ تھا جس کے ساتھ برطانیہ کا عسکری معاہدہ تھا، جس کے بقا کی ذمہ داری روس وفرانس کے ساتھ برطانیہ نے بھی اپنے سر لے رکھی تھی۔ پھر یہاں وہ انسانیت کہاں گئی، وہ اخلاق کہاں گیا، وہ "قولِ مرداں" کیا ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ ہر ہٹلر کے پاس دھونس (Bluffing) کے سوا کچھ نہیں، لیکن کیا برطانیہ کی بزدلی اس سے زیادہ کوئی اور ہوسکتی ہے کہ دھونس کو دھونس جانتے ہوئے بھی ہر ہٹلر کے سامنے آنے کی ہمت اس کو نہ ہوسکی

چند دن اس طرف کی بات ہے کہ زیکوسلوویکیا کی اعانت میں برطانیہ نے بھی اسی دھونس سے کام لینا چاہا تھا یہاں تک کہ گیس سے محفوظ رکھنے کے لئے کروڑوں نقاب تقسیم کردینے کا بھی اعلان کردیا گیا تھا لیکن اسے معلوم ہو غریب برطانیہ کو دھونس دکھانے کا بھی سلیقہ حاصل نہیں اور یہ اسی میدان کا شیر ہے جہاں کوئی دوسرا شیر مقابلہ کے لئے موجود نہ ہو

جس وقت یہ خبر رائٹر نے پہونچائی کہ مسٹر چیمبرلین ہر ہٹلر سے ملنے کے لئے ہوائی جہاز پر جا رہے ہیں تو اہل نظر اسی وقت تاڑ گئے تھے کہ یہ سراسیمگی بے وجہ نہیں ہے، اور اس کے بعد جب زیکوسلوویکیا کی جدید حد بندی کے متعلق فرانس سے مشورہ لیا گیا تو یہ اندیشہ اور زیادہ قوی ہوگیا، لیکن بایں ہمہ اس کا وہم و گمان بھی نہ تھا کہ برطانوی پارلیمنٹ اور برطانوی قوم سے استمزاج کئے بغیر اس کا فیصلہ ہو جائے گا اور فیصلہ بھی ایسا شرمناک جسے کوئی خوددار قوم برداشت نہیں کر سکتی

اہل زیک نے اس فیصلہ کو کس طرح قبول کیا، یہ بیان اتنا دردناک ہے کہ رائٹر ایجنسی کی محتاط روش بھی اسے نہ چھپا سکی۔ کہا جاتا ہے کہ جس وقت پراگ میں آہنی مکبر الصوت کے ذریعہ سے اعلان ہوا تو شہر پر موت کا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ اعلان کے الفاظ یہ تھے کہ:-

"زیک حکومت نے برطانوی فیصلہ کو ایسے سخت دباؤ کے زیر اثر قبول کیا ہے جس کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی۔ یہ فیصلہ گویا ایک حکم تھا جو کسی مغلوب و ضعیف قوم کو دیا جاتا ہے۔ ہم امن و سکون کے لئے وہی قربانی پیش کر رہے ہیں جو کسی وقت مسیح نے پیش کی تھی۔ ہم خود کسی پر الزام نہیں لگاتے، تاریخ خود اس کا بہتر فیصلہ کرنے والی ہے کہ قابل الزام کون ہے"

بہرحال یہ ڈرامہ تو ختم ہو چکا اور (ساسہ ز ا ا ر کرا) کا پارٹ جن جن کو کرنا تھا وہ نہایت کامیابی کے ساتھ کر چکے، لیکن ہم کو سوچنا چاہئے کہ حقیقتاً پس پردہ وہ کیا محرکات تھے جنھوں نے تجویز، مشورہ اور فیصلہ کے تمام مراحل ایک ہی سانس میں طے کرا دئے

فرانس کے عزائم کی شکست کے لئے تو صرف یہ جان لینا کافی تھا کہ برطانیہ اس کا ساتھ نہ دے گا، لیکن خود برطانیہ نے کیوں ایسا کیا، اس کا سراغ لگانے کے لئے ہم کو ایک طرف اس تحریک اشتراکیت کا مطالعہ کرنا چاہئے جو حدود انگلستان کے اندر بھی خطرناک صورت اختیار کرتی جاتی ہے اور بحالت جنگ ملک کے اندر انقلاب پیدا کرنے پر آمادہ ہے اور دوسری طرف ہندوستان کی سیاسیات کو دیکھنا چاہئے کہ اگر اس وقت جنگ چھڑ جاتی تو اس کی آزادی کے تمام امکانات واقعات میں تبدیل ہو جاتے اور یہ وہ بات ہے جس کے مقابلہ میں برطانوی حکومت اپنا سب کچھ قربان کر سکتی ہے

پانیر نے خوب لکھا ہے کہ مسٹر چیمبرلین پیام امن لیکر تو ضرور واپس آئے ہیں، لیکن اتنی بے عزتی کے ساتھ کہ برطانوی پارلیمنٹ کے وزیر اعظم کا اُسے ملک و قوم کو سنانا کچھ ناممکن سی بات معلوم ہوتی ہے

ہو سکتا ہے کہ جس وقت پارلیمنٹ کے سامنے یہ مسئلہ پیش ہو تو چیمبرلین کی وزارت کو مستعفی ہو جانا پڑے لیکن اس کا اثر اب زیک حکومت کی بدقسمتی پر کوئی نہیں پڑ سکتا۔ زیکوسلوویکیا کو جتنا ذلیل ہونا تھا ہو چکا اور مسٹر [illegible]

کو جو کچھ کرنا تھا کر چکے — گو اسوقت تک تفصیلی بیان شایع نہیں ہوا اور ہٹلر چمبرلین مفاہمت کے جزئیات سے ہم بے خبر ہیں، لیکن اس کی نوعیت اس سے ظاہر ہے کہ جرمن افواج سوڈٹین علاقہ پر قبضہ کرنے کے لئے روانہ ہو رہی ہیں اور بڈاپسٹ میں جرمن قوم کے ساڑھے تین لاکھ افراد نے ہٹلر کی درازی عمر کی دعا مانگتے ہوئے اقدام کا نعرہ بلند کیا۔ یقیناً کوئی صاحب فکر و نظر اس امن و سکون پر مطمئن نہیں ہو سکتا اور نہ یہ التوائے جنگ کوئی پایدار چیز ہے بلکہ اس مسئلہ نے یوروپ کی سیاسیات کو زیادہ پیچیدہ بنا دیا ہے اور ہو سکتا ہے کہ خود اہل زیک جرمن آمریت کو قبول نہ کریں اور جنگ کے لئے آمادہ ہو جائیں۔ پھر یہ وہ آگ ہوگی جسکو ایک چمبرلین کیا سو چمبرلین بھی بجھا نہ سکیں گے

میں یہاں تک لکھ چکا تھا کہ یوروپ کے سیاسی حالات بہت نازک ہو گئے اور قوی اندیشہ پیدا ہو گیا کہ یکم اکتوبر کو دوسری عالمگیر جنگ شروع ہو جائے گی، لیکن ہر ہٹلر کے ساتھ مسٹر چمبرلین کی آخری ملاقات نے پھر ہوا کا رخ بدل دیا اور گمشدہ امن و سکون حاصل ہو گیا یعنی نازیت کے دیوتا پر زیکوسلاوکیا کی قربانی چڑھا دی گئی اور ہر ہٹلر نے وہ کچھ پا لیا جس کی اس کو توقع نہ تھی۔

کہا جاتا ہے کہ ہر ہٹلر نے آیندہ کے لئے نہایت مستحکم وعدہ قیام امن و سکون کا کیا ہے اور یوروپ میں اپنے جارحانہ اقدام سے توبہ کر لی ہے۔ لیکن جو لوگ آسٹریا کے باب میں ہٹلر کے وعدہ کا حشر دیکھ چکے ہیں وہ اس وعدہ کی حقیقت سے واقف ہیں۔

اب غالباً مسولینی کی باری آئے گی اور وہ اسپین میں وہی کرے گا جو ہر ہٹلر نے زیکوسلاوکیا میں کیا ہے۔ اسکے بعد جرمنی افریقہ کے مستعمرات کی واپسی کا مطالبہ کریگا اور آخر کار اس طرح رفتہ رفتہ یوروپ کی ڈماکریسی کو نازیت و فسطائیت ہمیشہ کیلئے ختم کر دیگی

کانگرس کی آستین کا سانپ

اصول و مقاصد کے لحاظ سے کوئی متنفس ایسا نہیں جو کانگرس کا مخالف ہو لیکن افسوس ہے کہ بعض مخصوص افراد کی وجہ سے جو اسوقت برسر اقتدار ہیں کانگرس کی مقبولیت کم ہوتی جا رہی ہے

کانگرس کا مقصود ملک کو آزاد دیکھنا ہے اور سوائے اُن چند خود غرض افراد کے جو اپنے ضمیر کو محو کر چکے ہیں، سارا ہندوستان اس مسئلہ میں اس کا ہم آہنگ ہے لیکن یہ مقصد عظیم اسوقت تک حاصل نہیں ہو سکتا جب تک اکثریت اقلیت کا اعتماد حاصل نہ کرے اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب مذہبی تعصبات، قومی روایات اور ذاتی اغراض سے بلند ہو کر انسانی رواداری سے کام لیا جائے

اسوقت جن جن صوبوں میں کانگرس کی حکومت ہے، ان کے حالات کا مطالعہ کرنے کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہونچتے ہیں کہ کانگرس کے اُن افراد نے جو برسر اقتدار و حکومت ہیں، کانگرس کے حقیقی مقصود کو نظر انداز کر دیا ہے۔ ان کا احساس مذہبی اُبھر آیا ہے ان کا پندار اکثریت نمایاں ہو گیا ہے اور خصوصیت کے ساتھ مسلمانوں کے جذبات پامال کرنے میں انھوں نے کانگرس کے احکام اور انسانی اقتضاء دونوں کو پس پشت ڈال دیا ہے

لکھنؤ کے اجلاس کانگرس میں جسوقت پنڈت جواہر لال نہرو نے زبان کے متعلق اظہار رائے کرتے ہوئے

اس کو دوسرے درجہ کا مسئلہ ظاہر کیا تھا اسی وقت ہم نے کانگرس اور نیز پنڈت جی کو متوجہ کیا تھا کہ اگر وہ ہندو مسلم اتحاد چاہتے ہیں تو سب سے پہلے زبان کے مسئلہ کا فیصلہ کر دیں، کیونکہ اگر ہندو سنسکرت کے ثقیل الفاظ استعمال کرنا ترک نہ کریں گے تو مسلمانوں سے یہ توقع رکھنا کہ وہ اُردو کو عربی فارسی الفاظ سے پاک کر دیں مہمل سی بات ہوگی۔

یقیناً اس کے بعد مہاتما گاندھی اور پنڈت جی نے چند بیانات ایسے شائع کئے جن سے معلوم ہوتا تھا کہ اس مسئلہ کی اہمیت ان پر واضح ہو گئی ہے اور ایک مشترک زبان "ہندوستانی" کے رواج کو اپنے مقاصد میں شامل کر کے اس فتنہ کا سدباب کرنا چاہتے ہیں، لیکن افسوس ہے کہ کانگرس حکومتوں نے اس پر مطلق عمل نہیں کیا اور اس سے زیادہ افسوسناک امر یہ ہے کہ ہائی کمانڈ نے بھی ان سے کوئی بازپرس نہیں کی

میں کانگریسی خیال کا آدمی ہوں اور ہمیشہ میں نے اس کی حمایت کی ہے، لیکن میرے نزدیک کانگرس نام کسی خاص شخص کا نہیں ہے، اور اس لئے اگر کوئی کانگرسی مقصد کانگرس کے خلاف قدم اٹھاتا ہے تو ہمارا فرض ہے کہ ہم اس سے بازپرس کریں خواہ وہ کسی حکومت کا وزیر ہی کیوں نہ ہو

حال ہی میں ڈاکٹر گوکل چند نے شملہ کے اجلاس "ہندی ساہتیہ سمیلن" میں کتنی معقول بات کہی ہے کہ ہندی اور ہندوستانی فی الحقیقت دونوں ایک ہی چیز ہیں اور بنارس اسکول کی یہ کوشش کہ ہندی میں سنسکرت الفاظ کا استعمال زیادہ کرنا چاہئے قابل ملامت حرکت ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اُردو کے حامی جو اس کو سادہ بنانے کی کوشش کر رہے ہیں پھر عربی و فارسی کے الفاظ شروع کر دیں گے اور ان کا یہ طرز عمل یقیناً حق بجانب ہوگا۔

مشترک زبان کے باب میں سب سے پہلی اُصولی بات جس پر ہندو مسلمانوں دونوں کا اتفاق ہونا چاہئے یہ ہے کہ ملک کی زبان سے مراد وہ زبان ہے جس کو دونوں فریق آسانی سے سمجھ سکیں اور اسی اُصول کی بنا پر کانگرس نے "ہندوستانی" کے رواج کی تجویز کی۔ اس میں سوال نہ عربی فارسی الفاظ کا ہے نہ سنسکرت کا۔ اگر عربی فارسی کا کوئی لفظ ایسا ہے جسے سب آسانی سے سمجھ سکتے ہیں تو اس کے نکالنے کی کوئی وجہ نہیں اور اگر ثقیل عربی یا فارسی لفظ کی جگہ اس سے زیادہ آسان لفظ ہندی کا ملسکتا ہے تو اس کے اختیار کرنے میں مسلمانوں کو کوئی عذر نہ ہونا چاہئے

اب اسی اُصول کو سامنے رکھ کر آپ شہر یا گاؤں میں جا کر تحقیق کیجئے تو معلوم ہوگا کہ عربی فارسی کے بہت سے الفاظ لوگوں کی زبان پر چڑھے ہوئے ہیں اور خصوصیت کے ساتھ قانونی الفاظ تو تمام تر عربی فارسی کے ہیں جن کا مفہوم ہر شخص کے ذہن نشین ہو چکا ہے، اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ ان کی جگہ دوسرے الفاظ وضع کئے جائیں۔ کوئی شخص ایسا نہیں جو صوبۂ متحدہ یا یو۔پی کے الفاظ کو نہ سمجھتا ہو لیکن کوشش کی جا رہی ہے کہ اس کی جگہ "سنکیت پرانت" لکھا جائے، ان تمام باتوں سے ہمیں اس ذہنیت کا پتہ چلتا ہے جو ان لوگوں کے اندر کام کر رہی ہے اور اس کا نتیجہ کبھی مفید نہیں ہو سکتا

میں دیکھ رہا ہوں کہ اسی زبان کے مسئلہ میں ہندوستان کے تمام مسلمان خواہ وہ کانگرس سے متعلق ہوں یا مسلم لیگ سے متفق الخیال ہوتے جا رہے ہیں اور اگر کسی وقت مسلمانوں کی پوری جماعت کانگرس سے بالکل علحدہ ہو گئی تو اس کی ذمہ داری نہ مسٹر جینا پر ہوگی نہ مسٹر شوکت علی پہ بلکہ خود کانگرس کے اُن ہندو افراد پر جو ہائی کمانڈ کی منشاء کے خلاف کانگرس کی تحریک کو محدود دنا مقبول بناتے جا رہے ہیں

اُردو ڈے

لکھنؤ کی انجمن بہار ادب نے جو اودھ کی نہایت مقتدر انجمن ہے اپنے ایک جلسہ میں تجویز پیش کی ہے کہ موجودہ ہندی اُردو نزاع کے باب میں ہندوستان کے تمام مسلمانوں کو متفقہ طور پر اپنی آواز بلند کرنا چاہئے اور زبان کو ثقیل بنانے کے لئے سنسکرت الفاظ کا استعمال جو " ہندوستانی " میں عام ہوتا جا رہا ہے، اس سے اُردو کو محفوظ رکھنے کے لئے ایک آل انڈیا تحریک بروئے کار لانا چاہئے چنانچہ ایک سب کمیٹی مقرر کی گئی ہے جو ان مسایل پر غور کر کے اپنی رپورٹ پیش کریگی۔ اسی کے ساتھ یہ بھی طے پایا ہے کہ آیندہ نومبر کی کوئی تاریخ مقرر کر کے تمام ہندوستان میں " یوم اُردو " منایا جائے اور جلسے کر کے صوبوں کی حکومتو اور کانگرس ہائی کمانڈ کو توجہ دلائی جائے کہ بعض ناعاقبت اندیش ہندوؤں کا سنسکرت کے ثقیل الفاظ کے استعمال پر زور دینا سخت نامناسب حرکت ہے۔ چونکہ اس تحریک کو عام کرنے کے لئے ضرورت ہے کہ ہندوستان میں جہاں جہاں اُردو انجمنیں قایم ہیں ان سب کو " یوم اُردو " منانے میں شریک کیا جائے اس لئے استدعا کی جاتی ہے کہ ایسی تمام انجمنیں اپنے اپنے پتے سکریٹری صاحب انجمن بہار ادب لکھنؤ یا براہ راست دفتر " نگار " کو لکھ بھیجیں تاکہ یہاں سے ان کو ایجنڈا اور تمام ضروری لٹریچر بھیجدیا جائے اور پورے اتحاد عمل کے ساتھ یوم اُردو منایا جائے۔

حیات و آغاز حیات

جس طرح ہمیں یہ نہیں معلوم کہ "زندگی کیا ہے" اسی طرح ہم اس سے بھی ناواقف ہیں کہ "اس کا آغاز کیونکر ہوا" ہم یہ بھی نہیں جانتے کہ سوائے کرۂ زمین کے فضا میں اور کہاں آثار حیات پائے جاتے ہیں اور خود ہمارے کرہ میں حیات کی ابتدا کب اور کیونکر ہوئی

عہد قدیم کا انسان اس سوال کے مختلف جوابات اپنے دماغ میں رکھتا تھا، لیکن ان سب میں ایک غیر انسانی آسمانی قوت کے احساس کا جذبہ کارفرما تھا اور اس کا یہ اعتقاد "قبضۂ قدرت" کے خیال پر قایم تھا۔ اسی قبضہ و قدرت کے ختم ہو جانے کا نام اس نے موت رکھا تھا اور جب انسان مرجاتا تھا تو وہ سمجھتا تھا کہ کسی غیر معلوم قوت کا قبضہ اس پر ہو گیا ہے

ہندوستان کی قدیم اصطلاحات میں دو لفظ ہم کو ملتے ہیں پران اور آتما جن کے معنے مختلف ہیں۔ پران سے مراد وہ قوتِ حیات ہے جو ہر جاندار شے میں پائی جاتی ہے اور آتما سے مراد ان کی یہ تھی کہ ہر انسان میں "حیات کلی" پائی جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس سے حیات کی حقیقت پر کوئی روشنی نہیں پڑتی، اور نہ اس عہد ترقی میں بھی کوئی فیصلہ کن جواب اس سوال کا دیا جا سکا ہے (کیونکہ مظاہر حیات کا براہ راست مطالعہ ناممکن ہے) تاہم اس مسئلہ پر عقلی گفتگو کا سلسلہ ختم نہیں ہوا ہے اور نہ ہونا چاہئے۔

سنٹ آگسٹاین نہ علم الحیات (بیالوجی) سے واقف تھے نہ علم الکیمیا (کیمسٹری) سے لیکن اس نے محض اپنی عقل و فراست سے کام لیکر یہ نظریہ پیش کیا کہ "حیات کا وجود بے جان مادہ سے ہوا ہے"

تولید غیر ارادی

کئی صدی کا زمانہ گزرا کہ لوگوں نے "تولید غیر ارادی" (Spontaneous generation) کے نظریہ کو مان لیا تھا۔ اس نظریہ کے مطابق حیات کا بیجان مادہ سے پیدا ہونا تسلیم کیا گیا تھا۔ انجیل میں لاش سے شہد کی مکھیوں کی پیدائش کا ذکر پایا جاتا ہے اور یہ بات مشہور ہے کہ تلسی کے پھول کو کچل کر کسی ظرف میں بند کر دیجئے تو بچھو پیدا ہو جائیں گے۔ اسی طرح سڑے ہوئے گوشت سے پسوؤں کا پیدا ہونا بیان کیا جاتا ہے۔ لیکن اس نظریہ کو پاسٹیور اور ٹنڈال نے غلط ٹھہرا دیا اور اب یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ تولیدِ حیات جراثیم سے ہوتی ہے جو ہمیں نظر نہیں آتے اور اسی بنا پر علم الجراثیم (بیکٹیریالوجی) وجود میں آیا جس کا مقصود جراثیم کی تحقیق ہے

رہا یہ مسئلہ کہ حیات کا آغاز کب سے ہوا، سو اب تک اس کا کوئی معقول جواب نہیں دیا گیا۔ پالنس ہیمیا کا نظریہ یہ ہے کہ

حیات اتنی ہی قدیم ہے جتنا مادہ، اور آفرینش کی ابتدا ہی سے کرۂ زمین پر کاروبار حیات شروع ہو گیا ہے، لیکن کرۂ زمین کی ابتدائی ساخت: آب و ہوا اور درجۂ حرارت کو سامنے رکھ کر یہ یقین کرنا مشکل ہے کہ اسوقت وہاں حیات کا وجود پایا جاتا ہے، کیونکہ اسوقت نہ آکسیجن پائی جاتی تھی اور نہ سمندر بنے تھے

عام طور پر یقین کیا جاتا ہے کہ جس وقت کرۂ زمین ٹھنڈا ہوتے ہوتے اس قابل ہوا ہوگا کہ اس میں حیات کا وجود نشو و نما پائے وہ دفعتہً پیدا ہو گئی ہوگی۔ بعض کہتے ہیں کہ درجۂ حرارت، دباؤ، پانی میں بعض نمکوں کا پایا جانا اور سمندر کے اوپر فضا میں بعض گیسوں کا وجود، یہ سب تخلیق حیات کا باعث ہوئی ہیں۔ بعض کا خیال ہے کہ سرد پانی پر آفتاب کی حرارت و روشنی پڑنے سے زندگی وجود میں آئی، ڈاکٹر اسرہیڈنگ کہتے ہیں کہ جب کرۂ زمین کی گرم گرم کیچڑ پر پہلا چھینٹا بارش کا ہوا اسوقت زندگی کے آثار پیدا ہوئے اور یہ قطبین کے اولین موسم سرما میں ہوا ہوگا

لارڈ کلون کا اعتقاد ہے کہ کرۂ زمین پر حیات کا باعث شہاب ثاقب ہوئے ہیں، یعنی ہمارے کرہ میں زندگی کے جراثیم دوسرے کروں سے منتقل ہو کر آئے ہیں۔ دنیا کے نہایت مشہور سائنس داں ڈاکٹر کرائل کا بیان ہے کہ زندگی کا وجود برقی قوت کا ممنون ہے۔ [illegible] ڈاکٹر موصوف نے تجربہ کر کے معلوم کیا کہ ۱/۲ وولٹ کے برابر اس میں برقی تغیر ہوتا رہتا ہے۔ یہ تو معلوم ہی ہے کہ انسان کی ہر عضلاتی حرکت سے برقی قوت خارج ہوتی ہے اور جسم انسانی سے ہر وقت برقی رو نکلتی رہتی ہے۔ ایک جانور بجلی کے ذریعہ سے ہلاک کر کے خاک کر دیا گیا، ڈاکٹر مذکور نے اس کے نسیج Brain
(tissues) کی راکھ سے ایسے خلایا پیدا کر لئے جن میں آثار حیات کا پتہ چلتا تھا

بہر حال زندگی کا آغاز کسی طرح ہوا ہو، یہ یقینی ہے کہ وہ مادۂ حیات کی نہایت ہی سادہ صورت میں رہا ہوگا۔ عناصر تو جاندار اور بیجان چیزوں میں یکساں ہیں لیکن ایک جاندار جسم کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ خود اپنے آپ کو ابھارتا ہے۔ مطلق حیات کے وجود کے لئے صرف پانی ضروری ہے لیکن زیادہ ترقی یافتہ حیات کے لئے آکسیجن کا پایا جانا بھی لازم ہے کرۂ زمین کی ابتدائی حالت میں آکسیجن کا وجود نہیں پایا جاتا تھا۔ بعد کو جب درختوں کا نشو و نما یہاں ہوا تو ان سے آکسیجن پیدا ہوئی جس نے سمندروں کے کھاری پن سے مل کر حیات کی ترقی میں بڑی مدد کی

چونکہ بقاء حیات کے لئے ایک قایم درجۂ حرارت کی بھی ضرورت ہوتی ہے جو طبقات الارض کے اندر انقلابات ہونے کی وجہ سے گھٹتا بڑھتا رہتا ہے، اس لئے انجمادی دور کے بعد پہاڑوں کی تخلیق نے بھی حیات کی ترقی میں بڑی مدد کی ہوگی

خود انجمادی دور میں تو زمین کے برف پوش ہونے کی وجہ سے کسی حیات کا امکان نہ تھا لیکن جب اس انجمادی دور میں پندرہ پندرہ کروڑ سال کے وقفہ سے آٹھ انقلاب رونما ہوئے اور ہر انقلاب کے وقت کچھ پہاڑ وجود میں آئے کچھ نئے سمندروں نے زمین کے بعض حصوں کو ڈھک لیا اور پھر زمین نے پانی کو پیچھے ہٹا دیا تو اس کشمکش کے ردعمل سے تخلیق

لہ (Amoeba) ایک قسم کا خردبینی کیڑا جو ہمیشہ اپنی شکل بدلتا رہتا ہے

حیات میں بہت مدد ملی

زندگی کا اولین ظہور

کرۂ زمین پر سب سے پہلے حیات کا ظہور کس صورت میں ہوا۔ اس کے متعلق مختلف نظریے قائم کیے گئے ہیں۔ بعض ماہرین سائنس کا خیال ہے کہ اول اول اس کا آغاز مادہ حیات کے قطروں کی صورت میں ہوا جن میں سے اکثر فنا ہو کر چند باقی ماندہ قطروں کی غذا بن گئے

بعض ماہرین کا خیال ہے کہ جب کیمیاوی مادوں پر فوق البنفسجی شعاع پڑی تو ان سے نباتاتی حیات سب سے پہلے پیدا ہوئی۔ بہرحال صورت جو بھی رہی ہو نتیجہ ایک ہی نکلتا ہے یعنی یہ کہ زندہ سالمے ([illegible]) موجود تھے جن میں محرکات خارجی کے رد عمل سے نشو و نما پانے کی صلاحیت پائی جاتی تھی

نفس کی پیدائش

آغاز حیات کے مسئلہ کو نفس کے وجود نے زیادہ پیچیدہ بنا دیا اور سوال یہ پیدا ہوا کہ کیا تمام جاندار اشیاء نفس رکھتی ہیں اور یہ کہ نفس و حیات کیا ایک ہی چیز ہیں۔ تحقیق سے ثابت ہے کہ نفس خود شعور (Self Conscious) صرف انسان میں پایا جاتا ہے اور جانداروں میں تحت شعوری (Sub Conscious) قسم کا نفس پایا جاتا ہے۔ ایک نوزائیدہ انسانی بچہ بھی نفس رکھتا ہے اور گھریلو جانور بھی۔ چیونٹیوں کی طرح سے جو حرکت عمل ظاہر ہوتی ہے وہ خالص حیات ہی سے تعلق نہیں رکھتی۔ اسی لیے بعض ماہرین سائنس نے دماغی حرکت عمل اور ان اعصابی حرکات کو جو برقی رو پیدا کرتے ہیں ایک ہی چیز قرار دیا ہے۔ یہ ثابت ہو چکا ہے کہ اکثر و بیشتر اعصاب کی حرکت سے برقی رو پیدا ہوتی رہتی ہے اور ضایع ہوتی رہتی ہے لیکن بعض مثالیں اس کے خلاف بھی پائی جاتی ہیں، مثلاً ایل (ایک قسم کی مچھلی بام کی طرح) کہ جو برقی رو اس کے اعصاب کی حرکت سے پیدا ہوتی ہے اس سے وہ فایدہ بھی اٹھاتی ہے۔ اسی طرح ممکن ہے کہ مادہ کی تبدیلیاں دماغ سے برقی رو پیدا کرتی ہوں اور جاندار اشیاء اس سے فایدہ اٹھاتی ہوں جس کا ہم نے دوسرا نام نفس (Mind) رکھا ہے

مادۂ حیات

بہرحال زندگی اپنا آغاز مادہ حیات (Protoplasm) سے کرتی ہے اور یہی اس کے جسمانی وجود کا باعث ہوتا ہے۔ یہ ایک نیم رقیق سا مادہ ہے۔ سادہ، بیرنگ لیکن بے انتہا کیمیاوی پیچیدگیاں رکھنے والا۔ یہ ماحول کی بیجان چیزوں سے غذا حاصل کر کے نشو و نما پاتا ہے۔ وہ حساس بھی ہے، خارجی حالات سے اس میں رد عمل بھی ہوتا ہے، بجلی کی قوت اور روشنی سے متاثر ہوتا ہے اور اعضا اس سے پیدا ہوتے ہیں۔ اس کا ایک غلاف یا خلیہ (Cell) ہوتا ہے جس میں وہ ٹھہرا رہتا ہے

انسان کا بار آور بیضہ (Ovum) $\frac{1}{125}$ انچ کا قطر رکھتا ہے اور اس خلیہ کے چاروں طرف اور بہت سے خلایا جمع ہو ہو کر مختلف حالتوں میں تبدیل ہوتے رہتے ہیں

جسم انسانی میں یہ بیضہ یا خلیہ تین خلایا میں تقسیم ہو جاتا ہے، پہلے میں دماغ، حرام مغز، آنکھ، ناک، کان اور پوست

کی تشکیل ہوتی ہے، دوسرے درمیانی خلیہ سے گردے، اعصاب، ہڈی کا ڈھانچہ اور دورۂ خون کا نظام وجود میں آتا ہے اور تیسرے خلیہ سے جگر اور مختلف غدود پیدا ہوتے ہیں۔ دوران تشکیل میں خلایا اپنی مدور صورت چھوڑ دیتے ہیں اور اعضاء کی ساخت کے لحاظ سے Tissues بننا شروع ہوتے ہیں۔ اسی طرح دماغ اور خون کے خلایا میں بھی تبدیلی پیدا ہوتی ہے

خون کے خلیات دو قسم کے ہیں۔ سرخ اور سفید۔ سرخ ذرات خون دوسرے خلیات کو اپنی غذا بنا کر نشو و نما پاتے ہیں، سفید ذرات ہمیشہ اپنی مدور صورت میں رہتے ہیں اور تنفس میں مدد دیتے ہیں۔ سرخ ذرات بھی ہڈیوں کے مغز میں پیدا ہوتے ہیں اور جب بیکار ہو جاتے ہیں تو طحال (تلی) میں جاکر فنا ہو جاتے ہیں

دماغ کے خلیات میں عجیب و غریب تغیر ہوتا ہے۔ جسم انسانی کے تمام اعضاء اعصاب کے ذریعہ سے ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں اور ان اعصاب کا تعلق دماغ کے خلیات سے ہے

مادۂ تشکیل حیات

الغرض زندگی کا وجود مادہ سے ہوا ہے اور جاندار و بیجان مادہ کی کیمیاوی ترکیب میں کوئی فرق نہیں ہے، اسی لئے انسانی زندگی غیر فانی خیال کی جاتی ہے اور موت نام ہے صرف حوادث کا

ماہرین فن مادۂ حیات کے بنانے میں کامیاب ہو گئے ہیں اور امید کی جاتی ہے کہ ایک نہ ایک دن وہ اسے اس قابل بنا سکیں گے کہ حیات کا نشو و نما اس سے ہو سکے۔ مرنے کے بعد انسان کے بعض حصے زندہ رہتے ہیں، چنانچہ موت کے بعد بالوں اور ناخنوں کا بڑھنا تو مشاہدہ ہی ہے۔ ایک ڈاکٹر نے کتے کا سر کاٹ کر تین دن تک اسے زندہ رکھا، ایک ڈاکٹر موت کے بعد قلب انسانی کو ۳۰ گھنٹے تک زندہ رکھنے میں کامیاب ہوا۔ ایک اور ڈاکٹر نے ایک چوزے کے دل سے خلیات کو علحدہ کیا اور بیس سال سے یہ اس کے پاس زندہ موجود ہیں، اس کے پاس چوہوں اور انسانوں کے زندہ خلیات بھی محفوظ ہیں، البتہ دماغ کے خلیات کو زندہ رکھنے میں ابتک کامیابی نہیں ہوئی

ڈاکٹر کیرل کا بیان ہے کہ "موت ایک قیمت ہے جو ہم دماغ کے عوض میں ادا کرتے ہیں ورنہ انسان کا گوشت و پوست یقیناً غیر فانی ہے۔ دماغ سخت قاتل و مہلک چیز ہے جو اپنے مقبوضات ہی کو آخر کار فنا کر ڈالتا ہے"

چونکہ بیجان مادہ کیمیاوی طریقہ سے پیدا ہو کر حرکت و عمل میں آنے لگا، اس لئے قدرت کے ساتھ انسان کی جنگ نصف ختم ہو گئی ہے۔ اب رہا دماغ کے خلیات پیدا کر کے نفس انسانی کو وجود میں لانا، سو اس کے متعلق کچھ نہیں کہا جا سکتا، ہو سکتا ہے کہ یہی مسئلہ انسانی شکست کا باعث ہو

جوش کے کلام کی خصوصیات

فرد اور سوسائٹی کا مختلف فیہ مسئلہ آج تک ماہرینِ عمرانیات کے مابین زیرِ بحث چلا آتا ہے۔ اگر ایک طرف حامیانِ اجتماعیت فرد کو کلیتاً سوسائٹی کا محتاج قرار دیتے ہیں تو اس کے بالکل برخلاف معتقدینِ انفرادیت اس امر کے قائل ہیں کہ سوسائٹی فی الحقیقت کوئی چیز نہیں، صرف افراد کے باعث اس کا قیام و وجود ہے لہٰذا وہ فرد کو اصل قرار دیتے ہیں اور سوسائٹی کو فرع متصور کرتے ہیں۔ امر واقعی کچھ بھی ہو لیکن اس میں شک نہیں کہ چونکہ انسان فطرتاً متمدن پیدا واقع ہوا ہے لہٰذا وہ اپنی حیات کے مختلف پہلوؤں کے اتمام کے لئے خواہ مخواہ سوسائٹی کا محتاج ہے۔

اس ضمن میں شعراء کے متعلق بھی مختلف آراء ہیں یعنی یہ کہ ان کے رجحانات و ذہنیات سوسائٹی کے ماتحت ہوتے ہیں یا وہ خود اپنے خیالات کی تبلیغ و اشاعت سے سوسائٹی کو متاثر کر لیتے ہیں۔ عربی شاعری میں ایسے سحر بیان شعراء اور خطباء کی مثالیں بکثرت ملیں گی جن کی صرف ایک جنبشِ لب کی بدولت عظیم الشان قبائل میں مستقل محاربات جاری ہو گئے۔ دو ہم آہنگ قبائل میں اختلاف و افتراق پیدا کر دینا یا بچھڑے ہوئے دو قبیلوں کو رشتۂ موانست میں پیوست کر دینا شعرائے عرب کی شاعری کا ادنیٰ کرشمہ تھا۔ لیکن ہماری شاعری میں فی الحقیقت ایسی مثالیں مفقود ہیں۔ آزاد و حالی جنھیں اردو کی قومی شاعری کے معلمین اوّل میں شمار کیا جاتا ہے رفتارِ زمانہ کی ہم آہنگی کرتے ہوئے سوسائٹی کے جدید رجحانات کے آئینہ دار تھے نہیں تھا کہ وہ اپنا ذاتی پیغام یا کوئی مخصوص تحریک سوسائٹی کی بہبودی کی خاطر پیش کر کے اس میں کامیاب ہوئے ہوں۔

حقیقت یہ ہے کہ شاعر، سوسائٹی کے نظام کے حدود کے اندر رہ کر بھی یک گونہ انقلاب پیدا کر سکتا ہے، خواہ وہ سیاسی انقلاب ہو یا ذہنی، یا مذہبی، یا ادبی۔

جوش کو بھی "شاعرِ انقلاب" کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس کے کلام کی انقلابی روح اور اس کے پیغام پر ہم ایک علحدہ مقالہ میں بحث کریں گے۔ سرِ دست ہمارا ارادہ ہے کہ جوش نے لٹریچر اور ادبیات میں جو انقلاب پیدا کیا ہے اس پر ایک مجمل لیکن اصولی بحث کرنے کے بعد دیکھیں کہ اس کے شاعرانہ کمالات کیا ہیں۔ لیکن اس امر سے پہلے ہم کو جوش کے نظریۂ شاعری پر ایک نظر ڈال لینا چاہئے۔

جوش کا نظریۂ شاعری علمائے فصاحت کا قول ہے کہ شعر وجدانی شے ہے۔ اس کا تعلق انسان کے جذبات و

احساسات سے ہے۔ اگر کوئی حساس شخص جس کو قدرت نے شعریت کا مادہ بھی ودیعت کیا ہو، اپنے احساسات، جذبات اور کیفیاتِ باطنی کو موزوں کلام کی صورت میں ادا کرے تو اس کو ہم شاعری سے تعبیر کرتے ہیں۔ جوش نے شاعری کی جو تعریف کی ہے وہ بھی فنی اعتبار سے "قولِ فیصل" کا مرتبہ رکھتی ہے۔ فرماتے ہیں :-

شعر کیا ؟ جذبِ دروں کا ایک نقشِ ناتمام ! مشتبہ سا اک اشارہ، ایک مبہم سا کلام
ایک صوتِ خستہ و موہوم، سازِ ذوق کی ! مرتعش سی ایک آواز انتہائے شوق کی !!

یہ ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ شاعر اپنی کیفیاتِ باطنی کو الفاظ میں کماحقہ ظاہر نہیں کر سکتا۔ اسی لئے جوش نے اسکو "جذبِ دروں کا نقشِ ناتمام" اور "سازِ ذوق کی صوتِ خستہ و موہوم" سے تعبیر کیا۔ لیکن یہ امر مسلّم ہے کہ شاعری احساسات وجذبات کی مصوری کا نام ہے۔ اسی نظریہ کو ایک دوسری جگہ فرماتے ہیں :-

چھپائے رہتے ہیں جو شاعر کے دلِ سرشار پر لوٹ کر آتے ہیں وہ نغمے لبِ گفتار پر

ذرا مختلف الفاظ میں یہی مفہوم ملاحظہ ہو :-

میں زمیں پر مصحفِ احساس کی تصویر ہوں

غالباً انھیں باتوں کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے بعض اہلِ فن نے یہ نظریہ پیش کیا ہے کہ شعر و شاعری کا تعلق قلب[1] انسانی سے ہے اس کو دماغ سے منسوب کرنا حقیقتاً شعر کا خون کر دینا ہے، یا جیسا کہ جوش کہتا ہے :-

دماغوں پر کھلیں ہم کیا کہ ہم کو وہ سمجھے گا جو دل کا راز داں ہے !

اسی خیال کی مزید تصریح اس طرح کی ہے :-

کھلتے نہیں ہیں جوش دماغوں پہ دل کے راز بالاتر از رسائیِ نقد و نظر ہیں ہم !

"نقاد" کے متعلق جوش نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے ان میں بھی اسی نظریہ کی جھلک نظر آتی ہے بعض اشعار ملاحظہ کیجئے :-

رحم ! اے نقادِ فن، یہ کیا ستم کرتا ہے تو ؟ کوئی نوکِ خار سے چھوتا ہے نبضِ رنگ و بو ؟
شاعری اور منطقی بحثیں، یہ کیسا قتلِ عام ؟ برشِ مقراض کا دیتا ہے زلفوں کو پیام !!
کیوں اٹھا ہے جنسِ شاعر کے پرکھنے کے لئے ؟
کیا شمیم سنبل و نسریں ہے چکھنے کے لئے ؟

اس کے بعد نہایت جھنجھلا کر کہتا ہے :-

تیری دنیا اور ہے، شاعر کی دنیا اور ہے !!

---

[1] کیا قلب دماغ سے علحدہ کوئی متمائز قوتِ احساس رکھتا ہے۔ (اڈیٹر)

اس تمام بحث سے ظاہر ہو گیا کہ جوش کے نزدیک شعر کو حسیات قلبی سے تعلق ہے نہ کہ دماغ سے اور محسوسات نفس کی ترجمانی ہی کا نام شاعری ہے

شاعر کی خصوصیات یہاں تک تو صرف نفس شاعری سے بحث کی گئی ہے لیکن اس سلسلہ میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ شاعر کا فریضہ حقیقی کیا ہے؟ - اس میں کن کن خصوصیات کا جمع ہونا لازمی ہے اور اور اس کا تعلق کن موجوداتِ عالم سے ہے؟ سب سے پہلے ہمیں آخری سوال پر بحث کرنی چاہئے کیونکہ واقعۃً دوسرے سوالوں کا اسی پر دارومدار ہے

شاعر کی دنیا جوش کے نزدیک تمام عالم سے شاعر کو براہ راست تعلق حاصل ہے اور وہ اپنی مرضی کے مطابق اسکا مطالعہ کرتا رہتا ہے - بقول نظیری :-

بزیرِ ہر بنِ مو چشم روشنیست مرا | بروشنائی ہر ذرہ روزنیست مرا

یا جیسا کہ جوش خود کہتا ہے :-

رقص کرتا ہے نظامِ دہر میرے ساز پر | کاروانِ روح چلتا ہے مری آواز پر
ناز سے گلشن میں چلتی ہے ہوا میرے لئے | جھوم کر آتی ہے ساون کی گھٹا میرے لئے!
حسن کو بخشے گئے ناز و ادا میرے لئے | ساز سے باہر نکلتی ہے صدا میرے لئے!

شاعر کی تعریف اس طرح کی ہے :-

راستے کا ذرہ ذرہ جس کو دیتا ہو صدا | "نظم کرتا جا مجھے بھی شاعرِ رنگیں نوا!!"

اکثر بیانیہ امور کو استفہامیہ طرز میں ادا کرنے سے ان کا حسن اور اثر دوبالا ہو جاتا ہے - جوش اس نکتہ کو بخوبی سمجھے ہوئے ہے چنانچہ مذکورہ صدر بحث پر محاکمہ کرتا ہے :-

وہ کون منظرِ قدرت ہے آج عالم میں | جو میرے واسطے آغوش وا نہیں کرتا؟

شاعر کے فرائض اس تمہید کے بعد ہم کو دیکھنا چاہئے کہ جوش کے نظریۂ شاعری کے مطابق ایک شاعر کے کیا کیا فرائض ہیں یورپین مصنفین نے لٹریچر کی یہ تعریف کی ہے کہ وہ ایک ایسا آئینہ ہے جس میں حیات انسانی منعکس نظر آتی ہے - جوش کو اس نکتہ کا پوری طرح احساس ہے لکھتا ہے :-

جس کے دفتر میں ہے اُس کے عہد کی ہر ایک بات | موسم و ماحول و رسم و راہ و آئین و حیات
جو ایک ایسا آئینہ ہو سُشاہراہ دقت پر | چہرۂ ہستی کے خال و خد ہوں جس میں جلوہ گر

انسانی جذبات و احساسات مختلف ہوا کرتے ہیں - خوشی و مسرت، غم و اندوہ، لذت و کیف کی مختلف صورتیں ہیں اور

ان میں سے ہر ایک کی جزئیات اس قدر کثرت سے جمع کی جا سکتی ہیں کہ شاعری کا میدان بیحد وسیع نظر آتا ہے۔ لیکن سُوءِ اتفاق سے ہمارے شعراء نے صرف عشق و محبت کو لیکر اس پر لاتعداد دواوین مرتب کر ڈالے۔ جوشؔ کو اس سے سخت اختلاف ہے۔ شاعر کی تعریف کے ضمن میں اس امر کی جانب بھی اشارہ کر دیا ہے :-

چند شعبوں ہی میں گم ہو سکے نہ پائے جسکی ذات،
جس کا موضوعِ سخن ہو کُل نظامِ کائنات !

ایک اس سے بھی زیادہ دلچسپ امر ملاحظہ فرمائیے۔ یہ ایک نفسیاتی مسئلہ ہے کہ ہر بشر کی ذہنیت دوسرے بشر سے مختلف ہوتی ہے اسی طرح اس کے جذبات بھی دوسرے بنی نوع انسان سے علحدہ ہونا چاہئیں۔ لیکن چونکہ ہماری شاعری کی بنا یکسر فارسی کی کورانہ تقلید پر قائم ہے، اس لئے آپ کسی اردو شاعر کے کلام کا مطالعہ کرنے سے یہ نہیں اندازہ لگا سکتے کہ اس کے رجحانات اور اس کے معاصرین کے رجحانات میں کیا فرق تھا۔ اس کے نظریے کیا تھے اور اس کی زندگی کن حوادث کے ماتحت بسر ہوئی مگر جوشؔ اس لایعنی تقلید کا قائل نہیں۔ اُس کے نزدیک ایک شاعر کا کلام ایسا ہونا چاہئے کہ :-

جوہر بن کر جس کے ہر نقطے سے جھلکے اس کا نام
جس کی سیرت کو مدوّن کر سکے اس کا کلام،

موجودہ متغزلین کے متعلق جوشؔ نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے ممکن ہے بعض اصحاب ان کو سنکر چراغ پا ہوں لیکن ذرا دل پر ہاتھ رکھئے اور فیصلہ کیجئے کہ کیا اس کے یہ اشعار حرف بحرف صحیح نہیں ہیں ؟

ان غزلگویوں کا ہے معشوق ایسا نازنیں،
نام جس کا دفترِ مردم شماری میں نہیں

یہ فقط رسمی مُقلّد وامق و فرہاد کے
مر رہے ہیں آج تک معشوق پر اجداد کے !

ان کی سیرت ہے انوکھی، ان کی غیرت ہے عجیب
گو نہیں جاتے حیا سے یہ اب و جد کے رقیب ! !

آج تک غالب ہے ان پر وہ رقیب روسیاہ
کر چکا ہے زندگی جو میرؔ و مومنؔ کی تباہ !

پائی ہے ترکے میں، ان لوگوں نے بہرے، ہر صدا
ان کے لب پر بھی وہی ہے جو ولیؔ کے لب پہ تھا،

بالآخر کہتا ہے :-

سلسلہ ان کے سخن کا دور تک ہوتا نہیں،
کون ہے ان میں جو بالآخر "گرگٹ" ہوتا نہیں؟

قلب ان کا قطرۂ شبنم تو ہے، چھالا نہیں
کوئی ان میں زندگی کا دیکھنے والا نہیں ! !

آخری مصرع سے واضح ہے کہ جوشؔ کیوں ان "نقالوں" کو بنظرِ استخفاف دیکھتا ہے اور شاید انھیں اسباب کی بنا پر مولوی عظمت اللہ خاں مرحوم نے آج سے ۲۰ سال قبل غزل کی موت کا حکم صادر کر دیا تھا

جوشؔ کی شاعری

متذکرۂ بالا بحث سے یہ تو ظاہر ہو گیا ہو گا کہ جوشؔ کے نزدیک ایک شاعر میں کیا کیا صفات لازمی ہیں اب ہم کو دیکھنا چاہئے کہ اس کی شاعری کے محاسن کیا ہیں، اس کی خصوصیاتِ کلام کیا ہیں اور وہ ان میں کس حد تک کامیاب ہے

محاکات

محاکات کے لغوی معنی ہیں " باہم حکایت کرنا " لیکن اصطلاح شاعری میں اس فن کو محاکات سے تعبیر کرتے ہیں جس کے ذریعہ سے مناظر قدرت، کیفیات باطنی، احساسات قلبی اور دوسرے مواقع کی ہوبہو تصویر کھینچ دی جائے۔ بیان کو پڑھتے ہی نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر جائے۔ یہ صفت درحقیقت ضروریات شاعری میں ہے۔ قدرت نے جس شاعر کو اس کا جس قدر وافر حصہ ودیعت کیا ہے اتنی ہی اس کی شاعری بھی مستحسن و بلند ہے۔ جوشؔ اس میدان میں کس حد تک کامیاب ہے۔

مطابقت بہ اصل

تصویر کی خوبی یہ ہے کہ وہ اصل سے بالکل ملتی جلتی ہو اسی تخصیص کے باعث تصویر میں ایک خاص دلاویزی پیدا ہو جاتی ہے، نظر ڈالتے ہی ایک لطف و سرور کی کیفیت کا احساس ہوتا ہے شاعری میں بھی یہ امر ملحوظ رکھنا از بس ضروری ہے مثلاً ایک حسینہ خواب نوشیں سے بیدار ہوئی ہے۔ یہ اس کی کس قدر صحیح تصویر ہے

پھیلا پھیلا آنکھ میں کاجل　　اُلجھا اُلجھا زلف کا بادل
نازک گردن، پھول سی ہیکل!　　سُرخ پپوٹے، نیند سے بوجھل!
یہ کون اُٹھا ہے شرماتا!

چوتھے مصرع کو ملاحظہ کیجئے، پڑھتے ہی ایک خاص کیفیت کا سماں آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے۔ پھر لکھتے ہیں:۔

نیند کی لہریں، گنگا جمنی　　جلد کے نیچے، ہلکی ہلکی،
آنچل ڈھلکا، مسکی ساری　　ہلکی مہندی، دھندلی بندی!
یہ کون اُٹھا ہے شرماتا!

ذہن میں اس کیفیت کا تصور کیجئے اور پھر ان اشعار سے تطابق کیجئے تو معلوم ہوگا کہ گر ہم اس حالت کی تصویر بھی دیکھیں تب بھی وہ کیف و انبساط نہیں حاصل ہو سکتا جو ان اشعار کے پڑھنے سے ہوتا ہے۔

ایک نظم کا عنوان ہے " حسن بیدار " اس کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جوشؔ کو فن محاکات میں فی الحقیقت عبارت تامہ حاصل ہے۔ بعض اشعار ملاحظہ ہوں:۔

انکسار حسن پلکوں کے جھپکنے میں نہاں　　نیم وا، بھاری آنکھوں سے مروت سی عیاں!
احترام عشق کی رو دلنشیں آواز میں　　ایک بھیکے پن کا سناٹا دیار ناز میں!!

اس کے بعد تو بس تصویر کھینچ دی ہے۔ لکھتا ہے:۔

چوڑیاں ڈھیلی، دلائی پر شکن، ماتھے پہ ہات　　لب پہ خشکی، رُخ پہ سوندھا پن، نظر میں التفات
ہلکی ہلکی جھلکیاں رخسار پر یوں نور کی　　جیسے گل پر صبح کاذب کی سہانی روشنی!

[illegible]

حقیقتاً یہ امر غیر ممکن ہے کہ جب کسی شے کی تصویر الفاظ کے ذریعہ سے پیش کی جائے تو تمام تفصیلات بیان میں آجائیں۔ ایک کامیاب شاعر کا کام یہ ہے کہ موقعہ و محل کی خصوصیات کا مطالعہ کرکے اہم نکات کو منتخب کرے اور جو ان کو دلآویز پیرایہ میں بیان کردے اور جو خلا رہ گئے ہیں ان کا پُر کرنا قارئین پر چھوڑ دے۔

جوشؔ کو اس فن میں کمال حاصل ہے وہ غیر ضروری واقعات کو نظر انداز کردیتا ہے اور صرف ان واقعات کو قلمبند کرتا ہے جو مطالعہ [illegible] سے قریبی تعلق رکھتے ہیں مثلاً ایک گاؤں کی لڑکی کا نقشہ یوں پیش کیا ہے:۔

خورشید اک طرف نمایاں نقش		رکھے رخسار کو ہتھیلی پر
سر پہ آنچل پڑا ہے ساری کا		داہنے ہاتھ میں ہے جس کا سرا
نرم گردن میں خم، کلائی میں بل		ناک میں کیل، آنکھ میں کاجل!
رخ پہ زلفیں، نگاہ میں بچپن،		جیسی دھیمی پھوار میں گلشن
لب پہ موجیں رسی زندگانی کی،		جھلکیاں طفلی و جوانی کی،
[illegible] اک حیا سے دیتی ہے		خود بخود مسکرا سی دیتی ہے!

دیکھئے شروع میں اس کے نشست کی طرف اشارہ ضروری تھا جس سے معلوم ہوجائے کہ وہ کس حالت میں بیٹھی ہے لیکن اسکو اگر صرف اس طرح کہا جاتا کہ "وہ ہتھیلی پر رخسار رکھے ایک جانب تک رہی تھی" تو ذہنی نقشہ نہیں طیار ہوسکتا تھا لہذا ہمارے شاعر نے مطالعۂ جزئیات کرنے کے بعد ایک خاص پوزیشن کی طرف اشارہ کردیا ہے جس سے کل سماں آنکھوں میں نظر آجاتا ہے، ساری کا سرا بائیں جانب دوش پر ڈالا جاتا ہے لیکن چونکہ بچی کمسن ہے لہذا ساری کا دامن طویل ہونے کے باعث گردن کے پیچھے سے ہوکر دائیں جانب لٹکتا ہوگا۔ ایک تمیز دار بچی کی فطرت کا تقاضا یہی ہے کہ اس کو اپنے داہنے ہاتھ کی گرفت میں رکھے گی۔ جوشؔ نے صرف اتنا کہدینے سے کہ "داہنے ہاتھ میں ہے جس کا سرا" یہ تمام کیفیت پیش نظر آجاتی ہے

یہ بچی چونکہ کمسن ہے اس لئے اس کے "حسن معصوم" کی جانب اشارہ کئے ہوئے بغیر یہ بیان نامکمل رہ جاتا۔

چنانچہ گردن کی نزاکت اور ملائم کلائی کا بھی ذکر کردیا۔ پھر خیال آیا کہ اس کی زیبائش و تزئین کا حوالہ دینا بھی ازبس لازمی ہے لیکن یہ کہنا کہ وہ "جھومر، ٹیکا، پازیب، کنگن وغیرہ زیب تن کئے ہوئے تھی" فی الحقیقت واقعیت سے گریز کرنا ہے۔ یہ تو گاؤں کی ایک نوعمر، غریب اور مفلس لڑکی کا ذکر ہے۔ لہذا کہدیا کہ:۔ "ناک میں کیل آنکھ میں کاجل[1]"

غرض یہ کہ ہر مقام پر جوشؔ اس نکتہ کو ملحوظ رکھتا ہے کہ ان خصوصیات کا ذکر کردیا جائے جو موضوع زیر بحث کا نیچرل مرقع پیش کرسکیں

---

[1] یہ تصویر ناکتخدا لڑکی کی ہے اور شادی سے پہلے کیل کبھی استعمال نہیں کی جاتی، خاصکر گاؤں میں کہ وہاں تو شادی کے بعد بھی اس کا رواج نہیں ہے (اڈیٹر)

جوش نے جہاں مولانا محمد علی مرحوم سے خطاب کیا ہے وہاں طرزِ ادا نہ صرف بلیغ ہے بلکہ معلوم ہوتا ہے کہ قایل کو اپنے مخاطب کا پورا پورا احترام ہے اس لئے حرف حرف سے ادب، عقیدت اور خلوص مترشح ہے :۔

اے متاعِ بردہ ہندوستان و ایشیا، اے کہ تھا ناخن پہ تیرے عقدۂ حق کا مدار!
تیرے آگے لرزہ براندام تھی روحِ فرنگ اے دلِ ہندوستاں کے عزم تند و استوار!!
تجھ سے آتا تھا پسینہ افسر و اورنگ کو اے کہ ہمت تھی تری قوت شکن، سلطاں شکار!

ایک اور نکتہ قابل لحاظ ہے، جس مقام پر کسی کا استخفاف یا تذلیل مقصود ہوتی ہے، جوش وہاں کچھ ایسے مخصوص الفاظ استعمال کرتا ہے کہ اس کا مقصد واضح ہو جاتا ہے مثلاً "شیخ کی مناجات" میں لکھتا ہے :۔

تیرے بندوں میں ہیں جو صاحبِ زر میرے آگے جھکا دے اُن کے سر
اپنی مخلوق کو جبا، داور! میرے تعویذ اور گنڈے پر
دے مرے رُخ کو صولتِ الہام اور مریدوں کو تحفۂ اوہام
میرے ہر عیب کو ہنر کر دے میری داڑھی دراز تر کر دے!
حُسن تو خانقاہ کا ہے پھول! عورتوں میں کچھ اور کر مقبول
مقبروں پر جلال برسا دے میرے عرسوں پہ حال برسا دے
میری پیری میں زور رہنے دے! چشمِ عالم کو کور رہنے دے!!

ہیبت وصوتِ الفاظ اس سے بھی زیادہ پُرلطف بات یہ ہے کہ جس مقام پر وہ کسی خاص حالت کا اظہار کرتا ہے تو اس قسم کے الفاظ لاتا ہے جن سے خود بخود اس حالت کا سماں پیدا ہو جاتا ہے۔ کہیں دہشت برستی ہے، کسی جگہ کیفیتِ سرور کا اظہار ہوتا ہے۔ حقیقتاً یہ ایک صنعت ہے جسکو انگریزی میں Onamatopoea کہتے ہیں۔ بعض مثالیں درج کی جاتی ہیں :۔

مست بھونرا گونجتا پھرتا ہے کوہ و دشت میں
کاکلوں میں سے کرن پھولوں کو جھمکاتی ہوئی

کلیوں کا کوئلوں کی چٹکنا وہ بار بار وہ قہقہوں کی گونج، وہ شیریں پہیلیاں
یہ تنکتے سرد جھونکے کارواں در کارواں یہ ہمکتی، چلبلی موجیں قطار اندر قطار!
قمریاں چہکیں، ہلے پودے، چلی ٹھنڈی ہوا جام کھنکے، روئے مینا پر بہار آنے لگی،
آتی ہیں ہوائیں سنسناتی، پودوں کی دھڑک رہی ہے چھاتی،
پھر اس کے بعد تیز ہوئی تان دفعتہً اللہ رے زور، گونج اُٹھا گنبدِ کُہن

انتخابِ الفاظ بعض مقامات پر کوئی کیفیت سپردِ قلم کرتے ہوئے پے درپے چند الفاظ ایسے لے آتا ہے کہ اُن کے مجموعی مطالعہ سے اس چیز کا ہو بہو نقشہ نظر کے سامنے کھنچ جاتا ہے۔ مثلاً "مالن" کے متعلق لکھتا ہے :-

ایڈتی، مُڑتی، خود اپنی کمسنی سے کھیلتی بھاگتی، رُکتی، ٹھٹکتی، بال بکھراتی ہوئی
گنگناتی، مسکراتی، لڑکھڑاتی، جھومتی مثلِ ابرِ اپنے ہی پر خودبیچ و خم کھاتی ہوئی

محفلِ عیش کا ایک موقع ملاحظہ کیجئے :-

گائیں، ناچیں، لڑکھڑائیں، گنگنائیں تال دیں دلبرانِ شوخ و شیریں، مہوشانِ چست و چاق

ایک دلنشیں آواز کا نقشہ یوں پیش کیا ہے :-

ناآزمودہ غم کی جبیں چومتی ہوئی تپتی ہوئی، لرزتی ہوئی، جھومتی ہوئی

تشبیہات بعض چیزیں اسقدر غیر معروف ہوتی ہیں کہ جب تک ہم معروف اشیا کا حوالہ دیکر اُن سے ان کی مشابہت ظاہر نہ کریں، ذہنِ انسانی آسانی سے اُن کی جانب نہیں منتقل ہوتا۔ تشبیہ کا اصل مقصد یہی ہے۔ لیکن بیان میں نُدرت، لطافت اور نزاکت پیدا کرنے کے لئے بھی تشبیہات استعمال کی جاتی ہیں اور غالباً جوشؔ نے آخرالذکر مقصد ہی کو پیشِ نظر رکھا ہے۔ مثلاً پانی میں کسی خوبصورت سایہ کے لرزنے کی اس سے بہتر تشبیہ نہیں پیش کی جاسکتی :-

یوں قصر کا عکس ہے سرِ آب ارماں جیسے ہو دل میں بیتاب

ایک جگہ سورج کی کرنوں کی تمازت یوں دکھائی ہے :-

سر پہ کافر دھوپ جیسے، روح پر عکسِ گناہ تیز کرنیں جیسے پڑتی سودخواروں کی نگاہ

لیکن جب انھیں کرنوں کی لطافت، خوشنمائی کا ذکر کرتا ہے تو طرزِ ادا قطعاً تبدیل ہوجاتا ہے :-

چھوٹتی ہے یوں کرن جیسے کوئی کمسن عروس آرہی ہو کھیلتی کنگن سے، شرماتی ہوئی

بعض اور لطیف تشبیہات ملاحظہ ہوں :-

لب کو یوں جنبش سی ہوتا نطق شرم آمیز سے پنکھڑی جس طرح مڑ جائے ہوائے تیز سے
تیرتا پھرتا ہے یہ بادل کے ٹکڑوں میں ہلال یا زمرد کا سفینہ درمیانِ جوئبار
یہ کلی پر قطرۂ شبنم میں ہے نورِ قمر آنکھ کی پتلی میں یا ملطاں ہے عکسِ روئے یار
چیتھڑوں میں دیدنی ہے روئے غمگین حیات ابر کے آوارہ ٹکڑوں میں ہو جیسے آفتاب
سُرنگوں میں پھول سکتے میں ہے پیمانے کا رنگ اُف یہ نم آلود رخساروں پہ شرمانے کا رنگ
کاکلیں لہرا رہی تھیں روئے عالم تاب پر سنبلستاں کا تھا گل پہ سائباں کل رات کو
نظر آتا تھا گھبرایا ہوا یوں چاند بادل میں، کوئی سہمی ہوئی دوشیزہ شب کو جیسے جنگل میں

شعلہ کا بینہ ہوئے گلاب میں ایک سرخ پنکھڑی چمن میں — رنگی ہوئی سرخ اوڑھنی کا ہوا میں آنچل سنوارتی ہو
کلی پہ بیٹھی کسی ادا سے پڑا ہے شبنم کا ایک موتی — نہیں یہ ہیرے کی کیل پہنے پری کوئی مسکرا رہی ہو

ندرتِ بیان

محاکات کے سلسلہ میں یہ امر بالخصوص قابلِ لحاظ ہے کہ بعض مضامین فی نفسہٖ موثر نہیں ہوتا بلکہ طرزِ ادا سے اس میں تاثیر پیدا ہو جاتی ہے۔ مضمون آفرینی فی الحقیقت قوتِ تخیلہ کا کام ہے قوتِ شعری کا کمال دراصل طرزِ ادا ہی میں مضمر ہوتا ہے۔ شاعر کی خوبی یہی ہے کہ معمولی سے مضمون کو بھی اس طرح ادا کرے کہ لطیف تر معلوم ہو اور سامعین کے دلوں پر اثر کرے۔ جوشؔ نے انتخابِ الفاظ، ان کی تراکیب اور محاورات کی بندش سے بعض مقامات پر بہت دلآویزی پیدا کر دی ہے۔ بعض مثالیں پیش کی جاتی ہیں :-

پتیاں کھلتی ہوئی کلیاں آنکھ جھپکاتی ہوئی — نرم جاں پودوں کو گویا نیند سی آتی ہوئی
ہر کلی کو آ رہی تھیں ہچکیاں کل رات کو — ڈالیاں ٹھنڈی ہوا کے گدگدانے کی ادا
سرشار جوانی کی وہ بدمست اگاوٹ — سبزے نے چھپالی تو نگاہوں نے بتا دی
وہ کلی چٹکی، وہ ہوا کا جھونکا، وہ پھوٹی کرن — ٹھٹکے وہ انگڑائی دی دریا نے بہنے کے لئے
آتی ہیں ہوائیں سنسناتی — پودوں کی دھڑک رہی ہے چھاتی
سوکھی ہوئی گھاس ہے فسردہ — افسردہ نہ کہئے بلکہ مردہ
گردوں کی جبیں دمک رہی ہے — پودوں کی کمر لچک رہی ہے
پھوٹی ہے کرن جو تلملاتی — شبنم کی دھڑک رہی ہے چھاتی
چہرہ چھپکا نیند کے مارے — چھلکے ہیں شہد کے دھارے
جوبن دیکھے جان کر وارے — دھرتی ناتا بوجھ سہارے
یہ کون اٹھا ہے شرماتا
لپٹے منھ سو رہی تھیں کلیاں صبا نے آ کر جو گدگدایا — سرک گئے ہیں سروں سے آنچل تمام گلشن مہک رہا ہے

نفسیات و ذہنیات

فلسفۂ جدید کی دنیا میں نفسیات (Psychology) اور ذہنیات[1] (Psycho-Analysis) اپنی اپنی جگہ پر مخصوص علوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ہر افسانہ نگار، ڈرامہ نویس اور آرٹسٹ کے لئے ان کا مطالعہ لابُد اور ناگزیر ہے۔ کیونکہ فنونِ لطیفہ کا ایک مقصد یہ بھی ہوتا ہے کہ انسانی جذبات و احساسات میں ایک پسندیدہ ارتعاش پیدا کیا جائے تاکہ لوگ زیادہ سے زیادہ ان کی طرف مائل ہو کر لطف اندوز ہو سکیں

---

[1] "تحلیلِ نفسی" کہئے (اڈیٹر)

ان امور کی تکمیل کے لئے یہ لازم ہے کہ ہر اہل فن "واقف نفسیات" ہو۔ شاعری چونکہ اصولاً جذبات انسانی سے براہ راست تعلق رکھتی ہے ہذا ایک شاعر کو فن نفسیات سے گہرا تعلق ہے

جوش کی شاعری کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو انسان کی کیفیات نفسی پر کامل عبور حاصل ہے۔ قدم قدم پر اس امر کا احساس ہے کہ انسانی حسیات اور قلبی واردات کی صحیح تصویر کھینچی جاتی ہے

ایک نظم کا عنوان ہے "پہلی مفارقت" شروع اس طرح ہوتا ہے:۔

یاد ہے عہد وصل کی باتیں	ہائے فرقت کی چاندنی راتیں

دوسرا مصرع سنتے ہی سامعین کو تشویش ہونے لگتی ہے کہ دیکھئے اب کیا کہتا ہے۔ اس کے بعد لکھتا ہے:۔

آ تئیں جمع ہیں خدائی کی	چاندنی رات ہے جدائی کی
کوئی کافر ہی شب کو سوتا ہے	رات بھر دل میں درد ہوتا ہے

اس "شب بیداری" کی مرقع کشی اس طرح کی ہے:۔

اٹھتی رہتی ہیں بار بار آنکھیں	ڈھونڈتی ہیں جمال یار آنکھیں
کچھ وہ پھولوں سے آتی ہے خوشبو	نیند آتی نہیں کسی پہلو!
چھیڑتا ہے جو کوئی رات کو ساز	صاف آتی ہے دل کی آواز
آگ سی پہلوؤں میں جلتی ہے	ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا جو چلتی ہے

ظاہر ہے کہ جب یہ کیفیت ہوگی تو احباب واقربا کچھ نہ کچھ تسکین دینے کی کوشش کرتے ہوں گے لیکن اس "تسکین" کا جو اثر ہوتا ہے ظاہر ہے۔ جوش لکھتا ہے:۔

بے نتیجہ ہے صبر کی تلقین،	بلکہ دیتا ہے جب کوئی تسکین
شعلۂ غم بھڑکنے لگتا ہے،	اور بھی دل دھڑکنے لگتا ہے

نظم کا آخری حصہ بھی نفسیاتی نقطۂ نظر سے نہایت اہم اور دلچسپ ہے:۔

اے اودھ کی نسیم عقدہ کشا	وہ ملیں تو پیام یہ کہنا
آنکھیں دیدار کو ترستی ہیں	بادلوں کی طرح برستی ہیں
اٹھتی رہتی ہے ہوک سی پیہم	ہائے وہ رخ وہ کاکل برہم
ہائے وہ چاندنی، وہ مہتابی	مست آنکھوں کی وہ شکر خوابی
برگ گل پر وہ ماہتاب کی ضو	رخ پہ وہ آمد شباب کی رو
خال و خد سے عیاں الصد انوار	صبح صادق کی چاندنی کا نکھار

ہاں تو اے دلنشیں اودھ کی صبا! وہ ملیں تو پیام یہ کہنا
بادلوں کی طرح برستی ہیں آنکھیں دیدار کو ترستی ہیں!
ایک مدت ہوئی نہیں دیکھا ہائے تیرا وہ چاند سا مکھڑا
کس طرح صبح و شام ہوتی ہے دل دھڑکتا ہے آنکھ روتی ہے!
کھائے جاتا ہے کوئی سینے کو آگ لگ جائے ایسے جینے کو
تنگ ہے سانس آنے جانے سے
اب بُلالے کسی بہانے سے!

ایک بہن کو اپنے حقیقی بھائی سے جو الفت ہوتی ہے، محبت کی دنیا میں اس کا جواب ناپید ہے۔ ہندی شاعری میں "بیرن کی یاد" میں بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ اُردو شاعری میں یہ مضمون مفقود نہیں تو کمیاب ضرور ہے، لیکن جوش کے یہاں ایک غمزدہ بہن اپنے پردیسی بھائی سے خطاب کر رہی ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

میں دیس میں تم وطن سے باہر! اے بھائی، بہن نثار تم پر!!

"اے بھائی! بہن نثار تم پر" یہ مصرع ایک بہن کے جذبات کا حقیقی آئینہ دار ہے۔
نظم کا بقیہ حصہ بھی سُن لیجئے بہن پھر کہتی ہے:۔

انگنائی میں ہو رہا ہے غوغا ساون کی ہے رُت، ہوا ہے پُروا
سائے میں گرجتی بدلیوں کے استادہ ہیں دو شریر بچے
اک موجِ رواں ہے، اک چمن ہے اک خیر سے بھائی، اک بہن ہے
کچھ دیر سے دونوں لڑ رہے ہیں کیا جانئے کیوں جھگڑ رہے ہیں!
میں دیکھ رہی ہوں اور چپ ہوں کس جی سے بھلا فساد کاٹوں،
اس جنگ کے آئنے کے اندر بچپن ہے ہمارا جلوہ گستر
کرتے تھے شرارتیں اُدھم بھی
لڑتے تھے اسی طرح سے ہم بھی

ان اشعار کے مطالعہ سے ثابت ہوتا ہے کہ جوش کی شاعری نفسیاتی نقطۂ نظر سے بھی نہایت اہم پایہ رکھتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کو فی الحقیقت جذبات و حسیاتِ انسانی کی مختلف کیفیات سے پوری واقفیت حاصل ہے۔ پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی نے صحیح فرمایا ہے کہ "جوش کی شاعری نے ہمیں اس قابل بنا دیا ہے کہ آنکھیں نیچی کئے ہوئے بغیر، اپنی شاعری کو دنیا کی ترقی یافتہ شاعری کے مقابلہ میں رکھ سکتے ہیں۔ (نقش و نگار)

تاثیر اور دلنشینی شعر کی خوبی یہ ہے کہ سنتے ہی سامع کے قلب میں اُتر جائے۔ سننے والا یہ محسوس کرنے لگے گویا یہ بھی میرے دل میں ہے"۔ تاثیر اور دلنشینی کے لئے روانی، برجستگی اور صداقت ضروری اُمور ہیں۔

جوش کی شاعری کا بالاستیعاب مطالعہ کرنے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس کے حرف حرف میں درد و اثر کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے شعر خود کہے دیتا ہے کہ کس دل سے نکل کر آیا ہے اور وہ غم و اندوہ کا مسکن ہے۔

کسی شے کی تعبیر حقیقتاً ہمارے زاویۂ نگاہ اور ذوق نظر پر منحصر ہے۔ اگر ہماری طبیعت الم پرور ہے تو عمدہ سے عمدہ بات کا اندو گیں مفہوم لیا جا سکتا ہے۔ جوش کو "کسی" نے بیلے کی کلیاں تحفۃً بھیجی ہیں۔ اس کی توجیہ ملاحظہ فرمائیے:-

بھیجی ہیں کسی نے بہر دوراں — بیلے کی چمن فروز کلیاں
کلیوں سے مگر عیاں ہے زردی — یہ روح غم ان میں کس نے بھر دی ؟
گویا ہیں زبان حال سے یوں، — اے شاعر خوش نصیب و محزوں !
بھیجا ہے چھپا کے ہم کو جس نے — جانے اُسے غم دئے ہیں کس نے
یوں زرد وہ روئے دلنشیں ہے — اک بوند بھی خون کی نہیں ہے !

پھر کلیاں اس غمزدہ، مہجور لڑکی کا پیغام سناتی ہیں، سنئے :-

ہم سے یہ کہا ہے جا کے کہنا — لازم نہیں اب خموش رہنا
مجھ کو تری یاد نے ڈبویا — مرجھائی ہوئی کلی ہوں گویا
بھرتی ہوں چھپا کے شب کو آہیں — اُٹھتی نہیں چاند سے نگاہیں
شاما جو سحر کو بولتی ہے — آنکھوں کی گرہ کو کھولتی ہے !
چہرہ سے عیاں ہے دل کی اُلجھن — ڈھیلے ہیں کلائیوں کے کنگن
اللہ یہ کیا ہوا ہے مجھ کو — دیکھو جسے، دیکھتا ہے مجھ کو

آخری مصرع میں جو کیفیت پیش کی ہے وہ اسیر غم کے جذبات کا نہایت مکمل نقشہ ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ کہنے والی کے قلب پر غم و اندوہ کا ہجوم ہے، وہ نہایت ہی کرب و اضطراب کے عالم میں یہ سب کچھ بیباکی سے کہتی چلی جاتی ہے:-

اب حد سے سوا ہے خستہ حالی — نزدیک ہے وقت پائمالی
آنا ہو تو آ، کہ دل ہے بیتاب — ایسے میں ابھی چمن ہے شاداب[1]
جلد آ، کہ فروغ رنگ و بو ہو — قبل اس کے کہ خون آرزو ہو !!

---

[1] اسی مفہوم کا ایک شعر شاد عظیم آبادی کا یاد آگیا:-

مرغان قفس کو پھولوں نے اے شاد یہ کہلا بھیجا ہے — آجاؤ جو تم کو آنا ہو ایسے میں ابھی شاداب ہیں ہم (اڈیٹر)

دیکھئے، دوسرے شعر میں "آنا ہو تو آ!" کہنے کے بعد تیسرے شعر میں "جلد آ!" کی تکرار سے طرزِ ادا میں کتنی بے ساختگی پیدا ہو گئی ہے۔

ہجر و مفارقت کی شکایت کرنا شعراء کی سنت دیرینہ ہے۔ جوشؔ نے بھی اس "دفتر بے پایاں" میں مزید اضافہ کیا ہے لیکن نہایت با معنی۔ سنئے:-

تیرے قربان! ارے خواب میں آنیوالے　　داستاں عہدِ تمنا کی سنانیوالے
ہاں، ترے حرفِ شکایت سے پشیماں ہوں میں　　بخشدے بہر خدا جُرم کہ انساں ہوں میں!

اس "جرم" کی آگے چل کر یوں تشریح کی ہے:-

یہ مگر وہم ہے اے پیکرِ حسن و تنویر　　کہ یہ دل اب ہے کسی اور کی زلفوں کا اسیر

گو فی الحقیقت یہ "وہم" چند حقایق پر مبنی ہے جن کی توجیہ ہمارے شاعر نے کر دی ہے:-

ہاں ترے ہجر میں اک شغل نکالا ہو ضرور　　شدتِ کاہشِ آلام کو ٹالا ہے ضرور
قاعدہ ہے نہیں ہوتا ہے فلک پر جب ماہ　　لطف اٹھاتی ہے چمکتے ہوئے تاروں سے نگاہ
بن ترے جب کسی دم چین نہیں پاتا ہوں　　میں بھی یوں ہی دلِ افسردہ کو بہلاتا ہوں

مگر اس کے باوجود وفا کا یہ عالم ہے کہ کہتا ہے:-

تو جو آزردہ ہے جھوٹی بھی تسلی نہ سہی　　رشک آتا ہے اگر تجھ کو تو یہ بھی نہ سہی!

"غریب الوطن کا پیام" جوشؔ کی مشہور نظم ہے۔ یہ بھی شروع سے آخر تک تاثیر میں ڈوبی ہوئی ہے بعض اشعار ملاحظہ کیجئے:-

جکڑا ہوا پڑا ہوں زنجیر سے دکن کی　　سینے میں آرزو ہے بچھڑے ہوئے وطن کی

پھر گزشتہ واقعات و حوادث کا تصور کر کے ان پر یوں تبصرہ کرتا ہے:-

کس زندگی کی دُھن میں ہم رواں دواں ہیں؟　　جو ساتھ کھیلتے تھے وہ لوگ اب کہاں ہیں؟
شاداب تو ہیں میری بچپن کی سیر گاہیں؟　　اب ڈھونڈتی ہیں جن کو ترسی ہوئی نگاہیں!
اچھی تو ہیں پروں کو دُھن میں جھٹکنے والی　　دیوار پر وہ آکر چڑیاں چہکنے والی
کیا اب بھی جھومتی ہیں کرتی ہوئی اشارے　　نیلی شگ بولیں تالاب کے کنارے؟
بدلی میں گونجتے ہیں آموں کے باغ اب بھی؟　　جلتے ہیں جنگلوں میں دُھندلے چراغ اب بھی؟

اس کے بعد چاند سے خطاب کرتا ہے کہ:-

مغموم جھاڑیوں سے میرا سلام کہنا　　آنکھوں میں اشک بھر کر پھر یہ پیام کہنا
کیوں میرا سوزِ فرقت تم کو جلا رہا ہے؟　　کیوں مضطرب ہو؟ ٹھہرو! وہ دن بھی آرہا ہے

جس دن دھڑکنے والے دل کو قرار ہوگا! سائے میں جب تمہارے میرا مزار ہوگا!!

اشعار ذیل بھی تاثیر اور دل نشینی میں لاجواب ہیں:۔

بے خبر مجھ کو زمانے سے کیا ہے جس نے کچھ اُسے میری تباہی کی خبر ہے کہ نہیں؟
کھائے جاتا ہے مجھے دردِ غریب الوطنی! دل پہ اُس جانِ وطن کے بھی اثر ہے کہ نہیں؟

آنکھ کھلتے ہی نسیمِ تری یاد دل پہ کرتی ہے جانے کیا بیداد
دل مرا غرقِ یاس رہتا ہے شام تک جی اُداس رہتا ہے!

جبیں پہ سادگی، نیچی نگاہیں، بات میں نرمی مخاطب کون کر سکتا ہے تم کو لفظِ قاتل سے!

وہ اپنے حسن سے محفل میں اپنے عشق کی بزم! اُس انجمن کو پھر اِس انجمن میں پہونچا دے!

آنکھوں میں اشک، رُخ پہ تمنا، لبوں پہ آہ اب اس ادا سے سامنے آتے نہیں ہو تم!

ہاں جفا ہی جفا رہ گئی ہے محبت سے یہاں جفا پہ وفا کا گمان باقی ہے!

اب خانۂ امید میں ظلمت ہی نور ہے تکلیفِ اہتمامِ چراغاں نہ کیجئے
دم ہی نہیں ہے جوشؔ میں تجدیدِ شوق کا احسان اب یہی ہے کہ احساں نہ کیجئے!

قفلِ بابِ شوق تھیں ماحول کی خاموشیاں دفعتہً کافر پپیہا بول اُٹھا، اب کیا کروں؟

مرا رفیق نہیں ہے کوئی جدائی میں زہیر رہنے نہیں دیتی تری جدائی میں

شرط پوری ہو چکی، للہ اب تو رحم کر دیکھ کیا تھا جوشؔ اور کیا ہوگیا تیرے لئے!!

شکوۂ روزگار

کچھ عجیب اتفاق ہے کہ دنیا کے تمام باکمال لوگ زمانہ کے شاکی رہے ہیں۔ جوشؔ کے کلام سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ زمانہ کا سخت شاکی ہے، علی الخصوص "فکرِ روزگار" کے باعث غالباً اس کو دلی کوفت ہوئی ہے، لکھتا ہے:۔

آہ، اے دورِ فلک تیرا نہیں کچھ اعتبار مٹ کے رہتی ہے ترے جورِ خزاں سے ہر بہار
نوعِ انساں کو نہیں تیری ہوائیں سازگار فکرِ دنیا اور شاعر، آف ہو اے لیل و نہار!

موج کو ترِ وقف ہوا اور آتشہ کامی کے لئے!
خواجگی رختِ سفر باندھے غلامی کے لئے!!

ایک جگہ اپنے خاص انداز میں یہی مضمون یوں بیان کیا ہے:۔

ڈالتا ہے بار کوئی شاعرِ مدہوش پر حسن کے بکھرے ہوئے ہیں بال میرے دوش پر

پھر شکوہ سنجانہ تصریح اس طرح کی ہے:۔

بجلیاں جس نخل پر رقصاں ہوں چل سکتا نہیں
تیری اس دنیا کا مجھ سے کام چل سکتا نہیں
میں پر دل کو توڑتا ہوں آشیانے کو سنبھال
یہ ہے دنیا اور اپنے کارخانے کو سنبھال

"چراغِ عظمت" کے عنوان سے ایک نظم لکھی ہے وہ بھی انھیں خیالات کی آئینہ دار ہے :-

یہ ہے تیرا ہی چراغ، اے شاعرِ رنگیں صفات
لیکن اس سے فیض اُٹھا سکتی نہیں تیری حیات
اس کو پا سکتا نہیں تو بزمِ عشرت کے لئے
یہ تو ہے نادان تیری لوحِ تربت کے لئے
ہو گی تیری تیرہ قسمت زندگی جب خواب میں
جگمگائے گا یہ تیری موت کی محراب میں

غم کوشی و ایذا پسندی

اُردو شعرا میں جوشؔ کی مخصوص صفت یہ ہے کہ وہ مصائب و آلام سے دل برداشتہ ہو کر مائلِ فریاد نہیں ہوتا۔ اس کو احساس ہے کہ تمام عالم میرے درپئے آزار ہے لیکن پھر بھی وہ ایک تبسم آمیز انداز سے ان تکالیف کا خیر مقدم کرتا ہے :-

اُٹھی جاتی ہے دل سے ہیبتِ آلامِ روحانی
جراحت بہرِ قلبِ زار مرہم ہوتی جاتی ہے

اُسے زمانہ کی کلفتوں کا احساس ضرور ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ یہ کہتا ہے :-

مانوس ہو چکا ہوں غمِ روزگار سے
اب ذکرِ آب و رنگِ تمنا نہ کیجئے
سینہ آلِ ذوقِ طرب سے ہے چاک چاک
اب فتنۂ نشاط کا در، وا نہ کیجئے

ایک دوسری جگہ اسی مضمون کو ذرا مختلف الفاظ میں پیش کیا ہے :-

اب، اے خدا، عنایتِ بیجا سے فایدہ؟
مانوس ہو چکے ہیں غمِ جاوداں سے ہم

تمام شعرا معشوق کی بے التفاتی کے شکوہ سنج ہیں لیکن جوشؔ کا نظریہ ان سب سے مختلف ہے، وہ کہتا ہے :-

سنتا ہوں دردِ عشق ہے ہر درد کی دوا
آ، اور میرے دردِ جگر کو دوچند کر

بے نیازی اور مستغنی المزاجی :-

تجدیدِ چاک کی نہیں دامن کو آرزو،
اب نقلِ اضطرابِ زلیخا نہ کیجئے
اب خانۂ امیر میں ظلمت ہی تو رہے
تکلیفِ اہتمامِ چراغاں نہ کیجئے
اب دل کو بزمِ ناز کی حسرت نہیں رہی،
اب عذرِ بد مزاجیِ درباں نہ کیجئے

بالآخر کس لاپرواہی کے ساتھ کہتا ہے :-

دم ہی نہیں ہے جوشؔ میں تجدیدِ شوق کا
احسان اب یہی ہے کہ احساں نہ کیجئے

(باقی)

یوسف رضا بدایونی

سیاسیات یوروپ

(۸)

اسٹالین

"ریشمی دستانوں کے ساتھ کوئی انقلاب پیدا نہیں کیا جا سکتا"

(اسٹالین)

انفرادی و شخصی حیثیت سے اسٹالین اسوقت دنیا کا سب سے بڑا طاقتور شخص ہے۔ وہ اور ڈکٹیٹروں سے دو باتوں میں مختلف ہے، ایک یہ کہ وہ نہ صرف ایک قومی حکومت کا متفقہ لیڈر ہے بلکہ ایک ایسی بین الاقوامی اشتراکی تحریک کا مرکز ہے جس کی جڑیں تمام ملکوں میں پھیلی ہوئی ہیں، علاوہ اس کے وہ مسولینی اور ہٹلر سے اس بات میں بھی مختلف ہے کہ وہ ڈکٹیٹروں کی دوسری نسل سے وابستہ ہے یعنی اس نے عنان اقتدار لینن سے حاصل کی ہے اور وہ پہلا ڈکٹیٹر سوویٹ حکومت کا نہیں ہے

لینن اس سے خوش نہیں تھا اور اپنے بعد اس کو جانشین نہ کرنا چاہتا تھا، چنانچہ ایک دن اس نے اپنے رفقار کار سے کہا کہ:-

"اسٹالین بہت سخت و تند خو ہے، میں چاہتا ہوں کہ اسے سکریٹری جنرل کے منصب سے بھی علحدہ کر دیا جائے اور کوئی دوسرا آدمی مقرر کیا جائے جو زیادہ متحمل، زیادہ وفادار اور زیادہ نرم ہو"

یہ ۱۹۲۴ء کی بات ہے، لیکن اس واقعہ کے گیارہ سال بعد وہی اسٹالین روس کا غیر تاجدار بادشاہ بن جاتا ہے اور ملک کی صحافت و قوم کی گرویدگی کا یہ عالم ہے کہ محبت و عزت کا کوئی لفظ ایسا نہیں ہے جس سے اسے یاد نہ کیا جاتا ہو یہاں تک کہ متعدد شہر اسی کے نام سے موسوم کر دئے گئے۔ اسٹالین کے اس عروج کا راز خود اس کی ذاتی صفات میں پنہاں ہے۔ سب سے پہلی چیز تو اس کی صحتِ جسمانی، جفاکشی اور قوتِ برداشت ہے۔ ہر چند اس کا قلب بیمار ہے لیکن جسمانی قوت اور محنت کشی کے لحاظ سے وہ ایک بے مثل انسان سمجھا جاتا ہے۔ نہ ہٹلر کی طرح اسکے اعصاب میں

کبھی ہیجان پیدا ہوتا ہے اور نہ مسولینی کی طرح وہ کبھی جذبات سے مغلوب ہوتا ہے وہ جذبات کے لحاظ سے سنگ مرمر کی سختی سے اور اگر وہ اعصاب رکھتا ہے تو بالکل ایسے ہی جیسے چٹانوں کے ریشے۔

وہ دُھن کا اتنا پکا ہے کہ انسان معلوم ہی نہیں ہوتا۔ وہ اتنا سُست معمار ہے کہ اس کے رفقا بسا اوقات گھبرا اُٹھتے ہیں اور ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ جو عمارت یہ بنا رہا ہے اس کی صورت و ہیئت کیا ہے، وہ ہر بات کو نہایت دور رس نگاہ سے دیکھتا ہے اور جو رادیہ قایم کر لیتا ہے اس سے کبھی نہیں ہٹتا

وہ ہوشیار و چالاک بھی بہت ہے اور اس کا اسے اعتراف ہے، چنانچہ ایک بار جب وہ کسی جاپانی سوار سے ملا تو اس سے کہا کہ "میں بھی تمھاری ہی طرح ایشیا کا باشندہ ہوں"۔ لنین نے اس کے متعلق جو بُرے خیالات ظاہر کئے تھے ان کو دبانے کی اس نے پوری کوشش کی، چنانچہ پانچ لاکھ کاپیاں ایک تصویر کی تمام ملک میں شایع کی گئیں، جس میں لینن اور اسٹالین دونوں ایک بنچ پر بیٹھے ہوئے دوستانہ گفتگو میں مصروف ہیں۔

اسٹالین نے جس ترکیب سے پہلے ٹراٹسکی وغیرہ کی دست چپ کی مخالف پارٹی کو نیچا دکھایا اور پھر بخارین وغیرہ دست راست کے مخالفوں کو وہ نہ صرف اس کے صبر و تحمل کا غیر معمولی کارنامہ ہے بلکہ اسکی ذہانت و ہوشیاری کا بھی۔ جب موقعہ صاف گوئی کا ہوتا ہے تو اس سے زیادہ صاف گو بھی کوئی نہیں اور وہ اپنی غلطیوں کا اس طرح اعتراف کر لیتا ہے کہ اور کسی ڈکٹیٹر کے بس کی بات نہیں۔ چنانچہ اس نے اپنے ایک آرٹکل میں نہایت صفائی سے اس کا اعتراف کیا کہ روس میں کسانوں کی اجتماعیت نے ضرورت سے زیادہ جلد ترقی کر لی

اس نے اپنی مشہور کتاب (Leninism) میں لکھا ہے کہ:۔

"سب سے اہم بات یہ ہے کہ ایک شخص میں اپنی غلطیوں کے اعتراف اور ان کی جلد از جلد تلافی کی ہمت ہونا چاہئے۔ کامیابی کے نشہ میں ایک شخص نہ اپنی غلطیوں کا اعتراف کرتا ہے اور نہ انتقاد کو برداشت کر سکتا ہے —— یہ بہت بُری بات ہے"

اس کی یہ کتاب فلسفۂ سیاسیات کی حد درجہ بے لاگ تفسیر ہے اور اس ۸۲۵ صفحات کی کتاب میں سوویٹ حکومت کی بھلائی بُرائی کو نہایت آزادی و صفائی کے ساتھ ظاہر کر دیا گیا ہے۔

اسٹالین کی ایک اور خصوصیت اس کی نگاہ کی دور رسی ہے۔ وہ ایک معاملہ کی تمام جزئیات کا مطالعہ کرتا ہے اور قومی زندگی کے عناصر کا معمولی سا معمولی پہلو ایسا نہیں ہے جو اس کی نگاہ سے باہر ہو۔ وہ تفصیلات و جزئیات کے مطالعہ کا بڑا شایق ہے اور اس باب میں ہٹلر اور مسولینی اس کے پاسنگ بھی نہیں ہیں

ہٹلر اس ڈاک کو بھی نہیں پڑھتا جو اس کی ذاتی تفریح سے متعلق ہوتی ہے۔ اسٹالین ہر کاغذ کا ایک ایک لفظ پڑھتا ہے اور صبح کو سب سے پہلے وہ تمام ان رپورٹوں کو پڑھتا ہے جو مختلف اقطاع ملک کے حالات پر مشتمل ہوتی

ہیں۔ ڈبلو۔ ایچ چیمبرلین، ہرچند اسٹالین کا خیر خواہ نقاد نہیں ہے لیکن وہ بھی اعتراف کرتا ہے کہ ملک کے دور دراز حصوں کی بہت سی انتظامی بدعنوانیاں محض اسٹالین کے اس ہوش و گوش کی وجہ سے دور ہوتی رہتی ہیں۔

اس کی تنظیمی قابلیت بھی بڑی زبردست ہے اور اپنے آدمیوں کو اس طرح قابو میں رکھتا ہے جیسے ان پر جادو کر دیا ہو۔ کہا جاتا ہے کہ اس میں خاص مقناطیسی قوت پائی جاتی ہے کہ ہر شخص اس سے مرعوب ہو جاتا ہے۔ اس کے بہت سے رفقاء اس سے ناراض ہیں اور عام طور پر سب کو معلوم ہے کہ رشتۂ انسانیت کا احساس تو اس میں باقی ہی نہیں رہا لیکن باوجود اسکے سب اسلئے وفادار ہیں۔ ہٹلر کے رفقاء ہٹلر کی پرستش کرتے ہیں، مسولینی کے ساتھی مسولینی سے ڈرتے ہیں لیکن اسٹالین کے ساتھی اس کی عزت کرتے ہیں۔

اسٹالین مقرر و خطیب نہیں ہے اس کی تقریریں سادہ اور کاروباری رنگ کی ہوتی ہیں، لیکن بہت تفصیلی اور طویل۔ وہ زیادہ تر سوال و جواب کے انداز سے گفتگو کرنا پسند کرتا ہے اور عوام اس سے بہت مستفید ہوتے ہیں۔

اس کی ذہانت ہرچند سست رفتار ہے لیکن ہے نہایت عمیق و مضبوط ۱۹۳۷ء میں جب عاملین امریکہ کا ایک وفد اس سے ملا تو اس نے کامل چار گھنٹے تک اسٹالین سے مختلف قسم کے سوالات کئے جن میں بعض نہایت مشکل و دقیق تھے، اور اسٹالین نے ان سب کا جواب نہایت متانت و سنجیدگی سے دیا۔ کہا جاتا ہے کہ اس ملاقات کی رپورٹ (جو ۱۱۰۰۰ الفاظ میں شایع ہوئی ہے) سوویٹ حکومت کے مقاصد پر بہترین مقالہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ جب اس وفد نے اپنے سوالات ختم کر دئے تو پھر اسٹالین نے امریکن حکومت کے متعلق دو گھنٹے تک سوالات کئے اور یہ سوالات ایسے نازک، دقیق اور پیچیدہ تھے کہ پورا وفد اس خوبی سے ان کا جواب دے سکا جس خوبی سے تنہا اسٹالین نے وفد کے سوالات کے جواب دئے تھے۔ اس چھ گھنٹے کی گفتگو میں نہ کوئی سکریٹری اندر آنے پایا اور نہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسٹالین ہر کام کو کس انہماک کے ساتھ انجام دیتا ہے

اسٹالین جتنا ضابط و صابر ہے اتنا ہی بیرحم بھی ہے اور اشتراکیت کی راہ میں جو چیز حایل ہوتی ہے اسکو دور کرنے میں وہ ہر ظلم و ستم کو روا رکھتا ہے۔ لیڈی آسٹر نے ایک بار اس سے دریافت کیا کہ "تم کب تک اپنے ملک کے لوگوں کو قتل کرتے رہوگے" اس نے جواب دیا کہ "جب تک اس کی ضرورت محسوس کی جائے"

جب ۱۹۰۵ء میں انقلاب کی تحریک پلٹ دی گئی، تو انقلابی جماعت کے افراد سراسیمہ و منتشر ہوکر ادھر ادھر چلے گئے لیکن اسٹالین، لینن کی طرح روس کے اندر ہی رہا۔ اس نے خاکروب اور فراش کی حیثیت سے مختلف ہوٹلوں اور لائبریریوں میں بسر کیا اور اس طرح اُسے انقلابیوں سے ملنے اور خفیہ سازشوں میں شریک ہونے کا بہت موقعہ ملا۔ جب یہ دور ختم ہوا اور لینن کی جماعت پھر کامیاب ہوئی تو اس نے لینن کی بڑی مدد کی

اسٹالین کوئی خاص عہدہ یا منصب نہیں رکھتا سوائے اس کے کہ جنوری ۱۹۳۸ء سے وہ مرکزی مجلس عاملہ

کے، سو ممبروں میں سے ایک ممبر ہے۔ اسی جماعت کو سوویٹ حکومت کی پارلیمنٹ کہنا چاہئے۔ وہ اب جنرل سکریٹری نہیں ہے بلکہ پارٹی سکریٹری ہے، لیکن اتنا حاوی ہے کہ بغیر اس کی مرضی و اجازت کے کوئی کام نہیں ہو سکتا

اس کا اصلی نام یوسف ہے اور ۱۸۷۹ء میں بمقام گورا (طفلس) پیدا ہوا۔ اسٹالین نام اس کا لینین نے رکھا تھا جس کے معنے فولاد کے ہیں۔ اس کا باپ جوتا بنانے کا کام کیا کرتا تھا اور چاہتا تھا کہ یہ بھی اسی پیشہ کو اختیار کرے لیکن اس کی ماں نے نہیں مانا اور اسے مذہبی اسکول میں بھیجدیا جہاں چار سال تک اس نے تعلیم پائی۔ یہ نہایت غریب گھرانے کا لڑکا تھا۔ اتنا غریب کہ جب اپنے عروج کے زمانہ میں اسٹالین اپنی ماں کو ماسکو لے آیا تو وہ حیران تھی کہ اسٹالین نے کیا ترکیب اختیار کی کہ اب وہ پیٹ بھر روٹی کھالیتا ہے۔ ایک مہینہ یہاں ٹھہرنے کے بعد وہ طفلس چلی گئی اور پھر واپس نہیں آئی۔ اہل جارجیا روسی نہیں ہیں، دونوں کی زبان بھی علٰحدہ ہے۔ چنانچہ اسٹالین روسی زبان بھی اہل جارجیا کے تلفظ میں بولتا ہے۔ جارجیا والے پہاڑی قوم سے تعلق رکھتے ہیں اور کاکیشیا کا خون ان میں ملا ہوا ہے، ان کے نقشے بھی روس والوں سے علٰحدہ ہیں اور اپنی قومی تاریخ الگ رکھتے ہیں

اسٹالین کے میلانِ انقلاب کا ایک سبب تو اس کی غربت تھی اور دوسرا مذہبی مدرسہ کی تعلیم جس نے اسکو پادریوں کے اخلاق کا موقعہ عطا کیا۔ چنانچہ مدرسہ چھوڑتے ہی وہ اُن لوگوں میں شامل ہو گیا جو مارکس کے فلسفۂ انقلاب کے پیرو تھے۔ اس نے ۱۸۹۸ء سے ۱۹۱۷ء تک پورے اُنیس سال نہایت تکلیف و مصیبت میں بسر کئے۔ محنت مزدوری گرفتاری، قید خانہ، جسمانی سزا اور روحانی کوفت سبھی کا مزا اسے چکھنا پڑا، کیونکہ حکومت اس انقلابی جماعت کی سخت مخالف تھی اور اس کے ممبروں کو کہیں چین سے بیٹھنے نہ دیتی تھی۔ یوں تو ہٹلر اور مسولینی بھی جیل کی زندگی بھگت چکے ہیں، لیکن اسٹالین سے زیادہ وہ اس لذت سے واقف نہیں۔ پانچ مرتبہ زار کی پولیس نے اسے گرفتار کیا اور پانچ ہی مرتبہ یہ جلاوطن کیا گیا، جب ۱۹۱۷ء کے انقلاب میں یہ آزاد ہوا ہے تو پانچویں مرتبہ قید بھگت رہا تھا۔

انقلابیوں کی دہشت انگیزیوں میں اس نے بڑا حصہ لیا۔ یہ بنکوں پر چھاپے مارتا اور وہاں سے روپیہ لا لاکر انقلابی تحریک میں صرف کرتا، ایک مرتبہ ۱۹۰۷ء میں بیس آدمیوں کو قتل کر کے پندرہ ہزار پونڈ کے نوٹ حاصل کئے۔ اسکی یہ حرکتیں اس کے بعض رفقاء کو پسند نہ تھیں اسی لئے ایک بار لینین نے اسے تھوڑے عرصہ کے لئے اپنی جماعت سے علٰحدہ کر دیا۔

جیل اور جلاوطنی کے علاوہ جو وقت اسے ملتا تھا اس میں وہ پھر وہی حرکتیں کرتا تھا کہ پھر جیل بھیجدیا جائے یا جلاوطن کر دیا جائے، اس نے ایک بار باکو سے بالشیوک اخبار (Verima) کے نام سے جارجین زبان میں نکالا اور جہاں جہاں انقلابیوں کے جلسے ہوئے ان میں شریک ہوا۔ اس نے ۱۹۱۲ء میں ایک کتاب بھی لکھی، جس کا نام (Socialism & National Question) تھا۔ یہ اس زمانہ میں سوشل ڈیموکریٹک پارٹی کا لیڈر تھا اور (Pravada) اخبار کا اڈیٹر۔ اس کے بعد ۱۹۱۳ء میں وہ پھر گرفتار کر کے جلاوطن

کردیا گیا۔ مگر یہ سارا زمانہ تمہیدی تھا کیونکہ اس کی اصل انقلابی زندگی ۱۷ء سے شروع ہوتی ہے، کیونکہ اس انقلاب کے بعد ہی روس کی شخصی حکومت ختم ہوگئی تھی اور دوسرے انقلابیوں کے ساتھ ساتھ یہ بھی نظم حکومت میں ایک ذمہ دار افسر بن گیا

خانہ جنگی کے دوران میں اس نے ٹراٹسکی کی طرح مستعدی نہیں دکھائی تاہم وہ انقلابی عسکری کمیٹی کا ممبر بنا، جب ۲۲ء میں لینن برسراقتدار ہوا تو جنرل سکریٹری کا عہدہ اس کو دیا گیا

سوویٹ روس میں کم از کم ایک سو مختلف قوموں کا مجموعہ ہے اس لئے ان میں باہم اتفاق و اتحاد رکھنا بہت دشوار تھا اور یہ خدمت اسٹالین کے سپرد تھی، چنانچہ اس نے مشورہ دیا کہ صوبوں کو خود مختاری دیدی جائے اور انھیں اسکو کی مرکزی حکومت سے وابستہ رکھ کر اسی نظام کا نام United State of (U.S.S.R) Soviet Russia رکھا جائے

اسٹالین اور ٹراٹسکی کے تعلقات ابتدا ہی سے خراب تھے۔ ایک بار اسٹالین نے محاذ جنگ پر بعض ناکارہ افسروں کو گولیوں سے ہلاک کر ڈالا۔ ٹراٹسکی نے جو سب سے بڑا فوجی افسر تھا اسٹالین کو تار بھیجکر جواب طلب کیا، اس نے وہ تار لیکر انگیٹھی میں ڈالدیا اور کوئی جواب نہیں دیا۔ لیکن وہ ہمیشہ اتنا سخت نہیں رہتا تھا، کبھی کبھی وہ انسان بھی ہو جاتا تھا

ایکبار پٹروگراڈ میں وہ کسی فوجی دستہ کا معاینہ کر رہا تھا کہ ایک سپاہی نے اسے سلام نہیں کیا، اس نے وجہ پوچھی تو اس نے پہلے اپنے پھٹے ہوئے بوسیدہ کرمچ کے جوتے کی طرف اشارہ کیا اور پھر اسٹالین کے بوٹوں کی طرف۔ اس نے فوراً اپنا جوتا اتار کر اسے دیدیا اور اس کے چیتھڑے خود اپنے پاؤں میں لپیٹ لئے اور جب تک خود لینن نے اسے مجبور نہیں کیا اس نے وردی کا دوسرا بوٹ استعمال نہیں کیا

لینن جو اپنے بعد اسٹالین ہی کا انتخاب چاہتا تھا، موت سے چار مہینے پہلے اس سے خفا ہو گیا تھا۔ لیکن جب اس کا انتقال ہوا تو عنانِ حکومت اسی کے ہاتھ آئی اور کامل پانچ سال اس نے تنظیم کے مکمل کرنے میں صرف کر دئے اس میں شک نہیں کہ اس نے اپنے مخالفوں کو نہایت بے رحمی سے ہلاک کیا اور جو شخص اس کے نقطۂ نظر سے غدار ثابت ہوا اس کو زندہ رہنے کی مہلت اس نے نہیں دی، لیکن بغیر اس کے وہ اپنا اقتدار قائم بھی نہ کر سکتا تھا

اسٹالین اور ٹراٹسکی کی مخالفت بہت مشہور ہے، اور ہر چند اسٹالین اس کو ذاتی مخالفت نہیں کہتا، لیکن فی الحقیقت تھی وہ ذاتی ہی، کیونکہ ان دونوں کے طبایع میں زمین آسمان کا فرق تھا، اسٹالین کہا کرتا تھا کہ ٹراٹسکی ارسٹاکریٹ (یعنی طبقۂ امرا کا رکن) ہے اور اس میں شک نہیں کہ وہ اپنے دماغ اور اسٹایل کے لحاظ سے واقعی ایسا تھا۔ ٹراٹسکی کہا کرتا تھا کہ اسٹالین وحشی ہے، مکار ہے اور سچ پوچھئے تو اس کا یہ کہنا غلط نہ تھا۔ الغرض ان دونوں کے مزاج میں بڑا فرق تھا۔ اسٹالین ایک پرجوش سیاسی انسان ہے اور اجتماعی رائے کا پابند، لیکن ٹراٹسکی زیادہ تر انفرادیت کا قائل

اسٹالین بے انتہا متحمل و سنجیدہ انسان ہے اور ٹراٹسکی کے جوش میں شگفتہ مزاجی کا عنصر قوی تھا، وہ حد درجہ خاموش و محتاط ہے اور یہ زندہ دل آزاد مزاج، اس میں حسن و نظم کی بڑی زبردست اہلیت ہے اور ٹراٹسکی میں یہ بات نہ تھی۔ ان دونوں کی مسکراہٹ کو دیکھو تو معلوم ہوگا کہ اسٹالین کے تبسم میں ایک شیر کی سی ہیبت ہے اور ٹراٹسکی ایک بچہ کی طرح مسکراتا ہے

علاوہ طبیعتوں کے اختلاف کے دونوں کی سیاسی راہیں بھی جدا تھیں۔ ٹراٹسکی ایک مستقل عالمگیر انقلاب کا قایل تھا، وہ اسٹالین کی طرح اس بات کا قایل نہ تھا کہ سوشلزم کو صرف روس کے اندر ہی کامیاب ہونا چاہئے۔ وہ یقین کرتا تھا کہ روس میں مارکس کا نظریۂ انقلاب اسی وقت قایم رہ سکتا ہے جب روس سے باہر بھی انقلاب مستقل طور پر پیدا کیا جائے

لینن کی وفات کے بعد ٹراٹسکی نے کہا کہ سوویٹ حکومت میں اشتراکیت کی ترقی رُک گئی ہے اور لینن نے جو عارضی رعایتیں سرمایہ دار قوتوں کے لئے جایز رکھی تھیں وہ پایدار ہوتی جارہی ہیں۔ اس لئے ضرورت ہے کہ روس سے باہر کی دنیا میں بھی اشتراکیت پھیلائی جائے۔ اسٹالین اس رائے کا مخالف تھا وہ کہتا تھا کہ ہمیں سب سے پہلے روس کو سنبھالنا چاہئے اس کے بعد باہر کی دنیا ہے اور اس کی رائے کی صحت کا اندازہ روس کی پنج سالہ اسکیم سے ہوگیا ٹراٹسکی کے خارج البلد کئے جانے سے قبل کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ اسٹالین کی یہ اسکیم اسقدر کامیاب ہوگی

روسی حکومت کے دائیں اور بائیں پہلو دونوں اسٹالین کے مخالف تھے۔ داہنا پہلو یہ کہتا تھا کہ اشتراکیت ضرورت سے زیادہ جلد بڑھتی جارہی ہے اور بایاں پہلو اس کی سست رفتاری کا شاکی تھا، اسٹالین نے اپنی چالوں سے ان دونوں کا زور توڑ دیا اور تمام مخالفین کو نکال باہر کیا۔ ہر چند اس نے ٹراٹسکی کی مخالفت اس حد تک کی کہ دفتروں کے رکارڈ اور اسکول کی کتابوں تک سے اس کا نام خارج کر دیا تاکہ جو نسلیں آنے والی ہیں وہ اس سے بالکل ناواقف رہیں، لیکن اس میں کلام نہیں کہ اس نے ٹراٹسکی کے بنائے ہوئے پروگرام سے فایدہ ضرور اُٹھایا۔

ٹراٹسکی نے ۱۹۲۱ء ہی میں صنعتی ترقی کی پنج سالہ اسکیم تجویز کی تھی اور سوچا تھا کہ ۱۹۲۵ء میں سرمایہ دار کاشتکاروں کا قلع قمع کر دے گا۔ اسٹالین نے بھی اسی پر عمل کیا لیکن پانچ سال بعد یعنی فرق یہ ہوا کہ ٹراٹسکی اس اسکیم کا نفاذ قبل از وقت چاہتا تھا اور اسٹالین صحیح وقت کا انتظار کر رہا تھا

۱۹۳۳ء کا قحط سوویٹ حکومت کے زمانہ کا خاص واقعہ ہے جس کی تفصیل دلچسپی سے خالی نہیں۔ پنج سالہ اسکیم میں یہ تجویز بھی شامل تھی کہ ملک کی تمام کاشت کو اجتماعی ملکیت قرار دیا جائے۔ اس وقت تقریباً ڈھائی کروڑ ٹکڑوں میں وہاں کی زمین منقسم تھی حکومت نے چاہا کہ ان سب کو اجتماعی ملکیت قرار دیکر تمام کسانوں کو برابر کا شریک بنا دیا جائے اس کی تدبیر یہ سوچی گئی کہ تمام کاشتکار اپنے آلات کشاورزی اور مویشی فارم منیجر کے حوالہ کر دیں اور ٹرکیٹروں کی مدد سے

سب ملکر اجتماعی حیثیت سے کاشت کا کام کریں، لیکن کسانوں میں اس سے سخت برہمی پھیل گئی اور انھوں نے غصہ میں آکر اپنے مویشیوں کو ہلاک کرنا شروع کر دیا اور تقریباً نصف مویشی روس کے فنا ہو گئے، چنانچہ سرکاری رپورٹ سے معلوم ہوتا ہے کہ گھوڑوں کی تعداد بجائے تین کروڑ پینتیس لاکھ کے ۳۲ء میں صرف ایک کروڑ ۹۶ لاکھ رہگئی، مویشی سات کروڑ سے چار کروڑ رہ گئے اور بھیڑ بکریاں چودہ کروڑ سے پانچ کروڑ رہ گئیں۔ اسی کے ساتھ انھوں نے صرف اتنی کاشت کی جتنی ان کو اپنے لئے درکار تھی اور باقی زمین یونہی چھوڑ دی۔ اسٹالین نے کسانوں کی یہ بغاوت دیکھ کر سوچا کہ ان باغیوں کی سزا یہی ہے کہ ان سے زمین کا ٹیکس بدستور پورا وصول کیا جائے اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ملک کا ملک فاقہ میں مبتلا ہو گیا۔ اسی کے ساتھ اسٹالین نے سرمایہ دار کاشتکاروں کو فنا کرنا شروع کیا یہاں تک کہ روس کی زمین ان کے وجود سے پاک ہو گئی۔ کسانوں نے سوویٹ حکومت کو ختم ہی کر دیا تھا اگر اسٹالین کے علاوہ کوئی دوسرا یہاں کا ڈکٹیٹر ہوتا۔ کسانوں نے اپنے مویشیوں کو ہلاک کیا اور اسٹالین نے انھیں ہلاک کر کے اس کا انتقام لیا

اسٹالین انسان ہونے کی حیثیت سے برا نہیں ہے اور نہ اپنے ذوق کے لحاظ سے پست ہے۔ اس کا مطالعہ تاریخ و فلسفہ کا بہت گہرا ہے اور وہ دنیا کے واقعات سے ہمیشہ باخبر رہتا ہے۔ اس کے اخلاق بھی اچھے ہیں اور وہ نمود و نمایش کو بالکل پسند نہیں کرتا۔ وہ لوگوں سے بہت کم ملتا ہے، لیکن جب ملتا ہے تو پورے انہماک کے ساتھ، وہ پبلک تقریریں کرنے کا بھی زیادہ عادی نہیں، لیکن جب کوئی تقریر کرتا ہے تو اس سے اس کا عزم و ثبات پوری طرح ظاہر ہوتا ہے۔

وہ جب ماسکو میں ہوتا ہے تو کرالمین میں رہتا ہے جو چالیس پچاس عمارتوں کا ایک احاطہ ہے ورنہ زیادہ تر وہ ماسکو سے باہر ہی رہتا ہے۔ ہٹلر اور مسولینی کی طرح وہ محافظ دستوں سے گھرا ہوا نہیں رہتا۔ بسا اوقات وہ پاپیادہ چل کھڑا ہوتا ہے اور کوئی محافظ اس کے ساتھ نہیں ہوتا۔ وہ کتابوں کے مطالعہ کا بہت شایق ہے اور کبھی کبھی شطرنج بھی کھیلتا ہی، گاہے رقص و سرود کی صحبتوں میں بھی شریک رہتا ہے۔ وہ پائپ بہت پیتا ہے اور برانڈی کا بھی شایق ہے۔

اس نے دو مرتبہ شادی کی۔ پہلی بیوی ۱۷ء میں مر گئی۔ اس سے ایک لڑکا ہے جس کی عمر اب ۲۶ سال کی ہے لیکن بالکل مجہول و ناکارہ ہے۔ ۱۹ء میں وہ اپنے ایک رفیق سے ملنے گیا جو قفل سازی کا پیشہ کرتا تھا وہاں اس کی لڑکی سے ملا اور اسی وقت شادی کا پیام دیدیا، اس سے دو بچے پیدا ہوئے ایک لڑکا جو اب ۱۵ سال کا ہے اور دوسری لڑکی دس سال کی ہے۔ یہ بیوی بھی ۳۲ء میں انتقال کر گئی

اسٹالین کی تنخواہ ایک ہزار روبل ماہوار ہے جس کی قیمت ۳۶ء میں ۶ پونڈ پندرہ شلنگ یا ۹۰ روپیہ ہوتی ہے اسے روپیہ سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ تمام سوویٹ افسروں کی طرح وہ بھی نہایت سادہ غربت کی زندگی بسر کرتا ہے۔ پہلے ہاں یہ دستور تھا کہ ۲۲۵ روبل ماہوار سے زیادہ تنخواہ کسی کو نہ مل سکتی تھی۔ لیکن اب مرتبہ کے لحاظ سے مقرر ہوتی ہے اور

اس کا اوسط ۰۰ ۲ روبل پڑتا ہے۔

وہ کسی مذہب کا پابند نہیں ہے اور اس کا مذہب اشتراکیت ہے۔ وہ کوئی خطاب نہیں رکھتا اور اپنے رفقاء سے وہ انتہائی بے تکلفی سے ملتا ہے

روس کی خارجہ پالیسی

روس کی خارجہ پالیسی صرف ایک لفظ سے ظاہر کی جا سکتی ہے۔ یعنی امن وسکون۔ وہ سولہ سال سے اس کوشش میں لگا ہوا ہے کہ دنیا میں اب جنگ نہ ہونے پائے کیونکہ اشتراکیت کی ترقی بغیر امن وسکون کے ممکن نہیں

سوویٹ حکومت کے دو بڑے دشمن ہیں، جرمن اور جاپان اور وہ انھیں کے خطروں سے محفوظ رہنا چاہتی ہے۔ سوویٹ حکومت لڑائی سے اتنا بچنا چاہتی ہے کہ جاپان کو خوش کرنے کے لئے اس نے منچوریا کی ریلوے چوتھائی قیمت سے کم میں اس کے ہاتھ فروخت کر دی اور ہر چند وہ جاپان کے توڑ میں امریکہ سے ملا رہنا زیادہ پسند کرتی ہے، لیکن اتنی نہیں کہ جاپان اس کو مخالف سمجھنے لگے

جرمنی کی طرف سے وہ بہت زیادہ فکرمند رہتی ہے، کیونکہ روس اور جرمنی کے درمیان پولینڈ کی حکومت فی الحقیقت جرمنی کی حلیف ہے اور اسی لئے روس یہ چاہتا ہے کہ اس کے اور جرمنی کے درمیان جو چھوٹی حکومتیں حایل ہیں (خصوصیت کے ساتھ لتھونیا) ان کی آزادی قایم رہے۔

اس سے قبل عرصہ تک روس اور جرمنی میں اتحاد رہا ہے لیکن ۱۹۳۳ء میں ہٹلر کے اقتدار سے یہ اتحاد ختم ہو گیا کیونکہ ہٹلر روس اور اس کی اشتراکی تحریک کا سخت مخالف ہے۔ روس نے مجبوراً فرانس اور زیکوسلاویکیا سے عسکری اتحاد قایم کیا جس سے مقصود یہ تھا کہ جرمنی کے چاروں طرف اسلحہ کا حصار قایم کر دیا جائے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اگر جرمنی نے کسی وقت فرانس پر حملہ کیا تو کیا روس اس کی مدد کر سکے گا؟ اس کا جواب یقیناً نفی میں دیا جائے گا کیونکہ دونوں کی سرحدیں متصل نہیں ہیں البتہ پراگوے (پایۂ تخت زیکوسلاویکیا) کو ہوائی جہازوں کا مرکز بنا کر ضرور برلن پر حملہ کیا جا سکتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہٹلر، زیکوسلاویکیا پر اپنے دانت جمائے ہوئے ہے تاکہ کسی طرح فرانس اور روس کے اتحاد کی اہمیت کو دور کر دیا جائے۔ لیکن ان تمام معاملات پر سب سے زیادہ اثر برطانیہ کی پالیسی کا پڑتا ہے۔ اگر وہ جرمن کی طرف جھک جائے تو پھر روس و فرانس کا اتحاد بیکار ہو جاتا ہے اور اگر روس کی طرف مایل ہو جائے تو جرمن کی تمام امیدیں وسط یوروپ میں پھیلنے کی خواب وخیال ہو جاتی ہیں۔ اور اسی توازن کو قایم رکھنے کی فکر میں برطانیہ کوئی فیصلہ نہیں کر سکا کہ اسے کیا کرنا ہے اور شاید عافیت اسی میں ہے کہ وہ اس فیصلہ کو ملتوی رکھے۔ لیکن کب تک؟ اگر جرمن نے زیکوسلاویکیا کے خلاف کوئی عسکری کارروائی شروع کی تو برطانیہ کو یہ دورخی پالیسی ترک کرنا پڑے گی اور بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہٹلر کے مقابلہ میں فرانس ہی کو ترجیح دے گا۔

انتخاب کلام نسبتی تھانیسری

(۳)

مولوی فضل حسین صاحب تبسم گزشتہ دو اشاعتوں میں کلام نسبتی پر نہایت محنت و کاوش سے تبصرہ فرما چکے ہیں، اور اب انتخاب کلام پیش کیا جاتا ہے، جس کا حق میں نے اُن سے حاصل کر لیا ہے

تبسم صاحب کا ممنون ہوں کہ انھوں نے انتہائی محبت و خلوص سے کام لیکر کلیات نسبتی کا مخطوطہ میرے پاس بھیجدیا اور مجھے انتخاب کا موقع دیا۔ یہ نسخہ مکمل تو یقیناً نہیں ہے، لیکن اس سے زیادہ مکمل شاید کہیں مل بھی نہیں سکتا اور ملک کو تبسم صاحب کا شکر گزار ہونا چاہئے کہ ان کی وساطت سے ایک خوش فکر شاعر کا گمشدہ کلام ہاتھ آگیا

نسبتی کی شاعری کے متعلق تبسم صاحب کافی لکھ چکے ہیں، اس لئے اب اس میں کسی اضافہ کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی

نیاز

نے راہ و نہ رسم ست و نہ توفیق نیاز را ——— رہ گم شدگانیم چہ جوئیم خدا را
گل امروز تماشہ حال مکن ،، ——— نسبتی خیر می شود فردا
بدنامیٔ تازہ برانگیخت است گرد، ——— طشتے دگر فتادہ ہمانا ز بام ما ؛؛
بگزار تا دسلے زشکایت تہی کنم ، ——— در سینہ می خلد گلۂ ناتمام ما
زلف یکجا بند یکجا دام یکجا عقدہ است ——— اندک اندک کردہ ام ایں قصۂ بسیار را
صد گرہ از کار ہر گبر و مسلماں وا شود ——— نسبتی گر وا کند یک رشتۂ زنار را
نگاہے چند باید کرد تا فارغ کند ما را ——— یکے جاں می برد از ما یکے دل را یکے دیں را
تو ایجاں در نمی آئی، دل از جا در نمی آید ——— کسے تا چند بر پا دارد ایں آرام و تسکیں را
اے مرغِ چمن نالۂ و زارِ تو جگر سوخت ——— از نسبتی آموختہ ای طرزِ نوا را

سنے وعدہ نے امید تو خود گو جواب چیست
پرسند گر ز ما سبب انتظار ما

ورائے عشوہ و ناز و خرام و رعنائی
دگر ہزار بلا ہمرہیست بالا را

اے آنکہ بیغانہ روی از کنار ما
آگاہ نیستی مگر از انتظار ما

کس نداند کہ کجا حسن تو یکجا کردہ
اینہمہ خوبی و زیبائی و رعنائی را

اشک ریزاں میروم در وادیٔ آوارگی
تا کجا خواہم فشرد ایں دامن نمناک را

برہم زدہ کار میروی لیک
کارست ہنوز با تو ما را

ما از دل و از کام دل خویش گزشتیم
امروز اجابت نتواں داشت دعا را

بزم جم آخر شد و وقت صبوح ما رسید
طرح دیگر می تواں انداخت دورِ جام را

نسبتی اندر دل بے رحم او تاثیر نیست
نالہائے صبحگاہ و گریہ ہائے شام را

۔۔ تو رفتم وسنے بے تو در غمت مردم
یکے ز دست نیامد ازیں دو کار مرا

دل گرفتار و یار بے پروا
ایں ہماں کوچہ من ہماں رسوا

دل و صد آرزوے خام بہ دل
یار و چندیں فریب و من تنہا

خوباں بردید از دل ما تو
آساں بکنید مشکل ما

موقوف بہ خنجر دگر شد
آسایش نیم بسمل ما

رفتیم ز کوئے یار اینک
در دامن ماست حاصل ما

اے بادشہ بتاں خدا را
در بزم طلب کن ایں گدا را

در نسخۂ نسبتی ست یک نام
عنقا و وفا و کیمیا را

قرباں شوم ابروِ بتاں را
زورِ دگرست ایں کماں را

چشم خراب آنرد دل مبتلائے زلفش
عیسیٰ بدین عیسیٰ، موسیٰ بدین موسیٰ

چارہ نتواں کرد دردِ کہنہ و دیرینہ را
دست بر دل می نہادم پارہ کردم سینہ را

در دلِ سنگین آں بے رحم تاثیرے نکرد
نسبتی بر گریۂ خود خندہ می آید مرا

باز می جویم دلِ افسردہ را
آں دل و آں خاطر آزردہ را

تو آنہا کردۂ اے شوخ با ما
کہ نے مومن کند با کس نہ ترسا

میکنم سخت یاد او امروز
غالبؔ یاد کردہ است مرا

بیش ازیں بودہ است حال خوشے
نالہ و اشک و آہ بود مرا

مردیم و بود در دل حرفے کہ با تو گویم
درخاک رفت با ما راز نہانی ما

داشتم زیں پیش باخود اندکے دیوانگی
عقل ناداں نسبتی دیوانہ ترکردہ مرا

نمود وعدۂ قتلم دو چشم او لیکن
چہ اعتماد تواں کرد قول مستاں را

ہر طبیبے کہ بیاید بسرم بہر علاج
او جدا گریہ نماید من بیمار جدا

ہجر شس از آب می برآرد دود
وصلش از شعلہ می چکاند آب

حال می پرسی و ما را گفتگو ہا کم شدست
بسکہ برہم خوردہ دلہا آرزو ہا کم شدست

مے باقی و ماہتاب باقی ست
ما را بتو صد حساب باقی ست

سر من گر بود ت ورنہ بود رنجش نیست
چہ تواں کرد مرا با تو سرے افتاد است

بر نسبتی امروز عجب حال غریب ست
چوں گردش ایام نہ آرام نہاد ست

در وصل عیش می کشد و در فراق غم
مانند شعلہ حسن ترا پشت و رو یکے ست

ابروش از عقدہ پیشانیش از چیں تہی
نسبتی امروز وقت التماس حاجت ست

بر خاک تو آمدہ ست جاناں
برخیز کہ وقت جانفشانی ست

خرمن دل را ہماں شمع وفا باید نہ برق
خاطر پروانہ از ہر آتشے خرسند نیست

دل باختۂ بہر نگاہ تو نشست است
رہ گم شدۂ بر سر راہ تو نشست است

نالہ بسیار و آہ بسیار است
درد را دستگاہ بسیار است

یک نظر غفلت از رخ تو مباد
اندکے ہم گناہ بسیار است

در ہر کہ بنگرد غلط یار میخورد
چشم خطا نظارہ ندانم چہ دیدہ است

داغے شدست لالہ و زخمے شدست گل
ایں ماجرا بہ مرغ چمن می تواں نشست

نشگفتہ سگلے اگر بہ بینی
گل نیست دل ست آنکہ وا نیست

از روز و شب نسبتی احوال چہ پرسی
ہر صبح گرفتار تو ہر شام اسیر ست

عمر در کوئے انتظار گزشت
عمر بگزشت و روزگار گزشت

زخمہا دارد تفاوت در میاں
ورنہ خار و نشتر و مژگاں یکے ست

ما نسبتی از بزم طرب بخت نداریم
تہمت بہ خم و بادہ و ساغر نتواں بست

بر رخش کج نشستہ و تر کانہ می رود
بیدرد را کہ ہیچ غم داد خواہ نیست

بیگانگیم عجب مدارید
دیوانہ بخویش آشنا نیست

بس کن اے واعظ در آغاز نصیحت لب ببند — نسبتی پایان این افسانہ می داند کہ چیست

ز جام جم چہ می پرسی حکایت — ترا امشب کہ خون دل بہ جام ست

نسبتی یک جرم را صد عذر گفت — گرچہ تقصیرے کہ می باید نداشت

پیوند دل از ہمہ بریدیم — دیرست کہ خاطرم بجا نیست

گرد از سر کوئے یار برخاست — آہے ز دم و غبار برخاست

گل ہمہ گوش ست لیکن صوت بلبل نارسات — نالہا کوتاہ افتادست جرم گوش نیست

از خون دلم شیشۂ مے ز سر بکام ست — بر حوصلۂ جام جم این بادہ حرام ست

در رہ بادہ نشستیم ہمہ — چہ تواں کرد کہ بوئے تو خوش ست

بہار رفت و ز دیوانگی نہ دانستم — کدام باغ و کدام این چمن کدام گل ست

بگذر تو نسبتی ز جفائے کہ بر تو رفت — آں شوخ ہم ز تندی آں خو گذشتہ است

گفت میترسم کہ من بسیار میخواہم ترا — آرزو خوبست اما اینقدر ہا خوب نیست

ہمہ جا از تو گفتگوئے ہست — نیست جائیکہ ماجرائے تو نیست

داد جاں نسبتی و دید ترا — مفت دیدست رونمائے تو نیست

بادہ ہرچند بود تلخ نہ تلخیش بد است — یار ہرچند کہ بد خوئے بود بد خو نیست

دی خام بود داغ دل امروز پختہ شد — فردا امید وعدۂ یک سوز دیگرست

غمت رفتہ رفتہ بدل خو گرفت — دلم سوختہ سوختہ بو گرفت

تو گفتۂ کہ بیا نسبتی و حیرانم — ز بیدلان تو بسیار کس بایں نام است

آمد آں تیر نگہ از سینہ ام پرّاں گزشت — لیک اندر گوشۂ دل نوک مژگانے شکست

جذب نگاہ اوئے دل بردن منست — ایں برق را معاملہ با خرمن منست

باغ را دستگاہ روئے تو نیست — گل بسامان رنگ و بوئے تو نیست

مارا کم و بیش از غم عشقت خبرے ہست — گر زخم دلے نیست خراش جگرے ہست

منکہ زنیساں فتادہ ام بدرست — کس چہ داند مرا چہ افتادست

تا گنج خرابۂ کہ باشی — بہر تو ہزار دل خرابست

حسن را نبود تفاوت چہ بکنعاں چہ بمصر — میرود ہر جا کہ یوسف گرمی بازار ہست

داستان دگراں رفت زیاد — قصۂ ما و تو افسانہ شدہ است

قامتش سخت دلکش افتاد است   ورنہ قد بلند بسیار است

بآب داد مرا سیلِ گریۂ شادی   شبِ وصال نگوئید روزِ طوفانست

بشہر ما نبود نسبتی کسے خوشدل   بخند دیا لبِ زخم است ویا لبِ چاکست

شمع روشن کن کہ تا روشن شود احوالہا   ورنہ بال و پر پروانہ چندیں دفتر است

خاموش گشتہ تو ولے گفتگو بجاست   چندیں حدیث بالبِ خاموش رفتہ است

بہ نیم گام جدائی نبودہ ام راضی   کنوں میانِ من و دل ہزار فرسنگ است

نیست ویراں دلِ خراب امروز   تا بنا کردہ ام خراب شدہ است

رفت جاناں و کسے از حالِ ما آگاہ نیست   کس چہ داند غیر دل آنہا کہ بر جاں رفتہ است

عذرِ ستم ترا رسد و بر خلاف آں   تو میکنی جفا و دلم عذر خواہِ تست

میروی میبری ز راہ مرا   اینچہ راہ است اینچہ رفتار است

می نماید از شگافِ سینہ اش لختِ جگر   خلق گوید نسبتی گل در گریباں کردہ است

نسبتی ہرچہ در دل است ز تو   بر زباں آید و ادا نشود

حالِ پروانۂ کہ در شب سوخت   شمعِ خاموش را تواں پرسید

صد جگر از تو ہست بر آتش   باش تا یک جگر کباب شود

چوں برگ خزاں باد بویرانہ رساند   مکتوب کہ دیوانہ بدیوانہ نویسد

رسیدن ہماں دل سپردن ہماں   نہ من دیر کردم نہ او دیر کرد

نسبتی گریۂ نیاز مکن   باش تا خندۂ بناز کند

خواہ مومن خواہ ملحد خواہ کافر خواہ گبر   نسبتی را ہرچہ میگوئیم قائل میشود

بسیار غنچہ گل شد و بسیار دل شگفت   دلتنگ را خبر ز شگفتن نمی شود

ہر گلے را کہ داغ بر دل نیست   لالۂ نوبہارِ ما نشود

یکبارہ تمنا میتواں شد   ببوئے گل تسلی میتواں شد

دردِ دل تا با تو گویم دیدہ پر خوں میشود   راز بیروں میترا و د جامہ گلگوں میشود

دل را بتو سپردم و شادم دگر چہ ماند   چیزیکہ داشتم بتو دادم دگر چہ ماند

عرقے کز جبینِ ناز چکد   در گریبانِ آفتاب کنید

رو دہد ہرچہ رو دہد ز آنرو   نسبتی رو بیار خواہد کرد

از کوئے تو ہر کجا رود کس   شرمندہ رود خجل نشیند،

بلبلاں ہم مزاجداں نشدند   کس چہ داند کہ گل چہ خو دارد

کشتۂ او برہنہ کے ماند   لالہ از خونِ خود کفن دارد

بامن چہ دل از تو راز گوید   گوید سخنے و باز گوید،

چہ قاصد و چہ پیام و چہ مژدہ و چہ خبر   بہ ہیچ حیلہ دل امیدوار نتواں کرد

دگر ز چشم تو امیدوار لطف شدیم   نگاہ کردی و دل باز در بلا افتاد

ابتدائے پیالہ بیہوشی است   آنقدر مے بخور کہ ہوش آید

من زمانِ دگر بہ ہوش آیم   لحظۂ انتظار من بکشید،

مے در پیالہ خونِ جگر در کنار بود   فصلے کہ من اسیر شدم نوبہار بود

جان بود و مدتے بچشیدم ز ابلہی،   چوں بر لبم رسید عجب خوشگوار بود

افسوس کہ سر رشتہ ام از دست بدر شد   دل بردی و رفتی و مرا دیر خبر شد

بودیم ز خود بے خبر افتادہ ولیکن   در سینہ خلیدی و بیکبار خبر شد

مرا بیروں کن از جائیکہ آنجا   تو باشی و دل آشفتہ باشد

خلاف وعدہ ندانی دلے بایں طالع   بوعدہائے تو امیدوار نتواں شد

ہست کسے باز بدنبالِ من،   میروم و دل لقفا میرود

ساغرِ مے سایۂ بیدار نباشد گو مباش   خونِ دل در سایۂ دیوار میباید کشید

پیش من یک حکم دارد مہرگان و نوبہار   در قفس رانند گرچہ در بہارم زادہ اند

می نداند روشِ بزم دلِ وحشی ما   مگذارید کہ دیوانہ بمحفل برود

ریختیم از مژہ خونابہ و مے گلگوں شد   یادِ لعلِ تو نمودیم و قدح پر خوں شد

ماندا ست چنیں کہ غنچہ خاموش   زاں لب سخنے شنیدہ باشد

گفتا کہ چگونہ میدہی جان،   جانان گفتیم و جان برآمد

بر عیشِ روزگار زدہ پشت پا بناز   خوشوقت آں گروہ کہ غمگیں گزشتہ اند

میرسی و نیستی آگہ چہ بر جان میرسد   میروی و ہم نمیدانی چہ بر دل میرود

درد تو سزائے دل بیدرد نباشد   آزردہ دلی منصبِ ہر مرد نباشد

چہ بلاست ایں ندانم کہ من و تو ہم شرابیم   دل تو ہمی کشاید دلِ من نمی کشاید

یار چوں بے حجاب میخندد — گوئیا آفتاب میخندد

کس بے خبر بگو کہ نیاید بکوئے عشق — ما بیخبر شدیم بیاراں خبر رسد

بفردا گفتۂ خونت بریزم — مباد امروز از شادی بمیرم

بگفتی نسبتی گو حال چونست — بسرت گردم نہ غمگینم نہ شادم

در کوئے تو بر خاک نشستیم نشستیم — با خاطر غمناک نشستیم نشستیم

دیوانگی ببیں کہ ز دنبال کارواں — چنداں دویدہ ام کہ ز محمل گزشتہ ام

کدامیں شب بود یارب کہ آں شب — تو باشی شمع و من پروانہ باشم

ہرکجا دل میرود من در پئے دل میروم — دل اگر دنبال ماند من بمنزل میروم

چہ گل شگفتہ دریں باغ نسبتی کہ مدام — ترا و مرغ چمن را بنالہ می بینم

دگر از خاکِ آں کو برنخیزم — بخاکِ پائے او سوگند کردم

از گفتگوئے عیش و طرب باز ماندہ ایم — ساز شکستہ ایم ز آواز ماندہ ایم

دیروز بہ بلبلم شب افتاد — افسانہ بوئے گل شنیدیم

در صید گاہ چشم سیاہے نشستہ ام — امیدوار تیر نگاہے نشستہ ام

چوں مرغ سراسیمہ ز پرواز فتادم — برخاستم از پائے گل و باز فتادم

سخن تمام نشد نسبتی و جاں دادم — حدیثِ شوق دراز ست مختصر گفتم

پارۂ دل بر جگر لختِ جگر بر روئے دل — پارہ ہا را دوختم اما پریشاں دوختم

دماغم نسبتی آشفتہ گشتہ است — نہ با بلبل نہ با گل می نشینم

بیا اے دل کہ باہم راز گوئیم — حدیثے بشنویم و باز گوئیم

من و تو ہر دو مرغ بستہ بالیم — بہم افسانۂ پرواز گوئیم

نیاز دل بمژگانش رسانیم — سلام صعوہ با شہباز گوئیم

یاراں ببال شوق پریدند و ما ہنوز — در انتظار شہپرِ عنقا نشستہ ایم

دیوانگی ببیں کہ چو طفلانِ بے خبر — امروز خوش بوعدۂ فردا نشستہ ایم

جز تو گم گشتۂ تو نیست بجو — خویش را جستہ جستہ پیدا کن

چو ز حالِ من نسبتی بہ نگہ سوال کردی — ز ہجومِ گفتگو ہا گلہ پائمال کردی

مہت گفتم برخ برقع گرفتی — مرا از روئے خود شرمندہ کردی

ایک صناع کے نفسیات

(۱)

" دو دوست ایک ہی عورت سے محبت نہ کریں " یہ کسی قانونی دفعہ کا جزو تو ہے نہیں کہ جرم ہو، اور اگر حکیمانہ نظر سے دیکھا جائے تو ایسے دو دوستوں کی محبت میں اضافہ ہو جانا چاہئے۔ کہ باہمی تعلق خاطر کا مدار تو اشتراک ذوق ہی پر ہے۔ بہر حال وسط ہند میں اس مسئلہ پر ایک شاہانہ فلسفہ مرتب ہو گیا ہے۔ مگر ہماری سماج اس کو روا نہیں رکھتی اور نفسیات انسانی کا بھی فیصلہ یہی ہے کہ مذہب محبت میں شرک ناروا ہے۔ رشک ورقابت فطری جذبہ ہے

جوتیش گپتا اور نرمل چندر سین بچپن کے ساتھی اور ہم سبق دوست تھے۔ دونوں نے ایک ساتھ ڈگری حاصل کی تھی بلا دیوی مزمدار بی۔ اے کے آخری سال کے لئے اُسی کالج میں داخل ہوئی، اور اگرچہ یہ دونوں دوست تھے لیکن جب بلا سے ربط وضبط بڑھا تو دونوں کو اُس سے محبت ہو گئی۔ عام مشاہدے کے خلاف ان کی محبت میں یہ خاص بات دیکھنے میں آئی کہ وہ رشک رقابت کے رکیک جذبے کا شکار نہ بنے۔ بلکہ ایک نے دوسرے سے اپنے احساسات کا حال بیان کر دیا اور اس پر متفق ہو گئے کہ دونوں میں سے بلا جس کو چاہے منظور کرے

بلا کی زیبائی میں وہ تمام اجزاء شامل تھے جو حُسن بنگالہ کو جیتا جاگتا جادو بنا چھوڑتے ہیں، اور اس کی دلربائی میں وہ تمام جاذبیتیں موجود تھیں جو بر ہمو کلچر ایک لڑکی میں پیدا کر سکتا ہے۔ بلا جتنی حسین تھی اتنی ہی ذہین بھی، اور جس قدر نرم و نازک تھی اسی قدر سوشیل بھی تھی۔ جوتیش وجیہہ و مضبوط قوے کا نوجوان تھا اور باوجود عملی انسان ہونے کے اس کی فطرت میں ہمدردی کا عنصر بھی تھا۔ نرمل شکل وصورت کے اعتبار سے تو اتنا دلکش نہ تھا جتنا اُس کا دوست تھا لیکن ذہن وطبیعت کے اعتبار سے نہایت حسین نوجوان تھا۔ نرمل کو ایک تخیلی انسان کہنا غلط نہ ہوگا۔ اُس میں زندگی کے عوض ربودگی کا عنصر زیادہ تھا۔ اس پرواز طبیعت کے ساتھ اگر تعلیمی مضمون بھی ادب ہو اور پروفیسر ایک شاعر، تو ایسے طالبعلم کا شاعر نہ بنجانا کمال حیرت کی بات ہوگی، چنانچہ نرمل کی شاعرانہ فطرت کو پرواز کا پورا موقعہ ملا۔

بلا کا نسوانی احساس جوتیش کی وجاہت سے متاثر تھا، لیکن اس کا ذوق نرمل پر فریفتہ تھا۔ اس لئے جب نرمل نے فطری ایثار سے پہلا موقعہ جوتیش کو دیا تو بلا نے اس سے کہدیا کہ:۔ " جوتیش، اگرچہ میں تمھیں بہت پسند کرتی ہوں

تم میرے ذوق کے معیار پر پورے نہیں اُترتے!" — اس کے بعد نرمل نے اپنی آرزوں کو پیش کیا اور ہر چند جوتش کی سی خوبی نرمل کے پاس نہ تھی مگر بملا نے اُسے قبول کرلیا اور اُن کی شادی ہوگئی — بی اے پاس کرنے کے بعد ہی نرمل ایک بڑے ترکہ کا مالک بن گیا لیکن عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ موروثی دولت کی قدر نہیں ہوتی اور جس کی طبیعت میں نرمی اور ہمدردی ہو، وہ دولت کی قدر تو کجا اُس کا صحیح استعمال بھی نہیں جان سکتا چنانچہ نرمل کے اسراف کی کوئی حد نہ تھی، احباب و اقارب کے علاوہ اگر کوئی اجنبی بھی اُس کے پاس اپنی ضرورت لیکر پہونچ سکا تو مایوس نہ پلٹا اور دوستوں شناساؤں میں تو شاید ہی کوئی ایسا ہو جسکی ضرورت نرمل کے علم میں آئی اور رفع نہ ہوگئی ہو۔ البتہ اتنا ضرور تھا کہ غائب دوست اس کے نزدیک غائب ہی ہوجاتا تھا، غرض اُس کی دولت کو ختم ہونا تھا اور وہ ختم ہوگئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ تمام دوستوں سے جدائی ہوگئی، شعر و ادب کے سوا اور کوئی ساتھی اس کی تنہائی کا باقی نہ رہا

شعر کے باب میں نرمل کے خیالات و عقاید کچھ جاپانی نظریات سے متاثر تھے اور مشق و مطالعہ کے ساتھ زندگی کے دلشکن تجربات، نیز اُس کے غمگین حالات نے اُسے نہایت نازک خیال شاعر بنا دیا تھا، نرمل کو اپنے فن سے عشق تھا اور تہذیب و تمدن میں ریاکاری کے سوا اُسے کچھ نظر نہ آتا تھا، اس کی طبیعت کا یہ انداز اُسوقت تکمیل کو پہونچا جب وہ افلاس کی چکی میں پسنے لگا، اور اس حالت نے اسکی طبیعت میں مزید تغیر یہ پیدا کیا کہ اس کا دل انسانی غلط کاریوں پر دُکھنے لگا اور اُس کی معیار ادب میں حکیمانہ پہلو پیدا ہو گیا — جوتش کی زندگی کلرکی سے شروع ہوئی۔ اس معاشی پستی نے اس کے دل سے بملا کو بھی بھلا دیا۔ مگر وہ چونکہ حرکت و عمل کا انسان تھا، اُسے ایک موقعہ ترقی کا مل گیا اُس کا موضوع تعلیم تو اقتصادیات رہا تھا، لیکن ایک بہت بڑی فلم کمپنی سے تعلق ہوگیا اور چونکہ تیز آدمی تھا، بہت جلد فلم ڈائرکٹر بن گیا۔ یہ "سینہ ریو" بھی خود ہی لکھ لیتا تھا، امریکن فلموں سے کاٹ چھانٹ کر فسانے بھی خود ہی مرتب کر لیتا تھا، مختصر یہ کہ اب وہ بڑا آدمی تھا.
حالات مساعد ہوئے تو جوتش نے نرمل کے ساتھ بھی تعلقات کو تازہ کیا جو جد و جہد کے زمانہ میں بالکل ترک ہوگئے تھے

(۲)

جوتش نے جیب سے سگار کیس نکالکر نرمل کی طرف بڑھا دیا، اور کہنے لگا: — "یہ سنکر کہ بملا کو درد سر کی شکایت ہے مجھے بہت افسوس ہے" نرمل نے ایک سگار نکال کر میز پر رکھ لیا اور ایسے لہجے میں جس سے عام بیزاری کا اظہار ہوتا تھا کہنے لگا: "یہ شکایت اُسے اکثر ہوجاتی ہے۔ سگار بہت نفیس ہیں۔ شکریہ!" — آج کل نرمل چاندنی بازار کی اونچی عمارت کے بالائی حصہ میں رہتا تھا، اور جس چھوٹے سے کمرے میں یہ دونوں باتیں کر رہے تھے وہ نرمل کا دار المطالعہ تھا اور نشست گاہ بھی۔ کمرے کی حالت سے عسرت ظاہر تھی۔ ہر چیز میلی اور گرد آلود تھی، ہر شے بے ترتیبی سے پڑی تھی، کتابیں ہر جگہ بکھری ہوئی تھیں۔ جوتش سگار پیتے ہوئے سامنے دروازے پر نظریں جمائے دیکھ رہا تھا جس کے اندر بملا درد سر میں مبتلا پڑی ہوئی تھی وہ پھر کہنے لگا: — "نرمل، کیا اس میں کچھ شک باقی ہے کہ تم اپنی شاعری سے معاش پیدا نہیں کر سکتے؟ اور جب تمھاری

زندگی کامیاب نہیں تو تمھارا فن یقیناً زوال پذیر ہے!"۔ نرمل مسکرا دیا اور بولا:۔ "ایک شاعر کبھی کسی بات کا اعتراف نہیں کرتا اور فن و ابتلا میں تو خاص ربط ہے!" ۔۔۔۔ "لیکن ایک شاعر کے لئے بھی حرکت و عمل ضروری ہے؟"

نرمل کے سنتے ہوئے چہرہ میں کسی خاص جذبے سے اک چمک سی پیدا ہوتی نظر آئی مگر جوتیش کہتا رہا:۔ "تم یکہہ سکتے ہو کہ رجعت بھی تو حرکت ہے!" ۔۔ نرمل کے سانس لینے سے اس کے دماغی انتشار کا اد۔ اس کے کھانسنے سے اعصابی انتشال کا پتا چلتا تھا۔ وہ کہنے لگا:۔ "تمھیں بڑا گھمنڈ یہ ہے کہ تم زندگی کو کامیاب بنانے کی راہوں سے واقف ہو، اور تم کہہ سکتے ہو کہ نتائج و تجربات انسان کے رہبر بنجاتے ہیں، اور صحیح نتیجہ وہ ہے جو انگلیوں سے محسوس کیا جاسکے۔ تمھیں یہ باتیں کہنے کا حق اسوجہ سے ہے کہ اسوقت تمھاری زندگی کامیاب ہے! لیکن سوال یہ ہے کہ جسے تم ترقی و کامیابی سے تعبیر کررہے ہو وہ تنزل و محرومی تو نہیں!" یہ کہکر وہ کرسی کی پشت سے ٹک گیا اور کھانسا۔ جب ذرا سانس ٹھیری تو جوتیش کے مونھ کے سامنے چٹکی بجا کر کہنے لگا "میرے نزدیک تمھارے استنباط و نتائج کی قدر بس اتنی ہی ہے!"

اس کی اس گفتگو سے جوتیش جھلا گیا، کچھ مکدر سا ہوگیا، لیکن ساتھ ہی اُسے نرمل کے مقابلے میں اپنی برتری یعنے ایک کامیاب انسان ہونے کا احساس بھی ہوا۔ اور فوقیت کے اس احساس نے اس کے تکدر کو رفع کرکے اُسے ترحم پر آمادہ کردیا

"نرمل، میں اس حقیقت کو کہ صرف روپے ہی کا نام کامیابی نہیں، تمھاری رعایت سے نہیں بلکہ دلایل کی بنا پر مانتا ہوں ۔۔ لیکن یہ تو تم بھی مانوگے کہ خوشحالی ایک طرح کی کامرانی ضرور ہے، اور اس سے تم انکار نہیں کرسکتے کہ یہ چیز روپئے کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتی۔ آئینہ دیکھوگے تو تمھیں کہنا پڑے گا کہ تم اس عمر میں انسان معلوم ہونے کی بجائے انسان کا ایک ایسا خاکہ نظر آتے ہو جو ماند اور پھیکا پڑ گیا ہے!" ۔۔۔ نرمل کی غلافی آنکھیں جن میں گڑھے پڑے ہوئے تھے پھیل گئیں، اور اُس کے زرد چہرے پر فسردگی چھاگئی، جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ اُس کے احساس کو صدمہ پہونچا ہے:۔

"جوتیش، تمھاری اس گفتگو سے میں خوش ہوں یا اُسے اپنی توہین سمجھوں؟"

"مجھے یقین ہے کہ تم میری اس صاف گوئی کو دلسوزی کے سوا اہانت پر مبنی نہ سمجھوگے، ورنہ میں ایسے نازک مسئلے کو چھیڑتا ہی نہیں۔ میں جانتا ہوں کہ تم ان دو کوٹھریوں کی سکونت کو اُنس مکانی کہوگے، مگر ایسی توجیہیں مجھے مطمئن نہیں کرسکتیں"

"شاعر کبھی حیلے نہیں تراشتا! اُنس مکانی ایک حقیقت ہے، اور راحت و تکلیف خیال سے وابستہ ہے"

"بجا ہے! لیکن سوال صرف شاعر کی ذات کا نہیں بلکہ بملا اور شیلا کا بھی ہے! پچھلی بار جب میں ملا تھا تو بملا کو اور شیلا مضمحل نظر آتی تھی۔ تم اتنے غیر ذمہ دار کیونکر ہوسکتے ہو؟" جوتیش نے نہایت سنجیدگی کے ساتھ کہا۔

"اوہو! اب یہ حالت ہے؟" نرمل نے کس بات پر اظہار تعجب کیا، نہیں کہا جاسکتا ۔۔ جوتیش۔ پھر کہنا شروع کیا:۔ "تمھیں یہ بتانا پڑے گا کہ نفسی خوشی سے رہنے کی آرزو تمھارے دل سے کیوں جاتی نہیں کہ تم خوش کرسکتے ہو، بس دنیا میں شاعری کی یہی قیمت ملتی ہے لیکن وہ شاعری دنیا کی سمجھ سے [illegible]

بیزار شاعر ہو ۔۔۔"۔ نرمل نے "سوگوار اور بیزار شاعر" کو اپنی صحیح داد سمجھ کر ایک ہلکا سا قہقہہ لگایا اور کہا:- "تم مجھے بھی اپنے مشین کے پہیے سے باندھنا چاہتے ہو ۔۔۔ جوتیش، یہ دنیا محض اعتبارات کی دنیا ہے، اور ان اعتباری نعمتوں میں جو یہ دنیا پیش کر سکتی ہے تضاد و تخالف ہے، ایک نعمت کے حصول کے لئے دوسری نعمت کو خیرباد کہنا ہی پڑے گا! جس کو تم کامیاب زندگی کہتے ہو سب سے زیادہ ناکام ہے کامیابی میں آخر کچھ تو بے نیازی کا جزو ہونا چاہئے تمہاری کامیاب زندگی میں بس یہی چیز مفقود ہوتی ہے۔ بصیرت کا تقاضا یہی ہے کہ انسانی زندگی سوگوار ہو اور دنیا سے بیزار۔ تم نے اسوقت نہایت صحیح لفظوں میں ادائے مطلب کر دیا"۔ جوتیش کو نرمل کی یہ باتیں "کٹ حجتی" معلوم ہوئیں، وہ غصہ میں آ کر اٹھ بیٹھا اور ٹہلنے لگا:- "تم خود جس طرح چاہو مر سکتے ہو۔ اس میں کسی کو دخل دینے کا حق نہیں۔ لیکن بلا اور بچی کا خیال نہ کرنا نہ صرف انسانی فرائض کے خلاف بلکہ مقتضائے شاعری کے بھی منافی ہے!"۔ ان فقروں نے نرمل کو دوسرے ہی عالم میں پہونچا دیا، یاد ماضی نے تازہ ہو کر اس کے خشک چہرے پر ایک رنگ پھیر دیا۔ وہ بولا:- "ہاں۔ بلا اور میں ایک وقت سمجھتے تھے کہ ہم دنیا میں بڑے بڑے کام انجام دے سکیں گے ۔۔۔ دنیا کا نظام ہی بدل دیں گے!"۔ اس نے نرمل پر اس وجدانی کیفیت کے طاری ہو جانے کو نہیں دیکھا، مگر جوتیش خود بھی اسی رنگ میں رنگ گیا:- "کانجی مل کی ضمانت میں جب تمہاری جائداد نیلام ہوئی تو بلا کے تاثرات تمہارے علم میں بھی نہ آئے ہوں گے۔ اس نے کسی سے کہا تھا جو خار جلیے نے بھی سنا کہ محبت دنیا میں ہر چیز کا ۔۔ فدیہ کا بھی نعم البدل ہے، کیونکہ محبت کی یاد سے زیادہ حسین کوئی چیز نہیں ہے، بلا کو جو اعتماد تمہاری ذات میں تھا وہ خود اپنی جگہ مستقل حسن تھا ۔۔۔ "جوتیش، تمہیں جاننا چاہئے کہ دنیا میں حقیقت ایک ہی ہے، صورت بدل جاتی ہے۔ اسوقت بلا کا اعتماد حسن محض تھا تو آج اس کی سوا ایک مستقل "روپ" ہے"۔

نرمل مسکرایا، جوتیش نے کھڑکی کی طرف نظر اٹھائی، ایک پل بھر کے لئے سگار کا دھواں دونوں کے درمیان حائل ہو گیا، اور پھر جوتیش کے ہونٹ حرکت میں آئے:- "اسوقت بلا نادان تھی، کم سمجھ تھی، زندگی کے تجربوں سے نا آشنا تھی، اور ہم سب بھی ایسے ہی تھے، تمہارے سب دوست۔ اپنے حلقے میں تم کو قابل ترین مانتے تھے ۔۔ اس وقت ہم سب قابلیت و ذہانت کے پرستار تھے، کیا زمانہ تھا! الغرض اب تمہارے دوست برداشت نہیں کر سکتے کہ تم اس تنہائی میں زندگی گزار دو"

"تنہائی میں عافیت ہے!" نرمل نے جواب میں کہا

"ہو، مگر عافیت اور ذمہ داری دو جدا دنیائیں ہیں ۔۔ ذمہ دار انسان عافیت کی تلاش کریگا تو ادائے فرض سے قاصر رہیگا"

"اعتبارات میں اگر ایک اعتبار کو زیادہ اہم ۔۔۔"۔

"تم اسے مانو گے یا نہیں کہ زندگی کی ادنے ضروریات بہت زیادہ اہمیت رکھتی ہیں؟" جوتیش نے نرمل کا قطع کر کے سوال کیا

"ہاں، اس بنا پر کہ ادنے چیزوں کی ضرورت ہر وقت پڑتی ہے، ان کو زیادہ اہمیت دیجا سکتی ہے"

"تو تم نے بلا اور شیلا کی ان ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے کیا سوچا ہے؟"

اس سوال نے نرمل کو زیادہ متاثر کیا، اور اس کا ہاتھ بے اختیار میز پر رکھے ہوئے کاغذوں پر جا پڑا۔ اسکے ساتھ جو تیش بھی اُٹھ کھڑا ہوا۔ کرسی کے سرکنے اور جو تیش کے قدموں کی چاپ نے نرمل کے اعصاب پر اثر ڈالا۔ نرمل جھلا سا گیا لیکن جو تیش بول اُٹھا :۔ " سنو نرمل، تمھیں چاہئے کہ تم گھر سے نکلو، آدمی بنو، آدمیوں سے ملو، اور دنیا کی طرح آدمیوں سے مل جل کر کام نکالو۔ لیکن اگر بیوی بچوں کی ذمہ داری کا احساس بھی تمھیں اس پر آمادہ نہیں کرسکتا تو جب تک تم کوئی صورت پیدا کرو، مجھے اجازت دو کہ میں تمھارے حالات کی دیکھ بھال کروں! سنا ہے تم کوئی نظم لکھ رہے ہو ـــــ کب تک مکمل ہو جائے گی ؟" ـــــ " ایک نظم کبھی مکمل نہیں ہوتی! لیکن ہماری گزر تو ہو رہی ہے ـــــ "

" لغو، مہمل! آپ کے پاس تین جانوں کی گزر کے لئے جتنا ہوگا، اردیشر کی بیوی اپنے موزوں پر اُس سے کہیں زیادہ خرچ کردیتی ہے!" ـــ " اس گفتگو سے اردیشر کو واسطہ ؟" ـــــ " یہ کہ اگر تم خفا نہ ہو تو وہ یہاں حاضر ہو اور تمھاری کسی نظم یا افسانے کا فلم بنانے کی اجازت طلب کرے" ـــ نرمل نے ہاتھ کے جھٹکے سے جو تیش کی تجویز کو ناقابل توجہ ثابت کرتے ہوئے میز کے کاغذوں کو چھوا اور بولا :۔ " تمھارے ہی فلسفے کے تحت شاید یہ تنوی صورت حال کو بدلے "

" احمق نہ بنو۔ نرمل! تم جانتے ہو کہ محض شاعری ہمارے اُجڑے وطن میں معاشی مشکلوں کا حل نہیں ہو سکتی۔ تاوقتیکہ اُسے تجارتی نہ بنایا جائے، مشکل حل ہو سکتی ہے عمدہ انتظام سے! خوب تیل دی ہوئی مشین ہی خوب چلتی ہے!"

" مگر تمھیں کیا معلوم کہ میں کیا لکھ رہا ہوں ؟"

" بس اسقدر معلوم ہے کہ تمھارا کام نہایت خوبی سے انجام پا رہا ہے "

نرمل نے جو تیش کے فقرے کے اندر مخفی طنز کو نہیں دیکھا اور اپنے کام کے بخوبی انجام پانے کی داد پا کر اس کی بھولی آنکھیں مسرت سے چمک اُٹھیں ـــ " خوبصورتی سے انجام پا رہا ہے! جوتی، خوبصورتی میرے لئے سانس کا درجہ رکھتی ہے۔ ایک حسین نظم، ہاں!" اُس کی گردن مڑ گئی اور وہ اُس دروازے کو دیکھنے لگا جس کے پیچھے اُس کی بیوی اور بچی نیم گرسنہ سو رہی تھیں۔ نرمل کو احساس ہوا اور کہنے لگا۔ " مجھے پروا نہیں کہ کون دکھ اُٹھاتا ہے، کون مصیبت جھیلتا ہے ـــ جو مجھ سے وابستہ ہیں، ان کا بھی فرض ہے کہ مجھے پہچانیں، مجھے سمجھیں! میرے لئے میرے فن سے زیادہ حقیقی شئے کوئی نہیں! اُن کو صبر سے انتظار کرنا چاہئے ـ صبر سے انتظار کرنا ہی انسان کا حسین ترین فرض ہے "

جو تیش کھڑا ہو گیا، نرمل کی اس وقت کی حالت کو کچھ دیر دیکھتا رہا، اور پھر بولا :۔ " ہوں، نرمل، میں جانتا ہوں کہ ان حالات کے باوجود تم اپنی ہی سی کروگے!"

" اگر کوئی مجھے چین سے رہنے دے ـــــ اپنی سی کرنے دے!"

" ایک زمانہ تھا کہ مجھے تمھاری ہر بات سے اتفاق تھا، لیکن اسوقت ہم دونوں زندگی سے روشناس نہ ہوئے تھے۔ اُس وقت، وقت بھی ہماری تائید کرتا معلوم ہوتا تھا، ہم سمجھتے تھے کہ دنیا کے پہلو میں بھی دل ہے، مگر حقیقت

کچھ اور نکلی، نظامِ دنیا ایک بے روح مشین ہے اور بس، اور ہم سب اسی مشین کے پرزے ہیں۔ ہمیں اسی رُخ گردش کرنا پڑے گی جس رُخ پر دنیا گردش کر رہی ہے۔ پھر وسعتِ نظر سے کام لینے کے بعد یہ سوال بھی سامنے آتا ہے کہ فن یا کوئی مشغلہ انسان کو ماورائے بشریت کیونکر بنا سکتا ہے؟"

"صناعت آدمی کو جہنم میں پہونچا دیتی ہے!" نرمل کی آنکھوں سے غصہ ٹپکنے لگا۔ جوتیش نے اس کے غصے سے تجاہل برت کر کہا:۔ "سچ کہتے ہو لیکن پلاّ نے تنہا ایک صناع سے شادی نہیں کی بلکہ ایک انسان سے بھی کی ہے!"

نرمل ایک ذرا کھانسا۔ اس کی کم سنی و تعلق اعصابی تھا۔ پھر ایک زہرخند کے ساتھ کہنے لگا:۔ "عورت صناع کے ساتھ شادی کرتی ہے اور نہ انسان کے ساتھ وہ ایک مرد سے شادی کرتی ہے!"

"نرمل تمہیں سمجھنا چاہئے، ایک جان چھڑکنے والی بیوی اور ایک معصوم بچی — اور ہر قسم کی راحت و آرام سے محروم! آخر وہ کیا چیز ہے جو تم لکھ رہے ہو اور جس پر پلاّ کو اتنا اعتماد ہے؟"

"ایک ٹریجیڈی ایک حزنیہ — حزنیہ بیانات!" — "منظوم؟" — "ہاں" — "اسکا تو فلم بھی بن سکتا ہے"

نرمل نے کھڑکی میں سے نظر آنے والی روشن فضا کی طرف اشارہ کیا جہاں چورنگی کے بازاروں اور تماشہ گاہوں کے چراغاں نے ایک نورانی غبار سا ابھار رکھا تھا اور جس کی وجہ سے نرمل ستاروں کی پُرشباب جھلملاہٹ کو نہ دیکھ سکتا تھا:۔ "تمہارا مطلب ہے کہ میری مثنوی کا فلم بنایا جائے اور وہاں دکھایا جائے — وہاں، جہاں ہر وقت ٹین اور لوہا کام کرتا ہے؟ جہاں مشینیں چلا کرتی ہیں؟"

جوتیش ہنسکر کہنے لگا:۔ "یہ بھی تمہاری غلط فہمی ہے، یہ سب جس سے تم نے اپنی بیزاری کا اظہار کیا، ایک طریقہ ہے جس کے ذریعہ سے 'آج' اپنے آپ کو ظاہر کر رہا ہے"

"تو مجھے مہربانی کرکے 'کل' پر قانع رہنے دو — مجھے تمہارا 'آج' اور اس کا اظہار نہیں چاہئے!"

"فریقین میں ایک ہی حق پر ہوتا ہے!" جوتیش نے طنزاً کہا

"نہیں، دوسرا ہمیشہ ناحق پر ہوتا ہے!" نرمل نے بھی طنز کیا اور اس کی آنکھوں میں ایک چمک آکر فوراً مٹ گئی، چہرے پر زردی سی چھا گئی۔ وہ کہتا رہا "جوتیش، تم اندازہ نہیں کر سکتے کہ یہ ہولناک غبار نور ہر رات مجھ پر کیا ظلم کیا کرتا ہے — مجھے اس سے چڑھ ہو گئی ہے، نفرت ہے، یہ شیطانی روشنی ہے!" نرمل کی سانس تیز ہو گئی اور اس کی نگاہیں اس روشن فضا پر جم گئیں "یہ روشنی نہیں شیطان کی سانسیں، جب بھی میری نگاہ اس پر پڑ جاتی ہے تو میں اس روشنی کے اندر ہزاروں بیچراغ جھونپڑیاں دیکھتا ہوں یہ روشنی ہر رات مجھ پر طعنہ زنی کرتی ہے کہ تجھے گُل کرنا چاہتے ہو تو اپنی زندگی کا چراغ بجھا دو!"

نرمل سانس لینے کے لئے رُکا، خشک ہونٹوں پر زبان پھیری، مسکرانے کی کوشش کی، اور بھرائی ہوئی آواز میں کہنے لگا "تم مجھے دیوانہ کہو گے لیکن حقیقت یہ نہیں ہے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ تم اور تیر، اور ایسے تمام انسان، اس خرافات کو

سب کچھ زندگی اور صناعت سمجھ لیتے ہو! تم وہ چیزیں تو بنا لیتے ہو جو روح انسانی کی تسکین کو [illegible] کر دیں، لیکن ایسی شئے تخلیق نہیں کر سکتے جس سے تمھارا نفس تسکین پا سکے! تمھاری روحیں بھی ناچار ہیں! تمھارا ذہن [illegible] تمھیں احمق بننے کی قابلیت دیتا ہے کیونکہ تم لوگ اپنے خیال کی خلوتوں میں ان ہفوات ہی کو حیات و صناعت کا نام دے لیتے ہو!" — جوتیش پھر کھڑا ہو گیا، اُس کی آنکھیں سکڑ گئیں، اور بغلوں میں ہاتھ دبا کر کہنے لگا: — "بہت بہت شکریہ!"

"معاف کرنا، جوتی! مگر میں کہوں گا کہ اس مشینی تہذیب، اس صنعتی تمدن، اس سرمایہ داری کے نظام معاشرت نے روحانیت کا گلا گھونٹ دیا ہے۔ میں ارباب ادب و صناعت کے دعوے سنتا ہوں اور اپنی قوم کے ذہنی افلاس پر ماتم کرتا ہوں — آج ادب اور ادبی صناعت کا جو مفہوم سمجھا جا رہا ہے، تم خود اُس کی ایک زندہ شہادت ہو، انسانی محبت سے میری وحشت کی بڑی وجہ یہی ہے۔ پرانے دوستوں میں ایک تم ہو جو عنایت کئے جاتے ہو، میں سچ مچ ایک ناکارہ آدمی ہوں — اس دنیا کے لئے ہرگز موزوں نہیں!" یہ کہکر نرمل ہنسا اور اُس کی آنکھوں میں خفت جھلکنے لگی۔ دونوں کی نگاہیں کھڑکی میں سے باہر کی روشنی کو دیکھنے لگیں اور نرمل نے کہا، "یہ تمھاری انسانیت ہے کہ اس ناخوشگوار موسم میں بھی اپنے لطف و تفریح کا خون کر کے میرے پاس آئے، اس عہد میں کسی کو دوسرے کا خیال رکھنے کی مہلت ہی کہاں ملتی ہے آجکل شرافت و انسانیت کا دوسرا نام حماقت ہے — یہ الفاظ تو بس کلام کی زیبائش کے لئے رہ گئے ہیں۔"

نرمل کی نرمی اُس کی برہمی و بیزاری کو دوچند کر کے دکھا رہی تھی، کھانسی کا ٹھسکا پھر اُٹھا، جوتیش نے سوال کیا: —

"اس کھانسی کا کچھ علاج بھی کر رہے ہو؟"

"معمولی کھانسی ہے — خود چلی جائے گی۔" نرمل نے بے پروائی سے جواب دیا۔

"معمولی کھانسی کو تو اتنا شور مچانے کا حق نہیں!"

"معمولی اور ادنیٰ چیزیں ہی تو ہنگامہ آفریں ہوتی ہیں!"

جوتیش سگار کے دم لیتا رہا اور پھر ایک تبسم کے ساتھ جس میں ارادے کی قطعیت شامل تھی، نرمل کی طرف نظر اُٹھائی: —

"اب بس یہی باقی ہے کہ تم مجھے ٹھوکر مار کر باہر نکال دو یا اس کھڑکی میں سے باہر پھینک دو کہ شیطان کی ان تجلیوں کے اندر جا پڑوں"

"نہیں، جوتی، میں تمھیں ٹھوکر مار کر نہیں نکال سکتا — میں واقعی احسان مندی کے احساس سے دبا جا رہا ہوں!"

"تو مجھے اس کا بدلا دو — مجھے اپنا مہاجن بنا لو!"

"مجھے بہت افسوس ہے، مگر میں تمھیں خوش نہیں کر سکتا — واقعی مجھے ضرورت نہیں ہے۔"

ایک مختصر لمحے کے لئے جوتیش کی نگاہیں پھر بملا کی خوابگاہ کے دروازے پر قایم ہو گئیں۔

"تم ٹھوکر مار کر نہیں نکالتے تو اب مجھے اپنے ہی پاؤں سے جانا چاہئے — اردیشر سے قرارداد ہے، وہ ایک ایسا فلم بنانے کے منصوبے کر رہا ہے جو فلمی صنعت کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کر دے۔ بملا سے سلام کہنا

"میں پھر آؤں گا" — نرمل کرسی سے اُٹھا، جوتیش کے ساتھ دروازے تک گیا اور پھر دروازہ بند کر ... چند منٹ تک خاموش کھڑا رہا، زینے پر سے جوتیش کے اُترنے کی آواز آئی ... نرمل دروازے سے ہٹا ... میز کے قریب پہونچ، سگار کو اُٹھا کر دیکھا اور سونگھا، پھر اُس کھونٹی پر نظر پڑی جہاں ... کپڑے ٹنگے ... شیلا کی ... ساڑی نیلی اور پچکی ہوئی تھی، فراک بھی کئی جگہ سے سلی ہوئی تھی، چھتری بانکی ٹیڑھی ... سب ... وہ ایک ٹھنڈی سانس بھری اور وہاں سے ہٹ آیا، ہاتھ میں سگار تھا اُسے پھر سونگھا — "بلاؔ!" آہستہ سے دروازہ کھٹکا کر ہلکے سے آواز دی۔

"کیوں نرمل خیر تو ہے؟" — "کچھ نہیں جوتیش آیا تھا۔ تمھیں سلام کہہ گیا ہے"

"ہاں، میں سن رہی تھی" — "جوتیش نے ایک بہت عمدہ سگار دیا ہے، ذرا ٹہل آؤں۔ سر کا درد کیسا ہے؟"

"جاتا رہا، آج دن بھر تم لکھتے بھی رہے ہو، ضرور ٹہل آؤ"، بلاؔ نے اپنی نرم آواز میں اُتنی ہی دلسوزی کے ساتھ کہا جتنا کہ اُس کا نام نرم و ملائم تھا۔

"تم بھی چلو" — "نہیں پھر ہو، اب کپڑے پہننا دوبھر معلوم ہوتا ہے، شیلاؔ سو رہی ہے، وہ اکیلی رہے گی"

"آج جوتیش نے مجھے بڑی نصیحتیں کیں، میں نے بھی تہیہ کیا ہے کہ ایک دفعہ تو اُسے بھی دکھا دوں — ہوں!"

بلاؔ ہنسی، مگر نرملؔ نے اُس ہنسی کی لطافت سے لطف نہ اُٹھایا، بلکہ اس ہنسی میں اُسے مضحکے کا پہلو نظر آیا۔ نرملؔ کی نگاہیں اکیلا پھر کھڑکی میں سے اُس روشنی پر پڑیں، اُس نے اپنی جگہ طے کر لیا وہ ہنسی بلاؔ کی نہ تھی بلکہ شیطان کی تھی اور کھڑکی میں سے آئی تھی۔ غرض وہ ٹہلنے کے لئے نکل گیا، اور اپنے نرے، کمرے کے سب اونچی کھڑکی اور اُس میں سے نظر آنے والے تمدن کی تاریک روشنی کو اُسی طرح درخشاں چھوڑ گیا

(۳)

بلاؔ کی نیند اُچٹ گئی تھی، وہ پلنگ سے اُٹھکر دوسرے کمرے میں آ بیٹھی۔ لیمپ کی دھیمی روشنی میں بھی اُس کے سیاہ بال چمک رہے تھے۔ اس کے چھوٹے اور نازنین پاؤں میں سرخ مخمل کی پرمی چپل بہت حسین معلوم ہوتی تھی نازک ہاتھوں میں گھر کے کاموں نے وہ نرمی تو باقی نہ رہنے دی تھی، مگر اب بھی اس قابل تھے کہ دل میں رکھ لئے جائیں بلاؔ نے کچھ دیر کے لئے آنکھیں بند کر لیں۔ نرملؔ کے واپس آنے تک بلاؔ سونا نہ چاہتی تھی۔ دفعتہً کسی نے دستک دی اور بلاؔ نے چونک کر آنکھیں کھولدیں، پہلے تو وہ سمجھی کہ نرملؔ ہے، مگر نرملؔ کو دستک کی کیا ضرورت تھی؟

"کون ہے؟" بے ساختہ اس کے مونھ سے نکل گیا — "بلاؔ، میں ہوں جوتیش!" جواب ملا۔

"جوتیش!" وہ حیران ہو کر خود سے کہنے لگی۔ پھر خود بخود بالوں پر ہاتھ جا پہونچا، اور اُس کے دماغ میں ایک بجلی سی چمک گئی، وہ کھڑی ہوگئی، لپک کر دروازہ کھولا اور گھبرا کر پوچھنے لگی: "جوتیش نرملؔ تو خیریت سے ہے؟"

جوتیش کا چہرہ تمتمایا ہوا تھا، وہ ہچکچا سا رہا تھا، اندر داخل ہوتے ہوئے کہنے لگا: "ہاں، نرملوں کو کبھی صدمہ

نہیں ہیم بچا! مجھے افسوس ہے کہ میں نے تمھیں خوفزدہ کردیا" کہکر ہنسا
بلا نے ایک لمبی سانس لی، اُسکی طرف دیکھا انفعال کا احساس ہوا اور کہنے لگی "میں اسوقت دیکھنے کی چیز ہوں!"
"سچ مچ ہو ـــــ بلا تم دیکھنے کی چیز کب نہیں تھیں! تمھارا درد سر؟"
بلا نے تذبذب کی حالت میں اُس کو دیکھا اور کہنے لگی:- "وہ ایک حیلہ تھا، میں تنہائی اور تاریکی میں سوچنا چاہتی تھی"
اُس نے پھر جو تیش پر ایک متجسسانہ نظر ڈالی "تم جانتے تھے کہ نرمل گھر میں نہیں ہے؟"
"ہاں، مجھے معلوم تھا، آج نرمل سے باتیں کرکے میری آنکھ کھل گئی ہے، اسی لئے میں اسوقت پھر آیا ہوں، نرمل موہوم امیدوں پر جی رہا ہے، آج اُس کے خیالات کی حد کا پتا چلا۔ میں اُس کے پاس سے اُتر کر نیچے پہونچا تو ایک دوست سے ملاقات ہوگئی۔ اُس سے باتیں کر رہا تھا کہ میں نے نرمل کو باہر جاتے دیکھا ـــــ"
"نرمل کی صحت نہایت ناقابل اطمینان ہے ـــــ سارا سارا دن کام میں لگے رہتے ہیں" بلا نے قطع کلام کرکے کہا اور ٹھنڈی سانس بھر کر چپ ہو رہی"
"مگر اس وقت تو نہایت بشاش، سگار کے دھوئیں اُڑاتا جا رہا تھا، یقیناً اُس کے خیالات اسوقت چاندنی دنیا میں ہوں گے۔ میں ایک مدت سے چاہتا تھا کہ تم سے باتیں کروں۔ یہ نیک حسن اتفاق ہے ـــــ کیا روشنی سے چکا چوند ہوتی ہے؟"
اچانک آنکھیں ڈبڈبا آنے کے باعث بلا نے گردن موڑ کر ہاتھ رکھ لیا تھا اور جو تیش کی دلسوزی و ہمدردی اس کا باعث ہوئی تھی۔ اُس نے بہت ضبط کرنا چاہا مگر آنسو بہ نکلنے کے لئے بیتاب تھے۔ بلا نے جواب میں کہا:- "نہیں. . . . . تو!"
"بلا، میرا خیال ہے کہ نرمل بیمار ہے"
"ایسے حالات میں کوئی تندرست کیسے رہ سکتا ہے! وہ ہم سب سے زیادہ خستہ ہیں ـــــ ان کا دماغ بہت تھکا ہوا ہے!"
"مگر بلا، یہ حالت خطرے سے خالی نہیں!"
"میں جانتی ہوں ـــــ سب سے زیادہ خطرہ تو نرمل کو ہے!"
"تم اس کھڑکی کو کیلوں سے بند کر دیتیں تو اچھا تھا"
بلا اس کا اصل مفہوم سمجھ کر جو تیش کو حیران نظروں سے دیکھنے لگی:- "مگر رات میں چورنگی کی روشنی مجھے اچھی معلوم ہوتی ہے، اس کے اندر مجھے روح سی دوڑتی محسوس ہوتی ہے۔ آخر بند کر دینے کی ضرورت؟"
"ہاں، مگر یہ روشنی نرمل کے اعصاب کو بہت متاثر کرتی ہے" جو تیش نے سر کو جنبش دیکر اور بلا کو غور سے دیکھتے ہوئے جواب دیا:- "اُس نے شاید تم سے نہیں کہا، نرمل اس روشنی کو "شیطانی روشنی" کہتا ہے، لیکن مجھے اس سے خوشی ہوئی کہ تمھیں اس روشنی سے نفرت نہیں ہے"
بلا نے ہنسکر اس کا اقرار کیا، اور کہنے لگی:- "ایک عورت کے لئے پُر مسرت اور جانی پہچانی چیز سے نفرت کرنا

مشکل ہے، عورت کی عقل محدود مانی گئی ہے اور وہ اتنی عالی خیال نہیں سمجھی جاتی کہ پچھلی ہوئی چیزوں کو فراموش کر سکے! اس حالت میں بھی بعض وقت مجھ پر یہ خیال غالب ہو جاتا ہے کہ تمام خرچوں کو روک کر آخری پائی بھی ان کھیل تماشوں میں صرف کر دوں! مگر پھر عقل آ جاتی ہے۔ یہ خواہش اور خیال نرمل کے ساتھ غداری ضرور ہے، مگر ایک حقیقت بھی ہے"

"اس کو غداری سے کسی صورت میں تعبیر نہیں کیا جا سکتا" وہ بولا

"بعض وقت متاسفانہ احساس ہوتا ہے کہ نرمل کو اگر ایسی بیوی ملتی جو پسند و ناپسند میں بالکل اسکی ہم مذاق ہوتی تو نرمل کی زندگی زیادہ خوش گزر سکتی"

"تمھارا یہ خیال ہے؟" جوتیش نے سوال کیا

"ہاں، یہ میری اس محبت کا خیال ہے جو مجھے نرمل سے ہے!"

جوتیش اپنی ٹھوڑی کھجانے لگا، اور پھر سوال کیا: "تم سمجھتی ہو کہ تم لوگ اس مکان میں گرمیاں گزار سکو گے؟"

"تم بھولتے ہو جوتیش، لاکھوں آدمی ہر سال گزارتے ہی رہتے ہیں۔ خود تم نے کتنی گرمیاں اور برساتیں کلکتے ہی میں گزاری ہیں"

"تم صحیح کہتی ہو، لاکھوں آدمی یہاں کی سڑی گرمی میں بسر کرنے پر مجبور ہوتے ہیں، اور میں نے بھی بسر کی ہے لیکن وہ حالات دوسرے ہوتے ہیں کچھ مجبوریاں ہوتی ہیں، اور لوگ کچھ عادی بھی ہو جاتے ہیں کہ تبدیلی کی ضرورت محسوس ہی نہیں ہوتی، مگر تم سب کو اس کی ضرورت ہے! بلا بچی کو لیکر ایک مہینہ کے لئے میرے ساتھ شیلانگ چل کر رہو! نرمل اگر پسند نہ کرے اسے یہیں رہنے دو"

"نہیں، جوتیش، میں تنہا کہیں نہیں جا سکتی ـــ نرمل میرے بغیر کچھ بھی نہ کر سکیں گے، اور انھیں اپنی کتابوں سے جدائی گوارا نہ ہوگی جن کو منتقل کرنا ممکن نہیں"

"اسی خیال سے میں نے نرمل کو تو شامل بھی نہیں کیا"

"بہت بہت شکریہ، جوتیش، مگر اب تم ـــ"

"بہت اچھا" جوتیش نے ذرا کھسیانہ ہو کر اُسے بات بھی پوری نہ کرنے دی۔

بلا نے اُس کی تالیف قلب کے خیال سے پھر کہا: "میں نے بہت سوچا کہ نرمل کو خبر کئے بغیر میں کام کر سکتی مگر کوئی صورت سمجھ میں نہ آئی کہ کیا ذریعہ اختیار کروں۔ اس بارے میں نرمل کی خودداری یا غرور حد سے زیادہ ہے"

"غرور، ہاں!"

"مگر مجھے کوئی کام نہیں آتا ـــ اور رات ہوتے ہوتے میں بالکل تھک بھی جاتی ہوں!"

"اس دنیا اور اس زندگی پر ہزار لعنت! نرمل کی یہ "شیطانی روشنی" ایک معمولی انسان کو جو کچھ دے سکتی ہے سب مجھے حاصل ہے، لیکن وہ چیز نہیں ملتی جو میں چاہتا ہوں، نرمل کو تم مل گئیں ـــ لیکن نرمل اس روشنی سے جتنا متفر

اصل میں تم اس [illegible] کا خیال [illegible] ہے، کسی شے سے ہماری نفرت۔ ہماری اُس شے کی تمنا کی مناسبت سے ہوتی ہے، بہت سی چیزیں [illegible] ہیں نفرت نہیں ہے ہماری لئے نہیں ان کی نفرت نہیں، ہماری شدت [illegible] ہماری نفرت [illegible] صورت میں ظاہر ہوتا ہے!

"تمھیں [illegible] اس کا احساس نہیں ہو سکتا، لیکن ایک حقیقت ہے کہ تم مجھے ایک قاتل، ایک ایسا شخص ہونے کا احساس [illegible] سی کو دہکتی آگ میں ڈھکیل دیا ہو! تم مجھے جتنی پیاری اُسوقت تھیں اتنی ہی آج بھی ہو۔ بلکہ کچھ زیادہ، تمھارا یہ صبر وسکون، تمھاری اچھائی اور سیوا، تمھارا دیویوں کا سا بھاؤ"

"مگر جوتیش، یہ خیال تو تھیں جب ہی بھلا دینا تھا۔ میں اپنے انتخاب پر کبھی متاسف نہیں ہوئی۔ میں جانتی ہوں کہ اُس وقت اگر میں غلطی کرتی تو ایک دن سکھ کا نہیں دیکھ سکتی تھی۔ نرمل کے ساتھ فارغ البالی میں مجھے اتنی تسکین روح وقلب معلوم نہیں ہوتی جتنی اس عسرت میں ہوتی ہے (ہنسکر) میری محبت بھی خود غرض ہے!"

"بلا، میں نے تمھارے فیصلے کا ہمیشہ احترام کیا، لیکن مجھ سے یہ توقع نہ کرو کہ تم زندگی کے سمندر میں بڑی تھپیڑے کھاؤ اور میں کنارے پر کھڑا کھڑا تماشا دیکھوں"

"جوتیش کرم کرو! اب...... اب......"

"بلا، تمھاری محبت مجھے تمھارے ہر اشارے کی تعمیل کو فرض قرار دیتی ہے، لیکن وہی محبت مجھے مجبور بھی کرتی ہے کہ اب میں تمھاری نارضامندی کی بھی پروا نہ کروں — بلا، میں تمھیں اس تکلیف میں نہیں دیکھ سکتا!" جوتیش نے بلا کا ہاتھ پکڑ لیا "کیا تم سمجھتی ہو کہ ذرہ بھر محبت بھی جس کے دل میں ہو وہ یہ دیکھنا گوارا کرے گا کہ تم اس حال میں زندگی بسر کرو، تم اپنی جان کو ایک خود غرض اور اندھے شاعر کے پیچھے کیوں مٹا رہی ہو!"

"جوتیش تمھارے ان احساسات کی قدر نہ کرنا ایک غیر انسانی فعل ہوگا، لیکن سمجھو تو سہی، تم کیا کہہ رہے ہو؟ غور کرو۔ تمھیں ایسی باتیں ہرگز منھ سے نہ نکالنا چاہئے، یعنی یہ کہ تمھیں جس سے محبت کا دعوےٰ ہے۔ کیا تم چاہو گے کہ وہ اپنی محبت سے دست بردار ہو جائے؟ اسے اگر ممکن سمجھتے ہو تو پہلے خود تجربہ کرو! میں نے تمھارے پر خلوص خیالات واحساسات کو دل میں جگہ دی ہے، لیکن ہم دونوں محبت کے متعلق گفتگو کرنے کے بھی مجاز نہیں! میں مانتی ہوں کہ جس طرح ہوا اور پانی کی تقسیم عام ہے، اُسی طرح محبت کرنے کا حق بھی عام ہے اور محبت، دولت وامارت یا شرافت ونجابت کی شرط سے بھی آزاد ہے، مگر جو محبت کرتے ہیں، وہ تو ہستی قربان کر دینے کو محبت کی معراج باور کرتے ہیں! یاد رکھو عشق کی محنت کبھی رائیگاں نہیں جاتی۔ اب جوتیش میرے حال پر رحم کرو اور چلے جاؤ۔ میرے کہنے سے چلے جاؤ!"

"میں تمھارے حکم کی تعمیل تو کروں گا، لیکن مجھ سے کچھ خدمت بھی لو، مجھے موقعہ دو!"

"جوتیش، ایک دن میں بالکل آمادہ ہو گئی تھی کہ تم سے کچھ روپیہ قرض لے آؤں — میں جانتی تھی کہ اس سے

تمھیں خوشی ہو گی۔ اِسی خیال سے بتا بھی رہی ہوں، اگرچہ میرا جی تمھیں بتانے پر طیار نہ تھا۔ لیکن تمھیں یہ سمجھ لینا چاہئے کہ میرے محبت کا راستہ ایک ہی ہے یعنی ابھ کے جاؤں گی، آیندہ سے اس موضوع کی طرف اشارہ بھی نہ ہونا چاہئے۔ شاید تم سمجھ سکو، مجھے اور نرمل کو اتنی تکلیف کسی چیز سے نہیں ہوتی جتنی لوگوں کی عنایت و مہربانی کے اظہار سے ہوتی ہے ایسے موقعہ پر میں انتہائی کمزور ثابت ہوتی ہوں اور ضبط کرنا مشکل ہوجاتا ہے، اب صبح میں واقعی بیمار اُٹھوں گی غریب شیلا پر جھنجلا پڑوں گی، بچوں کی پرورش دراصل بڑا مشکل کام ہے —— اچھا اب جاؤ!"

"ذرا ٹھیرو — مجھے کچھ اور کہنا ہے" —— "وہ بھی جلدی سے کہہ ڈالو" "یہ کہ میں تمھیں گود میں اُٹھا کر اس کھڑکی سے کود جاؤں گا" —— ببلا نے نرم سے قہقہے کے بعد کہا "جوتیش میری زندگی کے اس دور میں تم ایک معما بنے جارہے ہو"

"سُنو ببلا، میں نے نرمل سے کہا ہے جب تک اُس کی مثنوی مکمل ہو مجھے اپنا حاجن بن جانے دے لیکن وہ نہیں سنتا۔ کیا تم میری خاطر سے نرمل کو اس پر رضامند نہ کردگی؟"

ببلا کے چہرے پر کرب و اذیت کے آثار نمودار ہوگئے۔ اس نے کہا "اس لئے کہ افلاس پر قرض کی لعنت کا بھی اضافہ ہو جائے؟" —— "نہیں شیلا کی پرورش اور تعلیم ......"

"تم جانتے ہو کہ نرمل ایک مثنوی لکھنے میں مصروف ہیں — یہ صورت ان کے کام کے لئے بھی مضر ہوگی!"

"مگر میں تو شیلا کو کچھ دینا چاہتا ہوں!" —— "لیکن تم روپیہ دیکر ہمیں ذلیل بھی کرنا چاہتے ہو!"

"ببلا! — تمھارا، میرے متعلق یہ خیال ہے؟" — "غیر سے قرض لینا برا نہیں — لیکن تم سے قرض لینا اور ایک پہاڑ کے نیچے پس جانا برابر ہے، جوتیش اب تم جاؤ" —— "میں اس لئے چلا جارہا ہوں کہ کوئی دیوانگی نہ کر بیٹھوں، مگر یہ وعدہ کرو کہ جب کبھی تمھارے نقطۂ نظر میں تبدیلی واقع ہوگی تو مجھے ضرور اطلاع دوگی" "ہاں یہ وعدہ ہے، بس اب جاؤ!" —— جوتیش، ببلا کی جانب ایک قدم بڑھا، لیکن پھر اچانک مڑا اور رخصت ہوگیا۔ ببلا دروازے پر کھڑی اُس کی آوازِ قدم سُناکی۔ نہ معلوم کیوں، لیکن ببلا اس کے پیچھے، اس کے پاس جانا چاہتی تھی۔ یہ کیفیت اور جذبہ آنی اور عارضی تھا۔ وہ دروازے پر سے پلٹی تو کھڑکی میں آکھڑی ہوئی اور ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں سے اپنی آنکھوں کی جلن مٹاتی رہی اور پھر جالیٹی۔

(۴)

نرمل پلٹا تو سیڑھیاں چڑھ کر اپنے دروازے کے سامنے دم لینے کے لئے ٹھہر گیا۔ اس کی سانس پھول گئی تھی، دروازے کی دراز سے کان لگایا تو کمرے کے اندر قبر کا سناٹا سنائی دیا۔ لیکن نرمل کا ہاتھ جیب میں پڑا تھا، اور وہ کسی چیز کو بڑی احتیاط سے پکڑے ہوئے تھا۔ اُس نے دروازہ کھولا اور ساتھ ہی کھانسی کا دورہ پڑا جس نے نرمل کو کپکپا دیا اُس نے کھانسی کو دبا دینے کی ناکام کوشش بھی کی۔ پھر سونے کے کمرے پر کان لگا کر سننا چاہا مگر کوئی آواز نہ سنی۔

نرمل ایک ممی کی طرح ساکت تھا اور اس کی نگاہیں کھڑکی پر قایم ہوگئیں۔ نرمل کے ستے ہوئے چہرے اور مرجھائے ہوئے ہونٹوں پر ایک خوف آمیز مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ اُس نے جیب سے ہاتھ نکالا اور جلدی جلدی سر کے بالوں پر پھیرنے لگا۔ پھر کرسی پر بیٹھ گیا، اور جیب میں سے طلائی جالی کا ایک بٹوا نکالا جس میں قیمتی نگینے جڑے ہوئے تھے

لمپ کی روشنی پڑی تو بٹوا اور اُس کے جواہر جگمگانے لگے۔ کچھ کھٹکا سا ہوا۔ نرمل نے فوراً اُس بٹوے کو چھپا لیا۔ پھر خود ہی ہنسا اور بلند آواز سے اپنے آپ کو بزدل کہا۔ بٹوے کو خالی کیا، جس میں ایک نفیس لیس کا چھوٹا سا رومال تھا، ایک طلائی چھلا جس میں تین چار چھوٹی چھوٹی چمکتی ہوئی چابیاں تھیں، تہ کئے ہوئے چند کاغذ تھے، ایک چھوٹی سی سینٹ کی نیلی شیشی تھی، اور ایک چھوٹا سا بٹوا اور تھا۔ نرمل کی انگلیاں تیزی کے ساتھ اس بٹوے کو ٹٹولنے لگیں۔ اُسکی نگاہوں میں ایک سوال کی حرارت جھلکنے لگی۔ اُس نے ایک خفی احساس حسرت کے ساتھ اُسے کھولا پہلے جھانک کر دیکھا، پھر اُسے میز پر خالی کر دیا، کچھ نقدی تھی، جسے اُس نے اچھی طرح دیکھا بھی نہیں، البتہ وہ ایک بہت چھوٹے تہ کئے ہوئے کاغذ میں محو ہوگیا۔ یہ ایک خط تھا۔ نرمل نے اُس کی تہیں کھولیں شکنیں مٹائیں اور مضمون پڑھنے سے قبل دستخط دیکھے تو ایک قہقہہ مار کر ہنسا "جوتیش را" پھر اس کو پڑھا اور تہ کرنے لگا۔ نقدی پر نظر پڑی۔ چار روپئے اور کچھ ریزگاری تھی۔ نرمل کے چہرے پر سفیدی چھا گئی تھی۔ کرسی کے ہتھوں پر اُس کی گرفت قایم ہوگئی، آنکھیں بند ہوگئیں اور جبڑے لٹک گئے ــــ جیسے زندگی ختم ہورہی ہو۔ پھر دو چار منٹ کے بعد اُس کی بڑی بڑی اور بنلائی آنکھیں بزدلانہ طور پر خوابگاہ کے دروازے پر قائم ہوگئیں۔ نرمل کو محسوس ہورہا تھا کہ اُس کی جان نکل رہی ہے ــــ کوئی خبر گیری کیوں نہیں کرتا؟

کھڑکی پر جو نظر پڑی تو غصے سے اُس کی کیفیت پاگلوں کی سی ہونے لگی۔ پھر اُس نے سب چیزیں بٹوے میں ڈالدیں اور اُسے بند کر کے میز کے کاغذوں پر پھینکدیا، جو افسردہ کمرے کی سوگوار فضا میں ایک سنہرے پھول کی طرح چمک رہا تھا۔ نرمل کھڑا ہوگیا، سر کو ایک ذرا اونچا کیا اور پکارا :۔ "بلا!" ــــ "کیوں نرمل؟" جواب ملا ــــ "باہر آؤ!" "ابھی آئی!" ــــ بلا جب باہر آئی تو اس کی ہرنی کی سی آنکھیں نیند سے بوجھل ہو رہی تھیں۔ وہ نرمل کی طرف بڑھی مگر ایک آسیب زدہ کی طرح، اُس کی نگاہیں طلائی بٹوے کو دیکھ کر حیران تھیں اور وہ پریشان۔ اس چمکنے والی چیز کو دیکھکر آسیب زدہ بلا کا رنگ اُڑنے لگا تھا، اب یہ دونوں کھوئے ہوئے کھڑے تھے اور ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھ رہے تھے پہلے نرمل کی نگاہیں جھک گئیں، اُس کی آنکھوں کے اندر خوف کی پرچھائیاں گزرنے لگیں۔ نرمل کا ہاتھ بڑھا اور بلا کا آنچل پکڑ لیا۔ بلا کھڑی دیکھتی رہی ــــ انتظار کرتی رہی

"کرسی پر بیٹھ جاؤ" نرمل نے بڑی مشکل سے ابتدا کی "بلا، ایک عجیب اور ایک نہایت حیرت انگیز واقعہ ــــ ہر بات تعجب خیز!" وہ رکا، اُس کی نگاہیں بلا کی پشت پر کتابوں کی الماری پر قایم ہوگئیں۔ "دو انسان محبت کریں، ایک ساتھ بسر کریں، ایک ساتھ جدوجہد کریں، ایک ساتھ فاقے کریں، ایک ہی سی امیدیں قایم کریں، ایک ساتھ

نا اُمید ہوں، اُن کی گڑیا سی ایک پیاری بچی بھی ہو اور پھر بھی ایک دوسرے کو نہ جان سکیں! حیرت ہے! عجیب وغریب مرحلہ! بلاّ، یہ بات دنیا کی، انسان کی زندگی کا سخت حیرت ناک واقعہ ہے!"

بلاّ اُس کی طرف دیکھا کی تکتی رہی، اس تکتے رہنے میں اُس کی روح نے نگاہوں کا قالب اختیار کر لیا تھا۔

اُس کی حالت یہ تھی جیسے وہ چلتے میں سو رہی ہو، سوتے میں چل رہی ہو، کچھ دیر خموش رہکر کہنے لگی:۔ "نرل تم کچھ بیمار ہو؟"

نرل نے اُس کا ہاتھ تھام لیا، سر سے پاؤں تک کانپ گیا، یہ سب اضطراری حالتیں تھیں، لیکن وہ بلاّ کو دیکھے جا رہا تھا، یہ اُس کا ارادی فعل تھا! پھر آہستہ سے بولا:۔ "ہاں، شاید ہوں — شاید ایک مدت سے بیمار ہوں! لیکن حیرت ہے کہ ہم دونوں کو اس بات کا علم و احساس آج ہو رہا ہے! بلاّ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ غریب بلاّ!"

بلاّ ہاتھ چھڑا کر سیدھی کھڑی ہو گئی۔ طلائی بٹوے پر نظر ڈالی اور دھیمی آواز میں کہنے لگی:۔ "نرل، اگر تم نے دوبارہ بھی میرا نام اسی لہجے میں پکارا تو میں چیخ پڑوں گی"۔

یہ سن کر نرل لڑکھڑا گیا، کرسی کا تکیہ پکڑ لیا، اور ایک خوفناک ہنسی ہنسا، پھر کھڑکی میں سے باہر دیکھنے لگا۔

"یہ کیا ہے؟" بلاّ نے بٹوے کی طرف اشارہ کرکے پوچھا — "شاید تم پوچھنا چاہتی ہو کہ کس کا ہے؟"

"یہ یہاں کیسے آیا؟" بلاّ نے پوچھا — "راستے میں پڑا تھا!" نرل نے کہا — بلاّ نے نرل کو نظر بھر کر دیکھا اُس کی کھانسی میں بناوٹ اور چہرے پر فتحمندی کی رونق کو محسوس کیا۔ وہ اسوقت سخت کشمکش میں مبتلا تھی، مگر فوراً اپنے جذبات پر قابو پا کر اپنی فطری شیرینی کے ساتھ پوچھنے لگی:۔ "نرل، تم نے اپنے کام ہی کو اپنی موت بنا لیا، اتنی مشقت تو کوئی بھی برداشت نہیں کر سکتا، ہماری زندگیاں بالکل برباد ہیں!" پھر دفعتہً جذبات سے متاثر ہو کر کہنے لگی" یہ تمنے کیا کیا؟"

اُسے نرل کے بیان پر یقین نہ آیا کہ بٹوا پڑا ملا تھا — وہ کرسی پر بیٹھ گیا اور آنکھیں موندلیں۔ اُس کے خط و خال درشت اور چالاک نظر آئے:۔ "مینے کیا کیا؟" وہ ہنسا اور کھنکارا۔ "اپنی کرسی ذرا ادھر لے لو تاکہ ایک دوسرے کو دیکھ سکیں میں بتاتا ہوں کہ میں نے کیا کیا"۔

مشینی حرکت کی طرح بلاّ نے اپنی کرسی سرکائی، اور ساری کے اندر اُس کی اُنگلیاں آپس میں گتھ گئیں، نرل نے اُس پر ایک غور کی نظر ڈالی:۔ "بلاّ، تم بھی بالکل تھک چکی ہو۔ میرا خیال غلط تو نہیں؟ تمھیں اس طرح گھلتے دیکھ کر برداشت نہ کر سکنے اور جوتیش کے الزاموں نے مجھے خود کو بھول جانے پر مجبور کر دیا — مجھے اپنی طبیعت اور تربیت کو پس پشت ڈالدینا پڑا —— زندگی بڑی بیرحم آقا ہے، بلاّ!" اس نے بلاّ کو مغالطے میں ڈالنے کے لئے کہا

"لیکن نرل، اس سے تمھارا مطلب کیا ہے؟ کیا میں نے ادائے فرض میں کوئی کمی کی یا کبھی کوئی شکایت کی؟"

بلاّ نے نہایت ملتجیانہ لہجے میں کہا۔

"مطلق نہیں، کبھی نہیں! لیکن بلاّ، میں تمھیں جس حال میں دیکھتا ہوں وہ حالت اپنی جگہ ایک مستقل شکایت ہے

اُس کے سُننے سے میں کیونکر باز رہ سکتا ہوں؟ اس بٹوے کو کھول کر دیکھو۔"

"لیکن ——" —— "میں جو کہہ رہا ہوں!" —— "کیا واقعی؟" —— "اس میں مذاق کا تو کوئی پہلو نہیں جلدی کرو، میں بہت خستہ ہو رہا ہوں۔" بلاؔ نے ہاتھ بڑھا کر بٹوے کو اُٹھایا، لیکن ہاتھ میں دبا لیا۔

"کھول کر دیکھو!" نرملؔ نے ذرا سخت انداز میں کہا —— بلاؔ نے تعمیل کی —— "سب چیزیں نکال کر دیکھو۔ جلدی کرو —— میں بیتاب ہوں۔" —— "جوتیش، جوتیش کا خط!" بلاؔ دم بخود ہو گئی پھر ایک لمحے کے بعد "چار روپئے گیارہ آنے!" سب چیزیں نکالنے اور نقدی گننے کے بعد آہستہ سے بولی۔

نرملؔ نے اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالدیں اور کہنے لگا:۔ "چوری کی زحمت کے مقابلہ میں نہایت حقیر رقم! نہایت ذلیل —— ہے نا؟" —— "اوہ، نرملؔ، تمھاری سمجھ کو کیا ہو گیا ہے؟" —— "نہیں بلاؔ میں دیوانہ ہرگز نہیں، بات صرف اتنی ہے کہ زندگی نے مجھے سخت ٹھوکریں لگائی ہیں۔ آج میں بھی اُسے ایک ٹھوکر مارنے کے قابل ہو گیا! لیکن میری یہ ٹھوکر زندگی کے جسم میں نہیں بلکہ ہوا میں لگے گی! یہ بھی میری نارسائی کا ثبوت ہے۔"

"چپ رہو نرملؔ، پرمیشور! ... نرملؔ!" —— "تم نے اگر مجھے اس لہجے میں پھر مخاطب کیا تو میں چیخ پڑونگا"

"تم اب سو جاؤ —— تم بہت تھک گئے ہو" —— "اسوقت میں ہمیشہ سے زیادہ تھکا ہوا تو نہیں ہوں۔ میں تمھیں سارا قصہ سنانا چاہتا ہوں۔ خموشی سے سنو، ایک شاعر شاید چار روپئے گیارہ آنے کی چوری پر آمادہ نہ ہوگا۔ جرم کیا جائے تو اس میں بھی کچھ ہم آہنگی ضرور ہونا چاہیئے۔" وہ ہنسا اور کہتا رہا "ایک شاعر اگر گرے تو اُسے بہت بلندی سے گرنا لازم ہے۔" کھانسی کا ایک سخت دورہ پڑا اور نرملؔ بے حال ہو گیا۔

بلاؔ گھبرا کر اُٹھی، احساس فرض نے اس کی ہستی کو چھا لیا۔ اس میں حیرتناک طاقت اور چستی پیدا ہو گئی۔ وہ نرملؔ کے اوپر جھک گئی اور کہنے لگی:۔ "نرملؔ، سنبھلو! اس بٹوے کے خیال کو مطلق بھلا دو، میرے تمھارے سوا کبھی کوئی نہ جان سکے گا۔ اس واقعہ کو ہمیشہ کے لئے دفن کر دو اور دفن سمجھو۔ میں تمھارے پاس بیٹھی ہوں پورا قصہ کہہ کر دل کا بوجھ ہلکا کر لو۔ کل سے ہم نئی صورت میں نئے انتظام کریں گے، ماضی کو یکسر بھلا دیں گے اور ایک نئی زندگی شروع ہو گی۔"

نرملؔ کا احساس خودداری بلاؔ کے اس معمولی لطف و رافت سے بھی مجروح ہوا۔ وہ کانپ گیا اور اس طرح کہنا شروع کیا جیسے کوئی کراہتا ہو:۔ "بلاؔ، میں مرنے کی حد تک تھک گیا ہوں —— اتنا رگیدا گیا ہوں! میں نے اپنے مطمح نظر کے ساتھ عہد وفا باندھا اور اُسے نبا‌ہا —— آہ، وہ میرا پاش پاش مطمح نظر! میں اور میرا آئیڈیل، دو اچھے رفیق تھے —— ان جنہی روشنیوں کی جگمگاہٹ کے ہوتے ہوئے چلے جا رہے تھے! کوئی نہیں جانتا تھا، اور کوئی کیوں پروا کرے؟ ہر صبح وہی اُمید اور ہر شام وہی مایوسی —— میں نے صرف وہی ایک کام نہ کیا جس کی قابلیت مجھ میں ودیعت ہے اور جس کا نام 'زندگی' ہے!

"شام کو جوتیش آیا اور مجھے ملامت کی، اُس نے مجھے بتایا کہ بلاؔ بہت خستہ ہو گئی ہے اور شیلا مضمحل ہے - جیسے میں اِس سے غافل تھا!

"بلاؔ، جوتیش کا یہ ایک لفظ چبھ گیا ہے - میری بچی مضمحل نظر آئے! وہ سمجھتا ہے کہ مجھے شاعری کا حق نہیں، کیونکہ اُس کی قیمت اگر مل بھی سکتی ہے تو اتنی نہ ہوگی کہ میں بلاؔ کو تازہ دم اور شیلا کو مسرور رکھ سکوں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مس جوتیش اور اردیشر کے ساتھ ہو جاؤں - ویسا ہی بنجاؤں، وہ لکھنے لگوں جس کی بازار میں مانگ ہے۔ اُس نے یہ بھی کہا کہ میں اپنی مثنوی کے ختم ہونے اور اُس کی آمدنی ہونے تک اُس سے قرض لے لوں" - یہاں پہونچکر نرملؔ مسکرایا کسی خیال پر قربان ہو جانے کی مسرت میں ڈوب گیا — یا اُسکی غلطیوں کا زور اُسے بہالے گیا"

وہ کہتا رہا۔ "جوتیش کے جانے کے بعد میں سیر کو نکل گیا اور اُس کا دیا ہوا سگار بیکر مزے لیتا رہا - سگار بہت نفیس تھا اور رات کی ہوا کلیں پھولوں کی طرح تھی - میں میدان کے بدلے چورنگی پر ہو لیا، بے ارادہ چلا جا رہا اور کمال اطمینان کی حالت میں تھا - میں پارک اسٹریٹ میں جا پہونچا۔ کاسٹن منشن کے پھاٹک میں سے دو عورتیں اور ایک مرد برآمد ہوئے - تینوں بہت خوش تھے ہنستے اور قہقہے لگاتے نکلے اور ایک موٹر میں سوار ہو گئے - وہ مرد اردیشر تھا میں نے دور سے پہلی ہی نظر میں پہچان لیا - اُس کی بیوی اور بہن ساتھ تھی، تینوں خوش و خرم تھے - جھوٹی خوشی! یہ بٹوا اُس کی بہن کا ہے، اور جوتیش کا وہ خط رسوائی اور فضیحت کا گھر، مس اردیشر کا منگیتر اس خط کو دیکھے تو کیا کہے ؟ کسی غیر شاعر کے ہاتھ اگر لگتا تو یہ مختصر سا محبت نامہ جو اپنی قسم کے ادب کا عمدہ نمونہ ہے، بڑی رقم کی ہنڈی ثابت ہوتا!"

نرملؔ پھر ہنسا، کرسی پر سکڑا، سنبھلا اور پھر کہنے لگا :- "میرا خیال اردیشر کے بچوں کی طرف گیا، وہ کسی ادنےٰ تربیت کی، کرایہ پر رکھی ہوئی عورت کی نگرانی میں سو رہے ہوں گے، کمرے ہوادار اور گدے نرم ہوں گے! لیکن ماں باپ کھیل کود میں مصروف - پھر مجھے تمھارا خیال آیا کہ کام کی تھکن سے نڈھال ہو رہی ہو، پھر یہ بٹوا نظر پڑ گیا، میں بڑھا تو یہ پاؤں کے نیچے آ گیا - میں سوچتا ہوں کہ مس اردیشر کو جب علم ہوگا تو اس کا سارا لطف کرکرا ہو جائے گا - نرم گدوں پر بھی بے چین رہے گی!"

اس کے بعد تھوڑی دیر بالکل سکوت رہا - بلاؔ نے مہرِ خموشی توڑی تو اُسے نرم دبی آواز نئی اور عجیب سی معلوم ہوئی۔

"دھن بھاگ! تو سچ مچ یہ تمھیں پڑا ملا! صبح ہی کسی ذریعہ سے مس اردیشر کے پاس پہونچوا دینا چاہئے - تم فکر نہ کرو، میں اس کام کو نہایت خوش اسلوبی سے انجام دے لوں گی" —— "شکریہ، اچھی بلا!"

بلاؔ نے احساسِ خوف کی حالت میں نرملؔ کو دیکھا اور پھر اپنی آواز میں رافت و سکون کا اثر پیدا کر کے کہنے لگی :-

"نرملؔ، یہ سب ایک ڈراؤنا خواب تھا - جوتیش نے غلطی کی جو تم سے ایسی باتیں کیں، کیونکہ اسے معلوم تھا کہ تم ایک اہم تصنیف میں لگے ہوئے ہو - مگر اس کی نیت رنج پہونچانے کی نہ تھی - بہر حال اب تمھیں اپنا کام ختم کرنا ہے، اس لئے کسی طرف دھیان دینا ہی نہ چاہئے - میں سمجھتی ہوں کہ تمھارے لئے سب سے زیادہ ضروری دماغی سکون ہے - مجھے مطلقاً کوئی

شکایت نہیں، ستیلا بھی خوش اور چونچال ہے۔ اتنی مدت کی رفاقت کے بعد باقی راستہ طے کرنے میں تمھیں مجھ پر اعتماد رکھنا چاہئے"۔ — نرمل کے سنتے ہوئے چہرے پر تبسّم کی جھلک دوڑ گئی۔ وہ کہنے لگا:۔ "باقی راستہ طے کرنے میں —— بملا پیاری، تم ہمیشہ قابل اعتماد ہو!" —— بملا کے سراپا میں ایک کپکپی دوڑ گئی:۔ "میں محض اس خیال سے کہتی ہوں کہ تمھیں خاطر خواہ سکون مل سکے، اُس وقت تک کے لئے کہ تمھاری تنوی شائع ہو، جوتیش سے کچھ قرض لے لو۔ دوستی و رفاقت آخر اور کس کام آسکتی ہے؟ اور تم نے کیا اپنے دوستوں اور خود جوتیش کے ساتھ سلوک نہیں کئے؟" بملا نے نہایت دلنشین لہجے میں کہا — نرمل کے چہرے پر سے تبسم کا غازہ اُڑ گیا، اور اُس کی طویل سانس سے کمرے کی فضا بھر گئی:۔
"کہہ چکیں؟" اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"اس سے تمھیں یکسوئی حاصل ہوگی اور تم اعتماد کے ساتھ کام کر سکو گے۔ دوسری طرف جوتیش کی غلط فہمی بھی دور ہو جائے گی، اُسے یقین ہو جائے گا کہ تمھیں اپنی تصنیف پر کتنا اعتماد ہے۔ وہ غالباً تمھارے احسانات کے بوجھ کو ہلکا کرنا چاہتا ہے۔ اب تم آرام کرو"۔ بملا نے کہی، نرمل کو ایک نظر دیکھا، اور اُس کا یہ دیکھنا اپنی جگہ ایک سوال تھا" اور صبح ایسے تازہ دم اُٹھو کہ گویا تمھیں کوئی فکر ہی نہیں۔ میں تمھارا بات بتاؤں گی۔ ہر بات کا زیادہ خیال رکھوں گی۔ بٹوا صبح ہی پہنچا دیا جائے گا اور دوپہر کی فرصت میں جوتیش کے پاس چلی جاؤں گی۔ پہلے فون کر لوں گی —"

نرمل اس طرح دیکھ رہا تھا گویا کچھ جانتا ہی نہیں۔ دفعتًا بات کاٹ کر بولا:— "بملا، جوتیش کے دل میں تمھاری محبت ابھی تک باقی ہے — محبت اصل میں مٹتی ہی کب ہے! شام کو باتوں میں جب تمھاری طرف اشارہ ہوتا اُسکی آنکھوں کی چمک بڑھ جاتی تھی۔ ہاں، تمھارے خیال سے وہ ہر بات پر آمادہ ہو جائے گا —"

"میں بھی یہی سمجھتی ہوں" — "تمھیں احساس ہے؟" — اس خیال سے کہ نرمل اس کے تاثرات کو پڑھ کر بملا کے خطرات سے آگاہ نہ ہو جائے، بملا نے ہاتھ کی آڑ کر لی اور کہنے لگی:۔ "ہماری موجودہ ضرورت تھوڑے سے روپیوں سے رفع ہو جائے گی —" "جب لینا ہے تو اتنا لے لیا جائے کہ پھر تردد نہ ہو — اور لینے کے لئے کم اور زیادہ یکساں ہے؟"

بملا کھڑی ہو گئی اور بھرائی سی آواز میں کہنے لگی:۔ "نرمل اب بہت دیر ہو گئی ہے، تمھارے لئے نہایت ضروری ہے کہ اپنی طاقت و توانائی کی حفاظت کرو۔ اب ایسی کیا بات ہے جو تم افسردہ ہو؟ اُٹھو، اب سو جاؤ"۔ بملا نے آہستہ سے خوابگاہ کا دروازہ کھولا اور ہونٹوں پر اُنگلی رکھکر نرمل کو متنبہ کیا کہ کھٹکا نہ ہونے پائے۔ خود کمرے میں داخل ہو کر موم بتی روشن کی، اور پھر دروازے پر آکر کہنے لگی:۔ "آؤ، سو جاؤ!" — نرمل کھڑا ہو گیا، میز پر ہاتھ ٹیک کر بکھرے ہوئے کاغذوں پر نظر ڈالی، پھر ہاتھوں کو سر پر حلقہ کر کے ایک انگڑائی لی۔ اُس شام کی تو فت و سوخت نے اُس کے چہرے کا رہا سہا رنگ بھی اُڑا دیا اور وہ بالکل سفید پڑ گیا تھا۔ میز کی دراز کھینچی، اُنگلیوں سے بٹوے کو ٹٹولا اور پھر اُٹھا کر دراز میں ڈال دیا، اُس نے دراز بند کر دی اور بٹوا آنکھوں سے اوجھل ہو گیا — "آ جاؤ، نرمل!" — دفعتًہ نرمل غصے کی فوری کیفیت سے کانپ گیا اور بولا:۔—

"دروازہ بند کر لو، اور مجھے میرے حال پر چھوڑ دو ۔۔" "مگر تم - بیمار ہو، اور زیادہ بیمار ہو جاؤ گے!"

"بلا، جو کہتا ہوں وہ کرو! میں کام کروں گا، اس وقت طبیعت حاضر ہے"۔ بلاؔ کی خود اعتمادی اور قوت ارادی رنج اور خوف سے بدل گئیں وہ اول تو ژکی مگر پھر دروازہ بند کر دیا ۔۔۔ نزمل ایک بوڑھے آدمی کے لڑکھڑاتے قدموں سے کھڑکی تک گیا اور سر کی ایک ڈرامائی جنبش کے بعد باہر کی فضا کو دیکھنے لگا اور دیر تک دیکھتا رہا۔ دفعتاً وہ "شیطانی روشنی" موقوف ہو گئی۔ نزمل نے "اچھا!" کہا اور نہایت سکون و اطمینان کی حالت میں میز پر بیٹھ کر اپنے کام میں لگ گیا ۔ نزمل کی مثنوی دراصل پوری ہو چکی تھی مگر تمام نہ ہوئی تھی کیونکہ اس کی "حزنیہ حیات" ابھی ناتمام تھی۔ نزمل نے اُس میں آخری باب کا اضافہ کیا اور اپنی "حزنیہ حیات" کی تکمیل کر کے پھر کھڑکی پر آکھڑا ہوا۔ یہ وہ وقت تھا کہ کلکتہ میں چاروں طرف کی سڑکوں سے مچھلی اور سبزی کی گاڑیاں آنا شروع ہو جاتی ہیں۔ صبح صادق کی ہوا کے سکون خیز جھونکے سرگوشیوں میں کچھ سمجھانے لگے لیکن نزمل نے کھڑکی میں سے جست کی اور ہوا کے سمندر میں غوطہ لگا کر غائب ہو گیا۔

اُدھر بلاؔ کی آنکھ کھلی تو وہ پکاری: - "پیارے نزمل، آکے سو جاؤ ۔۔۔ صبح تم بہت تھک جاؤ گے!"

نزمل مقبول ہو یا نہ ہو مگر مشہور شاعر ضرور تھا۔ اُس کی خودکشی کی خبر سے شہر میں ہلچل پڑ گئی۔ اخبار کے نامہ نگاروں نے متواتر کئی روز تک ہنگامہ جاری رکھا۔ جوتیش نے اخبار والوں کو ضروری اطلاعات دے کر بلاؔ اور شیلاؔ کو دارجلنگ بھیج دیا۔ مگر اخباری لوگوں نے وہاں بھی اُس کا پیچھا نہ چھوڑا۔ ہفتوں اخباروں کے کالم نزمل کے متعلق مضامین شایع کرتے رہے اور اُس کی غیر مطبوعہ مثنوی کے لئے متعدد ناشروں نے تقاضا کیا۔ نزمل کی "حزنیہ حیات" جوتیش کی سپردگی میں دیدی گئی اس مثنوی میں خود نزمل کی داستان زندگی نظم ہوئی تھی۔ ختم داستان پر نزمل ایک عرصہ تک اُلجھن میں مبتلا تھا، کیونکہ نظم کا اُٹھان اور اُس کے مطالب کا بہاؤ متقاضی تھا کہ فسانہ المانجام ہو، لیکن وہ خود تو زندہ تھا! فسانے کے ہیرو کو جھوٹ موٹ مار ڈالنا اُسکی صناعت کی لغت سے خارج تھا نزمل طے کر چکا تھا کہ فسانے کا انجام ناتمام رہے۔ لیکن اُس رات کو جوتیش سے باتیں کرنے میں خود نزمل کے منھ سے "حزنیہ حیات" نکل گیا، جسے اُس نے ایک الہام سے تعبیر کیا اور اُسے "حزنیہ حیات" بنانے کا تہیہ کر لیا۔ ساتھ ہی اُس پر یہ انکشاف ہوا کہ بلاؔ جوتیش سے شادی کر کے زیادہ آرام سے بسر کر سکتی ہے، اُسے کیا حق تھا کہ بلاؔ کو مبتلائے آلام رکھے! ۔۔ ان احساسات و خیالات نے اُس کے اندر ایک محشر بپا کر دیا اور بالآخر اُس نے اپنی کتاب زندگی کو بیدار کر دینے کا تہیہ کر لیا ۔۔ جوتیش نے اُس مثنوی کا ایک فلم بنایا جو نہایت مقبول ہوا کتاب شائع کی جس کے کئی ایڈیشن ہاتھوں ہاتھ نکل گئے۔ بلاؔ اور شیلاؔ کو دنیا میں کسی بات کی کمی نہ رہی ۔۔۔ اس وجہ سے کہ نزمل نے اس کے واسطے اپنی جان دی تھی! ۔ دوسروں کی زندگی ہمیں بیدار نہیں کر سکتی، جو شے ہمیں بیدار کر سکتی ہے وہ خود اپنی زندگی کا ابتلا ہے، نزمل نے جب خودکشی کی تو گویا اس کی حیات بیدار ہو گئی۔

ل - احمد

بھوک

(ایک چشم دید واقعہ سے متاثر ہوکر)

علی الصباح، کہ دنیا تھی محوِ خواب ابھی — چھپا ہوا تھا حجرۂ مشرق میں آفتاب ابھی
فلک پہ انجمنِ شب کا تھا اثر باقی — گھرا ہوا تھا ستاروں میں ماہتاب ابھی
فضائیں گم تھیں دھندلکے میں آخرِ شب کے — عروسِ صبح کے چہرے پہ تھی نقاب ابھی
نہ آئی تھی ابھی سرخیِ افق کے چہرے پر — شفق نے چہرے پہ چھڑکی نہ تھی شراب ابھی

غنودگی میں فضائیں تھیں سر جھکائے ہوئے
میں جا رہا تھا سڑک پر قدم بڑھائے ہوئے

مگر تھا پیش نظر اک مرقعۂ ادبار — دلِ غریب کی صورت اداس تھا بازار
بجز صدائے نفس کے، نہیں نہ تھی آواز — بجز ہوائے سحر کے کوئی نہ تھا بیدار
وہ کوٹھیاں وہ طرب خانہ ہائے دولت و عیش — جہاں تھے آخرِ شب تک حیات کے آثار
وہاں بھی موت کے بیٹھے تھے ہر طرف پہرے — نہ شمع تھی، نہ پتنگے، نہ بزم تھی، نہ بہار
گداگروں کے کئی قافلے بحالِ تباہ — پڑے ہوئے تھے سرِ راہ نیند میں سرشار

یکایک ایک طرف اُٹھ گئی جو میری نظر،
عجب طرح کا نظر آیا سامنے منظر

گلی کے موڑ پہ اک آدمی پریشاں حال — کہ جس کی شام جوانی تھی سوگوارِ زوال
جھکی جھکی ہوئی نظریں، رُندھا رُندھا ہوا دل — دھنسی دھنسی ہوئی آنکھیں، پُٹے پُٹے ہوئے گال
برہنہ جسم، خمیدہ کمر، رمیدہ حواس — بدن نڈھال، طبیعت نڈھال، روح نڈھال
زبانِ "لغزشِ پا" پر فسانۂ شب و روز — سطورِ چینِ جبیں میں حدیثِ ماضی و حال
سمجھ گیا میں اسے دیکھتے ہی حال اس کا — کہ اس کی شکل بیک وقت تھی جواب و سوال
بساطِ خاک پہ بیٹھا ہوا تھا خاک بسر — پڑی تھی سامنے کوڑے پہ کچھ سڑی ہوئی دال
سگِ حریص کی مانند چاٹتا تھا اسے — بُرا تھا بھوک سے کچھ اسقدر غریب کا حال

میں اس مہیب نظارے کی تاب لا نہ سکا
قدم جمے کے جمے رہ گئے اُٹھا نہ سکا

رضا نقوی

غزل :-

فراق گورکھپوری

قصۂ دردِ محبت ہی تو ہے
کیوں نہیں سنتے حکایت ہی تو ہے

جن کو اُن آنکھوں نے غافل کر دیا
آج کیوں جائیں قیامت ہی تو ہے

مل کے اہلِ غم سے وقتِ عرضِ حال
جُھک گئی چشمِ مروت ہی تو ہے،

درد کے مارے ہوئے بھی سو گئے
چھا گئی ان پر بھی غفلت ہی تو ہے

ہم وہی ہیں اے نگاہِ آشنا
خوش نہیں ہوتے طبیعت ہی تو ہے

عشق کو رہنے دے اپنے حال پر
امتیازِ درد و راحت ہی تو ہے

صبر بھی رکھتے ہیں تیرے بیقرار
کاٹ دیں گے شامِ فرقت ہی تو ہے

آنکھ جھکتے ہی اُڑیں چنگاریاں،
شرم ہی تو ہے شرارت ہی تو ہے

راز اس کا کھل نہیں سکتا فراقؔ
درد ہی تو ہے محبت ہی تو ہے

غزل :-

(جگرؔ بریلوی)

کیونکر کہوں زباں سے کہ تو مہرباں نہیں
لیکن میرا نصیب کہ میں شادماں نہیں

کوئی تو نازشِ صفتِ ماتم بھی چاہیئے
میرا وجود تیرا ستم رائگاں نہیں

پھولوں کا رنگ دیکھ رہا ہوں چمن سے دور
افسوس ہے کسی کو خیالِ خزاں نہیں

کیفیت و سرور ہے اور جلوۂ جہاں
اب میں نہیں، زمین نہیں، آسماں نہیں

مصروفِ کارِ عشق خموشی سے ہیں جگرؔ
ہم آشنائے شیوۂ آہ و فغاں نہیں

ہم کو تاثیرِ غم سے مرنا ہے،
اب اسی رنگ میں نکھرنا ہے

جاں نثاری قبول ہو کہ نہ ہو
ہم کو اپنی سی کر گزرنا ہے

اب کوئی زہر دے کہ بادۂ ناب
ایک پیمانہ ہم کو بھرنا ہے

دیکھ لی ہم نے عشق کی معراج
اس سے آگے ابھی گزرنا ہے

حسن ہو عشق ہو جنوں ہو کہ ہوش
سب سے بیگانہ دل کو کرنا ہے

غزل :—

(مرزا جعفر علی خاں صاحب اثر)

جنوں میں بھی وہی خواب پریشاں دیکھ لیتا ہوں
وفا کا عہد اُن ہونٹوں پہ لرزاں دیکھ لیتا ہوں

معاذ اللہ ترے حسن روز افزوں کی آرائش
پئے یک جلوہ خون صد گلستاں دیکھ لیتا ہوں

نیاز عشق فرصت آنکھ اُٹھانے کی نہیں دیتا
اگر دست طلب میں ترا داماں دیکھ لیتا ہوں

ادا کچھ ملتی جلتی ہے ترے دامن جھٹکنے کی
گلوں کو دیکھ کر اپنا گریباں دیکھ لیتا ہوں

کبھی ترک تمنا پر، کبھی عرض تمنا پر
محبت کو محبت سے پشیماں دیکھ لیتا ہوں

مجھے کیا کام تھا نظارۂ گلہائے خنداں سے
ستمگر تیری خوئے تاب پنہاں دیکھ لیتا ہوں

اثر فکر رسا جب مائل پرواز ہوتی ہے
فضائے شعر میں نغموں کا طوفاں دیکھ لیتا ہوں

محکمۂ اطلاعات عامہ صوبجات متحدہ کی ایک تحریر

ہمیں موصول ہوئی ہے، جس میں نگار کے بعض اطلاعات کی ان الفاظ میں تردید کی گئی ہے :—

مکرمی تسلیم

نگار بابت اگست ۱۹۳۸ء میں " ملاحظات " کے زیر عنوان صوبجات متحدہ میں سینٹری انسپکٹروں کے انتخاب کے سلسلہ میں ڈائرکٹر صحت عامہ (جنھیں نگار نے مسلمان قرار دیا ہے) اور آنریبل وزیر لوکل سلف گورنمنٹ کی جس گفتگو کا حوالہ دیا گیا ہے وہ غالباً کسی غلط فہمی کا نتیجہ ہے

واقعہ یہ ہے کہ موجودہ ڈائرکٹر[1] صحت عامہ مسلمان نہیں بلکہ ہندو ہیں اور جس گفتگو کا ملاحظات میں ذکر کیا گیا ہے وہ وزیر موصوف اور ڈائرکٹر صحت عامہ کے درمیان کبھی نہیں ہوئی۔ اب کی سال ۳۴ سینٹری انسپکٹر مقرر کئے گئے ہیں جن میں ۱۱ مسلمان ہیں

امید کہ جناب " نگار " کی آیندہ اشاعت میں ضروری تصحیح کر دیجئے گا

دستخط ڈپٹی ڈائرکٹر (اردو)

(نگار) ہمیں یہ معلوم کر کے مسرت ہوئی کہ آنریبل وزیر لوکل سلف گورنمنٹ سے جس گفتگو کا حوالہ اگست کے نگار میں دیا گیا ہے وہ نہیں ہوئی

---

[1] میں نے غلطی سے ڈائرکٹر لکھدیا تھا، میری مراد محکمۂ صحت عامہ کے ہیڈ اسسٹنٹ سے تھی۔

فیروز شاہ کے عہد میں بڑے بڑے علما پائے جاتے تھے۔ ان میں سے ایک مولانا جلال الدین[۱] رومی تھے جو مدرسہ فیروز شاہی کے پرنسپل تھے۔ دوسرے مولانا عالم آندپتی جن کی نسبت مولانا عبدالحق[۲] دہلوی نے لکھا ہے کہ فتاوائے تاتارخانی

۱ؔ مشہور مثنوی کے مصنف مولانا روم دوسرے تھے۔ ۲ؔ مولانا عبدالحق بن سیف الدین دہلوی کی تاریخ حقی مشہور کتاب ہے اس میں سلاطین غلام خاندان سے لیکر اکبر تک کے حالات درج ہیں۔ یہ تاریخ ۱۰۰۵ھ / ۱۵۹۶ء میں (جب اکبر کی تخت نشینی کا بیالیسواں سال تھا) مرتب ہوئی مصنف کے آبا و اجداد بخارا سے ہندوستان آئے تھے اور دہلی میں مقیم ہو گئے تھے۔ مصنف بادشاہ نامہ لکھتا ہے کہ جب تیمور دہلی کی تاخت سے فارغ ہوکر لیے بلخ واپس گیا تو اسکے ساتھیوں میں سے کچھ لوگ یہاں رہ گئے تھے اور انھیں میں سے کسی کی اولاد میں عبدالحق ہیں۔ لیکن مولوی عبدالحق اپنی کتاب اخبار الاخیار میں لکھتے ہیں کہ "میرا جد اعلےٰ آغا ترک علاؤ الدین خلجی کے زمانہ میں دہلی آیا۔ آغا ترک کا باپ ماوراء النہر چلا گیا تھا اور پھر وہاں سے تیمور کے ساتھ آیا"

مسٹر مکاف نے اپنے مسودہ تاریخ دہلی میں لکھا ہے کہ انکا مورث اعلےٰ بخارا سے دہلی آیا اور یہاں شاہی دربار سے متعلق ہوگیا بہرحال اس میں کلام نہیں کہ مولوی عبدالحق کے آبا و اجداد بخاری تھے۔ اس لئے مولوی عبدالحق کے بیٹے "دہلوی البخاری" کی نسبت سے مشہور ہوئے۔ مولوی عبدالحق کے والد ایک بزرگ آدمی تھے جن کی تعریف مصنف نے کی ہے۔ مولوی عبدالحق بیس سال کی عمر میں تمام علوم متداولہ سے فارغ ہوگئے اور قرآن بھی حفظ کیا (بادشاہ نامہ عبدالحمید لاہوری) دوران تعلیم کا حال بیان کرتے ہوئے وہ خود اپنی مشہور تصنیف اخبار الاخیار میں لکھتے ہیں کہ وہ دونوں وقت مدرسہ جایا کرتے تھے اور صرف کھانا کھانے کے لئے تھوڑی دیر کو گھر آتے تھے ان کا گھر مدرسہ سے دو میل کے فصل پر تھا اس لئے شوق تعلیم میں یہ روزانہ ۴ میل کا سفر کیا کرتے تھے۔ دہلی چھوڑنے کے بعد کچھ عرصہ تک ملا عبدالقادر بدایونی، فیضی اور نظام الدین مولف طبقات اکبری کے ساتھ فتحپور سیکری میں رہے (تاریخ بدایونی) لیکن بعد کو کسی اختلاف کی بناء پر علحدہ ہوگئے اور حج کو چلے گئے بعد فراغ حج عرب میں عرصہ تک قیام رہا اور مدینہ و مکہ کے علماء سے بہت کچھ فیضان حاصل کیا۔ اصول تصوف، مذہب، سیاحت، تفسیر وغیرہ کی بہت سی کتابیں ان کی تصنیف سے ہیں۔ خود انھوں نے اپنی تصانیف کی تعداد ایک سو بتائی ہے۔ ان میں سے مدینہ سکینہ، مدارج النبوۃ، جذب القلوب (تاریخ مدینہ) اور اخبار الاخیار بہت مشہور ہیں۔ مولوی عبدالحق ۹۵۸ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۰۵۲ھ میں انتقال کیا۔ انھوں نے حوض شمسی کے پاس اپنا مقبرہ اپنی ہی زندگی میں طیار کرا لیا تھا چنانچہ یہیں مدفون ہوئے (یہ مقبرہ اب بھی موجود ہے اور اچھی حالت میں ہے) مولوی عبدالحق بہت صحیح و توانا شخص تھے مولف بادشاہ نامہ کا بیان ہے کہ ۱۰۴۸ھ میں جب کہ ان کی عمر ۹۰ سال کی تھی ان کے قواء نہایت اچھے تھے اور اپنے مشاغل تصنیف و تالیف میں اسی طرح مصروف تھے جیسے عالم شباب میں۔ مصنف کا بیان ہے کہ تاریخ لکھنے کا شوق انھیں ضیاء برنی کی تاریخ فیروز شاہی کو دیکھ کر پیدا ہوا چونکہ تاریخ فیروز شاہی میں صرف فیروز شاہ تک کے حالات تھے اس لئے بعد کے سلاطین کے حالات انھوں نے تاریخ بہادر شاہی (مصنفہ سام سلطان بہادر گجراتی) سے مدد لیکر بہلول لودی تک کی تاریخ مرتب کی اسکے بعد یہ خیال پیدا ہوا کہ ان بادشاہوں کا بھی حال لکھنا چاہئے جن کی طرف ضیاء برنی نے اعتنا نہیں کیا ہے۔ اس غرض سے انھوں نے طبقات ناصری سے مدد لیکر فخر الدین سام (محمد غوری) کے حالات سے اپنی تاریخ کو شروع کیا۔ بہلول لودی کے وقت سے عہد اکبری تک کے حالات انھوں نے زیادہ تر زبانی روایات اور اپنے ذاتی معلومات کی بناء پر لکھے ہیں۔ انھوں نے سلاطین بنگال، جونپور، مانڈو، (مالوہ)، دکن، ملتان، سندھ و کشمیر کے حالات بھی لکھے ہیں لیکن نہایت مجمل و مختصر۔ تاریخ حقی کمیاب ہے اور ہندوستان میں اس کے قلمی نسخے شاذ و نادر کہیں کہیں پائے جاتے ہیں ایک نسخہ برٹش میوزیم میں ہے اور دوسرا رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے کتب خانہ میں۔

کی ترتیب میں انھیں کا خاص حصہ تھا۔ علاوہ ان کے مولانا خواجگی (قاضی شہاب الدین دولت آبادی کے استاد) مولانا احمد تھانیسری اور قاضی عبدالمقتدر (جو علاوہ فاضل ہونے کے بے مثل شاعر بھی عربی و فارسی کے تھے اور جنھوں نے لامعۃ العجم کا جواب لکھ کر شہرت دوام حاصل کر لی ہے) ملک احمد ولد امیر خسرو اور مولانا مظہر کڑوی اور قاضی عابد بھی اپنی اپنی جگہ بے مثل علماء و صاحبان کمال میں شمار کئے جاتے تھے

سلہ سلطان ابراہیم شرقی بادشاہ جونپور کے عہد میں قاضی شہاب الدین دولت آبادی نے عروج حاصل کیا، قاضی صاحب اپنے عہد کے اشہر و شد تسلیم کئے جاتے تھے اور اس وقت کے تمام علماء انھیں "ملک العلماء" کہا کرتے تھے کیونکہ ان سے زیادہ صاحب فضل و کمال اور کوئی شخص نہ تھا۔ قاضی صاحب کی تصانیف متعدد ہیں جن میں حواشی کافیہ (جو ان کی بہترین تصنیف کہی جاتی ہے) ارشاد، بدیع البیان خاص شہرت رکھتی ہے

سلہ ملک احمد امیر خسرو کے صاحبزادہ تھے۔ اور مذاق شعری نہایت پاکیزہ رکھتے تھے۔ اگرچہ ان کا کوئی دیوان ایسا نہیں پایا جاتا، لیکن شعرائے متقدمین کے کلام میں جو اصلاحیں انھوں نے دی ہیں وہ کہیں کہیں نظر آجاتی ہیں۔ بدایونی نے چند مثالیں لکھی ہیں مثلاً ظہیر کا شعر ہے:۔

کلاہ گوشۂ حکم تو از طریق نفاذ ربودہ از سر گردون کلاہ جباری

انھوں نے ربودہ کو فگندہ سے بدل دیا ___ کمال کی ہجو میں ایک شعر مشہور ہے:۔

ایں سہل بود کہ گوگرد سرخ خواست گرنان خواجہ خواستے آں راچہ کردمی،

ملک صاحب نے بجائے گوگرد سرخ کے آب حیات کر دیا ___ اسی طرح ایک اور شعر ہے:۔

گر مشک خواند خاک درت را فلک مرنج ترش گہر بطعن خریدار نشکند،

ملک احمد نے پہلے مصرعہ کو یوں کر دیا:۔ "گر لعل خواند سنگ درت مشتری مرنج" (بدایونی ۶۷)۔ (شعر العجم- ۲- ہم ۱۲)

سلہ مولانا مظہر کڑوی کے متعلق بدایونی نے لکھا ہے کہ اس کے زمانہ میں مولانا مظہر کی اولاد لکھنؤ میں موجود تھی۔ مولانا دربار فیروز شاہ میں خاص عزت رکھتے تھے۔ ان کا ایک دیوان بھی ۱۵ ہزار اشعار کا تھا لیکن چونکہ ان پر زہد و علم کا رنگ زیادہ غالب تھا اس لئے ملا بدایونی کے نزدیک ان کے اشعار زیادہ پرلطف اور بامزہ نہ ہوتے تھے

سلہ قاضی عابد شاعر بھی تھے چنانچہ ان کا یہ قطعہ بہت مشہور ہے اور حقیقتاً نہایت خوب ہے:۔

دوستاں گویند عابد با چنیں طبع لطیف چیست کاشعار غزل از تو فراواں برنخاست

ما کراشعر و غزل گوئیم چوں در عہد ما شاہد موزوں و ممدوحی زر افشاں برنخاست

یہ قطعہ بالکل ترجمہ معلوم ہوتا ہے عربی کے اس قطعہ کا۔

قالوا ترکت الشعر قلت ضرورۃ باب الدواعی والبواعث مغلق

خلت الدیار فلا کریم یرتجی، عنہ النوال ولا ملیح یعشق،

(لوگ مجھ سے پوچھتے ہیں کیا تو نے شعر گوئی ترک کر دی میں جواب دیتا ہوں کہ ہاں، کیونکہ اسباب شعر گوئی ناپید ہیں۔ نہ کوئی ایسا سخی ہے جس کی مدح میں شعر کہہ کے بخشش کی توقع قائم کی جائے اور نہ کوئی ایسا سبزہ رنگ معشوق ہی ہے جس کی محبت شعر کہنے پر مجبور کر دے)

فیروزشاہ کو تمام فنون کے ساتھ دلچسپی تھی چنانچہ اُستادوں کے ماتحت اس نے اپنے غلاموں کی بڑی تعداد کو مختلف پیشوں اور حرفتوں کی تعلیم دلائی۔ اور لوگوں میں مختلف قسم کی نئی چیزیں بنانے کا ولولہ پیدا کر دیا اس عہد کے ایک مشہور ایجاد طاس گھڑیال ہے جس سے نمازوں کے اوقات روزہ کھولنے کا وقت سایہ کا حال، شب و روز کے گھٹنے بڑھنے کی کیفیت معلوم ہوتی تھی۔ فیروز آباد میں جہاں یہ گھڑیال لگا تھا وہاں اس کے دیکھنے کے لئے ہر وقت لوگوں کا ہجوم رہتا تھا۔ اس ایجاد کو خود فیروزشاہ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ ہر جشن کے موقعہ پر جو سال میں چار بار (عیدین، نوروز و شب برات) ہوتے تھے اور ہر جمعہ کو نماز کے بعد داستان گو گوئے، ماہرین رقص، پہلوان اور کرتب دکھانے والے جمع ہوکر اپنا کمال اور تماشہ دکھایا کرتے تھے۔ اور بادشاہ سب کو انعام دیکر رخصت کرتا تھا

فیروزشاہ کو قدیم اور نادر چیزیں جمع کرنے کا بڑا شوق تھا چنانچہ اشوکا کے سنگین ستونوں کا فیروز آباد میں نصب کرنا بھی اسی ذوق کی بنا پر تھا۔ اس نے ایک خاص مکان اس لئے تعمیر کرایا تاکہ وہاں ایسی عجیب و غریب چیزیں رکھی جائیں

سراج عفیف نے لکھا ہے کہ اس عجائب خانہ میں ایک پستہ قد شخص ایسا تھا جو صرف ایک گز لمبا تھا لیکن اس کا سر تین آدمیوں کے برابر تھا۔ دو آدمی دراز قامت تھے۔ یہ اتنے لمبے تھے کہ اُسوقت کا طویل سے طویل قد رکھنے والا آدمی ان کی کمر تک پہونچتا تھا۔ دو عورتیں ایسی تھیں جن کی داڑھی بالکل مردوں کی طرح تھی۔ ایک بکری تین پاؤں کی تھی جو خوب دوڑتی تھی۔ ایک سیاہ کوا سُرخ چونچ کا، ایک سپید طوطی سیاہ منقار کی ایک گائے جس کے سُم گھوڑے کی طرح تھے۔ اور علاوہ ان کے اور بہت سی چیزیں اس عجائب خانہ میں تھیں۔ آدمیوں اور ہاتھیوں کی وہ ہڈیاں بھی اس عجائب خانہ میں رکھی ہوئی تھیں، جو سرستی اور ستلج کے درمیان پشتہ زمین کھودنے سے برآمد ہوئی تھیں۔ بعض ہڈیاں ایسی تھیں جو نصف پتھر ہوگئی تھیں

فیروزشاہ کو کمسنی ہی سے شکار کا بہت شوق تھا محمد شاہ تغلق اسے منع بھی کرتا رہتا، لیکن یہ باز نہ آتا جب عنان حکومت اس کے ہاتھ میں آئی تو اس شوق نے اور زیادہ ترقی کرلی

یہ نہ صرف چیتوں اور سیاہ گوش کے ذریعہ سے شکار کھیلتا تھا بلکہ شیر بھی اس غرض سے اس نے پال رکھے تھے۔ شاہین، باز، جرہ، بحری، وغیرہ کے ذریعہ سے بھی شکار کھیلتا تھا۔

موسم گرما میں دیپال پور اور سرستی کا درمیانی حصہ گورخر کے شکار کے لئے مخصوص تھا۔ اسی طرح موسم سرما میں بدایوں اور آنولہ کے جنگلوں میں نیل گائے کا شکار کیا کرتا تھا۔ اگر کسی جنگل میں شیر آجاتا، تو کوئی اس کا شکار نہ کرتا، بلکہ بادشاہ کو اس کی خبر دی جاتی اور یہ فوراً وہاں پہونچ کر اس کا شکار کرتا

چونکہ فیروزشاہ فطرتاً رحیم المزاج تھا اس لئے فتوحات کے لحاظ سے اس نے کوئی ترقی نہیں کی۔ تاہم اس کی فتوحات میں سب سے بڑی فتح یہی ہے کہ محمد شاہ تغلق کے زمانہ میں جو طوائف الملوکی اور بدامنی پھیل گئی تھی وہ اس کے عہد میں مفقود

ہوگئی اور سلطنت میں ہر طرف امن وسکون نظر آنے لگا۔ وہ جنگ سے متنفر تھا اور حقیقت یہ ہے کہ جنگی قابلیت اس میں بہت کم تھی۔ دکن، جہاں حسن گنگو نے اپنی خود مختار حکومت بہمنی سلطنت کے نام سے کوہ وندھیاچل کے جنوب تک قایم کرلی تھی، اور جو ۱۸۰ سال تک قایم ہوئی بدستور مطلق العنان رہا۔ بنگال کی طرف ہر چند فیروز شاہ دو مرتبہ گیا، لیکن کوئی نتیجہ نہ نکلا۔

پہلی دفعہ جب سنہ ۷۵۴ھ (۱۳۵۳ء) میں وہ بنگال کی طرف گیا تو گیارہ مہینہ تک واپس نہیں آیا۔ اس مہم میں اس کو کامیابی حاصل ہوئی اور ایک لاکھ اسی ہزار بنگالی افواج قتل کی گئی۔ لیکن جب فیروز شاہ کو معلوم ہوا کہ اسقدر جانیں ضایع گئی ہیں تو اس نے یک ڈلہ کے قلعہ کا محاصرہ (جہاں شاہ بنگال بھاگ کر پناہ گزیں ہوگیا تھا) چھوڑ دیا اور دہلی واپس آیا

اس کے بعد سنہ ۷۶۰ھ (۱۳۵۹-۶۰ء) میں وہ پھر بنگال گیا۔ اس وقت ستر ہزار سوار، اور بیشمار پیدل فوج ساتھ تھی (۴۷۰ ہاتھی بھی ہمراہ تھے) لیکن اس مہم کا نتیجہ بھی یہ ہوا کہ صلح ہوگئی۔ واپسی میں بادشاہ ہاتھیوں کا شکار کرنے پدماوتی (چھوٹا ناگپور) کے جنگل میں پہونچگیا اور بڑی مشکل سے اپنے ساتھیوں کی جان بچا کر دہلی واپس آسکا۔ اس دفعہ وہ ڈھائی سال کے بعد دہلی آیا اور آخر ۶ ماہ میں تو کوئی خبر ہی بادشاہ کی دہلی تک نہ پہونچ سکی

اس کے بعد اس نے ٹھٹھہ فتح کرنے کا عزم کیا اور نوے ہزار سوار، ۴۸۰ ہاتھی لیکر بھکر کی طرف روانہ ہوا۔ کچھ فوج ۵۰۰۰ کشتیوں کے ذریعہ سے دریائے سندھ کو عبور کرکے پہونچی اور کچھ بہہ کر ساحل گئیں۔ اتفاق سے اس زمانہ میں قحط پڑگیا اور رسما، جام (فرمانروائے سندھ) کے مقابلہ میں شکست ہوئی۔ واپسی میں فیروز شاہ نے گجرات کا قصد کیا لیکن راستہ بتانے والوں نے دھوکا دیکر کچھ کی دلدلوں میں پھنسا دیا۔ پھر ۶ ماہ تک بادشاہ کی کوئی خبر دہلی نہیں پہونچ سکی۔ اس مصیبت سے نجات پانے پر بادشاہ نے پھر گجرات میں فوج مرتب کی اور دہلی سے کمک طلب کرکے سندھ پر حملہ کیا اس مرتبہ بادشاہ کو کامیابی حاصل ہوئی اور وہاں کے فرمانروا کو معزول کرکے اس کے بیٹے کو تخت نشین کیا اس کے بعد نگرکوٹ پر حملہ کیا اور وہاں فتح ہوئی

جب فیروز شاہ، دہلی آکر انتظام سلطنت میں مصروف ہوا تو خداوند زادہ (سلطان محمد تغلق کی بہن) معہ اپنے شوہر کے وہیں ایک محل میں رہتی تھی، فیروز شاہ ہر جمعہ کو اس محل میں جاتا۔ ملک خسرو (آئے کھڑا ... اور ملک داود خداوند زادہ کا بیٹا) ماں کے پیچھے بیٹھتا۔ جب بادشاہ رخصت ہونے لگتا تو خداوند زادہ پان دیتی

ہر چند خداوند زادہ، فیروز شاہ کی تخت نشینی پر راضی ہوگئی تھی، لیکن حقیقتاً وہ اس سے خوش نہ تھی۔ اس نے فیروز شاہ کو قتل کردینے کی سازش کی اور محل کے اندر حجروں میں زرہ پوش ... چھپا ... کہ جب وہ میں اپنے سر پر دوپٹہ کو درست کرنے لگوں تو فیروز شاہ کا کام تمام کردیں۔

جب فیروز شاہ حسب معمول آیا تو داؤد ملک نے جو اس سازش میں شریک نہ تھا بادشاہ کو چلے جانے کا اشارہ کیا یہ کچھ سمجھ کر فوراً وہاں سے چلدیا۔ خداوندزادہ روکتی رہی مگر یہ کوئی عذر کر کے چلا آیا۔ اس کے بعد جب خداوندزادہ کے محل کا محاصرہ کیا گیا تو زرہ پوش سپاہی گرفتار ہوئے اور انھوں نے سارا حال بیان کر دیا۔ بادشاہ نے خداوندزادہ کو صرف یہ سزا دی کہ وہ گوشہ نشین ہو جائے اور اپنا وظیفہ لیتی جائے اور اس کے شوہر خسرو ملک کو جلاوطن کر دیا

جب بادشاہ اول مرتبہ بنگال کی مہم پر گیا تو تاتار خاں بھی ساتھ تھا۔ بادشاہ کبھی کبھی شراب کا شغل کیا کرتا تھا۔ ایک دن صبح کو اتفاق سے تاتار خاں اس کے خیمہ میں پہونچ گیا۔ فیروز اس وقت اسی شغل میں مصروف تھا فوراً شراب کا سامان پلنگ کے نیچے چھپا دیا۔ لیکن تاتار خاں نے دیکھ لیا اور بادشاہ کو نہایت سختی سے زجر و توبیخ کی۔ بادشاہ بہت نادم ہوا اور آیندہ کے لئے عہد کیا کہ میں تمہاری موجودگی میں کبھی شراب نہ پیوں گا

تاتار خاں صرف ایک فوجی افسر تھا۔ لیکن یہ فیروز شاہ کی حد درجہ انصاف پسندی اور سلامت روی تھی کہ اس نے اپنے ایک معمولی امیر کی جھڑکی سن لی اور جواب میں سوائے انفعال و ندامت کے اظہار کے اور کچھ نہ کیا

جب بادشاہ ضعیف ہو گیا تو اس کو ایک سخت صدمہ تو اپنے وزیر خان جہاں کی وفات کا پہونچا اور دوسرا صدمہ بڑے بیٹے فتح خاں (ولی عہد) کا جس کی وفات وزیر کے تین سال بعد وقوع میں آئی۔ فتح خاں نہایت ہوشیار و قابل لڑکا تھا۔ اس لئے اس کی موت نے بادشاہ کی کمر توڑ دی۔ فیروز شاہ نے خان جہاں کے مرنے کے بعد اس کے بیٹے کو وزیر کر دیا لیکن فیروز کے دوسرے بیٹے محمد کی سازش سے وزیر کو معزول ہو کر جان کے خوف سے بھاگ جانا پڑا۔ اس کے بعد فیروز شاہ نے ناصر الدین کا خطاب دے کر تمام انتظام سلطنت محمد کے سپرد کر دیا۔ چونکہ محمد سخت نالایق تھا اس لئے غلاموں میں اسکے طرز عمل سے سخت ہنگامہ برپا ہو گیا فیروز شاہ کو مجبوراً اپنی خلوت سے نکلنا پڑا اور بمشکل اس شورش کو رفع کر کے اپنے پوتے یعنی فتح خاں کے بیٹے کو تخت نشین کیا اور چند دن بعد ۱۸ رمضان سنہ ۷۹۰ھ[1] کو انتقال کر گیا اس کی عمر نوے سال کی تھی اسنے قریب چالیس سال کے حکومت کی اور اپنے غیر فانی نقوش حسن انتظام کے چھوڑ گیا۔ فیروز شاہ، حوض خاص (شمسی) کے پاس مدفون ہوا اس کا مقبرہ اب بھی شکستہ حالت میں موجود ہے۔

فیروز شاہ کی ... انصاف پسندی

فیروز شاہ کی وفات ۷۹۰ھ

---

[1] یہ تاریخ وفات طبقات اکبری بدایونی اور تاریخ مبارک شاہی کے بیان کے مطابق ہے۔ فرشتہ میں شاید کتابت کی غلطی سے ۱۳ رمضان سنہ ۷۹۹ھ درج ہے سنہ عیسوی ۱۳۸۸ تھا اور تاریخ ۲۶ ستمبر۔
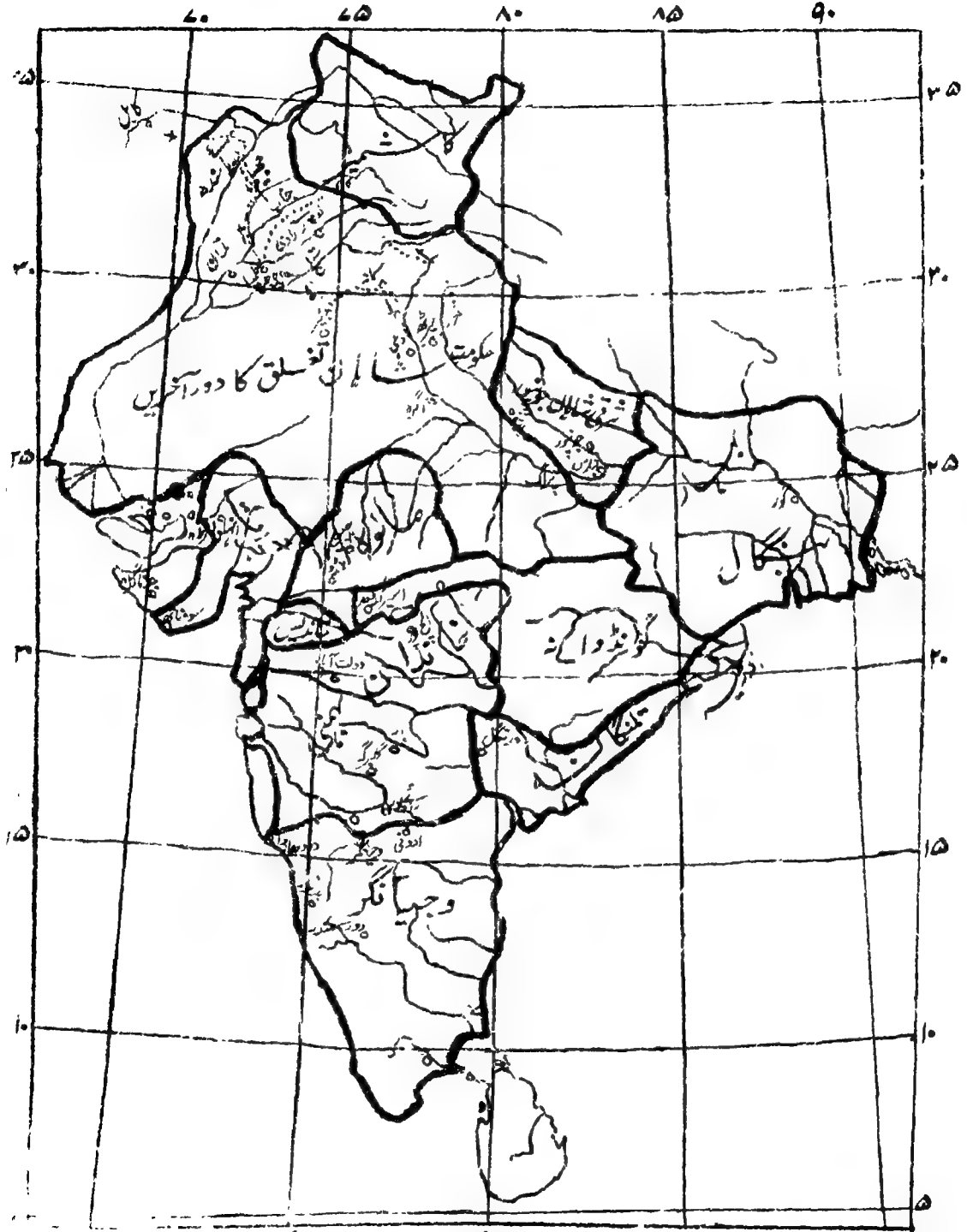
ہندوستان سنہ ۸۰۰ھ (۱۳۹۸ء) میں
بنگال
گونڈوانہ
وجیانگر
انگریزی میل
عہد طوائف الملوک و زوال خاندان تغلق
تیمور کا حملہ نقطوں کے ذریعہ سے اس طرح ( ) ظاہر کیا ہے

باب یازدہم

سلاطین افاغنہ کا زوال

حکومت ہند کا تجزیہ

اور تیمور کا حملہ

اس میں شک نہیں کہ فیروز شاہ کے طویل عہد حکومت میں، جو اپنے امن وسکون، اور حسن انتظام اور خوشحالی کی وجہ بہت ممتاز زمانہ خیال کیا جاتا ہے، سلطنت کے تمام عناصر اپنی اپنی جگہ مطمئن تھے۔ لیکن تخت وتاج کی وہ قوت جو شخصی حکومت کا طرۂ امتیاز خیال کی جاتی ہے تقریباً مفقود تھی

وہ نسل جس نے سلطان غیاث الدین بلبن کی شوکت وجبروت، سلطان علاؤالدین کے رعب وسطوت اور محمد تغلق کے عزم وہمت کے تماشے دیکھے تھے، مٹ چکی تھی اور بادشاہ کی ہیبت سے ہر وقت لرزہ براندام رہنا فیروز شاہ کے عہد میں ایک بھولے ہوئے خواب سے زیادہ حیثیت نہ رکھتا تھا۔ فیروز سے لوگ محبت کرتے تھے لیکن اس کی طرف سے ڈر نکل گئے تھے اور اس کی نرمی نے لوگوں کے دلوں سے خوف بالکل محو کر دیا تھا

یہ صحیح ہے کہ فیروز شاہ کے عہد میں کوئی بغاوت رونما نہیں ہوئی لیکن اس کی وجہ یہ تھی کہ لوگ شورش وہنگامہ برپا کرکے اس سے زیادہ کچھ نہیں پا سکتے تھے جو انھیں یوں ہی بحالت امن حاصل تھا۔ فیروز کی ذاتی خصوصیات اور اُسکے وزیر خان جہاں کی فراست ودانائی، حقیقتاً ملوکانہ نہیں بلکہ ملکوتی تھیں [illegible] ہر دل میں جگہ کرلی تھی اور کسی کا ضمیر ان نعمتوں کو ٹھکرا دینے کی طرف مائل نہ ہو سکتا تھا

اگر فیروز شاہ کے بعد اس کے جانشین بھی انھیں صفات کے حامل ہوتے تو فتح خاں اس کے بڑے بیٹے سے

یہ توقع کی جاتی تھی) تو یقیناً سلطنت کا شیرازہ اس قدر جلد منتشر نہ ہو جاتا، لیکن فطرت جس کی بہترین تفریح انقلاب اُمم کا تماشہ ہے ایسی متحمل نہ تھی اور چونکہ اُسے دس سال بعد ہی تاتار کے "ایک مغل زادہ" پر تاج صاحبقرانی رکھ کر سرزمین ہند میں ایک دوسری حکومت (مغلیہ) کے حقوق قایم کرنا تھے، اس لئے فیروز شاہ کے بعد ہی اس نے "سلاطین افاغنہ" (اگر حقیقتاً اسوقت تک کے تمام بادشاہوں کو افغانی النسل کہہ سکتے ہیں) کی تاریخ پر تمت لکھ دینے کا ارادہ کر لیا اور چند کمزور جانشینان فیروز کے مضمحل مناظر پیش کرنے کے بعد آخر کار وہ ورق ہی اُلٹ دیا

ہندی غلام

یہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ فیروز شاہ کو اپنے غلاموں کے ساتھ بہت شغف تھا اور تمام معاملات میں وہ ان پر حد سے زیادہ اعتبار کرتا تھا۔ ان کی بڑی بڑی جاگیریں مقرر تھیں، ان کے ہاتھوں سلطنت کے بڑے بڑے کام انجام پاتے تھے، تمام محکمے مصافی ہوں یا غیر مصافی انھیں کے سپرد تھے اس لئے دہلی میں بھی وہی ہوا جو بغداد کی قسمت میں لکھا ہوا تھا اور جس طرح بنی عباس کا زوال ترکی غلاموں کے سبب سے رونما ہوا، اسی طرح سلاطین افاغنہ کی حکومت کا انحطاط ہندی غلاموں کی وجہ سے ظہور میں آیا

فیروز شاہ کی مساعی اور ہندو اقوام سے اتفاق

یہ بالکل صحیح ہے کہ فیروز شاہ جب تک زندہ رہا اس کے غلام امرا نے سرتابی نہیں کی، لیکن یہ کیا ضرور تھا کہ وہ اسکے جانشینوں کا بھی وہی احترام ملحوظ رکھتے اور اُن کی کمزوریوں سے فائدہ نہ اُٹھاتے۔ پھر چونکہ یہ غلام اکثر و بیشتر حال ہی کے نومسلم ہندو تھے، اس لئے ان کے فطری جذبات وطن پرستی ابھی مفقود نہ ہوئے تھے اور فیروز شاہ کے بعد ہی انھیں سلطنت دہلی کی طرف سے جو بالکل غیر مذہب اور غیر ملک والوں کے قبضہ میں تھی، کوئی ہمدردی باقی نہ رہی۔ یہ تھا حال اُس نومسلم ہندو طبقہ کا جو تمام شرائین حکومت میں خون کی طرح دوڑ رہا تھا۔ اب دوسری طرف خود ہندو راجاؤں کو دیکھئے کہ ان کا کیا رنگ تھا۔ فیروز شاہ نے جو یقیناً بے تعصب بادشاہ کہلائے جانے کا مستحق ہے، اس کی بہت کوشش کی کہ ہندو مسلمانوں کے درمیان اتحاد قایم ہو جائے چنانچہ اسی غرض سے اس نے خاندان شاہی کے بعض افراد اور چند امرا و اراکین کی شادیاں بھی ہندو خاندانوں میں کیں لیکن چونکہ ہندو اپنے مذہب و اخلاق، قومیت و افتادِ طبیعت کے لحاظ سے بالکل جدا عنصر ہیں، اس لئے وہ ہمیشہ موقعہ کے منتظر رہے اور اپنی اس خصوصیت کو، کہ جب تک بالکل مجبور نہ ہو جائیں سر اطاعت خم نہ کریں، انھوں نے فیروز شاہ کی مہربانیوں کے زیر اثر بھی فراموش نہیں کیا

فیروز شاہ کے بعد آزادی کی خواہش

جب تک فیروز شاہ زندہ رہا۔ یہ لوگ اُس کے اخلاق سے مرعوب ہو کر خاموش رہے لیکن اس کی آنکھیں بند ہوتے ہی اُن کے جذبات میں پھر تلاطم پیدا ہو گیا اور تاریخ شاہد ہے کہ اس عہد میں انھوں نے سیاسیات ہند کے اندر کیا انقلاب پیدا کر دیا۔ ایک طرف اگر نومسلم ہندو امرا اپنی بڑی بڑی جاگیروں میں خود مختار حکمراں بنے ہوئے تھے، تو دوسری طرف خالص ہندو طبقہ کے حکمراں افراد بھی اپنی آزادی کے لئے "ناخن و دنداں" کا زور صرف کر رہے تھے

تغلق شاہ ثانی (۷۹۰ھ — ۱۳۸۸ء) — ابوبکر شاہ

اگر فیروز شاہ کے بعد کوئی قوی عزم کا بادشاہ ہوتا تو اس شورش کو جو آئندہ دس سال کے بعد ایک بڑے زبردست طوفان کی آمد کی خبر دے رہی تھی فرو کر دیتا۔ لیکن افسوس ہے کہ فیروز کے بعد کوئی اہل شخص تخت نشین نہ ہوا۔ فتح خاں جو فیروز کی تمام تمناؤں کا مرکز تھا، مر گیا تھا۔ دوسرا بیٹا ظفر خاں بھی نہ تھا۔ اس لئے لوگوں نے تغلق شاہ ثانی، فتح خاں کے بیٹے (اور فیروز کے پوتے) کو بادشاہ بنا دیا[1]

چونکہ یہ ایک بیوقوف نوجوان تھا اور سوائے لہو و لعب اور کوئی مشغلہ نہ رکھتا تھا۔ اس لئے امراء اور محل کے غلاموں نے جب کہ اس کی حکومت کو صرف پانچ ماہ اور کچھ دن[2] کا زمانہ گزرا تھا قتل کر دیا

اس کے بعد ظفر خاں کے بیٹے ابوبکر کو امراء نے تخت نشین کیا[3]

---

[1] جس دن فیروز شاہ کا انتقال ہوا اسی دن فیروز آباد میں تغلق شاہ تخت نشین ہوا اور اپنا لقب غیاث الدین رکھا۔ اس نے اپنے چچا ناصر الدین محمد شاہ کے خلاف جو فیروز شاہ کی زندگی ہی میں سرمور بھاگ کر چلا گیا تھا، فوج بھیجی۔ وہ سرمور سے نگر کوٹ چلا گیا اور فوج واپس چلی آئی۔ اس نے اپنے حقیقی بھائی سالار شاہ کو مقید کر دیا اور بہت سی بدعتیں شروع کیں۔ ابوبکر شاہ (ظفر خاں کے بیٹے) نے امراء اور غلاموں کو ملا کر محل پر یورش کی اور ملک مبارک کو قتل کر دیا۔ جب اس کی خبر تغلق شاہ کو معلوم ہوئی تو وہ مع اپنے وزیر (خان جہاں) کے جمنا کی طرف نکل کر بھاگا مگر باغیوں نے ان دونوں کو پکڑ لیا اور قتل کر ڈالا۔ یہ واقعہ ۲۱ صفر ۷۹۱ھ۔ ۱۹ فروری ۱۳۸۹ء کا ہے

[2] بروایت مبارک شاہی ۶ ماہ اٹھارہ دن حکومت کی لیکن یہ صحیح نہیں ہے

[3] جب غیاث الدین قتل ہو گیا تو امراء و ملوک نے ابوبکر شاہ کو تخت نشین کر دیا۔ چونکہ ابوبکر، رکن الملک نائب وزیر کی وجہ سے بادشاہ ہوا تھا اس لئے اس نے سارا انتظام اسی کے سپرد کر دیا۔ اس کے بعد ہی رکن الملک کے دل میں اور زیادہ تمنائیں پیدا ہوئیں اور خود بادشاہ بن جانے یا کسی خاص اپنے آدمی کو فرمانروا بنانے کے خیال سے ابوبکر کی ہلاکت چاہنے لگا۔ جب غلاموں کو یہ خبر معلوم ہوئی تو انھوں نے رکن الملک اور اس کے بہت سے ساتھیوں کو قتل کر دیا، اسی زمانہ میں سلطان شاہ کو "جو ابوبکر شاہ کی طرف سے سامانہ کا گورنر تھا" وہاں کے امراء نے قتل کر ڈالا۔ اس واقعہ سے ناصر الدین محمد کو جرأت ہوئی اور وہ قلعہ نگر کوٹ سے جالندھر ہوتا ہوا سامانہ گیا اور یہاں اپنے مراسم تخت نشینی ادا کر کے دہلی کی طرف بڑھا اور ۲۵ ربیع الآخر ۷۹۱ھ۔ (۲۳ اپریل ۱۳۸۹ء) کو اپنی پچاس ہزار جمعیت لئے ہوئے کوشک جہاں نما تک آیا (جسے کوشک شکار بھی کہتے ہیں اور اب وہ فیروز شاہ کے کوٹلہ کے نام سے مشہور ہے) صف آرائی شروع کر دی۔ ابوبکر شاہ اسوقت فیروز آباد میں تھا۔ ۲ جمادی الاول کو جنگ شروع ہوئی۔ اتفاق سے اسی دن ناہر میواتی اپنی فوج لئے ہوئے ابوبکر کی مدد کو آگیا اور ناصر الدین محمد شاہ کو شکست ہوئی اور دو آبہ چلا گیا اس نے پھر موضع جالیسر میں ساحل گنگ پر قیام کر کے اپنے بیٹے ہمایوں کو سامانہ بھیجکر کمک طلب کی اور شعبان کے مہینہ میں دوبارہ دہلی پر حملہ کیا اور موضع کنڈالی کے پاس لڑائی ہوئی۔ محمد شاہ کو پھر شکست ہوئی اور بہت سامال، خیمہ و خرگاہ ابوبکر کے ہاتھ آیا محمد شاہ پھر بھاگ کر جالیسر چلا گیا

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۲۳۶ پر ملاحظہ فرمائیے)

ناصر الدین محمد (۷۹۲ھ تا ۷۹۶ھ ۱۳۹۰ء تا ۱۳۹۴ء)

مگر چونکہ اس کا چچا ناصر الدین محمد جسے فیروز شاہ کے عہد میں غلاموں نے نکال دیا تھا، پنجاب میں سامانہ سے نگرکوٹ تک اپنا کافی اقتدار پیدا کر چکا تھا، اس لئے وہ دہلی کی طرف بڑھا اور کئی بار شکست کھانے کے بعد ۷۹۲ھ ۱۳۹۰ء میں تخت دہلی پر قابض ہوا۔ یہ سید چار سال تک حکمراں رہا لیکن اس کے زمانۂ حکومت میں ہر جگہ ہندوؤں نے بغاوت شروع کر دی اور جو کچھ اقتدار سلطنت دہلی کا باقی تھا وہ بھی مٹ گیا[۱]

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۲۳۵)

اس کے بعد محرم ۷۹۲ھ (جنوری ۱۳۹۰ء) میں شاہزادہ ہمایوں خاں (محمد شاہ کے بیٹے) نے سامانہ کے لوگ و امراء کو جمع کر کے نواح دہلی کو لوٹنا شروع کیا۔ ابوبکر شاہ نے بھی اپنی فوج روانہ کی اور پانی پت کے قریب موضع بسینہ میں جنگ شروع ہوئی۔ اس کا نتیجہ بھی محمد شاہ کے خلاف ہوا اور ابوبکر کو نمایاں کامیابی حاصل ہوئی۔ محمد شاہ اپنی متواتر ناکامیوں سے مایوس ہو گیا تھا اور غالباً وہ اب قسمت آزمائی نہ کرتا، لیکن ابوبکر شاہ نے جمادی الاول کے مہینہ میں خود ہی جلیسر کی طرف پیش قدمی کر کے محمد شاہ کو بالکل نیست و نابود کر دینا چاہا۔ چنانچہ جب وہ ۲۰ کوس دہلی سے دور ہو گیا تو محمد شاہ چار ہزار فوج لیکر دوسرے راستہ سے دہلی میں داخل ہو گیا۔ جب ابوبکر شاہ کو یہ خبر معلوم ہوئی تو وہ پھر اپنا لشکر لیکر دہلی واپس آیا اور سلطان محمد پھر بھاگ کر جلیسر چلا گیا۔ رمضان میں مبشر حاجب، جو غلامان فیروز شاہی میں بہت با اقتدار شخص تھا، ابوبکر سے منحرف ہو گیا اور فیروز آباد میں خاص شورش پیدا ہو گئی۔ چونکہ ابوبکر کے پاس اس کا کوئی علاج نہ تھا اس لئے وہ بہادر ناہر کے کوٹلہ چلا گیا۔ ۱۸ رمضان کو مبشر حاجب اور دیگر امراء نے سلطان محمد کو اطلاع دی اور ۱۹ رمضان ۷۹۲ھ کو وہ جلیسر سے چلکر دہلی پہونچ گیا اور تاج سلطانی سر پر رکھ کر مبشر حاجب کو اسلام خاں کا خطاب دیا۔ چند روز بعد سلطان محمد نے جب اپنا قبضہ مکمل کر لیا، تو غلامان فیروز شاہی کو شہر بدر کر دیا جو پھر ابوبکر سے آکر مل گئے۔ ابوبکر نے اس جمعیت سے فائدہ اٹھا کر پھر محرم ۷۹۳ھ میں اپنا تخت واپس لینے کی کوشش کی لیکن اسلام خاں کی فوج نے اُسے سخت شکست دی۔ ابوبکر اور بہادر ناہر گرفتار ہو کر سلطان محمد کے پاس آئے۔ بہادر ناہر کا قصور معاف کیا گیا اور ابوبکر قلعۂ میرٹھ میں قید کر دیا گیا اور چند دن بعد وہ میں مر گیا۔ ابوبکر کی سلطنت ڈیڑھ سال رہی

[۱] ۷۹۴ھ ۱۳۹۲ء میں ناہر سنگھ، سردار ہرن سنگھ اور بیر بھان نے بغاوت اختیار کی۔ ناہر سنگھ کی سرزنش اسلام خاں کی فوج نے کی۔ سردار ہرن کی سرکوبی کے لئے سلطان محمد خود آیا اور وہ قلعۂ اٹاوہ میں محصور ہو گیا۔ بادشاہ یہاں پہونچا تو باغی سردار بھاگ گیا۔ بادشاہ نے دوسرے دن قلعۂ اٹاوہ کو مسمار کر دیا اور وہاں سے قنوج اور دلمئو کے باغیوں کی سرکوبی کرتا ہوا جلیسر واپس آیا اور یہاں ایک قلعہ محمد آباد کے نام سے تعمیر کرایا۔

رجب ۷۹۴ھ میں خواجہ جہاں نے جو بادشاہ کا خاص آدمی تھا اسے اطلاع دی کہ اسلام خاں باغی ہو کر لاہور و ملتان جانا چاہتا ہے۔ بادشاہ یہ سنکر فوراً جلیسر سے دہلی آیا اور اُسے قتل کرا دیا۔ سنہ ۷۹۵ھ ۱۳۹۳ء میں سلطان کو معلوم ہوا کہ سردار ہرن، اجیت سنگھ راٹھور، بیر بھان (بھوگاؤں کے مقدم) اور ابھے چند (چاندو کے مقدم) نے سرکشی اختیار کی ہے۔ سلطان نے ملک مقرب الملک کو مقابلہ کے لئے روانہ کیا اُس نے مکر سے کام لیکر ان کو مطیع کر لیا اور قنوج لیجا کر قتل کر دیا۔ صرف سردار ہرن بچ کر اٹاوہ چلا گیا۔ اسی سال بادشاہ نے میوات کو تاراج کیا اور جالیسر میں بیمار ہو گیا۔ اسی بیماری کی حالت میں اسے خبر معلوم ہوئی کہ دہلی کے نواح میں بہادر ناہر نے لوٹ مار شروع کر دی ہے۔ باوجود ضعف و نقاہت کے وہ میوات آیا اور بہادر ناہر بھاگ گیا اس کے بعد سلطان محمد، محمد آباد واپس آیا کر اپنی ناتمام عمارت کو پورا کرے۔ ربیع الاول ۷۹۶ھ میں اس نے اپنے بیٹے ہمایوں کو شیخ کھوکھر کے مقابلہ میں جانے کا حکم دیا جس نے لاہور میں بغاوت شروع کر دی تھی۔ لیکن وہ ابھی روانہ نہ ہوا تھا کہ ۱۷ ربیع الاول ۷۹۶ھ ۱۵ جنوری ۱۳۹۴ء کو سلطان محمد کا انتقال ہو گیا

سکندر شاہ اول (۷۹۵ھ / ۱۳۹۲ء)

سلطان محمد کے بعد اس کا بیٹا ہمایوں[1] (سکندر شاہ کا لقب اختیار کرکے) تخت نشین ہوا اور ڈیڑھ مہینہ کے بعد وہ بھی مرگیا۔ اس کے بعد ہمایوں کا بھائی محمود[2] ۱۸ سال تک حکمراں رہا لیکن اس شان سے کہ تخت سلطنت کبھی قنوج میں

محمود شاہ (۷۹۵-۸۱۵ھ / ۱۳۹۲-۱۴۱۲ء)

[1] سلطان ناصر الدین محمد کی وفات پر ہمایوں اس کا بیٹا تین دن ماتم کی رسم ختم کرنے کے بعد سکندر شاہ کا لقب اختیار کرکے تخت نشین ہوا (۱۹ ربیع الاول ۷۹۶ھ) لیکن ۱۵ جمادی الاول کو بیمار پڑا اور ایک ماہ ۱۶ دن حکومت کرکے مرگیا

[2] ۲۰ جمادی الاول ۷۹۶ھ کو محمود شاہ محمد شاہ کا چھوٹا بیٹا اور ہمایوں کا بھائی باتفاق امرا بادشاہ ہوا اور ناصر الدین کا لقب اختیار کیا چونکہ اب سلطنت دہلی کا اقتدار بالکل ختم ہوگیا تھا۔ اسی لئے چاروں طرف بغاوتیں شروع ہوگئیں۔ انھیں باغیوں میں خواجہ جہاں وزیر بھی تھا جس نے جونپور میں شرقی سلطنت کی بنیاد ڈالی۔ ۷۹۷ھ میں سعادت خاں (باربک) نے نصرت شاہ (فتح خاں کے بیٹے اور سلطان فیروز شاہ کے پوتے) کو دعویدار سلطنت بنا کر کھڑا کیا اور فیروز آباد پر قبضہ حاصل کرلیا۔ اس وقت دلی کہنہ میں مقرب خاں کا قبضہ تھا قلعہ سیری میں ملو اقبال خاں کی حکومت تھی اور جہاں پناہ پر محمود شاہ کا تصرف تھا علاوہ اس کے تمام نواح دہلی، پنجاب، دوآبہ، وغیرہ میں بغاوتیں برپا تھیں اور ہر امیر اپنی جگہ خود مختار فرمانروا بنا ہوا تھا۔ آپس میں لڑائیاں جاری تھیں، طوائف الملوکی کی بدامنی ہر جگہ نظر آرہی تھی۔ اور محمود شاہ کی سلطنت عبارت تھی صرف سنبھل، پانی پت، جھجر، رہتک اور دوآبہ (یعنی دہلی کے جنوب و مشرقی حصہ) سے اس حالت پر تین سال گزر چکے تھے کہ اقبال خاں نے نصرت شاہ کا ساتھ چھوڑ کر محمود شاہ پر اپنا اقتدار قایم کرلیا اور گویا اس کے نام سے خود ہی حکمراں بن گیا۔ الغرض یہ بدامنی اسی طرح قایم تھی کہ امیر تیمور گورگانی نے ۸۰۱ھ میں حملہ کرکے دہلی میں خون کا دریا بہا دیا۔ جب امیر تیمور واپس گیا تو سلطنت دہلی کی تقسیم اس طرح ہوگئی تھی:۔

دہلی اور دوآبہ	اقبال خاں	کے قبضہ میں تھا
گجرات	ظفر خاں	"
ملتان، دیپال پور اور ساحت سندھ	خضر خاں	"
مہوبا، کالپی	محمود خاں	"
قنوج، اودھ، کڑا، دلمئو، سندیلہ، بہرائچ، بہار، اور جونپور،	خواجہ جہاں	"
دہار	دلاور خاں	"
سمانہ	غالب خاں	"
بیانہ	شمس خاں	"

(تاریخ مبارک شاہی)

تھا کبھی دہلی میں سلطنت

اور دہلی کا بھی یہ حال تھا کہ ادھر محمود اپنے کو بادشاہ کہتا تھا، اُدھر فیروز آباد میں نصرت شاہ، فتح خاں کا بیٹا حکمرانی کر رہا تھا۔ اس طرح گویا دہلی کے تخت پر دو بادشاہ قابض تھے اور ملک میں حد درجہ بدامنی پھیل رہی تھی۔ الغرض یہ تھا ہندستان کی سلطنت کا حال جب امیر تیمور صاحبقران نے ۹۲ ہزار سواروں کی جمعیت سے دہلی پر حملہ کیا۔ تیمور کے حملہ کا مفصل حال ظفر نامہ[۲]

---

[۱] دہلی پر نصرت شاہ نے عارضی قبضہ کر لیا تھا لیکن اقبال خاں نے پھر اسے محروم کر دیا اور آہستہ آہستہ حدودِ سلطنت کو وسیع کرنے لگا۔ سنہ ۸۰۲ھ میں محمود شاہ (جو دہلی کی تباہی کے وقت گجرات بھاگ گیا تھا) اقبال خاں کے ساتھ مل گیا۔ ان دونوں نے مل کر ابراہیم شاہ شرقی کے خلاف (جو اپنے بھائی مبارک کے بعد جونپور کے تخت کا مالک ہوا تھا) فوج کشی کی۔ لیکن محمود شاہ، اقبال خاں سے علحدہ ہو کر ابراہیم شاہ سے مل گیا اور آخرکار وہ قنوج کا مقامی حکمراں بننے میں کامیاب ہو سکا۔ اسی اثنا میں اقبال خاں اور خضر خاں گورنر ملتان کے درمیان جنگ شروع ہو گئی۔ اس لڑائی میں اقبال خاں مارا گیا (جمادی الاول سنہ ۸۰۸ھ) اور دولت خاں لودی اور دیگر ذی اثر امراء نے پھر محمود شاہ کو دہلی بلایا لیکن وہ نہیں آیا۔ اس نے ان گورنروں کو باہم دست و گریباں ہونے کے لئے آزاد چھوڑ دیا۔ محمود شاہ رجب سنہ ۸۱۵ھ میں انتقال کر گیا۔

محمود شاہ کی تاریخ وفات میں اختلاف ہے۔ فرشتہ محمود کی تاریخ وفات ذی قعدہ سنہ ۸۱۴ھ، اور دولت خاں لودی کی عنانِ سلطنت ہاتھ میں لینے کی تاریخ یکم محرم سنہ ۸۱۶ھ بیان کرتا ہے۔ اسی کے ساتھ یہ بھی ظاہر کیا جاتا ہے کہ چودہ مہینے تک تختِ دہلی پر کوئی حکمراں نہیں رہا اس لئے ان تاریخوں کا غلط ہونا یقینی ہے۔ مبارک شاہی کا مصنف، جو تاریخوں کے بیان کرنے میں زیادہ اہتمام کرتا ہے، محمود کی تاریخ وفات رجب سنہ ۸۱۵ھ ظاہر کرتا ہے اور یہی صحیح ہے۔

اسی مورخ کی روایت ہے کہ محمود شاہ کی سلطنت "با اینہمہ تزلزل و انقلاب بست سال و دو ماہ بود"

ہم بیان کر چکے ہیں کہ ربیع الاول سنہ ۷۹۷ھ سے نصرت شاہ فیروز آباد میں تین سال تک حکمراں رہا اور امیر تیمور کے بعد بھی عارضی قبضہ اس کا تختِ دہلی پر ہو گیا لیکن اس کے بعد جب اقبال خاں نے اس کو معزول کر دیا، تو پھر اس کے بعد (سنہ ۸۰۲ھ سے) اس کا پتہ نہیں چلا اور مورخین نے اس کا کوئی حال نہیں بیان کیا۔

[۲] مصنف ظفر نامہ کا نام مولانا شرف الدین علی یزدی تھا جن کا انتقال سنہ ۸۵۰ھ / ۱۴۴۶ء میں ہوا۔ ظفر نامہ میں بالکل تیمور کے حالات درج ہیں اور میر خوند کے نزدیک اس کا شمار بہترین تاریخوں میں ہے۔ یہ کتاب سنہ ۸۲۸ھ / ۱۴۲۴ء میں لکھی گئی ہے اور حقیقت یہ ہے کہ ملفوظاتِ تیموری سے اس کے ترتیب میں اس قدر کافی مدد لی گئی ہے کہ اگر ہم کہنا چاہیں تو کہہ سکتے ہیں کہ ظفر نامہ صرف ملفوظاتِ تیموری کی دوسری صورت ہے۔ اس کتاب کا ترجمہ یورپ کی اکثر زبانوں میں ہو چکا ہے۔ اس کا قلمی نسخہ میرے ذاتی کتب خانہ میں موجود ہے۔

ملفوظات تیموری[1] اور مطلع السعدین[2] میں درج ہے۔ لیکن ہم یہاں صرف اس کا ایک خاکہ پیش کریں گے، کیونکہ تیمور[3] کا شمار ہندوستان کے بادشاہوں میں نہیں ہے اور اس لئے اس کے حالات سے جداگانہ بحث کرنا ہمارے موضوع سے خارج ہے

---

[1] ملفوظات تیموری کو تزک تیموری بھی کہتے ہیں اور اس کا مصنف خود تیمور ہے یہ کتاب چغتائی ترکی زبان میں تھی جسے ابوطالب حسینی نے فارسی میں ترجمہ کرکے شاہ جہاں کے نام سے منسوب کیا ہے۔ ترجمے کے مختصر مقدمہ میں ابوطالب نے صرف اس قدر بیان کیا ہے کہ اصل کتاب جو ترکی زبان میں تھی جعفر حاکم یمن کے کتاب خانہ سے دستیاب ہوئی تھی۔ اس میں تیمور کے حالات (سات برس کی عمر سے ۷۴ سال کی عمر تک کے) درج ہیں۔ چونکہ ابوطالب نے اس سے زیادہ کوئی تصدیق اس امر کی نہیں کی ہے کہ اس کا اصل مصنف کون تھا اور علاوہ اس کے ایک ترکی زبان کے نسخہ کا یمن کے کتاب خانہ میں پایا جانا بظاہر ایک عجیب بات معلوم ہوتی ہے، اس لئے بعض نے شبہ کیا ہے اور یہ خیال کرتے ہیں کہ ابوطالب نے یہ صرف اس لئے لکھدیا ہے کہ اس کی تصنیف زیادہ باوقعت ہو جائے

میجر ڈیوی جس نے اول بار اس کتاب کی طرف توجہ دلائی۔ اس شبہ کے خلاف ہے کیونکہ کتاب کی ترتیب خود اس بات کی شاہد ہے کہ تیمور اس کا مصنف ہے علاوہ اس کے یہ فطرت کے خلاف ہے کہ ایک شخص اپنی تصنیف کو دوسرے کے نام سے منسوب کرکے اپنی عزت و شہرت کو نقصان پہونچائے۔ اگر خود ابوطالب اس کا مصنف ہوتا تو وہ دوسرے کی طرف کیوں منسوب کرتا

بہرحال یہ شبہ کرنا کہ تیمور اس کا مصنف نہ تھا بالکل لغو بات ہے کیونکہ خاندان تیموریہ کے تمام افراد میں اپنے حالات لکھنے کا فطری ذوق پایا جاتا تھا۔ بابر اور جہانگیر نے بھی خود اپنے حالات لکھے ہیں۔ اور اس خاندان میں اگر کسی نے ایسا نہیں کیا تو دوسروں سے یہ خدمت لی ہے بہرحال تاریخ کی طرف اس خاندان کو خاص توجہ تھی اور غالباً یہ کافی شہادت اس امر کی ہے کہ ملفوظات تیموری یا تزک تیموری خود تیمور ہی کے دماغ کا نتیجہ ہے

ظفرنامہ تیمور کے صرف تیس سال بعد مرتب ہوا ہے اور اس میں صراحت کے ساتھ یہ واقعہ درج ہے کہ تمام امراء و ارکین دربار کو تیمور نے سخت تاکید کی تھی کہ وہ روز کے واقعات کو صحیح درج کرتے رہیں خواہ وہ کسی معاملات سے متعلق ہوں (یہاں تک کہ اس میں خود تیمور کی ذات بھی شامل تھی) چنانچہ تیمور کے سامنے مسودات پیش ہوتے تھے اور جرح اور تعدیل کے بعد وہ فضلاء عصر کو دئے جاتے تھے تاکہ عمدہ زبان (نظم و نثر) میں وہ منتقل کئے جائیں۔ جب ظفرنامہ کی طیاری کا حکم سلطان ابراہیم (تیمور کے پوتے) نے دیا ہے تو اس کے لئے خاص اہتمام کیا گیا۔ ملک میں جہاں کہیں تیمور کے حالات کی کتابیں تھیں فراہم کی گئیں۔ بہت سے معاون، شرف الدین یزدی (مصنف ظفرنامہ) کو دئے گئے۔ سلطان ابراہیم خود مسودات کو دیکھتا اور نقایص دور کرتا۔ اس سے ظاہر ہے کہ ظفرنامہ کا ماخذ تمام تر وہ تصانیف ہیں جو اس سے قبل (یعنی عہد تیموری) میں مرتب ہو چکی تھیں اور جس وقت ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ظفرنامہ میں اکثر جگہ تزک تیموری کی عبارت نقل کر دی گئی ہے تو پھر یہ تسلیم کرنے کے لئے کہ تزک تیموری، تیمور ہی کے عہد میں لکھی گئی کوئی شبہ باقی نہیں رہجاتا۔ تزک تیموری کا دوسرا ترجمہ فارسی زبان میں محمد افضل بخاری نے کیا تھا۔ یہ عہد شاہجہاں کا ایک فاضل شخص تھا اور بادشاہ کے حکم سے اس نے ابوطالب کے ترجمہ تزک تیموری پر نظر ثانی کرکے جہاں جہاں کوئی غلطی یا سقم رہ گیا تھا اُسے دور کیا

(بقیہ فٹ نوٹ نمبر ۲ و ۳ صفحہ ۲۴۰ پر ملاحظہ ہو)

تیمور ہندوستان آنے سے قبل تمام عراق و فارس، افغانستان و ایشیائے کوچک کو زیرنگیں کر چکا تھا اس لئے ضروری تھا کہ وہ کسی نہ کسی وقت اس طرف بھی متوجہ ہو، چنانچہ اس نے اپنے فوجی مشیروں کے سامنے ہندوستان کے

(بقیہ فٹ نوٹ نمبر ۲ و ۳ صفحہ ۲۳۹)

۵۲ اس کتاب کا پورا نام مطلع السعدین و مجمع البحرین ہے اسکا مصنف کمال الدین عبدالرزاق بن جلال الدین اسحاق السمرقندی تھا۔ بروایت حبیب السیر معلوم ہوتا ہے کہ وہ ۱۲ شعبان ۸۱۶ھ (۶ نومبر ۱۴۱۳ء) کو ہرات میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ اسحاق، سلطان شاہ رخ (امیر تیمور کا بیٹا) کے دربار سے متعلق تھا اور عہدۂ قضا و امامت اس کے سپرد تھا۔ عبدالرزاق نے اپنے باپ کی وفات پر عضد الدین یحییٰ کے ایک رسالۂ علم صرف کی شرح لکھ کر حضور میں پیش کی اور یہ اس کے لئے پہلا موقع تھا کہ سلطان شاہ رخ کے دربار میں حاضر ہوا — معلوم ہوتا ہے کہ عبدالرزاق کا تعلق دربار کے ساتھ اسی وقت سے ہو گیا تھا۔ کیونکہ بعد کو جب شاہ رخ نے شاہ بیجا پور کے پاس سفارت بھیجی تو عبدالرزاق ہی کو اس سفر میں بہت تکالیف اٹھانی پڑیں لیکن آخر کار وہ خراسان واپس پہونچا۔ (سفارتِ ہند کا حال حبیب السیر اور روضۃ الصفا میں درج نہیں ہے۔ اس کا ذکر مطلع السعدین کے اس اقتباس میں کیا گیا ہے جسے غالباً مسٹر اولڈ فیلڈ نے شایع کیا تھا۔) سلطان شاہ رخ کی وفات پر وہ عبداللطیف، مرزا عبداللہ اور مرزا عبدالقاسم کی حضوری میں بھی باریاب رہا۔ اور آخر کار یکم جمادی الاول ۸۵۶ھ (اکتوبر ۱۴۶۳ء) کو سلطان ابوسعید کے عہد میں خانقاہ مرزا شاہ رخ کا مہتمم بنا دیا گیا۔ یہ خدمت اس نے دس سال تک انجام دی اور جمادی الثانی ۸۸۷ھ اگست ۱۴۸۲ء میں انتقال کر گیا۔ صاحب حبیب السیر نے سنہ وفات ۸۸۶ھ تحریر کیا ہے اور حاجی خلیفہ نے وہی ۸۸۷ھ۔ اس کی متعدد تصانیف ہیں "مطلع السعدین" بہترین اور بہت مشہور کتاب ہے اس میں سلطان ابوسعید بہادر خاں کے عہد سے مرزا سلطان ابوسعید گرگان کے قتل تک کے مفصل حالات درج ہیں — مسٹر مارے نے (رایل ایشیاٹک سوسائٹی کی فہرست نسخہ جات قلمی میں) یہ بھی تحریر کیا ہے کہ عبدالرزاق، بہ حیثیت سفیر گیلان بھی بھیجا گیا تھا، لیکن وہ ابھی اس خدمت سے فارغ بھی نہ ہوا تھا کہ مصر کی روانگی کا حکم ہوا لیکن اپنے آقا کی وفات کی وجہ سے وہ نہ جا سکا — ۸۵۶ھ ۱۴۵۲ء میں جب سلطان ابوالقاسم بابر یزد سے گزرتے ہوئے مشہور مورخ شرف الدین علی یزدی (مصنف ظفر نامہ) سے ملا ہے تو اس وقت عبدالرزاق بھی موجود تھا۔ اس کے دو سال بعد وہ سلطان ابوسعید کی ملازمت میں آ گیا۔ اور اسکی نہایت عزت کی گئی — جب ۸۶۳ھ میں سلطان حسین بہادر نے جرجان کی طرف پیش قدمی کی۔ تو عبدالرزاق نے بھی (جو پہلے ہی اس طرف بھیج دیا گیا تھا، اس جنگ کے اکثر واقعات کا مشاہدہ کیا — ہندوستان میں مطلع السعدین کا نسخہ بہت کمیاب ہے۔ لیکن یوروپ میں اکثر لوگ اس سے واقف ہیں۔ ایسٹ انڈیا آفس کے کتاب خانہ میں بھی اس کا قلمی نسخہ موجود ہے۔ رایل ایشیاٹک سوسائٹی کے کتاب خانہ میں بھی اس کا ایک نسخہ تھا (جو اب کھو گیا ہے) اس کی نسبت کہا جاتا ہے کہ خود مصنف کا قلمی تھا۔ یوروپ کی مختلف لائبریریوں میں اس کتاب کے قلمی نسخے موجود ہیں — اس کتاب کی دو جلدیں ہیں۔ پہلی جلد میں تیمور کے مفصل حالات درج ہیں اور دوسری جلد میں اولادِ تیمور کی تاریخ (سلطان حسین مرزا کے وقت تک کی درج کی گئی ہے پہلی جلد اسکی بہت کمیاب ہے — ۵۳ تیمور کا سلسلۂ نسب چنگیز خاں کے خاندان سے ملتا ہے۔ تیمور کا مورث اعلیٰ چنگیز کے بیٹے چغتائی کا وزیر بھی تھا تیمور ۷۳۶ھ ۱۳۳۵ء میں پیدا ہوا تو غالباً تیمور، خانِ فارس کے عہد میں کش کا گورنر مقرر ہوا —

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۲۴۱ پر ملاحظہ ہو)

مسئلہ کو بھی پیش کیا ان سب سے بعض نے کہا کہ پانچ دریاؤں کا عبور کرنا، گھنے جنگلوں سے گزرنا، بڑے بڑے راجاؤں کی خونخوار افواج (جو جنگلوں میں وحشی درندوں کی طرح چھپی ہوئی ہے) سے عہدہ برآ ہونا، آہن پوش ہاتھیوں کو شکست دینا، ایسا آسان کام نہیں ہے[1]۔ بعض نے محمود غزنوی کی مثال پیش کی کہ اس نے صرف تیس ہزار سواروں کی مدد سے ہندوستان کو فتح کر لیا تھا اور ہمارے پاس تو ایک لاکھ جرار فوج موجود ہے۔ اس کے ساتھ شاہزادہ شاہ رخ (تیمور کے بیٹے) نے بھی ہندوستان کی دولت اور یہاں کے کفر و بت پرستی کا ذکر کر کے جہاد پر آمادہ کیا۔ مخالفین نے پھر ایک دلیل پیش کی کہ "اگر وہاں کامیابی ہو بھی گئی تو ہمارے نسل کے لوگ جو وہاں حکمراں ہوں گے ان میں بعد کو یقیناً اختلاط پیدا ہو جائے گا اور وہاں کی آب و ہوا ان کو آرام طلب، عیش پسند اور غیر جنگجو بنا دے گی[2]۔ اس پر تیمور نے کہا کہ میرا مقصد قیام کرنا نہیں ہے[3]

ملتان کا محاصرہ

اس سے قبل پیر محمد جہانگیر (تیمور کا پوتا جو کابل کا گورنر تھا) تمام حدود افغانستان کو زیر کر کے ہندوستان کے اندر پہونچ چکا تھا اور دریائے سندھ کو عبور کر کے ملتان کا محاصرہ کئے ہوئے تھا[4]

تیمور کی روانگی ہندوستان

اتفاق سے اسوقت جبکہ تیمور حملۂ ہندوستان کی طیاریاں کر رہا تھا۔ پیر محمد کی تحریر پہونچی جس میں سلطنت دہلی کی بدنظمی طوائف الملوکی وغیرہ کا مفصل حال درج تھا

اس تحریر کو دیکھتے ہی تیمور نے رجب ۸۰۰ھ (مارچ ۱۳۹۹ء) میں اپنے دار السلطنت سمرقند سے ہندوستان کی طرف کوچ کر دیا[5]

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۲۴۰)

پھر چغتائی خاں سیورغتمش کا وزیر ہو گیا اور ۷۷۱ھ/۱۳۶۹ء سے قبل سارے اختیارات خود حاصل کر لئے (اگرچہ چغتائی خاں اور اسکے جانشین محمود کا ۷۹۰ھ/۱۳۸۸ء تک برائے نام کچھ اثر باقی رہا)۔ ۷۸۲ھ/۱۳۸۰ء میں تیمور نے اپنے فتوحات کا سلسلہ شروع کیا اور سات برس کے اندر ہی اندر خراسان، جرجان، مازندران، سجستان، افغانستان، فارس، آذربیجان اور کردستان پر قبضہ کر لیا۔ اس دوران میں توقتامش نے اس کے سلطنت میں بڑھنا شروع کیا۔ لیکن تیمور نے ایک بار ۷۹۳ھ/۱۳۹۱ء میں اور پھر ۷۹۷ھ/۱۳۹۵ء میں اسے شکست دی۔ اسی اثنا میں وہ بغداد اور عراق پر بھی قابض ہو چکا تھا۔ اس کے چار سال بعد وہ شمالی ہند کی طرف متوجہ ہوا اور ۸۰۱ھ میں کشمیر و دہلی کو غارت کر کے مغرب کی طرف بڑھ گیا ۸۰۳ھ/۱۴۰۰ء میں اس نے اناطولیا پر حملہ کر کے سیواس اور ملیشیا لے لیا۔ ۸۰۳ھ میں شام، حلب اور دمشق پر اسکا قبضہ ہو جانے سے مملوک سلطان مصر نے اس کی اطاعت اختیار کر لی ۸۰۴ھ/۱۴۰۲ء میں بمقام انگورا عثمانی ترکوں کو شکست دیکر سلطان بایزید کو مقید کر لیا۔ اس کے بعد وہ چین کی طرف متوجہ ہوا۔ لیکن ۸۰۷ھ/۱۴۰۵ء میں بمقام اُترار جب کہ اس کی عمر ستر سال کی تھی انتقال کر گیا

[1] تزک تیموری (الیٹ) ۳ = ۳۹۵ — [2] چنانچہ دو صدی بعد زمانہ نے ثابت کر دیا کہ یہ پیشین گوئی کیسی صحیح تھی — [3] تزک تیموری (الیٹ) ۳۹۷
[4] اس وقت ملتان میں سارنگ، اقبال لو خاں کا بھائی حکمراں تھا — [5] ظفر نامہ۔ (الیٹ) ۳ - ۴۸۰

اور ۸ محرم کو سرحد کی سنگلاخ زمینوں، کوہستانوں کی چوٹیوں اور وادیوں کو طے کرتا ہوا اُس دریائے سندھ پر پہنچا
جلال الدین خوارزم نے چنگیز خاں تیمور کے مورث اعلیٰ کے تعاقب سے خوفزدہ ہو کر عبور کیا تھا
کا ایک پل دو دن کے اندر طیار کرایا اور ۱۲ محرم کو دریا سے عبور کر کے اپنے پوتے پیر محمد سے
قبضہ کر لیا تھا

پنجاب کی حالت اس وقت یہ تھی کہ تیموری حملہ کی داستانیں عام ہو گئیں تھیں اور دیپالپور ... لوگ
بھٹنیر کے قلعہ میں پناہ لے رہے تھے تیمور بھٹنیر پہنچا اور وہاں قتل عام کر کے آگے بڑھا۔ اب تمام آبادی ویران تھی
کہ لوگ بھی شہر چھوڑ کر جنگلوں میں چلے گئے تھے اور تیمور جس طرف سے گزرتا تھا غارت و کامیابی اس کا ساتھ دے رہی
تھی۔ آخرکار ۲ ربیع الاول کو پانی پت کے مشہور میدان میں پہونچ گیا۔ یہاں کوئی اس کا مقابل نہ تھا۔ اس لئے وہ آگے بڑھا
اور ۷ ربیع الثانی کو دہلی پہونچ گیا جہاں محمود شاہ کی فوج اس کے مقابلہ کے لئے آمادہ تھی

امیر تیمور نے اپنی فوج اس طرح مرتب کی کہ پیر محمد اور امیر یادگار وغیرہ کو میمنہ سپرد کیا۔ سلطان حسین اور خلیل سلطان
وغیرہ کو میسرہ میں رکھا اور خود قلب میں رہا

محمود شاہ کی فوج میں بارہ ہزار سوار اور چالیس ہزار پیادہ تھے علاوہ اس کے ۱۲۰ ہاتھی بھی تھے جو بالکل آہن پوش
تھے اور اُن کے دانتوں میں زہریلی کٹاریں لگی ہوئی تھیں اور ان کے اوپر ہودوں میں تیر انداز اور آتش باز بیٹھے تھے۔

تیمور جب فوج کی ترتیب سے فارغ ہو گیا تو اُس نے ایک بلندی پر چڑھ کر فوج کے مواقع دیکھ کر اپنی فتح کے لئے دعا
مانگی اور پھر حملہ کا حکم دیا۔ تیمور کی میمنہ نے ہندی فوج کی میسرہ پر تیروں کی بارش شروع کی اور اُسے پیچھے ہٹا دیا۔ اسی طرح
ترکوں کے میسرہ نے دہلی فوج کے میمنہ کو پسپا کر دیا۔ قلب میں چونکہ اقبال خاں اور خود محمود شاہ موجود تھے اسی لئے اس
حصہ نے تھوڑی دیر سخت مقابلہ کیا مگر اُسے بھی شکست ہوئی اور یہ دونوں بھاگ کر شہر میں داخل ہوئے اور وہاں سے بھی
رات کو چھپ کر پہاڑوں میں چھپ گئے

۸ ربیع الثانی کو فتح کے بعد تیمور نے حوض خاص پر اپنا خیمہ نصب کیا۔ تمام امراء و اراکین حاضر ہو کر قدمبوس ہوئے
اور علماء و فضلاء بھی آئے جن کی خواہش کے مطابق اس نے قتل عام کا حکم نہیں دیا اور زر فدیہ لے کر سب کو امان دینے
کا وعدہ کر لیا۔ دہلی کی جامع مسجد میں امیر تیمور کے نام کا خطبہ پڑھا گیا اور جشن فتح مندی شروع ہو گیا

ایک ہفتہ بعد ۱۶ ربیع الثانی کو زر فدیہ کی وصولی میں تیمور کے سپاہیوں کی طرف سے کچھ سختی ہوئی تو اس پر لوگوں
میں کچھ ہنگامہ ہوا۔ حتےٰ کہ تیموری فوج جو پہلے ہی سے غارت گری کے لئے کوئی بہانہ تلاش کر رہی تھی برہم ہو کر لوٹ مار
پر آمادہ ہو گئی۔ تیمور نے بہت کوشش کی کہ خونریزی نہ ہو لیکن وہ اپنی فوج کے بڑھے ہوئے جوش کو نہ روک سکا،
اور پھر مسلسل ۱۹ ربیع الثانی تک سوائے اُن مقامات کے جہاں علماء و فقہاء وغیرہ رہتے تھے۔

رجسٹرڈ نمبر ایل ۱۰۴۳

نگار

قیمت
۸ر

مصحفی نمبر طیار ہے، مفصل اشتہار صفحہ ۶۲ پر ملاحظہ ہو

ہندوستان کا سالانہ چندہ پانچ روپیہ ششماہی تین روپیہ

نگار

ششماہی چندہ دینے والوں کو نگار کا جنوری نمبر
بدوں اضافۂ ضخامت و قیمت رسالہ شامل نہ ہوگا

جلد ۳۴	فہرست مضامین نومبر ۱۹۳۸ء	شمار ۵

اڈیٹر:- نیاز فتحپوری

جلد-۳۴	نومبر ۳۸ء	شمار- ۵

ملاحظات

پھر وہی تفریقِ بوبکر و علی

کچھ دنوں سے لکھنؤ میں سکون تھا اور بظاہر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ شاید اب سُنّی شیعہ اپنے اختلافات کو چھوڑ کر متفقہ طور پر ملک کے سیاسی حالات کا مطالعہ کریں گے اور سوچیں گے کہ انھیں کانگرس کے موجودہ دورِ حکومت میں کیا طریقِ کار اختیار کرنا ہے، لیکن افسوس ہے کہ یہ خیال غلط نکلا اور فضا پہلے سے زیادہ تاریک ہوگئی

اس کی ابتدا مولانا حسین احمد صاحب کے اس اعلان سے ہوتی ہے جس کے ذریعہ سے انھوں نے مدح صحابہ کی اجازت دیدی ہے اور اس باب میں ہر ممکن مشورہ و امداد کا وعدہ کیا ہے - مولانائے موصوف کا بیان ہے کہ اسوقت تک انھوں نے اس تحریک کے التوا کی سفارش صرف اس امید پر کی تھی کہ وہ اس دوران میں حکومت سے گفتگو کرکے شاید کوئی صورت ایسی پیدا کرسکیں گے جو سنیوں کے لئے قابلِ اطمینان ہو، لیکن چونکہ وہ اس میں کامیاب نہیں ہوئے اسلئے انھیں کے کسی سابق فتوے کے مطابق (کہ مدح صحابہ نے اب ایک مذہبی فریضہ کی حیثیت اختیار کرلی ہے) سنیوں کے لئے

سوائے اس کے کوئی چارہ کار نہیں کہ وہ علی الاعلان سڑکوں پر مدح صحابہ پڑھتے ہوئے گزریں اور قانون کا مقابلہ کریں چنانچہ اس کی طیاریاں ہو رہی ہیں اور یہ جہاد عظیم ۱۱ رمضان کو شروع کیا جائے گا

مولانا حسین احمد صاحب کے اس اعلان کا عام سنی جماعت نے خیر مقدم کیا ہو یا نہ کیا ہو لیکن ہمارے شہر کے سب سے بڑے ہنگامہ پسند لیڈر ظفر الملک صاحب نے انتہائی جوش و خروش کے ساتھ اس کی پذیرائی کی اور مولانا عبدالشکور صاحب کو اس تحریک کا قاید اعظم مقرر کرکے اعلان کر دیا کہ رمضان المبارک سے بہتر مہینہ اس شہادت عظمی کے حاصل کرنے کا اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ سنا جاتا ہے کہ مختلف مقامات سے والنیٹر طلب ہو رہے ہیں، اشتعال انگیز تقریروں سے پبلک کو آمادہ پیکار کیا جا رہا ہے اور ایک بھائی کو دوسرے بھائی کے ذبح پر آمادہ کرنے کے لئے تلقین مذہب جاری ہے

اس سے قبل ہم تفصیل کے ساتھ اس مسئلہ پر اظہار خیال کر چکے ہیں اور ہمارے نزدیک حکومت نے جو فیصلہ کیا ہے اس سے بہتر فیصلہ ممکن نہ تھا، لیکن وہ لوگ، جو بغیر فتنہ و فساد کے اثبات وجود نہیں کر سکتے اور جن کی شہرت کا انحصار ہمیشہ ہنگامہ آرائیوں پر رہا ہے، کیونکر ایسی بات پر راضی ہو سکتے تھے، جو لوگوں کو چین سے بیٹھنے دے اور وہ کیوں قومی مفاد پر اپنے اغراض کی قربانی کرتے۔ وہ صرف موقعہ کے منتظر تھے، بہانہ کی تلاش میں تھے، محض ایک چنگاری چاہتے تھے سو وہ ان کو مل گئی اور مولانا حسین احمد ایسے محترم بزرگ کے ہاتھوں سے ملی

مقامی اخبارات سے معلوم ہوتا ہے کہ شیعہ حضرات بھی کافی مشتعل ہو چکے ہیں اور مدح صحابہ کے جواب میں وہ بھی علانیہ تبرا کہنے پر آمادہ ہیں۔ لیکن جس طرح میری رائے میں سنیوں کا فیصلہ غلط ہے، اسی طرح شیعوں کا یہ ارادہ بھی درست نہیں۔ اگر دو مخالف جماعتوں میں سے کوئی ایک بھی سنجیدگی و رواداری سے کام لے تو فساد بڑی حد تک رک جاتا ہے۔ علاوہ اس کے شیعہ حضرات کو یہ بھی سوچنا چاہئے کہ اگر سنیوں کی طرف سے مدح صحابہ کی تحریک جاری کی گئی تو حکومت خود اس کے روکنے کی ذمہ دار ہے اور شیعوں کو اپنی طرف سے کسی انتقامی کارروائی کی ضرورت نہیں

میں پہلے بھی لکھ چکا ہوں کہ اگر سنی واقعی حکومت کے فیصلہ کو خلاف انصاف سمجھتے ہیں اور مدح صحابہ کو وہ فریضۂ مذہبی کی حیثیت دیتے ہیں تو ان کو یہ عزم کر لینا چاہئے کہ چاہے کچھ ہو وہ اس فیصلہ کو مسترد کرا کے رہیں گے، لیکن اس کی تدبیر یہ نہیں ہے کہ چند آوارہ گرد لڑکوں کو پکڑ کر ان کے ہاتھ میں مدح صحابہ کا جھنڈا دیدیا جائے بلکہ اس کی صورت صرف یہ ہے کہ پہلے تمام سربرآوردہ سنی قانون شکنی کریں اگر ان کی گرفتاری سے یہ تحریک ختم ہو گئی تو اس کے معنے یہ ہوں گے کہ یہ سب وقتی جوش تھا اور ایسے غیر حقیقی جذبہ کو ختم ہی ہو جانا چاہئے تھا، لیکن اگر سنیوں میں اس سے اور برہمی پیدا ہو گئی تو پھر ممکن ہے کہ حکومت متاثر ہو اور لکھنؤ کی سرزمین میں شیعوں کے علم کے ساتھ ساتھ مدح صحابہ کے جھنڈے کے لئے بھی کوئی جگہ نکل سکے

سچ ہے جب کوئی قوم تباہ ہونے لگتی ہے تو پہلے اس کی عقل پر ... ہے ہیں اور وہ نقد و نسیہ کی تمیز کھو بیٹھتی ہے۔ یہ وقت تھا کہ مسلمانوں کی تمام جماعتیں اپنے فروعی اختلافات کو ... کر کے متفقہ طور پر سوچتیں کہ کانگرس کے موجودہ دورِ اقتدار میں ان کا طرزِ عمل کیا ہونا چاہئے، ان کو اپنے بقا و تحفظ اور ملک کی آزادی کے لئے کیا تدابیر اختیار کرنا چاہئے، لیکن اس کا کیا علاج کہ مسلمان تو صرف نجاتِ اخروی کا طالب ہے اور وہ ایک دوسرے کا خون بہائے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی

گر مسلمانی ہمین ست کہ غالب دارد
وائے گر در پس امروز بود فردائے

کانگرس کے خلاف عام بدظنی

ہمیں حصار سے کامریڈ بدر الدین کا ایک مراسلہ موصول ہوا ہے جس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اسوقت کانگرس کے خلاف نہ صرف مسلمانوں میں بلکہ ہندوؤں کی دوسری جماعتوں میں بھی کافی بدظنی پیدا ہو گئی ہے

بدر الدین صاحب نے کامریڈ نرسنگھ داس بابا جی کے ایک پمفلٹ کا بھی حوالہ دیا ہے جو آل انڈیا کانگرس کمیٹی کے اجلاس کے وقت تقسیم کیا گیا تھا اس مراسلہ میں درج ہے کہ:۔

"کامریڈ نرسنگھ داس نے ۱۰ سال تک گاندھی سیوا سنگ میں کام کرنے کے بعد جب یہ محسوس کیا کہ یہ سب دھوکا ہی دھوکا ہے تو انھوں نے ۱۹۳۶ء میں اس سے کنارہ کشی اختیار کر لی اور اس کی برائیوں کو منظرِ عام پر لانے کے لئے یہ پمفلٹ شایع کیا

بابا جی کا بیان ہے کہ کانگرس کا مقصد تو آزادی کامل حاصل کرنا ہے لیکن موجودہ ورکنگ کمیٹی اور "ہائی کمانڈ لیڈرشپ" پس پردہ برطانیہ سے ساز باز میں مصروف ہے۔ چنانچہ بھولا بھائی ڈیسائی جو صد درجہ سرمایہ پرست ہیں کھلم کھلا برطانوی شہنشاہیت کے طرفدار ہیں، اس میں مطلق شک کی گنجائش نہیں کہ اس وقت گجرات اور مارواڑ کے چند متمول سرمایہ دار کانگرس پر قابض ہیں اور ورکنگ کمیٹی ہر وقت ان کا منھ دیکھتی رہتی ہے۔ ورکنگ کمیٹی کا اجلاس ہوتا ہے تو گھنشیام داس برلا کے مکان پر۔ ہوائی جہازوں اور موٹروں کا کرایہ ادا کرتا ہے تو وہی برلا۔ لیڈروں کی شاندار دعوتیں کی جاتی ہیں، محفلوں کے فوٹو اخباروں میں شایع کئے جاتے ہیں۔ گاندھی جی کو موٹروں میں لئے پھرتے ہیں اور اس سے مقصود صرف سرمایہ داری کی حفاظت ہے۔ یہ وہی برلا ہیں، جو سری پرکاش، کانگرس کینڈیڈیٹ کے مقابلہ میں حلقۂ گورکھپور سے کھڑے ہوئے اور انھیں اپنے سرمایہ کے زور سے کامیاب نہ ہونے دیا، اور یہی وہ برلا ہیں جنھوں نے ڈال چند ہیرا چند ایک غیر کانگرسی نمائندہ کی مدد کر کے کانگرسی نمائندہ

کو شکست دی۔ اسی قسم کے ایک اور سرمایہ دار جمنالال بجاج ہیں جو کانگرس کے خزانچی ہیں اور اپنی دولت کے اثر سے کانگرس کو قابو میں۔ لئے ہوئے ہیں

اسوقت کانگرس ورکنگ کمیٹی بالکل مستبدانہ حکومت کر رہی ہے اور جمہوریت کا کوئی جذبہ اس کے اندر موجود نہیں ہے۔ اصولاً ہونا یہ چاہئے کہ پریسیڈنٹ کیبنٹ کا انتخاب کرے۔ لیکن ہو یہ رہا ہے کہ کیبنٹ پریسیڈنٹ کا انتخاب کرتی ہے اور جو سرمایہ داروں کی حفاظت نہ کرے اسے پریسیڈنٹ نہیں بننے دیا جاتا اور برابر سترہ سال سے یہ کمیٹی ملک کو سبز باغ دکھا رہی ہے اور ملکی ضروریات پورا کرنے میں ناکام ثابت ہوئی"

یہ ہے خلاصہ بدرالدین صاحب کی تحریر کا، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کانگرس اپنا اعتماد ہندوؤں میں بھی آہستہ آہستہ کھوتی جا رہی ہے۔ مسلمانوں میں جو بدظنی کانگرس کی طرف سے پیدا ہوتی جا رہی ہے اس کا سب سے بڑا ثبوت وہ مظاہرہ ہے جو کلکتہ کے مسلمانوں نے مولانا ابوالکلام آزاد کے خلاف حال ہی میں کیا تھا۔ انھوں نے صاف صاف کہدیا کہ چونکہ مولانا کانگرس کی مُسلم کش پالیسی کے طرفدار ہیں اس لئے نہ وہ امامت کے اہل ہیں نہ خطبۂ عیدین پڑھنے کے۔

میں نے جہاں تک غور کیا ہے، مسلمانوں کی اس برہمی کا تعلق صرف اُردو ہندی نزاع سے ہے جو کانگرسی وزراء کی سنسکرت آمیز زبان کی اشاعت سے شروع ہوئی اور جس پر گاندھی جی کی تحریر (موسومہ آنریبل سمپورنانند جی وزیر تعلیم یوپی) نے مہرِ توثیق ثبت کر دی۔ گاندھی جی نے نہایت صاف الفاظ میں سنسکرت الفاظ کے ٹھونسنے کی نہ صرف اجازت دیدی ہے بلکہ وہ اسے ضروری و مستحسن قرار دیتے ہیں۔ دہلی میں ڈاکٹر اشرف کے رزولیوشن کا جو حشر ہوا اس سے بھی پبلک واقف ہے اور مولانا ابوالکلام آزاد نے جس انداز سے اس رزولیوشن کی مخالفت کی وہ بھی سب کو معلوم ہے بہرحال اب کانگرس نے زبان کے مسئلہ میں کھلا ہوا چیلنج دیدیا ہے اور ورکنگ کمیٹی کا یہ فیصلہ کہ ایک عام مشترک زبان کا نام ہندوستانی قرار دینا چاہئے بالکل بے معنی ہو کر رہ گیا ہے۔ گاندھی جی کے اس بیان نے کہ ہندوستانی زبان میں سنسکرت الفاظ کی کثرت بہت ضروری و مستحسن ہے اب گنجایش کسی کی تاویل کی نہیں رکھی اگر مولانا ابوالکلام کے خلاف کلکتہ کے مسلمانوں نے احتجاج کیا تو اس کا سبب بھی یہی تھا کہ انھوں نے مسلمانوں کی صحیح نمایندگی اس مسئلہ میں نہیں کی اور اگر مسلمان کانگرس سے کٹ کر مسلم لیگ میں شامل ہو رہے ہیں تو اس کی وجہ بھی کانگرس کی یہی ناعاقبت اندیشانہ پالیسی ہے

صوبۂ بہار، صوبۂ متوسط اور خود ہمارے صوبۂ یوپی میں جن جن صورتوں سے اُردو زبان کے مٹانے کی کوشش جاری ہے، ان کا علم سب کو ہو گیا ہے اور اسی کے ساتھ ساتھ گاندھی جی کی ذہنیت بھی بے نقاب ہوتی جا رہی ہے ودیا مندر اسکیم کے سلسلہ میں مسلمانوں کی شکایت کا جواب جن الفاظ میں انھوں نے دیا ہے، اس سے صاف ظاہر ہے کہ وہ خود ان الجھنوں کو مٹانا نہیں چاہتے اور ہندوؤں کی سنسکرت آمیز زبان کا رواج وہ خود چاہتے ہیں۔ انکے

نزدیک "الفاظ" و "دیا مندر" میں کوئی بات ایسی نہیں جو مسلمانوں کو ناگوار ہو، کیونکہ ان کے نزدیک مندر کے معنی صرف "مکان" کے ہیں، لیکن مسٹر شکلا کی طرح وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ مندر کا لفظ کیوں رکھا گیا ہے اور اس کی تہ میں جو ذہنیت کام کر رہی ہے اس سے خود گاندھی جی بھی مغلوب ہیں

یو۔ پی میں گرام سدھار کے سلسلہ میں کارکنوں کی ٹریننگ جس زبان میں دیجا رہی ہے وہ مسلمان کیا ہندوؤں کے لئے بھی ناقابل فہم ہے، لیکن یو پی گورنمنٹ باوجود اس علم کے بھی اس سنسکرت نوازی میں مصروف ہے اور کسی شکایت کا اثر اس پر نہیں ہوتا۔

بہر حال میرے نزدیک اب یہ معاملہ شکوہ و شکایت کی حدود سے گزر گیا ہے اور مسلمانوں کی یہ "ہائے ہائے" مجھے پسند نہیں آتی، اگر وہ سمجھتے ہیں کہ ہندوؤں کا موجودہ طرز عمل ان کے لئے نقصان رساں ہے، تو انکو دفع مضرت کے لئے کوئی عملی قدم اٹھانا چاہئے، کوئی موثر تدبیر اختیار کرنا چاہئے اور اگر وہ ایسا نہیں کر سکتے ہیں تو انھیں خاموشی کے ساتھ یہ سب کچھ برداشت کرنا چاہئے۔ یہ روز روز کی شکایت کانگرس یا گاندھی جی سے حد درجہ ذلیل و پست بات ہے اور قطعاً شیوۂ مردانگی کے خلاف

حیدرآباد اور کانگرس تحریک

آخر کار حیدرآباد میں وہی ہو کر رہا جس کی کوشش عرصہ سے جاری تھی اور جس کی تحریک ہندوؤں میں ہنگامۂ کشمیر ہی کے وقت سے پیدا ہو گئی تھی ہندوستان میں صرف حیدرآباد ہی ایک ایسی ریاست ہے جو اپنے نظم و نسق اور بے لاگ انصاف کی وجہ سے اپنی حیثیت تمام ریاستوں سے جدا رکھتی ہے اور وہاں کوئی غیر مسلم جماعت ایسی نہیں ہے جو پوری آزادی کے ساتھ اپنے مراسم و شعائر ادا کر سکتی ہو۔ لیکن جس وقت سے کشمیری مسلمانوں نے اپنی حکومت کے خلاف جد و جہد شروع کی ہے، اسی وقت سے ہندوؤں میں جذبۂ انتقام پیدا ہو گیا ہے اور وہ کشمیر کا بدلہ حیدرآباد سے لینا چاہتے ہیں۔ اس باب میں ہندو اخبارات نے بھی اس فرقہ وارانہ تحریک کو ابھارنے میں کم حصہ نہیں لیا اور کشمیری مسلمانوں کی خالص سیاسی تحریک کو مذہبی رنگ دیکر ہندو مسلم سوال پیدا کر دیا

جس حد تک امن و سکون اور انفرادی یا اجتماعی آزادی کا سوال ہے، کشمیر اور حیدرآباد میں زمین و آسمان کا تفاوت ہے۔ وہاں مسلمانوں کے ساتھ جو ظلم روا رکھا جاتا ہے اور جس بیدردی کے ساتھ ان کی اقتصادی و اخلاقی حیثیت کو پامال کیا جا رہا ہے، اس کی نظیر دنیا کی کسی حکومت میں نہیں مل سکتی اور ہر وہ شخص جسے ایک بار بھی وہاں جانے کا اتفاق ہوا ہے وہ اس حقیقت سے واقف ہے، برخلاف اس کے حیدرآباد میں جا کر دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ وہاں ہندوؤں کو تمام وہی آسانیاں اور آزادیاں حاصل ہیں جو برطانوی ہند میں پائی جاتی ہیں بلکہ اقتصادی حیثیت سے وہ مسلمانوں سے بدرجہا بہتر حالت میں ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ملازمت میں ان کا تناسب ان کی آبادی کے لحاظ

سے کم ہو۔ لیکن اول تو وہ اتنے خوشحال ہیں کہ انھیں نوکری کی ضرورت ہی نہیں اور اگر ہو تو بھی تمام امتحانات مقابلہ میں ان کو آزادی کے ساتھ شریک کیا جاتا ہے اور اسوقت کوئی محکمہ وہاں ایسا نہیں ہے جس میں وہ بڑے بڑے عہدوں پر ممتاز نہ ہوں

بہرحال ہندوؤں کا یہ پروپاگنڈا کہ انھیں وہاں مذہبی آزادی حاصل نہیں ہے یا یہ کہ اقتصادی و تمدنی حیثیت سے ان کے ساتھ وہاں انصاف نہیں ہوتا، بالکل لغو و بے معنی سی بات ہے۔ البتہ حیدرآباد کا ایک مسلمان ریاست ہونا اور وہ بھی سب سے بڑی ریاست ہونا، بجائے خود ایک ایسا واقعہ ہے جو ہندوؤں کو کبھی خوش نہیں آسکتا اور وہ کوشش کر رہے ہیں کہ اگر وہاں ہندو راج قائم نہیں ہوسکتا تو کم از کم اس کو بیدست و پا کر دیا جائے

کانگرس کا دعوی ہے کہ وہ ریاستوں کے اندر ایسی سیاسی تحریکوں سے اپنے آپ کو متعلق کرنا پسند نہیں کرتی، لیکن اسی کے ساتھ چونکہ اس کا نام اس نے جنگ آزادی رکھا ہے اس لئے انسانیت و حریت کے نام سے وہ ہمیشہ اس میں حصہ لیتی ہے جیسا کہ میسور اور ٹراونکور میں دیکھا گیا ہے۔ اس لئے گو حیدرآباد کی کانگرسی جماعت بظاہر آل انڈیا کانگرس کی کوئی مسلمہ شاخ نہ ہو، لیکن بہرحال اس کے "بچہ شتر" ہونے سے انکار نہیں کیا جا سکتا اور قانون شکنی کے لئے جس ستیاگرہ کا وہاں آغاز ہوا ہے، اسے ایک نہ ایک دن مستقل فتنہ کی شکل اختیار کر لینا ہے

کچھ دن قبل جو ہندو مسلم فساد حیدرآباد میں ہوا تھا اس کے متعلق کسی اظہار یا رائے زنی کرنا مناسب نہیں کیونکہ معاملہ عدالت میں زیر سماعت ہے، لیکن اس کا اقرار کرنا پڑے گا کہ حصول انصاف کے لئے ریاست حیدرآباد نے جو مراعات ہندوؤں کے ساتھ کی ہیں اس کی نظیر کسی حکومت کی تاریخ میں نہیں مل سکتی۔ البتہ اسی سلسلہ میں وہاں آیندہ فتنہ کا سدباب کرنے کے لئے ایک قانون ضرور وضع کیا گیا ہے جس کا مدعا یہ ہے کہ فتنہ و فساد پھیلانے والے وہاں نہ آسکیں اور اندرون ملک میں کسی ایسی جماعت کی تشکیل نہ ہوسکے جس سے نقص امن کا اندیشہ ہو۔ یہ کوئی نیا قانون نہیں، کوئی مستبدانہ بدعت نہیں ہے، دنیا کی تمام حکومتوں کا فرض ہے کہ وہ امن و سکون کو قائم رکھیں اور ان عناصر کی بیخ کنی کریں جو فساد و اشتعال کا باعث ہوا کرتے ہیں۔ حیدرآباد کے کانگرسی خیال کے لوگوں نے اسی قانون کے خلاف احتجاج کیا ہے اور اسی کے توڑنے کے لئے وہاں جتھوں کی روانگی شروع ہو گئی ہے

ایسی صورتوں میں حکومت کا اولین فرض یہی ہوا کرتا ہے کہ وہ سختی کے ساتھ قانون کی پابندی کرے اور ہمیں یقین ہے کہ آنریبل سر اکبر حیدری کی صدارت عظمیٰ میں وہی ہوگا جو ہر لحاظ سے قیام آئین و بقائے سکون کے لئے ضروری ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ ہم آل انڈیا کانگرس ورکنگ کمیٹی کو بھی متوجہ کرنا ضروری سمجھتے ہیں اور اس سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ کیا ریاستوں میں اس قسم کی تحریکوں کا آغاز اس جدید کانسٹی ٹیوشن کو دیکھتے ہوئے جس کو اہل کانگرس نے قبول کر لیا ہے، مفید ہو سکتا ہے

وفاق کا نفاذ ہونے والا ہے جس میں بڑا اہم عنصر ریاستوں کا ہے اور یقیناً برطانوی ہند اس سے کوئی فایدہ نہیں اٹھا سکتا اگر ریاستوں کی ہمدردی اسے حاصل نہ ہو۔ اور یہ صرف اسی طرح حاصل ہو سکتی ہے کہ ان کی آزادی پر حملہ نہ کیا جائے اور غالباً یہی وہ مصلحت تھی جس کی بنا پر اس وقت تک کانگرس نے ریاستی رقبوں کو اپنے دائرۂ عمل سے باہر رکھا تھا

یہ سلسلۂ قیام وفاق جو کشمکش ریاستوں اور برطانوی حکومت کے درمیان جاری ہے اس سے کانگرس ناواقف نہیں اور ریاستیں بھی جانتی ہیں کہ کانگرس نے ریاستوں کی شرکت کے لئے ان پر کیا پابندیاں عاید کرنا چاہی ہیں۔ اس لئے بحالت موجودہ برطانوی حکومت، کانگرس اور ریاستیں سب ایک دوسرے سے اُصولی اختلاف رکھتی ہیں اور جس وقت وفاق کا نفاذ ہوگا تو لازماً ان تین قوتوں میں سے دو کا کسی ایک بات پر متحد ہونا ضروری ہے پھر یا تو یہ اتحاد کانگرس اور حکومت برطانیہ کا ہوگا یا حکومت اور ریاستوں کا یا کانگرس اور ریاستوں کا۔ صورت اول میں چونکہ ریاستوں کی آزادی کا سلب ہو جانا یقینی ہے جسے حکومت برطانیہ خود بھی اپنے مصالح کے لحاظ سے مناسب نہیں سمجھتی اس لئے یہ ناممکن العمل ہے۔ دوسری صورت وہ ہے جس سے برطانوی حکومت کے اغراض زیادہ پورے ہو سکتے ہیں اور اسی پر زور دیا جا رہا ہے لیکن ملک کی آزادی کے لئے مفید نہیں، اب گئی تیسری صورت یعنی کانگرس اور ریاستوں کا اتحاد جس سے واقعی ملک کو فایدہ پہونچ سکتا ہے، سو اس کا حصول اسی طرح ممکن ہے کہ کانگرس ان کی ہمدردی حاصل کرے اور وہاں کسی ایسی تحریک کا آغاز نہ ہونے دے جو ان کی آزادی یا ملوکیت کے منافی ہو۔ یہ طے شدہ امر ہے کہ ہندوستان کو کسی نہ کسی دن پوری طرح آزاد ہونا ہے، لیکن ایسی صورت میں جبکہ کانگرس خود بھی مکمل آزادی کی متمنی نہیں اور برطانوی سایۂ عاطفت کو اپنے لئے ناگزیر سمجھتی ہے، اسے کیا حق حاصل ہے کہ وہ ریاستوں میں کسی ایسی تحریک کا تجربہ کرے جس کے انجام کا کوئی صحیح تخیل خود بھی ابھی تک قایم نہیں کر سکی ہے۔ علاوہ اس کے ہندو مسلم بدمزگی یوں بھی روز بروز بڑھتی جا رہی ہے اور اگر یہ سلسلہ ریاستوں میں بھی قایم ہو گیا تو اس کے معنے یہ ہوں گے کہ ملک کی آزادی سے پہلے اس فتنہ کا انسداد ضروری ہوگا اور پھر کون کہہ سکتا ہے کہ برطانوی حکومت اس سے فایدہ اُٹھا کر اپنے کھوئے ہوئے اقتدار کو دوبارہ حاصل نہ کر لیگی اور ملک کی آزادی کا سوال پھر پچاس سال کے لئے پس پشت نہ ڈال دیا جائے گا

مصحفی نمبر طیار ہے، مفصل اشتہار صفحۂ ۶۲ پر ملاحظہ ہو

جوش کے کلام کی خصوصیات

(مسلسل)

نئی راہیں

اردو شاعری کا بنظر تعمق مطالعہ کرنے سے ایک تلخ حقیقت کا نہایت شدید احساس ہوتا ہے یعنی یہ کہ ہمارے شعراء نے محض تقلید سے کام لیتے ہوئے محبوب کی بعض مخصوص حرکات و کیفیات پر ہی اپنی توجہ منعطف کی ہے۔ دیگر محاسن تک یا تو ان کی نظر ہی نہیں پہونچی یا مقلدانہ ذہنیت کے باعث کسی قسم کے اجتہاد سے کام لینے میں ان کو جھجک محسوس ہوئی ورنہ سچ پوچھئے تو زلف و ابرو اور چشم و عارض کے علاوہ اور بھی دلکش محاسن محبوب میں موجود ہیں کسی نے صحیح کہا ہے:-

خوبی ہمیں کرشمہ و ناز و خرام نیست
بسیار شیوہ ہاست بتاں را کہ نام نیست

جوش کو اس نکتہ کا پورا پورا احساس ہے۔ متغزلین کے بارے میں اس کا یہ قول نقل کیا جا چکا ہے:-

پائی ہے ترکے میں ان لوگوں نے بہرے بر صدا | ان کے لب پر بھی وہی ہے جو ولی کے لب پہ تھا
سلسلہ ان کے سخن کا دور تک ہوتا نہیں | کون ہے ان میں جو بالائے کمر تک جاتا نہیں

اس کے برخلاف ایک حقیقی شاعر کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے:-

راستے کا ذرہ ذرہ جس کو دیتا ہو صدا | نظم کرتا ہے مجھے بھی شاعر رنگیں نوا
روز و شب مجبور ہو جو سیر کرنے کے لئے | ہر نفس اک وادیٔ نو سے گزرنے کے لئے
چند شعبوں ہی میں گم ہونے نہ پائے جس کی ذات | جس کا موضوع سخن ہو کل نظام کائنات

اس کا کلام پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دراصل وہ "ہر نفس اک وادیٔ نو سے گزرتا ہے" اور کائنات کا ذرہ ذرہ اس کا موضوع سخن ہے۔

محبوب کے "شیوہ ہائے غیر مسمّیٰ" پر بھی اس نے طبع آزمائی کی ہے اور حسینان جہاں کے نئے نئے انداز پر

روشنی ڈالی ہے۔ ایک جگہ لکھتا ہے:۔

یوں چپ ہے مجھ سے گویا کچھ کام ہی نہیں ہے		یہ وہ ادا ہے جس کا کچھ نام ہی نہیں ہے!

"جنگل کی شہزادی" کی تعریف یوں کرتا ہے:

صحرا کی زیب و زینت، فطرت کی نور دیدہ		برسات کے ملائم تاروں کی آفریدہ
ضو پانے والی چاندوں کی ضوفشانی		سکے بٹھانے والی اٹھتی ہوئی جوانی
ڈوبے ہوئے سب اعضا حسن مناسبت میں		پالی ہوئی گلوں کی آغوش تربیت میں
تصنیف ہوں ہزاروں چھپتے ہوئے فسانے		ان انکھڑیوں کی خسرو کانپیں شراب خانے

ایک نظم کا عنوان ہے "اٹھتی جوانی"۔ اس کے دو بند ملاحظہ فرمائیے اور جوش کی جدت طراز فطنت کی داد دیجئے:۔

سدھی ہوئی اس غضب کی پلکیں		کہ آنکھ چلتے ہی دل میں ڈوبیں
سجھی ہوئی اس بلا کی چشکی
کبھی نہ خالی گیا نشانہ

وہ رخ پہ طوفان کیف شب کے		کہ لیکے انگڑائی منھ اندھیرے
ملے جو آنکھیں ہتیلیوں سے
ٹپک پڑے بادۂ شبانہ

آخری شعر بغور ملاحظہ کیجئے اور دیکھئے کہ اس کے پڑھتے ہی ہمارے قلب پر سرور و انبساط کی ایک کیفیت طاری ہوجاتی ہے اور تھوڑی دیر کے لئے ہم اپنے آپ کو ایک دوسری دنیا میں تصور کرنے لگتے ہیں۔

متغزلین نے اپنے محبوب کی شان میں دفاتر بے معنی سیاہ کرڈالے ہیں۔ اس کی توصیف میں زمین و آسمان کے قلابے ملادئے مگر جوش کی جدت پسند طبیعت نے جو تصویر پیش کی ہے، فطرت اور واقعیت کے لحاظ سے بے نظیر ہے:۔

نوخیز، حسین، بلند، بالا،		اوڑھے ہوئے سرمئی دوشالا
فردوس کے در کئے ہوئے باز		ٹیکے ہوئے کہنیاں بصد ناز!
رنگین کلائیوں کو جوڑے		چہرے کو ہتیلیوں پہ رکھے
گلدان میں پھول ہنس رہا ہے
قرآن ہے کہ رحل پر رکھا ہے

"بسیار شیوہ ہاست بتاں را کہ نام نیست" کا بھی جوش دل سے قائل ہے۔ ان "بسیار شیوہا" میں سے بعض ملاحظہ فرمائیے:۔

یہ شہابی رنگ نازک جلد میں رخسار کی		خون کا یہ رقص تہ میں عارض گلنار کی

سُرخ آنچل کا ڈھلک جانا یہ سر سے بار بار — دونوں ہاتھوں سے چھپا لینا یہ منھ بے اختیار
گفتگو یہ سر جھکا کر شرگیں انداز سے — یہ گرہ ہر لفظ میں رکتی ہوئی آواز سے

ذرا ان اشعار کو بغور پڑھئے اور فیصلہ کیجئے کہ کیا جوش کو ندرتِ بیان اور جدتِ مضامین میں ید طولیٰ حاصل نہیں ہے؟ غالباً دو شعرا ہیں قدرت نے "فطنتِ شاعرانہ" (POETIC GENIUS) بمشکل کسی دوسرے شاعر کو اس قدر وفور کے ساتھ ودیعت کی ہو اور یہی باعث ہے کہ جوش کی شاعری نہ صرف بلحاظ ندرت ولطافت بلکہ دیگر کمالات شاعری کو معیار قرار دیتے ہوئے بھی کسی بڑے سے بڑے شاعر سے فروتر نہیں ہے۔ شاید انھیں وجوہ کی بنا پر اردو کے ایک وقیع انشاپرداز نے فرمایا ہے کہ[1]:- "جوش کے کلام کے متعلق کچھ لکھنا ایسا ہی ہے جیسے دن کے وقت یہ کہنا کہ آفتاب نکل آیا ہے"

نظریۂ عشق

عموماً متغزلین کے یہاں عاشق کی ہستی کو زیادہ اہمیت نہیں دیجاتی۔ اُس کی ہر سانس محبوب کی دلجوئی میں گزرتی ہے۔ وہ زندہ صرف اس لئے ہے کہ محبوب کے جور وستم برداشت کرے۔ وہ اپنی ہستی کو مستقلاً پست متصور کئے ہوئے ہے۔ روزانہ محبوب کی بارگاہ میں "نیازمندانہ" انداز سے اپنا احوال سناتا ہے لیکن وہ بیدرد اعتنا نہیں کرتا۔ اگر حسن اتفاق سے کہیں محبوب نے اس پر ایک نظرِ التفات ڈال دی تو گویا اس کی معراج ہوگئی مگر جوش کا نظریۂ عشق اس لایعنی اور قبیح خوشامد کو تسلیم نہیں کرتا۔ وہ اس "مغلوبانہ ذہنیت" (DEFEATIST MENTALITY) کا قایل نہیں۔ اس کے نزدیک عاشق کا وجود بھی لابُد اور لازمی ہے۔ اس کی ہستی بھی اتنی ہی بلکہ اس سے زیادہ اہم ہے جتنی محبوب کی۔ اس کا خیال ہے کہ:-

اہانت گوارا نہیں عاشقی کی — غلامی میں بھی سروری چاہتا ہوں

یہ نہیں ہے کہ وہ پرستشِ محبوب کے خلاف ہے۔ بلکہ اس کے ساتھ ہی ساتھ "پندارِ عاشقی" بھی ملحوظ ہے:-

مزاجِ تمنائے خوددار، توبہ! — عبادت میں بھی داوری چاہتا ہوں

محبوب کو غلط فہمی ہے کہ اُس کی ذات پر تمام عشاق کی ہستی کا دار و مدار ہے، لیکن جوش کا قول ہے کہ حُسن فی الاصل کوئی چیز نہیں صرف عشق کے باعث حسن حُسن ہوگیا۔ چنانچہ محبوب کی اس غلط فہمی کو یوں رفع کرتا ہے:-

اے حسن! اگر عشق خریدار نہ ہوتا — یہ غلغلۂ گرمیِ بازار نہ ہوتا
اے حسن! داد دے کہ تمنائے عشق نے — تیری حیا کو عشوۂ ترکانہ کر دیا

اس کا عقیدہ ہے کہ حُسن کو جو اہمیت دیجاتی ہے اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ عشق کی توجہ اس کی جانب منعطف ہے چنانچہ کہتا ہے:-

اے حسن! شاد ہو کہ تجھے چشمِ شوق نے — آشوبِ چشم و فتنۂ دوراں بنا دیا

---

[1] نگار - جلائی ۱۹۳۲ء

فیضِ نگاہِ عشق نے اے دفترِ جمال! | تیرے ہر ایک جزو کو قرآں بنا دیا
اے ناز! داد دے کہ سرابِ جمال کو | میری نظر نے چشمۂ حیواں بنا دیا!

بالآخر ایک "جذبۂ منفعلانہ" کے ماتحت کہہ اٹھتا ہے کہ:-

رکھ کر کلاہِ فخر کہ تیرے شباب کو | میں نے خدائے عالمِ امکاں بنا دیا!

"محبوب کی بے التفاتی کے خلاف احتجاج کرنا متغزلین کا عام شیوہ ہے۔ اپنی فریاد و پکار سے غالباً وہ اہلِ زمانہ کی ہمدردی اپنی موافقت میں حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن جوش اس عالمِ مفارقت میں بھی عاشقانہ وقار کو قائم رکھتا ہے۔ وہ اپنا مرتبہ "گدایانہ" نہیں بناتا۔ اس کا نظریہ یہ ہے کہ "وہ اپنے حسن سے محفل، میں اپنے عشق سے برہم!!"
بعض اشعار ملاحظہ ہوں:-

اس طرف حسن خود سر و خود بیں | اس طرف عشق ضابطہ و خوددار
اس طرف نازِ دلبری کا شکوہ | اس طرف شعرِ بیخودی کا وقار
اس طرف حسن غرقِ صد نخوت | اس طرف عشق محوِ صد پندار

یہ تو ہجر و مفارقت کی حالت تھی لیکن اگر اسے محبوب کی خلوت میں بھی باریابی ہوتی ہے تب بھی یہ نہیں ہوتا کہ وہ غلامانہ انداز میں اپنا احوالِ درد و غم سنائے۔ برخلاف اس کے عاشق کو یہاں بھی اپنی "پوزیشن" کا احساس رہتا ہے اور وہ نہیں چاہتا کہ کسی طرح عشق کی توہین ہو جائے۔ سنئے:-

اس طرف عہد ہے نہ سننے کا | اس طرف بند ہیں لبِ گفتار
مجھ کو یہ ضد کہ وہ ہوں تبسم ریز | ان کو یہ ضد کہ یہ کرے اصرار

صدق و وفا

اس تمام بحث سے یہ نہیں مستنبط کر لینا چاہیے کہ جوش اُلفتِ محبوب میں اخلاص و صداقت کے خلاف ہے۔ اس کے بالکل برخلاف وہ ہر وقت مجسم وفا ہے۔ اس کی ہر سانس داستانِ الفت کی راوی ہے:-

وفا شعار ہوں ترکِ وفا نہیں کرتا | کبھی نمازِ صبوحی قضا نہیں کرتا

محبوب کے مظالم کے باوجود وہ یہ کہتا ہے کہ:-

نقشِ خیال دل سے مٹایا نہیں ہنوز | بیدرد! میں نے تجھ کو بھلایا نہیں ہنوز

صرف یہ کہ محبوب کو فراموش نہیں کیا بلکہ حقیقتِ امر یہ ہے کہ رشتۂ موانست اسی طرح مضبوط ہے۔

تیری ہی زلفِ ناز کا ابتک اسیر ہوں | یعنی کسی کے دام میں آیا نہیں ہنوز

ایک دوسرے مقام پر اسی مطلب کو واضح کرتا ہے:-

یہ مگر وہم ہے اسے پیکر حسن و تنویر کہ یہ دل اب ہے کسی اور کی زلفوں کا اسیر

اس نکتہ کی مزید تصریح یوں کی ہے :-

یاد ہیں بخیر جس پہ کبھی تھی تری نظر وہ دل کسی سے میں نے لگایا نہیں ہنوز!

انسان کی فطرت کا تقاضہ ہے کہ جب کوئی شے مفقود ہو جاتی ہے تب اس کی اصل قدر و قیمت کا احساس ہوتا ہے۔ محبوب نے "بزمانۂ التفات" جو الطاف و احسانات کئے تھے وہ اب تک عاشق کے نقش ذہن ہیں :-

گردن کو آج بھی تری بانہوں کی یاد ہے یہ منتوں کا طوق بڑھایا نہیں ہنوز!

اس کو پوری طرح احساس ہے کہ محبوب کی نگاہ بدل گئی ہے، وہ اب ملتفت نہیں ہوگا۔ لیکن اس کی خوش اعتقادی کا یہ عالم ہے کہ کہتا ہے :-

وہاں جفا ہی جفا رہ گئی ہے مدت سے یہاں جفا پہ وفا کا گمان باقی ہے

پھر نہایت فخریہ انداز میں کہتا ہے کہ :-

حسن کا اب نہیں اگلا سا بانکپن قایم مگر وفا کی وہی آن بان باقی ہے

غرض یہ کہ محبوب کے مظالم کے باوجود جوش کے نزدیک ہر حالت میں وفاداری کا ثبوت دینا چاہئے کیونکہ دنیائے محبت میں عشق اور وفا لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔

اعلائے محبوب

جوش کے نظریۂ عشق کے مطابق ایک عاشق کو خوددار اور باوقار ہونا چاہئے۔ لیکن اس سلسلہ میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کے نزدیک محبوب کا مرتبہ کیا ہے؟ کیا وہ فرعی اور ثانوی حیثیت رکھتا ہے؛ اور کیا عاشق کے معیار و مرتبہ کے بلند کرنے میں جوش نے محبوب کے مرتبہ کو کسی حد تک فروتر بنا دیا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ عاشق کے مرتبہ کو بلند کرنے کے معنی ہی یہ ہوتے ہیں کہ محبوب کا مرتبہ بھی بالاتر ہو جائے کیونکہ جب عشق باوفا ہوگا تو فطرتاً وہ اپنی تمناؤں کے مرکز یعنی حسن کو بھی عظمت و افتخار کی نگاہ سے دیکھیگا۔ وہ محبوب سے نہایت فخریہ انداز سے کہیگا۔

اپنی رفتار پہ ہے کوثر و تسنیم کو ناز کاکلیں چھوڑ کے شانوں پہ خراماں ہو جا!

ایک دوسری جگہ یہی مفہوم اس طرح ادا کیا ہے :-

بل ابروؤں پہ ڈال کے زلفوں کو کھول دے کونین کو اسیر کمان و کمند کر!

جوش کو محبوب کی عظمت کا جسقدر احساس ہے اس کا اندازہ اس شعر سے ہوسکتا ہے :-

کفر سجدے میں گرے، دین کی نبضیں چھٹ جائیں آج آ، دوش پہ بکھرائے ہوئے یوں گیسو!

نہ صرف یہ کہ جوش کو اپنے محبوب کی عظمت کا احساس ہے بلکہ اس کا خیال ہے کہ ہر "اہل نظر" کو اپنا محبوب اتنا ہی ذی مرتبت اور عزیز معلوم ہوتا ہے۔

آؤ پھر جلوۂ جاناں پہ لٹا دیں کونین — شغلِ پارینۂ اربابِ نظر تازہ کریں

بالفاظ دیگر جلوۂ جاناں پہ کونین نثار کر دینا فی الحقیقت عشاق کا شیوۂ دیرینہ ہے :

اس ضمن میں ایک نکتہ ملحوظ رہے۔ جوش نہ صرف اعلائے محبوب کا متمنی ہے بلکہ اس کا عقیدہ ہے کہ محبوب کی عظمت کے باعث جس قدر بھی اشیاء اس سے متعلق ہیں وہ سب ذی قدر ہو جاتی ہیں ایک جگہ لکھتا ہے :-

ہاں آسمان! اپنی بلندی سے ہوشیار — اب سر اُٹھا رہے ہیں کسی آستاں سے ہم

محبوب کے باعث اس کے آستانے کا یہ مرتبہ ہو جانا کہ اس پر سر رکھ دینے سے سر بھی اتنا ارفع و اعلیٰ ہو جائے کہ آسمان کو اپنی بلندی سے ہوشیار ہو جانا پڑے ایک ایسا دعویٰ ہے کہ جس کو مبالغہ پر محمول کر سکتے ہیں لیکن اس سے کم از کم یہ تو ظاہر ہو جاتا ہے کہ جوش کے دل میں محبوب کی کس قدر عظمت و مرتبت ہے

التفات محبوب جوش نے اپنا نظریۂ عشق پیش کرتے ہوئے جہاں اور بہت سی اختراعات اور جدتوں سے کام لیا ہے ان میں ایک یہ بھی ہے کہ اس کا معشوق محض ظالم، عاشق کش جابر و قاہر اور بے التفات ہی نہیں ہے بلکہ محبوب کو بھی احساس محبت ہے اور حقیقت امر یہ ہے کہ ایک حسین و جمیل ہستی کو خواہ مخواہ ظالم قرار دے دینا خود اپنی جگہ پر ظلم ہے۔ جگر نے صحیح کہا ہے :-

ان شاعرانِ دہر پہ ہو عشق ہی کی مار — اک پیکرِ جمیل کو قاتل بنا دیا

لیکن جوش ان " شاعرانِ دہر" میں نہیں جو اس "پیکرِ جمیل" کو قاتل قرار دیتے ہیں۔ جوش کا محبوب بھی اس سے ملنے کے لئے اس قدر بیتاب رہتا ہے (بیتاب رہتی ہے ؟) جیسا کہ تقاضائے موانست ہے۔ اس سلسلہ میں ارسالِ تحفہ و پیام بھی ہوتا ہے۔ دونوں جانب سے اظہارِ محبت بھی کیا جاتا ہے اور سچ پوچھئے تو یہ نظریہ اس مقلدانہ فرسودہ نظریہ سے زیادہ نیچرل ہے جس میں معشوق کو صیاد سے تعبیر کیا جاتا تھا۔

اس مطلب کو واضح کرنے کے لئے چند مثالیں درج کرنا ضروری ہیں۔ تحفہ و پیام ملاحظہ ہو :-

یہ کس نے جوش کو بھیجے ہیں ناز پرور پھول — شگفتہ پھول، جواں پھول، خلد پیکر پھول!

" زرد کلیاں " جوش کی مشہور نظم ہے۔ وہ بھی اسی نظریہ کی آئینہ دار ہے۔ کلیوں کے ذریعہ محبوبہ نے جو پیام بھیجا ہے وہ بھی ملاحظہ فرمائیے :-

اب حد سے سوا ہے خستہ حالی — نزدیک ہے وقتِ پائمالی،

آنا ہو تو آ، کہ دل ہے بیتاب — ایسے میں ابھی چمن ہے شاداب

جلد آ، کہ فروغِ رنگ و بو ہو

قبل اس کے کہ خونِ آرزو ہو!

"التفاتِ یار کے دورِ طرب آہنگ میں" موافقت و ملاطفت کا یہ عالم تھا کہ :-

مست راتوں میں بفیضِ ارتباطِ حسن و عشق | میہمانی کے مزوں میں میزبانی کے مزے
کمسنی کی خوابگاہوں میں بپئے تکمیل شوق | جرعہ جرعہ پی کے مے افسانہ خوانی کے مزے

ظاہر بین نظروں کو شاید یہ گمان ہو کہ جوش کو اس التفاتِ یار سے سرور و انبساط حاصل ہوتا ہوگا۔ حالانکہ معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ جوش کو اپنے آرامِ جاں کی بیچینی سے اور بھی تشویش و کوفت ہوتی ہے۔ وہ استعجاب آمیز طریقہ سے کہتا ہے :-

جس کے قدموں پر ہو خود فطرت کا سر | وہ پڑھے اور مجھ سے ملنے کو نماز
آہ، وہ اور اس طرح مجھ سے ملے | خود اٹھاتی ہو جوانی جس کے ناز

"جفائے وفا" کے عنوان سے اسی مفہوم کو پیش کیا ہے :-

دل کی بستی میں کیوں نہ ہو کہرام | آہ یہ نامہ، ہائے یہ کہرام
کاش اسوقت مجھ کو موت آجائے | آگ میں پھول کس سے دیکھا جائے
کاش وہ یوں نہ باوفا ہوتی، | بانیِ ظلم ناروا ہوتی،
بول اسے نامہ بر! جیوں کیسے | پھر تو دوہرا یہ کیا کہا اُس نے
"آنکھ کھلتے ہی صبح تیری یاد | دل پہ کرتی ہے جانے کیا بیداد
دل مرا غرقِ یاس رہتا ہے | شام تک جی اُداس رہتا ہے!"

عہدِ تمنا کی یاد محبوب کی اس لطف آمیز روش کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ بزمانۂ مفارقت عاشق کو یہ سب الطاف و عنایات ایک ایک کرکے یاد آئیں گی۔ وہ متعجب ہوگا اور تلوّنِ زمانہ پر حیرت کریگا کہ :-

"لوگ ایسے بھی دنیا میں بدل جاتے ہیں!" جوش کے زمانۂ فراق کا بھی یہی عالم ہے اس کو ہر ہر قدم پر محبوب کے عہدِ تمنا کی یاد ستاتی ہے۔ وہ اس کی دیرینہ ملاطفت کو یاد کرکے ایک آہ سرد کھینچتا ہے۔ اگر کہیں محبوب سے خطاب کرتا ہے تو اس امر کی جانب خاص اشارہ کردیتا ہے :-

دل نے بخشا تھا تقاضائے زلیخا تجھ کو | یاد ہے وہ خلشِ عہدِ تمنا تجھ کو؟

اس "تقاضائے زلیخا" والے عہدِ تمنا کی کس قدر پُرتاثیر تشریح کی ہے :-

نرگسِ ناز میں یوں اشک بھرے رہتے تھے | نظر آتا تھا ورقِ دہر کا دھندلا تجھ کو!
روزِ باراں میں ستاتا تھا غمِ عشق تجھے | شبِ مہتاب میں ڈستی تھی تمنا تجھ کو!
ہر گھڑی میری حضوری کی تمنا تھی تجھے | ہر نفس میری جدائی کا تھا کھٹکا تجھ کو

۱۸ ہم حباب آسا ہیں لازم ہے کہ جب ہم سے ملو — دوستو، باریک بینی سے ذرا کام لو

۱۹ اس طرف ہڈیوں سے جامۂ تار — اس طرف حجم جبّہ و دستار

۲۰ پھول چڑھتے ہیں خاکساروں پر — سجدے ہوتے ہیں یاں مزاروں پر

۲۱۔ دے سرے رُخ کو سہولتِ ابہام — اور مریدوں کو تحفۂ اوہام

۲۲۔ ان کے آگے ہر بیابان ہوگا جلوہ گاہ — اور ترا آئینہ ہوگا صرف شوہر کی نگاہ

۲۳۔ ان کی باتیں خوفِ رسوائی سے ہونگی جو براز — تیرے سینے میں کسی شب کا نہ ہوگا کوئی راز

رعایت لفظی

تقریباً ایک صدی پیشتر تک شعر کی بڑی خوبی یہ سمجھی جاتی تھی کہ کسی طرح کھینچ تان کر اس میں "صنعتِ ایہام" کی گنجائش نکل آئے۔ در اصل یہ تمام تکلفات بار دہ فارسی شاعری سے مستعار لئے گئے تھے اور ہماری متعلمانہ ذہنیت کا نتیجہ تھے۔ جب اہل زمانہ کے دماغ تہذیبِ جدید سے روشن ہوئے تو مذاقِ شاعری میں بھی انقلابِ عظیم وقوع پذیر ہوا۔ لوگوں کو اس امر کا احساس ہونے لگا کہ ایک بات کو صاف اور سہل طریقہ سے ادا کرنا نسبتاً اس سے بہتر ہے کہ اُسے پیچیدہ اور متصنع الفاظ کے گورکھ دھندے میں جکڑ دیا جائے اور مطلب بالکل خبط ہو جائے۔ اس ذہنی انقلاب کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ سوسائٹی نے اس قسم کے تمام لایعنی تکلفات کو مسترد کر دیا اور علی الخصوص "رعایتِ لفظی" کو متفق اللفظ ہو کر مردود قرار دیا ہے۔ جوش "شاعرِ انقلاب" کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ اس سے یہ توقع تھی کہ چند قدم اور آگے بڑھ کر بعض دیگر بھی تکلفات کا استرداد کرے گا لیکن نہایت افسوس ہے کہ اس کی شاعری میں بھی بعض جگہ وہی شیخ ناسخ اور میاں امانت کی رعایتِ لفظی والی ذہنیت کارفرما نظر آتی ہے۔ بعض مثالیں نقل کی جاتی ہیں:—

۱۔ آج تک غالب ہے ان پر وہ رقیبِ روسیاہ — کر چکا ہے زندگی جو تیرۂ مومن کی شب،

۲۔ وہ تیری پہلی ملاقات کی وہ پہلی رات — اُدھر تھا چاند اِدھر دیدۂ پر آب ترا

۳۔ اشک بے سوزِ دروں پانی ہے ایماں کی قسم — قلبِ شبنم پر شعاعِ مہرِ تاباں کی قسم

۴۔ غم کے سکّے بحرِ زر تا کے بٹھائے جائیں گے — کب تک آخر ہم پئے عشرت رُلائے جائیں گے
دام پر تا چند یوں دانے گرائے جائیں گے — آنسوؤں سے تا کجا موتی بنائے جائیں گے

۵۔ ہر اک صدف ہو آنکھ میں آنسو بھرے ہوئے — یا رب نزولِ قطرۂ نیساں کا واسطہ

۶۔ نہ ہوگا کوئی مجھ سا بھی تیرہ قسمت — کہ بازارِ شب میں سحر بیچتا ہوں،

رعایت لفظی کی ایک اور خرابی

ایک عیب اس سے بھی زیادہ اہم ملاحظہ فرمائیے۔ مناجات، فریاد، نالہ و بکا ایسے مضامین ہیں جن میں خلوص، صدق اور سادگی ہی درحقیقت کلام کی جان ہوتی ہے لیکن جوش ان موضوعوں پر بحث کرتے ہوئے "صنعتِ ایہام" کا لحاظ رکھتے ہیں۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سراسر تصنع مترشح

ہونے لگتا ہے بعض مثالوں سے یہ مطلب واضح ہو جائے گا

ایک نظم کا عنوان ہے "التجائے مرگ" یہاں شاعر نے بارگاہ ایزدی میں مرگ کی درخواست کی ہے۔ مطلع ہے:۔

کر قطع نخلِ عمر گلستاں کا واسطہ! ۔۔۔ یا رب بہار عالمِ امکاں کا واسطہ

تمام نظم میں مختلف اشیاء کا واسطہ دیکر خداوند عالم سے درخواست کی ہے کہ مجھے جلد از جلد موت آجائے لیکن ذرا اشعار ذیل بھی ملاحظہ فرمایئے:۔

کام و دہن کو موت کی تلخی سے کر دوچار ۔۔۔ شکر فشانیِ لبِ خوباں کا واسطہ
اب طولِ زندگی سے مجھے کر نہ شرمسار ۔۔۔ بالیدگیِ زلفِ پریشاں کا واسطہ
دے روزِ تلخ زیست کو اب حکم اختصار ۔۔۔ تجھ کو درازیِ شبِ ہجراں کا واسطہ
اب نشۂ حیات سے دے جوشؔ کو فراغ ۔۔۔ تجھ کو خمارِ نرگسِ جاناں کا واسطہ
چھلکا مری جبیں پہ عرقِ کربِ نزع کا ۔۔۔ رنگیں رخوں کی تابشِ افشاں کا واسطہ
اب فکرِ زندگی سے فراغت کی دے نوید ۔۔۔ شیریں لبوں کی سستیِ پیماں کا واسطہ

یہ وہ موقع ہے کہ جناب جوشؔ رب العالمین سے التجائے مرگ کر رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ التجا کرنے میں حرف حرف سے خلوص و صدق کی بو آنی چاہیئے لیکن اس نظم کو پڑھتے ہی یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ شاعر کی نظر بجائے مناجات کے "رعایت لفظی" پر مرکوز ہے اور شروع سے آخر تک اس صنعت ہی کا لحاظ رکھے ہوئے ہے، دعا کا زیادہ خیال نہیں۔

ایک دوسری خرابی انگریزی کی ایک مثل ہے کہ کسی ایک جرم کے مرتکب ہونے کے معنی بالفاظ دیگر یہ ہوتے ہیں کہ دیگر مختلف النوع جرائم کا ارتکاب کرنا پڑے گا۔ بعینہٖ یہی حال اس جگہ ہے۔ رعایت لفظی کے چکر میں پڑ کر ہمارے شاعر سے دیگر اہم فنی غلطیاں سرزد ہوئی ہیں۔ جن کی طرف اشارہ کر دینا لازمی ہے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ اس تمام مناجات کا مخاطب خدا ہے۔ آپ جب کسی سے اپنے حوائج کی تکمیل کے لئے ملتجی ہوں اور ساتھ ہی ساتھ کسی شے کا واسطہ دیں تو آپ کی لیاقت و فرزانگی کا انحصار اس امر پر ہوگا کہ ایسی اشیاء کو واسطہ قرار دیں جن کا شخص مذکور پہ نسبتہً زیادہ اثر ہو اور جن کی سفارشات کو رد کرتے ہوئے اُس کو جھجک محسوس ہو۔ یہاں خداوند عالم سے درخواست مرگ کی جا رہی ہے اُصولاً کچھ ایسی چیزوں کا واسطہ دینا چاہیئے جو بارگاہِ ایزدی میں مقبول و پسندیدہ متصور کی جاتی ہوں لیکن جناب جوشؔ کن اشیاء کو واسطہ قرار دیتے ہیں؟ "شکر فشانی لب خوباں" "بالیدگی زلف پریشاں"، "درازی شب ہجراں"، "رنگیں رخوں کی تابش افشاں" اور ان سب سے زیادہ دلچسپ "شیریں لبوں کی سستی پیماں" اور "مست انکھڑیوں کی جنبش مژگاں" کا واسطہ ہے۔ خود ہی فیصلہ کیجئے کہ خداوند عالم کو ان اشیاء کا واسطہ دینا فنی اعتبار سے کہاں تک صحیح ہے اور اس نظم سے کس حد تک بوئے اخلاص آتی ہے!!

"آرزوئے محروم" جوش کی مشہور نظم ہے جس میں انھوں نے اپنے محبوب سے ہجر و مفارقت کا شکوہ کیا ہے شروع یوں کیا ہے

فریاد ہے اے خلوتی پردۂ ناموس   کب سے ہوں تری دھن میں گریبان دریدہ

ماہرین نفسیات اندازہ لگا سکتے ہیں کہ یہ کس قدر نازک موقع ہے۔ محبوب کی جناب میں فریاد و التجا کی جا رہی ہے۔ اپنا افسانۂ دل مؤثر ترین الفاظ میں پیش کرنا چاہئے۔ ہر لفظ سے خلوص و صداقت ٹپکنا چاہئے۔ بس یہ معلوم ہو کہ فریاد کرنے والا دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو کر اپنے دل کی کیفیات سادہ ترین الفاظ میں بیان کر رہا ہے لیکن جوش صاحب کا رنگین قلم یہاں بھی "صنعت لفظی" سے نہیں چوکتا اور فرماتے ہیں:۔

سونے کو ترستی ہیں برستی ہوئی آنکھیں   بیدار ہو اے ترک محبت نخشیدہ

وہ سجدہ کروں سر ہی نہیں روح بھی جھک جائے   دے اذن اگر جنبش ابروئے خمیدہ

ہر شعر ایک خاص کیفیت کے ماتحت لکھا جاتا ہے کبھی دل کو فرحت ہوتی ہے اور کبھی کلفت و افسردگی۔ لہذا شعر بھی ان مختلف کیفیات کا آئینہ دار ہونا چاہئے۔ جوش کا ایک نظم کا پہلا مصرع ہے:۔ "اے یار دلنشیں، وہ ادا کون لے گیا" ظاہر ہے کہ یہ نظم عالم ہجر میں لکھی گئی ہے۔ محبوب کی دیرینہ عنایات یاد دلا کر اس کی موجودہ بے اعتنائی پر ملامت کی جا رہی ہے۔ اس لئے اس میں بجز درد و مصیبت کی مختلف کیفیات کے اور کچھ نہیں ہونا چاہئے۔ لیکن بھلا کیا مجال کہ جوش صاحب "رعایت لفظی" کا لحاظ نہ رکھیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں:۔

اب جوش کے سینے میں نہ آنسو نہ آہ سرد   اس گلستاں کی آب و ہوا کون لے گیا؟

لسانی غلطیاں

عموماً جوش کا کلام لسانی نقطۂ نظر سے مستحسن اور مرجح سمجھا جاتا ہے لیکن یہ امر نہایت عجب خیز ہے کہ وہ لسانی اغلاط سے بھی خالی نہیں بلکہ بعض غلطیاں تو ایسی ہیں کہ جوش جیسے عظیم المرتبت شاعر کے شایان شان نہیں۔ یہ غلطیاں کئی قسم کی ہیں۔ ایک تو وہ غلطیاں ہیں جو جوش نے عربی و فارسی سے کامل واقفیت نہ ہونے کے باعث کی ہیں مثلاً:۔

(۱) ایک نظم کا مطلع ہے:۔

اے نرگس جاناں یہ نظر کس کے لئے ہے؟   یہ شعلۂ برق یہ شرر کس کے لئے ہے؟

پھر ارشاد ہوتا ہے:۔

اے سایۂ کاکل میں چمکتے ہوئے عارض!   ظلمات میں یہ آب خضر کس کے لئے ہے؟

اے گیسوئے آشفتہ و اے کاکل برہم   یہ عمر مسیحا و خضر کس کے لئے ہے؟

ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں:۔

اس راستے کی شمع ہو روح الامیں کی سانس   روشن کبھی ہوا نہ چراغ خضر یہاں (قافیہ نظر دیر)

خضر بکسر خا و سکون ضاد بروزنِ عشق، یا بفتح خا و کسر ضاد بروزنِ تحسین ہے۔ خضر بروزنِ شجر یا خضر بروزن علل، دو جہلا کا تلفظ ہے اور قبیح ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ تینوں جگہ ترکیب فارسی استعمال کیا ہے جو سراسر غلط ہے۔

(۲) ایک نظم کا پہلا مصرع ہے:۔ "یہ کس نے جوش کو بھیجے ہیں نازپرور پھول" قوافی میں مخمور، معطر وغیرہ پھر لکھتے ہیں:۔

پلٹ گئے اسے خلش نوکِ خار سے شاکی — اسے بھی دیکھ جسے ڈس رہے ہیں کافر پھول

"کافر" بفتح فا نہ صرف غلط ہے بلکہ نہایت بھونڈا معلوم ہوتا ہے

(۳) سخت حیراں ہوں مگر اے امتِ بدر و حنین — دیو کی تصویرِ غم کا ستشنہ ہو خونِ حسین

"امت بدر و حنین" سے کیا مراد ہے؟ بدر اور حنین دو مقامات کے نام ہیں جہاں غزوات، وقوع پذیر ہوئے ہیں، انکی امت سے کیا مفہوم ہے؟ جناب رسالتمآب صلعم یا حضرت علی کو "فاتح بدر و حنین" یا "شاہ بدر و حنین" البتہ کہا جاتا ہے۔ لیکن اس نسبت سے مسلمانوں کو صرف "امت بدر و حنین" کہنا کسی طرح درست نہیں

(۴) توبہ توبہ فصلِ گل میں اور میں توبہ کروں — میں کوئی کافر نہیں الحمد ربِ العالمیں

"الحمد للہ" یا "الحمد لربِ العالمین" کی بجائے "الحمد ربِ العالمین" کہنا صحیح نہیں۔

(۵) "سوگوارانِ حسین سے خطاب":۔

ابنِ کوثر پہلے اپنی تشنہ کامی کو تو دیکھ — اپنے ماتھے کی ذرا مہر غلامی کو تو دیکھ!

جناب رسول خدا صلعم کو (یا حضرت علی مرتضیٰ کو) ساقیِ کوثر کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔ اسی لحاظ سے امام حسین کو علی الخصوص "ابنِ ساقیِ کوثر" کہتے ہیں بنظرِ تعمیم ہر سید کو "ابن ساقیِ کوثر" کہہ سکتے ہیں۔ "ابن کوثر" کوئی معنی نہیں رکھتا۔

دوسری قسم کی غلطیاں وہ ہیں جہاں جوش نے اردو الفاظ کو روزمرہ کے خلاف یا غلط استعمال کیا ہے۔ مثلاً:۔

(۱) ان کا تقویٰ کہ میری میخواری — ایزدِ باری کون بہتر ہے

"تقویٰ" اور "میخواری" غیر ذی روح اشیا ہیں۔ ان کے لئے "کون" کہنا غلط ہے "کیا" ہونا چاہیئے۔ استفہامیہ ضمیر جب کسی غیر ذی روح کے لئے تنہا استعمال کی جائے (یعنی اس کے بعد کوئی اسم نہ ہو) تو "کون" نہیں کہتے بلکہ "کیا" کہتے ہیں۔ مثلاً ہم کہیں گے "اخبار یا رسالہ؟ کیا پڑھنا چاہیئے؟" برخلاف اس کے ذی روح کے لئے کہیں گے "زید اور عمرو میں کون زیادہ تیز ہے"

(۲) کلیاں ہیں سفید، سبز دونا — بیجا نہیں دل کا محو ہونا

دُونا بروزن ہونا غلط ہے۔ صحیح لفظ دونا بفتح دال ہے۔

(۳) "وقفۂ حاضر کو تاجِ زر پہنا چکنے کے بعد"۔ تاج پہنایا نہیں جاتا۔ اُڑھایا جاتا ہے۔ لباس وغیرہ پہنتے ہیں۔ تاج و کلاہ اُوڑھتے ہیں۔

(۴) "روندتے ہیں جس کو چوپائے جھلستی ہے سموم" "جھلسنا" فعل لازم ہے۔ یہاں اس کا محل نہیں۔ اس کی بجائے "جھلسانا" ہونا چاہیے جو فعل متعدی ہے۔

(۵) کون یہ اوڑھے کفن، تا حشر سونے کے لئے　　جا رہا ہے قبر کی خوراک ہونے کے لئے

موت ہے خوراک میری، موت پر جیتی ہوں میں

اردو میں خوراک بروزن "سُراغ" مستعمل ہے۔ بروزن "طومار" خلاف روزمرہ ہے۔

(۶) وہ رحمت میں غرق بڑھی بوڑھیوں کی ذات　　وہ کاٹنا ڈلی کا کہانی کے ساتھ ساتھ

ذات اور ساتھ ہم قافیہ نہیں ہو سکتے۔

افتراقِ محاورہ

محاورات جس طرح روزمرہ کی گفتگو میں استعمال کئے جاتے ہیں اگر بعینہٖ اسی طرح نظم کئے جائیں تب ہی صحیح مانے جا سکتے ہیں۔ ورنہ اس کو ہم محاورہ نہیں کہہ سکتے بعض مقامات پر جناب جوش اس امر کا بھی لحاظ نہیں رکھتے اور ایک محاورہ کو دو ٹکڑے کر کے بالفصل نظم کرتے ہیں جو غلط ہے۔ مثلاً "چال ڈھال" محاورہ ہے۔ جوش صاحب لکھتے ہیں:-

۱۔ چال انگریزی ~~ہے ڈھال انگریزی~~　　جسم کا بال بال انگریزی!

بھول چوک ہونا روزمرہ کا محاورہ ہے۔ جناب جوش لکھتے ہیں:-

اک بے پناہ چوک ہے اک سخت بھول ہے　　(دو فاق)

غیر مانوس الفاظ و تراکیب

بعض مقامات پر اس قسم کے غیر مانوس الفاظ آتے ہیں جن سے تصنع ظاہر ہوتا ہے اور پڑھنے والے کو کوفت ہونے لگتی ہے۔ مثلاً:-

۱۔ تو کہے دریا میں ہے تا غرقِ نمو　　یار کی کڑیل جوانی کا لہو۔

تو یہ کہے کہ ہوش میں دنیا نہیں ہے آج

یہ دراصل "توگوئی" کا ترجمہ ہے لیکن فی زمانہ نہ صرف متروک ہے بلکہ مذاقِ سلیم کو ناگوار گزرتا ہے۔

یزداں شکار

(۱) نگاہ روبرو! اے روحِ نعمت دارین　　بہوش باش، کہ یزداں شکار ہیں ہم لوگ

(۲) ہر بات ایک فسوں، ہر سانس ایک جادو　　قدسی فریب مژگاں، یزداں شکار گیسو

(۳) چٹکی سے چھوڑنا دکِ ہستی شکار کو،　　مست انگھڑیوں کی جنبش مژگاں کا واسطہ

(۴) ظرفِ گلی میں آبِ وضو دیکھتا ہے کیا،　　آ، جامِ زر میں آتشِ یزداں شکار دیکھ

(۵) تجھ سے آتا تھا پسینہ افسر و اورنگ کو　　اے کہ ہمت تھی تری قوت شکن، یزداں شکار

"یزداں شکار" پر رسالہ نگار میں نیاز صاحب اور ڈاکٹر عندلیب شادانی کے مابین کافی بحث ہو چکی تو جب

کا خیال تھا کہ اس کے معنی ہیں "شکار یزداں" لیکن ڈاکٹر عندلیب شادانی نے بالاسناد ثابت کر دکھایا کہ شکار کلمۂ فاعلی ہے لہٰذا اس کے معنے ہوئے "یزداں کو شکار کرنے والا" حقیقتاً شادانی ہی کا خیال ٹھیک تھا۔ شکار کلمۂ فاعلی ہے۔ رومی :-

زیر کنگرۂ کبریاش مردانند　　فرشتہ صید و پیمبر شکار و یزداں گیر

لیکن اس سے غالباً عندلیب شادانی کو بھی انکار نہ ہوگا کہ یہ ترکیب اردو میں بالکل اجنبی اور غیر فصیح ہیں اور حقیقتاً "فصاحت شکار" ہیں

دیگر غیر فصیح الفاظ اس کے علاوہ بھی مذکورۂ ذیل اشعار میں خط کشیدہ الفاظ پر غور فرمائیے کہ کس قدر تصنع سے لبریز ہیں اور خود ہی فیصلہ فرمائیے کہ یہ الفاظ و تراکیب ہماری زبان میں کس حد تک فصیح ہیں :-

۱- یاد کر وہ دن کہ ہر یک جوشِ بے اندازہ باز　　دورِ سوز و ساز میں تھے ترجمانِ کیدگر

۲- غور کر تو اک عفونت خیز لاشا تو نہیں

۳- ہر جنبش نگاہ ہے اک انقطاع فصل

۴- کندہ ہے اس طرح شکستہ پہ یارب کس کا نام

۵- صدائے نے سے پریشاں تھے شیروانِ جہاں　　لوائے جہت لرزاں تھے قاطعانِ طریق

تضادِ بیان قرآن مجید میں شعرا کے متعلق مرقوم ہے کہ "انہم فی کل وادٍ یہیمون" یعنی وہ مختلف وادیوں میں بھٹکتے پھرتے ہیں۔ کم از کم جوش کے بارے میں بعض جگہ یہ قول صادق آتا ہے۔ ایک مقام پہ خود بھی اعتراف کیا ہے :-

گونجی ہوئی ازل سے ہے گلبانگ بیخودی　　یعنی حدیثِ عقل نہیں معتبر یہاں

لیکن ایک وہ شخص جو مستقل فلسفۂ حیات پیش کرنے کا دعویٰ رکھتا ہو جس کو دعا ہو کہ شاعر حقیقت میں وہ ہو سکتا ہے :-

جس کا دل ہو درحقیقت وہ رصد گاہِ عظیم　　جو ہر فطرت کی ہر اک کروٹ کا ہمراز و ندیم

اُس کے کلام میں قدم قدم پر تضاد و تناقص پایا جانا فی الحقیقت استعجاب انگیز ہے۔ اس پر طرہ یہ کہ بعض جگہ ایک ہی نظم میں دو متناقض یا غیر مربوط بیانات نظم کر دئے گئے ہیں، بعض مثالیں تحریر کی جاتی ہیں۔ "پہلی مفارقت" جوش کی نہایت مقبول نظم ہے۔ اُس کو اس طرح شروع کیا ہے :-

چاندسے عہدِ وصل کی باتیں　　ہائے فرقت کی چاندنی راتیں
کوئی کافر ہی شب کو سوتا ہے　　رات بھر دل میں درد ہوتا ہے
کچھ وہ تکیوں سے آتی ہے خوشبو　　نیند آتی نہیں کسی پہلو

پھر آگے چل کر لکھتے ہیں :-

مُرغ جب صبح کو جگاتے ہیں　　جو سنتے ہی وہ یاد آتے ہیں

دیکھئے، شعر ۲ میں تو لکھا ہے کہ "کوئی کافر ہی شب کو سوتا ہے" اور "نیند آتی نہیں کسی پہلو" لیکن پھر اس کے کیا معنی ہوتے ہیں کہ "مرغ جب صبح کو جگاتے ہیں" "جو نکلتے ہی الخ" بھلا جب نیند آتی ہی نہیں اور شب کو سوتے ہی نہیں تو مرغ جگاتے کیونکر ہیں؟ اور ایک "شب بیدار" کا خواب سے چونکنا کیا معنی رکھتا ہے؟

۲- ایک نظم کی ابتدا یوں کی ہے:-

اے نرگس جاناں یہ فتنہ کس کے لئے ہے؟　　یہ شعلہ، یہ بجلی، یہ شرر کس کے لئے ہے؟

جس میں چشم محبوب کے شعلہ، بجلی، شرر ریز ہونے کو جیتے ہوئے ایک نہایت ہی خوفناک اور مہیب شے ثابت کیا ہے لیکن پھر لکھتے ہیں:-

اے دیدۂ مے پرور و اے نرگس مخمور　　چھلکا ہوا یہ ساغر نرگس کے لئے ہے

یہاں نہایت مناسب اعتراض یہ ہو سکتا ہے کہ اس سے قبل تو شعلہ، بجلی اور شرر سب ہی کچھ محبوب کی نگاہ سے ٹپک رہے تھے لیکن یکایک وہی نگاہ "مے پرور" اور "مخمور" کیسے ہو گئی۔

۳- ایک نظم کا مطلع ہے:-

ہنوز عشق و محبت کی شان باقی ہے　　وہی زمین وہی آسمان باقی ہے

جس سے مستنبط ہوتا ہے کہ عشق و محبت کی گذشتہ کیفیات میں کوئی تغیر و تبدل نہیں ہوا ہے۔ لیکن بعد میں تحریر فرماتے ہیں:-

جفا کا اب نہیں اگلا سا بانکپن قایم　　مگر وفا کی وہی آن بان باقی ہے

وہ جوشؔ چھوڑ چکے ناوک افگنی پھر بھی　　چمکتا تیر، لچکتی کمان باقی ہے

بالفاظ دیگر، محبوب نے اپنا گذشتہ رویہ بالکل تبدیل کر دیا ہے۔ اس سے پیشتر وہ جفائے شدید کیا کرتا تھا (جو غالباً عاشق کے لئے لذت بخش تھی) لیکن اب اس نے اس روش سے قطعاً کنارہ کشی اختیار کر لی ہے۔ ذرا ان اشعار کو مطلع مذکور (ہنوز عشق الخ) سے منطبق کیجئے اور ملاحظہ کیجئے کہ معانی میں کس قدر زبردست تناقص ہے۔ وہاں لکھا ہے کہ حالات بدستور ہیں لیکن ان اشعار سے ظاہر ہوتا ہے کہ محبوب نے اپنا گذشتہ رویہ بالکل تبدیل کر دیا ہے۔ مگر اس سے بھی زیادہ دلچسپ شعر یہ ہے۔

وہاں جفا ہی جفا رہ گئی ہے مدت سے　　یہاں جفا پہ وفا کا گمان باقی ہے

اعتراض یہ ہے کہ ابھی تو فرما چکے ہیں کہ "جفا کا اب نہیں اگلا سا بانکپن قایم" اور محبوب نے ناوک افگنی چھوڑ دی ہے یعنی ظلم نہیں کرتا لیکن اب کہتے ہیں کہ "وہاں جفا ہی جفا رہ گئی ہے مدت سے"۔ کیا یہ تعجب خیز تضاد نہیں ہے؟

اب ہم ان متناقص بیانات کی جانب اشارہ کریں گے جو ایک ہی نظم میں تو نہیں لیکن مختلف مقامات پر پائے جاتے ہیں حقیقتاً یہ بھی اسی قدر قبیح ہے۔ جو شاعر ایک مستقل پیام کا مدعی ہو اس کو لازم ہے کہ جس جگہ کوئی بات کہے اپنا اصول مدنظر رکھے ورنہ شاعری کے مخالفین کہ اٹھیں گے کہ "دروغ گو را حافظہ نباشد"۔ بہرحال وہ متضاد اور غیر مربوط بیانات یہ ہیں:-

۱- مومنانِ لکھنؤ سے خطاب فرماتے ہیں:-

منبرِ سبطِ نبی پر اور سیاسی شور و شین … مجھ سے آنکھیں تو ملاؤ سوگوارانِ حسین

یعنی مجالس عزا میں سیاسی مسائل پر مباحثہ و مناظرہ کرنا جوش کے زاویۂ نگاہ کے مطابق مکروہ اور قبیح ہے لیکن جوش کا ایک سلام ہے (جو یقیناً مجالس عزا میں پڑھنے کے لئے ہی لکھا جاتا ہے) اس میں فرماتے ہیں:-

بستۂ زنجیر محکومی خبر بھی ہے تجھے … مہر و مہ پر تجھ کو عزم حکمرانی چاہئے

کوئی پوچھے کہ یہ سب "سیاسی شور و شین" نہیں تو اور کیا ہے؟

۲- ایک جگہ عاشقانہ وقار و خودداری کی تصویر یوں پیش کی ہے:-

میرے جلسے سے اُٹھ آنے پر خفا ہو ہمنشیں … شاعروں کی فطرتِ عالی سے تو واقف نہیں؟

دل ہمارا جذبۂ غیرت کو کھو سکتا نہیں، … ہم کسی کے سامنے جھک جائیں ہو سکتا نہیں

اہلِ دنیا کیا ہیں اور اُن کا اثر کیا چیز ہے؟

ہم خدا سے ناز کرتے ہیں بشر کیا چیز ہے؟

اسی طرح ایک دوسری جگہ لکھتا ہے:-

کیا دیکھتا ہے زہد کے کوچے میں رعب شیخ … کوئے مغاں میں جوش کا عز و وقار دیکھ!

پڑھنے والا اس "فطرتِ عالی" اور "عز و وقار" سے بیحد مرعوب ہو جاتا ہے کہ "دل ہمارا جذبۂ غیرت کو کھو سکتا نہیں" لیکن بعض دوسرے مقامات پر اس "فطرتِ عالی" کا مظاہرہ اس طرح کیا گیا ہے (خط کشیدہ جملے قابلِ لحاظ ہیں):-

مزاج پوچھ کے اے شاہِ عارض و کاکل … گدائے راہ کی بھی آبرو بڑھاتا جا

اگر یہ لطف گوارا نہیں، تو مستِ خرام … جبینِ جوش پہ ٹھوکر ہی اک لگاتا جا

پھر آرزوئے شرکتِ بزمِ جمال ہے … پھر اہتمامِ خدمتِ درباں ہے آجکل

بعض دیگر معنوی غلطیاں ملاحظہ فرمائیے:-

دیکھ کیونکر جی رہا ہوں دلربا تیرے لئے! … ہر نفس ہے اک حدیثِ کربلا تیرے لئے

ڈھونڈتا پھرتا ہوں میں اپنے کو تیری راہ میں … پوچھتا پھرتا ہوں میں اپنا پتا تیرے لئے

جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انتہائی کرب و اضطراب کا عالم ہے اور ساتھ ہی ساتھ مدہوشی، بدحواسی اور خود فراموشی کی یہ کیفیت ہے کہ اپنا پتہ معلوم نہیں۔ لیکن پھر فرماتے ہیں:-

آہ، گو اک عمر سے ہوں میں رئیس ابنِ رئیس … بن کے نکلا ہوں گدائے بے نوا تیرے لئے

چاک کر کے میں نے آبائی امارت کا لباس … زیبِ تن کی ہے غلامی کی قبا تیرے لئے

یہاں نہایت ہی برمحل اور معقول اعتراض یہ ہو سکتا ہے کہ ایک عاشق جو بحد مضطرب اور بےچین ہے اور جس کی مدہوشی اور خود فراموشی کا یہ عالم ہے کہ اپنا پتہ بھی دوسروں سے پوچھتا پھرتا ہے اس کے متعلق یہ کہنا قطعاً خلافِ واقعیت ہے کہ وہ دعویٰ کرتا ہوگا کہ "میں رئیس ابن رئیس ہوں" اور "میری آبائی امارت جنیں اور چناں تھی" ہر وہ شخص جو نفسیات انسانی سے واقفیت رکھتا ہے دل میں فیصلہ کرسکتا ہے کہ یہ سب کس حد تک سہے !! مولانا جامی نے صحیح کہا ہے :۔

بندۂ عشق شدی، ترکِ نسب کن جامی کیں دریں راہ فلاں ابن فلاں چیزے نیست!

بعض مقامات پر بیان نہایت غیر مربوط ہے مثلاً :۔

(۱) اے نرگسِ جاناں یہ نظر کس کے لئے ہے؟ یہ شعلہ۔ یہ بجلی، یہ شرر کس کے لئے ہے؟

اے زہرہ جبینوں کے لئے پیک ہزیمت پیغامبرِ فتح و ظفر کس کے لئے ہے

اے تجھ کو ملے عمر مری شام بلا کی یہ زلف رسا تا بہ کمر کس کے لئے ہے

شروع میں ظاہر ہوتا ہے کہ نرگس جاناں (یعنی چشم محبوب) سے خطاب کیا جارہا ہے۔ لیکن تیسرا شعر بھی ملاحظہ فرمایئے کہ (اے تجھ کو ملے عمر الخ) اور غور فرمایئے کہ چشم محبوب کو یہ دعا دینا کس حد تک مناسب ہے۔ در اصل اس مصرع کا مخاطب خود محبوب ہے لیکن اس تبدیلی تخاطب کی تصریح لازمی تھی جو یہاں نہیں کی گئی ہے۔ یہ خامی جوش کی متعدد نظموں میں پائی جاتی ہے:۔

(۲) کیونکر نہ کروں شکر خدائے دوجہاں کا بخشا ہے مرے دل کو مزہ سوز نہاں کا

یکساں ہے مسرت کا محل ہو کہ فغاں کا ہونارِ جہنم بھی تو لطف آئے جناں کا

ہوتی ہے خوشی صحت و آزار سے مجھ کو

خلعت یہ ملا ہے تری سرکار سے مجھ کو (آوازۂ حق)

ابتدا میں خدائے دوجہاں صیغۂ واحد غائب میں ہے لیکن پھر تیسرے مصرع میں "تیری سرکار" سے کیا مراد ہے۔ اگر یہ بھی خدا سے خطاب ہے تو وہی متذکرۂ بالا عیب یہاں بھی موجود ہے یعنی تبدیلی تخاطب کی ہے لیکن اس کی تصریح نہیں کی گئی۔

(۳) "مقتل کا نپور" اے سیہ رو، بے حیا، وحشی، کمینے بدگماں اے جبینِ ارض کے داغ، اے دنی ہندوستاں

تجھ کو عورت نے جنا ہے؟ جھوٹ ہے یہ اے لعیں! آدمی کی نسل سے اور تو، نہیں ہرگز نہیں!

یہاں مخاطب ہندوستان ہے مگر ہندوستان کو "عورت نے جنا ہے اور "آدمی کی نسل سے تو نہیں" کہاں تک موافق عقل ہے؟ ہندوستان ایک ملک کا نام ہے۔ اس کا نسل آدم سے ہونا یا نہ ہونا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ مزید براں لفظ "جنا" نہایت عامیانہ لفظ ہے فصحا کی زبان پر رائج نہیں اور سب سے زیادہ دلچسپ تو یہ مسئلہ ہے کہ ہندوستان کو عورت نے جنا ہے یا نہیں!

تکرار و بے ترتیبی بیان | شاعر کا کمال یہ ہے کہ جس شے کا تذکرہ کرے اس کا نقشہ اس طرح پیش کرے کہ آنکھوں

کے سامنے اس کی تصویر من وعن کھنچ جائے۔ تبئین کلام میں اس کا بھی لحاظ رکھنا چاہئے کہ جو شے نسبتاً زیادہ اہم اور مرجح ہے اس پر خاص زور ڈالا جائے اور غیر ضروری اور لایعنی امور کو نظر انداز کر دیا جائے۔ اسی طرح تقدم اور تاخر کا بھی لحاظ کرنا ضروری ہے، یعنی اول ضروری اور لازمی اشیاء کا ذکر کر دیا جائے بعدۂ غیر ضروری اور فرعی کا، ساتھ ہی ساتھ اس امر کا بھی خیال رکھنا ازبس لازمی ہے کہ مضامین کا اعادہ و تکرار نہ ہونے پائے۔ جوش کے یہاں بعض نظموں میں یہ باتیں مفقود نظر آتی ہیں۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی شخص فنِ تبئین سے ناواقف ہے اور جو شے پیش نظر ہے اس کو نہایت بے ترتیبی کے ساتھ بیان کر رہا ہے۔ مثلاً جوش نے "مولوی" کا حلیہ ان الفاظ میں پیش کیا ہے:۔

۱۔	ہوئی اک مولوی سے کل ملاقات	شبیہ قبہ و تصویر منبر
۲۔	وہی ہوں گے جو فردوسِ بریں میں	خدا کے فضل سے حوروں کے شوہر
۳۔	عمامہ برسر و مسواک در جیب	اُٹنگا پائجامہ۔ دلق دربر
۴۔	حنا سے ریش سرخ، آنکھوں میں سرمہ	لٹیں مہکی ہوئیں، زلفیں معطر
۵۔	جھکے شانے پہ چوخانے کا رومال	عبا کے بند میں تسبیح احمر
۶۔	کشادہ صدر اور کوتاہ گردن	شکم پر رعب، قد رشکِ صنوبر
۷۔	لٹیں مہکی ہوئیں، آنکھوں پہ عینک	لبیں ترشی ہوئیں، داڑھی شکم پر
۸۔	عبا عناب گوں داڑھی عمامہ	گلوری منہ میں، لب خونِ کبوتر

یہاں مولوی سے ملاقات کا تذکرہ تو مقصود نہیں۔ محض اس پر تضحیک و استہزا کرنا اور اس کا استخفاف منظور ہے۔ اسی غرض سے اُس کا "حلیۂ عجیب" بیان کیا ہے لیکن ایک نظرِ غائر ڈالنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ بیان میں جابجا بے ترتیبی اور تکرار عیاں ہے۔

سب سے پیشتر آپ "مولوی" کی شکل و شباہت پر غور فرمائیے۔ اس پر نظر پڑتے ہی جوش صاحب کے ذہن میں ایک تشبیہ آئی کہ اس مولوی کا تن و توش قبہ و منبر سے متشابہ ہے۔ اس تشبیہ کا بہترین استعمال یہ ہوتا کہ جب مولوی کا حلیہ بیان کر لیتے تو تاثیرِ کلام کے لئے اس تشبیہ کا بھی اضافہ کر دیتے لیکن جوش صاحب نے سب سے پہلے اس تشبیہ ہی کو نظم کیا ہے جو فنی اعتبار سے بالکل بے محل ہے

پھر اس کی ہیئت کی جو تصویر پیش کی ہے اس میں بھی بعض جگہ بالکل لایعنی امور معرض بحث میں آگئے ہیں جو فنِ تبئین کے خلاف ہے۔ مولوی کے جسم و صورت پر بحث کی جا رہی ہے۔ اس ضمن میں یہ کہنا کہ

وہی ہوں گے جو فردوسِ بریں میں خدا کے فضل سے حوروں کے شوہر

مولوی کے خلاف نفرت و استکراہ اور خشونتِ انتقام کے جذبہ کا البتہ مظہر ہے۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ صرف یہ معلوم

ہوتا ہے کہ شاعر کو اس مولوی سے کوئی خاص عناد ہے اور معاندانہ چشمک کی بنا پر اس کی تذلیل کے درپے ہے۔ وگرنہ اصل مقصد (یعنی مولوی کی شکل و شباہت کی مرقع کشی) سے اس شعر کو کوئی لگاؤ نہیں

اس کے بعد مولوی کا حلیہ بیان کرنا شروع کرتے ہیں۔ اس کے "فرقِ راس" کے ذکر سے ابتدا کی جاتی ہے اور کہتے ہیں کہ اس کے سر پہ عمامہ تھا۔ اس کے بعد لازم تھا کہ اس کے چہرے وغیرہ کا ذکر کیا جاتا لیکن فوراً ہی "مسواک اور جیب" کہ کر قارئین کی توجہ جیب کی طرف منعطف کر دی جاتی ہے۔ جیب کے بعد پائجامہ کا تذکرہ فرماتے ہیں۔ ۔۔۔ الانتظار ہے کہ اب جوتے وغیرہ کا ذکر کیا جائے گا۔ لیکن یکایک " بہمہ ادائے بے ترتیبی" مولوی صاحب موصوف کی دلق پوشی پر بحث چھڑ جاتی ہے۔ اصولاً ریش و چشم کا ذکر عمامہ کے بعد فوراً ہی ہو جانا چاہئے تھا جہاں مسواک جیسی لایعنی شے کا بالکل بے محل ذکر کر دیا گیا ہے۔ بہرحال اب شکل و شباہت کی خصوصیات بیان کرتے ہیں کہ سرخ داڑھی، آنکھوں میں سرمہ، معطر گیسو کاندھے پر رومال، چوڑا چکلا سینہ، کوتاہ گردن، آونڈیلا پیٹ وغیرہ وغیرہ

غالباً قارئین سمجھے ہوں گے کہ چہرہ کی خصوصیات بیان کی جا چکیں کیونکہ اب رومال، عبا، تسبیح وغیرہ کا ذکر شروع ہو گیا ہے۔ لیکن نہیں، چشم و گیسو جن پر شعر نمبر ۲ میں "نگاہ مسودانہ" ڈالی جا چکی تھی پھر دوبارہ ۔۔۔ معلوم ہوتے ہیں۔ یعنی کلام کے دوران میں شعر نمبر ۷ و نمبر ۸ میں "اگزیر" ہوتے ہیں۔ اگر گیسوؤں کی مہک کے ساتھ ہی ساتھ ان کی "پریشانی" کا بھی ذکر ہو جاتا اور جہاں داڑھی کے "احمریں" ہونے کا ذکر کیا گیا ہے وہیں اس کا شکم پر رعب پر دراز ہونا بھی بیان کر دیتے تو ایک گونہ تسلسل اور ترتیب ظاہر ہوتی۔ بصورت موجودہ معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کو ترتیب بیان اور تسلسل کا مطلق لحاظ نہیں۔

بعینہ اسی طرح عبا، عمامہ اور لبوں کا ذکر شعر نمبر ۳ و نمبر ۵ میں کیا جا چکا ہے جہاں ان اشیاء کی بعض خصوصیات پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ اب شعر نمبر ۷ و نمبر ۸ میں مکرر ان کا تذکرہ کرتے ہیں۔ اس قسم کی بے ترتیبی نہ صرف خلافِ فصاحت ہے بلکہ پڑھنے والے کی کوفت کا باعث ہوتی ہے

شاعرانہ مصوری کا ایک اہم نکتہ یہ ہے کہ جہاں کسی شے کا ذکر کیا جائے تو اس کے ساتھ ہی ساتھ اس کی مابہ الامتیاز خصوصیات کا بھی ذکر کر دیا جاتا ہے تاکہ وہ تصویر مکمل متصور کی جائے۔ جوش کے یہاں بعض جگہ اس خوبی کا بھی فقدان ہے مثلاً عبا کا ذکر شعر نمبر ۳ میں کیا ہے۔ لیکن اس کے بندھن جو جیب آویزاں تھی اس کا شعر نمبر ۵ ہی میں تذکرہ کیا جا چکا۔ گویا ابھی یہ بتایا نہیں کہ وہ عبا اس وضع و قماش کی تھی لیکن اس کے لوازمات میں سے ایک شے کا پیشتر ہی ذکر کر دیا۔ یونہی شعر نمبر ۲ میں لبوں کی کیفیت بیان کی ہے لیکن ریش دراز، عبا اور عمامہ کا بیان کرنے کے بعد لکھا ہے کہ لب خونِ کبوتر کی مانند سُرخ بھی تھے۔ اس افتراقِ بیان سے بجز بے ترتیبی کے اور کچھ تو حاصل نہیں ہوا۔ یہ عیب جوش کی موجودہ نظموں میں علی الخصوص پایا جاتا ہے

بھونڈی تشبیہات | تشبیہ کا حسن اور اس کی لطافت اس نکتہ میں مضمر ہے کہ مشبہ بہ اس قدر نفیس منتخب کیا جائے

جس کے باعث شئے مشبہ لطیف تر ہو جائے اور دنیا کی نگاہ میں اس کا حسن دوبالا ہو جائے۔ جوش کے یہاں بعض جگہ اس نکتہ کو نہیں ملحوظ رکھا گیا ہے۔ اور بعض تشبیہات نہایت غیر شاعرانہ اور بھونڈی ہیں۔ مثلاً:-

نرم ہو جاتا ہے ٹلپٹس سے جو پک کر پھوڑا ۔۔۔ جنبش نشتر جراحت سے ہوتا ہے فگار

فرش گل کی یونہی ہو جاتی ہے خو گر جو قوم ۔۔۔ ہونا پڑتا ہے اسے خار مغیلاں سے دوچار

پھاڑتے ہی جیسے میلا چیتھڑا اڑتی ہے گرد ۔۔۔ یونہی وہ دو شخص جو اک دوسرے سے ہیں خفا

گفتگو کرتے ہیں جب آپس میں از راہ اتفاق ۔۔۔ دیکھتا ہوں ان کے منہ سے غبار اٹھتا ہوا

صبح کے ہنگام جیسے مدرسے کی گھنٹیاں ۔۔۔ طفل کے ذوق شکر خوابی کو کرتی ہیں نڈھال

یونہی بے تاب ناتواں بچوں کے مفلس باپ کی ۔۔۔ نیند اڑا دیتا ہے اسے خواب اجل یعنی خیال

اس طرح تیرگی میں ہوتا ہے ۔۔۔ خوف کا قلب طفل میں آغاز

جس طرح رات کی خموشی میں ۔۔۔ سائیکل کی [illegible] آواز

موٹر

جیسے موٹر کی گریزاں روشنی سے راہ میں ۔۔۔ نصف لمحے کے لئے ظلمت پہ چھا جاتا ہے نور

سرمدی آلام کے مارے ہوئے انسان کو ۔۔۔ یونہی جیسے ملتی ہے دم بھر کے لئے موج سرور

غبار اک دوسرے پر پھینکتے ہیں تیز رو موٹر ۔۔۔ مخالف سمت سے تند و تیز ہو کر جب گزرتے ہیں

یونہی دو بدگہر اشخاص، جب آپس میں ملتے ہیں ۔۔۔ تو تاریکیاں اک دوسرے سے اخذ کرتے ہیں

شاد و فرحاں ہیں نئے احباب تیرے لطف سے ۔۔۔ سرد مہری سے قدیم احباب کا رخ زرد ہے

یہ تری صورت ہے ایسے تیز رو موٹر کی طرح ۔۔۔ جس کے آگے روشنی ہے اور پیچھے گرد ہے

وقت شب کچھ اور بھی تاریک کر جاتا ہے یوں ۔۔۔ اپنی چمکائی ہوئی ظلمت کو موٹر کا غبار

جس طرح کاندھے پہ رکھ کر ہاتھ دم بھر کو خوشی ۔۔۔ دوش پر غم کا نیا اک اور رکھ جاتی ہے بار

شب کو اک پرسکون محفل کا ۔۔۔ آ کے موٹر مٹا گیا یوں ناز

جس طرح آئے وقت بادہ کشی ۔۔۔ کان میں مے فروش کی آواز

نسائیت

فصاحت کا خاص عنصر یہ ہے کہ مرد و زن، طفل و جوان، شیخ و شاب ہر ایک کی گفتگو ان کی حیثیت کے مطابق نظم کی جائے تاکہ واقعیت مترشح ہو۔ جوش نے بعض جگہ اس امر کا بھی لحاظ نہیں رکھا ہے۔ اور مرد کی گفتگو نظم کرتے ہوئے نسوانی الفاظ و محاورات استعمال کئے ہیں مثلاً:-

۱- تیغ و تبراں اور عورت کا گلا، او بد صفات ۔۔۔ چھوٹ جائیں تیری نبضیں، ٹوٹ جائیں تیرے ہاتھ

۲- مرد ہے تو اس سے لڑ پہلے جو مارے پھر مرے ۔۔۔ تو نے بچوں کو چبا ڈالا۔ خدا غارت کرے (مقتل کانپور)

۳- کھائے جاتا ہے کوئی سینے کو آگ لگ جائے ایسے جینے کو (پہلی مفارقت)

خاتمہ لیکن حقیقت امر یہ ہے کہ اس قسم نے تسامحات سے جوشؔ کے کمالات شاعری میں کچھ زیادہ فرق نہیں پیدا ہوتا اس نوع کے اسقام سے کسی شاعر کا کلام خالی نہیں۔ فردوسی سے بڑھکر کون قادر الکلام ہوگا، متاخرین میں قاآنی کا جواب نہیں لیکن ان دونوں کے کلام میں اس قسم کی بے اعتدالیاں کثرت سے ہیں۔ اردو شاعری میں میر انیس کی مثال پیش کی جا سکتی ہے کہ ان کے مسلمہ کمالات و محاسن کے باوجود، ایک غیر جانبدار نقاد کو ان کا کلام بھی اغلاط سے پاک نہیں نظر آتا۔ یہی حال جوشؔ کا ہے بلکہ اس کے کمالات شاعری بڑی حد تک اس کے اکثر مسامحات کی پردہ پوشی کر لیتے ہیں اور پڑھنے والا ایک خاص استغراق و محویت کی کیفیت محسوس کرنے لگتا ہے اور یہ وہ اختصاص ہے جو جوشؔ کے اکثر معاصرین میں مفقود ہے۔ دوسرے شعرا تقلید کے دائرے سے باہر نہیں نکلتے لیکن جوشؔ کا ایک مختص رنگ ہے اور یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ اس میں وہ ایک حد تک کامیاب ہے:-

مُرغانِ خوش آہنگ اندر باغِ سخن لیکن
نالیدنِ ایں بلبل شورِ دگرے دارد

یوسف رضا بدایونی
(ممتاز ہاؤس - علی گڈھ)

(**نگار**) اس مضمون کی کتابت ہو رہی تھی کہ ڈاک سے ہمیں ایک تحریر موصول ہوئی جس میں یہ نہایت دلدوز خبر درج تھی کہ نوجوان مقالہ نگار دفعۃً ۲۸ ستمبر کو ریل سے کٹ کر مر گئے

مرحوم مسلم یونیورسٹی کے نہایت ہونہار طالب علم تھے اور حال ہی میں انھوں نے نہایت اعزاز کے ساتھ وہاں سے بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی تھی ـــ مرحوم کی والدہ پر اس حادثہ سے قبل ہی غم و الم کی خاص کیفیت طاری تھی اور جس وقت تار پہونچا تو وہ مبہوت ہو کر رہ گئیں۔ یقیناً کوئی اس غم کا اندازہ نہیں کر سکتا جو ماں کو اپنے جوان بیٹے کی ایسی اچانک موت کی وجہ سے پہونچا چاہئے اور اس پر جتنا اظہار افسوس کیا جائے کم ہے، لیکن اس کا کیا علاج کہ فطرت جس کے پنجے اور دانت ہمیشہ خون سے رنگین رہتے ہیں، سخت بے رحم ہے، اور اس کا مقابلہ پتھر کا کلیجہ بنانے ہی سے ہو سکتا ہے

مرحوم کا یہ غالباً پہلا انتقادی مقالہ ہے جو نگار میں شایع ہوا ہے اور اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نوجوان ادیب میں ترقی کے کتنے امکانات پوشیدہ تھے جو افسوس ہے کہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو گئے۔ ہمیں مرحوم کے اعزہ و پسماندگان اور خصوصیت کے ساتھ ان کی سوگوار ماں کے ساتھ دلی ہمدردی ہے لیکن سوائے اس کے کہ صبر و ضبط کی لاحاصل تلقین کریں اور کیا کر سکتے ہیں ـــ

"چالیس" کی اہمیت مذاہب عالم میں

"چالیس (۴۰) کے ہندسے کو تمام اقوام و مذاہب میں خاص اہمیت حاصل ہے، چنانچہ مرنے کے بعد چہلم کی رسم، ریاضت و عبادت میں چلہ کشی (یعنی چالیس دن کا اعتکاف)، رسول اللہ کا چالیس سال کی عمر میں مبعوث ہونا، سورۂ احقاف میں اربعین (۴۰ سال) کا ذکر، ایام نفاس کے لئے ۴۰ دن کی تعیین، یہ وہ تمام باتیں ہیں جن سے ہر مسلمان واقف ہے
اسی طرح یہودیوں کے مذہبی لٹریچر کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل ۴۰ سال تک خانماں برباد پھرا کئے ایلیا نبی کو ۴۰ سال تک کووں نے غذا پہونچائی، جس بارش سے طوفان نوح پیدا ہوا وہ بھی چالیس دن تک قایم رہی۔ مصر قدیم میں بھی لاش کی مومیائی کے لئے ۴۰ دن کی مدت مقرر تھی اور انگلستان کے عہد وسطیٰ میں بھی قتل انسان کے جرمانہ کی ادائی کے لئے ۴۰ دن کی میعاد مقرر تھی، جنگ کے دوران میں فریقین کو آرام لینے کے لئے ۴۰ ہی دن کا وقت ملتا تھا اور دارالعلوم کے التوا کے بعد ممبران پالیمنٹ کو جو مہلت ملتی تھی وہ بھی ۴۰ دن کی ہوتی تھی لیکن ایسا کیوں ہے، دنیا کے تمام اقوام میں ۴۰ کو یہ اہمیت کیوں حاصل ہے اور یہ واقعہ ہماری تحقیق کو ہمیں کس نتیجہ پر پہونچاتا ہے۔ اس پر اسوقت تک کسی نے توجہ نہیں کی۔

یہ تھا وہ معمہ جواب سے تقریباً تیس سال قبل مسٹر ام۔ اس اڈورڈس نے انجمن علم الانسان کے جلسہ میں پیش کیا تھا اور اب مسٹر پری ہونے کامل تحقیق و تفتیش کے بعد ایک مقالہ کے ذریعہ سے اس پر روشنی ڈالی ہے
اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ۴۰ کی اہمیت مسلمانوں اور یہودیوں کی طرح زردشتیوں، ہندوؤں اور عیسائیوں میں بھی پائی جاتی ہے اور یقیناً یہ ثبوت ہے اس امر کا کہ مشرق و مغرب کی اقوام کا استھان کسی وقت ایک ہی تھا اور یہی سبب ہے کہ بعض روایتیں اور قصے کہانیاں ان سب میں مشترک پائی جاتی ہیں

سب سے پہلے آپ توریت کو دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ:۔ طوفان نوح لانے والی بارش ۴۰ دن تک جاری رہی۔ طوفان کے ۴۰ دن کے بعد پہاڑ کی چوٹی نظر آئی — یعقوب کی لاش میں مسالہ لگانے کے لئے ۴۰ دن درکار ہوئے۔ موسیٰ ۴۰ دن تک کوہ حوریب پر بھوکے پیاسے پھرتے رہے — موسیٰ نے چالیس چالیس دن کے دو روزے رکھے۔ ایلیا نبی Elizah چالیس دن تک بے آب و دانہ رہے — یہودا کے ۴۰ سالہ گناہ کی یاد میں ۴۰ دن تک

داہنی کروٹ سے لیٹے رہے ۔ Goliath نے اسرائیل نوجوں کا ۴۰ دن مقابلہ کیا ۔ نینوا کو توبہ کے لئے ۴۰ دن دئے گئے ۔ لڑکا پیدا ہونے کے بعد ۴۰ دن اور لڑکی پیدا ہونے کے بعد ۸۰ دن نفاس کے مقرر کئے گئے ۔
کی عمر ۴۰ سال کی تھی جب وہ بطور جاسوس کے روانہ کئے گئے ۔ بنی اسرائیل ۴۰ سال تک جنگلوں میں پھرتے رہے ۔ بنی اسرائیل کو اہل فلسطین نے ۴۰ سال تک پریشان رکھا ۔ سلیمان، داؤد اور Joash نے ۴۰ سال تک حکومت کی ۔ یعقوب نے Esau کو ۴۰ گائیں تحفہ میں بھیجیں ۔ اسی طرح کے اور بہت سے واقعات توریت میں ایسے درج ہیں جن سے ۴۰ کے عدد کی اہمیت ظاہر ہوتی ہے ۔ زردشت نے ۴۰ سال کے بعد تبلیغ شروع کی ۔ ۴۰ دن تک مسلسل اہور امزد اسپنت سمار کا ورد پارسیوں کے نزدیک بہت مفید خیال کیا جاتا ہے ۔ سال کے ۳۶۰ ایام کو ۹ حصوں میں تقسیم کرتے ہیں، اور مذہبی رہنما کو یہ خدمت قبول کرنے سے بھی ۴۰ دن ریاضت کرنا پڑتی ہے
ہندوؤں کے یہاں بھی عورت کے ایام نفاس کے لئے ۴۰ دن مقرر ہیں ۔ سندھ کے ہندؤں میں رواج ہے کہ بچے کی نال نکال کر اسے ۴۰ دن تک اس کے سرہانے رکھتے ہیں ۔ ویدک طریق علاج میں کایا پلٹ کے لئے ۴۰ دن درکار ہوتے ہیں
بدھ کے چالیسویں دن شیطان سے اندر کی ملاقات ہوئی ۔ عیسوی روایات میں بھی ۴۰ کا ذکر بکثرت نظر آتا ہے ۔ مسیح کی ولادت کے ۴۰ دن بعد مریم نے مسیح کو معبد میں پیش کیا ۔ مسیح نے چالیس دن کا روزہ رکھا ۔ سولی چڑھائے جانے کے بعد مسیح ۴۰ گھنٹے قبر میں پڑے رہے ۔ احیاء ثانی کے بعد وہ ۴۰ دن تک اسی زمین پر رہے اور پھر اس کے بعد آسمان پر لیجائے گئے ۔ شعراء قدیم کے کلام میں بھی ۴۰ کا وجود پایا جاتا ہے اور شیکسپیر کے ڈراموں میں بھی ۔
ان تمام روایات سے یہ بات تو یقینی طور پر ثابت ہوتی ہے کہ تمام اقوام عالم کسی زمانہ میں ایک ہی جماعت سے تعلق رکھتی تھیں جو منتشر ہو کر مشرق و مغرب میں پھیل گئی اور بعض روایات بھی اپنے ساتھ لے گئی ۔ لیکن اب سوال یہ ہے کہ کب اور کس حصۂ زمین سے اس جماعت کے افراد ادھر ادھر منتقل ہوئے اور چالیس کے عدد کو ان کی روایات میں کیوں اتنی اہمیت حاصل ہے ۔ انسان سب سے اول کرۂ زمین کے کس حصہ میں رونما ہوا، اس کے متعلق مختلف نظریئے پائے جاتے ہیں اور منجملہ ان کے تلک کا نظریہ یہ ہے کہ عہد قبل تاریخ میں انسان کا سب سے پہلا مسکن وہ تھا جسے اب منطقۂ باردہ یا قطبین کے پاس کا حصۂ زمین کہتے ہیں ۔ ہرچند یہ نظریہ بظاہر اس لئے غلط معلوم ہوتا ہے کہ قطبین کے منجمد حصہ میں انسان کیونکر پایا جاتا ہوگا لیکن منطقۂ باردہ کے متعلق جو طبقاتی (jeological) جوی (meteorological) اور علمی تحقیق گزشتہ ۳۰ سال کے اندر ہوئی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسٹر تلک کا یہ نظریہ غلط نہیں ہے ۔
اس منطقہ کے متعلق یہ معلوم ہو چکا ہے کہ اس کا برفانی یا انجمادی دور کوئی مستقل چیز نہیں تھا، ایک زمانہ انجماد کا آتا تھا اور ختم ہو جاتا تھا اس لئے غور طلب امر یہ ہے کہ اس کا آخری انجماد کب ختم ہوا
علماء طبقات الارض کا بیان ہے کہ سب سے آخری انجماد ۴۰ ہزار اور ۲۰ ہزار سال قبل مسیح کے درمیان پایا

جاتا تھا لیکن اس زمانہ کے دوران میں بھی صدیاں ایسی گزر جاتی تھیں کہ موسم گرم ہو جاتا تھا اور منطقۂ باردہ آبادی کا اہل بن جاتا تھا ۔۔ علاوہ اس کے سب سے بڑا ثبوت سرزمین قطبین کے کسی وقت گرم ہونے کا یہ ہے کہ وہاں لوہے اور کوئلے کی بڑی زبردست معدنیں دریافت ہوئی ہیں۔ حال ہی میں روس کے چار علماء اس منطقہ کی تحقیق کے لئے روانہ ہوئے اور وہاں پہونچکر انھوں نے یہ لاسلکی پیام بھیجا کہ قطب شمالی برف سے بالکل خالی نظر آتا ہے اور ہم سردی کے لئے ترس رہے ہیں" تو دنیا حیرت زدہ ہو کر رہ گئی ۔۔ الغرض یہ امر پایۂ تحقیق کو پہونچ چکا ہے کہ منطقۂ باردہ ہمیشہ برفستانی نہیں رہا ہے اور اس پر گرمی کے دور بارہا گزر چکے ہیں۔ اسی کے ساتھ علماء حال کی تحقیق یہ بھی ہے کہ انڈو آرین اقوام کا اصلی وطن یہی سرزمین قطب تھی اور بعد کو برفانی دور آنے کی وجہ سے وہ ادھر ادھر منتقل ہوئیں۔ بہرحال یہ تسلیم کر لینا ضروری ہے کہ انسانی آبادی کا ظہور سب سے پہلے قطبین ہی کی سرزمین میں ہوا ہے۔ لیکن اس کا تعلق ۴۰ کے عدد سے کیا ہے؟ اب اس کو بھی سن لیجئے۔

اس سے غالباً ہر شخص واقف ہوگا کہ طلوع و غروب کی جو صورت گرم ممالک میں پائی جاتی ہے وہ منطقۂ باردہ سے بالکل مختلف ہے۔ ۸۶ خط عرض البلایہ (جو قطبین کے نیچے سے گزرتا ہے) شب و روز کے ظہور کی یہ کیفیت ہے کہ وہاں ۲۴ دن تک (یہاں دن سے مراد ۲۴ گھنٹے کا زمانہ ہے) تو بالکل تاریکی رہتی ہے، اس کے بعد تقریباً ۲۴ دن تک صبح صادق کی سی کیفیت رہتی ہے اور پچیسویں دن آفتاب کا ایک گوشہ نظر آتا ہے اور چند منٹ کے بعد غائب ہو جاتا ہے (یہی پچیسواں دن ان کے نوروز کا سمجھنا چاہئے) اس کے بعد پندرہ دن تک آفتاب تدریجاً زیادہ بلند ہو ہو کر غائب ہوتا رہتا ہے یہاں تک کہ سولھویں دن پورے ۲۴ گھنٹے تک روشنی دیتا ہے، اس کے بعد روشنی کا عرصہ کم ہوتے ہوتے سولھویں دن پھر تاریکی ہو جاتی ہے۔ لیکن جب آفتاب ایکبار پوری طرح نکل آتا ہے تو پھر وہ تقریباً ۶ مہینے تک غروب نہیں ہوتا اور سروں پر چکر لگایا کرتا ہے۔ اس ۶ ماہ کے طویل دن کے بعد سولہ دن تک وہ زمانہ رہتا ہے جب آفتاب کبھی غروب ہو جاتا ہے اور کبھی نکل آتا ہے، اس کے بعد ۲۴ دن بالکل اسی طرح گزرتے ہیں جیسے شفق پھولی ہو اور پھر ۲۴ دن باری باری طلوع آفتاب اور طلوع شفق کے گزرتے ہیں یہاں تک کہ آفتاب بالکل غائب ہو جاتا ہے اور ۶۵ دن کی طویل رات شروع ہو جاتی ہے ۔۔ ظاہر ہے کہ جس حصۂ زمین میں اتنی طویل رات ہوتی ہو وہاں طلوع آفتاب کا کس بے صبری سے انتظار کیا جاتا ہوگا اور کیا کیا خوشیاں رات کے ختم ہونے پر نہ منائی جاتی ہوں گی ۔ جنھوں نے قدیم اقوام کی تہذیب کا مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ ان سب میں آفتاب پرستی پائی جاتی تھی اور اڈونس، اتیس، تموز، مردوک اور اندر سب سورج ہی کے دیوتا کے مختلف نام تھے۔ قدیم یونان و روم میں اتیس کا احیاء ثانی ۲۵ دسمبر کو منایا جاتا تھا اور یہی تاریخ بعد کو عیسائیوں نے مسیح کے احیاء ثانی کے لئے اختیار کی۔ اس ۲۵ کا راز یہی ہے کہ قطبین میں آفتاب (جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے) ۲۴ دن تک ظہور و خفا کے بعد پچیسویں دن پوری طرح طلوع کرتا ہے ۔ چنانچہ قطبین کی قدیم آبادی اسی کو نوروز سمجھتی تھی اور خوشیاں مناتی تھی۔

یہ ہم بیان کر چکے ہیں کہ آفتاب کے اولین طلوع کے بعد جو سولہ دن کے ایاب و ذہاب کے بعد ہوتا تھا پورے ۴۰ دن کے بعد وہ حقیقی دن شروع ہوتا تھا جو ۶۵ دن تک قایم رہتا تھا اور اس لئے گویا پورے ۴۰ دن کے انتظار کے بعد ان کا یوم مسرت شروع ہوتا تھا اور اس طرح چالیس کی اہمیت سب سے پہلے قطبین کی آبادی میں قایم ہوئی ۔ پھر اگر ہم مان لیں کہ انسانی آبادی سب سے پہلے قطبین ہی میں ظاہر ہوئی اور بعد کو وہیں سے چاروں طرف منتشر ہوئی تو آسانی سے یہ مسئلہ حل ہو جاتا ہے کہ تمام مذاہب و اقوام میں ۴۰ کو کیوں اتنی اہمیت حاصل ہے۔

دُنیا کی نہایت ابتدائی کتابیں

ادب فی الحقیقت بنی نوعِ انسان کے لکھنا پڑھنا سیکھنے سے بہت قبل وجود میں آگیا تھا فنون لطیفہ میں رقص سب سے پُرانا ارٹ ہے - عہدِ عتیق کا وحشی انسان اپنے دشمن پر غالب آنے کے بعد جب الاؤ کے گرد پہلی مرتبہ خوشی سے ناچا کودا اور اُس نے اُچھل کود کر شور مچایا تو گویا سب سے پہلا جنگی ترانہ دنیا میں نمودار ہوا - اس کے بعد جیوں جیوں خدا پرستی کا خیال انسانوں میں جڑ پکڑتا گیا، عبادت گزاری کے لئے دعا کا طریقہ نکالا گیا - اس کے بعد محض رفاہ عام کے لئے انسان کو لکھنے کا قاعدہ مقرر کرنا پڑا مگر یہ اُس وقت ہوا جب دنیا کسی قدر متمدن ہو چکی تھی اور طرزِ معاشرت و معیشت ایک اُصول کے ماتحت آتی جا رہی تھی

قدیم ترین تحریریں چٹانوں پر بھدے اور بھونڈے نقوش کی صورت میں تھیں اس کے بعد انسان نے آگ میں پکائی ہوئی خشک مٹی کی ٹکیوں پر لکھنا شروع کیا - "کلدانیہ" میں ان گلی کتابوں کے نمونے حضریات کے سلسلہ میں سرہنری برڈ نے دریافت کئے ہیں - ان میں سے ایک "برٹش میوزیم" میں موجود ہے اور "طوفان نوح" کے باب میں ہے - یہ غالباً دُنیا کی قدیم ترین تحریر ہے جو قریباً چار ہزار سال قبل مسیح لکھی گئی تھی - عبرانیوں نے اسی کلدانی روایت کی بنا پر "طوفانِ نوح" کا قصہ توریت کی "کتاب الخروج" میں درج کیا تھا جہاں سے وہ عیسائیوں اور مسلمانوں کے یہاں رواج پا گیا

کلدانی تحریر "میخی" شکل کی ہوتی تھی اور بائیں طرف سے داہنے جانب کو لکھی جاتی تھی - جنگی کارناموں کے بیانات اور دعاؤں کے علاوہ کلدانی ٹکیوں پر زراعت و فلاحت، نجوم و سیاست پر بھی تحریریں دستیاب ہوئی ہیں - بیان کیا جاتا ہے کہ یہ مٹی کی ٹکیاں جو لیرڈ اور دیگر ماہرین "اشوریات" نے دریافت کی ہیں مشہور قدیم شہر نینوا میں "سناغرب" کے کتبخانہ کا ایک حصہ تھیں - اس کا انتقال ۶۸۱ سال قبل مسیح میں ہوا تھا -

قدامت کے لحاظ سے مصری ادب کا درجہ کلدانی ادب کے بعد ہی ہے - مصری کتابیں "پیپرس"[1] پر لکھی گئیں تھیں - سب سے قدیم مصری کتاب "ملوتی" سب سے بڑے ہرم مصری کی تعمیر کے وقت معرضِ تحریر میں آئی تھی - اس کتاب کی

---

[1] نرکل کی قسم کا درخت ہے - قدیم زمانہ میں اس کی پتیوں پر یا اس کے پتوں سے بنائے ہوئے کاغذ پر لکھنے کا دستور تھا - (اڈیٹر)

ایک کاپی برطانوی عجائب خانہ میں محفوظ ہے اور دیوتاؤں، دیویوں، وظایف و اوراد، دعاؤں اور حیات بعد الموت کے حالات پر مشتمل ہے۔ مصری لوگ اس کی ایک نقل ہمیشہ اپنے مُردے کے ساتھ اُس کی قبر میں رکھ دیتے تھے تاکہ اس کی دوسری زندگی میں اُس کے لئے ایک دستور العمل کا کام دے اور اُس کی روح کو سیدھے راستہ پر چلائے۔ قدیم مصری ادب بیشتر مذہبی تھا لیکن اس کے علاوہ ایک وہ ادب تھا جسے سرکاری یا دفتری کہنا چاہئے اور تیسرا وہ ہر دلعزیز ادب تھا جسکی بنا عوام کی بولی ٹھولی اور قصے کہانیوں پر قایم تھی۔ چند صدیوں کے اندر مصریوں نے مذہب، اخلاق، قانون، علم کلام، ریاضی، پیمائش، طب، سیاحت اور فسانہ نگاری پر عظیم الشان ادب مجتمع کر دیا تھا لیکن افسوس کہ اس میں سے بہت کم محفوظ رہ سکا۔ دوسری مصری کتاب (The Precepts of Ptah Hotep) دنیا کی دوسری قدیم ترین کتاب ہے۔ پٹاہ ہوٹیپ ممفس میں پیدا ہوا تھا اور [illegible] سال ق۔م کے لگ بھگ پایا جاتا تھا۔ یہ کتاب حضرت موسٰی کی پیدایش اور ہندوستانی مقدس صحایف "ویدوں" کی تالیف سے دو ہزار سال قبل لکھی گئی تھی اور ہومر اور حضرت سلیمان کی کہاوتوں سے ڈھائی ہزار سال قدیم تر کہی جاتی ہے۔ حضرت سلیمان اور ہمارے درمیان زمانہ اتنا زیادہ نہیں ہے جتنا کہ پٹاہ ہوٹیپ اور حضرت سلیمان کے درمیان تھا۔ یہ کتاب جو "پیپرس" پر لکھی گئی تھی آجکل پیرس کے قومی عجائب خانے میں محفوظ ہے۔

یوروپی ادب کی پیدایش سے سیکڑوں سال پہلے چین میں کتابیں لکھی جاتی تھیں۔ لیکن وہ شخص جس نے درحقیقت چینی ادب و اخلاقیات کی بنیاد ڈالی مشہور چینی فیلسوف و مصلح کنفوشیس تھا جو حضرت عیسٰی کی پیدایش سے پانچ سو برس پہلے چین میں پایا جاتا تھا۔ قدیم ترین چینی کتابیں بانس کے ریشہ سے بنائی ہوئی تختیوں پر لکھی گئی تھیں۔ الفاظ و حروف یا تو اُن پر پکی روشنائی سے لکھے جاتے تھے یا نوکیلے تیز آہنی قلم سے کندہ کئے جاتے تھے۔ چینی کتابیں ریشم پر لکھی ہوئی بھی پائی گئی ہیں۔ کاغذ کے موجد چینی لوگ ہیں اور چین میں کاغذ سو سال قبل مسیح بننا شروع ہو گیا تھا۔ حضرت مسیح کی پیدائش کے وقت تک چینی لوگ چھپائی کے کام کے ماہر ہو چکے تھے اور اُنھوں نے متعدد اقسام کے ٹائپ بغرض طباعت ایجاد کئے تھے۔ یوروپ میں طباعت کتب کا کام شروع ہونے کے تین سو سال قبل چین میں طباعت کئی ارتقائی مدارج طے کر چکی تھی۔ ابتدائی چینی ادب اخلاقیات پر مبنی تھا۔ دوسری صدی ق۔م کے آغاز میں چینی فغفور شہنشاہ چی ہوانگ ٹی نے حکما تمام کتابیں سوائے اُن کے جو علم طب و فن جراحی اور کاشتکاری سے متعلق تھیں جلوا ڈالی تھیں۔ یہ چین کا نہایت افسوسناک اور زبردست قومی و ادبی نقصان تھا۔ تاریخ ادب میں قدیم ترین نسوانی مصنف ایک چینی عورت پاؤ چاؤ نامی تھی جو عیسائیت کے آغاز میں ایک مسلمہ تاریخ داں مانی جاتی تھی۔ چین کا قدیم ادب بہت ضخیم، وسیع اور شاندار ہے لیکن "کلاسکل" مصنفین کے بے پناہ اثر کے باعث چین کی قوم دنیا کی سب سے زیادہ دقیانوسی اور ضعیف الاعتقاد قوم ہو کے رہ گئی ہے اور اسی وجہ سے چینی زبان تاریخ کے آغاز سے لیکر آج تک جوں کی توں بلا کسی ترمیم و تنسیخ کے قایم ہے۔

ہندوستان کی قدیم ترین و مقدس ترین کتاب 'وید' حضرت عیسیٰ سے غالباً ایک ہزار سال قبل لکھی گئی تھی۔ گوتم بدھ چھٹی صدی ق۔م میں زندہ تھا۔ اُس کی تعلیمات نے بہت بڑے پیمانہ پر یہاں مذہبی ادب کی بنیاد ڈالی اور کتابیں یا تو صاف کئے ہوئے چمڑے پر اور یا چھال اور تاڑ کے پتوں پر لکھی گئیں۔ قدیم ترین عبرانی کتب بھی تقریباً ۸۰۰ سال (ق۔م) لکھی گئی تھیں۔ جہاں تک انسانی معلومات کا دخل ہے جاپان اب سے ایک ہزار سال مشترکی ادب موجود نہ تھا۔ کیونکہ وہاں بھی چین و یونان کی طرح صدیوں تک تقریر کا دور دورہ رہا اور کتابیں بہت بعد میں لکھی گئیں۔

فینشی قوم جو سامی نسل سے متعلق تھے اور شمالی افریقہ میں رہتے تھے اُس زمانہ کی سب سے بڑی تجارت پیشہ قوم تھی۔ اُن کا دارالحکومت قرطاجنہ دنیا کا قدیم ترین تجارتی مرکز کہا جاتا ہے۔ اہلِ یونان نے فنِ تحریر انھیں فینشیوں سے سیکھا۔ اہل یونان نے حروفِ تہجی آٹھویں صدی (ق۔م) میں ایجاد کئے اور پانچویں صدی (ق۔م) سے درس و تدریس کا کام باقاعدہ شروع ہو گیا۔

اسکندریہ نے یونانی کلچر اور علوم و فنون کے مرکز ہونے کی حیثیت سے ایتھنز کا درجہ گرا دیا۔ قدیم مصری حکمرانِ جو بطلیموس[1] کے خطاب سے مخاطب کئے جاتے تھے علوم و فنون کے بڑے شیدا اور سرپرست تھے۔ اسکندریہ کی صرف ایک لائبریری میں اُسوقت سات لاکھ یونانی کتب محفوظ تھیں۔ اس لائبریری کا کچھ حصہ رومی فاتح جولیس سیزر نے ۴۸ سال قبل مسیح میں جلا ڈالا تھا۔ بعدازاں عیسائی مشنریوں نے اسکندریہ کی متعدد لائبریریاں برباد کیں اور اس کا الزام حضرت عمر فاروق کے سر تھوپا گیا۔

تیسری صدی (ق۔م) میں اسکندریہ، یونانی ادب کا عظیم الشان مرکز تھا اُسی زمانہ میں رومی مصنفین نے ایتھنز والوں کی تقلید میں اپنا ذخیرۂ ادب مرتب کرنا شروع کیا۔ اسکندریہ کی یہ ممتاز ادبی حیثیت، رومیوں کے ہاتھ سے فتح ہونے کے بعد بھی پانچویں صدی عیسوی تک قایم رہی اور اسکندریہ تہذیب و تمدن، علوم و فنون کا گہوارہ بنا رہا۔

ابتدا میں رومی ادب، غیروں کی ملکیت تھا۔ جب روم، عسکری و سیاسی حیثیت سے اُس عہد کی متمدن دنیا کا مرکز سمجھا جانے لگا تو اطراف عالم سے علماء و فضلاء وہاں آآکر آباد ہونے لگے، ٹھیک اُسی طرح جس طرح کا اٹھارھویں صدی عیسوی میں مقررین و مصنفین عالم کا اجتماع پیرس (فرانس) میں ہوا تھا۔ بایں ہمہ ایک طویل مدت تک روم کی ادبی زبان یونانی ہی رہی اور جب لاطینی ادب کا نشوونما ہوا تو وہ سراسر یونانی ادب کا چربہ تھا۔ ہومر کا ترجمہ لاطینی میں کیا گیا پہلی صدی قبل مسیح سے پیشتر یعنی "لاطینی ادب کے عہد زریں" کے آغاز سے قبل اکثر لاطینی مصنفین غیر لاطینی الاصل اور نوواردھے تھے لاطینی ادب کا 'کلاسکل عہد' ایک صدی سے زیادہ قایم نہیں رہا۔ حضرت عیسیٰ کی پیدایش سے ایک سو سال پہلے سے اُن کی پیدایش کے وقت تک (ایک صدی کے اندر) سسیرو، لکریشیس، سیزر، ہوریس، ورجل، اووڈ اور لوی پیدا ہوئے، اور اپنے ادبی کارناموں کی وجہ سے بہت مشہور ہوئے۔

---

[1] اسکندر کے زمانہ سے لیکر قلو پطرہ کے عہد تک مصر کے فرمانروا بطلیموس کہلاتے تھے۔ (اڈیٹر)

علم الاصنام، اور بعید از عقل کہانیوں ہی سے ہر قوم کا ابتدائی ادب لبریز رہا ہے۔ کیوپڈ اور سائکی کی کہانی یونانی اساطیر کی نہایت مشہور و دلفریب کہانی ہے۔ اس کہانی کا خلاصہ یہ ہے کہ ۔ سائکی ایک بادشاہ کی سب سے چھوٹی بیٹی تھی۔ وہ اس قدر حسین تھی کہ حسن کی دیوی وینس نے جلکر اپنے بیٹے کیوپڈ کو اس کے قتل پر مامور کیا۔ کیوپڈ رات کی خموشی و تنہائی میں سائکی کے کمرہ میں داخل ہوا مگر حسن و جمال کے اس زندہ پیکر کو دیکھکر حیران رہ گیا اور جو تیر وہ سائکی پر چلانے والا تھا وہ خود اسی کے سینہ میں پیوست ہوگیا آخر کار کیوپڈ سائکی سے ملنے لگا مگر اس نے یہ کہدیا تھا کہ سائکی اس کا نام معلوم کرنے کی کوشش کبھی نہ کرے گی اور نہ کبھی روشنی میں اس کا چہرہ دیکھنے کا خیال کرے گی۔ عرصہ تک سائکی اس پر عمل کرتی رہی مگر آخر کار اس سے ضبط نہ ہوا اور ایک رات اپنا لمپ روشن کرکے اس نے کیوپڈ کے چہرہ کو دیکھا اور اسی گھبراہٹ میں لمپ کا ایک قطرہ ٹپک کر کیوپڈ کے شانہ پر ٹپک پڑا۔ کیوپڈ کی آنکھ کھل گئی اور وہ غائب ہوگیا اسکے بعد سائکی نے بڑی مصیبتیں برداشت کیں اور آخر میں کیوپڈ پھر مل گیا

اسی قصہ کی نقل ناروے کی وہ قومی کہانی ہے جس میں ایک دولہن فریجا نامی اپنے شاوند اوڈر نامی کی حکم عدولی کرتی ہے۔ ہندوستانی ویدمیں بھی پرورنا اور اُروَاسی کا قصہ اسی سے ماخذ ہے اور دیلز اور جنوبی افریقہ کی زولو قوم میں ایسی ہی ایک حکایت پائی جاتی ہے

کیوپڈ اور سائکی سے زیادہ مشہور کہانی ڈاینا اور انڈمیین کی ہے جس کی نقل مختلف زبانوں میں ملتی ہے۔ ڈاینا، چاند کی دیوی، ایک مرتبہ آسمانوں پر اپنے دودھ جیسے سفید گھوڑوں والی گاڑی پر بیٹھی چلی جاتی تھی کہ اس نے ناگاہ ایک پہاڑی پر انڈمیین نامی ایک حسین و جمیل نوجوان گڈریے کو سوتا ہوا پایا۔ اس فانی انسانی حسن نے اس کو مائل بہ زمین کیا وہ اُتری اور جھک کر اس نے جوان گڈریا کا منہ چوم لیا۔ ہر شب کو وہ اسی طرح آسمانوں پر سے اس پہاڑی پر ایک لمحہ کے لئے اُترتی اور انڈمیین کا منہ چومکر چلی جاتی۔ بائرن نے اپنی ایک نظم میں اس واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اپنے محبوب انڈمیین کے حسن و شباب کو زندہ جاوید کرکے ڈاینا نے اسے انسانی دسترس سے دور ایک کوہستانی غار میں ابدی نیند سلا کر لٹا دیا ہے جہاں وہ اس کا ایک بوسہ لینے کے لئے ہمیشہ شب کو جایا کرتی ہے ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس فسانہ سے آسٹریلیا کے قدیم باشندے بھی واقف ہیں کیونکہ ان کے یہاں بھی ایک ایسا ہی قصہ بیان کیا جاتا ہے سنگھالی (لنکا کے باشندے) اور بعض افریقی اقوام بھی ایسی ہی روایت بیان کرتی ہیں ۔ یہ بعید از عقل کہانیاں ادب کی پیدائش سے بہت پیشتر انسان کا واحد ذہنی سرمایہ تھیں اور انھوں نے ہر زمانہ اور ہر عہد میں شعراء کو متاثر کیا اور ان کے لئے ذخیرۂ فکر مہیا کیا ہے۔ نہ صرف ہومر اور ورجل وغیرہ ان کہانیوں کے ناقل ہیں بلکہ بہت سے شعراء مثلاً براؤننگ، ٹامسن، ہیرک، لانگ فیلو میریڈتھ، ولیم موریس، پوپ، سوئن برن، ٹینی سن خصوصاً بائرن، شیلے، کیٹس اور روزیٹی بھی اپنی نظموں میں ان کو بار بار دُہراتے ہیں۔ علم الاصنام و اساطیر ہی کی وجہ سے بڑے بڑے نقاش و مصور و مجسمہ ساز، نیز یورپ میں

حیرت انگیز و نادر نمونے اپنے کمال فن کے پیش کر سکے، اور صدیوں بعد انھیں کہانیوں نے رفائیل سے پہلے کے نقاشوں کی قوت فکر یہ پرواز تخیل کو متاثر کیا تھا۔ یہ اہم بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ لٹریچر کی ابتدا باہمی تعاون سے ہوئی نہ کہ انفرادی صلاحیت سے۔ ستاروں اور سیاروں کی ابتدائی دلچسپ کہانیاں، نیز ابتدائی نغمے جو ماؤں نے اپنے بچوں کو گا گا کر سنائے عہد بہ عہد الٹتے پلٹتے، بدلتے بدلاتے اس زمانہ تک جا پہونچے کہ انسان نے لکھنا پڑھنا ایجاد کر لیا اور یہ کہانیاں اور نغمے درختوں کی چھالوں پر کندہ کئے گئے یا پیپرس پر لکھے گئے۔ جب انسان نے پہلی مرتبہ لکھنا شروع کیا تو سوانح اور تاریخی روایات پر ایک ضخیم مواد لوگوں کے سینوں میں موجود تھا جو بلا دقت معرض تحریر میں آتا رہا

انسانی زندگی میں، شادی اور موت کے متعلق بھی خاص خاص رسمیں وجود میں آ گئیں۔ تداخل فصلیں پر بھی مخصوص رسوم معین ہوئیں، دیوتاؤں اور دیویوں پر چڑھاوے چڑھائے گئے۔ موسم بہار، فصل کاٹنے کے ایام، کھیتوں میں بیج ڈالنے کا موسم وغیرہ وغیرہ آغاز تمدن میں انسان کے لئے مخصوص اوقات تھے۔ ان عادات و رسوم نے ابتدائی تحریر انسانی کو بہت متاثر کیا۔ مزید براں بچوں کو سلانے اور زچہ خانہ کی کہانیاں، دیوتاؤں وغیرہ کے ڈراونے قصے، کہاوتیں اور ضرب الامثال وغیرہ بڑی تعداد میں سینہ سے زبان پر اور زبان سے نوک قلم پر آ کر ابتدائی ادب انسانی کا باعث ہوئے

"نظم تحریر سے بہت زیادہ پرانی ہے۔ اینڈریو لینگ کہتا ہے کہ:-

> "نظم کی موجودہ صورت بیشک نسبتاً جدید ہے۔ مگر نظمیں اور نغمے سیکڑوں برس تک انسان بغیر لکھے پڑھے مزے لے لیکر گاتا رہا۔ زبانیں پیدا ہوئیں، بگڑیں اور سدھریں لیکن ان لسانی تغیرات نے ان منظوم تخیلات اور روحانی ترانوں پر کچھ اثر نہ کیا جو تمام دنیا پر چھا گئے تھے اور جن کی پیدائش کی کوئی تاریخ معین نہیں کی جا سکتی"

خوشی کے اوقات میں ناچ ناچ کر انسان اپنے منہ سے جو کلمات سُر کے ساتھ نکالتا تھا وہی موجودہ نظم و موسیقی کی ابتدا تھی اور تمدن و تہذیب حاصل کرتے ہی یہی چیزیں مناسب ترمیم و تنسیخ، تغیر و تبدل کے بعد انسان نے لکھنا شروع کیں۔ واٹس ڈنٹن نظم کی تعریف ان الفاظ میں کرتا ہے کہ:- "نظم ذہن انسانی کی وہ تراوش فکر ہے جو جذبات کی شورش کے عالم میں نپی تلی زبان میں ادا ہو"

یونان اور روم کے "عہد زریں" میں بہت کم آدمی لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ لیکن گاتے سب تھے۔ اُن "تاریک صدیوں" میں جو سلطنت رومتہ الکبریٰ کے زوال کے بعد کتابوں کے پڑھنے والے تھوڑے رہ گئے تھے مگر نغمے پھر بھی گائے جاتے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ بے پڑھے لکھے لوگ ہر زمانہ اپنا ایک لٹریچر رکھتے تھے جو انھیں کے سینوں میں دفن رہتا تھا اور یہ امر کسقدر حیرتناک ہے کہ مشرق و مغرب، شمال و جنوب ہر جگہ اور ہر مقام پر قوموں نے اپنا لٹریچر نثر و نظم دونوں میں ایک ہی انداز سے حاصل کیا ہے یہی نہیں بلکہ بعض اوقات مشرق بعید کی ایک کہانی مغرب بعید کی کسی کہانی سے ایسی مطابقت رکھتی ہے کہ گویا یہ دونوں ایک ہی وقت میں ایک ہی انسان نے وضع کی تھیں

(ماخوذ)

محمود بریلوی

تاریخ اودھ کا ایک ورق

(مکّا درزی)

اب سے ٹھیک ایک صدی پہلے کی بات ہے - حاتم دوراں نصیر الدین حیدر کا عہد حکومت ہے (۱۸۲۷ء سے لیکر ۱۸۳۷ء) اور ہر شخص مسرت و اطمینان کی زندگی بسر کر رہا ہے - اس عہد زریں میں ہر طرف ہُن برس رہا تھا اور لکھنؤ رشک فردوس بنا ہوا تھا - بادشاہ کی داد و دہش کا شہرہ سنکر لوگ دور دور سے بخت آزمائی کے لئے یہاں آتے تھے اور جس کی رسائی ذات شاہانہ تک ہوجاتی تھی وہ واقعی خاک سے پاک ہوجاتا تھا - انھیں خوش نصیبوں میں خیرآباد کا مکا درزی بھی تھا جو یاوری قسمت سے شاہ نصیر الدین حیدر کے دربار میں شاہی درزیوں کا جمعدار ہوگیا - توشہ خانہ کا تمام سامان اسی کی معرفت خریدا جاتا تھا اور یہ ایک ایک کے دس دس وصول کرتا تھا - کہا جاتا ہے کہ مکّا کو انگیا کرتی سینے میں کمال حاصل تھا اور یہی بات اُس کی ترقی کا باعث ہوئی - اس کا نام اب مکّا سے مکّا نال ہوگیا، مگر باوجود اس دولت و اقتدار کے وہ بہت ہی ملنسار اور متواضع تھا - تمکنت و غرور نام کو نہ تھا - ہر شخص سے جُھک کر ملتا تھا - کنبہ والوں کی پرورش کرتا تھا - غیروں کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آتا تھا اور سوئی ہمیشہ پگڑی میں لگی رہتی تھی - اپنے وطن خیرآباد میں اسنے بہت سی عمارتیں (مسجد، امام باڑہ، خانقاہ، قدم رسول، اور متعدد اونچے اونچے مکان تعمیر کرائے جو اب بھی موجود ہیں - مگر وہ ہمیشہ خود کچے مکان میں رہا تاکہ اگلی حالت اسکو بھول نہ جائے

کرنل سلیمن (Col: Saleeman) رزیڈنٹ اودھ بہ سلسلۂ سیاحت اودھ (۱۸۵۰ء) اپنے سفرنامہ میں تحریر کرتے ہیں کہ :- " خیرآباد میں خوشنما عمارتوں کا ایک سلسلہ ہے جس میں مکّا کے باپ کا مقبرہ - مسجد - امام باڑہ - قدم رسول اور دوسری عمارتیں شامل ہیں - یہ سب مکّا درزی ملازم شاہ اودھ نصیر الدین حیدر کی تعمیر کردہ ہیں جو اپنے آقا کی نگاہ لطف و کرم کی بدولت بہت ہی دولتمند ہوگیا تھا - مکا ابھی زندہ ہے اور عمارتوں کی برابر مرمت کراتا رہتا ہے ان عمارتوں میں گداگروں کے غول کے غول بھرے رہتے تھے اور اُن کی صداؤں سے اتنا شور و شغب ہوتا تھا کہ کانوں کے

پر دسے پیٹتے جاتے تھے۔ میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ ایک ادنےٰ درجہ کے آدمی نے کیسی کیسی عظیم الشان عمارتیں کھڑی کر دی ہیں اور اُن کے قیام و بقا کے لئے جائداد بھی وقف کر دی ہے"

مرزا رجب علی بیگ سرور مصنف فسانۂ عجائب نے جو مکا کے ہمعصر تھے اُس کی آسودگی اور تونگری کا تذکرہ ان الفاظ میں پیش کیا ہے:۔ "مکا خیاط مالِ دنیا سے مالامال ہے۔ استغنا کا دم بھرتا ہے۔ سینا تو کیا ٹانکا بھی کم بھرتا ہے۔

روایت ہے کہ شاہ دہلی نے اپنی ایک محبوب بیگم کے لئے ایک لاکھ روپیہ کی لاگت کا ایک بھاری تولوان جوڑا بنوایا تھا شدہ شدہ یہ خبر قدسیہ محل کے کانوں تک پہونچی جو شاہ نصیر الدین حیدر کی بہت چہیتی اور دریا دل بیوی تھیں انھوں نے بھی بادشاہ سے فرمائش کر دی کہ میرے لئے ایک لاکھ روپیہ کا جوڑا طیار کرا دیجئے۔ بادشاہ نے مکا کو جوڑے کی طیاری کا حکم دیدیا۔ مکا حسب ارشاد عالی جوڑے کی طیاری میں معروف ہوگیا۔ چھ ماہ کی مدت میں دوسرے درزیوں کی مدد اور مشورے سے یہ جوڑا طیار ہوا جس میں لعل اور گوہر ٹنکے ہوئے تھے۔ مکا اس جوڑے کو ایک خوبصورت کشتی میں قرینے سے سج کر روشن چوکی کے ساتھ در دولت پر لے گیا۔ جوڑا بہت پسند کیا گیا اور مکا انعام و اکرام سے سرفراز ہوا۔

ایک روز میاں مکا نقرئی ہودج میں پشت فیل پر سوار کہیں جا رہے تھے۔ خاص بردار جلو میں تھے۔ ایک پٹھان صاحب بازار میں کھڑے تھے وہ ایک درزی کی سواری اس طمطراق سے جاتے ہوئے اور اُسے فیل نشین دیکھ کر آتش حسد سے جل بھنکر خاک ہوگئے اور دل کے جلے پھپھولے پھوڑنے کو پکار کر کہا ہمارا بند ٹوٹ گیا ہے جو ٹانک دیگا اُس کو اُجرت ملے گی۔ یہ سنتے ہی مکا ہاتھی سے اُتر پڑا۔ پٹھان کے پاس آکر بند سی دیا اور دعائیں دینے لگا۔ پٹھان صاحب شرم سے پانی پانی ہوگئے۔ مکا ہاتھی پر بیٹھکر چلدیا"

راجہ غالب جنگ نے مکا کی بخیہ گری کی کوشش کی تھی مگر اُن کی چال اُلٹ گئی اور صیاد خود صید ہوگیا جس نے دوسرے کی بخیہ اُدھیڑنا چاہی تھی خود اسی کا گریبان چاک ہوگیا اور مکا لالوں کا لال بنا رہا چونکہ اس واقعہ سے اُس زمانہ کے طرز حکومت پر بھی روشنی پڑتی ہے اس لئے میں اُس کو کسی قدر تفصیل کے ساتھ بیان کرتا ہوں

راجہ غالب جنگ قوم کے کوری عہد نصیر الدین حیدر میں مہتمم پولیس تھے اور پیدل فوج کا ایک دستہ بھی اُن کے زیر کمان تھا۔ علاوہ ان عہدوں پر فائز ہونے کے وہ جہاں پناہ کے نظر کردۂ خاص تھے اور ہر وقت سایہ کی طرح اُنکے ہمراہ رہتے تھے حتےٰ کہ بادشاہ کی عیش و نشاط کی نجی صحبتوں میں بھی اُن کو حاضری کا اعزاز حاصل تھا مگر وہ اپنی سخت گیری اور بد مزاجی کے لئے بہت بدنام تھے اور اپنے رسوخ کے گھمنڈ میں وزیر اعظم روشن الدولہ کا بھی موقع بے موقع مذاق اُڑایا کرتے تھے جس سے سب ان کے مخالف ہوگئے تھے۔

بادشاہ نے رنجیت نامی ایک جوان کو بہت منہ لگا رکھا تھا۔ یہ شخص روشن الدولہ کا نمک پروردہ تھا مگر بعد کو بادشاہ کا معتمد خاص ہوگیا تھا اور جو لوگ وزیر اعظم کے درپے تخریب ہوتے تھے اُن کو برطرف کرانے کی اُدھیڑ بُن میں

میں لگا رہتا تھا

مکا خیاط بھی اپنے مفادے تحفظ کے لئے غالب جنگ کو نیچا دکھانا چاہتا تھا۔ ان دونوں سے بادشاہ کا دوسرا معتبر ملازم گنگا خواص بھی در پردہ ملا ہوا تھا۔ ان تینوں نے بعض بیگمات کو بھی اپنا ہمنوا بنا لیا تھا جو ان لوگوں کی برابر حمایت کرتی رہتی تھیں۔ بادشاہ بعض اوقات غالب جنگ کی معرفت عورتوں کو بھی بلوایا کرتے تھے۔ ایک روز انھوں نے موگیری نامی ایک عورت کو پیش کرنے کی فرمائش کی جب کافی وقت گزر گیا اور وہ حاضر نہ ہوئی، بہت مضطرب ہوئے دھنیا مہری سے اُس کے حاضر نہ ہونے کا سبب دریافت کیا تو اُس نے باد پ کہا۔ خداوندکیا عرض کروں کچھ کہتے بن نہیں پڑتا راجہ بڑے ہی ذات شریف ہیں خود رنگ رلیاں مناتے ہیں اور خدمت عالی میں پیش نہیں کرتے۔ جب دوسرے حاضرین نے بھی جو آپس میں ساز باز کئے ہوئے تھے اس بیان کی تصدیق کی تو بادشاہ آگ بگولا ہو گئے مگر اسوقت غصہ پیکر خاموش ہو رہے اور موقع محل کے منتظر رہے وہ چاہتے تھے کہ کسی دوسری بات کا حیلہ کر کے راجہ سے عوض لیا جائے تاکہ کسی کو یہ نہ معلوم ہو کہ یہ باہمی رقابت کا نتیجہ ہے۔ سلیمن صاحب ریذیڈنٹ اودھ ناقل ہیں کہ دھنیا مہری کے بیان میں ذرہ برابر کذب و دروغ نہ تھا کیونکہ بعد کو خود موگیری نے تسلیم کر لیا کہ اُس کو راجہ نے روک لیا تھا

۷ اکتوبر ۱۸۳۵ء کو بادشاہ اپنے نجی کمرہ میں کسی سیاسی امر پر غالب جنگ سے گفتگو کر رہے تھے اور میز پر چند تاج چنے ہوئے تھے جو مکا کی زیر نگرانی تیار ہوئے تھے اور جن کا کل ساز و سامان بھی اُسی کی معرفت خریدا گیا تھا۔ مکا جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے بادشاہ سے ہر چیز کی دس گنی قیمت لیا کرتا تھا اور اُس کے منھ مانگے دام بے چون و چرا آنکھ بند کر کے ادا کر دئے جاتے تھے۔

غالب جنگ نے دیکھا کہ مکا کی بد دیانتی ظاہر کرنے کا اس سے بہتر موقع نہیں مل سکتا اس لئے انھوں نے ایک تاج اُٹھا کر اُس کو اپنی اُنگلی پر نچانا شروع کر دیا یہاں تک کہ اُنگلی تاج کے بالائی حصے کو پھاڑ کر باہر نکل آئی جس سے یہ ظاہر کرنا مقصود تھا کہ مال مسالہ بہت ادنے قسم کا استعمال کیا گیا ہے۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ راجہ نے بوجہ سابقہ بے تکلفی کے بادشاہ کو مخاطب کر کے عرض کیا "حضور تاج میں چھید ہو گیا"، چونکہ بادشاہ کو تاج و تخت بہت منتوں مرادوں سے نصیب ہوا تھا اس لئے یہ جملہ اُن کے لئے سوہانِ روح ہو گیا اور بغیر کچھ ارشاد کئے وہ اُٹھ کر کمرہ کے باہر تشریف لے گئے۔ اُس کے بعد فوراً ہی چند ملازمین نے اندر آ کر راجہ کو چاروں طرف سے گھیر کر کہا کہ تاصدور حکم ثانی اپنی جگہ سے جنبش نہ کیجئے گا تقریباً دو گھنٹے تک راجہ اسی مخمصہ اور گومگو کی حالت میں بیٹھے رہے اُس کے بعد چند اور خدام بھی کمرے میں آ گئے جنھوں نے راجہ کی پگڑی اُتار کر بغرض اہانت زمین پر پھینک دی اور اُس کو حلال خوروں سے ٹھوکریں دلوا کر کمرہ کے باہر پھکوا دیا۔ اسکے بعد راجہ کو زنداں میں بھیجکر دوسرے روز پا بزنجیر کر دیا گیا اور اُنکے مکانات پر پہرہ بٹھا دیا تاکہ کوئی شخص راجہ کے خاندان کا نقل و حرکت نکرے اور راجہ کی جایداد بھی ضبط سرکار ہو گئی۔

تیسرے روز راجہ کے تازیانے بھی بہت سختی سے لگائے گئے تاکہ چھپی ہوئی دولت بھی بتا دیں اُسی روز شام کو بادشاہ نے نشہ کی ترنگ میں فرمان جاری کر دیا کہ راجہ کا داہنا ہاتھ قلم کر دیا جائے اور ناک بھی اُڑا دی جائے مگر وزیر اعظم نے بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ اگر ارشاد عالی پر عمل کیا گیا تو برٹش گورنمنٹ کی طرف سے سخت اندیشہ ہے۔ بادشاہ یہ سنکر استراحت فرمانے چلے گئے مگر دوسرے روز راجہ کو پھر کوڑے لگانے کا حکم نافذ کر دیا۔

چھ یا سات دن کے بعد راجہ کے کل ملازمین اُن کے پاس سے ہٹا دئے گئے اور حکم ہوا کہ راجہ کے پاس کوئی نہ جانے پائے ۔ ۹، اکتوبر سنہ مذکور کو اعلےٰ حضرت نے ایک اور فرمان جاری کیا کہ خاندان غالب جنگ کی کل مستورات در دولت تک پیدل لائی جائیں اور سب کے سر مونڈ کر اور ننگا کر کے شارع عام پر نکال دیجائیں۔ یہ حکم دیکر بادشاہ آرام خاص کو تشریف لے گئے۔ کل عورتیں حسب الحکم محلسرا میں لائی گئیں مگر ملازمین شاہی بوجہ اُن کی معصومیت اور بیگناہی کے اُن کے ہمدرد و غمگسار ہو گئے تھے اس لئے بجائے بے پردہ پیدل لانے کے اُن کو پردہ دار ڈولیوں میں سوار کر کے عزت و حرمت سے لائے۔

ریذیڈنٹ نے اس اندیشہ سے کہ مبادا ان مستورات کی اور زیادہ توہین و تحقیر کی جائے اور غالب جنگ کو فاقے دے دیکر ہلاک کر دیا جائے۔ مداخلت کا تہیہ کر لیا اور بادشاہ کی خدمت میں عین اسوقت بغرض ملاقات حاضر ہونا چاہا جبکہ وہ بستر استراحت پر سے تھے۔ بادشاہ کو یہ نہایت شاق گزرا اور وزیر کو بھیجکر ریذیڈنٹ سے کہلا بھیجا کہ اگر آپ صرف غالب جنگ کے اہل خاندان کی رہائی کے لئے تکلیف کرنا چاہتے ہیں تو آپ کو زحمت کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ میں حکم دے رہا ہوں کہ کل مستورات اپنے اپنے مکانوں کو واپس کر دیجائیں مگر ریذیڈنٹ پھر بھی ملاقات پر مصر ہوئے۔ بادشاہ بالکل خاموش بت بنے بیٹھے رہے اُن کی جانب سے وزیر اعظم جواب دہی کرتے رہے۔ انھوں نے اس امر سے تو بالکل انکار کر دیا کہ ملزم کو دو روز سے کھانا پانی بالکل نہیں دیا گیا ہے مگر اس کا اقبال کیا کہ اُن کو سزائے تازیانہ دیگئی ہے اور مستورات ابتک محلسرا میں موجود ہیں مگر اُن کو فوراً آزاد کر کے روانہ کر دیا جائے گا۔ وزیر نے یہ بھی بیان کیا کہ راجہ کی جائیداد ضبط کرنے کی ضرورت اس لئے ہوئی کہ اُن کے ذمہ بڑی بڑی سرکاری رقمیں واجب الادا ہیں۔ اس کے بعد مستورات اپنے اپنے مقاموں کو واپس کر دی گئیں اور غالب جنگ کو اجازت ہو گئی کہ اپنی خدمت کے لئے چار ملازم رکھ لیں

اس کے بعد راجہ درشن سنگھ نے جو بہت ہی با اثر آدمی تھے اور غالب جنگ کے سخت دشمن تھے بادشاہ کی خدمت میں عرضی پیش کی کہ غالب جنگ کو فدوی کے سپرد کر دیا جائے، اس تجویز کو بادشاہ اور وزیر دونوں نے بخوشی منظور کر لیا اور وزیر اعظم نے درشن سنگھ سے تین لاکھ روپیہ لیکر غالب جنگ کو اُن کے حوالہ کر دیا اور ریذیڈنٹ کو یہ کہکر اطمینان دلا دیا کہ درشن سنگھ غالب جنگ کے دوست ہیں وہ اُن کو اور اُن کے متعلقین کو بہت آرام اور آسایش سے رکھیں گے درشن سنگھ نے غالب جنگ کو ایک آہنی پنجرہ میں بند کرا کے اپنی گڑھی واقع شاہ گنج میں بھیجدیا

بعد انتقال نصیر الدین حیدر، غالب جنگ نے چار لاکھ روپیہ ادا کرکے قید و بند سے گلوخلاصی حاصل کی اور وعدہ کیا کہ اگر اپنے منصب پر بحال کر دیا جاؤں گا تو تین لاکھ روپے اور حاضر کردں گا قید سے رہائی پانے پر وہ بمقام کانپور کمپنی کی عملداری میں قیام پذیر ہوئے اور تین ماہ کے بعد جب روشن الدولہ برطرف ہوئے اور خلعت وزارت نواب منتظم الدولہ حکیم مہدی علی خاں کو عطا ہوا تو اپنی جگہ پر پھر مقرر کر دئے گئے اور بمقام لکھنؤ بتاریخ یکم مئی ۱۸۳۸ء بعمر تخمیناً اسی سال وفات پائی۔

مکّا کے بالائی حصۂ جسم کی ایک قلمی تصویر عجائب خانہ لکھنؤ میں موجود ہے۔ سر پر لٹو دار پگڑی اور گلے میں بادامی رنگ کا انگرکھا ہے۔ شانہ پر سہ گوشیہ رومال ہے جس کے دو کونے سینے پر لاکر گرہ دیدی گئی ہے۔ کرحسب رواج زمانہ کسی ہوئی ہے۔ مسیں بھیگتی ہیں اور سبزہ آغاز ہے چہرہ کتابی اور سڈول ہے۔ آنکھیں بڑی بڑی۔ پیشانی کشادہ اور رنگ گندمی ہے۔ بشرے سے نیکدلی ٹپکتی ہے اور فہم و فراست کے آثار بھی پائے جاتے ہیں۔

خدا نے مکّا کو سب نعمتیں عطا کی تھیں مگر اولاد نرینہ سے محروم رہا۔ اُس نے خیرآباد اپنے وطن میں سفر آخرت اختیار کیا اور وہیں اُس کی دائمی خوابگاہ ہے اُس کی رحلت کے بعد اُس کی بیوہ اور نواسہ علی بخش جایداد کا مالک ہوا لکھنؤ میں باغ مکّا اور مکّا گنج ابتک اس کی یادگار موجود ہیں۔

شیخ تصدق حسین بی۔اے۔ ایل۔ ایل۔ بی

"نگار" کے پُرانے پرچے

نگار کے مندرجہ ذیل پرچے دفتر میں موجود ہیں جن کی دو دو تین تین کاپیاں دفتر میں رہ گئی ہیں جن اصحاب کو ضرورت ہو طلب کرلیں۔ قیمتیں وہی ہیں جو سامنے درج ہیں:-

(سنہ ۲۹ء) جنوری ۸ر — (سنہ ۳۰ء) اپریل ۴ر — (سنہ ۳۱ء) مئی ۴ر — (سنہ ۳۱ء) جولائی تا دسمبر ۴ر فی پرچہ — (سنہ ۳۲ء) فروری تا دسمبر (علاوہ اپریل) ۴ر فی پرچہ — (سنہ ۳۳ء) فروری و جولائی ۴ر فی پرچہ — (سنہ ۳۴ء) فروری ۴ر — (سنہ ۳۵ء) فروری، اپریل تا اگست، اکتوبر تا دسمبر ۵ر فی پرچہ — (سنہ ۳۶ء) فروری، مارچ، اپریل، مئی، جولائی، اگست، ستمبر، اکتوبر، نومبر، دسمبر ۵ر فی پرچہ — (سنہ ۳۷ء) مارچ، اپریل، مئی، جون، جولائی، اگست، نومبر ۸ر فی پرچہ۔

منیجر نگار لکھنؤ

مثنوی سحر البیان

گزشتہ زمانے سے عشق و عاشقی کے سیکڑوں کھیل کھیلے گئے ہزاروں کہانیاں بنیں۔ لاکھوں شعر کہے گئے لیکن حسن و محبت
وصل و جدائی کا افسانہ جیسی میٹھی زبان اور فصیح بول چال میں میر حسن دہلوی نے سنایا کسی دوسرے شاعر یا ادیب کو
نصیب نہ ہوا۔ قبولیت عام جسقدر اس مثنوی کے حصہ میں آئی اُردو کی کسی عاشقانہ نظم کو سوائے گلزار نسیم کے نصیب
نہ ہوئی۔ جو اسکی شاعرانہ خوبیوں کا لطف اُٹھا سکتے تھے انھوں نے پڑھا اور مزہ لیا جو شعر و سخن کا مذاق نہ رکھتے تھے
انھوں نے کہانی کی قدر کی۔ پڑھ نہ سکتے تھے تو دوسروں سے پڑھوا کر سنا اور جو دو چار شعر یاد ہو گئے ان کو
الاپنا شروع کیا۔

حسن تخلص۔ میر غلام حسن نام۔ دلّی کے رہنے والے تھے۔ بارہ برس کے سن میں اپنے والد کے ساتھ فیض آباد
آئے۔ نواب سردار جنگ خلف نواب سالار جنگ بہادر کی سرکار سے پرورش ہوئی۔ کئی برس وہاں رہکر نواب آصف الدولہ
کے عہد میں لکھنؤ پہونچے اور مثنوی سحر البیان یہیں تمام کی۔ شعر و سخن سے موروثی ذوق تھا۔ مذاق ستھرا طبیعت مناسب
پائی تھی۔ سونے پر سہاگہ کہ وقت بھی اچھا ملا۔ بیگمات کی محفلوں میں رسائی ہوئی۔ امیرانہ تکلفات اور شاہانہ رسوم دیکھنے
برتنے کا موقع ملا۔ ناچ رنگ، گانے بجانے کے جلسے دیکھے۔ باغوں کی بہار، مکانوں کی آرائش۔ شاہی سواریوں کے
تماشے نظر سے گزرے۔ خیالات کی بلندی اور طبیعت کی موزونی سے جو کچھ کانوں سنا یا آنکھوں دیکھا اُس کی تصویر نظم
میں کھینچکر رکھدی۔

مثنوی سحر البیان ۱۱۹۹ھ میں تمام ہوئی اور اُس کی تصنیف کو آج ڈیڑھ سو برس سے زیادہ عرصہ گزرا لیکن اسکی
زبان قریب قریب وہی ہے جو اسوقت بولی جاتی ہے۔ آصف الدولہ کے عہد کا فیشن اور اس دور کے رسوم و رواج
آج بزبانِ حال سحر البیان میں موجود ہیں۔

قصہ کی رنگینی۔ جواب و سوال کی نوک جھونک۔ انداز بیان کی دلچسپی۔ مضمون کی شوخی۔ قافیوں کی چستی
بندش کی صفائی نے مثنوی میں چار چاند لگادئے۔ اور سچ یہ ہے کہ اس شان کی مثنوی نہ میر حسن کے وقت سے پہلے

موجود تھی اور نہ اُس کے بعد لکھی جا سکی۔ خود فرماتے ہیں:۔

نئی طرز ہے اور نئی ہے زبان　　نہیں مثنوی ہے یہ سحرالبیان
جو منصف ہیں سو کہیں گے یہی　　نہ ایسی ہوئی ہے نہ ہوگی کبھی

اس مثنوی کی سب خوبیاں ایک مختصر مضمون میں بیان نہیں ہو سکتیں۔ آج صرف قصہ بیان کیا جاتا ہے اور اسی کے ساتھ ساتھ چند شعر بھی سنائے جائیں گے۔

اگلے وقتوں میں ایک بڑے شان و شوکت کا بادشاہ تھا۔ کئی ملکوں کے راجہ اُس کی پرجا تھے۔ فوج لشکر۔ لونڈی غلام۔ زر و جواہر کی کمی نہ تھی۔ خدا کا دیا سب کچھ موجود تھا مگر اولاد نہ تھی اور ایک چراغ کے نہ ہونے سے گھر میں اندھیرا تھا۔ جب بڑھاپے کے آثار نمودار ہوئے اور کلیجے کی ٹھنڈک نصیب نہ ہوئی تو اُس نے راج پاٹ چھوڑ کر فقیری لینے اور بقیہ زندگی یاد خدا میں بسر کرنے کا ارادہ کیا۔ وزیروں امیروں نے سمجھایا کہ خدا کی رحمت سے مایوس ہونا اور معبود کی یاد کے لئے دنیا کا کاروبار چھوڑنا مناسب نہیں ہے

فقیری بھی کیجئے تو دنیا کے ساتھ　　نہیں خوب جانا اُدھر خالی ہاتھ

بادشاہ کی تسلی کے لئے رمالوں۔ نجومیوں جوتشیوں کو بلوایا اور ان سے دریافت کیا کہ تاج و تخت کا وارث پیدا ہونے کی کب تک امید ہے۔ اُن سب نے بالاتفاق کہا کہ بادشاہ کی تقدیر میں ایک فرزند ہے اور خوشی کا دور جلد آنیوالا ہے۔ پنڈتوں نے جنم پترا دیکھ کر حکم لگایا کہ "چندہ ماں سا بالک ترے ہوئیگا" لیکن بارھویں سال میں نظر کا ڈر ہے اسلئے بارہ برس تک یہ چودھویں کا چاند محل سے باہر نہ نکلے اور کوٹھے پر نہ چڑھے۔ بادشاہ کو ڈھارس ہوئی۔ سلطنت چھوڑنے کا قصد فسخ کیا اور خدا کی قدرت سے اُسی سال شاہی محل میں ایسا خوبصورت لڑکا پیدا ہوا کہ "اُسے دیکھ بیتاب ہو آفتاب"۔ شہزادہ کا نام بے نظیر رکھا گیا۔ بادشاہ نے نماز پڑھی اور شکرانے کے سجدے کئے۔ مبارک سلامت کے شادیانے بجے امیر و وزیر۔ رئیس و فقیر نذریں لیکر بادشاہ کی خدمت میں مبارکباد دینے کے لئے حاضر ہوئے۔ ہر ایک کو اس کی حیثیت کے مطابق انعام تقسیم ہوا

دئے شاہ نے شاہزادے کے نام　　مشایخ کو اور پیرزادوں کو گاؤں
امیروں کو جاگیر۔ لشکر کو زر　　وزیروں کو الماس و لعل و گہر
خواصوں کو فوجوں کو جوڑے دئے　　پیادے جو تھے اُن کو گھوڑے دئے

مبارک سلامت کی دھوم دھام چھٹی تک رہی۔ شاہزادہ محل میں پلنے لگا۔ مکتب میں بٹھانے کا وقت آیا تو ہر فن کے اُستاد اس کی تعلیم کے لئے مقرر ہوئے اور اس کو وہ تمام علوم و فنون پڑھائے سکھائے گئے جو آصف الدولہ کے عہد میں شریفوں اور رئیسوں کے یہاں رائج تھے

جب بارھویں سال کی گرہ پڑی اور پنڈتوں کی بتائی ہوئی خطرہ کی مدت ٹل گئی تو دارالسلطنت آراستہ کیا گیا شہزادہ حمام میں نہا کر اور شاہی لباس پہنکر بڑی دھوم سے شہر کی سیر کو نکلا۔ چار گھڑی کے بعد محل میں واپس آیا۔ شام ہو چکی تھی چودھویں رات کا چاند چمک رہا تھا۔ چاندنی کی بہار دیکھنے کے لئے کوٹھے پر پلنگ بچھنے کا حکم دیا بادشاہ نے یہ سمجھ کر کہ سختی کے دن گزر چکے ہیں اور اب چھت پر آرام کرنے میں کچھ خطرہ نہیں ہے اجازت دی۔ شہزادہ بچھونے پر آتے ہی سوگیا۔

وہ پھولوں کی خوشبو وہ ستھرا پلنگ جوانی کی نیند اور سونے کا ڈھنگ

تھوڑی دیر میں چوکی پہرے والوں کو بھی نیند آگئی اور ہر طرف سناٹا ہو گیا۔ اتفاقاً اُس طرف سے ماہ رخ نام ایک پری کا گزر ہوا۔ شاہزادے پر نظر پڑی اور اس کے حسن و جمال پر ہزار جان سے عاشق ہو گئی۔ اپنا ہوائی تخت پلنگ کے قریب لائی۔ شاہزادے کو اُڑا کر پرستان لے گئی۔ پری کے طلسمی باغ میں شاہزادے کی آنکھ کھلی تو اجنبی جگہ دیکھ کر بہت حیران ہوا۔ پہلے خیال ہوا کہ خواب ہے

زبس تھا وہ لڑکا تو سہما بھی کچھ ہوا کچھ دلیر اور حیراں بھی کچھ

سرہانے پری کو دیکھ کر پوچھا کہ تو کون ہے اور یہ گھر کس کا ہے؟

پری نے منھ پھیر کر جواب دیا:-

خدا جانے تو کون؟ میں ہوں کہاں! مجھے بھی تعجب ہے میں ہوں جہاں،
یہ گھر گو کہ میرا ہے تیرا نہیں، پر اب گھر ترا ہے میرا نہیں
پھر اڑا کر ترا تجھ سے شہر و دیار یہ بندی ہی لائی ہے تقصیر وار

شہزادہ مجبور تھا۔ پری کی قید سے رہائی کی کوئی صورت نہ تھی۔ دل کو جوں توں لگایا وہاں۔ اور جو کچھ پری نے کہا منظور کیا۔ شہزادے کے والدین بیٹے کے یکایک گم ہونے سے ادھر تو یوں تباہ حال اور بدحواس تھے۔ ادھر شاہزادہ وحشیوں کی طرح اُداس رہتا تھا۔

بہانے سے دن رات سویا کرے نہ جب کوئی تب وہ رویا کرے

ماہ رخ شہزادے کا جی بہلانے کی لاکھ کوشش کرتی مگر اس کو والدین کی شفقت اور گھر کی دلچسپیاں نہ بھولتی تھیں ایک مدت اسی حال میں گزری اور دل کی کلی نہ کھلی تو پری نے شاہزادے کو ایک طلسمی گھوڑا دیا جو کل کے اشارہ سے ہوا پر چلتا تھا اور اجازت دی کہ وہ اس پر چڑھکر روزانہ ایک پہر تک روئے زمین کی سیر کر آیا کرے۔ سہ پہر کو پری اپنے باپ کی خدمت میں جاتی تھی اس وقت شاہزادہ طلسمی گھوڑے پر چڑھکر دنیا کی سیر کو نکلتا تھا اور پہر بھر ہوا کھا کر پرستان میں واپس آجاتا تھا۔ تقریباً تین سال اسی حال میں گزرے۔ ایک رات اس کا گزر ایک باغ کی طرف

ہوا جسمیں سفید رنگ کی ایک بلند عمارت بنی ہوئی تھی۔

وہ چھٹکی ہوئی چاندنی جا بجا	وہ جاڑے کی آمد وہ ٹھنڈی ہوا

شاہزادے کو باغ کا منظر بہت پسند آیا۔ گھوڑے سے اترا اور دبے پاؤں باغ میں آیا۔ ایک طرف چند گنجان درخت لگے تھے اُن کی آڑ سے جھانکنے لگا۔ صحن باغ میں فرش بچھا تھا اور مسند پر ایک نہایت حسین وصاحب جمال شہزادی بیٹھی تھی۔ اِدھر اُدھر خواصیں کھڑی تھیں اور تاروں کی طرح چاند کو حلقہ میں لئے تھیں۔ شہزادہ یہ سماں دیکھ رہا تھا کہ ایک خواص کی نظر اُس پر جا پڑی۔ غل شور ہوا شہزادی کو خبر ہوئی کہ کوئی شخص درختوں میں چھپا ہے وہ بھی سہیلیوں کے ساتھ اُس طرف گئی۔ دیکھا کہ ایک حسین نوجوان درختوں کی آڑ میں سج دھج سے کھڑا ہے۔ (ڈیڑھ سو برس پہلے لکھنؤ کے رئیس زادوں کا فیشن دیکھئے):۔

گلے میں پڑا نیمہ شبنم کا ایک	بدن سے عیاں نور عالم کا ایک
طرحدار اک سر پہ چیرا سجا	تمامی کا پٹکا کمر سے بندھا
جواہر کا کمر کے تلے میں لگا	ستارہ ہو جوں صبح کا جگمگا
اک الماس کی ہاتھ انگشتری	سراپا حنا دست و پا میں لگی
برس پندرہ یا کہ سولہ کا سن	جوانی کی راتیں مرادوں کے دن

حسن وجمال دیکھکر خواصیں عش عش کرنے لگیں اور شہزادی عشق کے دیوتا کا شکار ہوگئی۔ اس نازنین کا نام بدر منیر تھا سراندیپ کے بادشاہ کی لڑکی تھی اور اس باغ میں سیر تماشے کو آیا کرتی تھی۔ بادشاہ کے وزیر کی بیٹی اُس کی ایک سہیلی نجم النسا نام تھی۔ اُس نے عاشق و معشوق کو بیہوش دیکھ کر گلاب چھڑکا شہزادی کو ہوش آیا تو دالان میں جاکر چھپ رہی۔ (وزیر زادی نے بہلا پھسلا کر راضی کیا کہ وہ مہمان کی خاطر داری کرے):۔

کیا ہے اگر تو نے کچھ دل اُسے	تو مت چھوڑ اب نیم بسمل اُسے
کہاں یہ جوانی کہاں یہ بہار	یہ جوبن کا عالم رہے یادگار
سدا عیش دوراں دکھاتا نہیں	گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں)

نجم النسا نے شہزادے کو خلوت میں بلالیا اور بدر منیر کو ہاتھ پکڑ کر اُس کے قریب بٹھا دیا۔

(وہ بیٹھی عجب ایک انداز سے	بدن کو چرائے ہوئے ناز سے
منھ آنچل سے اپنا چھپائے ہوئے	لجائے ہوئے شرم کھائے ہوئے)

تھوڑی دیر تک حجاب رہا۔ اُس کے بعد شراب کے دور چلے اور عاشق و معشوق میں محبت پیار کی باتیں ہونے لگیں۔ شہزادے نے اپنا حسب نسب ظاہر کیا۔ ماہرخ پری کے پاس اپنی گرفتاری کا حال سنایا اور یہ بھی

کہدیا کہ ایک پہر سے زیادہ غیر حاضری کی اُس کو اجازت نہیں ہے - اسی گفتگو میں پہر بھر رات گزر گئی اور شہزادہ دوسرے دن اسی وقت آنے کا وعدہ کر کے رخصت ہوا

سماں شب کا آنکھوں میں چھایا ہوا   مزہ دل میں سارا سمایا ہوا
نئی بات کا لطف پانا غضب   وہ پہلے پہل۔ دل لگانا غضب

ہجر کا دن رو رو کر کٹا اور شام کو فلک سیر گھوڑے پر سوار ہو کر بدر منیر کے باغ میں پہونچا اور ایک پہر رات گئے تک اپنے معشوق کے ساتھ عیش و عشرت میں مشغول رہا۔

اب معمول ہو گیا کہ ہر روز شام کو بدر منیر کے باغ میں جاتا اور پہر رات تک نسیں بول کر پری کے طلسمی باغ میں واپس چلا جاتا۔

ایک دن کسی دیو نے شہزادے کو بدر منیر کے پاس دیکھ لیا اور ماہ رخ کو خبر کر دی۔ وہ غصہ میں بھری بیٹھی تھی کہ شہزادہ پہونچا۔ اُس کو دیکھتے ہی برس پڑی۔

تجھے سیر کو میں نے گھوڑا دیا   کہ اُس مال زادی کو جوڑا دیا
پھر ایسے راتوں کو دلشاد تو   کرے گا دنوں کو بہت یاد تو

اور ایک دیو کو حکم دیا کہ شہزادے کو جنگل کے اس کنوئیں میں قید کر دے جس پر کئی من کا پتھر رکھا ہوا ہے۔

سر شام کھانا کھلانا اسے   اور اک جام پانی پلانا اسے
نہ دیجیو سوا اس کے جو کچھ کہے   یہی اس کا معمول دائم رہے

دل سے دل کو راہ ہوتی ہے اُدھر شہزادہ کنوئیں میں قید ہوا اور یہاں بدر منیر کے دل کو بے چینی شروع ہوئی جب کئی دن گزرے اور شہزادہ نہ آیا تو بدر منیر بیقرار ہو گئی۔

دوانی سی ہر طرف پھرنے لگی،   درختوں میں جا جا کے گرنے لگی،
خفا زندگانی سے ہونے لگی،   بہانے سے جا جا کے سونے لگی
نہ اگلا سا ہنسنا نہ وہ بولنا   نہ کھانا نہ پینا نہ لب کھولنا
جہاں بیٹھنا پھر نہ اٹھنا اُسے   محبت میں دن رات گھٹنا اُسے
کہا گر کسی نے کہ بی بی چلو   تو اٹھنا اُسے کہہ کے ہاں جی چلو
جو پوچھا کسی نے کہ کیا حال ہے   تو کہنا یہی ہے جو احوال ہے
کسی نے جو کچھ بات کی بات کی   جو دن کی جو پوچھی کہی رات کی
کہا گر کسی نے کہ کچھ کھائیے،   کہا خیر بہتر ہے منگوائیے۔

جو پانی پلاتا تو پینا اسے — غرض غیر کے ہاتھ جینا اسے
غزل یا رباعی دیا کوئی فرد — اسی ڈھب کی پڑھنا کہ جس میں درد
سو یہ بھی جو منہ کو رسیلے کہیں — نہیں تو کچھ اس کی بھی خواہش نہیں
گیا ہو جب اپنا ہی جیوڑا نکل — کہاں کی رباعی کہاں کی غزل

ایک دن باغ میں پریشان بیٹھی راہ تک رہی تھی کہ گانا سننے کو جی چاہا اور عیش بائی ڈومنی کو مجرے کا حکم دیا گیا۔ ڈومنی کی آن بان دیکھئے:۔

لٹیں منہ پہ چھوٹی ہوئی سر بسر — کہ بدلی ہو جوں سر کے ادھر ادھر
وہ بن پر بچھے ہونٹوں کی مسی غضب — کہ منہ پر تھی گویا قیامت کی شب
فقط کان میں ایک بالا پڑا — کہے تو کہ ہتا مہ کے ہالا پڑا
بندھا سر پہ جوڑا پڑی زرد شال — کمر کی لچک اور مٹک کی وہ چال
وہ پشواز اگری وہ نرگس کے ہار — وہ کم خواب کے
وہ اٹھی ہوئی چین پشواز کی — وہ مسکی ہوئی چولی انداز کی
وہ مہندی کا عالم وہ توڑے چھڑے — وہ پاؤں میں سونے کے دو دو کڑے
چلی واں سے دامن اٹھاتی ہوئی — کڑے سے کڑے کو بجاتی ہوئی
وہ آنے لگی کافر اس آن سے — کہ جانے لگا جی مسلمان سے

موسم موافق تھا اور وقت مناسب گانے کا سماں بندھ گیا:۔

گھڑی چار دن باقی اس وقت تھا — سہانا ہر اک طرف سایہ ڈھلا
درختوں کی کچھ چھاؤں اور کچھ وہ دھوپ — وہ دھانوں کی سبزی پہ سرسوں کا روپ
وہ رقص بتاں اور ستھری الاپ — وہ گوری کی تانیں وہ طبلہ کی تھاپ
وہ دل پیٹنا ہاتھ پر دھر کے ہاتھ — اچھلنا وہ دامن کا ٹھوکر کے ساتھ
غرض جو کھڑے تھے کھڑے رہ گئے — اڑے جس جگہ تھے اڑے رہ گئے

راگ سے پتھر کا جگر پانی ہوتا ہے - چرند و پرند - انسان و حیوان - جن و پری سب کا حال غیر ہو گیا - بدر منیر کا دل گھائل تھا وہ آہیں کھینچنے لگی - دیر تک آنکھوں پر رومال رکھکر روتی رہی اور اس کے بعد چھپر کھٹ پر جا گری - محفل برخاست ہوئی مگر بدر منیر کا حال دن پر دن بد تر ہونے لگا -

نہ منہ کی خبر اور نہ تن کی خبر — نہ سر کی خبر نے بدن کی خبر

اگر سر کھلا ہے تو کچھ غم نہیں، جو کُرتی ہے میلی تو محرم نہیں
جو مسی ہے دو دان کی تو ہے وہی، جو کنگھی نہیں ہے تو یونہی سہی
نہ منظور سرمہ نہ کاجل سے کام نظر میں وہی تیرہ بختی کی شام

غرض جب سپہر نے لیلےٰ کو مجنوں بنا دیا تو ایک رات خواب میں دیکھا کہ لق و دق جنگل میں کنواں ہے اور کنوئیں کے منھ پر کٹی لال پتھر کی سل رکھی ہے اور وہاں سے آواز آتی ہے کہ اے بدر منیر مجھکو تیری جدائی کا غم ہے

میں بھولا نہیں تجھکو اے مری جاں کروں کیا کہ ہے مجھ پہ قید گراں
کوئی دم کا مہمان ہوں آج کل اسی چاہ میں جائے گا دم نکل

بدر منیر نے جواب دینا چاہا مگر یکایک اُس کی آنکھ کھل گئی۔ جاگی تو نہ وہ کنواں تھا نہ وہ آواز۔ خود باؤلی ہو رہی تھی۔ نجم النسا نے یہ قصہ سُنا تو جوگن کا بھیس بنا کر شہزادے کو ڈھونڈھنے نکلی۔ رخصت کے وقت بدر منیر رونے لگی:۔

وہ رو رو کے دو ابر غم یوں ملے کہ جس طرح ساون سے بھادوں ملے

شہروں شہروں جنگل جنگل پھرتی اور شہزادے کا نشان ڈھونڈھتی تھی لیکن کہیں پتہ نہ چلتا تھا۔ ایک رات جنگل میں مرگ چھالا بچھائے اکتارا بجا رہی تھی۔ جنوں کے بادشاہ کا لڑکا فیروز شاہ نام اُدھر سے گزرا اور جوگن کی صورت دیکھتے ہی عاشق ہو گیا

یہ سمجھا بناوٹ کا کچھ بھیس ہے لگا کہنے جوگی جی آدیس ہے

جوگن نے بھی نظر پہچان لی

کہا ہنس کے جوگن نے ہر بول پر جہاں سے تو آیا چلا جا اُدھر

کچھ دیر باہم لطیفے ہوئے اور اس کے بعد پریزادے کے اصرار سے جوگن نے بین بجانا شروع کی۔ رات بھر بین بجاتی رہی اور فیروز شنتا رہا۔ صبح کے وقت جوگن نے بین کاندھے پر رکھی۔ پریزادے نے اُس کا ہاتھ پکڑ کر ہوائی تخت پر بٹھایا اور پرستان لے گیا۔ چند روز تک مہمان رکھا اور مطلب کی بات زبان پر نہ لایا۔ مگر جب دل بے قابو ہو گیا تو ایک دن قدموں پر گر پڑا۔ جوگن نے کہا کہ تم میرے مطالب بر لاؤ تو اپنی مراد بھی پاؤ۔ شہزادی بدر منیر کی عاشقی کا قصہ۔ پری کی محبت اور بے نظیر کے قید کئے جانے کا حال بیان کر کے فیروز شاہ سے کہا کہ تم شہزادے کا پتہ چلاؤ تو تمھارا مقصود بھی حاصل ہو۔ فیروز شاہ کے حکم سے پرستان میں ہر طرف شہزادے کی تلاش ہونے لگی۔ ایک خادم کا اس کنوئیں کی طرف گزر ہوا جہاں بے نظیر قید تھا۔ معلوم ہوا کہ ماہرخ پری کا قیدی ہے۔ فیروز شاہ نے ماہرخ کو ڈرا دھمکا کر بے نظیر کو قید سے نجات دلوائی اور دوسرے دن ہوائی تخت پر بٹھا کر نجم النسا اور بے نظیر کو

بدر منیر کے باغ میں پہونچا دیا - عاشق کی معشوق سے ملاقات ہوئی اور بدر منیر کے تن بیجان میں جان آئی -
چند روز کے بعد بدر منیر اپنے ماں باپ کے گھر گئی شہزادہ بے نظیر کی طرف سے شادی کا رقعہ اس کے باپ کے پاس بھیجا گیا - پیام منظور ہوا اور بڑے دھوم دھام سے بے نظیر اور بدر منیر کی شادی ہوئی - نواب آصف الدولہ کے عہد میں لکھنؤ کی برائیں دیکھنا ہو تو مثنوی میر حسن میں بیاہ کی داستان پڑھنا چاہئے مگر اس مختصر مضمون میں اس تفصیل کی گنجایش نہیں - بعد ازاں نجم النسا اور فیروز شاہ کی شادی ہوئی وہ دونوں شاد و خرم پرستان کو رخصت ہوئے اور بے نظیر اپنی دلہن کو لیکر ماں باپ کی خدمت میں وطن آیا - والدین کی آنکھوں میں نور آیا - یعقوب ثانی نے یوسف پایا -

اغفوں کے جہاں میں پھر جیسے دن ہمارے تمہارے پھریں ویسے دن
ملیں سب کے بچھڑے الہی تمام بحق محمد علیہ السلام

امیر احمد علوی (بی - اے)

پبلک سروس کمیشن - صوبجات متحدہ

ضرورت ہے

۳۰ - ۲۴۳ / ۶۰۴۷

حکومت صوبجات متحدہ کی ترقی دیہات کی اسکیم کے سلسلہ میں ۲۶ ایورویدک اور ۲۶ یونانی دواخانے جاری کئے جانے والے ہیں - ان کے لئے اتنے ہی ویدوں اور اطبا کی ضرورت ہے - ایسے ویدوں اور اطبا کا تقرر فی الحال ۶ ماہ کے لئے ہوگا ممکن ہے کہ آیندہ اور توسیع ہو - امیدواران کو صوبجات متحدہ یا ریاست ہائے رامپور و بنارس ٹہری (گڑھوال) کا مستقل باشندہ ہونا ضروری ہے - تنخواہ ۳۵ - ۵ - ۶۵ روپیہ ماہوار - اس کے علاوہ ۸ روپیہ ماہوار متعین شدہ الاؤنس دورہ کے اخراجات کے لئے یہ مشاہرہ عارضی ہے اور اس میں مزید تخفیف ممکن ہے - امیدوار کو بورڈ آف انڈین میڈیسنز صوبجات متحدہ (Board of Indian Medicine U.P.) کے درجہ الف (A Class) کا رجسٹرڈ وید یا طبیب ہونا ضروری ہے - بنارس ہندو یونیورسٹی کے ایورویدک کالج اور مسلم یونیورسٹی علیگڈھ کے طبیہ کالج کے سند یافتہ امیدواران کو ترجیح دیجائے گی - امیدواران کی عمر یکم دسمبر ۱۹۳۸ء کو عموماً ۲۵ اور ۴۵ سال کے درمیان ہونی چاہئے - درخواستیں ۵ دسمبر ۱۹۳۸ء تک داخل ہو جانی چاہئیں - درخواست کا مجوزہ فارم اور مزید اطلاعات سکریٹری صاحب پبلک سروس کمیشن صوبجات متحدہ - الہ آباد سے درخواست کرنے پر دستیاب ہو سکتے ہیں -

الہ آباد - ۲۸ اکتوبر ۱۹۳۸ء

سیاسیات یورپ

(۹)

ڈی ولیرا

اس وقت جتنے ڈکٹیٹر حکمراں ہیں ان میں سے اکثر ایسے ہیں جو بیرون ملک کے باشندے ہیں اور انھیں میں سے ایک ڈی ولیرا بھی ہے۔ ہر ہٹلر آسٹریا میں پیدا ہوا۔ پلسڈسکی (پولینڈ کا حکمران) لتھونیا کا باشندہ ہے۔ اسٹالین جارجیا کا رہنے والا ہے اور کمال اتاترک، سلونیکا (یونان) میں پیدا ہوا تھا۔ جب کمال اتاترک بچہ تھا تو سالونیکا، سلطنت ترکی ہی میں شامل تھا، ریوا بھی اسی طرح آسٹریا کا حصہ تھا جب شوشنگ اسکول میں تعلیم پاتا تھا، لیکن ڈی ولیرا کی جائے پیدائش تو اس کے پایۂ تخت سے تین ہزار میل دور واقع ہے۔

یہ ۱۸۸۲ء میں بمقام نیویارک پیدا ہوا۔ اس کا باپ اسپین کا رہنے والا تھا لیکن ہجرت کرکے امریکہ چلا گیا تھا اس کی ماں بیشک آئرلینڈ کی رہنے والی تھی لیکن وہ بھی امریکہ چلی گئی تھی، الغرض ڈی ولیرا اپنی پیدائش کے لحاظ سے امریکن تھا، اور اسی چیز نے فی الحقیقت اس کی جان بچائی۔ کیونکہ جب ۱۹۱۶ء میں آئرلینڈ کے اندر بغاوت ہوئی، اور باغی سرداروں کو برطانوی فوجی عدالت سے قتل کی سزائیں دیجانے لگیں تو ڈی ولیرا سزائے موت سے صرف اس سے بچگیا کہ وہ امریکہ کا باشندہ تھا اور یہ کچھ مناسب نہیں سمجھا گیا کہ امریکہ کو شکایت کا موقع دیا جائے۔ اگر اتفاق سے ڈی ولیرا امریکن نہ ہوتا تو اسوقت آئرلینڈ کی تاریخ کسی اور طرح مرتب کی جاتی اور ہوسکتا ہے کہ وہ بدستور غلام بنا رہتا۔

دنیا میں ایسے سیاسی رہنما بہت کم ہوئے ہیں جن کو دنیا ان کے پیارکے نام سے پکارتی ہو، لیکن آئرلینڈ میں ہر شخص ڈی ولیرا کو ڈیو ہی کے نام سے پکارتا ہے اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ ملک میں کتنا ہر دلعزیز ہے اور لوگ اس سے کتنی محبت کرتے ہیں

وہ ٹھیک ساڑھے نو اور دس کے درمیان صبح دفتر آجاتا ہے اور سب سے پہلے وہ ان محکموں کے تمام افسروں سے گفتگو کرتا ہے جو براہ راست اس کی نگرانی میں ہیں اور ایک ایک بات کو نہایت تفصیل کے ساتھ سمجھتا ہے وہ دوپہر کا کھانا کھانے گھر جاتا ہے اور پھر فوراً دفتر واپس آجاتا ہے اور شام کو ۶ بجے تک کام کرتا رہتا ہے، اس کے بعد چار پینے گھر جاتا ہے اور اکثر وبیشتر پھر پلٹ آتا ہے۔ آدھی رات کو دفاتر حکومت کی عمارتوں کے پاس سے گزرنے والے اکثر دیکھتے ہیں کہ پریسیڈنٹ کے کمرہ میں روشنی ہورہی ہے۔ وہ سوائے اس صورت کے کہ بیمار پڑ جائے کبھی تعطیل نہیں مناتا اور نہ چھٹی لیتا ہے۔ وہ نہایت مضبوط گٹھے ہوئے جسم کا انسان ہے۔ نہایت اچھا شہسوار ہے اور تقریباً ہر اتوار کو وہ ڈبلن سے دس میل کے فاصلہ پر پہاڑیوں پر چڑھنے اترنے کی ورزش میں مصروف دیکھا جاتا ہے، ڈرائیور موٹر کو آہستہ آہستہ لیجاتا ہے اور وہ موٹر کے پیچھے پیچھے برہنہ سر تیز قدموں سے پیدل چلتا رہتا ہے۔ وہ اتنا تیز رفتار ہے کہ اس کے اعزہ و احباب کوئی اس کا ساتھ نہیں دے سکتے۔ اس کے ساتھ آٹھ محافظ خفیہ پولیس کے بھی رہتے ہیں لیکن وہ اسے گھیرے نہیں رہتے بلکہ پیچھے پیچھے چلتے ہیں، وہ ہمیشہ سیاہ لباس استعمال کرتا ہے اور برانڈی یا وھسکی کبھی نہیں پیتا، اب وہ تمباکو بھی نہیں استعمال کرتا حالانکہ ۱۹۱۶ء میں وہ اس کا بڑا شایق تھا۔ کہا جاتا ہے کہ جس وقت بغاوت کے سلسلہ میں وہ گرفتار کیا گیا تو پائپ پی رہا تھا۔ اس نے فوراً اسے ہاتھ سے پھینک دیا اور ہمیشہ کے لئے تمباکو پینا چھوڑ دیا

جب تک اس کی بینائی اچھی رہی وہ کتابوں کے مطالعہ کا بڑا شایق تھا، لیکن اب اسے شطرنج، ریڈیو اور ریاضی سے بہت دلچسپی ہے۔ اس کی بیوی شادی سے قبل اس مدرسہ میں ملازم تھی جہاں ڈی ویلرا پڑھتا تھا، بعد کو ۱۹۱۰ء میں اسی سے شادی ہوگئی اور سات بچے ہوئے۔ ڈی ویلرا اپنی بیوی بچوں سمیت ایک نہایت سادہ اور معمولی مکان میں رہتا ہے۔ ان کے پاس صرف ایک ملازم ہے اور ایک خادمہ۔ ۱۹۳۲ء سے قبل وہ اس سے بھی زیادہ مختصر مکان میں رہتا تھا اور نوکر بھی کوئی نہ تھا۔ سارا کام میاں بیوی خود اپنے ہی ہاتھ سے کرتے تھے

ڈی ویلرا لوگوں سے ملنے میں بہت فراخدل ہے اور بکثرت لوگ اس سے ملنے آتے ہیں، اس کے احباب بھی بہت ہیں، لیکن عورتوں کی صحبت سے وہ اجتناب کرتا ہے۔ اسے روپیہ سے کوئی دلچسپی نہیں ہے، اس نے عہدۂ صدارت قبول کرنے پر اپنی تنخواہ گھٹا کر ۲۵۰۰ پونڈ سے ۱۵۰۰ پونڈ کردی۔ ذاتی ذریعۂ معاش اس کا کوئی نہیں ہے اور نہ وہ تعیش کا عادی ہے، موسیقی کا البتہ بہت شایق ہے اور مذہب کا بھی پابند ہے۔ ہنسی مذاق سے اسے دلچسپی نہیں لیکن جب ہنستا ہے تو دل کھول کر ہنستا ہے۔ وہ بڑا ضابط، متحمل اور سنجیدہ ہے، جذبات سے بہت کم مغلوب ہوتا ہے، جب وہ کسی پبلک جلسہ میں شریک ہونے جاتا ہے تو وہ نہ مسکراتا ہے، نہ سر کے اشارے سے لوگوں کے خیر مقدم کو قبول کرتا ہے، وہ سیدھا چلا جاتا ہے اور ایسے انداز سے گویا یہاں کوئی آدمی موجود ہی نہیں ہے۔

ڈی ویلرا کی عمر دو سال کی تھی کہ اس کے باپ کا انتقال ہو گیا اور اسے اس کا ماموں امریکہ سے آئرلینڈ لے آیا اس کی ماں وہیں امریکہ میں رہ گئی اور کسی اور سے شادی کرلی۔ ڈی ویلرا کی تعلیم ننہیال ہی میں ہوئی اور رائل یونیورسٹی سے نکل کر کسی مدرسہ میں معلم ہو گیا اور یہیں سے اس کی انقلاب انگیز زندگی شروع ہوئی۔

اس وقت یورپ کے اکثر ممالک میں ڈی ویلرا کی ذہنیت کے نوجوان پائے جاتے ہیں لیکن اس کی سی خصوصیات کسی میں نہیں پائی جاتیں۔ یہ ابتدا ہی سے بہت زیادہ انتہا پسند تھا جس وقت پیرس، میکڈوف، میکڈوناعف نے آئرلینڈ میں جمہوریت کا اعلان کیا تو یہ وہ وقت تھا کہ کامیابی کی کوئی امید نہ تھی اور اس تحریک میں حصہ لینا گویا خودکشی کرنا تھا لیکن ڈی ویلرا ان لوگوں کے ساتھ شریک ہو گیا۔ یہ تحریک ایک ہفتہ کی جنگ کے بعد ختم ہو گئی اور تمام لیڈر قتل کئے گئے، ڈی ویلرا محض امریکن ہونے کی وجہ سے بچ رہا۔ اس کے بعد وہ بغاوت رونما ہوئی جو ایسٹر بغاوت (Easter Rebellion) کے نام سے مشہور ہے۔ اس میں ڈی ویلرا نے باقاعدہ انگریزی فوجوں کا مقابلہ کیا اور بغاوت فرو ہونے کے بعد بھی اظہار اطاعت نہیں کیا۔ فوجی عدالت نے اس کو سزائے موت کا حکم دیا لیکن چونکہ اس وقت برطانیہ کو توقع تھی کہ امریکہ بھی ان کے ساتھ جنگ عظیم میں حصہ لیگا، اس لئے ڈی ویلرا کو قتل نہ کیا گیا بلکہ حبس دوام کی سزا تجویز کی گئی۔ یہ ایک سال تک ڈارٹمور میں قید رہا تھا کہ ۱۹۱۷ء میں عام صلح کا اعلان ہوا اور اس سلسلہ میں وہ چھوڑ دیا گیا لیکن ۱۹۱۸ء میں پھر گرفتار کر کے لنکن جیل بھیج دیا گیا۔ یہاں سے وہ اپنے دوستوں کی مدد سے بھاگا اور مانچسٹر آکر ایک پادری کے مکان میں اس نے پناہ لی، یہاں سے وہ لیورپول گیا اور پھر آئرلینڈ پہونچا۔ ہر چند اس کی گرفتاری کے لئے تمام ملک میں خفیہ پولیس والے دوڑتے پھرتے تھے لیکن وہ کسی کے ہاتھ نہ آیا۔ پھر یہ امریکہ گیا اور وہاں سے لوگوں کی ہمدردی حاصل کر کے آئرلینڈ کی آزادی کے لئے کچھ چندہ فراہم کیا اور بڑی دشواریوں سے ۱۹۲۰ء میں آئرلینڈ پہونچا۔

اس کے بعد آزادی آئرلینڈ تک جو زمانہ بسر ہوا، وہ نہایت خوفناک قسم کی کاوش کا تھا، اور بار بار ناامیدیوں کا سامنا اسے ہوا، لیکن وہ برابر کوشش میں لگا رہا اور آخر کار اس نے اپنے ساتھیوں کی مدد سے قومی مجلس (نیشنل اسمبلی) قائم کرلی اور بادشاہ کی اطاعت کا حلف اٹھانے سے انکار کر دیا۔ اس کے بعد جو خانہ جنگی وہاں شروع ہوئی وہ تاریخ آئرلینڈ کا نہایت اہم واقعہ ہے لیکن ڈی ویلرا برابر دلیرانہ مقابلہ کرتا رہا اور جولائی ۱۹۲۱ء میں حکومت برطانیہ اس پر آمادہ ہوئی کہ آئرلینڈ کو ڈومنین ہوم رول دیدیا جائے لیکن صوبہ السٹر کو اس سے علٰحدہ رکھا جائے، ڈی ویلرا نے اس کی مخالفت کی اور پھر جنگ شروع ہو گئی۔ ۱۹۲۲ء میں یہ خونریزی پھر ختم ہوئی اور کاسگریو کی صدارت میں یہاں حکومت قائم کی گئی۔ کاسگریو نے لائیڈ جارج کے پیش کردہ شرائط کو منظور کر کے عہد نامہ پر دستخط کرنا چاہے لیکن ڈی ویلرا نے اس کی مخالفت کی اور ہر چند اس کی جماعت اقلیت میں تھی لیکن بعد کو ۱۹۳۲ء میں لیبر پارٹی کے اتحاد سے اس نے کاسگریو گورنمنٹ کو توڑ دیا اور خود برسر اقتدار ہو کر اس وقت تک چین سے نہ بیٹھا جب تک اس نے آئرلینڈ کو پوری طرح آزاد نہ کرا لیا۔

مکتوبات نیاز

جناب ڈپٹی صاحب

کل اتفاق سے وہ راستہ میں ملے جن سے آپ خفا ہیں۔ میں آپ سے سفارش تو نہیں کرتا، لیکن یہ ضرور پوچھوں گا کہ جس سے آپ برہم ہو جاتے ہیں وہ کیوں اس درجہ خوار ہو جاتا ہے۔ سچ ہے

تو پوچھتا نہیں، تو کوئی پوچھتا نہیں

مجھے اُن سے صرف اتنی ہی دلچسپی ہے جتنی غالب کو "اسلام" سے کہ وہ انھیں "آوارۂ غربت" دیکھ سکتا تھا اور نہ میں ان کو۔ میں نے اُس وقت تو اس کا ذکر مناسب نہیں سمجھا، لیکن آج صبح وہ آئے تو میں نے پوچھا غریب آنسو بھر لائے۔ مجھ پر اس کا اتنا اثر ہوا کہ تھوڑی دیر کے لئے میں آپ سے متنفر ہو گیا اور کوشش کی کہ انھیں بھی باغی بنا دوں، لیکن کامیاب نہ ہوا۔ بہرحال اگر غلطی کا اعتراف کوئی معنی رکھتا ہے تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ وہ سراپا "اعتراف" ہیں اور اس سزا کو قبول کرنے کے لئے تیار جو ایک محبت کرنے والے کی طرف سے دوسرے محبت کرنے والے کو دیجا سکتی ہے۔ پھر اگر گناہ و گنہگار میں کوئی فرق ہے تو تعزیر میں بھی ہونا چاہئے۔ بہرحال میں نے اُن کو روک لیا ہے وہ میرے ہی پاس ٹھیرے ہوئے ہیں۔ آپ ان سے ناخوش ہوں تو ہوں، میں نہیں ہوں اور جانتا ہوں کہ آپ کی برہمی بھی زیادہ پائدار نہیں۔ یہ عریضہ صرف اس لئے بھیج رہا ہوں کہ آپ کو حالات کا علم ہو جائے اور کوئی مقصود نہیں

مشفقی۔ آپ کی بیکاری کا حال سُنکر افسوس ہوا۔ اس میں شک نہیں کہ آپ کی ذمہ داریاں عرصہ تک اس کو برداشت نہیں کر سکتیں، لیکن سوال یہ ہے کہ اس کا علاج بھی کیا ہے۔ وہ زمانہ گزر گیا جب بندگی میں انسان کا بھلا ہوتا تھا، اور خدا پر ہر مخلوق کا رزق پہونچانا فرض تھا۔ اب تو جبر و اختیار کی صورت صرف یہ رکھی ہے کہ انسان بھوکا مرنے پر اختیار رکھتا ہے اور قدرت۔ رزق مہیا کرنے پر مجبور نہیں۔ رہا ایک انسان کا مرنا یا جینا، سو اس کی اہمیت کا اندازہ اس سے کیجئے کہ جب آپ چلتے ہیں تو سیکڑوں چیونٹیاں پامال ہو جاتی ہیں، لیکن

آپ کو خبر نہیں ہوتی - تو کیا خدا کو آپ اپنے برابر بھی بے نیاز ہونے کا حق نہیں دیتے - اگر خدا کا وجود ہے تو یقیناً انسان اس کے مقابلہ میں اس سے زیادہ فروتر ہے جتنی چیونٹی آپ کے مقابلہ میں

اس سے مدعا صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ اگر بیروزگاری کے باب میں آپ صرف خدا پر بھروسہ کر کے بیٹھ رہے تو نتیجہ یقیناً تباہی ہے - جس سے کوئی بازپرس نہ ہو سکے اس سے دور ہی رہنا بہتر ہے

افسوس ہے کہ نوکری کی عمر آپ کی رہی نہیں، اور ہوتی بھی تو ملتی کہاں ہے، اس لئے اس کی فکر تو آپ کیجئے نہیں - پیشہ اور کاروبار کی حالت بھی خراب ہے، لیکن بہرحال آبادی کا بڑا حصہ اسی پر زندگی بسر کر رہا ہے، اسلئے میری رائے میں اگر کسی چلتے ہوئے کارخانہ کی ایجنسی مل جائے تو بہتر ہے - ضمانت وغیرہ کی ضرورت ہوئی تو اسکا انتظام میں کر دوں گا

آپ میاں صاحب سے تو ملئے دیکھئے کیا کہتے ہیں

قبلہ شیخ صاحب،

گرامی نامہ پہونچا - یقیناً نہ میں آپ کا سا تجربہ رکھتا ہوں، نہ آپ کی سی عقل و فراست، لیکن اسکا کیا علاج کہ مجھے اپنی ناتجربہ کاری و حماقت دونوں بہت عزیز ہیں کیونکہ وہ میری اپنی ہی ہیں

آج نہیں بلکہ ہمیشہ سے مجھ میں یہ عیب چلا آ رہا ہے کہ جو کچھ دیکھوں اپنی آنکھ سے دیکھوں، اور جو کچھ سمجھوں خود اپنی فکر سے سمجھوں - پھر اس بدقسمتی کا کیا علاج کہ "گوشِ سخن شنو اور دیدۂ اعتبار" سے کوئی ایک چیز بھی فطرت کی طرف سے مجھے نہیں ملی

آپ کی محبت و ہمدردی میں کلام نہیں لیکن آپ مجھ ایسے سیہ بخت پر اس کا صرف بیجا کیوں کریں - آپ جس کے نام لیوا ہیں، اسی کا میں بھی ہوں - فرق صرف یہ ہے کہ آپ اس سے ڈرتے ہیں، میں محبت کرتا ہوں، اور محبت کرنے والے کو کبھی کبھی استغنا پیدا ہو ہی جاتا ہے

آپ نے مجھ سے زیادہ زمانہ دیکھا ہے اور یقیناً آپ بہتر جانتے ہیں کہ زندگی بسر کرنے کا صحیح طریقہ کیا ہے، لیکن دنیا میں ایسے لوگ بھی گاہے گاہے پیدا ہو جاتے ہیں جو تماشائی نہیں بلکہ تماشہ بنکر جینا پسند کرتے ہیں - پھر کچھ تو فرقِ میر سے اپنے درمیان رہنے دیجئے، خواہ وہ فرق فردوس و جہنم ہی کا کیوں نہ ہو

آخر کار آپ کی نظر مجھے کھا گئی نا! میں کہتا تھا کہ دیکھئے میری صحت پر رشک نہ کیجئے، آپ کی "نگاہ خارا شکن" بلائے بد ہے، لیکن آپ نہ مانے اور مجھے بیمار ڈال دیا - اس دوران میں، حالت اتنی خراب ہو گئی تھی کہ اگر میں

آپ کی طرح دولت مند ہوتا تو وصیت نامہ وغیرہ بھی لکھ ڈالتا۔ لیکن قدرت کو شاید منظور تھا کہ آپ کے مقابلہ میں مجھے شکست ہو۔ اس لئے بچ گیا اور اب بالکل اچھا ہوں۔ اب سے ۶، ۷ ماہ قبل جب میں حیدرآباد گیا تھا تو وہیں سے بیمار آیا تھا اور میں کہ اپنی بدقسمتی سے واقف ہونے کی بنا پر ہر معاملہ کو انتہائی بدظنی کے ساتھ دیکھتا ہوں، سمجھ چکا تھا کہ یہ موت کا پہلا اور آخری اعلانِ جنگ ہے۔ دل و دماغ دونوں بیکار ہو چکے تھے اور کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ دفعتاً ایسا کیوں ہوا۔ میں اس کا قایل تو ہوں نہیں کہ موت کا وقت مقرر ہے اور کچھ کیجئے وہ اُسوقت پر آئے گی ضرور، اس لئے تنہائی میں ان اسباب پر بھی غور کرتا جاتا تھا، جنھوں نے دفعتاً میری حالت کو اتنا متغیر کر دیا

حیدرآباد سے لکھنؤ واپس آنے کے بعد متعدد دورے مجھ پر پڑے اور رفتہ رفتہ حالت یہ ہوگئی کہ ضیق نفس سے سانس لینا دشوار ہوگیا اور قلب پر ہر وقت غیر معمولی دباؤ محسوس ہونے لگا۔ ڈاکٹروں نے دیکھا تو کہا کہ نہ خون میں دباؤ ہے، نہ قلب کو کوئی آزار، لیکن پھر کیا ہے؟ اسے وہ خود بھی نہ سمجھ سکے۔ آخرکار میں نے خود اپنا علاج شروع کیا، یعنی اُن تمام فطری ذرائع پر غور کیا جو صحت انسانی کے لئے ضروری ہیں اور اپنی زندگی کا بالکل نیا پروگرام مرتب کیا، کھانا پینا، اُٹھنا بیٹھنا، سونا جاگنا، سب کا اسلوب بدل دیا اور آپ یہ سنکر حیران ہوں گے کہ ایک ہفتہ کے اندر حالت کچھ سے کچھ ہوگئی

میں اب اپنے آپ کو پہلے سے زیادہ صحیح و توانا محسوس کرتا ہوں اور ایک خاص نشاط کی کیفیت اپنے اندر پاتا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ آپ یہ سنکر کہیں گے کہ مجھے بھی یہ تدبیر بتاؤ لیکن اس وقت تک کبھی نہ بتاؤں گا جب تک آپ میری ہی طرح ایک بار بیمار پڑ کر نہ دکھا دیں۔ آپ کو کیا خبر کہ اس دوران میں کتنی تکلیف، کتنی روحانی اذیت مجھے پہونچی ہے اور اب اس کے ازالہ سے مجھے کتنی مسرت ہے — اتنی کہ میں آپ کو بتانا چاہوں بھی تو دفعتاً نہیں بتا سکتا

اب جو آپ آئیں، تو میرے لئے وہاں سے وہ تمام چیزیں لیتے آئے گا جو تنہائی بدپرہیزی کے لئے ضروری ہوتی ہیں۔ ایک بار یوں بھی امتحان کر کے دیکھنا ہے

باب الاستفسار

اچ۔ جی ویلز اور اسلام

(ام۔ اے۔ انعام الٰہی صاحب۔ کراچی)

آپ نے ایچ جی ویلز کی کتاب "شورٹ ہسٹری آف دی ورلڈ" ضرور دیکھی ہوگی اور "اسلام اینڈ محمد" کے زیر عنوان اس کے خیالات بھی پڑھے ہوں گے اور یہ بھی یقین ہے کہ آپ نے اگر اس کو بے انصافی کا نہیں تو بے خبری کا ملزم ضرور گردانا ہوگا، اگرچہ ایچ۔ جی۔ ویلز کا حضرت محمد اور اسلام کے صحیح حالات سے بے خبر ہونا تعجب خیز بات ہے۔

مسلمانوں نے اس کے جواب میں انڈیا ہاؤس کے سامنے مظاہرہ کیا اور اب ہندوستانی مسلم اخبارات اس کے خلاف بہت کچھ لکھ رہے ہیں۔ ممکن ہے۔ یہ کوئی کارآمد صورت جواب کی ہو۔ اور کبھی اس سے فائدہ ہوا ہو اور اس وجہ وہ معاملہ میں بالفرض محال کامیابی ہوجائے۔ یعنی "دنیا کی مختصر تاریخ" میں سے "اسلام اور محمد" والے حصے خارج کردئے جائیں۔

یہ واقعہ اور اس قسم کے صدہا واقعات روزانہ ہوتے رہتے ہیں جن سے اسلام اور حضرت محمد کی توہین کا پہلو نکلتا ہے اور ان میں سے بعض پر مسلمان شور وغل بھی مچا لیتے ہیں یہاں تک کہ بعض معاملوں میں کوئی مجاہد اسلام مجرم کو قتل تک کردیتا ہے — لیکن سوال یہ ہے کہ آیا اس قسم کی کارروائیوں سے مسلمان کیا واقعی "اسلام" کی خدمت کرتے ہیں کیا غیر مسلم اقوام کے دلوں میں اسلام اور حضرت محمد کی عزت اس قسم کی حرکتوں سے بڑھ جاتی ہے؟

براہ کرم بسلسلہ استفسار جواب اس معاملہ پر اپنے خیالات کا اظہار کریں کہ غیر مسلم اقوام کی طرف سے "اسلام اور بانی اسلام" پر اس قدر خلاف حقیقت قسم کے حملے کیوں ہوتے رہتے ہیں — اور پھر جب ہوتے ہیں تو وہ کونسا بہترین طریق جواب ہے جو مسلمانوں کو اختیار کرنا چاہئے

(نگار) آپ کے استفسار کے دو ٹکڑے ہیں۔ ایک یہ کہ غیر مسلم مورخین و محققین کیوں غلط واقعات درج کرتے

اسلام و بانیٔ اسلام کی توہین کرتے ہیں اور دوسرے یہ کہ جو طریقہ احتجاج کا مسلمان اختیار کرتے ہیں وہ مفید ہے یا نہیں۔

۱۔ غیر مسلم مصنفین دو قسم کے ہیں، ایک وہ جو خود بھی کسی مذہب کے پابند ہیں اور دوسرے وہ جو کوئی مذہب نہیں رکھتے اور جنھیں آزاد خیال (Free thinkers) کہتے ہیں۔ یقیناً ان دونوں کے زاویہ ہائے نگاہ میں فرق ہوتا ہے اور رہنا چاہئے۔ وہ جماعت جو کسی مذہب کی پابند ہے اور کورانہ تقلید کے ساتھ پابند ہے، وہ تو قصداً کرکے تعلیمات اسلام میں نقص نکالتی ہے اور سیرۃ نبوی و تاریخ اسلام کا مطالعہ صرف اس نکتہ چینی کی غرض سے کرتی ہے، اور اسے کرنا چاہئے۔ اس عیب سے مسلمان بھی پاک نہیں، کیونکہ وہ بھی جب غیر مذاہب کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیشہ انھیں باتوں کو ابھارتے ہیں جو قابل اعتراض ہوتی ہیں۔

اب رہ گئی دوسری جماعت جو صرف تحقیق حق کی غرض سے مذہبی انتقاد کی طرف مائل ہے، اس کے متعلق یہ خیال کرنا کہ بالارادہ اسلام یا بانیٔ اسلام کی توہین کرتی ہے، درست نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ایسے مورخین کو اسلام کیا کسی مذہب سے بھی دلچسپی نہیں، لیکن کسی امر سے دلچسپی نہ ہونا اس کو مستلزم نہیں کہ اس کی مخالفت بھی کی جائے اور اس لئے ان کی مخالفت کو بغض و عناد سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔

افسوس ہے کہ خود مسلمانوں کی جماعت بھی اس باب میں انصاف سے کام نہیں لیتی اور چونکہ وہ اندھی تقلید میں مبتلا ہے اس لئے خود اس کو اپنے معائب یا اپنی کمزوریوں پر نگاہ ڈالنے کی توفیق نہیں ہوتی۔ دیکھنا یہ چاہئے کہ غیر مسلم لوگ جو اعتراضات اسلام پر کرتے ہیں یا نقائص سیرۃ نبوی میں نکالتے ہیں، ان کی بنیاد کیا ہوا کرتی ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ جو کچھ کہتے ہیں یا جو نتیجہ نکالتے ہیں اس کا ماخذ اسلامی روایات ہی ہوتی ہیں، ایسا تو وہ کر نہیں سکتے کہ دوسرے مذاہب یا دوسری اقوام کی کتابوں سے استناد کرتے ہوں۔

"رنگیلا رسول" کا ماخذ بھی آپ ہی کا مذہبی لٹریچر تھا اور نسٹرل نے جو انتقاد قرآن پر کیا ہے وہ بھی احادیث ہی کی بنا پر ہے۔ اس لئے فی الحقیقت قابل الزام تو خود ہمارے ہی جامعین احادیث، ہمارے ہی مفسرین قرآن اور ہمارے ہی مورخین اسلام ہیں جنھوں نے روایات کو بے سمجھے بغیر انھیں صحیح تسلیم کر لیا اور اس قدر انھیں رواج دیا کہ اسلام کا مفہوم سوائے اوہام پرستی و غیر عاقلانہ معتقدات کے اور کچھ نہ رہا۔

اب رہا ایسی تصانیف کے خلاف اس قسم کا احتجاج جیسا کہ عام طور پر رائج ہے، سو میری رائے میں اس سے زیادہ اظہار کمزوری کا مسلمانوں کی جانب سے اور ہو ہی نہیں سکتا۔ اگر ایک شخص رسول اللہ کے کیرکٹر کو بدنما ظاہر کرتا ہے تو ہمارا فرض صرف یہ ہے کہ اس کے استدلال کو غلط ثابت کریں۔ کسی کو مار ڈالنا یا جھنڈے اور جلوس نکالنا نہ کوئی منطقی استدلال ہے، نہ علمی حجت ہے۔ اس سے زیادہ سے زیادہ آپ یہ ثابت کر سکتے ہیں کہ آپ کو مذہب سے محبت ہے اور اس کے باب میں جان لینے اور جان دینے سے بھی احتراز نہیں کر سکتے لیکن اس طریق عمل سے

نہ آپ دوسروں میں اسلام کی محبت پیدا کر سکتے ہیں اور نہ اہل علم و عقل پر اس کی صداقت ثابت ہو سکتی ہے۔

اسوقت تک آریوں اور مشنریوں کی طرف سے بکثرت ایسی کتابیں شایع ہو چکی ہیں جن میں رسول اللہ کی سیرت کو داغدار اور قرآن مجید کو ناقص و نامکمل تصنیف ظاہر کیا گیا ہے اور ان سب میں اسی روایتی لٹریچر سے مدد لی گئی ہے جو مسلمانوں کے یہاں مستند سمجھا جاتا ہے (مسلم و روایات بخاری وغیرہ) اس لئے جواب کی معقول صورت یہی ہو سکتی ہے کہ یا تو مسلمان خود ان روایات کی تکذیب کریں یا اپنی کتابوں سے نکال دیں۔ لیکن یہ کام مولویوں کا ہے جو انھوں نے کبھی نہیں کیا اور نہ آیندہ کریں گے۔

پھر جب حالات یہ ہیں تو مسلمانوں کو چاہئے کہ جب کوئی اس قسم کا الزام اسلام یا بانی اسلام پر قایم کیا جائے تو وہ مذہبی علماء سے جواب کا مطالبہ کریں پھر اگر انکا جواب معقول ہوگا تو دنیا خود اسے تسلیم کریگی اور اگر نہیں ہے تو یہ خود اپنی کمزوری ہے جس کو تیغ و خنجر یا شور و واویلا سے دور نہیں کیا جا سکتا۔

مسلمانوں کا یہ مجاہدانہ جذبہ کہ وہ ہر مخالف اسلام کے درپئے آزار ہو جاتے ہیں، حد درجہ جاہلانہ و سفیہانہ جذبہ ہے اور اس سے مخالفین کو اور زیادہ یہ سمجھنے کا موقعہ ملتا ہے کہ اسلام کی تعلیم ہی خونریزی ہے اور خونریزی ہی سے اس کی اشاعت ہوئی ہے۔

تاریخ اسلام کا وہ واقعہ آپ کے سامنے ہوگا کہ عہدنامہ کی عبارت میں لفظ محمد کے بعد "رسول اللہ" کے الفاظ پر فریق ثانی اعتراض کرتا ہے اور آنحضرت خود اپنے ہاتھ سے اسے قلمزد کر دیتے ہیں۔ لیکن آج مسلمان کی ذہنیت یہ ہے کہ جو شخص محمد کو رسول اللہ نہ مانے وہ واجب القتل ہے۔ اسی سے آپ کو اندازہ ہو سکتا ہے کہ عہد نبوی کا اسلام کیا تھا اور آج کل کا اسلام کیا ہے

گزشتہ جنگ عظیم

(جناب کرم الہی صاحب۔ کانپور)

اہم تاریخی واقعات اور جغرافی معلومات کو نہایت مختصر الفاظ میں قلمبند کر دینے کا جو سلسلہ باب الاستفسار میں شروع ہوا ہے اور جس سلسلہ میں انقلاب فرانس اور ہندوستان پر آپ نے معلومات فراہم کی ہیں، بہت مفید ہیں۔ براہ کرم اسی انداز سے گزشتہ جنگ عظیم پر بھی اظہار خیال فرمایئے۔

(نگار) جنگ عظیم سے وہ بین الاقوامی جنگ مراد ہے جو اگست ۱۹۱۴ء سے نومبر ۱۹۱۸ء تک دنیا میں جاری رہی

اس کی ابتدا یوں ہوئی کہ سراجیوو (Serajevo) میں جو یوگوسلیویا کا مشہور شہر ہے، فرانسیس فرڈیننڈ (Francis Ferdinand) کو سربیا کے ایک باشندے نے قتل کر دیا۔ آسٹریا نے انتقاماً جولائی ۱۹۱۴ء میں سربیا پر حملہ کر دیا۔ روس سربیا کی مدد پر آمادہ ہو گیا اور جرمنی آسٹریا کی حمایت پر۔ چونکہ فرانس و روس کا اتحاد تھا اس لئے فرانس کے خلاف بھی اعلان جنگ کر دیا گیا اور بلجیم پر حملہ کرنے کی وجہ سے برطانیہ کو بھی اس میں حصہ لینا پڑا۔ لڑائی شروع ہونے کے بعد ترکی اور بلغاریہ بھی جرمنی کے ساتھ شریک ہو گئے۔

ان فریقین میں اتحادیین (یعنی فرانس، برطانیہ و روس) کے ساتھ ۱۹۱۴ء میں جاپان اور اٹلی نے اور ۱۹۱۶ء میں رومانیا نے بھی شرکت کر لی۔ بعد کو پرتگال بھی ساتھ ہو گیا اور اپریل ۱۹۱۷ء میں امریکہ بھی۔

اس جنگ میں ۳۰ کروڑ مسلح سپاہیوں نے حصہ لیا اور جتنا روپیہ اس میں صرف ہوا اس کی نظیر تاریخ میں کہیں نہیں ملتی۔ اس جنگ کے دو محاذ تھے مشرقی اور مغربی۔ مغربی محاذ میں جرمنی کے مقابل برطانیہ و فرانس تھے اور مشرقی محاذ میں روس۔ اٹلی کے سرحد میں جو لڑائیاں ہوئیں انھیں مغربی محاذ ہی کا جزو سمجھنا چاہئے اور بلقان کی جنگ کو مشرقی محاذ کا حصہ۔ ترکی نے گیلی پولی اور عراق میں اتحادیین کو اُلجھائے رکھا۔

جرمنی کے مستعمرات پر بھی حملہ کیا گیا۔ چنانچہ جاپان نے کیاؤ چو پر قبضہ کر لیا اور افریقی مستعمرات بحر جنوب کے جزائر پر برطانیہ قابض ہو گیا۔

اتحادیین اور خصوصیت کے ساتھ برطانیہ کے بحری بیڑے نے بڑا کام کیا کیونکہ بغیر اس کے افواج اور سامانِ حرب کی نقل و حرکت دشوار تھی۔ اس بیڑے نے جرمن بیڑے کو باہر نہ نکلنے دیا اور تمام جرمن بندرگاہوں کا راستہ مسدود کر دیا۔ اس میں شک نہیں کہ جرمن آبدوزوں نے ۱۹۱۶ء و ۱۹۱۷ء میں اتحادیین کے جہازوں کو بہت نقصان پہونچایا لیکن اس سے کوئی مفید نتیجہ نہ نکلا۔

۱۹۱۴ء میں جرمن افواج پیرس کے قریب تک پہونچ گئیں اور روس مشرقی پروشیا اور آسٹریا پر حملہ آور ہوا لیکن یہ دونوں اقدامات ناکام رہے۔ ۱۹۱۵ء میں زیادہ تر خندقوں کی لڑائی ہوئی جو ساحل بلجیم سے لیکر سوئٹزرلینڈ تک پھیلی ہوئی تھیں۔ اسی سال برطانوی افواج نے گیلی پولی پر قبضہ کر لیا لیکن اختتام سال سے قبل ہی انھیں واپس ہونا پڑا۔ عراق میں جنگ کرنے کے لئے ہندوستانی فوج بھیجی گئی تھی لیکن وہ بھی ناکام رہی۔ روس کی کامیابیاں بھی عارضی ثابت ہوئیں اور پولینڈ پر جرمنی افواج چھا گئیں۔ سربیا کا بھی یہی حشر ہوا اور اٹلی بھی آسٹریا کا کچھ بگاڑ نہ سکا۔

۱۹۱۶ء میں برطانیہ میں وہ مشہور حملہ کیا جو جنگ سوم کے نام سے مشہور ہے اور فرانس اور جرمن میں رڈون کے قبضہ کے لئے نہایت سخت جنگ ہوئی۔ جرمن نے رومانیا کو فتح کر لیا اور برطانیہ کو عراق میں شکست ہوئی

روس بھی بہت کمزور پڑ گیا اور اٹلی تو خیر پہلے ہی سے مضمحل تھا۔

۱۹۱۷ء کا خاص واقعہ امریکہ کی شرکت اور روس کا ڈھیر ہو جانا ہے جس نے آخری بار اپنی پوری کوشش ختم کر دینے کے بعد جرمن سے صلح کر لی اور اپنا پیچھا چھڑا لیا۔ اسی سال اٹلی کی مدد کے لئے برطانوی اور فرانسیسی افواج بھی روانہ کی گئیں کیونکہ اُسے آسٹریا کے محاذ میں شکست ہوئی تھی۔

۱۹۱۸ء میں اپنی آخری جارحانہ جنگ میں انگریزوں کو سخت شکست دی اور فرانسیسیوں کو پیرس تک بھگا چھوڑا، لیکن امریکن افواج کی آمد نے ہوا کا رُخ بالکل بدل دیا اور نتیجہ یہ ہوا کہ جرمنی اور اس کے ساتھیوں کو ہر جگہ شکست پر شکست ہونے لگی۔ جرمنی کے ہاتھ سے تمام مفتوحہ علاقے نکل گئے، آسٹریا، اٹلی سے مغلوب ہو گیا۔ ترکی فوجیں بھی تباہ ہوئیں اور بلغاریہ بھی۔ آخر کار انھوں نے یکے بعد دیگرے صلح کی درخواست کی اور ۱۱ نومبر ۱۹۱۸ء کو یہ جنگ ختم ہو گئی۔

شرائط صلح پیرس میں بیٹھ کر طے کئے گئے اور جس صلحنامہ کی رو سے یہ لڑائی ختم ہوئی اس کا نام صلحنامۂ ورسیلز ہے۔
اس جنگ سے جرمنی کو یورپ میں جو سخت نقصان پہونچا اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ۲۵۰۰۰ مربع میل ملک اور ساڑھے چھ ملین آبادی اس کے ہاتھ سے نکل گئی یورپ سے باہر ۱۱۰۰۰۰۰ مربع میل زمین اور تیرہ ملین آبادی اس کی حکومت سے علحدہ ہو گئی۔

اس صلحنامہ کی رو سے السال اور لورین فرانس کو ملے، زیریں سلیشیا، پولینڈ کو دیا گیا، اضلاع میمل، لیتھونیا کو دے دئے گئے، شلسوگ کا ایک حصہ، ڈنمارک کو ملا اور متعدد سرحدی اضلاع بلجیم کو۔ سواحل رہائن کو غیر مسلح کر دیا گیا، سار کا علاقہ بین الاقوامی کمیشن کے انتظام میں دیدیا گیا اور مستعمراتی مقبوضات اتحادیین کے ہاتھ آ گئے۔

آیندہ جنوری ۳۹ء کا نگار

یعنی مصحفی نمبر طیار ہے

اور اپنی جامعیت کے لحاظ سے اردو شاعری کی تاریخ میں بالکل پہلی چیز ہے — مصحفی کا مرتبہ اسوقت تک لوگوں نے نہیں پہچانا اور اب بالکل پہلی مرتبہ آپ کو معلوم ہو گا کہ وہ کیسی غیر معمولی ہستی تھا —
مصحفی کے غیر مطبوعہ دواوین اور غیر مطبوعہ مثنویوں کا انتخاب — مصحفی کی غزلیات پر بالکل جدید اُصول انتقاد کے لحاظ سے تفصیلی تبصرہ — مصحفی کے شاگردوں کے متعلق ایک عالمانہ ریسرچ — مصحفی کے تذکروں اور دیگر تصانیف پر ایک فاضلانہ انتقاد — اور اسی طرح کے بہت سے عنوانات پر بے مثل مضامین آپ کو اس نمبر میں نظر آئیں گے۔ ضخامت کا اندازہ ۲۰۰ صفحات کیا گیا ہے لیکن ممکن ہے اس سے بڑھ جائے۔ غیر خریداران نگار کے لئے اس نمبر کی قیمت دو روپیہ مقرر ہے — اگر آپ نگار کے خریدار ہیں تو خریداری کے سلسلہ کو جاری رکھئے تاکہ یہ نمبر آپ کو مل سکے۔

منیجر نگار۔ لکھنو

غم

تجھے اے فطرتِ انساں مسرت کی تمنا ہے
اسی کو حاصلِ عمرِ دو روزہ تو نے سمجھا ہے

نشاط و عیش ہی تیرے لئے سب کچھ ہیں دنیا میں
نہیں کچھ اور گنجائش تری چشمِ تماشا میں

مگر ناداں یہ تیری بھول ہے، یہ تیری غفلت ہے
جسے تو نے سمجھ رکھا ہے عشرت، وجہِ کلفت ہے

نشاط و عیش کے مفہوم سے ناآشنا ہے تو
فریبِ زندگی کی شعلہ رنگی پر فدا ہے تو

ابھی اک دائمی عشرت سے ناواقف ہے دل تیرا
تجھے بڑھنے نہیں دیتا ہے ذوقِ مضمحل تیرا

ابھی محروم ہے تو لذتِ غم کی لطافت سے
ابھی تاباں کہاں ہے دل ترا دردِ محبت سے

ابھی پیدا نہیں ہے سوزِ فطرت تیرے سینے میں
ابھی مصروف ہے تو بادۂ رنگین پینے میں

جو ہو جائے رسا تیری نظر غم کی حقیقت تک
تو اک دن تو پہونچ جائے مقامِ آدمیت تک

اگر ہے روح تیری تشنہ و مضطر تو جرأت کر
نشاطِ زندگی کو مستقل کرنے کی صورت کر

وہ خوش قسمت ہے جس کو نعمتِ غم شاد کرتی ہو
یہ وہ دولت ہے جس سے روح کی دنیا سنورتی ہو

نیازِ عشق میں ہوتی ہے غم سے دلکشی پیدا
اسی شوق سے ہوتا ہے نورِ بندگی پیدا

ظہورِ غم سے جذبے روح کے بیدار ہوتے ہیں
سلیقے نالہ و فریاد کے ہموار ہوتے ہیں

جسے عرفانِ غم حاصل ہوا سب کچھ ملا اس کو
جو سچ پوچھو تو حاصل ہو گیا قربِ خدا اس کو

خلشِ غم کی رسا ہوتی ہے جب سازِ رگِ جاں تک
تو پہونچاتی ہے انساں کو تجلی گاہِ یزداں تک

وجودِ غم سے عزت بڑھ گئی انساں کی ہستی کی
حقیقت ماند ہو کر رہ گئی عشرت پرستی کی

یہ وہ میخانہ ہے جس کی شرابِ تند پینے سے
کثافت کے نقوشِ تیرہ دھل جاتے ہیں سینے سے

بطورِ خاص یہ دولت عطا ہوتی ہے انساں کو
یہ وہ نعمت ہے جو دیتی ہے تسکیں چشمِ گریاں کو

نشاطِ غم سے تکمیلِ طلب ہوتی ہے دنیا میں
بہاریں خود چلی آتی ہیں آغوشِ تمنا میں

یہ وہ آتشکدہ ہے جس میں کوثر کی لطافت ہو
یہ ہے وہ پھول پتی میں جس کی ایک جنت ہے

یہ وہ مضراب ہے جو چھیڑتی ہے ساز کے پردے
یہ وہ جذبہ ہے اٹھ جاتے ہیں جس سے راز کے پردے

خزانے ہیں اسی لذت میں پنہاں زندگانی کے
دکھاتی ہے یہی جلوے حیاتِ جاودانی کے

یہی قوت رسا تا حدِ نورِ عرش ہوتی ہے
یہی طاقت ہے وہ جس میں خدا کی یاد سوتی ہو

بی۔ اے۔ بزمی

غزلیات :-

سکندر علی وجد بی۔ اے (عثمانیہ)

(۱)

یہ راز اہلِ ہوس کی سمجھ میں آنہ سکا
جو پاس آنہ سکا، تجھ سے دور جانہ سکا

جو دل کہ فاش کن رازہائے ہستی تھا
حریمِ ناز کا پردا کبھی اٹھا نہ سکا

ملے تو زہرِ ہلاہل سمجھ دلِ ناداں!
وہی تو آبِ بقا تھا جو ہاتھ آنہ سکا

وفورِ غم کا بُرا ہو میں آج پیشِ حبیب
طلوعِ شمس و قمر پر بھی مسکرا نہ سکا

کیا تھا عشق نے بھی آج اہتمامِ فریب
پتہ کی بات مگر رنگِ رخ چھپا نہ سکا

بیانِ غم میں بڑی احتیاط لازم ہے
تمام عمر وہ مجھ سے نظر ملا نہ سکا

سدا جنوں کو سمجھتا رہا کمالِ حیات
شریرِ عقل کے پھندے میں وجد آنہ سکا

(۲)

کہاں تھی مجھ میں سکت زور آزمانیکی
اٹھائیں عشق نے سب سختیاں زمانے کی

مری نظر نے کیا کام گدگدانے کا
نگاہِ ناز تھی تمہیدِ مسکرانے کی

مآلِ جذبۂ تکمیل اے معاذ اللہ!
عجیب چیز تھی دھن آشیاں بنانے کی

اُسی ادا سے پھر اک بار کوند اے بجلی،
چمک کے رہ گئی تقدیر آشیانے کی

رہیگا وجد بیاں عشق کا سدا یکساں
بدلتی جائیگی سرخی فقط فسانے کی

سیری، جہاں پناہ اور دہلی کہنہ خونریزی اور غارتگری کا نہایت ہولناک منظر بنے رہے۔ اس لوٹ میں اس قدر زر و جواہر نقرئی و طلائی برتن، زیورات، اور قیمتی کپڑے ہاتھ آئے کہ شاید اس سے قبل کبھی تیموری فوج کو نصیب نہ ہوئے تھے۔ علاوہ اس کے قیدیوں کی تعداد اتنی تھی کہ ہر شخص کو بیس سے لیکر ایک سو غلام تقسیم ہوئے۔ تیمور نے دہلی کے بہت سے پیشہ ور دستکار اور حرفہ جاننے والے لوگوں کو سمرقند روانہ کر دیا تاکہ وہاں کے لوگوں کو ان فنون کی تعلیم دیجائے۔

دہلی سے روانگی

تیمور کو پندرہ دن دہلی میں قیام کئے ہوئے ہو گئے تو اُسے خیال آیا کہ وہ یہاں ٹھہرنے نہیں آیا تھا بلکہ اسکا مقصود تو صرف جہاد تھا اس لئے وہ ۲۲ ربیع الثانی ۸۰۱ھ کو دہلی سے روانہ ہوا۔ اور قلعہ فیروز آباد میں نماز پڑھکر میرٹھ گیا۔ اس کو تباہ و برباد کر کے ہردوار پہونچا اور یہاں بھی اُسے فتح حاصل ہوئی۔ اس کے بعد دریائے گنگ کو عبور کر کے کمسوری کے نیچے کوہ سوالک میں نشانات فتح چھوڑتا ہوا اُس نے نگرکوٹ اور جمّو کو فتح کیا اور ۱۹ جمادی الآخر کو افغانستان کی وادیوں میں غائب ہو گیا[1]

اقبال خاں کی سرکشی

خدا کا قہر ختم ہو چکا تھا اور اب لوگ اپنی پوشیدہ جگہوں سے نکلنے شروع ہو گئے تھے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان کی حالت اب تک وہی تھی اور ہر جگہ قحط و تباہی رونما تھی جب تیمور نے اس کو چھوڑ دیا تو اقبال خاں نے نصرت شاہ کو الگ کر کے تخت پر خود قبضہ کر لیا اور اٹاوہ و گوالیار وغیرہ کے ہندو راجاؤں کو جو خود مختار ہو گئے تھے زیر کرنیکی سخت کوشش کی

محمود شاہ تغلق (ثانی) ۸۰۱-۸۱۵ھ / ۱۳۹۹-۱۴۱۲ء

محمود شاہ نے قنوج میں اپنی حکومت قایم کی اور ۸۰۸ھ میں اقبال خاں، خضر خاں گورنر ملتان کے مقابلہ میں مارا گیا اس کے بعد ۹ سال تک پھر وہی طوایف الملوکی، گورنروں کی باہم خونریزی قایم رہی۔ یہاں تک کہ جب محمود شاہ نے ۸۱۵ھ / ۱۴۱۲ء میں انتقال کیا تو تخت دہلی پر بیٹھنے کے لئے کوئی نام کا بھی فرمانروا موجود نہ تھا آخر کار لوگوں نے مجبوراً امیر دولت خاں لودی[2] کو فرمانروا بنا دیا لیکن اس نے کبھی اپنے کو بادشاہ نہیں سمجھا۔ چند ماہ بعد خضر خاں (گورنر دیبل پور) نے دہلی کا محاصرہ کیا

دولت خاں لودی ۸۱۵-۸۱۶ھ / ۱۴۱۲-۱۴۱۴ء

---

[1] ظفر نامہ ۲-۲۰۴-۵۲۲ - تزک تیموری ۴۹۴-۴۷۷ — [2] جب ۸۱۵ھ میں محمود شاہ کا انتقال ہو گیا تو لوگوں نے دولت خاں لودہی کو اپنا سردار بنا لیا۔ تاریخ مبارک شاہی کا بیان ہے کہ دولت خاں نے کوئی رسم تخت نشینی کی ادا نہیں کی اور نہ جشن وغیرہ کی اجازت دی۔ اس کے بعد مبارک خاں اور ملک ادریس بھی (جو خضر خاں کے معاون تھے) دولت خاں سے مل گئے۔ اس کے بعد محرم ۸۱۶ھ میں دولت خاں کیتھر (روہیلکھنڈ) اور بسولی (بداؤں سے سات کوس) کی طرف گیا اور وہاں کے راجاؤں کو مطیع بنا کر دہلی واپس آیا۔ یہاں خضر خاں نے فوجکشی کی اور آخر ۴ ماہ کے محاصرہ کے بعد قلعہ سیری میں ۱۸ ربیع الاول ۸۱۷ھ کو دولت خاں نے ہتھیار ڈالدیئے اور خضر خاں (سید خاندان کے اول فرمانروا) نے حکومت دہلی کا چارج اپنے ہاتھ میں لے لیا— دولت خاں نے کبھی اپنے کو بادشاہ نہیں سمجھا۔ اس لئے اس نے اپنے نام کا کوئی سکہ بھی نہیں جاری کیا۔ جو سکے اس کے عہد میں مضروب ہوئے اُن میں فیروز شاہ یا اس کے خاندان والوں میں سے کسی کا نام درج کیا گیا۔

اور ۸ ربیع الاول ۸۱۷ھ (۲۳ مئی ۱۴۱۴ء) کو دولت خاں نے قلعۂ سیری اس کے سپرد کر دیا جس سے حکومت ہندوستان، سید خاندان میں منتقل ہو گئی۔[1]

قاضی ظہیر: محمود شاہ کے عہد کا مشہور شاعر قاضی ظہیر دہلوی تھا جو صاحب دیوان ہے اس نے محمود شاہ کی تعریف میں بہت سے قصائد لکھے ہیں۔ ملا بدایونی کا بیان ہے کہ قاضی ظہیر کے بعد کوئی شاعر اس پائے کا نہیں گزرا۔

---

[1] تاریخ مبارک شاہی (الیٹ، ۴۔ ۴۵)۔

باب دوازدہم

سیّد خاندان

۸۱۷ھ تا ۸۵۵ھ = ۱۴۱۴ء تا ۱۴۵۱ء

خضر خاں ۸۱۷ھ تا ۸۲۴ھ / ۱۴۱۴ء تا ۱۴۲۱ء

خضر خاں کی فرمانروائی

خضر خاں، ملک الشرق ملک سلیمان کا بیٹا تھا اور ملک سلیمان "ناصر الملک مردان دولت" (گورنر ملتان) کا متبنیٰ فرزند تھا اس کے مرنے پر ملک شیخ اس کا بیٹا جانشین ہوا، لیکن قضا نے اس کو بھی چند دن بعد اپنے باپ سے ملا دیا، اسلئے فیروز شاہ نے ملک سلیمان کو اقطاع ملتان کا مالک بنا دیا۔ مگر یہ بھی چند روز زندہ رہا اس لئے اس کے بعد اس کا بیٹا خضر خاں یہاں کا فرمانروا مقرر کیا گیا۔[1] چونکہ ملک سلیمان سید تھا[2] اور خضر خاں اس کا بیٹا تھا اس لئے جو عہدِ حکومت، خضر خاں سے شروع ہوتا ہے،[3] اسے سید خاندان کی سلطنت سے تعبیر کرتے ہیں۔ خضر خاں کو کسی مورخ نے سلطان کے لقب سے یاد نہیں کیا۔ مبارک شاہی میں تخت نشینی کے بعد اس کو "بندہ رائیت عالی" اور تخت نشینی کے پہلے "مسند عالی" لکھا ہے۔ طبقات اکبری میں رایت عالی درج ہے اور ملائے بدایونی نے مسند عالی تحریر کیا ہے۔

---

[1] مبارک شاہی (الیٹ) ۴-۴۶ — [2] اس کے سیّد ہونے کے ثبوت میں مبارک شاہی میں یہ واقعہ نقل کیا ہے۔ ایک بار مولانا جلال الدین بخاری ملک مردان کے مکان پر تشریف لے گئے۔ جب کھانا پیش ہوا تو ملک مردان نے سلیمان کو حکم دیا کہ حضرت کے ہاتھ دھلواؤ مولانا نے فرمایا کہ یہ سیّد ہے۔ اس سے یہ خدمت لینی مناسب نہیں ہے" علاوہ اس کے خود سلیمان کے اطوار و عادات اس کے موید ہیں کہ وہ سیّد تھا۔

[3] تاریخ "مبارک شاہی" کا مصنف یحییٰ بن احمد بن عبداللہ سرہندی تھا۔ چونکہ مصنف کا مقصود مبارک شاہ ثانی (سید خاندان کے حکمراں) کے مفصل حالات درج کرنا تھا اس لئے اس کتاب کا نام تاریخ مبارک شاہی رکھا گیا۔ اس تاریخ کی ابتدا محمد سام غوری سے ہوتی ہے اور جو قلمی نسخہ اس کا دستیاب ہوا ہے اس میں صرف ۸۵۲ھ / ۱۴۴۸ء تک کے حالات درج ہیں (جو سلطان سید محمد کی حکومت کا درمیانی زمانہ تھا) اس لئے یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ اس کے بعد اس نے کس عہد کے حالات لکھے تھے۔ (بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۲۴۶ پر ملاحظہ ہو)

فرشتہ نے صرف "سید خضر خاں" کو ترجیح دی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ خضر خاں نے باوجود تخت نشین ہو جانے کے ہمیشہ اپنے کو تیمور کا نائب سمجھا اور کبھی بادشاہ ہونے کا دعویٰ نہیں کیا۔ فرشتہ نے یہ بھی تحریر کیا ہے کہ جب تک تیمور زندہ رہا خضر خاں نے سکوں اور خطبوں میں اسی کا نام رکھا اور تیمور کے بعد شاہ رخ کا۔ یہی بیان آئین اکبری میں درج ہے اور نظام الدین احمد (صاحب طبقات اکبری) نے بھی یہی تحریر کیا ہے لیکن حقیقت غالباً یہ نہیں ہے۔ خضر خاں کے متعلق تمام حالات جمع کرنے میں فرشتہ اور نظام الدین احمد نے مبارک شاہی کو اپنا ماخذ قرار دیا ہے اور آئین اکبری میں فرشتہ کو پیش نظر رکھا گیا ہے لیکن مبارک شاہی میں جو اس وقت کی سب سے زیادہ مستند تاریخ ہے کہیں اس کا ذکر نہیں ہے کہ خضر خاں نے تیمور یا شاہ رخ کے نام کے سکے جاری کئے۔ یا خطبہ میں اُن کا ذکر کیا گیا۔ ملا عبدالقادر بدایونی نے بھی اپنی تصنیف منتخب التواریخ میں صرف اس بیان پر کفایت کی ہے کہ "اسم بادشاہی برخود تجویز نہ کرد و رایات اعلیٰ خطاب یافت"[۱]

خضر خاں کی اطاعت شعاری

اڈورڈ طامس نے بھی (جو سکوں کی تحقیق میں بہترین سند قرار دیا جاتا ہے) اس کی مخالفت کی ہے، کیونکہ خضر خاں کے عہد میں جتنے سکے رائج ہوئے اُن میں سے کسی سکے پر تیمور یا شاہ رخ کا نام منقوش نہیں کیا گیا، اکثر ایسا ہی ہوا کہ جو سانچے فیروز شاہ اور اس کی اولاد کے زمانہ میں رائج تھے، انھیں پر اس نے بھی سکے ضرب کرائے اور اگر نئے سانچے بنائے تو بھی خضر خاں نے فیروز شاہ یا اس کی اولاد کا نام درج کرایا۔ چونکہ وہ خود بادشاہ کہلائے جانے کی آرزو نہ رکھتا تھا اس لئے اس کو پرواہ ہو سکتی تھی کہ سکوں پر کس کا نام ہے البتہ وہ سنہ ضرور درج کرتا تھا جس سے یہ معلوم ہو سکے کہ فلاں شخص کے عہد حکومت میں یہ سکہ مضروب ہوا۔ بالکل یہی ترکیب ایسٹ انڈیا کمپنی نے بھی کی تھی کہ اول اول شاہ عالم وغیرہ کے نام اپنے سکوں میں منقوش کرائے تاکہ بازار میں ان کا چلن ہو جائے[۲]۔ الغرض سکہ و خطبہ کے مسئلہ میں فرشتہ نے صرف اپنی ذہانت و اختراع سے کام لیا اور مورخین مابعد نے مزید کاوش کے اس کے بیان کی تقلید کی۔ سوائے ملا عبدالقادر کے کہ اس نے کہیں اس کا ذکر نہیں کیا ہے۔

عہد کے سکے

خضر خاں سب سے پہلے تاریخ ہند میں بہ حیثیت گورنر ملتان نمودار ہوا[۳]۔ جب فیروز شاہ مر گیا اور اس کے بعد حکومت میں طوائف الملوکی پھیل گئی تو پھر وہ اس وقت نظر آیا جب سارنگ خاں، ملو اقبال خاں کے بھائی نے قلعۂ ملتان کا محاصرہ کر کے اس کو قید کر لیا (سنہ ۷۹۸ھ) اس کے بعد خضر خاں کسی طرح قید سے اپنی جان بچا کر بیانہ چلا گیا اور پھر جب تیمور نے

خضر خاں کی گورنری بحیثیت گورنر

(بقیہ نوٹ فٹ نوٹ صفحہ ۲۴۵)

فیروز شاہ تک کے حالات اس نے دوسری تاریخوں کی مدد سے لکھے ہیں بعد کے واقعات اس نے معتبر روایات اور اپنے مشاہدہ کی بنا پر تحریر کئے ہیں۔ اس نے اپنے حالات و تعلقات سے اعتنا نہیں کیا اس لئے نہیں معلوم ہو سکتا کہ وہ کیا تھا اور دربار مبارک شاہ سے اس کا کیا تعلق تھا۔ سید خاندان کے حالات کی واحد معتبر تاریخ یہی ہے چنانچہ سیدوں کی تاریخ لکھنے میں نظام الدین احمد، صاحب طبقات اکبری، نے بالکل اسی سے مدد لی ہے، اور فرشتہ نے بھی اس سے اقتباس کیا ہے اور ملا عبدالقادر بدایونی کا ماخذ بھی یہی ہے

[۱] بدایونی - ۲۰۵ - [۲] کرانکلس آف دی پٹھان کنگس مصنفہ اڈورڈ طامس صفحہ ۳۲۹-۳۳۰ - [۳] عہد فیروز شاہ میں

حملہ کیا تو اس نے اپنی امیدوں کو اس کے ساتھ وابستہ کر دیا۔ اور آخر کار امیر تیمور کی واپسی پر اس نے ۸۱۷ھ/۱۴۱۴ء میں دولت خاں لودہی کو زیر کر کے دہلی پر قبضہ حاصل کر لیا

اس نے سات سال تک حکومت کی اور ہمیشہ اس کوشش میں رہا کہ کسی طرح سلطنت دہلی کا اگلا اقتدار پھر قایم ہو جائے۔ لیکن وہ اس میں صرف اسی قدر کامیاب ہوا کہ قرب وجوار کے راجہ ایک حد تک مطیع تو ہو گئے لیکن بغاوت وشورش بدستور باقی رہی اور جو اجزاء سلطنت منتشر ہو گئے تھے وہ فراہم نہ ہو سکے

سنہ ۸۱۷ھ میں تخت نشین ہوتے ہی اپنے وزیر تاج الملک (ملک الشرق) کو بدایوں اور کیٹھر کی طرف روانہ کیا یہاں کا راجہ ہر سنگھ کوہستان آنولہ[1] میں بھاگ گیا۔ اور پھر مطیع ہو گیا۔ اسی طرح مہابت خاں امیر بدایونی نے بھی اطاعت اختیار کی۔ اس کے بعد اس نے کالی ندی اور گنگا کو عبور کر کے شمس آباد اور کمپل (کمبلا) کے باغیوں سے خراج وصول کیا اور دہلی واپس آیا لیکن چونکہ راجاؤں اور باغیوں کی یہ اطاعت بالکل عارضی تھی، اس لئے پھر شورش وانحراف کی شکایت رہی اور ۸۱۹ھ/۱۴۱۶ء میں دوبارہ تاج الملک کو بیانہ اور گوالیار جانا پڑا۔ خود خضر خاں کو بھی قلعہ ناگور کی طرف سفر کرنا پڑا کیونکہ سلطان احمد شاہ گجراتی نے وہاں کا محاصرہ کر رکھا تھا۔ اس سے فارغ ہو کر یہ گوالیار گیا قلعہ تو فتح نہ ہوا لیکن وہاں کے راجہ سے خراج وصول کر کے بیانہ گیا اور یہاں کے حاکم شمس خاں اوحدی کو بھی زیر کیا

۸۲۰ھ/۱۴۱۷ء میں ملک طغانی اور ترکوں کی جماعت نے بغاوت کی اور سرہند کا محاصرہ کر لیا، خضر خاں نے زیرک خاں حاکم سمانہ کو اس بغاوت کے فرو کرنے کے لئے مامور کیا۔ ملک طغانی نے اطاعت قبول کی اور جالندھر اس کے سپرد کیا گیا۔

۸۲۱ھ/۱۴۱۸ء میں راجہ کیٹھر نے بغاوت کی تاج الملک نے اسے زیر کیا اور اٹاوہ کو تاخت کرتے ہوئے دہلی واپس آیا۔

سنہ ۸۲۲ھ میں خود خضر خاں کو کیٹھر کی طرف جانا پڑا اور اس نواح کے باغیوں کو زیر کر کے بدایوں کی طرف متوجہ ہوا مہابت خاں حاکم بدایوں قلعہ بند ہو گیا خضر خاں نے محاصرہ کیا اور چھ ماہ تک یہیں پڑا رہا قلعہ فتح ہونے کے قریب تھا کہ دہلی میں شورش ہونے کی خبر معلوم ہوئی اور مجبوراً واپس جانا پڑا

اس کے بعد معلوم ہوا کہ ایک شخص نے جو اپنے کو سارنگ خاں کہتا ہے خروج کر کے اقطاع جالندھر میں شورش برپا کر رکھی ہے۔ بمشکل تمام اس کا فتنہ بھی فرو ہوا

۸۲۴ھ/۱۴۲۱ء میں خضر خاں نے میوات کو زیر کیا اور گوالیار کی طرف روانہ ہوا۔ یہاں سے خراج لیکر اٹاوہ پہونچا اور یہیں بیمار ہو گیا۔ چنانچہ اسی حال میں دہلی واپس آیا اور ۱۷ جمادی الاول سنہ ۸۲۴ھ (۱۵ مئی سنہ ۱۴۲۱ء) کو مر گیا۔ تاج الملک کا انتقال اس سے چار ماہ قبل محرم میں ہو چکا تھا[2]

آثار الصنادید کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے ۸۲۱ھ/۱۴۱۸ء میں دریا کے کنارے ایک شہر بھی آباد کیا تھا اور

[1] طبقات اکبری میں درۂ آنولہ۔ بدایونی میں جنگل آنولہ اور تاریخ فرشتہ میں صرف کوہستان لکھا ہے۔ [2] مبارک شاہی (الیٹ) ۴-۴۵-۵۳۔

معز الدین ابو الفتح مبارک شاہ بن خضر خاں ۸۲۴ھ/۱۴۲۱ء — ۸۳۷ھ/۱۴۳۴ء۔ فولاد کی سرکشی اور قتل۔ مبارک شاہ کی سیرت۔ بدامنی کا قیام

وہاں قلعہ و محلات تعمیر کرائے تھے۔ لیکن اب اس قلعہ کا پتہ نہیں ہے ممکن ہے کہ اب جس موضع کا نام خضر آباد ہے وہی جگہ خضر خاں کا آباد کیا ہوا شہر ہو[1]

خضر خاں نے اپنی وفات سے تین دن پہلے اپنے بیٹے کو جانشین مقرر کر دیا تھا۔ چنانچہ وہ ۱۹ جمادی الاول ۸۲۴ھ کو (یعنی وفات خضر خاں کے تین دن بعد) تخت نشین ہوا

اسی سال شیخا کھوکر کے بھائی جسرت اور طغان رئیس نے بغاوت کی اور یہ شورش اس حد تک بڑھی کہ خود مبارک شاہ کو سفر کرنا پڑا۔ اس جنگ میں جسرت کو شکست ہوئی اور وہ بھاگ گیا۔ لاہور بالکل ویران ہو گیا تھا اس لئے چند دن قیام کر کے اس کو آباد کیا، عمارات بنوائیں اور پھر دہلی واپس آیا۔

۸۲۶ھ/۱۴۲۲ء میں کٹیہر (روہیلکھنڈ) کی طرف توجہ کی اور خراج وصول کیا۔ مہابت خاں، حاکم بداؤں نے بھی حاضر ہو کر معافی چاہی۔ اسی سال بیانہ میں بدامنی پھیلی اور مبارک شاہ نے اُسے فرو کیا۔ ۸۲۹ھ/۱۴۲۵ء میں میواتیوں نے شورش برپا کی اور لشکر شاہی اس طرف روانہ کیا گیا۔ ابراہیم شاہ شرقی اور مبارک شاہ سے برہان آباد ضلع اٹاوہ کے میدان میں، جنگ ہوئی۔ لیکن ابراہیم شاہ شرقی جونپور خائف ہو کر چلا گیا اور ۸۳۱ھ/۱۴۲۸ء میں مبارک شاہ کامیاب دہلی واپس آیا۔ ۸۳۳ھ/۱۴۲۹-۳۰ء میں فولاد غلام[2] نے سرہند میں سر اٹھایا اور مسلسل چار سال تک مبارک شاہ اس کے پیچھے سرگرداں رہا۔ آخرکار رجب ۸۳۶ھ/۱۴۳۳ء میں، جو مبارک شاہ کا آخری سال تھا، فولاد غلام مارا گیا اور بمشکل تمام پنجاب کی شورش عارضی صورت سے رفع ہو سکی۔

مبارک شاہ اپنے خصائل کے لحاظ سے نیک طینت اور کریم النفس شخص تھا، وہ اکثر و بیشتر خود اپنی فوج کے ساتھ جا کر دشمنوں سے جنگ کرتا تھا اور حد درجہ دلیر و شجاع تھا۔ جو بدامنی اور خرابی پہلے سے چلی آ رہی تھی وہی اس کے عہد میں بھی قایم رہی۔ جونپور اور مالوہ کے صوبوں کی جو سیاسی اہمیت قایم ہو چکی تھی، اس نے مبارک شاہ کو اس قدر تکلیف نہیں پہونچائی جس قدر اقطاع پنجاب نے جہاں اس کا باپ خضر خاں سلطنت دہلی حاصل کرنے کے لئے دولت خاں لودی کے خلاف روانہ ہوا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ محمد بن سام کے جانشینوں کا متبرک پایۂ تخت پہلے ہی ہندوستان میں اپنا

---

[1] آثار الصنادید، سید احمد خاں جلد دوم صفحہ ۲۵-۲۶۔ [2] سید سالم خضر خاں کا بڑا معتمد علیہ امیر تھا اور بڑے بڑے اقطاع مثلاً سرہند، امروہہ، دہرتی وغیرہ اس کی جاگیر میں تھے۔ جب سید سالم کا انتقال ہوا تو مبارک شاہ نے اس کے بڑے بیٹے کو سید خاں اور چھوٹے بیٹے کو شجاع الملک کا خطاب دیکر جاگیر بدستور بحال رکھی۔ لیکن سید سالم کے بیٹوں نے مرکز حکومت سے کمزوری اور طوائف الملوکی سے ناجائز فایدہ اُٹھانا چاہا اور فولاد کو جو ان کے باپ کا غلام اور ترک بچہ تھا، سرہند بھیجا کہ وہاں فتنہ برپا کرے اور اس جھگڑے میں خود انھیں بغاوت کرنے کا موقع مل جائے۔

اقتدار کھو چکا تھا اور تیمور کے حملہ نے تو ایسی کاری ضرب لگائی کہ کچھ بچی بادشاہوں کی جو عزت ہندوستانی آبادی کے دل میں مرتسم تھی وہ دفعتہً زائل ہو گئی

ہندو زمینداروں کی بغاوت

کیتھر کے ہندو زمینداروں نے اس کے عہد میں بغاوت کی۔ دہلی کے جنوب میں جو ایک حصہ ایک نصف دائرہ کی صورت میں مختلف جاگیرداروں، راجاؤں اور امراء کے قبضہ میں تھا اس نے سر اٹھایا۔ مبارک شاہ نے اُن کو دبایا خراج وصول کیا عارضی طور سے وہ مطیع ہو گئے اور یہ سرکشی اختیار کی الغرض یہی مد و جزر قایم رہا۔ لیکن سب سے زیادہ تکلیف

گھکروں یا کھوکروں کی ایذارسانی

پنجاب کے گھکروں یا کھوکروں سے پہونچی جن پر حقیقت یہ ہے کہ تیمور کو بھی برائے نام فتح حاصل ہوئی تھی اور ان تاتاری حملوں سے جو شاہ رخ کے گورنر کابل کی امداد سے فولاد نے پے در پے پنجاب میں جاری رکھے اور ان کی سازشوں سے خود دہلی بھی محفوظ نہ رہ سکا

مبارک شاہ کا قتل

مبارک شاہ اپنے نئے شہر مبارک آباد[1] کی مسجد میں تھا کہ خود اس کے وزیر سرور الملک کے اشارہ سے ہندوؤں نے اسے قتل کر ڈالا۔ تاریخ وفات مصنف مبارک شاہی نے ۹ رجب ۸۳۷ھ (۱۹ جنوری ۱۴۳۴ء) تحریر کی ہے۔

محمد شاہ بن فرید خاں بن خضر خاں ۸۳۷ھ تا ۸۴۷ھ (۱۴۳۴ء تا ۱۴۴۳ء)

مبارک شاہ کے قتل ہوتے ہی چند گھنٹے بعد مکار وزیر (سرور الملک) نے محمد شاہ کو جو خضر خاں کا پوتا، فرید خاں کا بیٹا اور مبارک شاہ کا متبنیٰ فرزند تھا تخت نشین کر دیا اور چونکہ یہ تخت نشینی بالکل برائے نام تھی اور یہ وزیر خود بادشاہ بننا چاہتا تھا اس لئے اس نے خزانہ و جیل خانہ پر قبضہ کر لیا اور بڑی بڑی جاگیریں اپنے ہی آدمیوں کو (جن میں سدپال اور سدہارن کھتری قاتلِ مبارک شاہ بھی شامل تھے) تقسیم کیں اور امرا مبارک شاہ میں سے بعض کو قتل اور بعض کو مقید کر دیا۔ چونکہ سرور الملک (جسے اب خان جہاں کا خطاب مل گیا تھا) کی دغابازی اور مکاری کا حال سب کو معلوم ہو گیا تھا اسلئے اُن امراء نے جو خضر خاں کے ممنون تھے (مثلاً الہ داد، کاکا لودی امیر سنبھل، آبار میاں حاکم بدایوں، امیر علی گجراتی، امیر کمیل ترک بچہ) سرور الملک کی مخالفت شروع کر دی۔ اس نے اپنے خاص سرداروں کو ان مخالف امراء کے مقابلہ میں روانہ کیا۔ انھیں میں ایک کمال الملک بھی تھا جو در پردہ سرور الملک کا سخت دشمن تھا اور مبارک شاہ اپنے آقا کے خون کا بدلا اس سے لینا چاہتا تھا۔ یہ لوگ برن (بلند شہر) پہونچے تو کمال الملک کے ساتھی امراء کو معلوم ہوا کہ یہ تو خود ہمارا ہی دشمن ہے، اس لئے انھوں نے سرور الملک کو اس کی اطلاع کی۔ سرور الملک نے اس کا انسداد کرنا چاہا تھا

---

[1] ۱۰ ربیع الاول ۸۳۳ھ کو مبارک شاہ نے جمنا کے کنارے پر ایک شہر کی بنیاد رکھی اور اس کا نام مبارک آباد رکھا۔ سرسید احمد خاں نے آثار الصنادید میں لکھا ہے کہ مبارک آباد غالباً وہی تھا جسے اب مبارک پور کہتے ہیں اور مبارک شاہ کا مقبرہ بھی یہیں ہے اس لئے مبارک آباد کی تلاش موضع اوکھلا میں کرنی چاہیئے جہاں خضر خاں کا مقبرہ بھی پایا جاتا ہے۔

مگر وہ اس میں کامیاب نہیں ہوا اور اسی انتشار میں کمال الملک نے ملک الہ داد وغیرہ موافق امراء کو ساتھ لیکر دہلی کا رُخ کیا اور قلعۂ سیری کو محصور کر لیا۔ یہ محاصرہ تین ماہ تک قایم رہا۔ بادشاہ کو بھی سارے حالات معلوم ہو چکے تھے اسلئے اس نے سرور الملک کو جبکہ وہ خود بادشاہ کے قتل کی فکر میں تھا ہلاک کرا دیا اور اس کے ساتھیوں کو بھی عبرتناک سزائیں دیں۔ اب محمد شاہ کے لئے یہ پہلا موقع تھا کہ اس نے اپنے تئیں خود مختار بادشاہ سمجھا۔ اس کے بعد ۸۴۴ھ میں بادشاہ سامانہ گیا اور وہاں کے گکھروں کے خلاف ایک فوج روانہ کی جو تاخت و تاراج کے بعد واپس آئی

محمد شاہ نے ان جھگڑوں سے فارغ ہو کر کچھ دنوں تک انتظام سلطنت کی طرف توجہ کی، لیکن پھر عیش و عشرت میں مشغول ہو گیا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ملک میں پھر وہی بدامنی شروع ہو گئی اور قرب و جوار کے خود مختار فرمانرواؤں نے اس سے فایدہ اُٹھایا، چنانچہ ابراہیم شاہ شرقی (جونپور) نے بہت سے اضلاع کو اپنی حکومت میں شامل کر لیا۔ مالوہ کے فرمانروا محمود خلجی کی جرأت تو اس حد تک بڑھ گئی کہ اس نے خود دہلی پر حملہ کیا۔ ان مصائب سے آزاد ہونے کے لیے محمد شاہ نے بہلول لودی کو طلب کیا جو لاہور اور سرہند کا گورنر (لیکن حقیقتاً وہاں کا حکمراں) تھا۔ اس کی مدد سے یہ خطرات اسوقت دور ہو گئے بادشاہ نے بہلول لودی کو اپنا بیٹا بنایا اور خان خاناں کا خطاب دیا۔ ہرچند اس کے بعد اسی بہلول نے خود محمد شاہ کو معزول کرنے کی غرض سے دہلی پر حملہ کیا لیکن کامیاب نہیں ہوا۔

محمد شاہ بن فرید خاں ۸۴۷ھ[1] میں اپنی طبعی موت سے مرا۔

محمد شاہ کے بعد تمام امراء نے سوائے بہلول لودی کے علاؤ الدین کے ہاتھ پر بیعت کی اور اسے دہلی کا حکمراں تسلیم کیا لیکن اس نے تخت نشین ہوتے ہی اپنی عادت و اطوار سے ظاہر کر دیا کہ اس میں حکمرانی کی اہلیت بالکل نہیں ہے۔ اسوقت سلطنت دہلی کی تفریق و انتشار کی یہ حالت تھی کہ:۔

(۱) دکن، گجرات، مالوہ، جونپور، بنگال، کے گورنر خود مختار بادشاہ تھے اور اپنے نام کا سکہ و خطبہ انھوں نے جاری کر رکھا تھا

(۲) پنجاب میں پانی پت سے لاہور، دیپال پور اور سرہند تک بہلول لودی کی حکومت تھی

(۳) مہرولی اور میوات میں (دلی سے سات کوس تک) احمد خاں میواتی قابض تھا

(۴) سنبھل سے حدود دہلی تک دریا خاں لودی کی فرمانروائی تھی

حاشیہ: فتنہ سلطنت اور عیش و عشرت — محمد شاہ کی وفات — علاؤ الدین بن محمد شاہ ۸۴۹ھ–۸۵۵ھ / ۱۴۴۵ء–۱۴۵۱ء

---

[1] محمد بن فرید خاں کی تاریخ وفات میں مورخین کا اختلاف ہے۔ فرشتہ کا بیان ہے کہ محمد شاہ نے بارہ سال تک حکومت کی اور زمانہ حکومت کا تعین ۸۳۹ھ سے ۸۴۹ھ تک کیا ہے جو صرف دس سال کا زمانہ ہوتا ہے بدایونی نے اس کا زمانہ حکومت ۱۴ سال تحریر کیا ہے (۸۳۷ھ سے ۸۴۷ھ تک) جو بالکل صحیح ہے۔ طبقات اکبری نے بھی صرف دس سال تحریر کئے ہیں۔ مبارک شاہی کا کوئی مکمل نسخہ ایسا نہیں مل سکا جس میں یہ تاریخ درج ہوتی جو اجزاء مبارک شاہی کے دستیاب ہوئے ہیں ان میں صرف ۸۳۸ھ تک کے حالات درج ہیں۔

(۶) کمپلا اور پٹیالی میں، پرتاب سنگھ کی حکومت تھی

(۷) بیانہ میں داؤد خاں لودی کا تصرف تھا۔

(۸) گوالیار، دھولپور، چندوارا میں جدا جدا راجہ فرمانروا تھے

(۹) راپری اور اس کے مضافات میں قطب خاں افغان حکمراں تھا[1]

علاؤالدین کے حدودِ سلطنت اور دارالسلطنت کا انتخاب

چنانچہ تاریخ خان جہاں لودی[2] میں لکھا ہے کہ اس وقت علاؤالدین کی سلطنت کے متعلق عام طور سے یہ فقرہ ضرب المثل ہوگیا تھا کہ "بادشاہی شاہ عالم از دہلی تا پالم[3]"۔ الغرض سلطنت دہلی کے حدود یہ رہ گئے تھے کہ ایک جانب صرف ایک میل اور باقی اطراف میں ۱۲ میل سے زائد زمین نہ تھی۔ پھر اس کے ساتھ یہ طرہ ہوا کہ بادشاہ کو بدایوں کی آب و ہوا زیادہ اچھی معلوم ہوئی اور دارالحکومت اس کو بنانا چاہا۔ ہر چند امرا نے منع کیا لیکن وہ باز نہ آیا اور باوجود اس کے کہ اس اثنا میں دو بار بہلول لودی حملہ کرچکا تھا (ہر چند وہ حملے کامیاب نہ ہوئے) بادشاہ نے اپنا عزم پورا کیا اور دہلی میں اپنے دو سالوں کو حکومت سپرد کرکے بدایوں چلا گیا۔

علاؤالدین کی غلطیاں

یہ پہلی غلطی علاؤالدین کی تھی۔ دوسری حماقت یہ ہوئی کہ اسنے اپنے وزیر حمید خاں کو دشمنوں کے کہنے سے مقید کرلیا جو بعد میں بداؤں سے بھاگ کر دہلی آگیا۔ اس نے علاؤالدین سے انتقام لینے کے لئے بہلول لودی کو دہلی میں آنے کی دعوت دی۔ یہ پہلے ہی سے طیار تھا۔ فوراً دہلی آگیا اور قبضہ کرلیا۔

دہلی پر بہلول کا قبضہ

لہ Erskine's lives of Baber & Humayoon I 405.

سلہ تاریخ خان جہاں لودہی اور مخزن افاغنہ کا الگ الگ ذکر کیا جاتا ہے لیکن حقیقتاً یہ ایک ہی کتاب کے دو نام ہیں اور کوئی فرق ان دونوں میں سوائے اس کے نہیں ہے کہ مخزن پر جب دوبارہ نظر ثانی کی گئی تو کچھ حذف و اضافہ کے ساتھ تاریخ خان جہاں بن گئی۔ چونکہ اس تاریخ میں بطور ضمیمہ کے خان جہاں لودہی کے بھی حالات درج کردئے گئے ہیں (جو جہانگیر کا مشہور جنرل تھا اور عہد شاہجہاں میں باغی ہوجانے کی وجہ سے مارا گیا) اس لئے اس کا نام "تاریخ خان جہاں لودہی" ہوگیا۔ جہانگیر کے بھی کچھ مختصر حالات اس میں شامل ہیں۔

اس کے مصنف کا نام نعمت اللہ تھا۔ یہ دربار جہانگیر کا وقائع نویس تھا۔ مصنف نے اپنے باپ خواجہ حبیب اللہ ساکن ہرات کے متعلق لکھا ہے کہ وہ ۳۵ سال تک اکبر کی ملازمت میں رہا ——— اس کتاب کی ترتیب و تالیف میں "سامانہ کے نواب ہیبت خاں سے اسکو بہت مدد ملی چنانچہ خود نعمت اللہ، مخزن کے دیباچہ میں لکھتا ہے کہ "میں نے یہ کتاب خان جہاں لودھی کے حکم سے مرتب کی اور اس کی ترتیب میں سامانہ کے ہیبت خاں بن سلیم خاں نے (جو خان جہاں لودہی کی ملازمت سے وابستہ تھا اور جس نے افغانوں کی منتشر تاریخ کو یکجا فراہم کیا تھا) مجھے بہت مدد دی۔ یہ کتاب برہانپور میں لکھی گئی اور اس کتاب کی ترتیب ۱۰۲۱ھ ۱۶۱۲ء میں ختم ہوئی۔

مسٹر ڈورن نے مخزن کا ترجمہ انگریزی میں کیا ہے۔ اُن کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ نعمت اللہ فرشتہ کا ہم عہد تھا۔

سلہ پالم، دہلی کے قریب ایک چھوٹا سا صوبہ یا ضلع تھا۔

علاؤ الدین کی وفات اور خاندان سادات کی حکومت کا خاتمہ

لیکن علاؤ الدین کا نام خطبہ اور سکہ میں بدستور جاری رکھا[1] بعد کو جب اس کا پورا اقتدار قایم ہو گیا تو اس نے حمید خاں کو قید کر کے علاؤ الدین کو اطلاع دی۔ بادشاہ نے لکھ بھیجا کہ میرے باپ نے تمھیں بیٹا بنایا تھا اس لئے تم میرے بھائی ہو۔ دہلی کی سلطنت میں تمھیں دیتا ہوں اور خود بدایوں پر قناعت کرتا ہوں۔ اس کے بعد ۸۵۵ھ میں اس نے خطبہ سے علاؤ الدین کا نام خارج کرا دیا اور چتر شاہی سر پر رکھ کر دہلی کا بادشاہ ہو گیا۔

علاؤ الدین بدایوں میں ۸۸۳ھ تک زندہ رہا اس نے دہلی میں سات سال چھ ماہ تک حکومت کی اور بدایوں میں ۲۸ سال تک۔ اس کے ساتھ ہی سید خاندان کی حکومت کا بھی خاتمہ ہو گیا اور بہلول لودی کے وقت سے دہلی کے تخت پر ایک اور جدید خاندان نظر آنے لگا جسے خاندان لودی کہتے ہیں۔

---

[1] یہ بیان فرشتہ کا ہے۔ بدایونی اور طبقات اکبری میں اس کا کوئی ذکر نہیں ہے

باب سیزدہم

لودی خاندان

(۸۵۵ھ = ۹۳۲ھ)
(۱۴۵۱ء = ۱۵۲۶ء)

بہلول لودی ۸۵۵ھ تا ۸۹۴ھ ۱۴۵۱ء تا ۱۴۸۸ء

فرشتہ نے بہلول کے خاندانی حالات کی صراحت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ لودی، افغانوں کی ایک جماعت تھی جو ہندوستان میں بسلسلۂ تجارت آمد و رفت رکھتی تھی۔ بہلول کا دادا، ملک بہرام، فیروز شاہ کے عہد میں ملتان آیا اور یہاں کے حاکم مردان دولت کا ملازم ہوگیا۔ اس کے پانچ بیٹے۔ ملک سلطان شہ، ملک کالا، ملک فیروز، ملک محمد، ملک خواجہ بھی اس کے ہمراہ تھے

بہلول کی ابتدائی تاریخ

جب ملتان کا حاکم خضر خاں ہوا تو ملک شہ اس کا ملازم ہوگیا اس نے خضر خاں کی طرف سے ملو اقبال سے جنگ کی اور اس کو قتل کردیا۔ اس صلہ میں خضر خاں نے اسلام خاں کا خطاب دیکر سرہند کی حکومت اس کے سپرد کردی۔

ملک شہ کا بڑا بھائی ملک کالا، جو دوراله کا حاکم تھا، ایک جنگ میں مارا گیا لیکن اس کی بیوی حاملہ تھی۔ وضع کے دن قریب تھے کہ اتفاق سے ایک مکان کی چھت گر پڑی۔ وہ تو مر گئی لیکن جنین زندہ رہا، جو اسوقت ماں کا پیٹ چاک کرکے نکالا گیا۔ یہی تھا وہ یتیم فرزند (ملو) جس کی قسمت میں آیندہ بہلول لودی ہونا لکھا تھا

اس بچہ کی تربیت اس کے چچا اسلام خاں نے کی۔ جب بہلول جوان ہوا تو اسلام خاں اس کی خدمات سے مقدر خوش ہوا کہ اپنی بیٹی اس سے منسوب کردی اور اپنے بعد اس کو جانشین کرگیا۔ اسلام خاں کا اقتدار اس قدر بڑھ گیا تھا [illegible] ہزار افغانی سپاہیوں کو وہ اپنے پاس سے تنخواہ دیتا تھا۔ ہر چند اسلام خاں کے بعد اس کے بھائی (ملک فیروز) (قطب خاں) نے بہلول کا مقابلہ کیا لیکن کامیاب نہیں ہوئے اور بہلول کا اقتدار بڑھتا گیا[1]

[1] فرشتہ۔ ۱۷۳

یہ آپ کو معلوم ہو چکا ہے کہ بہلول لودی سلطنت دہلی حاصل کرنے کے لئے عرصہ سے بیتاب تھا، اور متواتر حملے بھی اس نے کئے تھے چنانچہ جب حمید خاں وزیر نے اس کو بلایا تو وہ فوراً چلا گیا اور وہاں حمید خاں کو قید کر کے ۸۵۵ھ ۱۴۵۱ء میں خود مختار بادشاہ بن بیٹھا

بہلول لودی کو سلطنت دہلی جس حال میں ملی تھی اس کا حال ہم ابھی بیان کر چکے ہیں کہ کس طرح تمام صوبے خود مختار ہو گئے تھے اور حکومت دہلی گویا صرف شہر دہلی سے تعبیر کی جاتی تھی لیکن باوجود اس بدامنی و انتشار کے بہلول لودی نے جس قابلیت اور عزم و ثبات سے اس مٹی ہوئی سلطنت کا اقتدار دوبارہ قایم کیا وہ تاریخ کا حیرتناک واقعہ ہے۔

بہلول لودی نے ۳۸ سال تک حکومت کی اور اس طویل زمانہ میں ایک بار بھی اس نے کسی ایسے طرز عمل کو پیش نہیں کیا جو شاہانہ عزائم و ملوکانہ خصائل کے منافی ہوتا۔

تخت نشین ہوتے ہی اس نے سب سے پہلے پنجاب کی طرف توجہ کی اور دہلی کا انتظام اپنے بیٹے بایزید اور دیگر امراء کے سپرد کر کے، دیپال پور کی طرف روانہ ہوا۔ محمود شاہ فرمانروائے جونپور نے اس فرصت کو غنیمت جان کر اپنی بیوی کے اصرار سے (جو علاؤالدین، سید خاندان کے آخری حکمراں کی بیٹی تھی) دہلی پر حملہ کر دیا بہلول یہ خبر سنکر پنجاب سے دہلی آیا اور افغانوں کی ایک بڑی جماعت اپنے ساتھ اطراف پنجاب سے فراہم کر لایا۔ ہر چند اس مقابلہ میں محمود شاہ کو شکست ہوئی اور وہ جونپور چلا گیا لیکن بعد کو مسلسل ۲۶ سال تک بہلول لودی اور فرمانروایان جونپور کے درمیان آتش جنگ مشتعل رہی اور آخر کار بہلول لودی نے ۸۹۳ھ ۱۴۸۷ء میں سلطنت جونپور کی جداگانہ ہستی کو ہمیشہ کے لئے مٹا کر سلطنت دہلی میں شامل کر لیا اور حسین شاہ شرقی کو (جو سلطنت جونپور کا آخری فرمانروا تھا) ایسی سخت شکست دی کہ پھر وہ سر نہ اٹھا سکا۔

ہر چند جونپور کے لئے اسے بہت کوشش کرنی پڑی اور تمام وقت اسی میں صرف ہو گیا، لیکن وہ سلطنت کے دیگر اقطاع سے بھی غافل نہیں رہا۔ اس نے تمام ملک کا دورہ کیا اور اپنے حسن تدبیر سے سلطنت دہلی میں [illegible] پیدا کر دی۔ میوات جا کر اس نے احمد خاں، حاکم میوات کو اطاعت پر مجبور کیا اور سات پرگنے اس سے [illegible] شامل کر لئے، اسی طرح بلند شہر میں جا کر دریا خاں لودی حاکم سنبھل سے سات پرگنے لے لئے۔ یہاں [illegible] کول میں آیا اور عیسٰے خاں سابق حاکم کو اپنی جگہ بحال کر کے برہان آباد میں اپنا اقتدار قایم کیا۔ [illegible] کر کے صرف بھوگاؤں اس کی جاگیر میں رکھا اور باقی سب مقامات سلطنت دہلی میں شامل [illegible] قلعہ رابری اور چندوار کو فتح کیا اور اٹاوہ کے حاکم کو بھی مطیع بنا لیا

بہلول لودی کی سلطنت کی بحالی

بہلول لودی کے شاہانہ عزائم

فرمانروایان جونپور کا خاتمہ اور شکست

حسن تدبیر

سلطنت میں وسعت

۱؎ بدایونی ۸۵۴ھ تحریر کرتا ہے۔

علاوہ اس کے حسب روایت تاریخ سلاطین افاغنہ[1] اس نے راناؤدے پور کو بھی شکست دیکر تمام اقطاع اجمیر پر قبضہ کرلیا اور سندھ میں احمد خاں کو شکست دیکر حدود سلطنت کو وہاں تک وسیع کرلیا[2]

الغرض ۳۸ سال کے اندر بہلول لودی نے کڑہ، بہرائچ، لکھنؤ، کالپی، بداؤں، دوآبہ کا تمام حصہ، اٹاوہ، گوالیار، سندھ، ادے پور، سنبھل، میوات، کول (علی گڑھ) برہان آباد، کو پھر سلطنت دہلی میں شامل کرلیا اور پنجاب میں بھی وہی اقتدار قایم کردیا جو اس سے قبل کسی وقت پایا جاتا تھا

یقیناً یہ امر حیرتناک معلوم ہوتا ہے کہ اس مردہ سلطنت میں کیونکر بہلول لودی پھر نئی روح پھونک سکا، لیکن اس کا جواب صرف اس کے خصائل کے بیان سے دیا جاسکتا ہے جنھیں صاحب تاریخ داؤدی[3] نے تفصیل کے ساتھ تحریر کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ بہلول لودی مذہب کا سخت پابند اور بے انتہا سخی شجاع بادشاہ تھا۔ رحم و رافت اس کی فطرت تھی، اور احکام شرع کی پابندی اس کا نصب العین۔ وہ اکثر علماء و مشایخ کو اپنی صحبت

---

[1] تاریخ سلاطین افاغنہ کا مصنف احمد یادگار تھا۔ دیباچہ میں لکھتا ہے کہ وہ شاہان سور کا دیرینہ خادم تھا، اور داؤد شاہ نے اسے سلاطین افاغنہ کی تاریخ لکھنے کا حکم دیا، جس طرح منہاج السراج اور ضیاء برنی نے اپنے عہد کے بادشاہوں کے حالات لکھے تھے، یہ تصنیف بہلول لودی کے حالات سے شروع ہوتی ہے اور ہیمو کے واقعہ قتل پر ختم ہوجاتی ہے۔

مصنف نے یہ بھی ظاہر کیا ہے کہ اس کا باپ مرزا عسکری کا وزیر تھا، جب اس نے ہمایوں کی طرف سے گجرات پر حملہ کیا ہے) اس کتاب کی صحیح تاریخ تصنیف کہیں درج نہیں ہے۔ لیکن چونکہ داؤد شاہ کے حکم سے اس کی ترتیب ہوئی تھی (اور داؤد شاہ کا انتقال ۹۸۴ھ میں ہوا ہے) علاوہ اس کے چونکہ مصنف نے طبقات اکبری کا بھی حوالہ دیا ہے جو سنہ ۱۰۰۲ھ میں لکھی گئی ہے، اس لئے ظاہر ہوگا وہ اس زمانہ کے بعد اور مخزن افغانی سے پہلے (جو سنہ ۔۔۔ھ میں لکھی گئی ہے) مرتب کی گئی۔ فن تاریخ کے لحاظ سے کتاب زیادہ باوقعت نہیں ہے، تاہم اس میں بہت سے ایسے واقعات ملتے ہیں جو دوسری جگہ دستیاب نہیں ہوتے ہمایوں کا حال لکھنے میں احمد یادگار نے بالکل طبقات اکبری کو نقل کردیا ہے۔ یہ کتاب بھی کمیاب ہے۔ —— [2] تاریخ سلاطین افاغنہ (الیٹ) ۵۔ ۔۔۔

[3] تاریخ داؤدی کے مصنف کا نام عبداللہ تھا۔ مصنف نے نہ تاریخ ترتیب کہیں لکھی ہے اور نہ اپنے حالات کا ذکر کیا ہے۔ تاہم اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ عہد جہانگیر میں اور غالباً اس کے اولین سال تخت نشینی میں مرتب کی گئی یا چند دن اس کے بعد۔

مصنف لکھتا ہے کہ "افغانی سلاطین ہند کے حالات چونکہ منتشر تھے اس لئے میں نے ان کو یکجا مرتب کرنا چاہا، اور بہلول لودی سے ابتدا کی اور چونکہ یہ تاریخ داؤد شاہ کے حالات پر ختم ہوتی ہے جو اس خاندان کا آخری بادشاہ تھا اس لئے اس کا نام تاریخ داؤدی رکھا۔

یہ تاریخ ضبط واقعات کے لحاظ سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی۔ لیکن چونکہ اس میں بہت سے واقعات ایسے درج ہیں جن سے سلاطین افاغنہ کے خصائل و عادات پر کافی روشنی پڑتی ہے اس لئے اس اعتبار سے بہت زیادہ قابل قدر ہے۔

میں رکھتا اور غربا ومساکین کے حالات ہمیشہ تحقیق کرتا رہتا۔ اس نے کبھی کسی سائل کو محروم نہیں کیا۔

وہ پانچوں وقت کی نماز جماعت کے ساتھ مسجد میں ادا کرتا اور لوگوں کی شکایتیں خود سنکر فیصلہ کیا کرتا تھا۔ وہ بے نہایت دانشمند تھا اور حد درجہ غور وتامل لطف ومہربانی سے کام لےکر انصاف کرتا تھا۔ (جو کچھ روپیہ، اسباب وغیرہ) اُسے ملتا وہ سب فوج کو تقسیم کر دیتا تھا، اور خود صرف خشک روٹی پر زندگی بسر کرتا تھا۔ دوستانہ صحبتوں میں وہ کبھی تخت پر نہ بیٹھتا اور نہ رؤسا کو اپنے سامنے کھڑا ہونے دیتا۔ وہ سب کو اپنے برابر جگہ دیتا اور اگر کوئی امیر ناراض ہو جاتا تو اس کے خوش کرنے کے لئے بعض اوقات یہاں تک ایثار سے کام لیتا کہ اس کے قدموں پر پگڑی تک ڈال دیتا۔

اس کی تخت نشینی سے پہلے دہلی کے پٹھانوں میں یہ رسم تھی کہ مردہ کے سیوم میں مٹھائی، شربت اور پان وغیرہ تقسیم کیا جاتا تھا۔ اس نے اس رسم کو بالکل ممنوع قرار دیا کیونکہ اس رسم میں فضول مصارف ہوتے تھے۔

اس کے ضبط کی عجیب وغریب شان وہ ہے جب ایک دن جامع مسجد کے اندر ایک مُلّا نے اس کو اور اس کے خاندان والوں کو صاف طور پر ذریات شیطان سے تعبیر کیا اور اس نے ہنسکر صرف یہ کہا کہ "ملا صاحب ہم سب تو بندگان خدا ہیں"[1]۔ تعمیرات کا بھی اسے شوق تھا، لیکن اس طرف توجہ کرنے کی فرصت نہیں ملی۔ تاہم اگر یہ جدید تحقیق صحیح ہے کہ آگرہ کی بنیاد اس نے رکھی تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس لحاظ سے بھی اس نے اپنے کو غیر فانی بنا دیا[2] لیکن تمام مورخین آگرہ کی بنیاد[3] سکندر لودی سے منسوب کرتے ہیں۔

آثار رحیمی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے متعدد مدارس بھی قائم کئے[4]۔ بہلولی سکہ جو پیسہ کے قائم مقام[5] رائج ہوا اسی کی یادگار ہے۔

اٹاوہ کی مہم سے فارغ ہو کر دہلی آ رہا تھا کہ راستہ میں بیمار ہوا اور بعد اولی (ضلع سکٹ) میں بعمر ۸۴ سال ۸۹۴ھ/۱۴۸۸ء میں مرگیا۔ اس نے ۳۸ سال ۸ ماہ ۸ روز حکومت کی۔

تہجد، پابندی، صوم و صلوٰۃ، عدل، دربار، فضول رسوم کی ممانعت، ضبط و تحمل، تعمیر، مدارس کا قیام، انتقال

Keene Article medieval India

[1] تاریخ داؤدی (ایلیٹ) ۴ صفحہ ۳-۷، ۳۔ [2] Cal Review. LXXIV P. 71 (1881)

[3] تاریخ داؤدی میں لکھا ہے کہ آگرہ نے شہری حیثیت سکندر لودی کے زمانہ میں اختیار کی۔ اس سے قبل وہ صرف ایک گاؤں تھا ہندوؤں کا بیان ہے کہ راجہ کنس فرمانروائے متھرا کے عہد میں آگرہ ایک مضبوط قلعہ تھا اور یہاں قیدی رکھے جاتے تھے۔ جب سلطان محمود غزنوی نے ہندوستان پر حملہ کیا تو اس نے آگرہ کو بھی تباہ کیا جس سے کہ وہ ایک معمولی گاؤں رہ گیا ۔۔ اس کے بعد پھر سلطان سکندر لودی کے عہد سے اس میں دوبارہ ترقی شروع ہوئی یہاں تک کہ اکبر کے زمانہ میں دہلی دار الحکومت قرار پایا۔ (تاریخ داؤدی (ایلیٹ) ۴، ۴۵۰)

[4] Promotion of Learning India P. 72 [5] ایک روپیہ کے چالیس بہلولی پیسہ ملا کرتے تھے۔ ایک بہلولی کا وزن ایک تولہ ۸ ماشہ ۴ رتی ہوا کرتا تھا۔ بہلولی کو دام بھی کہتے تھے۔

نظام خاں (سلطان سکندر لودی) ۸۹۴ھ تا ۹۲۳ھ

بہلول لودی نے اپنی وفات سے پہلے ہی نظام خاں کو اپنا جانشین نامزد کردیا تھا، اس لئے وہ تھوڑی ہی مدت[1] بعد سلطان سکندر کا لقب اختیار کرکے تخت نشین ہوگیا

جب سلطان بہلول نے ۸۸۳ھ میں ملک کے مختلف صوبوں پر گورنروں کا تقرر کیا تو اسی سلسلہ میں جونپور کی حکومت اپنے بیٹے باربک کو سپرد کردی تھی

جب سکندر تخت نشین ہوا تو اس نے اپنے بھائی (باربک) سے کہا کہ خطبہ میں اس کا نام پڑھا جائے، لیکن باربک نے انکار کیا۔ مجبوراً سکندر کو اس کے خلاف فوج بھیجنی پڑی اور باربک کو مغلوب کرنے کے بعد پھر بدستور اسی عہدہ پر بحال رکھا گیا

سکندر کا عہد حکومت

سکندر کا سارا عہد حکومت باغیوں اور سرکشوں کی سرکوبی میں صرف ہوگیا۔ ان میں بیانہ، جونپور اور اودھ کی بغاوتیں خاص طور سے اہمیت رکھتی ہیں، جن میں سکندر کو نمایاں کامیابی حاصل ہوئی۔ بیانہ کے قلعہ پر قبضہ کرلیا گیا اور جونپور و اودھ کی بغاوتیں بھی پوری طرح فرو کردی گئیں

۹۰۱ھ میں سکندر نے سلطان حسین کو (جو جونپور کی سلطنت کا آخری فرمانروا اور زیر حمایت علاؤالدین شاہ بنگال بہار میں پناہ گزیں تھا) مفتوح و معزول کرکے بہار تک اپنی سلطنت وسیع کرلی اور سلطان علاؤالدین فرمانروائے بنگال سے حدود سلطنت و حقوق حکمرانی کے متعلق باہمی مفاہمت ہوگئی

حدود سلطنت اور حقوق حکمرانی

علاوہ اس کے دھولپور، چندیری اور گوالیار کے راجپوتوں نے بھی اس کی اطاعت اختیار کرلی اور تمام پنجاب، دوآبہ، جونپور، اودھ، بہار، ترہت اور ملک مابین ستلج و بندیلکھنڈ اس کے قبضہ میں آگیا

---

[1] سلطان بہلول، نظام خاں کو اپنے بعد تخت نشین کرنا چاہتا تھا لیکن چونکہ اسکی ماں سنار کی بیٹی تھی اس لئے بعض امراء بہلول کے بڑے بیٹے باربک کو فرمانروا بنانا چاہتے تھے جو پٹھانی کے پیٹ سے تھا جب سلطان بہلول کا انتقال ہوا تو یہ اختلاف پیدا ہوا۔ نظام خاں کی ماں نے جس کا نام زیبا تھا اپنے بیٹے کے حقوق کو افضل ثابت کرنا چاہا اس پر عیسیٰ خاں لودھی نے جو بہلول کا برادر عمزاد تھا، زیبا کو کچھ برا بھلا کہا۔ خانخاناں فرملی کو جو امراء میں سب سے زیادہ با اختیار تھا، یہ بات ناگوار ہوئی اور اس نے عیسیٰ خاں سے کہا کہ تمہیں شرم نہیں آتی کہ کل سلطان کا انتقال ہوا ہے اور آج تم اس کے حرم کو گالیاں دے رہے ہو۔ عیسیٰ خاں نے کہا "تو ایک نوکر ہے۔ تجھے بادشاہوں کے عزیز و اقارب کے معاملہ میں گفتگو کا کیا حق حاصل ہے" یہ سنکر خانخاناں نے جواب دیا کہ "میں صرف سلطان سکندر (نظام خاں) کا نوکر ہوں کسی کا نہیں" یہ کہکر وہ باہر آیا اور اسی وقت بادشاہ کی لاش اٹھواکر قصبہ جلالی میں چلا آیا۔ یہاں نظام خاں کو بلایا گیا۔ چنانچہ جمعہ کے دن ۱۷ شعبان ۸۹۴ھ کو اس نے نظام خاں کو (جب کہ اس کی عمر صرف ۱۸ سال کی تھی)، کالی ندی کے کنارے تخت نشین کردیا۔ تخت نشین ہونے کے بعد اس نے باپ کا جنازہ تو دہلی بھیجدیا اور خود عیسیٰ خاں کی سرکوبی کے لئے روانہ ہوا لیکن چونکہ سلطان سکندر لودی فطرتاً رحیم المزاج تھا اس لئے عیسیٰ خاں کو مغلوب کرکے اس کا قصور معاف کردیا اور خود بھی دہلی واپس آگیا۔ (فرشتہ)

اعادۂ اقتدار شاہی

محمد تغلق اور فیروز شاہ کے بعد جو تفرقہ سلطنت دہلی کے تمام اجزا میں پیدا ہوگئی تھی اس کا حال آپ کو علاؤالدین بن محمد شاہ سید خاندان کے آخری فرمانروا کے ذکر کے سلسلہ میں معلوم ہوگیا ہوگا اور کون کہہ سکتا تھا کہ پھر یہ تمام اجزا یکجا ہوجائیں گے لیکن حقیقت یہ ہے کہ سلطان بہلول لودی نے اپنے عزم و ثبات و دیگر ملوکانہ خصایل سے دہلی کے مردہ سلطنت میں از سر نو جان ڈالنی شروع کی اور سکندر کے عہد میں قریب قریب وہی اقتدار پھر قایم ہوگیا، جو اس سے قبل کسی وقت عہد تغلق میں پایا جاتا تھا۔ اس کا سبب سوائے اس کے اور کچھ نہ تھا کہ بہلول لودی کے تمام خصائل مع شے زائد اس کے اندر پائے جاتے تھے۔ اور اس نے اپنی محنت و جانفشانی، انصاف و بیدار مغزی، اخلاق و عادات کا ایسا نمونہ پیش کیا کہ اس کا تمام ماحول متاثر ہوگیا اور اس کے علوی صفات کے سامنے تمام قوتیں جو سلطنت سے منحرف ہوگئی تھیں جھک گئیں۔

سلطان سکندر کی فتوحات

سلطان سکندر کے تمام فتوحات، نہایت شرح و بسط کے ساتھ تمام کتب تاریخ میں درج کئے گئے ہیں، لیکن ہم ان کی تفصیل کو غیر ضروری اور غیر دلچسپ خیال کرتے ہوئے، صرف اپنے موضوع کے لحاظ سے سکندر کے خصایل و عادات آئین عدل و حکمرانی، تہذیب و شایستگی، علم پروری و ہنر شناسی کو ذرا واضح طور پر دکھانا چاہتے ہیں جو حقیقی اسباب تھے اس کی کامیابی کے

سلطان سکندر کی خصوصیات

سلطان سکندر، اپنی ظاہری صورت کے لحاظ سے جس قدر حسین و جمیل تھا[1] اس قدر اس کا باطن پاکیزہ تھا۔ وہ اپنے باپ کی طرح حد درجہ سادگی پسند تھا اور کبھی شاہانہ تکلفات میں اپنا وقت ضایع نہ کرتا تھا۔ اس کی فطرت نہایت سلیم اور اس کی طبیعت رافت و عطوفت کی طرف ازبس مائل تھی وہ خدا سے ڈرتا تھا اور بندگان خدا پر ہمیشہ رحم کرتا تھا

جیسا وہ شجاع تھا ویسا ہی عادل بھی تھا۔ انتظام سلطنت، تصفیۂ معاملات میں وہ ہندو مسلمان، قوی و ضعیف کو برابر سمجھتا تھا اور چاہتا تھا کہ سر مو انصاف سے احتراز نہ ہو۔

بادشاہ ضبط اوقات کا بے انتہا پابند تھا اور جو معمول اس نے اپنے یا کسی اور کے لئے مقرر کر دیا، اس میں کبھی تبدیلی پیدا نہیں کی۔

بادشاہ کا معمول تھا کہ وہ نماز ظہر ادا کر کے مجلس علماء میں جاتا اور قرآن مجید کی تلاوت کرتا مغرب کی نماز جماعت کے ساتھ ادا کر کے حرم سرا میں جاتا اور ایک گھنٹہ وہاں قیام کر کے خلوت خاص میں جاتا اور وہاں لوگوں کے استغاثے سنتا امور سلطنت کی اصلاح کرتا۔ فرامین تحریر کرتا اور سلاطین معاصر کے نام خطوط لکھتا۔ رات کو بہت کم سوتا۔ ستر زبردست شاہ عالم خلوت خاص میں اس کے پاس رہتے اور نصف شب تک مذہبی احکام وغیرہ پر بحث رہتا۔ اس کے بعد کھانا چنا جاتا۔ اس کی ساری عمر گزر گئی لیکن یہ معمول کبھی ترک نہیں ہوا۔

---

[1] مصنف تاریخ داؤدی نے لکھا ہے کہ اس کے حسن کا یہ عالم تھا کہ جو شخص دیکھتا تھا تحیر رہ جاتا تھا۔

رجسٹرڈ نمبر ایل ۱۰۴۲

رجسٹرڈ نمبر اے ۱۱۰۴۳

قیمت
۸ر

تصانیف نیاز فتحپوری

نگارستان

حضرت نیاز کے بہترین ادبی مقالات اور افسانوں کا مجموعہ نگارستان نے ملک میں جو درجہ قبول حاصل کیا اُس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس کے متعدد مضامین غیر زبانوں میں منتقل کئے گئے۔

قیمت دو روپیہ (عہ)
علاوہ محصول

جمالستان

اڈیٹر نگار کے مقالات ادبی کا دوسرا مجموعہ جس میں ۳۲۔ افسانے ۳۳ء تک کے درج ہیں۔ زبان قدرت بیان علو تخیل اور پاکیزگی خیال کے بہترین شاہکار کے علاوہ بہت سے اجتماعی و معاشری مسائل کا حل بھی آپ کو اس مجموعہ میں نظر آئے گا۔ ہر افسانہ اور ہر مقالہ اپنی جگہ معجزۂ ادب کی حیثیت رکھتا ہے

قیمت چار روپیہ (للعہ)
علاوہ محصول
خریداران نگار سے ایک روپیہ کم

مکتوبات نیاز

اڈیٹر نگار کے تمام وہ خطوط جو نگار میں شائع ہوئے ہیں نیز وہ جو شائع نہیں ہوئے جذبات نگاری اور سلاست بیان رنگینی اور البیلے پن کے لحاظ سے فن انشاء میں یہ بالکل پہلی چیز ہے جس کے سامنے خطوط غالب بھی پھیکے معلوم ہوتے ہیں مع تصویر حضرت نیاز ۲۸ پونڈ کے کاغذ پر مجلد شائع ہوئی ہے۔

قیمت دو روپیہ آٹھ آنے (عہ)
علاوہ محصول

شہاب کی سرگزشت

حضرت نیاز کا وہ عدیم النظیر افسانہ جو اُردو زبان میں بالکل پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے اصول پر لکھا گیا ہے۔ اس کی زبان اس کی تخیل اس کی نزاکت بیان اسکی بلندی مضمون اور اسکی انشاء عالیہ سحر حلال کے درجہ تک پہونچتی ہے۔

قیمت ایک روپیہ (عہ)
علاوہ محصول

اُردو شاعری

یعنی جنوری ۳۵ء کا نگار جس میں اردو شاعری کی تاریخ، اس کی عہد بہ عہد ترقی اور ہر زمانہ کے شعراء پر بسیط نقد و تبصرہ کیا گیا ہے مع انتخاب کلام، اس کی موجودگی میں آپ کو کسی اور تذکرہ دیکھنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ اور جس میں سات مضامین اڈیٹر نگار کے لکھے ہوئے ہیں

حجم ۲۵۶ صفحات۔ قیمت عہ علاوہ محصول

ہندی شاعری

یعنی جنوری ۳۶ء کا نگار جس میں ہندی شاعری کی تاریخ اور اس کے تمام ادوار کا بسیط تذکرہ موجود ہے اس میں تمام مشہور ہندو شعراء کے کلام کا انتخاب مع ترجمہ کے درج ہے۔ ہندی شاعری کی اصل قدر و قیمت کا اندازہ مقصود ہو تو اُردو میں آپ کے لئے صرف یہی ایک مجموعہ کافی ہے۔ قیمت علاوہ محصول عہ

"نگار" جنوری ۳۷ء

(۱) "ڈرامہ اصحاب کہف" یہ ڈرامہ مصری انشاپرداز توفیق الحکیم کی کتاب "اہل الکہف" سے ماخوذ و مقتبس ہے اور تنہا یہی ایسی چیز ہے جو آپ کے ذوق انشاء تمثیل کو آسودہ کرنے والی ہے۔ اس کے علاوہ (۲) آسکر وائلڈ کے خطوط جو اسنے سارہ (مشہور ایکٹرس) کو لکھے تھے اور جو دنیائے ادب و انشاء میں خاص مرتبہ کی چیز سمجھے جاتے ہیں۔ وائلڈ اپنے طرز انشاء و ندرت بیان کے لحاظ سے یورپ میں جس مرتبہ کا شخص شمار ہوتا تھا اسکا اندازہ آپ ان خطوط سے کر سکتے ہیں (۳) "مسئلہ خلافت و امامت" (آنا دخیل شیعی کے قلم سے) مسئلہ خلافت و امامت لاکھ قدیم و لاینحل سہی پھر بھی اس سلسلہ تحقیق و جستجو میں بعض ایسی باتوں کے نکلنے کا امکان ہے جن سے مفاہمت کی کوئی صورت پیدا ہو سکے چنانچہ اس سلسلہ کا یہ پانچواں مقالہ ہے اسکے بعض عنوان یہ ہیں:۔ مسئلہ خلافت کے مبادی مقدمات۔ نفس مسئلہ خلافت۔ مسئلہ خلافت کے فروع و جزئیات وغیرہ ——— صفحات ۱۴۴ — قیمت عہ علاوہ محصول۔

ایک ضروری اطلاع

تاریخ اسلامی ہند کی پہلی جلد "حملۂ بابر" تک اس مہینے میں ختم ہو جاتی ہے۔ لیکن اس جلد کا نہایت ضروری ضمیمہ علحدہ شایع کیا جا رہا ہے، یعنی سنہ ۱۵ھ (سنہ ۶۳۶ء) سے لیکر سنہ ۹۳۲ھ (سنہ ۱۵۲۶ء) تک کی سلسلہ وار توقیت (Chronology)

یہ نقشہ یا سلسلہ وار تاریخی واقعات کا تختہ "نگار" کے ۸۰ صفحات کو محیط ہوگا اور پہلی جلد کے ساتھ اس کا حاصل کرنا ازبس ضروری ہے، کیونکہ یہ ایک قسم کا مفصل تاریخی انڈکس ہے جس سے فوراً یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ کس تاریخ میں کونسا اہم واقعہ پیش آیا۔ اسی کے ساتھ سب سے بڑی خصوصیت ایک یہ بھی ہے کہ انگریزی اور ہجری سنہ دونوں مطابق کرکے درج کئے گئے ہیں۔

اس کی قیمت بہت کم یعنی معہ محصول بارہ آنے رکھی گئی ہے تاکہ تمام قارئین نگار جن کے پاس تاریخ اسلامی ہند کی پہلی جلد پہونچ چکی ہے اس کو آسانی سے حاصل کر سکیں

اس خیال سے کہ بارہ آنے کی رقم بھیجنے میں آپ کو فیس منی آرڈر دو آنہ زیادہ نہ ادا کرنا پڑے مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ سال آیندہ کے چندہ کے ساتھ بارہ آنے زیادہ بھیجدیجئے یا اجازت دیجئے کہ جنوری کے وی پی میں اس رقم کا اضافہ کر دیا جائے۔ اس طرح آپ کو بچت ہو گی۔ اس لئے براہ کرم جو صاحب اس کو پسند فرماتے ہیں وہ ذریعہ کارڈ اطلاع دیدیں تاکہ جنوری کے وی پی میں یہ رقم بڑھا دیجائے۔ جن حضرات کی کوئی اطلاع نہ آئے گی ان کو وہی معمولی رقم کا وی پی روانہ کیا جائے گا۔ توقیت کا نمونہ دوسرے صفحہ پر ملاحظہ ہو۔

منیجر "نگار"

نمونہ (صفحہ اول)

توقیت

یعنی سلسلہ وار واقعات تاریخی کا نقشہ

سنہ ۱۵ھ (سنہ ۶۳۶ء) سے سنہ ۹۳۲ھ (سنہ ۱۵۲۶ء) تک

سنہ ۱۵ھ / ۶۳۶ء — عثمان بن ابی العاص ثقفی گورنر بحرین و عمان نے عہد خلیفہ ثانی میں اپنے بھائی حکم کو بحرین میں مقرر کرکے حکم دیا کہ "ہندوستان پر حملہ کریں" اسی زمانہ میں دوسرا حملہ حکم نے بھروچ پر کیا۔ اور اپنے بھائی مغیرہ کو دیبل روانہ کیا جہاں انھوں نے دشمن کو شکست دی۔ بچ نامہ میں لکھا ہے کہ یہ شہید ہوئے

سنہ ۲۲ھ / ۶۴۳ء — عبداللہ ابن عمرو ابن ربیع نے کرمان پر حملہ کیا، اور پایۂ تخت کو لے لیا، سیستان کو زیر کیا، اور مکران پر حملہ کرکے مکران اور سندھ کی متحدہ افواج کو شکست دی۔ خلیفۂ ثانی نے دریائے سندھ کو عبور کرنے کی ممانعت فرمائی۔ محمد الشیرازی سیستان کا فاتح عمرو ابن التیمی اور عبداللہ ابن عمر خطاب کو ظاہر کرتا ہے۔ اور مکران کا فاتح عبداللہ ابن عبداللہ ابن عثمان کو بتاتا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ "زنبیل، مکران، اور سندھ دونوں جگہ کا حکمران تھا" بعض مورخوں نے ناموں میں اختلاف کیا ہے اور بعض کہتے ہیں کہ یہ فتح سنہ ۲۳ھ میں ہوئی ہے۔

سنہ ۳۵ھ / ۶۵۵ء — عبدالرحمن ابن سمرہ کو گورنر عراق نے سیستان پر حملہ کرنے کے لئے مامور کیا۔ اس نے بُست (Bust) لے لیا اور کابل تک بڑھتا چلا گیا۔

سنہ ۴۴ھ / ۶۶۴ء — عبدالرحمن ابن شمر نے مرو سے کابل پر حملہ کیا، اور یہاں بارہ ہزار نفوس کو مسلمان کیا، اس فوج کا ایک افسر مہلب ابن سفرہ ہندوستان پر حملہ کرنے کے لئے مامور کیا گیا۔ یہ ملتان تک بڑھتا چلا گیا اور بہت سے قیدی لیکر خراسان آیا۔

ششماہی چندہ میں نگار کا جنوری نمبر
بوجہ اضافہ ضخامت وقیمت شامل نہ ہوگا

اڈیٹر:- نیاز فتحپوری

جلد ۳۴	فہرست مضامین دسمبر ۱۹۳۸ء	شمارہ ۶

ملاحظات

عالمِ اسلامی کا حادثۂ عظیم

وہ شخص جس کا نام ماں باپ نے مصطفےٰ رکھا تھا، لیکن مدرسہ میں پہونچکر اپنے ذہنی امتیاز کی وجہ سے مصطفےٰ کمال ہوگیا، جو درۂ دانیال کے معرکے کے بعد مصطفےٰ کمال پاشا کہلایا، جس نے ۱۹۲۲ء میں یونانیوں کو شکست دیکر قوم سے غازی مصطفےٰ کمال پاشا کا لقب حاصل کیا اور جو آخر میں ان تمام امتیازات سے بلند تر ہوکر صرف اتاترک کہلایا، وہ آج دنیا سے منھ موڑ کر عالمِ اسلامی کو صد درجہ سوگوار و ملول چھوڑ گیا ہے۔

آسماں را حق بود گر خوں بہ گرید بر زمیں

کمال آتاترک اس دور کے انسانوں میں ایک معجزہ کی حیثیت سے ظاہر ہوا اور تھوڑی سی فرصت میں وہی سب کچھ کر گیا جو ایک "مردِ صاحبدل" کر سکتا ہے۔ ترکی قوم زوال و انحطاط کی جس منزل پر پہونچ گئی تھی وہ اسکے عالمِ احتضار کی منزل تھی اور کوئی صورت اس کے جانبر ہونے کی باقی نہ تھی، لیکن کسے خبر تھی کہ قدرت سالونیکا کے ایک معمولی سپاہی زادہ سے کارِ مسیحائی لینے والی ہے اور ٹھیک اسوقت جبکہ سرزمین ترکی کا ذرہ ذرہ وقفِ مایوسی ہوچکا تھا امیدوں کا نیا آفتاب طلوع ہوگا اور وہ بستی جو صدیوں سے محوِ خواب تھی دفعتاً بیدار ہو جائے گی۔

کمال آتاترک نے اپنی عسکری زندگی اسوقت شروع کی جب سلطنتِ ترکی کا شیرازہ درہم برہم ہوچکا تھا اور نوجوانانِ اتحاد و ترقی نے جنگِ عظیم کے سلسلہ میں جرمنی کی طرفداری کا غلط فیصلہ کرکے اپنے ہاتھ سے اپنی گردن پر چھری پھیر لی تھی۔ مصطفےٰ کمال، انور بے کی اس پالیسی کا سخت مخالف تھا اور وہ اس کو خودکشی کہتا تھا، لیکن اسوقت تو ساری دنیا اس کی دشمن تھی، خود ابنائے وطن اس کے مخالف تھے، ترکی کا ذرہ ذرہ اس سے برہم تھا، لیکن اس نے ہمت نہیں ہاری، اور چند خستہ حال ترک سپاہیوں کی مدد سے چناق میں برطانوی فوج کے چھکے چھڑا دئے اور جب سب سے آخر میں یونانیوں کو اس نے سرزمین ترکی سے نکالا ہے تو لائڈ جارج جن کے اشارہ سے یونان نے یہ سب کچھ کیا تھا، حیرت زدہ ہوکر رہ گیا۔

قوموں کی تعمیر کرنے والے دنیا میں اور بھی ہوئے ہیں لیکن مصطفیٰ کمال نے اس قوم کو قوم بنایا جو اپنی اجتماعی صلاحیت بالکل کھو بیٹھی تھی اور اسقدر جلد کہ عقل انسانی باور نہیں کر سکتی۔ ۱۹۱۹ء میں ترکی کی شکستگی و درماندگی کا یہ عالم تھا کہ برطانیہ اس کو اپنی سیادت میں لینے کی تمام طیاریاں کر چکا تھا۔ لیکن تین سال نہ گزرے تھے کہ ۱۹۲۲ء میں لاسین کے مقام میں اتحادیین کا ہاتھ پکڑ کر مصطفیٰ کمال نے وہی شرائط لکھوائے جو وہ چاہتا تھا اور ایشیائے کوچک میں پھر وہی ہلالی جھنڈا لہرانے لگا جس کی حفاظت کے لئے ترکی قوم اپنے لاکھوں فرزندوں کا خون بہا چکی تھی۔

کمال اتاترک کی غیر معمولی فراست و فطانت ثابت کرنے کے لئے صرف یہی ایک واقعہ کافی ہے کہ اس نے سب سے پہلے خلافت کا خاتمہ کیا اور شخصیت پرستی کی اس دیرینہ روایت کو مٹا کر رکھدیا جس نے تعلیمات اسلامی کے بالکل خلاف نہایت مکروہ قسم کی ملوکیت قائم کر رکھی تھی۔ لیکن اس نے صرف اسی پر قناعت نہیں کی، بلکہ قیام خلافت کے سلسلہ میں جتنے مہلک جراثیم وہاں پیدا ہو گئے تھے، ان سب کو اس نے ہلاک کر ڈالا۔ مساجد و خانقاہ کو علماء و مشایخ کے وجود سے پاک کیا، مذہبی اوقاف کو جو مولویوں کی شکم پری کا ذریعہ تھے ختم کر دیا۔ تعدد ازدواج کو ناجایز قرار دیا، عورتوں کو چار دیواری سے نکال کر آزادی کی فضا میں مردوں کے دوش بدوش کام کرنے کا موقعہ دیا، رسم خط اور لباس بدل کر ممالک یوروپ کے ساتھ سیاسی مساوات کا جذبہ لوگوں میں پیدا کیا۔ تعلیم کو عام اور مفت کر کے قدامت پرستی کی ہر لکی کو مٹایا، اپنی زبان کو تمام اس متعفن و بوسیدہ لٹریچر سے پاک کر دیا جو مذہب کے نام سے زہر پرستی پھیلاتا تھا۔ صنعت و حرفت، زراعت و تجارت کے لئے نئی نئی راہیں کھولدیں اور جدید پایۂ تخت (انقرہ) تعمیر کر کے ترکی تاریخ کو نئی بنیاد پر استوار کرنا شروع کیا۔

حیرت ہوتی ہے کہ کمال اتاترک بارہ سال کی مختصر سی مدت میں وہ سب کچھ کیونکر کر سکا جو صدیوں میں بھی انجام کو نہیں پہونچتا اور تنہا کس طرح وہ اتنے بڑے کام کو پورا کر سکا جو اجتماعی قوت سے بھی اس خوبی کے ساتھ پورا نہیں ہو سکتا۔ دنیا جو چاہے کہے لیکن میں اسے معجزہ کہتا ہوں اور کمال اتاترک کو "صاحب معجزہ" ہی سمجھ کر اس کے مافوق الفطرت قوائے ذہنیہ کے سامنے سر عقیدت جھکاتا ہوں۔

کمال اتاترک اب نہیں ہے، لیکن اس کے کارنامے ہمیشہ باقی رہیں گے۔ اس کا جسم فنا ہو گیا لیکن اسکی پیدا کی ہوئی روح کبھی فنا نہ ہوگی۔ وہ اس زمانہ کا بطل اعظم تھا، اس دور کے ترکوں کا پیغمبر تھا، گمراہ قوموں کے لئے مشعل ہدایت تھا اور وہ سب کچھ تھا جو انسان کو "نیم خدا" بنا دیتا ہے۔

مولانا اشرف علی تھانوی اور آلۂ مکبر الصوت

آلۂ مکبر الصوت، لوڈ اسپیکر (Loud speaker) کو کہتے ہیں جس کے ذریعہ سے آواز کئی گنا بلند ہو کر دور و نزدیک ہر جگہ پہونچ سکتی ہے اور مولانا اشرف علی صاحب کو آپ جانتے ہی ہیں، تھانہ بھون کے وہ عالم د

بزرگ ہیں جنھوں نے بہشتی زیور اور بہشتی گوہر لکھ کر عوام میں بہت شہرت حاصل کرلی ہے۔

آپ کی اور خصوصیات یہ ہیں کہ علم تفسیر و حدیث میں بھی آپ کو ملکۂ راسخہ حاصل ہے اور آپ کے مریدوں کا بہت بڑا علقہ ہندوستان کے ہر گوشہ میں پھیلا ہوا ہے۔ آپ کے پاس مسایل فقیہہ وغیر فقیہہ کے متعلق سیکڑوں خطوط روزانہ آتے ہیں اور آپ ان کا جواب دینے میں ہمیشہ اس تفقہ فی الدین سے کام لیتے ہیں جو دوسرے علما میں کمتر پایا جاتا ہے اور فہم انسانی سے بیشتر دور رہتا ہے۔ چنانچہ حال ہی میں آپ سے ایک شخص نے دریافت کیا کہ:-

"آلہ مکبر الصوت" کے ذریعہ سے خطیب کی آواز کو تمام سامعین تک پہونچانا جایز ہے یا نہیں؟"

اس کا جو جواب مولانا نے دیا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ:-

"ہر ایسی مباح چیز کا استعمال جس میں کسی مفسدہ کا احتمال ہو ممنوع ہے، چونکہ خطیب کی آواز کا سامعین بعید تک پہونچانا شرعاً غیر ضروری ہے اور اس آلہ کے استعمال میں احتمال فساد ہے اور لہو و لعب کی صورت پیدا ہو سکتی ہے اس لئے اس کا ترک لازم ہے۔ یہ جب تو اس وقت ہے جب خطیب سے مراد مطلق واعظ و لکچرار ہو لیکن اگر اس سے مراد جمعہ و عیدین کا خطیب ہے تو اس وقت چونکہ آواز کا سننا ضروری نہیں ہے اس لئے اس آلہ کو مسجد میں داخل کرنا احترام کے خلاف ہے اور تشبہ ہے مجالس غیر مشروعہ کے ساتھ"

اسی کے ساتھ مولانا نے ایک نقلی دلیل بھی کلام مجید سے پیش کی ہے اور وہ یہ کہ:-

"حق تعالے نے ارشاد فرمایا ہے" ولا تسبوا اللذین یدعون من دون اللہ فیسبوا اللہ عدوا بغیر علم"

(یعنی غیر مسلموں کے دیوتاؤں کو برا نہ کہو ورنہ ان کے ماننے والے خدا کو برا کہیں گے) — ہر چند دیوتاؤں کو برا کہنا نہ صرف مباح بلکہ ضروری ہے، لیکن محض اس مفسدہ سے بچنے کے لئے کہ خدا کو بھی گالیاں دی جائیں گی منع کر دیا گیا"

اس سے مولانا نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ جب دیوتاؤں کو برا کہنا جو اتنا اچھا فعل ہے فساد کے اندیشہ کیلئے منع کیا گیا تو اندیشۂ لہو و لعب سے تو مکبر الصوت کا استعمال بدرجہ اولی ناجایز ہونا چاہئے۔ میں نے مولانا کے جواب کی اصلی عبارت نقل نہیں کی ہے، لیکن اس کا مفہوم وہی ہے جو عرض کیا گیا۔ اب اس کو سامنے رکھ کر غور کیجئے کہ کیا اس سے زیادہ ذہنی غلامی کی کوئی مثال اور مل سکتی ہے اور کیا اسی عقل و فراست کا نام شرع میں "تفقہ فی الدین" رکھا گیا ہے اور کیا ایسے علماء کی پیروی تہذیب و انسانیت کے لئے باعث ننگ نہیں؟

چونکہ مولانا نے اس مسئلہ میں عقل و نقل دونوں سے کام لیا ہے اس لئے آئیے ان دونوں کی حقیقت پر بھی غور کریں اور دیکھیں کہ ان سے اور کیا احکام و مسایل متفرع ہو سکتے ہیں

اگر مولانا کے جواب کا تجزیہ کیا جائے تو حسب ذیل نتایج اس سے اخذ ہوتے ہیں:-

ا۔ جمعہ و عیدین کے خطبہ کے لئے یہ ضروری نہیں کہ لوگ اسے سنیں بھی، صرف ان کا اس جگہ موجود رہنا کافی ہے

۲۔ آلۂ مکبر الصوت کا استعمال لہو و لعب ہے اور تشبّہ ہے کفار کے ساتھ۔
۳۔ دوسرے مذاہب کے دیوتاؤں اور خداؤں کو بُرا کہنا نہ صرف مباح ہے بلکہ بعض حالات میں "مندوب" ومستحسن بھی ہے۔

سب سے پہلے شق اول کو لیجئے جس میں خطبہ کا سننا ضروری نہیں ہے۔ یہ بالکل درست ہے کہ از روئے فقہ جمعہ وعیدین کے خطبہ کا سننا ضروری نہیں ہے اور لوگوں کا اختتام خطبہ تک صرف وہاں موجود رہنا کافی سمجھا جاتا ہے۔ لیکن یہ ان مسایل فقیہ میں سے نہیں ہے جو نصوص قطعیہ سے ثابت ہوئے ہوں، بلکہ صرف وقتی حالات کے تحت متفرع کئے جاتے ہیں اور وقت و زمانہ کے حالات کے لحاظ سے بدلے جاسکتے ہیں۔

اسلام کی روح جو اس کے تمام شعایر سے ظاہر ہوتی ہے صرف اجتماعیت ہے، پھر ظاہر ہے کہ بہترین اجتماعیت خیال وحرکت اور فکر وعمل دونوں کی اجتماعیت ہوا کرتی ہے اور اس کے بعد صرف عمل کی اجتماعیت۔ محض خیال کی اجتماعیت کوئی چیز نہیں کیونکہ اگر کسی جماعت کے افراد خیال کے لحاظ سے متحد ہوں اور عمل کے لحاظ سے متفرق و منتشر تو یہ بالکل بے نتیجہ بات ہوگی، اسی لئے اسلام نے زیادہ تر عمل پر زور دیا ہے لیکن اس نے فکر و خیال کی اجتماعیت کو نظر انداز نہیں کیا کیونکہ اگر قول و فعل دونوں ہم آہنگ ہوں تو اجتماعیت میں بہت زیادہ رسوخ پیدا ہو جاتا ہے۔

اگر جمعہ وعیدین کے خطبہ کا سننا قرون اولیٰ میں ضروری نہیں سمجھا گیا بلکہ صرف وہاں کی حاضری کافی قرار دی گئی، تو اس کا سبب یہ نہ تھا کہ وہ نفس خطبہ کی اہمیت یا اس کے سننے کی افضلیت کے قایل نہ تھے بلکہ صرف اس بنا پر کہ انکے پاس کوئی ذریعہ ایسا نہ تھا جو ہزاروں لاکھوں آدمیوں تک اس آواز کو پہونچا سکتے اور اس لئے بدرجۂ اقل صرف وہاں بیٹھے رہنے ہی کو ضروری قرار دیا تاکہ اس طرح کم از کم اجتماع کی ظاہری کیفیت تو باقی رہیگی اور اس سے لوگوں پر اثر پڑے گا۔ اگر حکم یہ دیا جاتا کہ جو لوگ خطبہ سن سکتے ہیں وہ بیٹھے رہیں اور باقی چلے جائیں تو اجتماعیت میں انتشار پیدا ہو جاتا۔

اب نفس خطبہ کو لیجئے کہ بجائے خود وہ ضروری ہے یا نہیں۔ اس سے مولانا تھانوی کو بھی غالباً انکار نہ ہوگا کہ خطبہ سے مقصود عوام کو تعلیم دینا ہے ان کے اخلاق درست کرنا ہے اور اگر حال کی اصطلاح میں ظاہر کیا جائے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ اپنے مقاصد کا پروپاگنڈا کرنا ہے، پھر ظاہر ہے کہ ایک خطبہ کا اثر اسی وقت ہو سکتا ہے جب اس کو سنا جائے، محض یہ منظر کہ مولانا اشرف علی صاحب دور ممبر پر کھڑے ہوئے اپنے چشم ولب یا ہاتھوں کو حرکت دے رہے ہیں اور ان کا کوئی لفظ ہمارے کانوں تک نہیں پہونچتا، نہ کوئی دلنشین منظر ہے نہ مفید۔ اس لئے خطبہ کی بہترین صورت یہی ہو سکتی ہے کہ تمام حاضرین اسے سن سکیں، اور اگر یہ کسی ذریعہ سے ممکن ہو تو اس کا اختیار کرنا نہ صرف اقتضائے عقل ومصلحت ہے بلکہ تعلیمات اسلامی کا اسلوب بھی یہی چاہتا ہے۔

اب دوسری شق کو لیجئے۔ مولانا کا یہ ارشاد بالکل درست ہے کہ کسی ایسی نئی چیز کا اختیار کرنا جو باعث فساد ہو یا

جس میں احتمال لہو ولعب ہو مناسب نہیں، لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ مکبر الصوت کونسا مفسدۂ لہو ولعب پیدا کر سکتا ہے اگر مولانا اس کا استعمال صرف اس لئے مناسب نہیں سمجھتے کہ غیر مسلم اس کا استعمال کرتے ہیں اور اس طرح تشبہ بالکفار ہو جائے گا، تو پھر اس دلیل کی بنا پر انھیں خود بھی بہت سی باتیں ترک کر دینا چاہئے۔

مولانا ریل میں سفر کرتے ہیں، موٹر پر سوار ہوتے ہیں، بجلی کی روشنی میں نماز پڑھتے ہیں۔ ڈبل روٹی مکھن استعمال کرتے ہیں، کفار کی مشینوں کا بُنا ہوا کپڑا پہنتے ہیں، خط و کتابت میں کارڈ ٹکٹ استعمال کرتے ہیں جن پر تصویر بنی ہوتی ہے، تار کے ذریعہ سے اپنے پروگرام کی اطلاع اپنے مریدوں کو دیتے ہیں، ولایتی بنی ہوئی گھڑیوں کی مدد سے افطار و سحار کے اوقات کی تعیین کرتے ہیں اور اسی طرح کی بہت سی وہ باتیں کرتے ہیں جن میں (انھیں کی دور از کار تاویل کی بنا پر) تشبہ بالکفار بھی پایا جاتا ہے، مفسدۂ لہو ولعب کا اندیشہ بھی، لیکن حیرت ہو کہ مولانا ان سب کو تو جایز سمجھتے ہیں اور مکبر الصوت کے استعمال کو ناجایز بتاتے ہیں ۔۔ لہو ولعب یا کسی اور مفسدہ کا احتمال ہر اچھی سی اچھی بات میں پایا جا سکتا ہو اور اسکا تعلق ہر شخص کی انفرادی نیت سے ہے۔ نماز سے زیادہ مقدس عمل کوئی نہیں، لیکن وہ بھی لہو ولعب ہو سکتی ہے، اگر کوئی شخص اس کو کھیل سمجھ کر کرے۔ قرآن شریف کی تلاوت ترتیل کے ساتھ نہایت اچھا فعل ہے، لیکن اگر اس سے کوئی موسیقی کا لطف اٹھانے لگے تو وہ بھی لہو ولعب میں داخل ہو جائیگا۔ صدقہ و زکوٰۃ کے فضایل ظاہر ہیں، لیکن اگر اس سے مقصود بیجا نمود و نمایش ہو تو یہ بھی مفسدہ میں داخل ہو جاتا ہے، الغرض تشبہ بالکفار ایسی بات ہے جس سے مولانا خود بھی نہیں بچ سکے اور احتمال لہو ولعب ایسی وسیع چیز ہے کہ نماز روزہ بھی اس کے حدود میں آ سکتا ہے چہ جائیکہ مکبر الصوت ۔ اس لئے ایسے معاملات میں ہمیشہ افادی پہلو کو سامنے رکھ کر فیصلہ کرنا چاہئے اور ایک نئی چیز کو اختیار کرنے سے اس لئے باز نہ رہنا چاہئے کہ وہ اس سے پہلے نہ پائی جاتی تھی، دیکھنا یہ چاہئے کہ وہ ہمارے لئے مفید ہے یا نہیں اور اس سے جایز فایدہ اٹھانے کی کیا صورت ہے ۔۔ مولانا نے اپنے اسی فتویٰ میں جو دلیل نقلی پیش کی ہے وہ نہ صرف اس لحاظ سے کہ اسکا کوئی تعلق مسئلۂ زیر بحث سے نہیں ہے بلکہ اس حیثیت سے بھی کہ مولانا نے اپنی طرف سے بھی اس کے مفہوم میں اضافہ فرمایا ہے، بالکل ساقط الاعتبار ہے ۔۔ مولانا نے کلام مجید کی جو آیت پیش کی ہے اس سے معلوم ہوتا ہو کہ دوسرے مذاہب کے دیوتاؤں یا خداؤں کو برا کہنا اسلام نے منع کیا ہو اور ساتھ ہی ساتھ اسکی وجہ بھی ظاہر کر دی ہو کہ اس سے فساد کا اندیشہ ہو۔ لیکن مولانا نے ساتھ ہی ساتھ یہ بھی فرمایا ہے کہ باطل معبودوں کو گالیاں دینا نہ صرف مباح ہو بلکہ بعض صورتوں میں افضل بھی ہو۔ میں نہیں سمجھتا کہ حضرت مولانا نے یہ استنباط کہاں سے کیا ہو اور اسکے اظہار کا کیا موقعہ تھا۔ میرے نزدیک تو پیش کردہ آیت سے قطعاً اسکی ممانعت کر دی گئی ہو اور ایسی صورت میں اسکو مباح یا افضل بتانا سراسر نص قطعی کی مخالفت ہو، ہو سکتا ہو کہ کلام مجید کی بعض آیات سے وہ اسکا جواز بھی ثابت کر سکیں، لیکن یہ جواز بالکل اسی قسم کی تاویلات بارہ کا نتیجہ ہوگا جس قسم کی تاویلات سے مکبر الصوت کے استعمال کو ناجایز بتایا گیا ہے ۔۔ یہ ہے ہمارے علمار کرام کی وہ قدامت پرستانہ ذہنیت اور کورانہ تقلید جس نے قوم کی قوم کو تباہ کر کے رکھدیا اور یہی ہیں وہ بُت جن کو توڑنا ہر مسلمان کا فرض ہے ۔

نظیر اکبرآبادی کی غزل گوئی

اور

ان کا غیر مطبوعہ کلام

نظیر اکبرآبادی ان شعراء میں سے ہیں جن کی عظمت امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ بڑھتی ہے۔ نظیر اس وقت تک صرف نظم نگار کی حیثیت سے مشہور تھے اور ان کے رنگ تغزل سے لوگ ناواقف تھے۔

ہمارے عزیز دوست جناب لطیف اکبرآبادی نے ان کی غیر مطبوعہ غزلوں کو سامنے رکھ کر جو اتفاق سے ان کے ہاتھ آگئی ہیں یہ مقالہ سپرد قلم کیا ہے اور جس تفصیل کے ساتھ نظیر کی شاعری کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے وہ اپنی قسم کی پہلی کوشش ہے۔

لطیف صاحب کے سامنے نظیر کے متعلق اور بھی بہت سے کام ہیں جن کو وہ فی الحال خاموشی کے ساتھ انجام دے رہے ہیں۔ اس لئے اگر کوئی صاحب نظیر کے متعلق کوئی معلومات رکھتے ہوں تو براہ کرم ان سے آگرہ کے پتہ پر مراسلت کریں۔

(اڈیٹر)

تمہید زندگی حرکت سے عبارت ہے، اس کے کسی شعبے میں ٹھیراؤ آجانے کی مثال "بند پانی" کی سی ہے جس میں بوئے فساد آجاتی ہے۔ شعر و ادب زندگی ہی کا ایک شعبہ ہے، اس کا بھی کسی ایک نقطے پر قایم رہ سکنا محال ہے۔ شعر و ادب اگر ترقی نہیں کرتا تو یقیناً پست ہونے لگتا ہے۔ چنانچہ مسئلۂ ارتقا کے مطابق اردو زبان میں ایسے ارباب کمال پیدا ہوتے رہے جنھوں نے اردو ادبیات کو صناعت کے درجے تک پہونچایا، مگر انھیں ارباب کمال میں وہ جوہر قابل بھی رونما ہونے لازمی تھے جو دوسروں کی طرح اپنے حال اور ماحول کا آلۂ کار نہ تھے، بلکہ ان لوگوں میں سے تھے جو عمومیت اور تقلید سے بغاوت کرکے اپنی راہ الگ بناتے، اور اس طرح مستقبل کی زبان بن جاتے ہیں۔ چونکہ ایسے لوگ اپنے عہد سے مختلف ہوتے ہیں، اس لئے ان کے معاصر اور معاشر انھیں سمجھ نہیں سکتے اور وہ مردود کردئے جاتے ہیں۔ لیکن جلد یا بدیر

وہ وقت آجاتا ہے جب اُن کے جوہر اور قابلیت کی قدر کی جاتی اور اُن کی پرستش ہونے لگتی ہے۔ یہی زمانہ اُن افراد کا حقیقی عہد ہوتا ہے۔ ڈاکٹر جانسن نے ایسے ہی اشخاص سے متعلق کہا ہے :-

"ہر وہ شخص جیسے لکھنے پڑھنے آتا ہے قلم اٹھا سکتا ہے اور اُٹھاتا ہے۔ لیکن ایسے لوگوں کی اکثریت زبان کو اُسی صورت و حالت میں استعمال کرتی ہے جس صورت و حالت میں کہ زبان اُن کے سامنے آتی ہے یا جس صورت و حالت میں کہ وہ زبان کو پاتے ہیں لیکن اس کے برخلاف ایک طباع شخص زبان کو اپنے مقصود اور غایت کا آلہ بناتا ہے اور اپنی خصوصیت سے سانچے میں ڈھال لیتا ہے۔ اُس کے دماغ میں جذبات (Emotions) کا ہجوم اور تموج ہوتا ہے۔ اُس کے اندر جو احساس و خیال، تخئیل و آرزو، ہمراہی و تضاد و تمنا ہوتی رہتی ہیں، امتیازات و تصورات جو اُس کے لئے فطری ہیں، زندگی، آداب زندگی کے متعلق اُس کی رائے، تاریخ کے باب میں اُس کا فیصلہ، اُس کی جدت و ظرافت، لغوی معنے میں اُس کی منطق اور اُس کی قابلیت، فرزانگی و حماقت، تمام ناقابل شمار مختلف اور خود اُس کے ذہن کی تڑپ، اُس کے دماغ میں منتقل ہو جاتی ہیں اور وہ ان سب کو مناسب الفاظ اور موافق زبان میں اپنے مخصوص انداز بیان میں پیش کرتا ہے۔ اُس کی یہ زبان اظہار اُس کے ذہنی تخیلات سے مشابہ اور اُسی طرح کی کثیر الاشکال ہوتی ہے۔ وہ ایسی زبان اختیار کرتا ہے جو اُسکی شخصیت کے زور کا قرار واقعی اظہار اور اُس کا عکس و پرتو ہوتی ہے"

عہد متاخرین تک اردو ادبیات کی تاریخ میں صرف دو ہستیاں ایسی نظر آتی ہیں جن پر جانسن کی یہ تعریف صادق آسکتی ہے یعنی نظیر اور غالب۔ ان دونوں نے عام مسلک کو ترک کرکے اپنے لئے نئی راہ پیدا کی اور دونوں ہمیشہ مطعون رہے۔ اُن کے زمانہ میں اُن کی قدر ہونا ناممکن تھا اگر ہوتی بھی تو بالکل غلط پیرایہ پر۔ لیکن اُن کا اصلی عہد بھی آگیا۔

باوجود تاخر، غالب کی قدر نظیر سے پہلے پہچانی گئی یعنی غالب پچاس ساٹھ سال اور نظیر سو سال زمانہ مابعد کی زبان سے اس تقدم و تاخر کی وجہ شاید یہ ہو کہ جدید تعلیم نے فلسفیانہ خیالات کی قدر کرنا ہمیں پہلے سکھایا اور صحیفۂ فطرت کے مطالعہ کا درس بعد میں۔

اگست ۱۹۴۱ء میں "یوم نظیر" کی تقریب پر دلی ریڈیو اسٹیشن سے میں نے ایک مختصر گفتگو میں میاں نظیر کی غزل گوئی پر روشنی ڈالی تھی۔ اس موقع پر اُسی موضوع کے متعلق تفصیلی اظہار خیال مقصود ہے۔ نظیر اسوقت تک جس بنا پر مشہور و معروف ہیں وہ اُنکی نظمیں ہیں، اور اُنکے متعلق مخالف یا موافق آراء کا مدار اُنکا وہی کلام رہا ہے جو مشاہدۂ فطرت یا مناظر قدرت کی شاعری سے موسوم ہے۔ نظیر کا غزلیہ کلام نشر و اشاعت نہیں پا سکا۔ اس کی ایک توجیہ تو یہ ہو سکتی ہے کہ اُن کی غزل گوئی اُن کی نظموں کی شہرت سے دب گئی اور دوسری یہ کہ اُن کا غزلیہ کلام عدم اشاعت کے باعث منظر عام پر نہ آسکا۔ اس سے کہ اُن کے متداول کلیات میں پچیس کے قریب غزلیں شامل ہیں اور پروفیسر شہباز کو بھی جنھوں نے واقعتاً نظیر کو دوسرا جنم دیا، تقریباً سو غزلیں دستیاب ہوسکیں۔ لیکن سید عابد علی صاحب اکبرآبادی نے گزشتہ دس سال کی مسلسل جستجو کے بعد کچھ غیر مطبوعہ نظموں کے علاوہ غزلیہ کلام کا جو ذخیرہ فراہم کر لیا ہے، آج اُس کی تعداد چھ سو غزلوں سے اوپر ہے۔ سید صاحب نے حقیقتاً اردو زبان اور نظیر کے معترفین پر زبردست احسان کیا ہے۔ لیکن قوم کی پست ہمتی کو دیکھتے ہوئے کیا امید ہو سکتی ہے کہ یہ مجموعہ اُس کا ایک عمدہ انتخاب ہی

طبع و اشاعت پاسکے گا۔ اس مضمون کی ترتیب کے وقت میرے سامنے نظیر کا ایک قلمی نسخہ ہے جس میں تقریباً دو سو غزلیں اور
اسی نظمیں شامل ہیں۔ نظموں میں اکثر مطبوعہ اور غزلوں میں بیشتر غیر مطبوعہ ہیں۔

اوائل عمر میں نظیر نے وہ دورِ زرّیں کا زمانہ دیکھا تھا اور زندگی کے تقریباً سو سال پورے کرنے میں ہندوستان کے قصر شہنشاہی
کے بام و در گرنے کا نظارہ کیا تھا۔ اور وہ تنزل کا زمانہ بھی دیکھا جب غاصبوں اور غداروں کا عروج پانا بھی۔ زندگی کے نشیب
فراز کے ان مناظر کا سامنے آنا اور زمانے کی ستم پروری سے دوچار ہونا۔ ہر صحیح الفکر انسان کو غور و تامل پر مجبور کر دیتا ہے
نظیر کی حکیمانہ نظر نے عالم کی بے ثباتی اور زندگی کی حقیقت کو بے نقاب دیکھا۔ معلمی کے پیشے نے طبیعت میں قناعت اور
استغنا پیدا کر دیا۔ شاہی درباروں کا طمع اور امیرانہ جاہ و حشمت کی تلخی اگر نظیر کے سامنے اس طرح نہ کھلتی تو شاید لکھنؤ
حیدرآباد اور بھرتپور کے بلاوے مسترد نہ ہوتے۔ نظیر حصولِ مال کی طرف سے بے پروا اور تحسین و آفرین سے بے نیاز تھے
دولت سے نفرت۔ فلسفیانہ طبیعت کا اور شان و مرتبت سے بے پروائی، شاعرانہ بصیرت کا نتیجہ ہے۔ نظیر نے کسی
کی حاشیہ نشینی قبول نہ کی، کیونکہ وہ خود طبیعت کے بادشاہ تھے۔ جب طبیعت اور مزاج کا یہ عالم ہو تو ایک شخص کا خوش خلق
اور منکسر المزاج ہونا بھی فطری سی بات ہے۔ چنانچہ ان حالات و اسباب کا اقتضا یہی ہو سکتا تھا کہ میاں نظیر کی صحبت میں
عام طبقے کے لوگ زیادہ نظر آئیں۔ ماحول کا اثر مسلم ہے۔ نظیر نے شعر کہا تو اُنہوں نے وہی موضوع منتخب کئے جو عام دلچسپی اور
لگاؤ کی چیز تھے اور وہی انداز اختیار کیا جو عام فہم ہو سکتا تھا

نظیر کا انتخابِ موضوعات ایک خاص نکتہ ہے جس کو سمجھ کر ہم ایک طرف تو ان کی تحریکِ شعری کی صداقت کو سمجھ سکتے ہیں
اور دوسری طرف خود اُن کے نفس و مزاج کا بھی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ ان کے موضوعات شعری کی نوعیت پر غور کرنے سے یہ بات
سامنے آتی ہے کہ نظیر طبقۂ متوسط سے متعلق تھے جو سماجی قوانین کی جکڑ بندیوں میں زیادہ الجھا ہوتا ہے، لیکن اپنے رجحان
شعری کے مقابلہ میں وہ اپنے سماج سے ایک ذرہ بھر مرعوب نہ تھے۔ اُن کی شاعری اُن کی طبیعت کا تقاضا تھا جس میں
اُن کی فطرت جھلکتی تھی۔ شاعری ان کے لئے وجہ تفاخر یا ذریعۂ معاش نہ تھی۔

ایک حقیقی شاعر کی داخلی زندگی اس کے شعر میں پوری طرح منعکس ہوتی ہے، لیکن کسی شاعر کے کلام سے اُسکی
خارجی زندگی مرتب کرنا کسی طرح درست نہیں ہو سکتا۔ رہن سہن کا طریقہ یقیناً اتنا دلچسپ نہیں ہو سکتا جتنا رہن سہن
کی آرزو اور احساس دلچسپ ہو سکتے ہیں۔ کیونکہ وہ اصل شاعر ہوتا ہے۔ ایک شاعر کا اپنا کردار جس قدر اس کے
جذبات میں جھلک سکتا ہے اتنا افعال میں نمایاں نہیں ہوتا کیونکہ اکثر جذبات فعل کی صورت اختیار کرنے سے رہ جاتے
ہیں۔ لیکن ایک سچا شاعر فکراً و حساً اور عملاً و فعلاً مختلف نہیں ہوتا۔ چنانچہ نظیر کی داخلی و خارجی زندگی، یعنی اُنکے جذبات
و حسیات اور فعل و عمل میں شدید قسم کی مطابقت پائی جاتی ہے۔ اور چونکہ میاں نظیر زندگی کے نقاش ہیں اور زندگی بھی سامنے
کی، یہی سبب ہے کہ اُن کے یہاں مقامی رنگ اس کثرت اور اس خصوصیت کے ساتھ نظر آتا ہے۔

نظیر کی مبتذل گوئی

میاں نظیر کی شاعری کے متعلق اظہار خیالات سے پہلے میں چاہتا ہوں کہ اُن کی ابتذال نویسی کی حقیقت پر ایک نظر ڈال لی جائے۔ جہاں تک نفسِ اعتراض کا تعلق ہے، میری نظر سے اور بہت سے شعرائے فارسی و اردو کا ایسا ہی کلام گزرا ہے، پھر تعجب ہے کہ صرف نظیر ہی ہدفِ ملامت بنانے کے لئے کیوں چھانٹا گیا؟ میں جس نتیجہ تک پہونچ سکا ہوں وہ یہ ہے کہ ابتذال کا لفظ بہت ہی محدود معنے میں نظیر کے کلام کی نسبت استعمال کیا جاسکتا ہے۔ نظیر نے تقلید ترک کرکے تصنع سے بغاوت کی فطانت نے اُن کو حقیقی شاعری کا مسلک سجھایا اور اُنھوں نے سامنے کے مظاہر زندگی کو اس طرح بیان کیا کہ عوام میں مقبول ہوگئے۔ چونکہ اُنھیں عوام سے سندِ قبول ملی اس لئے لوگوں نے آنکھ بند کرکے اُن کے کلام کے پوچ اور مبتذل ہونے کا فتویٰ صادر کر دیا۔ یہ اُن کے عہد کے سماج کا قانون تھا کہ اجلاف جس بات کو پسند کرتے، اشراف میں معیوب سمجھی جاتی تھی۔

ممتاز اور قابل ذکر افراد میں سب سے پہلے نواب شیفتہ نے یہ اعتراض وارد کیا تھا۔ پھر مؤلف آبحیات نے نظیر کے استخفاف پر کمر باندھی اور اُن کے بعد مولانا شبلی نے شیفتہ کی رائے اور آزاد کے خیال کی تائید کی۔ آجکل کے بعض نوجوان "ادیب" بھی اسی رائے اور خیال سے متاثر ہوکر نظیر کو فحش گو اور مبتذل نویس کہتے ہیں۔

مجھے شیفتہ کی رائے سے کوئی تکرار اور حجت نہیں۔ اول تو وہ ذاتی رائے تھی، کہیں سے مستعار نہ تھی اور رائے آزاد ہے۔ دوسرے یہ کہ شیفتہ جس سماج کے فرد تھے اُس کے بازار میں امارت کی ٹکسال میں ڈھلی ہوئی شرافت کا سکہ چلتا تھا، اس لئے اُس عہد کا ادب بھی اُسی طبقے کے مزاج و مذاق کا آئینہ تھا۔ ادنےٰ طبقے "اجلاف" کے نام سے موسوم تھے جن کی زندگی نہ تھی کہ ادب میں جگہ پائے یا جس کا ذکر ادب کہلائے۔ یہ بات چونکہ متانت یعنی امارت یا شرافت سے خارج تھی، اس لئے ادب سے بھی خارج تھی اور حقیقت تو یہ ہے کہ اُس عہد میں زندگی و ادب کے مابین تعلق کا خیال ہی کب پیدا ہوا تھا! لہذا شیفتہ کی رائے اُسوقت کے معاشری رجحان اور ادبی میلان کی پوری طرح آئینہ داری کرتی۔ مطلقہ کامل صداقت کے ساتھ پیش کردیتی ہے۔ اُس زمانہ کا معیار شعر و شرافت نظیر کی شاعری پر یہی تنقید کرسکتا تھا

شمس العلما مولانا محمد حسین آزاد کا خیال قابلِ افسوس ہے۔ وہ نئے رجحانات ادب کے مبلغ تھے۔ حیف ہے کہ اُنکے مذاق فطرت پرستی کو نظیر کے تمام سرمایۂ شاعری میں چند ہی شعر ایسے نظر آئے جو میر کے کلام سے ٹکر کھاتے تھے!

لیکن یہ ماجرا بہت زیادہ افسوسناک ہے کہ مولانا شبلی نعمانی کی بالغ نظر بھی نظیر کی شاعری میں کوئی حسن و خوبی نہ دیکھ سکی اور وہ شیفتہ اور آزاد کے ہمنوا ہوگئے۔ حالانکہ مولانا کا زمانہ شیفتہ کے زمانہ سے مختلف تھا۔ جدید خیالات کافی طور پر پھیل چکے تھے۔ ادب اور صناعت کے نظریوں کی کافی اشاعت ہوچکی اور اُن میں وسعت آچکی تھی۔ شیفتہ کے عہد کی تنگ نظری باقی نہ تھی۔ مولانا خود جدید علوم پر نظر رکھتے تھے

میرا قیاس یہ ہے کہ مولانا نے نظیر کے کلام پر نظر ڈالے بغیر اپنے پیشروؤں پر اعتماد کیا۔ لیکن اس طرز عمل سے اُن پر

ایک غیر ذمہ دارانہ اظہار رائے کا الزام عاید ہوتا ہے اور شبلی سے عالم و فاضل کے لئے یہ ایک کمزوری ہے۔ باایں ہمہ شاید اس کی کوئی تاویل ہو سکتی، مگر اس کا کیا جواب ہے کہ اپنے قیام حیدرآباد میں مولانا نے پروفیسر شہباز سے یہ سن کر کہ وہ نظیر پر کچھ کام کر رہے ہیں، اُن کی اس سعی و کاوش کو فعل عبث سمجھا اور اگرچہ پروفیسر صاحب کی توجیہ کرنے پر مولانا نے اُنسے اتفاق رائے کر لیا، لیکن نظیر کے متعلق مولانا کی اصلی رائے "موازنۂ انیس و دبیر" میں موجود ہے اور اس میں کسی ترمیم کا علم کم از کم مجھے نہیں ہو سکا ہے۔

گریجویٹ اُدباے جدید کے اعتراض کی حقیقت بس اتنی ہے کہ پچھلے زمانوں کے مقابلہ میں آج کل انسانی مصروفیتیں چونکہ بہت زیادہ ہیں، نیز یہ عہد مشینی کہلاتا ہے، اس لئے کفایت وقت کی خاطر ہم اپنی بہت سی ضرورتیں "طیار" چیزیں خریدکر پوری کرنے میں سہولت دیکھتے ہیں۔ ممکن ہے کہ سیاسیات قسم کے شعبوں میں اخبارات اور لیڈروں کی رائیں اپنا لینا شاید مضائقے کی بات نہ ہو، مگر زندگی کے ہر شعبے میں اس سہولت پر عمل کرنا بہت پرخطر ثابت ہو سکتا ہے

شعر کی بحث میں آکر لفظ ابتذال کا مفہوم کچھ وسیع اور نوعیت کچھ مختلف ہو جاتی ہے۔ معنوی ابتذال سے شاید ہی کسی شاعر کا دامن پاک رہا ہو، لیکن لسانی (لفظی) ابتذال بھی نہایت ثقہ شاعروں کے کلام میں موجود ہے۔ سعدی کی گلستاں کا باب پنجم خاص و عام کی زبان پر ہے۔ امیر خسرو کی مثنوی "عشقیہ" میں زفاف کی تفصیل، حکیم سنائی کی مذمتوں میں خواہر و دختر کی مذمت، اور صدہا شعرا کی ہجو و ہزل ہمارے سامنے ہے۔ چونکہ اکثر اور ثقات شعرا کے یہاں بھی ایسا ادب پایا جاتا ہے، اس لئے ہم یہی ایک نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ "واقعیت نگاری" سے قطع نظر، اس قسم کا کلام اظہار قدرت و کمال کے تحت عالم وجود میں آتا تھا اور جب یہ حال ہے تو تنہا نظیر کو مطعون کرنا کہاں کا انصاف ہو سکتا ہے؟

نظیر کے کثیر ذخیرۂ شاعری میں چند نظمیں یا اشعار ایسے ہیں جن پر یہ اعتراض وارد ہو سکتا ہے۔ لیکن اُن چند نظموں میں بھی دو چار ہی ایسی ہیں، جو کسی ادبی قدر کے بغیر پست ہیں، ورنہ باقی نظموں میں کوئی نہ کوئی ادبی قدر اور صناعتی قیمت پائی جاتی ہے۔ لیکن نظیر کے کلام پر نظر ڈالتے وقت ہمیں یہ نہ بھولنا چاہئے کہ وہ مطالعۂ حیات کرنے والا شاعر ہے، اور یہ بھی فراموش نہ ہونا چاہئے کہ زبان کے مرتبہ کا موضوع کے رتبہ سے بلند و پست ہونا اصول فن کے خلاف ہے۔ چہ یہ بھی سامنے رکھنا ہے کہ آج کا نظریۂ صناعت موضوع کے ثقہ یا غیر ثقہ ہونے کو مہمل سی بات سمجھتا ہے۔ اس باب میں صرف یہ دیکھا جاتا ہے کہ موضوع کے ساتھ پورا انصاف کیا گیا ہے یا نہیں۔ آج شاعر کا مسلم منصب یہ ہے کہ جو موضوع اُس کی توجہ کو جذب کر سکے اور ایک شاعر میں وسعتِ نظر و خیال لازمی ہے۔ وہ کامل صداقت اور انتہائی صفائی سے اُس کا اظہار کر دے ایک شاعر اگر کسی مبتذل موضوع کا اظہار پوری صداقت اور کامل حسن سے کر دیتا ہے تو اُسے صناعت ہی کہا جائے گا

نظیر کی مبتذل گوئی کے ذیل میں ایک اہم اور واقعاتی نکتہ یہ ہے کہ اُن کے کلام کا ایک معقول جز و فرمایشی اور بدیہی ہے۔ منجملہ اور روایتوں کے آگرہ میں یہ بھی مشہور ہے کہ لوگ راہ چلتے میاں نظیر کے ٹٹو کی باگ پکڑ لیتے اور حسب حال شعروں

کی فرمائش کرتے تھے اور چونکہ وہ ہر شخص کے لئے قابلِ حصول اور فقیرانہ مشرب کے آدمی تھے اور انھیں اس کی دلشکنی گوارا نہ تھی، فوراً کچھ شعر کہہ کر لوگوں کو ہنسا دیتے اور خوش کر دیتے تھے۔ دوسرے یہ کہ میاں نظیر کی حُسن پرستی خود اُن کے کلام سے ثابت ہے۔ حُسن کی محفلوں میں جانے کا پروانہ میاں نظیر کے پاس بدیہہ گوئی کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا؟ چنانچہ اُن کی بعض نظموں سے صاف اور بیّن طور سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ فرمائشی ہیں اور فی البدیہہ کہی گئی ہیں۔ ایسا کلام بہ لحاظ اعتبار سے بھی پست ہے اور اس میں بعض پستیاں بھی موجود ہیں۔ ظاہر ہے کہ عوام کی یا بازارِ حسن کی فرمائشیں پوری کرنے میں نظیر نقائص شعری دور کرنے کے لئے جان نہ کھپاتے ہوں گے اور ہنسنے ہنسانے کے لئے لہجے میں عمداً عامیانہ انداز رکھتے ہوں گے۔ چنانچہ ان کے ایسے کلام کو اس کلام سے جو شاعرانہ تاثر کے تحت وجود میں آیا ہے، بآسانی تمیز کیا جا سکتا ہے۔ بایں ہمہ ان کی نیچرل نگاری کی خصوصیت دونوں طرح کی شاعری میں نمایاں رہتی ہے۔

نظیر کے معترض اگر مجموعۂ کلام کو غور سے دیکھتے تو زبان کا اختلاف معیار دیکھ کر ان کو خود بخود نظر آجاتا کہ "کنہیا جی کا بالپن" اور "شیخ سلیم چشتی"، "آدمی نامہ" اور "بھنگ کا پیالہ"، "خربوزے" اور "عشق کی ہمہ گیری" کی زبان اور لہجے میں بہت بڑا فرق و امتیاز ہے۔ اگر ایسا کیا جاتا تو نہ صرف یہ کہ وہ اپنے اعتراض کا جواب پا لیتے بلکہ ان پر نظیر کا کمالِ فن بھی آشکار ہو جاتا۔

نظیر کی شاعری

کسی شاعر کے کلام پر تبصرہ کرتے وقت ہمارے یہاں بالعموم مضمون آفرینی، بندش کی چستی، تشبیہ کا حُسن، استعارے کی خوبی، اور محاورے کی برجستگی وغیرہ دکھانے میں توجہ صرف کی جاتی ہے۔ میں اس روایتی طریقے کو ترک کر کے نظیر کی بعض ایسی خصوصیات کو اجاگر کرنے کی کوشش کروں گا جو سرسری مطالعہ میں نظر سے رہ جاتی یا عام نگاہوں میں نہیں آتی ہیں۔ مجھے یہاں یہ بھی اعتراف کرنا چاہئے کہ میرا مقصود کلامِ نظیر کی تحسین ہے لیکن "تحسین" کا مفہوم "القا نظر" نہ سمجھنا چاہئے۔

فنی اعتبار سے نظیر کی شاعری میں فروگذاشتیں ہیں لیکن بڑے بڑے مسلم الثبوت شعرا کے یہاں بھی ایسی فروگذاشتیں موجود ہیں۔ شکسپیر کے اغلاط اگر جائز قرار دے جائیں تو ان کی ایک جدا لغت تیار ہو سکتی ہے۔ وہٹ مین (Whitman) اگر "قانون بالذات" کا لقب پا سکتا ہے، تو کوئی وجہ نہیں کہ نظیر بھی مستثنیٰ نہ کئے جائیں۔ شعر کے بہت سے محاسن کو اس بنا پر مسترد کر دینا کہ اس میں بعض شرطیں پوری نہیں ہوئی ہیں ایک غیر فلسفیانہ حرکت بھی ہے۔ نظیر کی فنی غلطیوں پر دوسرے مستند شعرا کی مثالیں دے کر پنڈت کیفی صاحب نے ایک جامع بحث کی ہے اور ضروری نہیں کہ یہاں اس موضوع پر اس سے زیادہ بحث کی جائے۔

شیلے (Shelley) نے شعر کی ایک نہایت جامع تعریف کی ہے، وہ کہتا ہے کہ "شعر زندگی کا ہو بہو نقش ہے اور شعر میں زندگی کی خارجی صداقت کا اظہار ہوتا ہے"۔ بالفاظ دیگر شاعر اپنی صناعت میں فطرتِ انسان کی شکلیں بناتا ہے جو ان افعال کے فنا ہو چکنے کے بعد بھی جن کی کہ وہ نقل ہیں، بصورتِ اعجاز باقی رہتی ہیں۔

نظیر فطری و حقیقی شاعر ہیں اور اُن کا تقلید سے بغاوت کرکے زبان سے اپنی غایت کے مطابق کام لینا اُنکو جونسن
کے مطابق ایک فطین شاعر ثابت کرتا ہے اور اس سے کہ نظیر کی نظر وسیع ہے اور پوری زندگی اُن کے سامنے ہے انسانی
خوبیاں اور خرابیاں یکساں طور پر اُن کی شاعری کا مسالہ ہیں اور وہ زندگی کے سچے نقشے کھینچتے ہیں، شیلے کی تعریف
انھیں حقیقی شاعر بتاتی ہے۔

عام طور پر نظیر کی شاعری ایک چشمے کی مثال ہے۔ اُن کے شعر کی روانی چشمے کی سی روانی ہے اور جس طرح ایک
چشمہ کا پانی کہیں گہرا کہیں اُتھلا ہوتا ہے، اور جہاں اُتھلا ہوتا ہے وہاں تہ تک بلور پارے اور کہیں کہیں جواہر ریزے
اپنی رنگینی و دلکشی نمایاں کرتے دکھائی دیتے ہیں گو چشمہ [illegible] برابر جاری ہے، بالکل یہی کیفیت نظیر کے کلام کی ہے

نظیر کے پاس شعر کے مسالے کی بہتات سے ان کو اپنی شاعری کے موضوع و مسالے سے کتنا گہرا تعلق اور انہماک
ہے اور وہ اُس سے اس قدر لطف و لذت حاصل کرتے ہیں؟ اس کا اندازہ کرنا دشوار ہے۔ ہم اُن کے کلام سے
محسوس کرتے ہیں کہ یہاں نظیر [illegible] در و دیوار زمین و آسمان کو لپٹتی دیکھ رہے ہیں، ہولی کے دنوں میں اُنکو
عبیر گلال اور زعفران کی بارش ہوتی دکھائی دیتی ہے، بھنگ اور شراب کے نشے میں چور ہوتے آرہے ہیں، بچوں کے ساتھ
کھیلنے میں دنیا و مافیہا کو بھولے ہوئے ہیں، عورتوں کے لباس کی خوشرنگی اور زیور کی زیبائی انھیں مسرت کی بہشت میں
پہونچائے دے رہی ہے، غرض تیج تہوار، میلے ٹھیلے، رسوم، تقریبات، ان کے احساس کی [illegible] کے لئے آب و رنگ
ہیں، اور اُن کے احساسات و اشارات کا حقیقی ذریعہ بن جاتے ہیں۔ چونکہ اُن کے شعر کا مسالہ زندگی فراہم کرتی ہے اسلئے
اُن کے اظہار میں زندگی کی صداقت جھلکتی ہے، مبالغہ کی [illegible] اور اس کے متعلق
اتنی تفصیل پیش کردیتے ہیں کہ بعض وقت یہ بات ان کی تعبیر [illegible] بیان [illegible] نہیں ملنے دیتی جو اچھے کلام سے حاصل
ہوا کرتی ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ وہ جن واقعات و اشیاء کا بیان کرتے ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ ان واقعات و اشیاء کی
حسی و جسمانی زندگی میں ڈوب جاتے ہیں۔ کیونکہ وہ اُن کے اندر انھیں کو بھی اپنا لیتے ہیں اور یہی احساس کی معراج ہے
نظیر جس طرح احساس کرتے ہیں، اسی طرح ظاہر کرسکتے ہیں اور اس کے ظاہر کرنے سے سننے یا پڑھنے والے میں بھی وہ
احساس اُسی طرح پیدا ہوجاتا ہے اور وہ تمام [illegible] احساس میں [illegible] شریک ہوجاتا ہے

فطرت پرستی نظیر کی فطرت ہے کسی وقت بھی وہ فطرت کا ساتھ چھوڑتے معلوم نہیں ہوتے۔ وہ جب کسی پرند کی
چہکار سنتے ہیں، جب ستاروں کی جگمگاہٹ نظر آتی ہے، جب چاندنی چٹکی ہوئی دیکھتے ہیں، جب دھنک نکلی ہوئی
دکھائی دیتی ہے، تو وہ فطرت سے اتنے ہی قریب ہوتے ہیں جتنا کہ ابتدا اُس وقت ہوتے ہوں گے جب اشیاء و انواع
نے اسماء کا جامہ نہیں پہنا تھا نظیر ہمیں اپنے سروش غیبی سے ہمکلام ہوتے سنائی دیتے ہیں وہ ہمیں یہ معلوم کرادیتے ہیں کہ
اُن کا ماحول اُن کے لئے ایک جذبہ کی صورت رکھتا ہے، وہ اُسے ایک طلسم زار کی صورت میں دیکھتے اور اُسے

ایک طلسم زاری کی طرح محسوس کرکے لطف اندوز ہوتے ہیں

جان ڈرنک واٹر (John Drink Water) کے بقول شاعری دو غالب اثرات سے متاثر ہوتی ہے۔ ایک خود شاعر کی شخصیت سے، دوسرے اُس زمانہ کی اسپرٹ سے نظیر کی شاعری میں اُن کی شخصیت کے زور کا قرار واقعی اظہار تو ہر جگہ کارفرما نظر آتا ہے، لیکن اُس عہد کی اسپرٹ کے عوض عہد مستقبل کی اسپرٹ زیادہ دیکھنے میں آتی ہے۔ نظیر کی فطانت کی یہی سب سے بڑی دلیل ہو سکتی ہے کیونکہ یہ بھی ایک مسلم بات ہے کہ ہر شاعر کے ذہن میں ایک نمونہ و مثال ضرور ہوتی ہے جس کے سانچے میں اس کی شاعری ڈھلتی ہے۔ لیکن نظیر کے سامنے ایسا کوئی نمونہ نہ تھا۔ وہ مشاہدۂ فطرت تک صرف اپنی فطانت کے زور سے پہونچے، جذبات کو انقلابی شکل میں پیش کرنا اور عام زندگی کے تمام پہلوؤں سے اپنے شعر کا مسالہ حاصل کرنا انھیں فطانت ہی نے سکھایا۔ اس اعتبار سے نظیر کو غالب پر بھی فوقیت ہے۔

شعر نظیر کی نمایاں صفت بندش کی سادگی اور بیان و خیال کی روانی ہے، جو میر کی سادگی و روانی سے مختلف ہو بلاشبہ میر کا احساس مقابلتاً گہرا ہے۔ لیکن حسن تخلیق اور جمال کائنات کے اظہار میں اُردو کا کوئی شاعر نظیر کے مقابلہ میں نہیں لایا جا سکتا اس سے انکار نہیں کہ نظیر کے یہاں میر کی طرح نفسیات کے گہرے رازوں کا انکشاف نہونے کے برابر ہو لیکن نفسیات کا دائرہ جذبات محبت ہی میں محدود نہیں ہے۔ نظیر کے یہاں نفسیات کا انکشاف ہے اور مبادی نفسیات تو اُن سے کسی موقعہ پر ترک نہیں ہوتے۔ اس لئے کہ وہ عام انسانوں کے شاعر ہیں۔ یہ بھی تسلیم ہے کہ نظیر نے غالب کی طرح فلسفہ کی گتھیاں نہیں سلجھائیں، لیکن نظیر فلسفۂ زندگی کے جسے انگریزی میں (Philosophy of Everyday) کہا جاتا ہے، مفسر ہیں اور وہ اُن کے یہاں موجود ہے بلکہ کہنا چاہئے کہ وہی وہ ہے۔ کیونکہ اُن کے پیش نظر سامنے کی زندگی ہے۔

نظیر کی نقاشی فطرت کے ضمن میں شعرائے مرثیہ کو خاص کر میر انیس کا ذکر کیا جا سکتا ہے۔ لیکن غور کرنے کے بعد واضح ہو جائے گا کہ نظیر اور انیس میں بہت بڑا فرق ہے، دونوں کا نقطۂ نظر ایک نہیں ہے۔ مرثیہ میں جو قدرتی مناظر ہمارے سامنے آتے ہیں وہ شاعر کے عشق فطرت اور اُس کے مشاہدے کا نتیجہ نہیں ہوتے۔ بلکہ اُن کے لئے "روایتی بیانات" کا نام زیادہ موزوں ہے۔

نظیر کی شاعری کے متعلق ڈاکٹر فیلن نے بسوط اظہار خیال کیا، اور اُس کو سچی شاعری اور نظیر کو اعلیٰ پائے کا شاعر تسلیم کیا ہے۔ نظیر کی شاعری کے متعلق ایک خاص بات یہ اور کہنا ہے کہ کسی خاص یا نئے انداز کی شاعری کے پھلنے پھولنے کے لئے خاص ہی فضاء و ماحول کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ وہ آزادی سے سانس لے سکے۔ مگر نظیر کے انداز شاعری کے لئے اُن کا زمانہ ناموافق تھا، اس لئے اُن کا مسلک شعر پھیل نہ سکا، اُس کا وقت اب آیا ہے۔ عصری رجحانات غمازی کر رہے ہیں کہ ادبی مستقبل نظیر ہی کے ہاتھ ہے۔ عہد حاضر واقعیت نگاری پر فریفتہ ہے، اور نظیر اُس سے بھی

بڑھکر فطرتیت (Naturalism) پر کاربند ہیں۔ نواب جعفر علی خاں اثر نے فطرتیت کے اعتبار سے نظیر کو اولیت کا مرتبہ دیا ہے۔

الغرض نظیر کا غزلیہ کلام دیکھکر ایک سخن سنج اس قطعی نتیجہ پر پہونچے گا کہ وہ غزل گوئی میں اپنے معاصر اساتذہ کے ہم پایہ اور فطرت یا زندگی کی نقاشی میں بالکل منفرد اور یگانہ تھے۔ نظیر کی غزل کا پیرایہ تو وہی ہے جو مروج تھا لیکن خیال و بیان کا انوکھا پن غزل میں بھی ظاہر ہوتا ہے۔

نظیر کا تغزل

نظیر کے کلام میں تغزل کا رنگ، ضروری نہ تھا کہ علٰحدہ عنوان سے دکھایا جاتا، کیونکہ دوسرے عنوانوں کے تحت جو مثالیں آئیں گی اُن میں دیگر شعری خوبیوں کے علاوہ نظیر کے تغزل کا رنگ بھی نظر آجائے گا۔ تاہم یہ ظاہر کرنے میں کوئی ہرج نہیں کہ نظیر کے یہاں کافی تغزل ہے۔ وہ کہیں کہیں معشوقانہ انداز بھی اختیار کر لیتے اور مناسب حد تک شوخ و ظریف بھی ہو جاتے ہیں۔ اکثر غزلیں معاملے کی باتوں میں قطعہ بند ہو گئی ہیں یا مسلسل کہنی پڑی ہیں۔ اس جگہ چند شعر اور ایک پوری غزل اس خیال سے نقل کی جاتی ہے:-

آیا جو مرے قتل کو کھینچے ہوئے شمشیر، کیا آن تھی واللہ　　اسوقت کوئی لفظ مرے منھ سے نہ نکلا جز حرف اہا ہا

آغوشِ تصور میں جب ہم نے اُسے مسکا　　لبہائے نزاکت سے ایک شور تھا بس بس کا

سو بار سحر پہ اُس کا مسکا نگہ گل سے　　شبنم سے کب اے بلبل پیراہنِ گل مسکا

اُس وقت جیسی نکلیں مری حسرتیں نظیر　　اُن لذتوں کو دل ہی سمجھتا ہے یا حنا

لڑکی منھ سے نہ بولی، رہ بیٹھی جھڑکیاں لیں　　اُسے سب کچھ بن آتا ہے، مجھے کچھ بن نہیں آتا

ساقی بہار آئی اور جوش ہے گلوں کا　　لا جام بھر کے اس میں، اک شور بلبلوں کا

پھر نظر دیکھیں اُس عہد شکن کی صورت　　دیکھئے کون سا یارب وہ زمانہ ہوگا

ساقی بھی یوں جام لیکر رہ گیا　　جس طرح تصویر ہو ساغر بکف

قرار لینے کو جاتے ہیں ہم جب اُسکے پاس　　زیادہ اور بھی ہو بے قرار آتے ہیں

ہر زخم پر ہے آہ کے بدلے صدائے واہ　　کیا پردلی ہے اس دل خانہ خراب میں

شوقِ دیدار ہے یا جذبۂ اُلفت ہے، غرض　　کوئی تو ہے کہ جو کھینچے لئے جاتا ہے مجھے

مجھ پر ابرو کی یوں نہ کھینچ کماں　　او، میں تیری کمان کے قرباں

داد تیرے بھی حسن کی دیتا　　آج ہوتا اگر مہ کنعاں

ٹھنڈی آہیں جگر سے نکلیں ہیں،　　اشک بھی متصل ہیں قطرہ زناں،

دم غنیمت ہے پھر کہاں اے دل　　یہ ہوا سرد اور یہ آب رواں،

بوسہ لیجئے جو ہو کے دست و کمر | اتنی ہم میں کہاں ہے تاب وتواں
وہ دہن اور کہاں لب اپنے نظیر | وہ کمر اور کہاں یہ ہاتھ میاں

نظیر کی زبان و فرہنگ یہ بالکل صحیح ہے کہ شاعری کی زبان روزمرہ کی کاروباری زبان نہیں ہوسکتی لیکن یہ بھی اُسی قدر مسلم ہے کہ حقیقی شاعر روزمرہ کی زبان سے بہت گریز بھی نہیں جاسکتا غالباً یہ ارسطو کا قایم کردہ اُصول ہے کہ زبان کا معیار موضوع کے رتبہ کے متعلق ہونا چاہئے۔ نظیر کی شاعری میں جو زبان استعمال ہوئی ہے اُس کے معیار کا تنوع ایک ناطق استدلال ہے کہ یہ مختلف معیار سوچ سمجھکر اختیار کئے گئے ہیں

نظیر نہ صرف اُردو زبان پر عبور رکھتے تھے۔ عربی، فارسی، اُردو، بھاشا، پنجابی، پوربی اور مارواڑی زبانوں کے شعر اُن کی ایک غزل میں موجود ہیں، جس کا مقطع ہے:۔

کبھی تو ہنس کر شتاب آجا نظیر کی طرف بھی ٹک اسے جال
بناکے سج دھج، پھراکے دامن، لگاکے ٹھوکر، ہلاکے بالا

عام طور پر نظیر نے صادہ وصاف زبان میں شاعری کی ہے اور چونکہ نظیر کے خیال میں اُلجھن نہیں ہوتی اسلئے زبان میں بھی گنجلک نہیں آنے پاتی ہے۔ محمود صاحب نے اپنی تالیف "روح نظیر" میں توجہ دلائی ہے کہ نظیر الفاظ کا استعمال اُسی طرح کرتے تھے جس طرح وہ الفاظ عام بول چال میں آتے تھے۔ یہ صحیح ہے، مگر اُسی حد تک جہاں تک کہ موضوع کا تعلق ہے۔ نظیر کے یہاں موضوع کی مناسبت و اختلاف سے بزار اور بازار، دوانہ اور دیوانہ وغیرہ کا استعمال ہوا ہے۔

الحاصل نظیر "جو بولو وہ لکھو" کے اُصول پر عامل تھے۔ رسالۂ مخزن کی ترقی کے زمانہ میں یہ آواز کان میں پڑجاتی تھی۔ لیکن الہلال اور پھر نگار نے اس گفتگو کو سوال کی حد سے ہی باہر نکال دیا تھا۔ اس زمانہ میں آکر اجتماعیت اور اشترکیت کے خیالات نے پھر وہی آواز کانوں میں پہونچائی ہے، اور اُس سے زیادہ قوی استدلال کے ساتھ یعنی ادب کو قومی زندگی کا آئینہ ہونا چاہئے، اس لئے زبان کا معیار وہ ہو جسے زیادہ سے زیادہ باشندگان ملک سمجھ سکیں!

اِس اُصول و استدلال کے خلاف یہ کہا جائے گا کہ ادب عوام کے لئے نہیں ہوتا۔ ادب ثقافت (کلچر) کا نتیجہ ہے اور عوام میں ثقافت نہ ہونے ہی کے باعث وہ عوام کہلاتے ہیں۔ اس لئے ادب کو اگر عام فہم بنا دیا گیا تو وہ ادب نہیں رہے گا اور چاہے جو کچھ ہو جائے۔

لیکن اگر یہ صحیح ہے کہ ادب قومی عادات و خصایل کا آئینہ ہوتا ہے، تو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ خفیف اقلیت پر قوم کا اطلاق نہیں ہوسکتا اور جو ادب اکثریت کی زندگی کو منعکس نہ کرے وہ صحیح معنے میں ادب کہلانے کا مستحق

نہیں۔ کم از کم اُسے قومی ادب نہیں کہا جا سکتا۔ چنانچہ اگر یہ ثابت ہو جائے کہ ہمارے ادب میں قومی زندگی کا عکس نہیں ہے، تو یقیناً ہمیں چاہئے کہ اپنے ادب کی پیشانی سے یہ داغ دھونے کے لئے اُسے قومی زندگی سے قریب تر کر دیں اور اگر ایسا کرنے میں نفاست یا ادبیت کا کچھ نقصان ہو بھی تو اُس کا خیال نہ ہونا چاہئے۔ اسلئے کہ ثقافت اور ادب یعنی زبان، ذی حیات عضو کہے جاتے ہیں۔ زبان کا معیار بدل دینے کے بعد بھی اُس میں نفاست و ادبیت پھر آ سکتی ہے اور اس اضافے کے ساتھ کہ اس کے اندر قوم کی زندگی بڑی حد تک رونما ہو گی اور قوم کا بڑا حصہ اُس سے فیض یاب ہو سکے گا، یعنی ثقافت حاصل کر سکے گا۔

اس بحث کو ذرا پھیلا دینے سے میرا مقصود یہ بتانا تھا کہ آج سے تقریباً ڈیڑھ سو سال پہلے نظیر نے آگرہ میں بیٹھ کر ادب اور زبان کا بھی معیار قائم کیا تھا۔ درانحالیکہ حاتم کے وقت سے اُن الفاظ کو کاٹنے چھانٹنے کا عمل جاری تھا، جو عوام کی زبان پر چڑھ جاتے تھے۔ نظیر نے وہ زبان پھیلانا چاہی اور وہ ادب پیدا کیا جس کو ہماری اکثریت سمجھ سکتی اور جس میں ہماری اکثریت کی زندگی منعکس تھی۔ لہذا اس اعتبار سے کہ انھوں نے ایک قومی زبان اور قومی ادب پیدا کیا، ہمارے تمام شاعروں میں ایک نظیر ہی قومی شاعر کہلانے کے مستحق ہیں۔

جیسا میں نے ابھی عرض کیا، ہماری زبان میں ترک اور تراش کا عمل بہت جلد شروع ہو گیا تھا اور متقدمین کی اس تراش خراش کے عمل نے زبان کا دائرہ ہمیشہ تنگ رکھا اور بہت سے مفید و کار آمد الفاظ کو ساقط الاعتبار کر دیا۔۔۔ اس سے انکار نہیں ہو سکتا اس طرز عمل سے اُردو نے شستگی، نفاست اور قابلیتِ اظہار کا بلند مرتبہ بہت تھوڑی ہی مدت میں حاصل کر لیا، لیکن توسیع زبان کا مسئلہ اپنی جگہ اٹل رہا اور ہے۔ متروکات میں اکثر ایسے سبک الفاظ پائے جاتے ہیں جن کے معنے وسیع اور مفہوم نازک ہیں اور جن کی ہمیں آج ضرورت ہے مگر وہ سکے اب رائج نہیں۔ اس دور کے بعض شاعروں اور ادیبوں نے اس بات کا احساس کیا ہے کہ پرانے الفاظ زندہ اور نئے الفاظ اور اسلوب وضع کئے جائیں۔ وہ اس طرف بھی مائل ہیں کہ زبان و عروض کی نارو اگرفتیں کچھ ڈھیلی کر دی جائیں۔

نظیر نے اپنے زمانہ میں صرف کاٹ چھانٹ سے احتراض ہی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ وسیع پیمانے پر اختراع و تصرف پر بھی بڑی دلیری سے عامل رہے۔ اس پہلو سے دیکھا جائے تو نظیر کی خدمت زبان اندازے سے باہر نظر آتی ہے۔ نظیر کا ذخیرۂ الفاظ تمام اُردو اہل قلم سے زیادہ ہے اور میرا عقیدہ ہے کہ جب بھی ہم خلوص مقصد اور سنجیدگی مدعا سے توسیع زبان کے مسئلہ پر غور کرنے بیٹھے تو اسالیب و الفاظ کا بڑا ذخیرہ حاصل کرنے میں کلام نظیر سے ہم کو بہت زیادہ مدد ملے گی۔

اگر موجودہ معیار پر جانچا جائے تو نظیر کے یہاں زبان کی غلطیاں ہیں وہ فارسی اور ہندی کے الفاظ عطف و اضافت کے ساتھ استعمال کرتے ہیں جیسے "جوان و لڑکے" یا "گھنگرو تال" وغیرہ، اوپر کہا جا چکا ہے کہ وہ عام تلفظ کا اتباع کرتے ہیں جیسے عجوبہ یا سر آنا (بجائے سرہانا) یعنی حروف گرا دیتے ہیں۔ وہ ضرورت پر جمع الجمع بھی بنا لیتے ہیں جیسے "عنایاتیں"

وہ قدیم الفاظ بھی استعمال کر لیتے ہیں جیسے ستی بمعنی سے، "سوتیاں" بمعنی سوتی ہیں، اور "ملونا" بمعنی ملانا۔

لیکن فارسی ہندی الفاظ کی ترکیب اُس وقت کے بعد تک کے شعراء کے یہاں پائی جاتی ہے اور پُرانے الفاظ کا استعمال بھی بالکل متروک نہ ہوا تھا۔ حروف گرا دینے کے باب میں میری اوپر کی توجیہ شاید زبردستی کی تاویل نہ سمجھی جائے گی۔ یعنی نظیر کے اُس کلام میں جو فرمائشی اور فی البدیہ ہے اور جو محض تفریح و تفنن طبع کے طور پر وجود میں آیا ہو یقیناً عروض کی پروا نہیں کی گئی ہے اور نہ صحت لفظی کا خیال رکھا گیا ہے۔ یہ فرو گزاشت اور ناہمواری اسی قسم کے کلام میں زیادہ نظر آتی ہے۔ دوسرے یہ کہ یہ چند مثالیں جو پیش کی گئی ہیں میرے نسخے میں اسی قدر مل سکیں اور اس لئے وہ قابل لحاظ بھی نہیں ہو سکتیں۔ با ایں ہمہ، اعجوبہ سے الف گرا کر عجوبہ لکھنا میرے خیال میں اچھی جدت ہے اور اگر غور و فکر کے ساتھ ایسی کار آمد اور مناسب بدعتوں کو روا رکھا جائے تو شاید زبان کی وسعت و اصلاح کے لحاظ سے بھی مفید ہو۔

اس بحث میں اختراع و اشتقاق نظیر کی سب سے زیادہ نمایاں خصوصیت ہے۔ میاں نظیر لفظ گھڑنے میں کسی وقت تامل نہیں کرتے۔ خاص کر قافیے کے باب میں اُن کو مطلق پروا نہیں ہوتی کہ اُن کا سکّہ ٹکسال باہر سمجھا جائے گا یا نہیں۔ بلکہ اُن کے تیور سے یہ پتہ چلتا ہے کہ یا تو وہ کسی احتساب کا وجود ہی تسلیم نہیں کرتے یا اپنے تئیں اُس سے بالا، یا اپنے آپ کو ہر اجتہاد کا مجاز سمجھتے ہیں۔ تھوڑی دیر کے لئے زبان کو وسیع کرنے کا خیال پس پشت بھی ڈال دیا جائے تب بھی شاید اس سے انکار نہ کیا جا سکے کہ اُس طرز عمل کا یہ فایدہ (سہولت) کیا کم ہے کہ شاعر کو خیال کا خون نہیں کرنا پڑتا چنانچہ اس پہلو سے نظیر قافیہ کے بادشاہ ہیں۔ اُن کے بعد یہ مرتبہ انشاء کو حاصل تھا، یا پھر اس عہد میں اکبر الہ آبادی نے یہ خصوصیت پیدا کی تھی۔

زبان کو احساس یا خیال کے اظہار کا واسطہ ہونے کی حیثیت حاصل ہے اور زبان کا ایسا صحیح استعمال جو اظہار خیال بخوبی کر سکے اپنی جگہ خود ایک صناعت ہے اور ایک مخصوص نوعیت کی صناعت۔ ہر فن و صناعت کے کچھ ضابطے اور قاعدے ہوتے ہیں اور اگر اُن کی پیروی کامل طور سے کر لی جائے تو نتیجۂ مطلوب مکمل ہوتا ہے۔ لیکن زبان کے استعمال کا ایسا کوئی ضابطہ و نظام نہیں۔ استعمال الفاظ کا فن دیگر فنون کی طرح اکتسابی نہیں اور استعمال الفاظ کی یہی خصوصیت ہے جس نے "اہل زبان" اور "زباندان" کی اصطلاحیں وضع کرا دیں۔ زبان کا صحیح استعمال مطالعہ، غور، اور مشق و مزاولت پر منحصر ہے۔ لیکن اس کے باوجود یہ ایک فطری ملکہ ہے۔ اظہار کی سلاست بعض کو بعض کے مقابلہ میں زیادہ حاصل ہوتی ہے اور خوش بیانی و خوش کلامی ایک خداداد بات ہے۔ پھر یہ کہ زباندان ہو یا اہل زبان اور مطالعہ، غور اور مشق کتنی بھی بڑھی ہوئی کیوں نہ ہو، یہ حد درجہ مشکل بات ہے کہ کوئی شخص ہمیشہ اور ہر وقت تمام سلسلۂ خیالات کو صحیح اور قطعی الفاظ میں ادا کر سکے، یا مختلف اور نازک احساس کو اُسی رنگ میں اور اُسی نزاکت کے ساتھ ہمیشہ بیان کر سکے۔

دوسرے یہ کہ زبان کا استعمال صناعت کا درجہ حاصل کرلینے کے بعد، زبان اظہارِ خیال کا واسطہ ہی نہیں ہوتی، بلکہ وہ پرِ پرواز بن جاتی ہے جس سے وہ خیال اڑنے لگتا ہے۔ نفسیات کے ماہر ہی بتا سکتے ہیں کہ انسانی فکر و خیال کے ارتقا و ظہور میں، اُن کو ذہنوں کے اندر مرتسم کردینے میں اور اُن کو زمانۂ مستقبل کے مطالعہ و غور کے لئے محفوظ کردینے میں، زبان کو کتنا زبردست دخل ہے۔ صحیح و درست الفاظ کا استعمال سامع یا مخاطب کی قوت مدرکہ کو کس طرح بیدار، اُس کے ذہن و فہم کو کتنا طیار، اور اُس کے قلب کو کس درجہ آمادہ کردیتا ہے!

زبان پر عبور رکھنے اور الفاظ کا صحیح استعمال کرنے کے پہلو سے دیکھا جائے تو نظیر ادبائے اُردو کی صف میں بہت آگے نظر آتے ہیں۔ نواب جعفر علی خاں صاحب اثر لکھنوی نے ڈانٹے اور نظیر کے ایک ہی نوع کے خیال کا مقابلہ کرکے بتایا ہے کہ محض استعمالِ الفاظ پر قدرت کی وجہ سے نظیر، ڈانٹے کے مقابلہ میں کیونکر سبقت لے گئے اور اُنکی تخئیل کس درجہ مکمل ہوکر سامنے آئی ہے۔

اسی بحث میں، میں ایک خاص مسئلے کی طرف بھی توجہ دلادینا چاہتا ہوں۔ لکھنؤ کی زبان کا اتباع کرنے والے یوں تو ہندوستان کے ہر حصہ میں ملیں گے، لیکن بعض الفاظ و محاورات ایسے ہیں جو لکھنؤ سے باہر مشکل سے سُنے جائیں گے۔ اس سے غالباً انکار نہ کیا جائے گا کہ "فسانۂ عجائب" کی تصنیف سے قبل لکھنوی زبان ایک معیار کی حیثیت نہیں رکھتی تھی، یا کم از کم ایسی کوئی معیاری کتاب موجود نہ تھی۔ یہ بھی ایک واقعہ ہے کہ سرور اکبرآباد کے رہنے والے تھے اور چالیس سال کی عمر میں وطن چھوڑا تھا۔ چنانچہ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ زبان آگرے سے لکھنؤ پہونچی۔ میاں نظیر کے یہاں وہ مخصوص الفاظ ملتے ہیں جو سرور کے یہاں ہیں اور آج بھی لکھنوی زبان کی خصوصیت بنے ہوئے ہیں۔ یہ چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں، تلاش سے زیادہ مل سکیں گی:۔

لفظ "اُپی" کا استعمال "دیا سرمہ آنکھ میں وہ بلا، جیسے اُپی تیغ پہ باڑھ دھری"۔ یا اہلے گہلے کا استعمال "طرق جیسے ہے عشرت کے اہلے گہلوں کا"۔ یا زری کا استعمال:۔ "ہاتھ بڑھا کر جو لی میں نے زری پنکھیا"۔ یا شور بور کا استعمال:۔ "شور بور سارا، کپڑے تھے لال میرے"۔ یا نہانا جیسے:۔ "مجھ زلف کے مارے کو نہ زنجیر پنہاؤ"۔ یا پہ بمعنی پر کا استعمال جو پہلے مصرع میں بھی موجود ہے وغیرہ۔

نظیر کی لسانی و ادبی خصوصیات کے ذیل میں جو مثالیں پیش کی جائیں گی، وہ ہر چند کہ خاص عنوانات کے تحت ہوں گی لیکن اُن کی وجہ سے دیگر خصوصیاتِ شعری اور محاسن ادبی بھی سامنے آجائیں گے جن پر علحدہ توجہ دلانا غیر ضروری معلوم ہوتا ہے۔

نظیر کی اختراعی مثالوں سے اُن کا کلام بھرا پڑا ہے، لیکن اُن کا وہ خمسہ جس کا عنوان "پری کا سراپا" ہے خاص چیز ہے۔ اُس کی چند ٹیپیں پیش ہیں، اسمار کی صفتیں کس قدر صحیح، مناسب و مخصوص اور کتنی شاعرانہ ہیں،

بیان و زبان کی نزاکتوں کو سمجھنے والے لطف اندوز ہوں گے :-

چتون کی دغا، نظروں کی کپٹ، سینوں کی لڑاوٹ ویسی ہے
گالوں کی دمک، خوبی کی جھمک، رنگوں کی کھلاوٹ ویسی ہے
بندوں کی ہلت جھمکوں کی جھکت، بالی کی ہلاوٹ ویسی ہے
کفشوں کی کھٹک، دامن کی جھٹک، ٹھوکر کی لگاوٹ ویسی ہے
ٹھٹوں کی اڑاوٹ اور غضب، قہ قہ کی ہنساوٹ ویسی ہے

غزل کے دو شعر اسی رنگ کے ملاحظہ ہوں :-

کدھر ہے آج الٰہی وہ شوخ چلبلیا — کہ جس کے غم سے مرا دل ہوا ہے بے کلیا
سو یار آپ نہ آیا رقیب کو بھیجا — ہزار حیف ہم اپنے نصیب سے کے بابیا

ظاہر ہے کہ نظیر نے ہندی الفاظ جو اُس وقت تک زبان میں کثرت سے شامل تھے۔ بلا تکلف استعمال کئے ہیں جیسے جنوں بمعنی افراد۔ ہندی تصریف سے بہت کام لیا ہے جیسے راجہ سے رجیرا وغیرہ اور ہندی ڈھنگ پر مرکب لفظ بنائے ہیں جیسے مہ رتن وغیرہ۔

نظیر نے الفاظ اور محاورات کے نادر و نفیس محلِ استعمال پیش کئے ہیں، اور اُن کو اپنی خصوصیت و غایت کے سانچے میں ڈھال کر مرضی کے مطابق کام لیا ہے :-

شرارت، شوخی، عیاری، طرح، پھرتی، دغا، چھلبل (اس مصرع میں طرح کا استعمال نادر ہے۔)
دل عبرتوں سے چھا گیا، خاطر ہوئی بس سہمگیں — بولی نظیر عبرت سے رہ، کیا پوچھنے کی ہے جگہ
(ان مصرعوں میں عبرت چھانا اور عبرت سے رہنا مخصوص استعمال ہے)
کرتا ہے گلبازی کی یاں ایکدم میں گردوں گل جھڑی (گل جھڑی بمعنی خزاں یا نامساعدت اچھوتا بیان اور مخصوص ترکیب ہے)

جلی جہاں میں کسی کی نہ زیر بریانی (زیر بریانی بمعنی تہ دیگ نظیر کی ایجاد ہے)
کہ جس سبب سے تو پھرتا ہے اس قدر شیدا (شیدا پھرنا اچھوتا محاورہ ہے)
اُس حسن کا پڑا ہے کانوں میں جب سے جھنکا (حسن کا جھنکا یعنی شہرہ یا چرچا)
ہم سمجھ جاتے ہیں پیار سے تری خاطر کی مڑوڑ (خاطر کی مڑوڑ عمدہ محاورہ ہے)
پہن کے ریجھنی پوشاک جھب دکھاتی ہے (”ریجھنی“ پوشاک کی ایک نادر صفت ہے)
نیند اُچٹ گئی، کروٹ جل گئی، کاٹے نہیں کٹتی ہے رات (کروٹ جلنا کتنا پیارا محاورہ ہے)

کاجل ڈھلکا، سرمہ بگڑا، منھ میں پان ہوا پھیکا (تینوں محاورے نہایت پاکیزہ ہیں)
اُس کا نخرا یہ غضب دل کے تئیں چھل گیا (پیرایۂ بیان اور محاورہ خاص چیز ہے)
کیا تجھ سے نظیر اب میں جوانی کی کہوں بات اس پن میں گزرتی ہے عجب عیش سے اوقات
(پن کا یہ استعمال بالکل نیا ہے)
تو نے چھوئی کیوں مری زیب بھری پنکھیا (زیب بھری خاص ترکیب ہے)
یا - پوتڑوں میں لئے سو سو مزے بلسنا (بلسنا To enjoy کے لئے ہمارے یہاں کوئی مفرد مترادف موجود نہیں ہے)
جو مجھ پہ آن پڑا دن سیاہ مت پوچھو (دن سیاہ کی ترکیب ندرت لئے ہے)
فارسی ترکیبوں کے استعمال میں بھی نظیر نے جدتوں سے کام لیا ہے :-
سہی قامت، پری پیکر، مقطع وضع، خوش منظر (مقطع وضع، کم از کم آج نیا معلوم ہوتا ہے)
کل جو گزرے تھے ہم کہنہ مزار استان میں ("استان" کا استعمال آجکل کچھ نیا سمجھا جا رہا ہے)

پھر ان میں زیب فزا کہکشاں نگاری کی
وہ تو وہ پر اس کجی ذاتی کو دیکھا چاہئے
کیا پُردلی ہے اِس دلِ خانہ خراب میں
چوم لوں میں ابھی اُس شوخ پری وا کے لب
اُس رشک گلستاں کی ایک زیب شعاری نے

فارسی ترکیبیں نظیر کم استعمال کرتے ہیں، لیکن جہاں ہیں نہایت سبک و دل نشیں ہیں :-

ہو نمایاں جس طرح ابر تنک میں آفتاب
یارِ مہ چہرہ اور شبِ مہتاب
شمیم زلف مشک افشاں، تغافل سو ستم ساماں
غرور اور ناز بے پایاں، مزاج اور طبع نازک تر
ادائیں سب فسوں آئیں، نہ چھوڑیں دل نہ چھوڑیں دیں
فریب و عشوہ صلح آگیں، عتاب و غمزہ جنگ آور
ناز و ادا کی گرمیاں، غارت گر صبر و تواں
طورِ تکلم دُرفشاں، طرزِ تبسم شکریں

گوش گفتار طلب، دیدۂ دیدار طلب
زلفیں الم شام تھیں، رخ رشک سحر تھے

محاکات شعری کی چند نازک مثالیں:-

ساقی نے سب کو جام دئے بھر کے بزم میں ساغر جو ہم نے مانگا تو شیشہ ہلا دیا
کیا غضب تھی وہ ادا، آہ کہ چنچل نے شتاب گونج کھلتے ہی جھجک کے جو سنبھالا بالا
جب ہلاتی ہے صراحی سی وہ گردن اپنی نشۂ حسن کو کرتا ہے دو بالا بالا،
غرفے سے ہاتھ کھول کے اُس نے جو لیا کھینچ بجلی سی کچھ چمک گئی، کافر ہلا حنا
یہ برق ابر میں دیکھے سے یاد آتی ہے جھلک کسی کے دوپٹے میں نورتن کی سی

اس نقاشی میں نظیر نے ایک ایک لفظ سے تصویر بنائی ہے۔ انکار میں خالی شیشہ ہلا دینا ایک پورا مرقع سامنے پیش کر دیتا ہے۔ گونج کے کھل جانے سے جھجکنا عجیب منظر دکھا دیتا ہے۔ بالے کا ہلنا ایک تصویر بنا دیتا ہے حنائی ہاتھ کا دریچے کے اندر کھنچ جانا ایک نقش کھینچ دیتا ہے۔ ابر میں بجلی کی چمک کو دوپٹے کے نورتن سے تشبیہ دینا ایک نظارہ پیش کر دیتا ہے۔

اسم صفت وغیرہ کا نادر اور درست استعمال نظیر کی خصوصیت ہے، اور ہر چیز کے لئے اُن کے یہاں نام بھی الگ ملتا ہے۔

۱۔ ساق بلور، گلاوٹ میں ہر ایک ران پری
۲۔ یہ گلبدن، یہ شوخ، رنگیلی، ہری بھری
۳۔ کیا پوچھے ہے لے رنگ بھری ہے مست مہینہ پھاگن کا
۴۔ قمری کی سن نفیر، نہ بلبل کی سن صفیر،
۵۔ مور کا شور، فغاں غوک کی، جھینگر کی جھنکار

جیسا کہ میں بتا چکا ہوں، نظیر پر اعتراض وارد کرنے میں بڑی سہولت اس سے ہو گئی کہ اُن کا غزلیہ کلام لوگوں کے سامنے نہ تھا۔ نظیر کی متانت کلام، علوئے بیان، اور ہمواری زبان کی مثال پیش کرنے کے لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ چند پوری پوری غزلیں نقل کر دی جائیں، تاکہ کلام کے دوسرے پہلوؤں کا بھی بخوبی اندازہ ہو سکے:-

اُس کے شرار حسن نے شعلہ جو اک دکھا دیا طور کو سر سے پاؤں تک پھونک دیا، جلا دیا
پھر کے نگاہ چار سو ٹھیری اُسی کے روبرو اُس نے تو میری چشم کو قبلہ نما بنا دیا
میں ہوں پتنگ کاغذی، ڈور ہے اُسکے ہاتھ میں چاہا ادھر گھٹا لیا، چاہا اُدھر بڑھا دیا
میرا اور اُس کا اختلاط، کیا ہو، مثال ابر و برق اُس نے مجھے رُلا دیا، میں نے اُسے ہنسا دیا

دل کشائی، بادہ نوشی، ذوق مستی، بے خودی

اس طرح کی عشرتوں میں اب تو بیٹھا ہے نظیر — پر خدا جانے یہ بیداری ہے اے دل یا کہ خواب

نہ دن کو چین ہے نہ راتوں کو خواب آنکھوں میں — بھرا رہے ہے ترے غم سے آب آنکھوں میں

جدھر وہ دیکھے ادھر صف کی صف الٹ دے ہے — بھری ہے شوخ کے ایسی شراب آنکھوں میں

تمہارے ہم تو قدیمی غلام بندے ہیں — تمھیں نہ چاہئے ہم سے حجاب آنکھوں میں

تمام شب نہ نیند آئی نہ پلک جھپکی — بسا ہے جب سے وہ خانہ خراب آنکھوں میں

خدا کی بات، جنھیں بات بھی نہ آتی تھی — وہ اب کریں ہیں سوال و جواب آنکھوں میں

قسم ہے چشم گلابی کی تیری اے گل رو — کہ یاں کھنچے ہے پڑا نت گلاب آنکھوں میں

شتابی آن کے محبوبو پگڑیاں رنگ لو — نظیر لایا ہے بھر کر شہاب آنکھوں میں

آنکھوں میں شہاب بھر کر لانے اور دنیا کے حسینوں کو صلائے عام دینے کی کیفیت کا بیان تقاضائے ذوق کرتا ہے

جس وقت خواب ناز سے وہ چشم وا ہوئی — صد خستۂ شگفتہ کی حاجت روا ہوئی

لا بوئے گل نہ کلبۂ احزاں میں اے نسیم — یہ کب ہماری روح کی راحت فزا ہوئی

یوں کارواں شباب کا گزرا کہ گوش زد — آواز پا ہوئی نہ صدائے درا ہوئی

پوچھی نظیر ایک نے کل شکل وصل یار — ق — ہم نے کہا یہ اس سے کہ کیا کہئے کیا ہوئی

جو شکل دور باش تھی روز نخست کی — اب بھی جو ہم سنئے تو وہی برملا ہوئی

آخری شعر جس پائے کا ہے اہل ذوق سے مخفی نہیں، لیکن میرا تاثر ہے کہ صرف ایک یہی شعر نظیر کو بے نظیر شاعر کہلوانے کے لئے کافی تھا۔

جوانی کا ماتم کس شاعر نے نہیں کیا، اور کون متنفس اس کا احساس نہیں کرتا، لیکن اس قطعہ میں نظیر نے جس دلگداز مگر فلسفیانہ رنگ کا نوحہ کہا ہے اپنی جگہ بے نظیر ہے۔

اک دن دل اپنا عیش گذشتہ کو یاد کر — رہ رہ کے ہم سے مانگتا اس کا [illegible]

یعنی وہ کیا زمانۂ عشرت تھا اے نظیر — جس میں ہزار عیش سے ہم کامیاب تھے

اب زار و ناتوان و ضعیف و نحیف ہوں — نقش طلسم تھا وہ کہ [illegible] بر آب تھا

اک جنبش مژہ میں وہ برہم ہوا طلسم — کیا کہئے اس کو اور مگر یہ کہ خواب تھا

جب ہم نے دل سے بھر کے دم سرد یوں کہا — جس میں مئے طرب سے تو مست و [illegible]

ہیہات کیا بتائیں ہم اس عصر خوش کا نام — اے غفلت انتہا وہی عہد شباب تھا

تھی باغ زندگی کی اُسی سے ہی آب و رنگ دیوان عمر کا بھی وہی انتخاب تھا
اپنی تو فہم میں وہی ہنگام دل فروز مجموعۂ حیات کا لب لباب تھا

ترتیب الفاظ کی موسیقی نظیر کا سارا کلام الفاظ کی موافقت و مناسبت یعنی خوش صوتی و ترنم سے مالامال ہے۔ وہ بالعموم بجتی ہوئی بحریں اختیار کرتے اور الفاظ کو اس ڈھنگ سے ترتیب دیتے ہیں کہ جلترنگ کا نقشہ کھنچ کر رہ جاتا ہے۔ الفاظ کو موضوع سے کچھ ایسی ہم آہنگی ہوتی ہے کہ مضمون کانوں سے نظر آنے لگتا ہے۔ صرف ایک غزل ہولی کے بیان میں پیش کی جاتی ہے، ورنہ نظیر کی یہ خصوصیت عام ہے:-

ہولی کی رنگ فشانی سے ہے رنگ یہ کچھ پیراہن کا جوں رنگ رنگ بہار میں ہو حال چمن اور گلشن کا
جس خوبی اور رنگینی سے گلزار کھلے ہیں عالم میں ہر آن چھڑکواں جوڑ دل سے حسن کچھ ایسا ہی تن کا
لے جام لبالب بھر دینا، ہے ساقی کو کچھ دھیان نہیں یہ ماغ پہونچے دوست تلک، یہ ہاتھ لپک لے دشمن کا
ہر محفل میں رقاصوں کا کیا عشرت لوا پر کرتا ہے وہ حسن جتانا گانے کا اور جوش دکھانا جوبن کا
اس گلرو نے یوں ہم سے کہا کیا مستی و مدہوشی ہے اب دھیان تمہیں کچھ چولی کا نا ہوش تمہیں کچھ دامن کا
جب ہم نے نظیر اس گلرو سے یہ بات کہی ہنس کر اس دم کیا پوچھے ہے اے رنگ بھری ہے مہینہ پھاگن کا

ان اشعار کی وجدانی کیفیت اپنی جگہ لیکن تیسرے کا معنوی لذت اور واقعیت حیات کا اشارہ وجد آفریں ہے۔

نظیر کا معشوق اردو فارسی کی شاعری کی روایات قدیمہ کے خلاف نظیر نے اپنا محبوب عورت کو بنایا، اور بے تکلف تانیث کی ضمیر استعمال کی ہے بیر ... خاص نظر سے اُن کی دو سو غزلیں پڑھیں تو مشکل سے تین چار شعر ایسے ملیں گے جن کا مخاطب امرد ہو سکتا ہے۔ مجھے حیرت ہے کہ اس سبب کی جو نظیر کے یہاں خصوصیت سے مفقود ہے، جناب مخمور کو شاعر انہ تاویل و اعتذار کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اُن کی نظموں میں دو ایک جگہ اگر اس نوع کا بیان پایا جاتا ہے تو وہ حیات نگاری اور زندگی کی نقاشی کے ذیل میں ہے۔ ایسے بیانات کو نظیر کی ذات خاص سے متعلق کر دینا نقد و درایت صحیح کے منافی ہوگا۔ ہم ایک شاعر کے کلام سے اُس کی پسند و ناپسند رغبت و نفرت کا اندازہ تو کر سکتے ہیں، مگر اُس کے ہر اظہار خیال کو اُس کا اصل کردار قرار نہیں دے سکتے۔ شاعر تو دوسروں کے تجربات و افتاد احساس و جذبات کو بھی احساس کے ذریعہ سے اپنا بنا لیتا ہے۔ اس ذکر میں شاید یہ بتانا نتیجہ خیز ہو کہ نظیر کے یہاں ساقی کی شخصیت محبوب سے الگ بھی ہے، ہر چند کہ اُن کا معشوق بھی یہ رسم ادا کرتا ہے:-

ساقی کو جام دینے میں اُس خوش نگہ کی، آہ ہر دم اشارتیں ہیں کہ "اس کے تئیں نہیں"

نظیر کا مطمح محبت فلسفۂ قدیم میں ایک یہ نظریہ بھی ملتا ہے کہ انسان اپنی روح کو ملوث کئے بغیر بھی جسم سے گناہ کر سکتا ہے۔ یعنی اگر جسم گناہ کرے تو لازمی نہیں کہ روح بھی ملوث ہو۔ نظیر کا غزلیہ کلام دیکھنے

سے خیال ہوتا ہے کہ غالباً وہ اسی مسلک کے آدمی تھے۔ نظیر نے اپنی کامرانیوں کو "فطرتیت" کے پیرائے میں بیان کیا ہے اور ذوقِ حصول و جرأتِ رندانہ کے مشرب کو سراہا ہے۔ لیکن جہاں کہیں محبت کے مسئلہ پر اپنے تاثرات و حسیات بیان کئے ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ ان کی محبت سطحی اور مثالی تھی۔ یا پھر میاں نظیر کے سامنے روح و جسم کے جداگانہ متاثر ہونے کا نظریہ ہوگا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ میاں نظیر کی "لذتیت" اور ان کی سطحی محبت دونوں اپنی اپنی جگہ ٹھیک ہوں اور ایک درجہ طے کر لینے کے بعد دوسرے تک پہونچے ہوں۔ یہی زیادہ قرین قیاس ہے کہ ترقی عمر کے ساتھ نظریۂ محبت میں تغیر ہوا ہو۔ افسوس کہ کلام کی تاریخی ترتیب نہ ہونے کی وجہ سے ہم اس بات کو مدلل نہیں کر سکتے۔ الغرض انکی محبت کا مقصود "ملک دیکھ لیا، دل شاد کیا، خوش وقت ہوئے اور چل نکلے" ہے۔ انھوں نے اپنے اس نظریئے کو مختلف پیرایوں میں ادا کیا ہے اور اسی کی تفسیر و تشریح کی ہے:-

آ گئے تھے سیر کرتے، تم کو دیکھا، خوش ہوئے　　　بس خدا حافظ ہے ہم اے یار رخصت ہو چلے

ایک جگہ اس حقیقت کو بیان کیا ہے کہ اصل عشق، عشق ذات ہے، عاشق صفات کو نہیں دیکھتا:-

فقط جو ذات سے کہیں دل سے چاہنے والے　　　انھیں کرشمہ و ناز و ادا سے کیا مطلب

محبت اگر حقیقی ہو تو عاشق کا دل بس جذبۂ پرستش اور احترام سے لبریز ہوتا ہے۔ ایک شعر میں نظیر نے اپنے جذبے کی پاکیزگی اور اپنے محبوب کی نزہت ہی کے مانند ایک پاکیزہ تخیل پیدا کیا ہے۔ وہ نسیم کو مخاطب کر کے اپنی محبت کو اس کی محبت سے زیادہ مقدس ثابت کرتے اور کنایتاً اس کی پیہم بوسہ بازی پر ایک طنز کر جاتے ہیں:-

اس کی جبین پاک پہ اس دم تک اے نسیم　　　کافر ہوں، گر پڑی ہو نگاہ بے وضو مری

محبت میں دل کی جراحتیں مسلم ہیں اور منہ سے ایک آہ نکل جانا بھی بالکل فطری۔ نظیر خود کو دائرۂ بشریت سے باہر ثابت نہیں کرتے۔ لیکن عشق کی وفا پیشگی کو بہر حال مقدم رکھتے ہیں:-

اظہار ہم بھی کرتے احوالِ دل فگاری　　　شرم و وفا کراکدم دیتی زباں کو یاری

محبت میں مدارج ہیں، نظیر کو بھی عشق کے تجربات ہوتے ہیں اور وہ اپنے لئے ایک محفوظ نتیجہ نکال لیتے ہیں:-

دل جس کو چاہتا ہے اسے بھی خبر نہ ہو　　　اپنی تو فہم میں ہے یہی راہ سب سے خوب

نظیر فلسفۂ زندگی کے ماہر ہیں، وہ زندگی کے مختلف مظاہر کو سمجھتے ہیں، اس لئے عشق کا حاصل بھی جانتے ہیں کہ اس کی انتہا بس ایک آہ دلگداز ہے۔ لیکن وہ اسے بھی پست سمجھتے ہیں اور مطمئن نہیں، کیونکہ ان کی نظر میں یہ کمال عشق نہیں یعنی ایک آہ بھی طالب اثر ہے اور طلب اثر سے جو ایک تمنا ہے، عشق کو بلند ہونا چاہئے:-

کمال عشق بھی خالی نہیں تمنا سے　　　ہے ایک آہ تو اس کو بھی ہے اثر کی طلب

محبت کی لذت کو نظیر اپنے ہی لئے رکھنا چاہتے ہیں، اور کسی کو اس کی خبر دینا انھیں گوارا نہیں ہے:-

لطف جو چاہت سے ہیں سو وہ جتانے نہیں
چاہ چھپی کیجئے تا کوئی جانے نہیں،

محبت کرنا اور یہ آرزو نہ کرنا کہ محبوب کبھی نہیں چاہے، بڑا درجہ ہے۔ لیکن محبوب کو یاد کرنا اور یہ چاہنا کہ وہ ہمیں یاد نہ کرے۔ انتہا ہے نظیر اس آرزو میں کامیاب ہو کر اس خوش قسمتی کا اعلان کرتے اور خوش ہوتے ہیں:۔

خوش نصیبی مری اُلفت کی تو دیکھو یارو
یاد کرتا ہوں جسے میں، وہ بھلاتا ہے مجھے!

اس شعر میں نظیر نے خیال کو اس بلندی پر پہونچا دیا جہاں پہونچنا دینا خیال میں آسکتا تھا۔

علم و حکمت غزل کے شعر میں خصوصاً علمی مسائل کا بیان غیر موزوں سی بات ہے۔ لیکن شاعر اگر عالم بھی ہے تو ناممکن ہے کہ اس کے شعر ایسے مسائل سے پاک رہیں۔ اردو شاعری میں فلسفہ کا بیان غالب کی خصوصیت ہے۔ مومن کے یہاں بھی مسائل حکمیہ کی کمی نہیں۔ میرا مقصود تو ہرگز نہیں کہ نظیر کو بھی عالم یا سائنس داں کہہ کر پیش کیا جائے، کیونکہ اگر وہ ایسے ہوتے بھی تو شاعری کے لئے یہ چیز کوئی وجہ تفاخر نہیں ہوسکتی تھی۔ لیکن یہ دکھلانے کے لئے کہ ایک شاعر میں جو بصیرت ہونا چاہئے وہ نظیر کو بخوبی حاصل تھی اور وہ ان حقیقتوں تک پہونچ جاتے تھے، چند شعر نقل کئے جاتے ہیں۔ نظیر اپنی اس حیثیت سے خود بھی باخبر ہیں۔ کہتے ہیں:۔

حکمت کا اُلٹ پھیر نہیں جن کی نظر میں
وہ کہتے ہیں غافل "یہ بقا ہے یہ فنا ہے"

آغاز حیات پانی سے ہے، نظیر اس نکتہ سے مسلم نہ تھے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ شاعر کا پانی "آب رخ" ہے:۔

آب رخ کیا، کہ اسی سے ہے حیات ہر شے
شاہد اس بات کی ہے جی من الما کی صدا

سورج کی کرنیں زمین پر بسنے والی مخلوق کے ساتھ کیا کیا شعبدہ بازیاں اور کیسی کیسی سحرکاریاں کرتی ہیں؟ زندگی ارض کا مدار آفتاب کی شعاعوں پر کہاں تک ہے؟ یہ سب سائنس کے مسلمات ہیں یہ راز نظیر پر غیر منکشف نہ تھا

خورشید جس سے لعل کی ہوتی ہے تربیت
وہ اُن لبوں کے پان کا ادنیٰ اُگال ہے

خواہش میں اُلوہیت ہے، یعنی طلب اگر صادق ہے تو آرزو کا بر آنا یقینی ہے۔ لیکن ہر آرزو آرزو نہیں ہوسکتی اور اس کے لئے کوئی پیمانہ و اندازہ ضروری تھا۔ نظیر نے یہ پیمانہ ایک شرط لگا کر پیش کیا ہے۔ شرط بھی کتنی جامع و مانع! اور ساتھ ہی ایک درس حیات بھی دیدیا ہے:۔

آرزو خوب ہے، موقعے سے اگر ہو، ورنہ
اپنے مقصود کو کم پہونچے ہیں بسیار طلب

انگریزی زبان میں ایک جملہ ضرب المثل کے طور پر اکثر بولا جاتا ہے جسکا مفہوم ہے کہ ساغر کے لبوں تک پہو۔ نچنے میں چھلک جانیکے بہت سے امکان ہیں نظیر انگریزی تو یقیناً نہیں جانتے تھے، مگر انکی بصیرت اتنی تھی کہ یہ عقدہ اُن کے خیال کی رسائی سے بچ نہ سکا:۔

کیا کا سہ سے سیجئے اس بزم میں اے ہمنشیں
دورِ فلک سے کیا خبر پہونچے گا لب تک یا نہیں

زندگی کی واقعیتیں

زندگی اگر عالمِ رؤیا کی زندگی ہوتی تو نہایت خوب چیز تھی۔ مگر زندگی نام ہے بیدار لمحوں کا اور بیداری میں زیست کی تلخیاں اٹل اور سخت ہیں۔ ان تلخیوں کے گوارا ہو جانے کا صرف ایک ہی نسخہ ہے اور وہ حکیمانہ نقطۂ نگاہ ہے۔ نظیر نے ان تلخ حقیقتوں کے راز اکثر کھولے ہیں۔ اگرچہ اس قسم کے خیالات کے اظہار کا ذریعہ نظم کو بنایا ہے، مگر غزل کے اشعار میں بھی ایسے خیالات بیان کر جاتے ہیں:-

ہو کس طرح نہ ہم کو ہر دم ہوائے مطلب　　　دیکھا جو خوب ہم نے، دنیا ہے جائے مطلب
وہ آبرو کہ جس پر کرتے ہیں جاں تصدق　　　اُس کو بھی دے چکے ہیں، اکثر برائے مطلب
ملنا بھی غرض کا ہے لڑائی بھی غرض کی　　　نہیں اور کسی سے کوئی روٹھا نہ منا ہے
ہم کیوں نہ اپنے آپ کو رو لیویں جیتے جی　　　اے دوست کون پھر کرے ماتم فقیر کا
سچ ہے بقول حضرت سید نظیر، آہ　　　بن آتی ہے تو ہوتی ہیں سب باتیں ٹھیک ٹھیک

خوشی کے فلسفہ کی یہ تعریف شاید ملٹن نے کی ہے کہ انسانی مسرت کا ماحصل سب کے لئے یکساں ہے میاں نظیر اس حقیقت سے بھی آگاہ تھے:-

اگرچہ اہلِ نوا خوش ہیں ہر طرح، لیکن　　　زیادہ اُن سے ہے ہر بے نوا کو عیش و طرب
کمالِ قدرتِ حق ہے نظیر کیا کہئے　　　جو شاہ کو ہے، وہی ہے گدا کو عیش و طرب

نظیر کا فلسفۂ زندگی

زندگی کے مختلف پہلوؤں کی تفسیر و تشریح اگرچہ نظیر کے کلام میں ملتی ہے، لیکن مجموعی طور سے اُنھوں نے بھی اُسے "نکشودہ معما" ہی مانا ہے۔ وہ ہر شے اور ہر حالت کو بڑی شدت سے گزشتنی مانتے ہیں۔ اسی لئے ہر حال میں خوش ہیں۔

ہستئ انسان کی حقیقت یا خودی کا احساس نظیر کو کس طرح ہوتا ہے؟ کہتے ہیں:-

سب غلط ہے یہ جو کہتے ہیں کہ ہم میں کچھ نہیں　　　کچھ نہیں ہم میں، تو ہستی و عدم میں کچھ نہیں

ہستئ انسان کی غایت اور مقصود کا اعتراف تو نظیر کرتے ہیں، لیکن انسان کس خاص کام کے لئے پیدا ہوا ہے، کو ناگفتہ ہی چھوڑ دیتے ہیں:-

جس کام کو جہان میں آیا تھا تو نظیر　　　خانہ خراب! تجھ سے وہی کام رہ گیا

ہستئ انسان اور زندگی کی کشمکش اور غفلتوں کو نظیر جس طرح سمجھے ہیں، وہ ذیل کی غزل میں ایک جگہ نظر آجاتا ہے۔ اس غزل میں نظیر کا مصلحانہ رنگ بھی ہے جسے میں نے الگ نہیں دکھایا ہے:-

جو تو کہتا ہے اے غافل "یہ میرا ہے یہ تیرا ہے"　　　یہ جس کا ہے اُسی کا ہے، نہ تیرا ہے نہ میرا ہے
تو اول سوچ تو دل میں کہ تو ہے کون اور کیا ہے　　　نمازی ہے، شرابی ہے، اُچکا ہے، لٹیرا ہے

فرشتہ ہے، پری ہے، دیو ہے یا آدمی، جن ہے　　بلا ہے، بھوت ہے، بامن، مزورا یا کمیرا ہے
تیری کیا ذات ہے، کیا نام ہے، کیا کام کرتا ہے　　مسافر ہے وطن ہے، یا ترا اس جا پہ ڈیرا ہے
جب ان چیزوں سے تو اپنے تئیں کچھ چیز ٹھیراتے　　تو اس کے بعد پھر کہیو کہ "یہ تیرا یہ میرا ہے"
یہ چیزیں ہیں تو غرض کیا ہیں، تو زبانی نہیں مالک　　تجھے او بے خبر ناداں یہ کس غفلت نے گھیرا ہے
تو کچے سوت کا دھاگا عبث بل پیچ کھاتا ہے　　یہ سب وہم غلط ہے اور قصور فہم تیرا ہے
تو کیا جانے کہ تجھ کو کس نے کس پردے میں کاتا ہے　　تو کیا جانے کہ تجھ کو کس اٹیرن میں اٹیرا ہے
تماشا ہے، مزا ہے، سیر ہے کیا کیا ہا ہا ہا　　مصور نے عجب کچھ رنگ قدرت کا بکھیرا ہے
ترقی میں تنزل ہے، تنزل میں ترقی ہے　　اندھیرے میں اُجالا ہے اُجالے میں اندھیرا ہے
طلسمات حقیقی ہے، یہ کچھ سمجھا نہیں جاتا　　یہی چاند اور یہی سورج، یہی شام اور سویرا ہے
نظیر اللہ اللہ، اس جہاں میں دم غنیمت ہے　　کہاں ہم اور کہاں پھر تم، کوئی دم کا بسیرا ہے

میر کا انداز محمد حسین آزاد نے نظیر کے چند شعروں کو میر کے انداز کا لکھا ہے۔ اُس کے لکھنے کا پرداز یہ ہے کہ گویا یہ چیز نظیر کے لئے فخر و مباہات کا موجب ہے کہ وہ میر کے رنگ میں چند شعر لکھ سکے۔ مجھے آزاد کے اس خیال سے مطلق اتفاق نہیں۔ میر کے رنگ میں کامیاب ہو جانا نظیر کے مقصد شاعری کے لئے باعث ننگ تھا۔ نظیر کی شاعری کا مسلک میر کے راستے سے بالکل جدا اور نہایت وسیع ہے۔ نظیر زندگی کے مفسر ہیں اور میر محض محبت کے ماتم گسار۔ میر کی شاعری میں فلسفۂ حیات معدوم اور نظیر کے یہاں بس یہی ایک چیز سارے عالم پر محیط ہے اسلئے میر و نظیر کا تقابل کوئی معنے نہیں رکھتا۔

لیکن جہاں تک جذبات محبت کے احساس و اظہار کا تعلق ہے، میر کے یہاں صحیح احساس اور کامل اظہار ہوا ہے۔ مگر نظیر نے ان احساسات کے اظہار میں ذرا سے تفلسف سے بھی کام لیا ہے۔ نظیر کے احساسات محبت کی صداقت کے اظہار کو اُن کے فلسفہ نے تھوڑا سا سنجیدہ بنا دیا ہے۔ جذبات محبت میں گداز کا ہونا لازمی ہے، اور اُسی کے دلنشین بیان نے میر کی انفرادیت قایم کی ہے۔ نظیر کے یہاں نیاز عاشقانہ ہے، لیکن میر کی سی فتادگی کم ہے، گو تغزلی احساس کے اظہار کا پرداز کچھ مماثل ہو جاتا ہے :-

آیا وہ جب تو ہم نہ رہے اپنے آپ میں　　دیکھا اسی طرح سے اُسے ہم نے بار ہا
یوں تو ادا و ناز سب آتے ہیں اُس کے یاد　　ہنسنا پر ایک اُس کا نہیں دل سے بھولتا
ہوا جو ہم کو وہ کوچہ چمن سرشت نصیب　　خدا نے ہم کو اُسی جا کیا بہشت نصیب
کوچے سے اُس کے آتا ہوں یوں ہو کے نا اُمید　　جو کر شکستہ حال کو جیسے ملا جواب

اتنا تو نامہ بر سے نہ ہوتا میں شرمسار — اے کاش بھیجتا وہ برا یا بھلا جواب

آتے ہی دل اپنا تو یہ سودائی ہے کم بخت — اور تس پہ سنا یہ کہ بہار آئی ہے کم بخت

نہ جاؤں میں تو اس کے پاس لیکن کیا کروں یارو — یکایک کچھ جگر میں آ کے لگ جاتا ہے نشتر سا

دل سا در یتیم بکا، ایک نگہ کے مول — کیا کہئے، خیر یہ بھی خریدار کے نصیب

کرتے تھے لئے تو شاید جھڑک دیا اُسنے — میاں نظیر تو کچھ شرمسار آتے ہیں

آفات نے اس کی اوج یہ ہم کو دکھا دیا — جو رفتہ رفتہ خاک میں آخر ملا دیا

مضامین کا توارد

نظیر کے یہاں ایسے مضامین اور خیالات پائے جاتے ہیں جو شعرائے ماقبل لکھ گئے تھے اور وہ بھی ہیں جو بعد کے شعرا نے لکھے ہیں۔ یہ انتخاب نہ توارادتاً تھا اور نہ ضروری لیکن دوران مطالعہ میں اگر ذہن نے کوئی ہم مضمون یا قریب المفہوم شعر پیش کر دیا تو نشان لگا دیا تھا۔ غالباً چند شعروں کا تقابل غیر دلچسپ نہ ہوگا:-

ملا خاقانی کا شعر ہے:-

من بندۂ آن دمم کہ ساقی گوید — یک جام دگر بگیر و من نتوانم

نظیر کہتے ہیں:-

ساقی ہمیں پلائے یوں جام پے بہ پے — جو ہم نشہ میں کہہ اٹھیں اکبار بس جی بس

حافظ کا مشہور شعر ہے:-

بلا زبان سلطان کہ رساند این دعا را — کہ بشکر پادشاہی ز نظر مران گدا را

نظیر کہتے ہیں:-

مجھے وہ دے پیئے تو یہ اس کا لطف ہے ورنہ — وہ بادشاہ ہے اسے مجھ گدا سے کیا مطلب

مرزا مظہر جانجاناں کا شعر ہے:-

خدا کے واسطے اس کو نہ ٹوکو — یہی ایک شہر میں قاتل رہا ہے

نظیر کہتے ہیں:-

نہ ٹوکو دوستو اس کی بہار نام خدا — یہی اب ایک ہے یاں گلعذار نام خدا

سودا و نظیر ایک ہی وقت میں تھے۔ سودا کا یہ مشہور شعر فارسی کا چربہ ہے:-

کیفیت چشم اس کی مجھے یاد ہے سودا — ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں

نظیر کہتے ہیں:- خدا کے واسطے گلگونہ میرے ہاتھ سے لو — مجھے بو آتی ہے اس میں کسو بدن کی

نظیر کا شعر ہے:-

یہاں بھی خواب ہے اور ہم بھی خواب ہیں اے دل — عجب بہار کا دیکھا ہے ہم نے خواب میں خواب

غالب کہتے ہیں:-

ہے غیب غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود — ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

نظیر کا شعر ہے:-

تھے کل یہ خط عارضِ خوباں سبزہ رنگ — کہتی ہے آج خلق جنھیں سبزہ زار ہا

غالب کہتے ہیں:-

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہوگئیں — خاک میں کیا صورتیں ہوں گی جو پنہاں ہوگئیں

نظیر کا شعر ہے:-

ان سنگدل بتوں کا گلا کیا کروں نظیر — میں آپ اپنے شیشۂ دل کی شکست ہوں

غالب کہتے ہیں:-

سن اے غارتگر جنس وفا سن — شکستِ شیشۂ دل کی صدا کیا

نہ گلِ نغمہ ہوں نہ پردۂ ساز — میں ہوں اپنی شکست کی آواز

نظیر کا شعر ہے:-

مر کر بھی نہ خاک نہ آسودہ ہوئے آہ — اے عشق نہ تھے ہم ترے انجام سے واقف

ذوق کہتے ہیں:-

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے — مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

نظیر کا شعر ہے:-

ابھی کہوں تو کسی کو نہ اعتبار آوے — کہ ہم کو راہ میں ایک آشنا نے لوٹ لیا

شیفتہ کہتے ہیں:-

ابھی کہوں تو کریں لوگ شرمسار مجھے — کہ کس کے وعدے پہ اتنا ہے اعتبار مجھے

نظیر کا شعر ہے:-

یوں جھمکتا ہے رخ اس محبوب کا زیرِ نقاب — ہو نمایاں جس طرح ابر تنک میں آفتاب

غالباً جلیل نے کہا ہے:-

رنگت یہ رخ کی اور یہ عالم شباب کا — آنچل میں تم تو پھول لئے ہو گلاب کا

نظیر کا شعر ہے :-

تا برق نہ خورشید نہ شعلہ نہ بھبوکا کیوں صاحبو یہ حسن ہے یا اور ہی کچھ ہے

مبتلؔ کہتے ہیں :-

نگاہ برق نہیں، چہرہ آفتاب نہیں، وہ آدمی ہے وَلے دیکھنے کی تاب نہیں

نظیر کا شعر ہے :-

چمک جا پھر خدا کے واسطے اے طور کے شعلے کہ مثلِ آتشِ افسردہ ہے دل پھر کچھ چلا گھلا

جگرؔ کہتے ہیں :-

ہنسی پھر اُڑنے لگی عشق کے فسانے کی نقاب اُٹھاؤ، بدل دو ہوا زمانے کی

عام انتخاب

گردوں نے ہمکو کیا نہ دیا اور کیا دیا سب کچھ دیا اگر دلِ بے مدعا دیا

خواب عدم میں ہم تو فراغت سے اے نظیر سوتے تھے عشق نے مگر آکر جگا دیا

یہ کچھ بہروپ پن دیکھو کہ بن کر شکل دانے کی بکھرنا، سبز ہونا، لہلہانا، پھر سمٹ جانا

یہ یکتائی، یہ یکرنگی، تس اوپر یہ قیامت ہے نہ کم ہونا نہ بڑھنا، اور ہزاروں گھٹ میں بٹ جانا

جو ہم میں شوخیاں تھیں جوانی میں اب کہاں اُن بے وقوفیوں کا اک الزام رہ گیا

شراب و گلبدن ساقی، مزے عیش و طرب ہر دم بہارِ زندگی کہئے تو ہے موسم جوانی کا

یہ بوڑھے گو کہ اپنے منھ سے سیخی میں نہیں کہتے بھرا ہے آہ، پر ان سب کے دل میں غم جوانی کا

یہ پیرانِ جہاں اس واسطے روتے ہیں اب ہر دم کہ کیا کیا اُن کا ہنگامہ ہوا برہم جوانی کا

نہیں بوڑھوں کی داڑھی پر میاں یہ رنگ وسمے کا کیا ہے آکے ایک ایک بال نے ماتم جوانی کا

اُٹھا کے سینہ، جھٹک بازو اور بنا سج دھج سپچلے ہے جس گھڑی ٹھوکر کو مار نام خدا

قدم قدم پہ برہمن پڑھیں ہیں بسم اللہ صنم بھی کہتے ہیں سب بار بار نام خدا

نشہ کی اب تلک آنکھوں میں کچھ نہ تھی مستی پر اب کچھ آتا چلا ہے خمار نام خدا

دیکھنا ہمدم یہ اُترا شبلستاں میں قمر یا ترا کا کل کسی کے چھکے سے بالا پڑا

وہ بالا ساقد اُس کا اور وہ بالا کان کا یارو
کریں ہیں اُس پری کے بالے جوبن کو دوبالا سا

طرح دینا، اُڑا دینا، لگا دینا، بجھا دینا
یہ ڈھبلیں یاد تس پر کچھ فریب اور فن نہیں آتا

چمنِ حسن میں اے نوگلِ بستانِ جمال
تو وہ گل ہے کہ بصد حسن جہانگیر کھلا
محوِ تدبیر ہیں ہم لیک خدا ہی جانے
کون سا گل ہے پسِ پردۂ تقدیر کھلا

وصف اُس کے حسن کا کس سے ہوا کلی مگر
جس کے جتنا فہم میں آیا، کہا، اچھا کہا

جدھر کو دیکھیے اُدھر آپ ہی جھمکتا ہے
مزا پڑے نہ اُسے کیوں کہ شیش محلوں کا
کہا میں یار سے ایک دن کہ دل یہ چاہے ہے
طریق جیسے ہے عشرت کے اہلے گہلوں کا

ایک نظر گر تجھے دیکھ لیں، شادی سے پھر
مہ کو لگیں چار چاند، مہر کو چار آفتاب

کیسا ہی وہ برا ہو تو لگ جائے جس سے دل
لگتا ہے دل کو پھر وہی واللہ سب سے خوب

عشق میں اُس گوہرِ نایاب کے
آج تلک خشک ہیں دریا کے لب

یہ جواہر خانۂ دنیا جو ہے با آب و تاب
اہلِ صورت کا ہے دریا اہلِ معنی کا سراب

اے مری جان ہمیشہ ہو تری جان کی خیر
نازکی دور بلا، حسن کے سامان کی خیر

سو چمن ایک فقط اُس کے ہیں کھڑے میں نظیر
جب یہ صورت ہو تو پھر کس کو خدایا دہے

ایامِ شباب اپنے بھی کیا عیش اثر تھے
کہتے ہیں جنھیں عیب وہ اُس وقت ہنر تھے

ہے حسن پرستی بھی عجب چیز وفا کیش، 　　دل پیر بھی ہو جائے پر اُس کا نہ اثر جائے

پہلے ہی ساغر میں تھے ہم تو پڑے لوٹتے 　　استنے میں ساقی نے دی اُس سے کڑی اور بھی

خاتمۂ کلام

المختصر یوروپ کی ترقیِ تمدن و علوم نے شعر و ادب کا جو معیار مقرر کیا ہے اور تنقید کا جو پیمانہ قائم کیا ہے، نظیر نہ صرف اُس معیار کے شاعر ہیں اور اُس پیمانے پر پورے اُترتے ہیں، بلکہ عہد حاضر میں ادب کے متعلق جو نظریات جاری و ساری ہیں وہ بھی نظیر کے کلام سے مستنبط ہوتے ہیں

مجھے احساس ہے کہ نظیر کے غزلیہ کلام سے جو اشعار مثالاً پیش کئے گئے ہیں، اُن کی تعداد بڑھ گئی ہے اور عجب نہیں کہ بعض طبیعتوں پر گراں بھی ہو، لیکن معذرت کی درخواست کے ساتھ ساتھ یہ عرض ہے کہ ایسا بالقصد کیا گیا ہے۔ چونکہ یہ کلام چھپا نہیں ہے، اس لئے جتنا زیادہ حصہ لوگوں کے سامنے آسکے نظیر کے متعلق بہتر رائے قایم کرنے میں مدد دے گا۔

(ہندستانی) 　　　　لطیف الدین احمد اکبرآبادی

کتابوں کی یونیورسٹی

چند سال ہوئے میں آل انڈیا لائبریری کانفرنس کے جنرل سکریٹری کی حیثیت سے جس کا اجلاس لاہور میں ہونے والا تھا علامہ سر محمد اقبال کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان سے درخواست کی کہ وہ مجلس استقبالیہ کی صدارت قبول فرمائیں علامہ موصوف نے میری استدعا کو نہایت خندہ پیشانی سے سنا لیکن آپ نے نہایت شائستگی مگر صاف گوئی کے ساتھ فرمایا کہ وہ میری درخواست کو منظور نہیں کر سکتے میں انتہائی مایوسی کے عالم میں وہاں سے رخصت ہونے ہی والا تھا کہ انھوں نے مجھ سے دریافت کیا "کیا کتب خانے کوئی کام کی چیز ہیں اور کیا کتابوں کے مطالعہ سے کچھ فایدہ حاصل ہوتا ہے"۔ ان کے اس سوال کا میں اسوقت کوئی جواب نہ دے سکا اور عرصہ تک میرے دماغ میں یہ سوال گونجتا رہا۔ میں حیران تھا کہ اقبال ایسے فاضل انسان کو کتابوں کے مطالعہ سے اسدرجہ نفرت و گریز کیوں ہے۔ کم ازکم علامہ کے سوال سے میں نے یہی نتیجہ اخذ کیا اور اس کے کوئی اور معنی نہ سمجھ سکا۔ مجھے امید نہ تھی کہ صاحب موصوف نے میرے ساتھ وہی طرزِ عمل اختیار کیا ہوگا جو ایک ممتحن زبانی امتحان میں کسی طالب علم کے ساتھ اختیار کرتا ہے، ممدوح کا یہ مقصد کبھی نہ رہا ہوگا کہ وہ میری معلومات کا امتحان لیں یا میری قوت تشریح و ترغیب کو پرکھیں، یقیناً سوال میں اس سے کچھ زیادہ گہرائی تھی، اس میں کتابوں اور ان کے مطالعہ کے متعلق اس بے اعتمادی کا اظہار تھا جس کے متعلق اور مفکرین بھی روشنی ڈال چکے ہیں۔

اس سوال پر غور و فکر کے اثنا میں میرے سامنے اور بھی ایسے ارباب فکر آئے جو اس اصول کے قطعًا منکر تھے کہ کتابوں کے مطالعہ سے عقل و دانائی پیدا ہوتی ہے مجھے اسٹیونسن کے "کاہل" کا خیال آیا۔ اس نے اپنے دلچسپ مقالہ "کاہلوں کے لئے ایک اعتذار" میں کتابوں کے مطالعہ کے خلاف ایک زبردست احتجاج کیا ہے وہ لکھتا ہے کہ "جہاں تک میرا تعلق ہے میں نے اپنے زمانہ میں بہت کافی لکچر سنے ہیں مجھے ابھی تک یاد ہے کہ لٹو کا گھومنا حرکت کی سکون کی ایک صورت ہے اور یہ بھی یاد ہے کہ حق شفع کوئی مرض نہیں ہے اور نہ طلب حق آسایش کوئی جرم ہے لیکن اگرچہ میں اپنی معلومات علمی کے ان جواہر پاروں سے بخوشی محروم ہونا پسند کروں گا تاہم میں ایک لمحہ کے لئے بھی تیار نہیں ہوں کہ ان معلومات کو وہی اہمیت دوں اور ان کی وہی قدر و قیمت سمجھوں جو میں نے اسکول سے

غائب ہوکر آوارہ گردی میں حاصل کی ہے" اس سے وہ یہ استدلال کرتا ہے کہ کتابوں کا بہت زیادہ مطالعہ فضول ہے، اس کی قدر و قیمت ایک شمعدان کی سی بھی نہیں ہے کیونکہ یہ ہماری زندگی پر (جس طرح ہم اس کو بسر کرنا چاہتے ہیں) بہت کم اثر انداز ہوتی ہے، مزید براں اس کا اعتقاد ہے کہ کتابیں ہم کو زندگی کے اُن مکمل و صحیح تعلقات سے بیگانہ بنا دیتی ہیں، جو فی الحقیقت بہت کارآمد ہیں۔ ایک کتابی آدمی "لیڈی آف شیلاٹ" کی طرح ہے جو زندگی کو اپنے اصلی خد و خال میں بمشکل دیکھ سکتی تھی، بلکہ وہ صرف ان پرچھائیوں پر قانع تھی جو آئینہ میں اسے نظر آتی تھیں ایسا شخص جو مسلسل کتابوں کے مطالعہ میں لگا رہتا ہے، تجربہ اور مشاہدات کا لطف صرف ثانوی حیثیت سے حاصل کرتا ہے، وہ حقایق کی دنیا سے الگ، صرف بھوتوں، پرچھائیوں اور دھندلی شکلوں کی دنیا میں رہتا ہے، وہ ان چیزوں کا مطالعہ کرتا ہے جو دوسروں نے انجام دئے ہیں جنھیں اوروں نے سوچا اور کیا ہے اور اس حقیقت کو بالکل فراموش کر دیتا ہے کہ اسے خود بھی غور و فکر کی حساس زندگی بسر کرنا ہے۔ آگے چلکر وہ کہتا ہے کہ کتابوں کا مطالعہ انسان کو اس عجیب و غریب دنیا سے الگ کر دیتا ہے جس کے محاسن و معائب کا مطالعہ وہ خود اپنی آنکھوں سے کر سکتا ہے۔ کتابوں کا عاشق بالکل تن آسان اور بے حس زندگی کا عادی ہو جاتا ہے وہ اس حقیقت کو فراموش کر دیتا کہ فراہمی معلومات کے لئے اپنے حواس ہی کام میں لائے جا سکتے ہیں۔ اس کے لئے آکسفورڈ کے پر فضا میدانوں کا وجود صرف میتھو آرنلڈ اور رابرٹ برجز کی نظموں میں پایا جاتا ہے اور بلبل کے نغمے صرف حافظ کی مترنم غزلوں ہیں وہ صرف ان پھولوں کی خوشبو سونگھتا ہے جن کو کیٹس نے اپنی بہاریہ نظم میں مثبت کیا ہے اور اس کو کسی صحبت کی مسرتوں کا اندازہ اسی وقت ہوتا ہے جب وہ اسکا ذکر کسی تذکرہ یا سیاحت میں پڑھتا ہے الغرض دنیا کی بہترین چیزوں سے لطف اندوز ہونے کی صلاحیت اس سے مفقود ہو جاتی ہے اور کائنات کے گوناگوں مناظر و مظاہر اس کے لئے بالکل ناممکن الفہم۔

کتابیں صرف ہماری قوت مشاہدہ ہی کو معطل کر دیتی ہیں بلکہ وہ اکثر ہماری آنکھوں کو زندگی کے عملی پہلو کی طرف سے بند کر دیتی ہیں اور نپٹ مکتبی اور ملّا بنا دیتی ہیں، تورو نے نہایت واضح اور مدلل طور پر اپنی کتاب والڈن میں اس موضوع پر بحث کی ہے۔ یہ امریکی مصنف جو عصر جدید کی میکانکی اور مذموم تہذیب سے قطعاً کوئی ہمدردی نہیں رکھتا تھا، صرف اصول فطرت تبلیغ کرتا تھا اس نے اپنے وطن کو جو عہد حاضر سے [illegible] سے آراستہ تھا، خیرباد کہکر ایک تالاب کے قریب رہنا اختیار کیا، اور یہاں جدید طرز زندگی سے [illegible] ہوکر اس نے جدید تہذیب کی اساس و بنیاد پر غور کرنا شروع کیا اور اس نتیجہ پر پہونچا کہ یہ سب [illegible] اُس نے ان تمام اداروں کا تجزیہ شروع کیا جن کو آج کل کا مہذب انسان اجتماعی روشن خیالی کے [illegible] کرتا ہے اور اس نے محسوس کیا کہ یہ سب بے حقیقت ہیں۔ اس نے امریکہ کے رائج الوقت نظام تعلیم کو [illegible]

کتابوں کے ذریعہ سے علم سکھانے پر زور دیا جاتا ہے۔ بالکل ناقص قرار دیا۔ یہ کتابی تعلیم زندگی کے حقایق سے قطعاً محروم کر دیتی ہے اور اس لئے بالکل بے معنی ہے۔ اس نے ایک خطیبانہ انداز سے اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کیا ہے "نوجوان کیونکر بہتر زندگی بسر کرتے ہیں؟ اس کی صورت صرف یہ ہے کہ وہ ابتدا ہی سے ذاتی تجربات حاصل کرنے کی کوشش کریں۔ اگر میں یہ چاہوں گا کہ کوئی لڑکا فنون و علوم سے واقفیت حاصل کرے تو میں رائج الوقت روش کبھی اختیار نہیں کروں گا جس کے معنی صرف یہ ہیں کہ ایک بچے کو کسی پروفیسر کے پڑوس میں رکھا جائے جہاں زندگی گزارنے کے فن کے سوا اور تمام باتیں بتلائی اور سکھلائی جاتی ہیں اور جہاں دنیا کا صرف سطحی مشاہدہ کرایا جاتا ہے۔ جہاں علم الکیمیا سکھلایا جاتا ہے لیکن یہ نہیں بتلایا جاتا کہ اس کی روٹی جو وہ روز مرہ کھاتا ہے کس طرح بنتی ہے، یا جہاں میکانیک کی تعلیم دیجاتی ہے لیکن نہیں سکھایا جاتا کہ معاش کس طرح حاصل کی جاتی ہے یا جہاں نیچون سیارہ کے نئے چاندوں کا دریافت کرنا سکھایا جاتا ہے لیکن یہ نہیں بتلایا جاتا کہ وہ خود اپنی آنکھ کے تنکے کا کس طرح پتہ لگا سکے۔ آپ کے سامنے دو بچے ہیں، ایک وہ جس نے اپنا جیبی چاقو اس دھات کے ٹکڑے سے بنایا ہو جسے اس نے خود کھود کر نکالا تھا اور گلا کر صاف کیا تھا لیکن پڑھا صرف اتنا ہی تھا جتنا کہ اس کام کے انجام دینے کے لئے ضروری تھا اور دوسرا لڑکا وہ ہے جس نے معدنیات پر بہت سے لکچر سنے ہوں اور اپنے شفیق باپ سے ایک چاقو بطور انعام پایا ہو۔ پھر آپ ہی فیصلہ کیجئے کہ ان دونوں لڑکوں میں سے کون زیادہ کارآمد ہے۔ میرے تعجب کی کوئی انتہا نہ رہی جب مجھے اپنے کالج کے ایام کے اختتام پر بتلایا گیا کہ مجھے فن جہاز رانی سکھلایا گیا ہے درانحالیکہ اگر میں نے کسی جہاز کے اندر کام کر کے بندرگاہ کے گرد ایک چکر بھی لگا لیا ہوتا تو مجھے اس سے کہیں زیادہ معلومات حاصل ہو جاتیں، ایک طالب العلم کو معاشیات و اقتصادیات کی تعلیم تو دیجاتی ہے لیکن زندگی کیونکر کفایت شعاری کے ساتھ بسر کی جاتی ہے اسکی تعلیم نہیں دیجاتی، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے والدین کو ناقابل ادا قرض کی مصیبت میں گرفتار کر جاتا ہے۔

میرا خیال ہے کہ کتابوں کے مطالعہ کے خلاف اس سے زیادہ پرزور احتجاج شاید ہی کسی نے کیا ہو۔ تورو کے قول کے مطابق کتابیں فی الحقیقت خود اپنے ہی مقاصد کو شکست دے دیتی ہے کیونکہ یہ ہم کو حقایق کی دنیا سے نکال کر محض خیالی شکلوں اور غیر حقیقی صورتوں کے عالم میں گم کر دیتی ہیں۔

کتابوں کا مطالعہ دوسرے قسم کے خطرات میں بھی مبتلا کر دیتا ہے، ولیم ہیزلٹ نے اپنے ایک نہایت مشہور مقالہ موسومہ "علما کی جہالت" میں ان خطرات کو واضح طور پر بیان کیا ہے لکھتا ہے کہ:-

"غیر معمولی تبحر علمی ایک ایسا خطرہ ہے جس میں بہت سے علما گرفتار ہیں۔ ان کی نظر کوتاہ ہوتی ہے اور فکر دوررس نہیں ہوتی ان کی دلچسپیوں کا حلقہ بہت محدود ہو جاتا ہے اور ان کی حالت اتنی ہی قابل رحم ہوتی ہے جتنا

کسی کارخانہ کے اس کاریگر کی جس کو صرف آلپنوں کے سروں کے بنانے کے لئے مخصوص کر دیا گیا ہے اول تو پنوں کا بنانا ہی خود کوئی عقل کو بڑھانے والا کام نہیں ہے اس پر طرہ یہ کہ اس کو چھوٹے سے کام میں سے بھی بہت چھوٹا سا حصہ انجام دینا پڑتا ہے اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کاریگر اپنی ساری زندگی اپنے کام میں صرف کر دیتا ہے جو ذہنی سکون پیدا نہیں کر سکتا۔ یہ نام نہاد علما صرف الفاظ کے غلام بن جاتے ہیں اور قدرت کے مشاہدہ کے لئے ان کے پاس بینائی باقی نہیں رہتی وہ اشیاء کا ادراک دوسرے اشیاء کے ذریعہ سے کرتے ہیں انکی کتابیں انکے اور اشیاء کائنات کے درمیان حجاب بن جاتی ہیں۔ کتابی کیڑا ایک قسم کی تن آسانی اور بے حس زندگی کا عادی ہو جاتا ہے۔ وہ ایک گراموفون ہے جو صرف دوسروں کی کہی ہوئی باتوں کو چالاکی سے دہراتا رہتا ہے۔

ایسے لوگ دوسروں کی آنکھوں سے دیکھنے ان کے کانوں سے سننے اور ان کے اعتقادات پر اپنے عقاید کی بنیاد رکھنے کے شایق ہوتے ہیں۔ انھیں ناموں اور تاریخوں کا علم ضرور حاصل ہوتا ہے لیکن انسان اور اشیاء عالم کا علم بالکل نہیں ہوتا وہ ہندؤں اور قلماقی تاتاریوں کے ذات پات کا مطالعہ تو نہایت شغف کے ساتھ کرتا ہے، لیکن اپنے ہمسایہ کے حالات سے بے خبر ہوتا ہے۔ وہ قسطنطنیہ اور پیکن کے طول وعرض سے بخوبی واقف ہے، لیکن اپنے پڑوس کی گلیوں کی اسے خبر نہیں ہوتی وہ خود اپنے احباب کے حالات سے آگاہ نہیں ہوتا، لیکن تاریخ کے مخصوص افراد پر بہت پر زور لکچر دے سکتا ہے"

کتب بینی کے خطرات کا ذکر صرف مقالہ نگاروں ہی نے نہیں کیا ہے بلکہ بعض افسانہ نویسوں اور ناول نگاروں نے بھی اس پر روشنی ڈالی ہے، چیخوف نے اپنے افسانہ "معلم الادبیات" میں ایک معلم کی کردار نگاری کی ہے، یہ بیچارہ جغرافیہ کا معلم تھا اس کو اپنے مخصوص مضمون میں اسدرجہ انہماک تھا کہ اور تمام چیزوں سے دلچسپی ختم ہو گئی تھی اسکا ایک رفیق عشق میں مبتلا ہوتا ہے اور چاہتا ہے کہ اپنے دوست کو داستان دل سنائے لیکن اسے ہمت نہیں ہوتی۔ اس معلم نے کائنات کو صرف دو چیزوں میں محدود کر دیا تھا، تاریخ اور نقشے۔ زندگی کے معاملات میں اسکی حیثیت ایک احمق سے زیادہ نہ تھی، وہ بالعموم خاموش رہتا اور جب کبھی گفتگو کرتا بھی تو نہایت خشک اور عامیانہ

اناطول فرانس نے بھی ان علما کا دبی زبان سے مضحکہ اڑایا ہے اور ان لوگوں پر طنز کیا ہے جو بڑی بڑی ضخیم کتابیں لکھتے ہیں۔ اس نے اس سلسلہ میں ایک کہانی بیان کی ہے کہ ایک شاہزادہ عجم کے تخت پر متمکن ہوا تو اس نے تمام علماء کو بلایا اور ان سے فرمایش کی کہ وہ بہت جلد ایک ایسی تاریخ عالم مرتب کر دیں جو سلطنت کے انتظام میں اسکے لئے مفید ہو۔ علماء اور عقلا بیس سال گزرنے پر بارہ اونٹوں کے قافلہ کے ساتھ دربار میں پہونچے، وزیر نے بادشاہ کی خدمت میں عرض کیا کہ علماء سلطنت تاریخ کی چھ ہزار جلدیں مرتب کر کے لائے ہیں اور اس عظیم الشان تاریخ کا صرف دیباچہ پانچسو جلدوں پر مشتمل ہے، بادشاہ نے وزیر سے کہا یہ تصنیفات حکومت کے محافظ خانے میں محفوظ رکھدی جائیں اور علماء سے

کہا جائے کہ وہ اتنی مختصر کتاب لکھیں کہ اس تھوڑے سے وقت میں جو میرے پاس ہے میں اس کو پڑھ سکوں۔ علماء بیس سال کے بعد پھر آئے اور اس مرتبہ وہ صرف ۱۵۰۰ جلدیں لائے۔ بادشاہ نے کہا میرے پاس ان کے پڑھنے کا بھی وقت نہیں ہے کیونکہ اب میں ضعیف ہوچکا ہوں۔ انھیں اور مختصر کیا جائے، علماء دس سال بعد پھر واپس آئے اور پانچسو جلدیں اپنے ہمراہ لائے لیکن بادشاہ نے پھر وہی جواب دیا کہ اس کے پاس پانچسو جلدیں پڑھنے کا بھی وقت نہیں ہے علماء پھر واپس چلے گئے اور پانچ سال کے بعد ایک جلد لیکر آئے لیکن اسوقت بادشاہ بستر مرگ پر پڑا تھا۔ اس افسانہ سے معلوم ہوتا ہے کہ کتابیں لکھنے کا کام کس قدر تضیع اوقات ہے اور ان کا مطالعہ بھی کس قدر دشوار ہے ایک آدمی بغیر زیادہ پڑھے ہوئے بھی حقیقی دضروری عقل حاصل کر سکتا ہے۔

ابھی تک تو میں گویا شیطان کی نیابت کر رہا تھا اور کتاب بینی کے خطروں کی تفصیل پیش کر رہا تھا اور ایسا کرنا ضروری بھی تھا کیونکہ میں چاہتا تھا کہ کتب بینوں کو ان گڑھوں اور گھاٹیوں سے آگاہ کردوں جو مطالعۂ کتب کے دوران میں سامنے آتے ہیں۔ اس حقیقت سے انکار نہیں ہو سکتا کہ دنیا بڑی حد تک کتابوں کی رہین منت ہے اور بہت سے لوگوں کی زندگی اس سے سدھر گئی ہے۔

اسٹیونسن کو افسانہ میں رشد وہدایت کا سرچشمہ نظر آتا ہے اور اسی لئے وہ (Three Musketeers اور Pilgrim's Progress) کا بڑا مداح ہے۔ اس نے شکسپیر کے ڈراموں سے بھی کافی فایدہ اٹھایا۔ گیٹے کی سوانح میں اسے روحانی غذا ملی۔

ارباب عمل نے بھی کتابوں کے مطالعہ کو بہت مفید بتایا ہے۔ لارڈ گرے کا عقیدہ تھا کہ کتب بینی بہترین تفریح ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ "جب میں معتمد امور خارجہ تھا تو سخت تھکا دینے والے کام کے بعد تفریح کی سب سے بہتر صورت میں نے یہ نکالی تھی کہ اپنے قصباتی کتب خانہ میں پہونچ جاتا۔ ارل آف بالڈون نے اس کا اعتراف کیا ہے کہ وہ کلاسیکی ادب کا بہت منت پذیر ہے اس کے خیال میں ہوریس، ہومر، اور ورجل کا مطالعہ اخلاقی حیثیت سے بھی ارفع واعلیٰ ہے۔

بعض اوقات کتابوں نے لوگوں کو نیا عزم واستقلال بخشدیا ہے اور زندگی کے دھارے کا رخ بدلدیا ہے جان اسٹورٹ مل نے اپنی خود نوشت سوانح میں لکھا ہے کہ ایک بار میں زندگی میں سخت مایوس ہوگیا تھا، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہر چیز باطل ہے۔ اتفاق سے مجھے ورڈس ورتھ کی نظموں کا ایک نسخہ ہاتھ آگیا میں نے اسے بغور پڑھا تو خوشی محسوس کرنے کی صلاحیت پھر عود کر آئی اور ایک کامیاب زندگی بسر کرنے کا ولولہ میرے اندر پیدا ہوگیا۔

جس طرح ورڈس ورتھ کی نظموں نے مل کو ایک نئی شاہراہ زندگی پر لگا دیا اسی طرح رسکن اور ٹالسٹائے کی چند کتابوں نے مہاتما گاندھی کی زندگی کا رنگ ہی بالکل بدلدیا وہ کہتے ہیں کہ "ٹالسٹائے کی کتاب" ایشور کا راج

خود تمہارے اندر ہے"، نے مجھے مبہوت و مسحور بنا دیا اور اس کی آزاد خیالی، عمیق مذہبیت اور صداقت کے سامنے تمام دوسری کتابیں پھیکی نظر آنے لگیں۔

مسولینی کو کبھی یہ حیثیت نہ حاصل ہوتی اگر کارل اور نیٹشے کا مطالعہ اس نے نہ کیا ہوتا۔ لینن کو سماج کی تعمیر جدید کا شوق کارل مارکس کے مطالعہ سے پیدا ہوا۔ الغرض مطالعۂ کتب کے فائدہ سے انکار نہیں ہو سکتا لیکن حقیقت ذہن نشین رکھنا چاہئے کہ اپنی تعلیم آپ، ہر اس تعلیم سے بہتر ہے جو دنیا کی کسی یونیورسٹی میں دیجاتی ہے۔ اس سے یہ مقصد ہرگز نہیں کہ جو تعلیم اسکولوں یا یونیورسٹیوں میں دیجاتی ہے وہ لغو ہے بلکہ صرف یہ دکھانا مقصود ہے کہ اپنا پسند کیا ہوا طریقہ تعلیم بدرجہا بہتر ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ایسی تعلیم کے لئے نصاب کیا ہونا چاہئے۔ میں اس سلسلہ میں کتابوں کے نام نہیں گنواؤں گا بلکہ اصولاً صرف یہ ظاہر کروں گا کہ اگر انسان کو صحیح معنی میں انسانی زندگی بسر کرنا ہے تو اسکو دنیا کی مختلف قوتوں کے سمجھنے کی کوشش کرنا چاہئے، اس کے لئے تھوڑی سی تاریخ پڑھنا ضروری ہے مگر صرف اپنے ہی ملک کی نہیں بلکہ سارے عالم کی۔ اسی کے ساتھ ان جلیل القدر لوگوں کے سوانح حیات پڑھنا چاہئے جنھوں نے دنیا میں ذہنی انقلابات پیدا کئے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ وہ تاریخی ناول بھی پڑھنا چاہئے جو ماضی کے ساتھ ہم آہنگی پیدا کر دینے والے ہیں اور فلسفہ کے مطالعہ کی بھی کوشش کرنا چاہئے خاصکر نفسیات اور اخلاقیات کا مطالعہ کہ یہ سائنس کے مطالعہ کا بھی ذوق پیدا کریگا ساتھ ہی ساتھ عمرانیات اجتماعیات اور سیاسیات کا مطالعہ بھی کرنا چاہئے۔ اس طرز کے مطالعہ کے لئے کتابیں گنانا بے سود ہے پڑھنے والے کو خود اپنے مقاصد کا صحیح اندازہ کرنا چاہئے کہ نقادوں نے کتابوں کی تین قسمیں کی ہیں، معلوماتی کتابیں، تفریحی کتابیں اور الہام بخش کتابیں اور ان سب کا مطالعہ ضروری ہے۔

پروفیسر ولیوان چند شرما   سید محمد عبد العلیم ہاشمی

نگار کے پُرانے پرچے

نگار کے مندرجۂ ذیل پرچے دفتر میں موجود ہیں جن کی دو دو تین تین کاپیاں دفتر میں رہ گئی ہیں جن اصحاب کو ضرورت ہو طلب کرلیں قیمتیں وہی ہیں جو سامنے درج ہیں:۔

(سنہ ۲۶ء) جنوری ۵ر ۔ (سنہ ۲۸ء) اپریل ۴ر ۔ (سنہ ۳۰ء) مئی ۴ر ۔ (سنہ ۳۱ء) جولائی تا دسمبر ۴ر فی پرچہ ۔ (سنہ ۳۲ء) فروری تا دسمبر (علاوہ اپریل و اکتوبر) ۴ر فی پرچہ ۔ (سنہ ۳۳ء) فروری و جولائی ۴ر فی پرچہ ۔ (سنہ ۳۴ء) فروری و اکتوبر ۴ر فی پرچہ ۔ (سنہ ۳۵ء) فروری، اپریل تا اگست، اکتوبر تا دسمبر ۵ر فی پرچہ ۔ (سنہ ۳۶ء) فروری، مارچ، اپریل، مئی، جولائی، اگست، ستمبر، اکتوبر، نومبر، دسمبر ۵ر فی پرچہ ۔ (سنہ ۳۷ء) مارچ اپریل، مئی، جون، جولائی، اگست، نومبر ۸ر فی پرچہ ۔

منیجر نگار لکھنؤ

مکتوبات نیاز

مخلص نواز، آپ نے غالب کا یہ شعر سنا ہوگا :-

من آں نیم کہ دگر می تواں فریفت مرا
فریبمش کہ مگر می تواں فریفت مرا

مدعا یہ کہ آپ نے میری سادگی کا یقین کیوں کر لیا۔ مانا کہ راوی کوئی اور نہ تھا خود میں ہی تھا، لیکن یہ تو دیکھئے کہ روایت کس سے بیان کی گئی تھی۔ اُس سے کہ جس نے آج تک سچی بات کا کبھی یقین ہی نہیں کیا۔ پھر یہ سب کچھ جانتے ہوئے آپ کا یہ سمجھ لینا کہ میرا شمار بھی اُن لوگوں میں ہے

جو مے و نغمہ کو اندوہ ربا کہتے ہیں

کہاں تک درست ہو سکتا ہے

میرے نزدیک ہر وہ بات جسے ضمیر انسانی گوارا کر سکے، صداقت سے باہر نہیں ہے، اس لئے ہو سکتا ہے کہ میری صداقت آپ کا کذب ہو اور میرا کذب آپ کی صداقت۔ اس باب میں فلسفہ و منطق سے کام لیکر کوئی خاص نظریہ پیش کرنا لایعنی سی بات ہے۔ رہا سوسائٹی کا سوال، سو آپ جانتے ہیں کہ دنیا میں جتنے "اجتماعی" جھوٹ بولے گئے ہیں، اتنے انفرادی جھوٹ نہیں بولے گئے

مذاہب عالم کے نظریوں کو دیکھئے، تاریخی "حقایق" کی چھان بین کیجئے، اس کی مثالیں بکثرت مل جائیں گی

میں آپ سے زیادہ عقلمند ہونے کا مدعی نہیں ہوں، لیکن اتنا احمق بھی نہیں کہ آپ کی "فکرِ بیدار" کی داد نہ دے سکوں۔ آپ نے جو کچھ کیا، اسے آپ کا جی خوش کرنے کے لئے کہئے تو "خوب" کہدوں، ورنہ سچ پوچھئے تو میں آپ کی ذہانت و فراست سے بہت فروتر سمجھتا ہوں

اللہ، اللہ، یہ زہرہ گدازیاں! یہ حوصلہ فرسائیاں! — میں تو عتاب نامہ دیکھ کر کانپ اُٹھا کہیں یہ نزلہ اس عضوِ ضعیف پر تو گرنے والا نہیں۔ لیکن آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ میرے ساتھ قدرت کا معاملہ اسوقت تک کیا رہا ہے

ہر چہ از گریہ فشاندیم بہ نشمردن ریخت
ہر چہ از نالہ رسانیم بہ نشنودن رفت

کلیجہ پتھر کا ہوگیا ہے اب نہ "غمزۂ ناہید" کا اثر ہوتا ہے نہ "قہر مریخ" کا۔ آنکھ، زبان خشک ہیں اور دل برف کی قاش۔ پھر آپ کہ ابھی تک "خیالِ طرۂ لیلیٰ" لئے بیٹھے ہیں، اس شخص کا قدم کیوں درمیان لاتے ہیں جو ماورائے دنیائے "محمل و منزل" زندگی بسر کر رہا ہے۔

آپ کے اس زعم و پندار کا جواب میرے پاس صرف یہ ہے کہ :-

"غبارے سطرِ آشفتگی بر ہوا نگاشت، پنداشت مصنف کتاب آسانم،
پرکاہے، بنیادِ فطرت بر باد گذاشت، دانست منشیِ طومارِ کہکشانم"

لاحول ولا قوۃ، آپ بھی عجیب چیز ہیں - میں کہ

بر سرم ز آزادی سایہ را گرانیہاست

ان کو اپنے پاس رکھ کر ساری دنیا کی ذمہ داریاں اپنے سر لیلوں! میری حماقت پر آپ کو اتنا زبردست اعتماد ہے یہ خبر مجھے نہ تھی!

مردانگی کا راز صرف رازدارانہ زندگی بسر کرجانا ہے۔ یعنی باوجود احساس و تاثر کے دوسروں کے سامنے بیخبرانہ رہنا۔ اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب دُنیا کے ساتھ کم سے کم امیدیں وابستہ ہوں، مایوسی کے مقابلہ کے لئے زیادہ سے زیادہ تابِ مقاومت پیدا کی جائے

مرد وہ ہے جو گھر میں فاقہ کرتا ہے لیکن باہر نکلتا ہے تو اس کی مونچھوں پر بل ہوتا ہے اور پیشانی پر جلال - لیکن یہ سب کچھ اسی وقت ممکن ہے جب سوال صرف اپنی ذات کا ہو۔ دوسروں کی ذمہ داریاں اپنے سر آئیں اور زمانہ نے نیچا دکھایا

دوسروں کے لئے تکلیف اُٹھانا اس میں شک نہیں بڑی چیز ہے، لیکن انسانی وقار کو کھو کر یہ چیز حاصل کرنا کم از کم میرے بس کی بات نہیں

آپ خفا تو ہوں گے، لیکن آج آپ کی برہمی برداشت کرلینا آسان ہے بہ نسبت اس کے کہ کل آپ بھی مجھے

ذلیل سمجھنے لگیں۔ اس صورت کے علاوہ اور جو تدبیر آپ تجویز فرمائیں اس میں بقدر امکان حصہ لینے کے لئے طیار ہوں

یہ آپ کی پرسشِ گاہ گاہ — بڑی تکلیف دہ چیز ہے بمبئی کی اُس تحریر کے بعد، جس کا جواب براہِ راست آپ تک نہ پہونچ سکتا تھا، آپ نے بالکل خاموشی اختیار کرلی۔ میں متفکر تھا کہ آپ کی صحت کی خبر کیونکر معلوم کروں آپ کی وہ باتیں جو انسان کو پروانہ کی طرح "نیمۂ داغ و نیمۂ خاکستر" بنا دیتی ہیں، کس طرح سنوں، لیکن کوئی تدبیر سمجھ میں نہ آئی، آخرکار مایوس ہوگیا۔ اب کئی مہینے کے بعد آپ نے پھر یاد فرمایا لیکن نہایت رواروی میں، جس طرح سرِ راہ کسی سے ملاقات ہوجائے۔ یہ کیا ادا ہے، میں آپ ہی سے پوچھتا ہوں

شکر ہے کہ آپ اب صحیح و توانا ہیں۔ میں بھی اچھا ہوں لیکن جس وقت یہ دیکھتا ہوں کہ:۔

"موسمِ دیر غنودن بہ شبستاں آمد" اور اس کا کوئی سامان موجود نہیں تو پھر مضمحل ہوجاتا ہوں۔ کیا آپ نے کبھی داغ کے اس شعر پر غور کیا ہے:۔

چمپا کھِلا گُلاب کھِلا موتیا کھلی
دل کی کلی نہ تجھ سے مگر اے صبا کھلی

اس شعر میں مجھے صرف "تجھ سے" کی تفسیر آپ سے پوچھنا ہے۔ لیکن نتیجہ معلوم!
پردہ ڈالا ہے وہ تو نے کہ اٹھائے نہ بنے

خوش رہئے، اور کیا کہوں

قبلۂ دلِ مستمنداں،

تاخیرِ جواب پر شرمندہ ہوں، لیکن میں اس دوران میں ہرگز اس قابل نہ تھا کہ فرمانِ گرامی کی تعمیل کرسکتا اور یوں کوئی عریضہ پیش کرنا مناسب نہ تھا

میں نے سب سے پہلی فرصت میں ان کو بلا کر آپ کا پیغام پہونچایا اور وہ تمام صورتیں جو تکمیل مقصد کیلئے ضروری ہیں ان کو اچھی طرح سمجھا دیں۔ وہ پہلے ہی سے مطمئن تھے۔ لیکن اب تو انھیں بالکل یقین ہے اور مجھے امید ہے کہ جناب کی خواہش کے مطابق تمام مراحل طے پا جائیں گے

میں ضرور آیندہ دسمبر میں حاضری کی کوشش کروں گا۔ اس سے زیادہ سعادت اور کیا ہوسکتی ہے کہ چند ساعتیں آپ کی صحبت میں گزر جائیں

صدیقی ، میں سمجھتا تھا کہ آپ کی رنگین مزاجیاں ضرور کوئی نہ کوئی گل کھلائیں گی، لیکن یہ بات میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھی کہ یہ دولت اتنی مستعجل ثابت ہوگی۔ آپ نے تو نہیں لکھا، لیکن مجھے کسی طرح معلوم ہو ہی گیا کہ قصور آپ کا نہ تھا بلکہ اُن کا تھا۔ بہرحال یہ بحث فضول ہے کہ جو کچھ ہوا وہ کیونکر ہوا، اب سوچنا یہ ہے کہ آیندہ کیا ہوگا۔ میری رائے اب بھی وہی ہے جو پہلے تھی، حیرت ہے کہ عنقا کے آپ قایل نہیں، کیمیا پر آپ کا اعتقاد نہیں، لیکن اُن سے وفا کی امید ضرور رکھتے ہیں

اخلاق کی تباہی بھی کم افسوسناک نہیں، لیکن جب اس کے ساتھ عزت و دولت بھی شامل ہو جائے تو پھر "گریہ و ماتم" سے بھی کافی اظہار تاسف نہیں ہو سکتا۔ اگر دل گوارا کرے تو چند دن کے لئے کہیں چلے جائیے جب "لاحول" سے کام نہ چلے تو "ماحول" بدل دینا ضروری ہے

مکرمی - آپ نے بالکل صحیح لکھا کہ مومن کا سمجھنا آسان نہیں۔ میں تو یہ کہتا ہوں کہ اس کا پڑھنا بھی آسان نہیں۔ اس کے اشعار کا لب و لہجہ خاص ہوتا ہے اور جب تک اسی انداز سے ان کو نہ پڑھا جائے مفہوم پیدا نہیں ہوتا۔ ان کا مشہور شعر ہے :-

ان سے پری وش کو نہ دیکھے کوئی
مجھ کو مری شرم نے رسوا کیا

پہلے مصرعہ کو معمولی لہجہ میں پڑھئے تو معلوم ہوگا کہ مومن لوگوں کو منع کر رہا ہے کہ اس کی پری وش کو کوئی نہ دیکھے حیرت و استعجاب کے لہجہ میں پڑھیں تو مفہوم واضح ہو جائے گا یعنی میں نے تو اس کی طرف اس لئے نہ دیکھا تھا کہ رازِ محبت ظاہر نہ ہو، لیکن میری یہ احتیاط ہی رسوائی کا باعث ہوگئی کیونکہ ایسے پری وش کو نہ دیکھنا کیا معنی۔

غالب کے ہاں نازک خیالی کی کمی نہیں لیکن تغزل سے کبھی کبھی ہٹ جاتا ہے۔ یہاں تک کہ جب وہ اس سے ہٹ کر فلسفہ طرازی سے کام لیتا ہے تو بالکل چوبِ خشک ہو جاتا ہے، لیکن مومن کا لوچ وہی رہتا ہے۔ زندگی اور غم دونوں کا لازم ملزوم ہونا غالب نے اس طرح بیان کیا ہے :-

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

بالکل حدیقۂ حکیم سنائی یا پند نامۂ عطار کی چیز معلوم ہوتی ہے۔ لیکن مومن اس خیال کو اس طرح ظاہر کرتا ہے :-

چھٹ کر کہاں اسیرِ محبت کی زندگی
ناصح یہ بندِ غم نہیں، قیدِ حیات ہے

مفہوم و طرزِ ادا دونوں میں غالب سے بڑھ گیا
مگر شاعرانہ میں تو خیر مومن کا کوئی ہمسر پیدا ہی نہیں ہوا۔ یہ رنگ اسی کی ایجاد تھا اور اسی پر ختم ہو گیا۔
غالب کے یہاں بھی اس کی بعض مثالیں مل جاتی ہیں، لیکن مومن کے تیور کچھ اور ہی ہیں۔ غالب کا مشہور شعر ہے:-

بہراہوں میں تو چاہیئے دونا ہو التفات
سنتا نہیں ہوں بات مکرر کہے بغیر

یہ مکر شاعرانہ ہے، لیکن مومن نے اس سلسلہ میں عجیب شاعرانہ نزاکتیں پیدا کی ہیں، کہتا ہے:-

ہے دوستی تو جانب دشمن نہ دیکھنا ۔ جادو بھرا ہوا ہے تمہاری نگاہ میں

مومن چاہتے ہیں کہ معشوق دشمن کی طرف نہ دیکھا کرے، لیکن ظاہر ہے کہ وہ کیوں ماننے لگا اس لئے مومن نے یہ بہانہ پیدا کیا۔ اسی رنگ کے دو شعر اور سنئے:-

خواہش مرگ ہوتی نہ ستاتا ورنہ ۔ دل میں پھر تیرے سوا اور بھی ارماں ہوگا
درباں کو آنے دیجئے پہرے نہ کیجئے قتل ۔ ورنہ کہیں گے سب کہ یہ کوچہ حرم نہ تھا

مومن کی حقیقی شاعری کا جوہر طنزیات میں کھلتا ہے، یا پھر جلی کٹی میں
طنزیات کے بعض شعر ملاحظہ ہوں:-

ہم بھی کچھ خوش نہیں وفا کر کے ۔ تم نے اچھا کیا نباہ نہ کی
رشک دشمن بہانہ تھا، سچ ہے ۔ میں نے ہی تم سے بیوفائی کی

دوسرے رنگ کے لئے اس کی چھوٹی زمینیں دیکھئے:-

اب اور سے لو لگائیں گے ہم ۔ جوں شمع تجھے جلائیں گے ہم
سر دوش عدو پہ رکھ کے بیٹھے ۔ جانا نہ کہ سر اٹھائیں گے ہم
گر تیری طرف کو بیقراری ۔ کھینچے گی تو لوٹ جائیں گے ہم
بتخانہ ہیں ہو کر ترا گھر ۔ مومن ہیں تو پھر نہ آئیں گے ہم

سیاسیات یورپ

(۱۰)

انگلستان

برطانیہ کا نظام حکومت اسقدر عجیب و غریب ہے کہ نہ اس کی کوئی دوسری مثال تاریخ میں ملتی ہے، نہ اسکی نوعیت کے لحاظ سے اس کا کوئی خاص نام رکھا جا سکتا ہے، وہ بیک وقت ملوکیت بھی ہے، حکومت اعیان ([illegible]) بھی اور آزاد ڈماکریسی بھی۔ اس کو سمجھنے کے لئے وہاں کی تقسیم دولت پر ایک نگاہ ڈالنا ضروری ہے۔

انگلستان میں صاحب ملکیت جماعت صرف دو فی صدی ہے لیکن قومی دولت کا ۶۴ فی صدی حصہ انکے پاس ہے، یہی جماعت فی الحقیقت یہاں کی حکمراں جماعت ہے، جو دنیا کے تمام بازاروں پر قابض ہے اور دارالعوام و دارالخواص کو اپنا کلب جانتی ہے۔

ان کی حکومت کی بنیاد تین قوتوں پر قایم ہے، بحری اقتدار، بینک آف انگلینڈ اور سول سروس۔ اور قومی آمدنی کے بڑے حصہ پر انھیں کو اختیار حاصل ہے۔ وہاں کی غیر متوازن تقسیم دولت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ویسٹ اینڈ کا صرف ایک امیر ۲۷۰ ایکڑ زمین کا مالک ہے۔

لندن کی ۸۰ لاکھ آبادی میں صرف ۴۰ لاکھ افراد ایسے ہیں جو صاحب ملکیت ہیں اور ان میں بھی صرف ۲۰ ایسے ہیں جو واقعی قیمتی زمین کے مالک ہیں۔ انگلستان میں ایک لاکھ مرد عورت ایسے ہیں جن کی آمدنی دو ہزار پونڈ سالانہ سے زیادہ ہے اور قومی دولت ۱۶ فی صدی ان کے قبضہ میں ہے اور ایک کرور اسی لاکھ ایسے ہیں جن کی آمدنی ۲۵۰ پونڈ سالانہ سے کم ہے اور ۶ ۵ فی صدی قومی دولت ان کے قبضہ میں ہے۔ انگلستان میں جو لوگ مرتے ہیں انھیں صرف چوتھائی ایسے ہوتے ہیں جو سو پونڈ کی ملکیت اپنے بعد چھوڑ جاتے ہوں۔

دارالعوام میں سرمایہ داری کی بڑی زبردست مرکزیت پائی جاتی ہے۔ ۱۹۲۳ء میں دارالعوام کے ۱۷۰ ممبر ۵۶۰ کمپنیوں کے ڈائرکٹر تھے اور ایک ممبر پارلیمنٹ تو ۴۳ کمپنیوں کا ڈائرکٹر تھا۔ دارالامراء (ہاؤس آف لارڈز) میں ۲۷۹ امراء ہیں جن میں ۲۴۶ بڑے زمیندار ہیں، ۱۱۲ بیمہ کمپنیوں کے ڈائرکٹر ہیں، ۴۷، صرافہ کے کاروبار کے ڈائرکٹر ہیں، ۶۷، بنکوں کے ڈائرکٹر ہیں، ۶۴، ریلوے کمپنیوں کے اور ۴۹، جہاز بنانے والی کمپنیوں کے۔ اس سے زیادہ دلچسپ بات یہ ہے کہ منجملہ ۲۷۹ امراء کے نصف سے زیادہ ایسے ہیں، جنھوں نے ۱۹۱۹ء سے ۱۹۳۱ء تک کسی مباحثہ میں حصہ نہیں لیا اور ۱۱۱ نے کسی اخلاقی مسئلہ میں کوئی رائے نہیں دی۔ اسی طرح گویا اوسطاً صرف ۸۳ امراء نے کام میں حصہ لیا۔

انگریزی قوم ہر چند بہت سی قوموں کا مجموعہ ہے لیکن انگلستان کی جائے وقوع اور اس کی جغرافی خصوصیت نے سب کا نقطۂ نظر ایک ہی کر دیا ہے۔ ایک جزیرہ کا باشندہ ہونے کی حیثیت سے ان میں بہت پیش بینی پیدا ہوگئی ہے اور وطنیت کا جذبہ قوی ہوگیا ہے۔

انگلستان اپنی پیداوار کے لحاظ سے زیادہ خوش قسمت نہیں ہے، وہ اپنی غذائی ضرورتوں کا صرف ۲/۵ حصہ پیدا کر سکتا ہے اور خام پیداوار جس پر اسکی صنعت و حرفت قایم ہے وہاں صرف ۲۰ فی صدی ہوتی ہے۔ لوہا، کوئلہ، اور فولاد البتہ وہاں بہت کافی پیدا ہوتا ہے، اسی لئے وہ یورپ بھر میں سب سے بڑا صنعتی ملک مانا جاتا ہے اور اس کی تجارت ۴۰ فی صدی برآمد کی تجارت ہے۔

وہاں کی حکمراں جماعت سب کی سب تجارت کرتی ہے اور اسی سے دولت کماتی ہے۔ انگریزی قوم تجارت کا اتنا زبردست احساس رکھتی ہے کہ کمائی کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتی۔ یہاں تک کہ شاہی جواہرات سے بھی کچھ نہ کچھ فایدہ اُٹھا لیا جاتا ہے اور وہ یہ کہ اُن کے دیکھنے کے لئے بھی چھ پنس ادا کرنے پڑتے ہیں۔ مشہور ہے کہ ایک انگریز ہفتہ میں چھ دن بنک انگلستان کی پوجا کرتا ہے اور صرف ایک دن گرجا کی اور یہ بھی اس لئے کہ وہاں مذہب کی قوت بڑی حد تک ہنوز باقی ہے۔

وہاں آزادی کا احساس بھی بڑا قوی ہے اور آزادی حاصل کرنے کے لئے انھوں نے فرانسیسیوں کی طرح بڑی قیمت ادا کی ہے، یہاں تک کہ متعدد بادشاہوں کی گردنیں محض آزادی کے لئے کاٹ ڈالی گئیں۔

وسٹ منسٹر کا پارلیمنٹری نظام اتنا عجیب و غریب ہے کہ ہر قوم اس پر رشک کرتی ہے اور بجا رشک کرتی ہے، ڈکٹیٹر شپ میں شخص واحد خادم قوم کی حیثیت رکھتا ہے اور ڈیماکریٹک حکومتوں میں حکومت، افراد کی خدمت کرتی ہے، اس حقیقت کو کوئی انگریز کبھی نہیں بھولتا اور ایک کھیل کی طرح اس پر عامل ہے۔ جس وقت انتخاب کی منزل ختم ہو جاتی ہے تو دونوں مخالف اس طرح ایک دوسرے سے ہاتھ ملاتے ہیں، گویا یہ کوئی ٹینس کا کھیل تھا۔ جب مسٹر بالڈون پہلی مرتبہ وزیر اعظم ہوئے تو سب سے پہلے انھوں نے لارڈ آکسفورڈ ہی سے مشورہ طلب کیا جو انتخاب میں ان کے نہایت شدید

مخالف فریق تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ انگریز قوم انگلستان کے مسئلہ کو جماعتی سیاسیات سے بالکل علحدہ ہوکر دیکھتی ہے۔ جس وقت لارڈ کرزن کا انتقال ہوا (جو سخت ٹوری تھا) تو لیبر پارٹی کے ممبروں نے دارالعوام میں اس کی بہت تعریف کی ۱۹۲۶ء میں جب ویلس کے اندر عام اسٹرائیک ہوا ہے تو پولیس اور اسٹرائیک کرنے والے دونوں فٹ بال ساتھ ساتھ کھیلتے تھے۔

حکومت و وطن کے ساتھ وفاداری وہاں بڑے سے بڑے اور چھوٹے سے چھوٹے آدمی میں پائی جاتی ہے۔ باہر کے لوگ جو وہاں جاتے ہیں انھیں یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ وہ ملک انقلاب سے کیونکر بچا ہوا ہے جہاں اتنی غیر متوازن تقسیم دولت کی پائی جاتی ہے اس وقت انگلستان میں ۲۰ لاکھ آدمی بیکار ہیں جن میں نصف ایسے ہیں جو کسی کام کے قابل نہیں ہیں لیکن حیرت کی بات ہے کہ جب رائے دینے کا وقت آتا ہے تو ان بیکار غریبوں کی جماعت کنسرویٹو ممبری کے حق میں رائے دیتی ہے۔ اس کا ایک سبب تو یہ ہے کہ متوسط طبقہ لیبر جماعت کی اہلیت کی طرف سے مطمئن نہیں ہو اور دوسرے یہ کہ حکومت ان فاقہ کش غریبوں پر ۲۰ لاکھ پونڈ ہر ہفتہ صرف کرکے اُن میں بے چینی پیدا نہیں ہونے دیتی۔

حکمراں جماعت کے دست و بازو وہاں کئی ہیں۔ ایک تو بحری طاقت ہے جو بجائے خود ایک قانون کی حیثیت رکھتی ہے، دوسرے بنک جو نہایت ہی عجیب و غریب ادارہ ہے اور تیسرے وہاں کے سرکاری مدارس۔ کابینہ کے ۵۵ ممبروں میں کم از کم سولہ تو اٹون کے مشہور مدرسہ کے طالب علم ہوتے ہیں، چھ ہیرو اسکول کے اور سترہ دوسرے مدارس کے۔ یہ لوگ اس کا بڑا لحاظ رکھتے ہیں کہ ان کا اسکول کسی طرح بدنام نہ ہو، چنانچہ مسٹر بالڈون نے لکھا ہے کہ جب ترتیب وزارت کی دعوت انھیں دی گئی تو انھوں نے پوری کوشش کی کہ مدرسۂ ہیرو (جہاں وہ طالب علم تھے) بدنام نہ ہو۔

اخباروں کا بھی وہاں بہت اثر ہے اور اس لئے حکمراں جماعت ہمیشہ ان کو بھی زیر اقتدار رکھتی ہے لیکن سول سروس کا نظام سب سے زیادہ عجیب و غریب ہے اور حقیقتاً یہی ریڑھ کی ہڈی سمجھی جاتی ہے۔

اس ملک کا طریق پروپاگنڈا بھی نہایت عجیب ہے۔ احتساب سے وہ بھی کام لیتے ہیں لیکن زیادہ تر جاسوسی کے ذریعہ سے۔ حبشہ کی جنگ کے وقت بحر روم میں برطانوی بیڑہ کی قوت سے ہر اخبار واقف تھا، لیکن مخالف جماعت کے اخباروں نے بھی اس کا ذکر نہیں کیا۔ انتخاب کے وقت وہاں اتنا سخت ناجائز سیاسی دباؤ ڈالا جاتا ہے کہ اگر یہی صورت ترکی یا بلغاریہ میں پیش آئے تو آزاد خیال اخباروں میں ہلچل پڑ جائے۔

برطانیہ کی خارجہ پالیسی جو نسلاً بعد نسلٍ ایک ہی سی چلی آرہی ہے، صرف یہ ہے کہ مغربی سلطنتوں کی قوت متوازن رہے اور توازن کا قیام انگلستان کے ہاتھ میں ہو۔

سر آسٹن چمبرلین نے ایک بار ظاہر کیا تھا کہ "ہماری بڑی بڑی لڑائیاں صرف اس لئے لڑی گئی تھیں کہ کسی

ایک حکومت کا اقتدار دوسری مغربی حکومتوں پر قایم نہ ہوجائے"۔ ٹریولیان کا بیان ہے کہ "ٹیوڈروں کے زمانہ سے اسوقت تک انگلستان نے سیاسیاتِ یورپ سے صرف یہ کام لیا کہ وہ خود حملوں سے محفوظ رہے اور جو تدبیریں سمندر پار کے ممالک کے قبضہ کے لئے اختیار کی جاتی ہیں وہ بیطانہ پڑیں"

اسی پالیسی کے تحت انگلستان کا موجودہ طرزِ عمل یہ ہے کہ اگر فرانس کسی وقت جرمنی سے زیادہ مضبوط ہوجائے تو جرمنی کی مدد کرے اور اگر کبھی جرمنی فرانس سے بڑھ جائے تو فرانس کی مدد کرے۔ چنانچہ جنگ عظیم کے بعد سے لیگ اقوام اسی پالیسی کی تکمیل کا ذریعہ بنی ہوئی ہے اور اگر کسی وقت لیگ اس مقصد کی تکمیل میں ناکام ہوئی تو برطانیہ اس کو ختم کردے گا لیکن چونکہ برطانیہ نے اپنے دیگر مقبوضات (ہندوستان وغیرہ) کو بھی اس میں علحدہ مستقل حکومتوں کی طرح شامل کرلیا ہے اس لئے لیگ پر ہمیشہ انگلستان کا اقتدار قایم رہیگا۔

جنگ سے قبل برطانیہ کی پالیسی یہ نہ تھی کہ وہ یورپ کے آیندہ امکانی خطرات کو پیش نظر رکھکر، اپنی قوم کو کسی مخصوص طرزِ عمل پر مجبور کرے، لیکن اب انگلستان یورپ کے آیندہ خطرات کا پہلے ہی سے بندوبست چاہتا ہے تاکہ امن وسکون کی تباہی سے اس کی تجارت متاثر نہ ہو۔ تاہم انگلستان اپنی خارجہ پالیسی کو بالکل کھیل ہی سمجھتا ہے، اہل جرمن و فرانس کے لئے تو سیاسیات موت و زندگی کی چیز ہے، لیکن انگلستان سمجھتا ہے کہ یورپ ایک اسٹیج ہے جس پر ہر ایکٹر اپنا کام کررہا ہے اور اگر کسی سے کوئی غلطی ہوجائے تو سمجھنا چاہئے کہ یہ صرف اہرسل تھا اور دوبارہ کوشش کرکے اس غلطی کو دور کرنا چاہئے۔

انگلستان کے دفترِ خارجہ میں دو گروہ ہیں۔ ایک وہ جو لیگ اقوام کا طرفدار ہے اور یورپ میں قیام امن و سکون کے خیال سے ایک متحدہ ذمہ داری پیدا کرنے کے لئے جرمنی کو بھی دول عظمی کی صف میں شامل کرنا چاہتا ہے یہ گروہ لڑائی کے نام سے کانپ اٹھتا ہے اور حبشہ کی جنگ کو اس نے اخلاقی قانون کی خلاف ورزی سمجھا۔ دوسرا گروہ جس میں ذرا معمر آدمی شامل ہیں، وہ ان تمام جھگڑوں سے علحدہ ہوکر صرف یہ چاہتا ہے کہ بحری قوت کو بڑھایا جائے اور خواہ مخواہ دوسروں کے معاملات میں دخل نہ دیا جائے۔ چنانچہ اس جماعت کی یہی پالیسی تھی جس نے جرمنی کو اتنے ہاتھ پاؤں پھیلانے کا موقعہ دیا۔

اس میں شک نہیں کہ ہٹلر کی آمریت کے بعد بھی انگلستان میں جرمنی کی طرفداری کا جذبہ بہت قوی پایا جاتا ہے۔ اور اس کے متعدد اسباب ہیں۔

۱۔ انگلستان کی ٹوری جماعت، بالشیوزم سے بہت خائف ہے اور اپنی حماقت سے اس نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ ہٹلر اس امر کی گارنٹی ہے کہ یہ تحریک مغرب کی طرف نہ بڑھے گی۔ اس لئے انگلستان اور جرمنی کو متحد رہنا چاہئے۔

۲۔ انگلستان اور خصوصیت کے ساتھ لندن والوں کا بہت سا روپیہ جرمن کاروبار میں لگا ہوا ہے، اسلئے اس سے

لڑائی مول لینا ایک بڑے سرمایہ کو خطرہ میں ڈالنا ہے۔

۳- انگلستان کے بہت سے صاحب اقتدار ایسے ہیں جو فرانس اور فرانسیسیوں سے نفرت کرتے ہیں اور اسلئے وہ قدرتاً جرمنی کی طرف مایل ہیں۔

۴- لارڈ لوتھیں اور ان کے حوائیین کا خیال ہے کہ یورپ میں امن و سکون صرف اسی طرح قایم رہسکتا ہے کہ جرمنی مضبوط رہے اور ہٹلر کا ساتھ دینا گویا جرمنی کو مضبوط بنانا ہے۔

۵- وہاں کے اخبارات ہر چند نازی تحریک کو پسند نہیں کرتے لیکن بالشویت یا اشتراکیت کو اس سے بھی برا جانتے ہیں اور اس لئے وہ روس کے مقابلہ میں ہٹلر کی طرفداری کو پسند کرتے ہیں۔

۶- انگلستان میں عام میلان لوگوں کا یہی ہے کہ گو جرمن مغلوب دشمن ہے لیکن ہے قابل عزت۔

۷- لیبر پارٹی میں بھی جماعتیں جرمن کی طرفدار ہیں۔

اس لئے اگر کسی وقت جرمن کے خلاف یورپ میں جنگ چھڑی تو یہ تمام اثرات ضرور اپنا کام کرینگے اور چونکہ ہٹلر یہ سمجھتا ہے کہ انگلستان کا نیوٹرل رہنا ناممکن نہیں ہے اس لئے اس کی ہمتیں بہت بڑھ گئی ہیں۔

جرمنی کے ساتھ انگلستان کی پالیسی کا رُخ ۱۹۳۵ء کے بحری معاہدہ سے ظاہر ہو جاتا ہے جس کی رو سے اگر جرمن اپنی فوجی طاقت بڑھا سکتا ہے تو دوسری طرف برطانیہ بھی اپنی ہوائی طاقت کو سہ چند کر سکتا ہے اور تجارت میں جرمن مسابقت کی طرف سے مطمئن ہو جاتا ہے۔

۱۹۱۴ء میں برطانیہ نے جرمنی کے خلاف محض فرانس یا بلجیم کی ہمدردی میں جنگ نہیں کی تھی، بلکہ سبب یہ تھا کہ دنیا کے بازاروں میں جرمنی نے انگلستان کو پیچھے ڈھکیل دیا تھا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا تھا کہ انگلستان کی تجارتی کساد بازاری بڑھ گئی تھی اور بیکاروں کی تعداد میں بہت اضافہ ہو گیا تھا۔ اب یہی اندیشہ جاپان کی طرف سے پیدا ہو گیا ہے، لیکن انگلستان اس سے براہ راست جنگ نہیں کرنا چاہتا، اس لئے چاہتا ہے کہ جرمنی کو مضبوط کر دیا جائے تاکہ جاپان اس کے ساتھ ملکر روس پر حملہ کرے اور اس طرح آخر کار یہ تینوں قوتیں کمزور ہو جائیں۔

اس میں شک نہیں کہ انگلستان بڑی حد تک جرمن کا طرفدار ہے، لیکن وہ جرمن کے خلاف اپنے آپ کو پوری طرح مسلح کرنے سے بھی غافل نہیں ہے، کیونکہ اسے اگر کسی کی طرف سے اندیشہ ہے تو وہ جرمنی ہی ہے، اسلئے برطانیہ کی خارجہ پالیسی کا صحیح علم اسوقت تک نہیں ہو سکتا جب تک اس کے مسلح ہونے کا زبردست پروگرام پورا نہیں ہو جاتا اب تو وہاں بحری قوت بڑھائی جا رہی ہے، ہوائی طاقت پر بیدریغ دولت صرف ہو رہی ہے، ہلاکت بار آلاتِ حرب پر آنکھ بند کر کے روپیہ خرچ کیا جا رہا ہے اور جب یہ سب کچھ ہو چکے گا تو معلوم ہو گا کہ انگلستان کا صحیح ارادہ کیا ہے اور وہ یورپ میں کس کو باقی رکھنا چاہتا ہے اور کس کو پامال کر دینا۔

آمرِ جرمنی کی داستانِ عشق

یورپ کی موجودہ فضائے سیاست جن روشن اور تابناک ستاروں سے مزین ہے اس میں جرمنی کے آمرِ اعظم اڈالف ہر ہٹلر کی ذات خصوصیت کے ساتھ نمایاں ہے اس کی سیاسی فراست نے اس کے نام کو "روم برلن محور" سے ہمیشہ کے لئے وابستہ کر دیا ہے جس کے زور پر اس نے دنیا کو ورطۂ حیرت میں ڈالکر رائن، اسٹریا اور زیکوسلوویکیا کے ایک حصہ کو اپنے قبضہ میں کر لیا۔ یہ ہٹلر کی شدید خود اعتمادی کی دلیل ہے کہ اس نے لوکارنو اور ورسیلز کے عہد ناموں کو پس پشت ڈالکر برطانیہ اور فرانس کے ہاتھوں سے وہ اقتدار چھین لیا جس کے دینے کے لئے وہ خوشی سے آمادہ نہ تھے اس طرح ان دو جمہوری طاقتوں کا اثر زائل کرنے اور یوروپ کے توازنِ ملکی کے برباد کرنے میں ہٹلر نے بڑی مدد دی ہے۔ اب یہ دوسری بات ہے کہ اس نے یہ جو کچھ حاصل کیا وہ اخلاقی اُصولوں کی قربانی کرکے حاصل کیا لیکن نازیت اور فسطائیت اخلاقی اُصولوں سے یکسر مبرّا ہیں، اُن کی کتاب سیاست میں ایفائے وعدہ سے زیادہ عہد شکنی میں اخلاقی شان مضمر ہے، وہاں طریقۂ کار کے بجائے نتیجہ سے بحث ہوتی ہے اور آغاز سے زیادہ انجام پر زور دیا جاتا ہے یہ سب باتیں اپنی جگہ صحیح و درست سہی لیکن اس حقیقت سے بھی مشکل سے انکار کیا جا سکتا ہے کہ ہٹلر نے جرمنی میں ایک حیات آفریں صور پھونک دیا ہے اس کے بچہ بچہ میں نئی روح اور نئی زندگی پیدا کر دی ہے۔ اب جرمنی ایک حقیقت ہے ایک صداقت ہے، اس کے معاشی و فوجی وسایل اور ذرایع بہت وسیع ہو گئے ہیں، اس کی ہوائی طاقت انگلستان و فرانس کی متحدہ طاقت سے کہیں زیادہ بہتر ہے اور یہ سب کچھ ایک شخص۔ یعنی ہر ہٹلر کی کوششوں کا نتیجہ ہے

ہٹلر اپنے عادات و خصائل کے لحاظ سے اتنا "سنگین" اور "آہنی" قسم کا انسان معلوم ہوتا ہے کہ بظاہر اسکے اوپر خدنگِ عشق کا کوئی اثر ہو ہی نہیں سکتا اور ہمارے ذہن میں اس کے کسی سے محبت کرنے کا مفہوم آتا ہی نہیں، لیکن حسن و عشق کی دار و گیر عام ہے اور محبت کی جنوں زائیاں کسی خاص شخص، نوع، مقام اور وقت کے لئے مختص نہیں۔ محبت کے دیوتا نے "لوہے کے انسانوں" اور شاہانِ جم مرتبت سبھی کو جب چاہا ہے، نوازا ہے، دردِ محبت کی تقسیم میں خدائے عشق نے فقیر و امیر کی تخصیص قطعاً نہیں کی ہے، ہٹلر نے بھی نپولین کی طرح عشق

میں کافی شدت والتہاب کا ثبوت دیا ہے، اس کے بعض افسانہائے محبت اسی وجہ سے اپنے اندر کافی جاذبیت رکھتے ہیں، لیکن اس کی فتادگی نے اس کے سپاہیانہ جذبات کو کبھی ماند نہیں ہونے دیا ہے۔

بڑے لوگوں کی بڑی باتیں ہوتی ہیں، معمولی لوگوں کے کانوں تک اُن کی بھنک بھی نہیں پہونچتی، ڈیوک آف ونڈسر سابق ایڈورڈ ہشتم کی محبت کا ذکر انگلستان کے اخبارات میں بہت کم آیا، امریکن اخبارات البتہ اسکے اوپر ہنگامہ مچاتے رہے لیکن یہ تمام قصہ انگلستان کی پبلک کے سامنے کماحقہ اُسوقت آیا جبکہ وہ اپنی تمام نیاز مندیاں "ناز" کی خدمت میں پیش کر چکے تھے اور ایک ہستی کی خاطر تاج وتخت کو پائے استحقار سے ٹھکرا چکے تھے، آمرین یورپ کی "پس پردہ" زندگی کا بھی ہمیں بہت تھوڑا علم ہے خصوصاً جرمنی کے مقابلہ میں ہماری "بے علمی" بڑی قابل رحم ہے، ہمیں جو کچھ وہاں کے حالات معلوم ہوئے ہیں وہ یا تو اُن خبروں کے ذریعہ جو جرمنی سے تار کے ذریعہ دوسرے ملکوں میں بھیجی جاتی ہیں یا پھر ہٹلر کی سوانحعمری کے ذریعہ، یا اُن سیاحوں کے ذریعہ جو تفریح کے طور پر یا وہاں کے حالات کا مطالعہ کرنے کے لئے جاتے ہیں، یہ خبریں عام طور پر گپ اور پروپیگنڈے کی حیثیت رکھتی ہیں اور حقایق تک پہونچنے کے لئے بڑی چھان بین کی ضرورت ہوتی ہے، لیکن کچھ نامہ نگاروں نے اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر ان آمرین یورپ کے اندرونی حالات کی نقاب کشائی کی ہے، ان لوگوں میں فرڈمان جو ایک امریکن ہے اور جین جو فرانسیسی ہے خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں لیکن ہٹلر کے نجی معاملات کی پردہ کشائی جس نامہ نگار نے کی ہے وہ ایک عورت ہے اور وہ شہزادی کیتھرائن ریڈزی ول (Princess Catherine Radziwill.) کے نام سے مشہور ہے اس نے جو کچھ معلومات حاصل کی ہے وہ جرمنی اور آسٹریا کی اُن عورتوں سے حاصل کی ہے جو وہاں کی سوسائٹی میں بڑی مقتدر اور با اثر ہیں۔

ہٹلر کی سوانح عمری (Mein Kemp) عورتوں کے ذکر سے یکسر خالی ہے اس میں گویا عورتوں کے وجود ہی کو قطعاً تسلیم نہیں کیا گیا، لیکن بہت سی مثالیں اس کی شاہد ہیں اور بہت سے مواقع ایسے آئے ہیں کہ جب ہٹلر اس نتیجہ پر پہونچنے پہ مجبور ہوا ہے کہ عورت کائنات کی غیر ضروری تخلیق نہیں ہے اور اگر اسے دنیا سے علحدہ کر دیا جائے تو یہ کائنات عالم یکسر ویران و سنسان نظر آنے لگے۔

ہٹلر نے بہت سی محبتیں کی ہیں، شروع زمانہ میں جو لڑکی اس کے دل و دماغ پر مسلط رہی ہے وہ اسکی بھانجی "گریٹ رابل" (Grete Raubal) تھی، وہ شمالی آسٹریا کے دیہاتی علاقہ کی رہنے والی تھی، ہٹلر اسی زمانہ میں "بطل میونک" (Munich) سمجھا جاتا تھا اسی وجہ گریٹ بھی اس سے بہت محبت کرتی تھی اور اس کے حضور میں سراپا عبودیت بنی ہوئی تھی، ہٹلر کو بھی اس سے بیحد محبت تھی لیکن اس کی وجہ سے وہ کبھی اپنے معمولات میں فرق نہیں ڈالتا تھا، وہ اسے فرطِ محبت سے گیلی کہتا اور گریٹ اسے

"چچا اُلف" کہتی تھی، ہٹلر کو جب کبھی انتظامی اور جنگی مصروفیتوں سے مہلت ملتی وہ اپنا وقت گیلی کے پاس صرف کرتا
اس نے اپنی ایسی بہت سی فرصتیں جب آسمان پر "ملکۂ عرش" بے نقاب ہوتی، تارے شبگیر ہوتے، چڑیاں زمزمہ
صبحگاہی چھیڑتی ہوتیں اور موجیں اپنا ساز درست کرتی ہوتیں، اپنی محبوبہ گیلی کے ساتھ گزاریں دنیا نے ان سب
باتوں کو دیکھا، لوگوں میں چہ میگوئیاں ہوئیں لیکن ہٹلر کے آگے کون دم مار سکتا تھا، وہ اب نازیوں کا "انسان اعظم" تھا
اسے اس بات سے بعید کوفت ہوئی کہ کوئی اس کی نجی زندگی سے کیوں واسطہ رکھے، یہ کسی کو نہیں معلوم کہ اس نے اس
برہمی کا اظہار "گریٹ رابل" پر بھی کیا یا نہیں لیکن ہاں اتنا معلوم ہے کہ ۱۹۳۱ء کی ایک صبح کو گیلی نے خودکشی کرلی!

اس واقعہ کے بعد سے ہٹلر کے مزاج میں سختی پیدا ہوتی گئی، ایکتھرائن نے لکھا ہے کہ گیلی کی خودکشی انکے مزاج کی
"آہنیت" کی بڑی حد تک ذمہ وار ہے۔ اس کے بعد سے اس کے لب ولہجہ کا کھرا پن اور اسکی طبیعت کی درشتگی بڑھ گئی لیکن
ہٹلر نے گیلی کی موت کو بری طرح محسوس کیا اس کا ثبوت یہ ہے کہ اس نے جرمنی کے سب سے بڑے نقاش "زیگ لر" کو
حکم دیا کہ وہ گیلی کی ایسی تصویر بنا دے جو اس کے نام کو بقائے دوام بخش دے جب وہ تصویر بن کر آئی تو ہٹلر اسکے سامنے
انتہائی عجز و نیاز کے ساتھ بے اختیارانہ جھک گیا اور جب اُٹھا تو اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گر رہے تھے۔

کچھ عرصہ کے بعد ہٹلر کو ایک سینما اسٹار رے نیٹ ملر (Renate Müller) سے محبت ہوگئی، جنرل گوئرنگ
نے ایک دعوت کی جس میں ہٹلر کی رے نیٹ سے ملاقات ہوئی جب دعوت ختم ہونے والی تھی اُسوقت گوئرنگ ہٹلر کو رے نیٹ
کے ساتھ تنہا چھوڑ کر کمرہ سے باہر چلا گیا، معلوم نہیں دونوں میں کیا گفتگو ہوئی اور کن معاملات پر بحث ہوئی لیکن کچھ دنوں
کے بعد اتنا ضرور سننے میں آیا کہ رے نیٹ ایک یہودی سے بڑی شدومد سے محبت کر رہی ہے اور یہ بات ہٹلر اور گوئرنگ دونوں
کو سخت ناگوار ہے ـــ گوئرنگ اور اس کے دوستوں نے رے نیٹ کو سمجھایا کہ وہ ایک یہودی سے محبت کرکے بڑی سخت غلطی کا
ارتکاب کر رہی ہے انھوں نے اُسے یہ بھی بتلایا کہ یہ صورت خطرہ سے خالی نہیں، رے نیٹ یہ دیکھکر جرمنی سے باہر چلی گئی اور
اُس یہودی سے شادی کرلی لیکن اسے جرمنی واپس آنے پر مجبور کیا گیا اور اس پر زور دیا گیا کہ وہ اپنے فلم کے ٹھیکے پورے کرے
ورنہ اسے سزا دیجائے گی، جرمنی میں وہ بالکل "اشک دادخواہ" تھی سراپا مظلومیت کی تمثیل، آخر اس نے ان زیادتیوں
سے تنگ آکر خودکشی کا ارادہ کیا اور ۵۰ فٹ کی بلندی سے کود پڑی لیکن عجیب اتفاق تھا کہ وہ مری نہیں، ڈاکٹروں کو
اس کی زندگی کی پوری امید تھی لیکن وہ خود اپنی زندگی سے بیزار ہوچکی تھی، اب وہ زندہ رہتی بھی تو اس کے لئے بیکار تھا،
آخر ایک دن اخباروں نے اعلان کردیا کہ رے نیٹ اس دنیا سے رخصت ہوگئی، اسوقت تیسری ریش (Reich)
برسر اقتدار تھی ـــ ہٹلر نے اسکے بعد ایک اور لڑکی سے محبت کی اس نے بھی گریٹ اور رے نیٹ کی طرح تاریخی اہمیت حاصل
کرلی ہے ـــ اسکی تیسری محبوبہ کا نام "لینی رفنستال" (Leni Riefenstall) ہے اور وہ
ایک یہودی لڑکی ہے!! ـــ وہ بویریا کی رہنے والی نہایت حسین وجمیل لڑکی ہے اور اس وقت جرمنی کی ممتاز ترین

ایکٹریسوں میں شمار کی جاتی ہے، اسی یہودی لڑکی اور آمرِ جرمنی میں نہایت شدید محبت ہے، ہٹلر اپنی خستگی دور کرنے کے لئے لینی ([illegible]) ہی کے نرم و نازک ہاتھ کا متمنی رہتا ہے — ہٹلر اور ایک یہودی لڑکی سے محبت کرے! یہ بات کچھ سمجھ میں نہیں آتی۔ دنیا کو اس محبت پر حیرت ہے، وہ یہودیوں کے خون کا پیاسا ہے لیکن اسی مطعون قوم کے ایک فرد کے لئے وہ بیتاب ہے، یہ بات عام لوگوں کے لئے شدید استعجاب کا باعث ہے لیکن عشق و محبت کی دنیا میں سیاسی اور نسلی تعصبات حائل نہیں ہوتے — ایک مرتبہ گوئرنگ نے ہٹلر کو اس حرکت پر بہت ملامت کی، "آپ بہت ہی ناعاقبت اندیشی سے کام لے رہے ہیں۔ اس یہودی لڑکی کو چھوڑ دیجئے، تمام سلطنت میں اس کی وجہ سے چہ میگوئیاں ہو رہی ہیں" لیکن ہٹلر نے نہایت سختی کے ساتھ جواب دیا "گوئرنگ! میرے نجی معاملات تم سے کوئی سروکار نہیں رکھتے، اگر تم انہیں دخل دوگے تو بڑی گستاخی کروگے۔ اس بات کو ہمیشہ کیلئے گرہ میں باندھ لو"۔ گوئرنگ نے اسکے بعد دوسری ترکیب سوچی، اس نے لینی کو دھمکایا کہ وہ ہٹلر کا پیچھا چھوڑ دے اور اس کی محبت سے باز آجائے ورنہ اسکی زندگی کو ختم کر دیا جائے گا،

ہٹلر کی محبوبہ بھلا کب دبنے والی تھی اس نے صاف صاف کہدیا کہ "گوئرنگ! تم یہ خبط اپنے دماغ سے نکال دو، تمہارا اسی میں بہتری ہے تم فوراً یہاں سے چلے جاؤ"۔ لینی نے اسی وقت ٹیلیفون کیا اور کہا کہ ہٹلر فوراً یہاں آؤ، مجھے بڑا ضروری کام ہے — ہاں، اور وہ کام تمہارے لئے بھی ضروری ہے"۔ ہٹلر نے فوراً تعمیل کی، لینی ([illegible]) اس کو دیکھتے ہی اسکی آغوش میں گر پڑی اور رونے لگی، اس نے آمرِ جرمنی کو ان تمام خطرات سے آگاہ کیا جو اس کی اور ہٹلر کی جان کے لئے پیدا ہو رہے تھے، ہٹلر نے اپنی بھاری آواز میں اس کو تسکین دیتے ہوئے کہا "لینی! مت گھبراؤ، مجھے اور تمھیں سوائے موت کے اور کوئی چیز علیحدہ نہیں کر سکتی"۔ ہٹلر کی یہ محبت جاری ہے اور اس کی یہود دشمنی بھی اسی طرح برقرار ہے اس محبت کا انجام کسی کو نہیں معلوم اگرچہ سب لوگوں کو اس کا انتظار ہے، ممکن ہے یہ محبت کچھ تاریخی امکانات اپنے اندر پوشیدہ رکھتی ہو اور یہودیوں کے ساتھ وہ جانوروں کا سا سلوک، جو جرمنی کی سرزمین پر روا رکھا جا رہا ہے، کچھ کم ہو جائے لیکن کوئی بات یقین کے ساتھ نہیں کہی جا سکتی — اس لئے کہ ابھی چودہ ہزار یہودی محض ایک سرواں راتھ کے قتل کے جرم میں گرفتار کئے گئے ہیں ان کے تمام مدارس، معابد، اخبارات، رقص گاہیں تھیٹر اور سینما بند کر دئے گئے ہیں اور ان کے اوپر جیسا عرصۂ حیات آج جرمنی میں تنگ ہے اس کی نظیر تاریخ میں نہیں ملتی۔

خواجہ احمد فاروقی، بی۔ اے

باب الاستفسار

خضر — کافر

(جناب سید علی رضا صاحب - دہلی)

یوسف رضا صاحب بدایونی کا ایک مقالہ جوش پر آپ کے رسالہ میں شایع ہوا ہے، اس کے دوسرے حصہ میں انھوں نے بعض اعتراضات بھی کئے ہیں۔ منجملہ ان کے ایک یہ بھی ہے کہ خضر، نظر اور شرر کا ہم قافیہ نہیں ہو سکتا، کیونکہ اصل لفظ خِضر یا خَضِر ہے۔ دوسرا اعتراض یہ ہے کہ کافر کو تحنوں کا ہم قافیہ قرار دیا ہے، حالانکہ صحیح تلفظ اس کا کافِر ہے۔

آپ نے اپنی کوئی رائے ان اعتراضات کی بابت نہیں درج کی۔ براہ کرم مطلع فرمائیے کہ آپ کا فیصلہ اس باب میں کیا ہے۔

(نگار) خضر اور کافر دونوں عربی لفظ ہیں۔ خضر کے تلفظ دو ہیں۔ خِضْر بروزن مصر اور دوسرا خَضِر بروزن فعل جس کے معنے ہیں سبز و شاداب کے، لیکن اس غیر معلوم ہستی کے لئے جس کا ذکر موسیٰ کے ذکر کے ساتھ کلام مجید میں آیا ہے اور جسے عوام پیغمبر بھی سمجھتے ہیں، خِضْر (بروزن فِعْل) اور خَضِر (بروزن فَعِل) دونوں کا استعمال ہوا ہے اس لئے میری رائے میں جوش نے غلطی نہیں کی ہے۔

کافر کے تلفظ کو ہر شخص جانتا ہے کہ وہ بروزن کاہل ہے، لیکن اردو فارسی والوں نے کبھی کبھی بفتح فا بھی استعمال کیا ہے میری رائے میں اس سے اجتناب اولیٰ ہے، کیونکہ اس میں عامیانہ انداز زیادہ پایا جاتا ہے۔

یہود اور صیہونیت

(جناب اسد اللہ خانصاحب۔ مرزاپور)

آجکل فلسطین میں یہودیوں کی وجہ سے ہنگامہ برپا ہے اور ہٹلر نے اپنے ملک سے ان کو نکالکر دنیا کی توجہ ان کی طرف پھیر دی ہے۔ اسی سلسلہ میں صیہونیت کا بھی بار بار ذکر آتا ہے۔ کیا آپ مہربانی فرماکر یہودیوں کی تاریخ کے متعلق مختصر الفاظ میں اپنے خیالات کا اظہار فرمائیں گے نیز یہ کہ صیہونیت کیا چیز ہے

(نگار) یہود سامی النسل قوم ہے جو اسوقت تمام دنیا میں پھیلی ہوئی ہے۔ انگریزی میں انھیں (Semites) کہتے ہیں جس کے معنے ہیں (A man of Judah) اسی کا مترادف (Hebrew) ہے۔ یہودیوں کی ابتدائی تاریخ توریت میں بیان کی گئی ہے، لیکن آثاری تحقیقات کی بنا پر اس میں بہت کچھ تغیر و تبدل ہوگیا ہے۔ اس قوم نے حضرت ابراہیم کی سیادت میں ۲۰۰۰ سال قبل مسیح عراق سے فلسطین ہجرت کی۔ اس کے ۵۰۰ سال بعد یہ اپنے مویشی لیکر مصر چلے گئے۔ یہاں ان کو سخت ایذائیں دی گئیں اس لئے حضرت موسیٰ کی سرکردگی میں یہ پھر وہاں سے چلے اور ۴۰ سال تک پہاڑوں اور جنگلوں میں آوارہ پھرتے رہے۔

جب یہ کنعان پہونچے جسے اب فلسطین کہتے ہیں تو یہاں کی قوموں کو انھوں نے مغلوب کیا اور اسی سرزمین میں آباد ہوگئے جس کو صدیوں قبل یہ چھوڑ چکے تھے۔ انھوں نے اس حصۂ زمین کو اپنے بارہ قبایل کے درمیان تقسیم کرلیا جو یعقوب کے بیٹوں یا پوتوں کے نام سے موسوم تھے۔ اس وقت انکا کوئی بادشاہ نہ تھا بلکہ ہر قبیلہ کا ایک سردار ہوتا تھا جو سرپنچ کی حیثیت سے تمام انتظام کرتا تھا۔ لیکن بعد کو انھوں نے اپنا ایک بادشاہ تجویز کرلیا جس کا نام طالوت (Saul) تھا۔ طالوت کے بعد داؤدؑ بادشاہ ہوئے اور ان کے بعد سلیمانؑ۔ سلیمانؑ کے عہد میں انکی سلطنت بہت مالدار تھی اور انھیں کے زمانہ میں ہیکل یروشلم تعمیر کی گئی۔ سلیمان کی وفات کے بعد سلطنت دو حصوں میں منقسم ہوگئی، جنوب میں یہوداہ (Judah) کی اور شمال میں اسرائیل کی ان میں باہم خوب لڑائیاں ہوئیں یہاں تک کہ ۵۸۶ سال قبل مسیح یہوداہ کی اور ۷۲۱ سال قبل مسیح بنی اسرائیل کی سلطنت ختم ہوگئی اور بابل یہودیوں کو غلاموں کی حیثیت سے گرفتار کرکے اپنے ملک لیگئے طویل زمانہ کے بعد یہ پھر واپس آئے اور حکومت شام کے تحت زندگی بسر کرنے لگے۔ شام میں اسوقت سلیوسس کی اولاد حکمراں تھی (یہ سکندر اعظم کا مشہور جنرل تھا)

بعد کو مکابیوس کی اولاد نے آزادی حاصل کرکے اپنے آپ کو حکمراں بنالیا۔ ۶۳ سال قبل مسیح یہودی رومیوں کی

حکومت کے متعلق ہوگئے، چنانچہ ولادت مسیح کے وقت جو سب سے بڑے یہودی تھے یہ تمام علاقہ رومہ کی سلطنت میں شامل تھا۔

سنہ ۷۰ء میں شہنشاہ طیطوس نے ان کے معبد کو تباہ کیا اور ملک سے باہر کر دیا۔ اسی وقت یہودی چاروں طرف منتشر ہوگئے اور تقریباً ہر جگہ ان کے ساتھ بہت برا سلوک کیا گیا۔ انگلستان سے یہ بارھویں صدی میں نکالے گئے لیکن سترھویں صدی میں پھر واپس آنے کی اجازت دیدی گئی۔ انیسویں صدی میں ان کو برابر کے شہری حقوق بھی مل گئے (اس سے قبل نہ ان کو ملازمت ملتی تھی اور نہ مساویانہ حقوق دوسری آبادی کے مقابلہ میں ان کو حاصل تھے)

سنہ ۱۹۳۳ء میں سامی النسل لوگوں کے خلاف ایک عام تحریک جرمنی میں شروع ہوئی اور اس کا سبب ہٹلر نے یہ بتایا کہ ملک کی تجارت پر یہ پوری طرح قابض تھے اور اہل ملک کے حقوق تلف ہو رہے تھے۔ تجارت اور لین دین میں ان کی مہارت ہمیشہ سے ضرب المثل رہی ہے اور اس باب میں ان کی سنگدلی کے واقعات بہت مشہور ہیں، چنانچہ شائی لاک کے افسانہ سے تقریباً ہر شخص واقف ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ ان میں بعض بڑے بڑے اہل کمال بھی پیدا ہوئے مثلاً برگساں۔ ڈسرائیلی۔ آنسٹین۔ ہین اور اسپنوزا وغیرہ۔

انیسویں صدی میں ایک جدید تحریک یہ پیدا ہوئی کہ یہودیوں کو اپنے اصلی وطن فلسطین میں بسنا چاہئے، اس تحریک کا نام (Zionism) ہے جسے عربی میں صیہونیت کہتے ہیں زیون یا صیہون اصل میں اس پہاڑی کا نام ہے جو یروشلم میں پائی جاتی ہے اور اسی لئے مجازاً یہودیوں کو اہل صیہون کہتے ہیں۔ جب جنگ عظیم کے بعد فلسطین ترکوں کے قبضہ سے نکل گیا تو یہ تحریک اور زیادہ قوی ہوگئی

سنہ ۱۹۱۷ء میں (Balfour Declaration) کے ذریعہ سے برطانیہ نے وعدہ کر لیا کہ یہودیوں کو فلسطین میں آباد کیا جائے گا۔ سنہ ۱۹۲۱ء میں اس مقصد کے لئے مستقل فنڈ قائم کیا گیا اور یہودیوں کی آمد فلسطین میں شروع ہوگئی۔ اس وقت دنیا میں ایک کروڑ پچاس لاکھ خالص یہودی پائے جاتے ہیں، لیکن یہودی خون اس سے بہت زیادہ لوگوں میں پایا جاتا ہے۔ برطانیہ عظمی میں تقریباً تین لاکھ یہودی آباد ہیں، لیکن ان میں وہ لوگ شامل ہیں جنھوں نے برائے نام عیسوی مذہب اختیار کر لیا ہے۔ یہ زیادہ تر شہروں ہی میں پائے جاتے ہیں اور بڑے وسیع پیمانہ پر مختلف قسم کے کاروبار کرتے ہیں۔ دولت کے لحاظ سے کوئی قوم ان کی ہمسر نہیں اور یہی وجہ انکے ساتھ رعایت کی ہے

ان کا مذہب یکسر رسم و رواج ہے اور حلال حرام کے جھگڑے ان کے یہاں بہت پائے جاتے ہیں، مسلمانوں نے بہت سی باتیں انھیں سے لی ہیں۔ ان کی تقویم بھی علحدہ ہے، ان کا سال اکتوبر سے شروع ہوتا ہے اور اسوقت ان کا سنہ ۵۶۹۸ ہے۔ ان کی لٹریری زبان عبرانی ہے اور بڑا وسیع لٹریچر اس زبان میں پایا جاتا ہے۔ جس زبان میں گفتگو کرتے ہیں اس کا نام یدیش ہے جس میں متعدد اخبارات شائع ہوتے ہیں۔

راز و نیاز

(ایک شاعر اپنے حقیقی ماحول میں)

جب غم بے انتہا سے دل مرا گھبرا گیا
کسبِ فرحت کے لئے میں جانبِ دریا گیا

وقتِ شب تھا، خامشی کا دلنشیں ہنگام تھا
کارواں در کارواں طاری سکوتِ عام تھا

مل گئی تھی شورشِ عالم کو ہر غم سے نجات
ایک نقطہ پر سمٹ کر آ گئی تھی کائنات

چودھویں کے چاند کی رعنائیاں تھیں بے نقاب
کر رہی تھیں وسعتِ عالم میں تقسیم شباب

ساحلِ دریا تک آ کر رک گئے میرے قدم
فطرت بیدار تھی آمادۂ لطف و کرم

دیکھ کر آبِ رواں کو نغمہ ریز و نغمہ بار
ہو گیا حاصل مری آشفتہ حالی کو قرار

چاند کی سیمیں شعاعیں چھا رہی تھیں ہر طرف
مستیاں ہی مستیاں برسا رہی تھیں ہر طرف

منچلی ہر موج سے تھیں آئینہ ساماںیاں
بڑھتی جاتی تھیں نگاہِ شوق کی حیرانیاں

ریت کے ذرّے چمکتے تھے ثریا کی طرح
تھا یہاں سب کچھ مرے خوابِ تمنا کی طرح

اسقدر پُر کیف منظر پیشتر دیکھا نہ تھا
دل جلے تسکین پا سکتے ہیں، میں سمجھا نہ تھا

کثرتِ جلوہ سے حاصل دل کو سرشاری ہوئی
رفتہ رفتہ روح پر اک محویت طاری ہوئی

سازِ دل آخر شعاعِ ماہ سے مل ہی گیا
میری اُمیدوں کا پژمردہ کنول کھل ہی گیا

کر دیا جذباتِ وارفتہ نے فطرت سے قریب
ہو گیا دل میرا انوارِ حقیقت سے قریب

نطق پیرائی عطا کی جذبۂ خاموش نے
کر دیا گویا مجھے کیفیتِ پُر جوش نے

موجِ دریا سے رہا تا دیر سرگرمِ کلام
کر لیا معلوم میں نے رازِ تسکینِ دوام

چاند اور تاروں سے کی میں نے مسلسل گفتگو
ہو گئی حاصل مجھے معراجِ کیفِ آرزو

رات بھر میخانۂ فطرت کی مے پیتا رہا
چاند کی کرنوں سے اپنے زخمِ دل سیتا رہا

چن لئے میں نے نئے جلوے حریمِ ناز سے
ذہن نے بیداریاں پائیں، نئے انداز سے

بارشِ الہام سے ذہنِ رسا تاباں ہوا
از سرِ نو زندگیِ عشق کا ساماں ہوا

الغرض جاری رہا تا صبح یہ راز و نیاز
ہو گئی آغوشِ فطرت میں محبت کی نماز

صبح کی آمد حیاتِ نو کا اک عنوان ہوئی
قسمت تاریک جاگی اور نور افشاں ہوئی

نبی احمد بریلوی

کسی کی تصویر سے

یہ کس کی شبیہ دلکش ہے - ہاں، یہ تو تمھاری صورت ہے!
یہ رنگ چڑھایا ہے کس نے - یہ کس کا خونِ محبت ہے!
یہ ہار پہنایا ہے کس نے - شاید یہ کسی کی حسرت ہے!

پاکیزہ نگاہیں کیا کہنا - معصوم تبسم کیا کہنا!
ان پیارے پیارے ہونٹوں پر خاموش ترنم کیا کہنا!
الفاظِ خموشی میں بھی نیا اندازِ تکلم کیا کہنا!

تم شمع سے بڑھ کر روشن ہو - جلتے ہوئے پروانوں کی قسم!
صہبا سے زیادہ رنگیں ہو - چلتے ہوئے پیمانوں کی قسم!
پھولوں سے زیادہ دلکش ہو - فطرت کے گلستانوں کی قسم!

لو آؤ کہ اب میں تم سے کچھ اظہارِ حقیقت کرتا ہوں
یعنی کہ لبِ خاموش کو اب رسوائے شکایت کرتا ہوں
کچھ تم سے سمجھے لفظوں میں تشریحِ محبت کرتا ہوں!!

ہم دونوں محبت کی بستی بچپن میں بسایا کرتے تھے
مٹی کے گھروندے دریا کے گھاٹوں میں بنایا کرتے تھے
ہم تم سے لڑکپن میں اکثر شادی بھی رچایا کرتے تھے!!

معصوم محبت سے ہم کو کچھ اُنس سا ہوتا جاتا تھا،
دل میٹھے میٹھے خوابوں میں راتوں کو کھوتا جاتا تھا،
تھی کچھ نہ خبر اور بیج کوئی الفت کے بوتا جاتا تھا!!

اچھا ہے میں تم سے مل نہ سکوں اچھا ہے کہ مجھ سے دور رہو
میں ملنے سے مجبور رہوں - تم ملنے سے مجبور رہو
تم دور رہو - یا پاس رہو آباد رہو مسرور رہو

سلام مچھلی شہری

وجدانیات وجد

(سکندر علی وجد)

آنکھوں سے عیاں ہے تری لے جانِ تمنا ۔۔۔ چھپتا ہے کہیں خونِ شہیدانِ تمنا
اُلفت میں شکستوں پہ شکستیں ہوئیں لیکن ۔۔۔ چھوٹا نہ کبھی ہاتھ سے دامانِ تمنا
اے یاس یہ شعلہ نفسی چھوڑ خدارا! ۔۔۔ برباد نہ ہو جائے گلستانِ تمنا
آسائش دائم مجھے درکار ہے یارب! ۔۔۔ بجھتی بھی نہیں شمعِ شبستانِ تمنا

ہے وجد عبث دعوۂ اخفائے محبت
آنکھوں میں سماتا نہیں طوفانِ تمنا

فیض اثر سے عشق کے دل کا عجیب رنگ ہے ۔۔۔ دولتِ حُسن کے لئے سارے جہاں سے جنگ ہے
قوتِ سیل سے نہ ڈر، موج سے کھیل بے خطر ۔۔۔ ساحل پر سکوں مگر، تیرے لئے نہنگ ہے
موت ہے ایسی زندگی جس میں خلش نہیں کوئی، ۔۔۔ کوئے جفاکشی میں جی، عرصۂ عیش تنگ ہے
خشمِ عدو ہے دلنواز، طرزِ ستم ہے مثلِ ناز ۔۔۔ ہاں نگہِ زمانہ ساز میرے لئے خدنگ ہے!
دولتِ صبح و شام لے، وقت کی باگ تھام لے ۔۔۔ دستِ جنوں سے کام لے، پائے خرد میں لنگ ہے

وجد یہ اہلِ گلستاں، آج یہ راز ہے عیاں
عشق سحاب درفشاں، حسن سراب رنگ ہے

افکار کاوش

(کاوش حیدرآبادی)

کاٹی تمام عمر غمِ زندگی کے ساتھ ۔۔۔ اپنی تو دو گھڑی بھی نہ گزری خوشی کے ساتھ
ڈرتا ہوں وضع کی ہو نہ کوئی نئی جفا ۔۔۔ تم اور یہ التفات میری بیکسی کے ساتھ!
ساقی! تری نگاہ کے صدقے پلائے جا ۔۔۔ وابستہ زندگی ہے اسی بیخودی کے ساتھ
اُن کی نگاہِ ناز نے لے لی متاعِ ہوش، ۔۔۔ اپنی خوشی بھی ہوگئی اُن کی خوشی کے ساتھ
آنکھوں میں انتظار کا عالم لئے ہوئے ۔۔۔ دنیا سے جا رہا ہوں میں کس بیکسی کے ساتھ
کاوش! کمالِ ضبط کا انجام کچھ نہ پوچھ ۔۔۔ کیا جانے کتنے اشک ہیں میری ہنسی کے ساتھ

جذباتِ کیف

(کیفی چریاکوٹی)

جہاں اک اک قدم پر ہے متاعِ زندگی اپنی
کوئی کہدے کہ اُس کوچے سے ہم کیونکر گزر جائیں؟

کوئی مستوں سے آکر سیکھ لے آدابِ میخانہ
کہ بےخود ہوکے نکلیں اور سب سے بےخبر جائیں

لبوں پر دم رُکا ہے رہ گرائے بزمِ امکاں کا
تمھارا حکم کیا ہے اب؟ بڑھیں ہم یا ٹھہر جائیں

ہوائے تندِ آزادی میں جانِ مضطرب گم ہے
نشیمن کی طرف جائیں تو میرے بال و پر جائیں

جسے منزل سمجھ کر چل پڑے تھے، وہ نہیں ملتی
اگر جائیں تو ہم اب کس طرف اے ہم سفر جائیں

لطافت طرزِ خود بینی میں پیدا ہو نہیں سکتی
اڑے رُخ سے جو رنگِ زندگانی، ہم نکھر جائیں

گریباں گیر ایماں، کفر ہے دامن کشاں کیفیؔ،
نگاہِ مست جس پر ڈال دیں وہ، ہم اُدھر جائیں

عذاب

(کاوشؔ)

رات کی بزم ہے سکوت فروش
کروٹیں لے رہی ہے روحِ سروش

رقص تاروں میں ہے بحدِ جمال
حسن اور عشق میں ہے قیل و قال

ذوقِ سرمایہ دار ہے مسرور
گنگناتا ہے جذبۂ مغرور

ہنس رہے ہیں ایاغِ عشرت رنگ
رو رہی ہے نگاہِ عسرت رنگ

سو رہا ہے سڑک پہ اک مزدور
گرسنہ، مضمحل، صبور و شکور

کیا بھیانک ہے منظرِ خوں ریز
آج بھی ہیں زمانہ میں چنگیز

ایک پستی میں اک بہ اوجِ کمال
گل ہے شمعِ دماغِ فکر و خیال

خون رو اے نگاہِ شعرِ حیات
جگمگا اے رہِ خرامِ نجات

یہ ہمارے خدا کا ہے انصاف
فاقہ کش! جاگ!! یہ ہے وقتِ مصاف

ٹوٹ اے برقِ انقلابِ خراب
ابتو دیکھا نہ جائے گا یہ عذاب

حضور !

فقیہِ شہر کا تکرار و بحث شغل ہوا — تہی غمی سے ہے اب صوفیا کے دل کا سرود
گریز راہبِ بے چارہ کو جہان سے ہے — کلیم چھوڑ چکا آرزوئے جلوۂ طور
ازل کا نور ہے زیرِ نقابِ خاک ابھی — تلاش کر نہ سکا اس کو فلسفی کا شعور
ہے شاعروں کے خموں میں فقط شرابِ دروغ — غزلسرا ہے، سو اپنی نوا سے بھی ہے نفور
حرم کے شیخ کو اپنا پتا بھی مل نہ سکا — عجم کے دیر نشیں کعبۂ جمال سے دور
کوئی سبو نہ کسی ہاتھ میں نظر آیا — کہ جس میں سوزِ محبت کی ہو شرابِ طہور

کسی کی آنکھ میں ایسی نظر نہیں باقی !
اثر سے جس کے ترے غیب میں عیاں ہو "حضور"

نعیم صدیقی

آیندہ جنوری ۳۹ء کا نگار

یعنی مصحفی نمبر طیار ہے

اور اپنی جامعیت کے لحاظ سے اُردو شاعری کی تاریخ میں بالکل پہلی چیز ہے ۔ مصحفی کا مرتبہ اسوقت تک لوگوں نے نہیں پہچانا اور اب بالکل پہلی مرتبہ آپ کو معلوم ہوگا کہ وہ کیسی غیر معمولی ہستی تھا۔
مصحفی کے غیر مطبوعہ دواوین اور غیر مطبوعہ مثنویوں کا انتخاب ۔ مصحفی کی غزلیات پر بالکل جدید اُصول انتقاد کے لحاظ سے تفصیلی تبصرہ ۔ مصحفی کے شاگردوں کے متعلق ایک عالمانہ ریسرچ ۔ مصحفی کے تذکروں اور دیگر تصانیف پر ایک فاضلانہ انتقاد ۔ اور اسی طرح کے بہت سے عنوانات پر بے مثل مضامین آپ کو اس نمبر میں نظر آئیں گے ضخامت کا اندازہ ۲۰۰ صفحات کیا گیا ہے لیکن ممکن ہے اس سے بڑھ جائے۔ غیر خریداران نگار کے لئے اس نمبر کی قیمت دو روپیہ مقرر ہے ۔ اگر آپ نگار کے خریدار ہیں تو خریداری کے سلسلہ کو جاری رکھئے تاکہ یہ نمبر آپ کو مل سکے

منیجر نگار لکھنو

وضعداری و بیدار مغزی

اس کی وضع داری اور پختگی انتظام کی دوسری مثال یہ ہے کہ ایک بار گرمی کے موسم میں شیخ عبدالغنی جونپوری بادشاہ سے ملنے آئے۔ ان کے لئے جو کھانا آیا اس میں موسم گرما کی وجہ سے شربت کے ۲ شیشے بھی موجود تھے۔ اس کے بعد اتفاق سے شیخ صاحب جاڑوں میں آئے لیکن شربت کے قرابے اب بھی پیش کئے گئے ایک بار وہ جس طرح ایک آدمی سے ملتا پھر عمر گزر جاتی اسی طرح پیش آتا اور اس میں سر مو تفاوت نہ ہوتا

اس کی عدالت و بیدار مغزی کا یہ عالم تھا کہ ہر متدین شخص سلطنت کا اپنی جگہ پر مطمئن اور ہر خائن شخص ہر وقت لرزاں رہتا تھا اس طرح اس کی دیانت و سیر چشمی کی یہ کیفیت تھی کہ اگر دنیا کی ساری دولت اسکے سامنے رکھدی جاتی تو وہ خلاف احکام مذہب اس پر نگاہ نہ کرتا۔

لشکر کا معمول

جب لشکر کو وہ کسی مہم پر روانہ کرتا تو روزانہ دو فرمان عسکر کے نام پہونچتے۔ ایک نماز صبح کے وقت جس میں اور ہدایتیں درج ہوتیں سرایوں میں گھوڑوں کی ڈاک ہر وقت طیار رہتی۔ اگر لشکر ۵۰۰ کوس پر بھی ہوتا تو بھی اس معمول میں فرق نہ آتا۔

ارزانی و خوشحالی

روزانہ اس کے سامنے کل اشیاء کا نرخ نامہ اور سلطنت کے تمام حالات و واقعات کی رپورٹ پیش ہوتی اور وہ فوراً تحقیقات کا حکم دیتا اگر کوئی نامناسب بات اُسے نظر آتی۔ یہی انتظام تھا کہ اس کے عہد میں غلہ اور تمام زندگی کی ضروری چیزیں بہت ارزاں تھیں اور قلیل آمدنی رکھنے والا بھی فراغت سے زندگی بسر کرتا تھا۔

قاضی و علماء کا تقرر

اس نے ایک قاضی کے علاوہ بارہ علماء بھی صرف مقدمات فیصلہ کرنے کے لئے مقرر کئے تھے اور جاسوس متعین تھے، جو عدالت کی تمام خبریں روزانہ بادشاہ تک پہونچاتے تھے۔ دریا خاں وکیل کو حکم دیا تھا کہ عدالت کے اندر پہر رات گئے تک بیٹھا رہے، کیونکہ ممکن ہے اس وقت کوئی مستغیث آجائے علاوہ اس کے وہ بعض اہم مقدمات کی خود تحقیقات کرتا اور سلطنت کے انتظام پر آپ توجہ کرکے آئین مقرر کرتا اور رعایا کے امن و سکون کی تدابیر ہر وقت سوچتا رہتا

مخبر و جاسوس

اس غرض کے لئے اس نے کثرت سے مخبر و جاسوس مقرر کر رکھے تھے جو رعایا و حکام کے تمام حالات اس تک پہونچاتے تھے اور یہ انتظام اس قدر مکمل تھا کہ بسا اوقات لوگوں کی وہ باتیں جو انتہائی خلوت سے متعلق ہوتیں اس کو معلوم ہو جاتیں۔ چنانچہ عام طور سے لوگوں کا خیال تھا کہ سلطان کے قابو میں کوئی جن ہے جو تمام باتوں سے آگاہ کر دیتا ہے۔[1]

---

[1] طبقات اکبری - ۱۷۱ -

فراست و دانائی

وہ انصاف کرنے میں حد درجہ کاوش کرتا اور خاص فراست و دانائی سے کام لیکر حقیقت تک پہونچتا چنانچہ صاحب طبقات اکبری نے ایک واقعہ بیان کیا ہے کہ :۔

گوالیار کے دو غریب آدمی جو بھائی بھائی تھے مفلسی سے تنگ آکر فوج میں شامل ہو گئے۔ایک لڑائی میں انھیں غارت کے سلسلہ میں دو لعل بھی مل گئے۔ایک اس دولت پر قانع ہو کر واپس جانا چاہتا تھا اور دوسرا اس کے بعد بھی قسمت آزمائی پر مصر تھا۔جب ایک بھائی گھر جانے لگا تو دوسرے بھائی نے لعل سپرد کر کے کہا کہ میری بیوی کو دیدینا۔جب یہ گوالیار واپس آیا تو اس نے اور چیزیں تو دیدیں لیکن لعل نہ دیا۔جب مالک واپس آیا تو اس نے اپنی بیوی سے استفسار کیا۔اس نے انکار کیا۔ الغرض یہ معاملہ میاں بھوراؔ[1] تک پہونچا جو دربار سکندر لودی کے امرا کبار میں سے تھے اور وہاں کے میر عدل بھی تھے انھوں نے گواہ طلب کئے۔ خائن بھائی نے ایک قمار خانہ سے دو جھوٹے گواہ پیش کر دئے اور میاں بھورا نے ان گواہوں پر اعتبار کر کے فیصلہ کر دیا کہ "لعل بیوی سے وصول کر لینا چاہئے" یہ غریب بہت پریشان ہوئی اور سیدھی آگرہ جا کر بادشاہ کی خدمت میں پہونچی۔بادشاہ نے فریقین اور گواہوں کو طلب کیا۔یہاں بھی وہی صورت پیش آئی۔بادشاہ کو یقین تھا کہ لعل اس عورت کو نہیں دیا گیا۔لیکن گواہوں کی موجودگی میں وہ کوئی خلاف حکم نہ دے سکتا تھا آخرکار اس نے سوچ کر گواہوں سے پوچھا کہ جب تمھارے سامنے اس عورت کو لعل دیا گیا ہے تو تم نے اسے ضرور دیکھا ہوگا۔ انھوں نے کہا کہ ہاں ہم نے دیکھا تھا۔یہ سنکر بادشاہ نے موم کا ایک ٹکڑا ان دونوں کو دیا اور کہا کہ جاؤ الگ الگ اس لعل کی صورت و مقدار موم کے ذریعہ سے ظاہر کرو۔جب یہ دونوں بنا کر لائے تو ایک کا بنایا ہوا نمونہ دوسرے کے نمونہ سے بالکل مختلف تھا اور لعل کی ہیئت وصورت سے کوئی مناسبت نہ تھی بادشاہ نے گواہوں کو دھمکایا اور انھوں نے سارا حال بیان کر دیا جس سے حقیقت واضح ہو گئی"[2]

عدل و داد

انصاف کے باب میں وہ ضعیف اور قوی کو بالکل برابر سمجھتا اور کسی کی رعایت نہ کرتا۔ایک بار کسی سید نے شکایت پیش کی کہ میاں ملک جاگیردار نے اس کی زمین چھین لی ہے۔بادشاہ نے میاں بھورہ کو تحقیقات کا حکم دیا۔لیکن اس مسئلہ میں کچھ ایسے نزاعات پیش آگئے کہ دو ماہ تک فیصلہ نہ ہو سکا۔بادشاہ نے میاں بھورہ کو بلا کر کہا کہ کیوں ابتک فیصلہ نہیں ہو سکا۔آج اس وقت تک عدالت گاہ سے کوئی نہ جائے جب تک یہ معاملہ طے نہ ہو جائے۔چنانچہ تمام علما تین پہر رات گئے تک بیٹھے رہے اور اسی وقت بادشاہ کو نتیجہ سے اطلاع دی گئی جو مستغیث سید کے حق میں تھا۔بادشاہ نے میاں ملک جاگیر کو بلا کر دریافت کیا کہ کیوں تم نے میرے خلاف حکم ظلم کیا اور وظائف و املاک کی زمین تم نے کیوں چھینی۔

---

[1] اس نام میں اختلاف ہے بعض مورخین نے بھوہ اور بعض نے بھورا لکھا ہے۔ [2] طبقات اکبری۔۱۷۲۔ فرشتہ ۱۸۹۔

میاں ملک نے منفعل ہوکر اعتراف جرم کیا۔ بادشاہ نے اس سے تین بار سب کے سامنے اعتراف جرم کرا کے نادم کیا اور پھر کبھی اس کو کوئی جاگیر نہ دی[1]

وہ فطرتاً بے انتہا سیر چشم واقع ہوا تھا۔ ایک بار سنبھل کے ضلع میں کسی شخص کو زمین سے ۵۰۰۰ اشرفیوں کا دفینہ مل گیا۔ لیکن میاں قاسم حاکم سنبھل نے اس سے لے لیا۔ اس نے بادشاہ کی خدمت میں درخواست روانہ کی۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ فوراً دفینہ پانے والے کو واپس دیا جائے۔

حاکم سنبھل نے عرضداشت روانہ کی کہ اتنی بڑی رقم پانے کا یہ شخص مستحق نہیں ہے۔

بادشاہ نے ایک فرمان اس کے پاس بھیجا کہ "اے بیوقوف جس نے اس کو یہ دفینہ عطا کیا ہے وہ بہتر جاننے والا ہے اگر یہ شخص مستحق نہ ہوتا تو وہ کیوں دیتا۔ ہم لوگ سب خدا کے بندے ہیں اور وہی بہتر جانتا ہے کہ ہم میں سے کون کس چیز کا مستحق ہے۔"

اسی طرح ایک بار اجودھن میں ایک درویش شیخ محمد کے کھیت میں بہت بڑا دفینہ برآمد ہوا اس میں کچھ طلائی برتن ایسے بھی تھے جن پر سکندر کی مہر ثبت تھی۔ علی خاں حاکم لاہور و دیپال پور نے شیخ کو لکھا کہ یہ دفینہ میرے حدود حکومت کے اندر سے برآمد ہوا ہے اس لئے میرے پاس بھیجدو۔ شیخ نے انکار کیا اس پر علی خاں نے بادشاہ کو اطلاع دی کہ:-

"اجودھن میں شیخ محمد کو شاہی خزانہ دستیاب ہوا ہے۔"

بادشاہ نے اس کے جواب میں صرف یہ لکھدیا کہ:-

"تم کو اس سے کیا واسطہ ہے اور تم کیوں شیخ محمد کے حالات سے اعتناء کرتے ہو؟"

اس کے بعد شیخ محمد نے کچھ طلائی برتن بادشاہ کی خدمت میں روانہ کئے۔ لیکن اس نے واپس کردئے اور کہا کہ:-

"تمہیں رکھو، ہمیں تمہیں سب کو خدا کے سامنے اپنے اپنے اعمال کی جواب دہی کرنا ہے"[2]

یہ واقعہ تاریخ سلاطین افاغنہ اور واقعات مشتاقی[3] میں بھی درج ہے۔

اگر وہ کسی کو جاگیر عطا کر دیتا اور پھر کسی سبب سے اس کی آمدنی بڑھ جاتی تو مطلقاً پرواہ نہ کرتا۔

---

[1] تاریخ داؤدی (الیٹ) ۴ - ۴۵۴ ۔ [2] تاریخ داؤدی (الیٹ) ۴ - ۵۲۴ - ۵۲۳ ۔

[3] واقعات مشتاقی کا مصنف شیخ رزق اللہ مشتاقی تھا۔ یہ ۸۹۳ھ میں پیدا ہوا اور ۹۸۹ھ میں اس کا انتقال ہوا مخزن افغانی میں اس کو صرف مولانا مشتاقی لکھا ہے۔

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۲۶۲ پر ملاحظہ ہو)

ایک بار اس نے ملک بدرالدین کا وظیفہ سات لاکھ تنکہ مقرر کر کے ایک پرگنہ تفویض کر دیا۔ پہلے ہی سال اسکی آمدنی ۹ لاکھ تنکہ ہو گئی اس نے بادشاہ سے عرض کیا کہ "زاید دو لاکھ کی بابت کیا حکم ہوتا ہے" بادشاہ نے کہا کہ :۔ "تم رکھ لو"۔ دوسرے سال گیارہ لاکھ آمدنی ہوئی اور بادشاہ نے پھر یہی حکم دیا۔ تیسرے سال آمدنی پندرہ لاکھ ہو گئی اس نے پھر عرض کیا۔ بادشاہ نے کہا۔ "جاگیر تمھاری ہے اس لئے اس کی آمدنی بھی صرف تمھاری ہی ہو سکتی ہے مجھ سے کیوں بار بار ذکر کرتے ہو؟"[۱]

چونکہ خود بادشاہ کی نیت ایسی اچھی تھی اس لئے تمام امراء و جاگیردار بھی ایسے ہی دیانت دار و امین تھے۔

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۲۶۱)

اس کے باپ کا نام شیخ سعد اللہ تھا۔ مولانا مشتاقی کو کمسنی سے علماء کی صحبت کا بہت شوق تھا اور اس طرح اس نے بہت فایدہ اُٹھایا۔ جو کچھ واقعات و حالات گزشتہ زمانہ کے اس کو علماء و مشائخ کے ذریعہ سے معلوم ہوتے تھے وہ لوگوں کے سامنے بیان کرتا تھا۔ آخر کار اس کے احباب نے مجبور کیا کہ وہ ان تمام حالات کو قلمبند کرے چنانچہ اس نے اپنے تمام تاریخی معلومات و تحقیقات کو یکجا فراہم کر دیا اور اس کا نام واقعات مشتاقی رکھا۔

مولانا عبدالحق نے اپنے تاریخ حقی اور شیخ نورالحق (عبدالحق کے بیٹے) نے اپنی زبدۃ التواریخ میں مولانا مشتاقی کی نسبت لکھا ہے کہ وہ بہت بڑے سیاح تھے انھوں نے اپنے عصر کے بڑے بڑے علماء، مشائخ اور صاحبان فضل و کمال کی صحبت سے فایدہ اٹھایا وہ خود بھی بڑے فاضل شخص تھے اور علم تصوف سے خاص ذوق رکھتے تھے۔ فارسی میں ان کا تخلص مشتاق اور ہندی میں راجن تھا ہندی زبان کے بہت بڑے ماہر تھے۔ ان کی تصنیف "پیابن جوب نرنجن" اور دیگر رسایل ہندی زبان میں بہت مشہور ہیں۔

مولانا مشتاقی کے آٹھ بھائی تھے جو سب کے سب قابل تھے۔ ان کا دادا شیخ فیروز علاوہ صاحب سیف ہونے کے مشہور اہل قلم بھی تھا۔ اس نے سلطان بہلول اور سلطان حسین شرقی کی باہمی جنگ کا حال ایک طویل نظم میں تحریر کیا تھا۔ جو مولانا عبدالحق کے پاس تھی لیکن بعد کو گم ہو گئی۔ شیخ فیروز کا انتقال ۸۶۰ھ میں ہوا۔

واقعات مشتاقی میں سلطان بہلول لودھی سے ابتدا کی گئی ہے اور سلسلہ وار عہد اکبری کے حالات لکھ کر شیرشاہ اسلام شاہ سلطان محمود عدلی، غیاث الدین خلجی (مالوہ) اور سلطان مظفر شاہ (گجرات) کے حالات پر یہ کتاب ختم ہو جاتی ہے۔

یہ کتاب نایاب ہے اور صرف دو نسخے اس وقت اس کے موجود ہیں۔ ایک مسٹر لیٹ کے پاس تھا جس سے انھوں نے فایدہ اُٹھایا، دوسرا لکھنؤ کے کتب خانۂ موتی محل میں۔

[۱] تاریخ داؤدی (الیٹ) ۴ - ۴۷۵ -

جاگیر مقرر کرنے کے بعد وہ کبھی اس میں تغیر نہ کرتا لیکن اسوقت اگر کسی جاگیردار پر کوئی قصور ثابت ہو جائے تو اس صورت میں اس کی جاگیر لے لیتا۔ لیکن اس کی توقیر و عزت میں کمی نہ کرتا۔

وہ حرص و طمع کے جذبات سے بالکل ناواقف تھا اور ہمیشہ ایسے جرموں میں جن کا تعلق سلطنت کی آمدنی سے ہوتا بہت نرمی سے کام لیتا۔ جشن عید اور ۱۲ ربیع الاول[1] کو قیدیوں کی فہرست اس کے سامنے پیش کی جاتی اور بقایائے مالگذاری کے سبب سے جتنے لوگ قید ہوتے سب کو رہا کر دیتا۔

مذہب کی طرف بہت غلو تھا اور چاہتا تھا کہ کوئی کام خلاف شریعت اس کی سلطنت میں نظر نہ آئے۔ چنانچہ اسنے اسی سلسلے میں حکم نافذ کر دیا کہ مزاروں پر عورتوں کا جانا اور سالانہ سالار مسعود کی چھڑیاں نکالنا ممنوع قرار دیا جائے مولانا مشتاقی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ تعزیہ داری اور سیتلا کی پوجا کو بھی اس نے روک دیا تھا۔

اس نے کثرت سے مساجد تعمیر کرائیں اور ہر مسجد میں ایک واعظ ایک قاری اور ایک جاروب کش مقرر کیا جن کو ماہوار تنخواہ ملتی تھی۔ موسم سرما میں محتاجوں کو کثرت سے کپڑے اور شالیں تقسیم کی جاتیں اور ہر جمعہ کو ایک مقررہ رقم غربا کو تقسیم کی جاتی۔ رمضان اور ربیع الاول کے مہینوں میں مساکین و مستحقین کو بیدریغ روپیہ دیتا۔

اس نے حکم دے رکھا تھا کہ ہر ششماہی پر سلطنت کے تمام غربا و مساکین کی فہرست پیش کی جائے جب یہ فہرست پیش ہوتی تو وہ اُن کو اس قدر روپیہ دیتا کہ ۶ ماہ کے لئے کافی ہو جاتا۔ علاوہ اس کے مختلف شہروں میں مد خیرات کے متعلق بہت سے مہتمم مقرر تھے جو غریبوں اور محتاجوں کا حال معلوم کرکے بادشاہ تک خبر پہونچاتے اور خزانہ شاہی سے روپیہ لیکر انھیں تقسیم کرتے[2]۔

چونکہ بادشاہ کو اس طرف بہت توجہ تھی اس لئے تمام امرا، ارکین، خوانین و ملوک نے بھی غربا و مساکین کے وظائف مقرر کر رکھے تھے۔ چنانچہ واقعات مشتاقی میں لکھا ہے کہ اس داد و دہش کا نتیجہ تھا کہ اگر کوئی فقیر مر جاتا تو اس کے پاس سے کافی دولت نکلتی جو اس کے اعزہ کو دیجاتی اور اگر کوئی عزیز نہ ہوتا تو پھر فقراء کو تقسیم کر دیجاتی۔

اس کے عہد میں زراعت کثرت سے ہوتی تھی۔ چیزیں بہت ارزاں تھیں تاجر خوش حال تھے اور تمام اہل پیشہ اپنے مشاغل میں نہایت اطمینان کے ساتھ مصروف نظر آتے تھے۔ سلطنت میں کہیں چوروں اور رہزنوں کا پتہ نہ تھا اور قافلے نہایت امن و سکون کے ساتھ رات دن سفر کیا کرتے تھے۔ سکندر شاہ کو مغربی مورخین نے عام طور سے حد درجہ متعصب ظاہر کیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ وہ مذہب اسلام کا پابند تھا لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ وہ ہندوؤں کی رواداری نہیں کرتا تھا بالکل غلط ہے۔ اس کا مقصود یہ تھا کہ جو عنداللہ حق ہے وہی کیا جائے۔ چنانچہ جس زمانہ میں

---

[1] رسول اللہؐ کی تاریخ رحلت — [2] تاریخ داؤدی (ایلیٹ) ۴ - ۴۶۴ -

وہ اپنے بھائی باربک شاہ سے لڑ رہا تھا ایک قلندر نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اس سے کہا کہ "فتح تیری ہی ہے" بادشاہ نے جھنجھلا کر ہاتھ الگ کر لیا اور جواب دیا کہ "دعا یہ کرنی چاہئے کہ اللہ اُس کو فتح دے جو حق پر ہے اور وہی ظہور میں آئے جو بہتر و مناسب ہو"

رواداری

قبل تخت نشینی کے ایک بار سکندر کو معلوم ہوا کہ تھانیسر میں ایک گاؤں ہے۔ وہاں کے ایک تالاب میں ہندو جمع ہو کر اشنان کرتے ہیں اس نے علماء سے استصواب کیا۔ میاں عبداللہ اجودھنی نے جو بڑے جید عالم تھے کہا کہ

"ہندوؤں کے کسی قدیم معبد کو غارت کرنا یا اُن کی کسی مذہبی رسم سے تعرض کرنا مناسب نہیں ہے"

سکندر نے یہ سُن کر کچھ نہیں کہا اور اپنے خیال سے باز آ گیا۔[1]

علم دوستی

وہ ان تمام صفات کے ساتھ علم دوست بھی اس درجہ کا تھا کہ اس کے عہد میں آگرہ (جو اس کا دارالحکومت تھا) علماء و فضلاء، مشائخ و صوفیہ شعراء و ادباء کا مرکز ہو گیا تھا۔ فارس و عرب، ہند و بخارا کے تمام صاحبان کمال کھنچ کھنچ کر آگرہ چلے آ رہے تھے اور بادشاہ کی فیاضیوں سے مالا مال نظر آتے تھے۔

مذہبی مباحثے

مذہبی مباحث کا اُسے بہت شوق تھا اور اکثر علماء کو جمع کر کے وہ ان کی گفتگو سُنا کرتا تھا۔ ایک بار جب بودھن نامی ایک برہمن نے یہ دعویٰ کیا کہ تمام مذاہب برابر ہیں تو سکندر شاہ نے بہت سے مقتدر علماء[2] کو حکم دیا کہ وہ اس سے بحث کریں۔

ذوق شعر و شاعری

شعر و سخن کا بھی اُسے ذوق تھا گُل رخ اس کا تخلص تھا کبھی کبھی شعر کہتا تھا[3] اور شیخ جمال کنبوہ[4] سے جو بڑے پایہ کا شاعر تھا اصلاح لیا کرتا تھا۔

---

[1] تاریخ فرشتہ ۱۸۰، تاریخ داؤدی (الیٹ) ۴-۴۳۹ھ — [2] ان علماء کی فہرست حسب روایت فرشتہ یہ تھی۔ میاں قادر بن شیخ خواجو میاں عبداللہ۔ سید محمد بن سعید خاں دہلوی۔ ملا قطب الدین و ملا الہ داد صالح سرہندی۔ سید امان۔ سید برہان۔ سید احسن قنوجی۔ سید صدرالدین۔ میاں عبدالرحمٰن۔ میاں عبدالعزیز سنبھلی (فرشتہ ۱۸۲) — [3] ملائے بدایونی نے یہ غزل اسکی منتخب التواریخ میں درج کی ہے۔

سروے کہ سمن پیرہن و گل بدنستش	روحے ست مجسم کہ دراں پیرہنستش
مشک ختن چیست کہ صد مملکت چین	در حلقۂ آں زلف شکن در شکنستش
در سوزن مژگاں بکشم رشتۂ جاں را	تا چاک بدوزم کہ دراں پیرہنستش
گل رخ چہ کند جوہر دنداں ترا وصف	ہمچوں در سیراب سخن در دہنستش

[4] عہد سکندر شاہ میں شیخ جمال بڑا مشہور شاعر تھا اور بادشاہ اس سے بہت مانوس تھا اور مشورہ بھی لیا کرتا تھا۔ شیخ جمال کا یہ ایک شعر فرشتہ اور ملائے بدایونی نے نقل کیا ہے ؎ ما را ز خاک کویت پیراہنے ست بر تن — آنہم ز آب دیدہ صد چاک تا بدامن

سیر العارفین اسی کی تصنیف ہے اور اس کا ایک دیوان بھی ۹ ہزار سے زائد اشعار کا تھا۔

اس کی صحبت میں علماء کے ساتھ شعرا بھی رہا کرتے تھے ان میں سے ایک ڈونگر برہمن بھی تھا جو عربی و فارسی کا عالم ہونے کے علاوہ شاعر بھی اچھا تھا۔

ملائے بدایونی، عہد سکندری کے بعض مقتدر علماء کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ:-

شیخ عبداللہ اور شیخ عزیز اللہ بڑے پایہ کے فاضل تھے۔ جب ملتان تباہ ہوا تو دہلی کی طرف آئے اور چالیس علماء (مثلاً جمال خاں دہلوی، شیخ لودی سید جلال الدین بدایونی وغیرہ) شیخ عبداللہ کی درسگاہ سے نکل کر اشاعت علوم کا باعث ہوئے۔ ہندوستان میں علوم معقولی کا رواج شیخ عبداللہ کے وقت سے ہوا ورنہ اس سے قبل علم منطق وکلام میں صرف شرح شمسیہ اور شرح صحائف پڑھائی جاتی تھیں۔

سکندر شاہ، مولانا شیخ عبداللہ کا حد درجہ احترام کرتا تھا جب کبھی درس کے وقت پہونچتا تو پوشیدہ طور سے کسی کونہ میں جاکر بیٹھ جاتا۔ تاکہ درس و تدریس میں حرج واقع نہ ہو جب وہ فارغ ہو جاتے تو بادشاہ سلام علیک کہہ کر سامنے آجاتا۔

شیخ عزیز اللہ کے استحضار علوم کا یہ حال تھا کہ مشکل سی مشکل کتاب زبانی پڑھاتے تھے، انھیں کے شاگردوں میں میاں قاسم سنبھلی تھے۔

اسی عصر کے ایک اور زبردست عالم شیخ الہ دیا بھی تھے جنھوں نے ہدایہ کی شرح کئی جلدیں میں تحریر کی ہے علاوہ اس کے تفسیر مدارک پر اُن کے حواشی اور شرح کافیہ کافی شہرت رکھتے ہیں اس زمانہ میں ان کی یہ تمام کتابیں درسیات میں داخل تھیں۔

ایک بار سلطان سکندر نے تمام علماء کو جمع کرکے ایک جانب شیخ عبداللہ[1] اور شیخ عزیز کو، دوسری جانب شیخ الہ دیا اور اُن کے بیٹے بھکاری کو کرکے مباحثہ سنا اور آخرکار یہ فیصلہ ہوا کہ وہ دونوں تقریر میں اور یہ دونوں تحریر میں اپنا جواب نہیں رکھتے[2]۔

الغرض سکندر شاہ کے دربار میں ہر وقت علمی چرچہ ہوا کرتا تھا اور یہ فخر اس بادشاہ کو حاصل ہے کہ اس کے عہد میں سب سے پہلے ہندوؤں نے فارسی کی طرف توجہ کی اور مسلمانوں کے علوم حاصل کرنے شروع کئے[3]۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندو مسلمانوں کے درمیان کافی تعلقات قایم ہوگئے تھے اور وہ ایک دوسرے کی زبان کو نہایت شوق سے حاصل کرتے تھے۔ مسٹر بلاک نے کلکتہ ریویو[4] میں ظاہر کرتے ہیں کہ "ہندوؤں نے

---

[1] شیخ عبداللہ کا انتقال ۹۲۲ھ میں ہوا۔ [2] منتخب التواریخ - ۸۶۔

[3] (Keen's Medieval India, Cal. Review LXXIX P. 71

[4] Cal. Review CIV

دربار کے شعراء — شیخ عبداللہ کا احترام — شیخ عزیز اللہ — اجلاس — ہندوؤں کا فارسی کا مطالعہ — ہندو مسلمانوں کا اتحاد

"دسویں صدی عیسوی سے فارسی کی طرف ایسی توجہ کی کہ ایک صدی گزرنے سے قبل وہ اس زبان میں مسلمانوں کے برابر ہوگئے"

ہندو اور فارسی زبان

اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ ہندو مسلمانوں کے تعلقات میں زیادہ اتحاد پیدا ہوگیا تھا اور دوسرے یہ کہ سکندر لودی نے قصداً ہندوؤں میں یہ مذاق پیدا کیا تاکہ انھیں سلطنت میں انتظامی عہدے دئے جائیں۔ چنانچہ جب فارسی خوان ہندوؤں کی ضرورت ہوئی تو اس نے پہلے برہمنوں سے درخواست کی کہ فارسی سیکھیں۔ انھوں نے انکار کیا تو چھتریوں سے کہا گیا۔ انھوں نے جواب دیا کہ ہم اہل سیف ہیں اہل قلم بننا پسند نہیں کرتے۔ اس کے بعد ویش طبقہ کو توجہ دلائی گئی لیکن اس نے تجارت پیشہ ہونے کی وجہ سے عذر کیا آخر کار کایستھوں نے اسے قبول کیا اور قلیل زمانہ میں ایسی دستگاہ حاصل کرلی کہ وہ مسلمانوں کے علوم کا درس دینے لگے اور سلطنت میں بڑے بڑے عہدے ان کو ملے۔

تصانیف

سلطان سکندر کے عہد میں تصانیف کثرت سے ہوئیں۔ جن میں خود بادشاہ اور اس کے امرا کا ذوق علمی بہت کچھ شامل تھا۔ تاریخ داؤدی میں لکھا ہے کہ ارکرجہاویدک جو فن طب کے متعلق سنسکرت کی مشہور کتاب تھی۔ فارسی زبان میں طب سکندری کے نام سے ترجمہ کی گئی اور بعد کو اطبار ہند نے اس سے بہت فایدہ اٹھایا۔[1]

دیگر فنون، ذوقِ موسیقی

بادشاہ کو دیگر فنون وصناعات کے علاوہ جن کے کارخانہ کثرت سے قایم تھے۔ موسیقی کا بھی بہت ذوق تھا وہ دربار عام میں تو کبھی گانا سننا پسند نہ کرتا تھا لیکن تنہائی میں اہل موسیقی کو اپنا کمال ظاہر کرنے کی اجازت دیتا اس وقت صرف سید روح اللہ اور سید ابن رسول جو مقربان خصوصی میں سے تھے، اس کے خیمہ کے قریب ہوتے اسے سرنا اور شہنائی کا بھی شوق تھا۔ جو دربار میں ۹ بجے شب تک بجائی جاتی تھی۔ بادشاہ کا حکم تھا کہ صرف چار راگنیاں مالی کور، (غالبًا مالکوس) کلیان۔ کانڑا اور حسینی بجائی جائیں۔[2]

---

[1] واقعات مشتاقی کا مصنف اس کتاب کے متعلق لکھتا ہے کہ "میاں بودہ نے جو خواص خاں کے جانشین ہوئے تھے خراسان سے بہت سی کتابیں فراہم کیں اور تمام علماء ہند و ایران کو طلب کرکے طب سکندری کو مرتب کرایا تھا۔

میاں بودہ بڑا علم دوست امیر تھا۔ بڑے بڑے اہل کمال اس کے دربار میں موجود رہتے تھے اور یہ اُن سے مختلف فنون پر کتابیں تصنیف کرایا کرتا تھا

[2] یہ بیان تاریخ داؤدی کا ہے۔ واقعات مشتاقی میں ان چار راگنیوں کا نام گورا، کلیان، کانڑا، مقام حسینی تحریر کیا ہے۔ احمد یادگار (مصنف سلاطین افاغنہ) بیان کرتا ہے کہ بادشاہ کے چار غلام تھے جو موسیقی کے ماہر تھے ایک چنگ نہایت خوب بجاتا تھا دوسرا قانون، تیسرا طنبورہ کا ماہر تھا اور چوتھا بین کا۔ یہ غلام حسن صورت کے لحاظ سے بھی بے مثل تھے۔

عماراتِ آگرہ و دھولپور

عمارات کی طرف بھی اسے خاص توجہ تھی چنانچہ جب وہ مہم بلکھات سے کامیاب واپس آیا تو اس نے حکم دیا کہ دارالحکومت آگرہ سے لیکر دھولپور تک جابجا باغات اور مکانات تعمیر کرائے جائیں تاکہ سر کار سے واپس آنے کے بعد یہاں توقف کیا جائے۔[1]

آگرہ کی رونق

پھر علاوہ اس کے خود آگرہ کی رونق و ترقی، جس کو اس نے اک معمولی گاؤں سے بڑے شہر میں تبدیل کر دیا تھا، اسکے ذوقِ تعمیر، آرائشِ شہر و امورِ رفاہِ عام کا کافی ثبوت ہے۔

یہ خصوصیت بھی اسی بادشاہ کو حاصل ہوئی کہ اس کے عہد میں ایسے ایسے امراء گزرے کہ ان میں سے ہر ایک اپنے خصائل و عادات اپنے اخلاق و شائستگی، اپنے علم پرستی و ہنر پروری کے لحاظ سے ایک مستقل تصنیف چاہتا ہے۔

مخصوص امراء

چنانچہ تاریخ داؤدی اور واقعات مشتاقی میں بعض امراء کے مفصل حالات درج ہیں۔

ان میں سے خاص امراء یہ تھے:- اسد خاں[2] ابن مبارک خاں یوسف خیل۔ خان جہاں لودی[3] جسے سند علی حسین خاں کہتے تھے۔ میاں زین الدین[4]۔ خواص خاں[5] اور میاں معروف[6] فرملی۔

ان کے حالات دیکھنے سے (جو مختصراً ہم نے فٹ نوٹ میں درج کر دئے ہیں) ایک شخص اچھی طرح معلوم کر سکتا ہے کہ سکندر لودی کا عہد کیسا عجیب و غریب عہد تھا اور امراء و ارکین سلطنت پر خود اس کی سیرۃ کا کیسا زبردست اثر پڑا تھا۔

---

[1] منتخب التواریخ - ۱۵ — [2] اسد خاں، مبارک خاں یوسف خیل کا بیٹا تھا اس کی دریادلی اور فیاضی کی داستانیں مشہور ہیں تاریخ داؤدی کا مصنف بیان کرتا ہے کہ جب وہ کھانے کے لئے بیٹھتا تو ... قیمتی چینی کے قابوں میں ہر قسم کا کھانا الگ کیا جاتا اور ہر قاب پر ایک پان معہ ایک اشرفی کے رکھ کر سب غرباء کو تقسیم کر دیا جاتا۔ اس کے اخلاق کی یہ حالت تھی کہ اپنے خادم سے بھی وہ اسی طرح خطاب کرتا تھا جیسے اپنے کسی ہمسر سے۔

ایک بار اُسے معلوم ہوا کہ شیخ محمد فرملی آج کل عسرت کی حالت میں ہے اور اس کی لڑکی کی شادی ہونے والی ہے۔ اسد خاں نے اسے بلایا اور اپنے غلام کو حکم دیا کہ دونوں مٹھیوں میں اشرفیاں لیکر اس کے دامن میں ڈالدے جب اس کی تعمیل ہو چکی تو اسد خاں نے اشرفیوں کا شمار کرایا۔ معلوم ہوا کہ ستر ہزار تنکہ قیمت کی اشرفیاں ہیں۔ یہ دیکھ کر اسد خاں نے حکم دیا کہ ایک لاکھ تنکہ پورا کر دیا جائے۔ (احمد یادگار نے اس واقعہ کو بھیکن خاں ہفت ہزاری سے منسوب کیا ہے جس کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ اس نے چالیس مساجد تعمیر کرائیں اور ہر مسجد میں ایک امام اور ایک ... مقرر کیا۔ یہ بھی بڑا دریادل امیر تھا۔ روزانہ ... ہو کر بازار میں ... اور جب تک ... ۵۰۰ تنکہ غرباء کو تقسیم نہ کر دیتا گھر واپس نہ آتا)

ایک بار شکار میں کسی دیہاتی نے دہی کسی برتن میں پیش کیا اسد خاں نے اس برتن کو اشرفیوں سے بھروا دیا۔ اسی طرح ایک بار گاؤں کی کوئی عورت نیم کی پتیوں کی ترکاری بنا کر لائی۔ اسد خاں بہت خوش ہوا اور وہ ترکاری لیکر اسکے برتن میں بھی اشرفیاں چوٹی تک چنوا دیں۔

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۲۶۸ پر ملاحظہ ہو)

زلزلے — عہدِ سلطان سکندر کے خاص واقعات میں زلزلۂ آگرہ کا بھی شمار کیا جاتا ہے۔ یہ زلزلہ ۹۱۱ھ (۳، ماہ صفر) کو تمام ہندوستان میں آیا تھا۔ یہ اس قدر شدت کے ساتھ محسوس ہوا کہ لوگوں نے سمجھ لیا کہ قیامت آگئی ہے۔ اس میں جان و مال کا سخت نقصان ہوا۔ تمام مورخین نے اس کا ذکر کیا ہے۔

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۲۶۷)

(احمد یادگار نے اس واقعہ کو بھی ببکن خاں سے منسوب کیا ہے) ایک دن اسد خاں گھوڑوں کی خریداری کر رہا تھا اور صدر خاں کو (جو خود بھی امرا میں سے تھا اور اسد خاں کا مخلص دوست تھا) دکھاتا جاتا تھا۔ جب سودا ختم ہوا اور صدر خاں گھر پہونچا تو معلوم ہوا کہ ۱۰۸ گھوڑے جنکی تعریف صدر خاں نے کی تھی اس کے مکان پر موجود ہیں (احمد یادگار نے اس واقعہ کو دولت خاں لودہی سے اور مصنف واقعات مشتاقی نے سید خاں سے منسوب کیا ہے)۔ اسی طرح ایک بار جواہرات کی خریداری میں مصروف تھا۔ سات لاکھ، پانچ لاکھ، تین لاکھ تنکہ کے تین الماس اس نے پسند کئے اتفاق سے ایک شخص وہیں بیٹھا ہوا تھا اس سے کہا کہ تم ان میں سے کسی الماس کو اپنے لئے پسند کرتے ہو؟ اس نے سب سے کم قیمت ہیرے کی طرف اشارہ کیا۔ لیکن اسد خاں نے وہ تینوں الماس اس کو دیدئے (واقعات مشتاقی میں یہ واقعہ سید خاں کی طرف منسوب کیا گیا ہے اور احمد یادگار دولت خاں لودہی سے متعلق کرتا ہے اور اس قدر اضافہ اور کرتا ہے کہ سلطان سے کسی نے شکایت کی کہ دولت خاں، خزانۂ شاہی کو نہایت بیدردی سے لٹا رہا ہے لیکن سلطان نے جواب دیا کہ "تمھیں مجھے مبارکباد دینی چاہئے کہ ایسے ایسے امراء میرے دربار میں ہیں" اور دولت خاں کو طلب کرکے نگینہ اور چاندپور کے پرگنے جاگیر میں اضافہ کر دئے)

ایک دفعہ سلطان سکندر لودہی نے اسد خاں کو کسی خاص خدمت پر مامور کیا۔ جب یہ چندیری پہونچا تو معلوم ہوا کہ جن جانوروں کی پیٹھ پر خزانہ لدا ہوا ہے وہ بہت مجروح ہوگئے ہیں۔ لوگوں نے تجویز پیش کی کہ سارا روپیہ فوج کو تقسیم کر دیا جائے پھر بعد کو ان کی تنخواہ اور جاگیر سے وضع ہو کر خزانہ میں داخل ہو جائے گا۔ اسد خاں نے منظور کر لیا لیکن جب بعد کو اس کے سامنے حساب پیش کیا گیا تو اس نے کہا میں صراف نہیں ہوں کہ روپیہ دوں اور لوں یہ کہکر اس نے سارے کاغذات پھاڑ ڈالے اور سات لاکھ تنکہ جو فوج کو تقسیم کیا گیا تھا معاف کر دیا۔

سے خان جہاں لودہی کا نام مسند علی حسین خاں تھا۔ اسکی جاگیر بہت بڑی تھی اور میر بخشی کے عہدہ پر ممتاز تھا۔ اس نے اپنی تمام عمر میں کبھی کسی سپاہی کی تنخواہ میں کوئی کمی نہیں کی اور نہ جرمانہ کیا۔ جب کوئی ملازم مرتا تھا تو اس کی تنخواہ اس کے بیٹے کے نام منتقل ہوتی تھی۔ اگر بیٹا نہ ہوتا تو بھتیجے یا بھانجے کو دیجاتی اور اگر یہ بھی نہ ہوتے تو وہ ماں یا کسی اور عزیز کو۔ وہ درباداری کو پسند نہ کرتا تھا اور اگر کوئی خادم خلاف اوقات آتا تو اس سے کہتا کہ تم گھر جاؤ کیونکہ میں بھی گھر میں ہوں تمھارے اوپر تمھارے اہل وعیال کے بھی حقوق ہیں انھیں ادا کرو۔ سیرچشمی اور فیاضی بھی اس کی مشہور تھی۔ بڑے میاں ایک دن خلاف معمول ذرا سویرے پہونچے اور کھچڑی کھانے کی خواہش ظاہر کی۔ لیکن جب وہاں سے واپس آئے تو خلعت اور گھوڑے کے علاوہ ایک گانوں بھی جاگیر میں لیکر آئے۔

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۲۶۹ پر ملاحظہ ہو)

احتساب نفس اور کفارۂ گناہ

جب بادشاہ بیمار ہوا اور اس نے خیال کیا کہ شاید وہ زندہ نہ رہیگا تو اس نے اپنے شیر ِ مذہبی شیخ لاڈن دانشمند سے پوچھا کہ قضائے نماز۔ ترک صیام۔ شراب خوری وغیرہ کا کفارہ کیا ہو سکتا ہے۔ شیخ نے تفصیل لکھ کر بھیجدی۔ سلطان نے

(بقیہ فٹ نوٹ صفحۂ ۲۶۸)

جب خان جہاں لودی کا انتقال ہوا تو سلطان سکندر لودہی نے تمام جاگیر مع عہدۂ میر بخشی کے میاں زین الدین کو عطا کردی جو خان جہاں لودہی کا نہایت معتمد علیہ افسر فوج تھا۔ اور خان جہاں کے بیٹے احمد خاں کو ضلع لکھنؤ میں جاگیر دیکر تین لاکھ تنکہ نقد سالانہ مصارف طبع دس ہزار سواروں کے لئے مقرر کردیا۔ ۔ کہ میاں زین الدین اپنے زہد و اتقا، فیاضی و اولوالعزمی کے لحاظ سے بے مثل شخص تھے طلوع صبح صادق کے وقت بیدار ہوتے اور دوپہر تک عبادت و وظایف میں مشغول رہتے۔ لکھا جاتا ہے کہ روزانہ کم از کم دس منزل کلام مجید کی کھڑے ہوکر ختم کرتے۔
کھانے کے وقت علماء عصر دستر خوان پر ہوتے اور مسایل علمیہ پر اس وقت گفتگو ہوا کرتی۔ سہ پہر کو انتظامی معاملات کی طرف توجہ کرتے اور پھر نماز مغرب کے وقت سے عشاء تک عبادت میں مشغول رہتے۔ اس کے بعد کھانا کھاکر خلوت میں چلے جاتے۔ شب جمعہ میں وہ کوئی کام سوائے ذکر و شغل کے نہ کرتے۔ ایک شب سلطان سکندر لودہی نے تین آدمی ان کی طلب میں روانہ کئے لیکن یہ نہیں آئے اور سلطان نے بھی کچھ نہیں کہا کیونکہ شب جمعہ میں ان کا گھر سے باہر نکلنا یا کوئی دنیاوی کام کرنا خلاف معمول تھا۔
ان کا دستر خوان بہت وسیع تھا۔ اور دن میں تین بار کھانا تمام غرباء کو اور جو شخص آجائے تقسیم کیا جاتا تھا رمضان بھر افطار و اسحار میں حکم تھا کہ جو شخص آجائے اُسے دودھ چاول کھانے کے لئے دیا جائے ۔ ہر سال وہ اپنے تمام اعزہ کو دہلی سے آگرہ بلاتے اور وقت رخصت ہر شخص کی تمام ضروریات و خواہشات مہیا کرتے ۔ ربیع الاول کی پہلے بارہ دنوں میں دو ہزار تنکہ روزانہ کا کھانا پکواکر غرباء کو تقسیم کرتے۔ اول و آخر دن چار ہزار تنکہ زائد کے خرچ سے حلوا وغیرہ بھی تیار کیا جاتا۔ سلطان سکندر لودہی کی وفات پر میاں زین الدین کی جاگیر وغیرہ سب لے لی گئی اور عسرت بہت بڑھ گئی لیکن اُن کی خوش نیتی اور سیر چشمی کا وہی عالم رہا اور باوجود عسرت و تنگدستی کے تین لاکھ تنکہ کی دستاویزیں چاک کرکے صرف اس لئے ضایع کردیں کہ کہیں عسرت کے زمانہ میں مدیون لوگوں سے وصولی روپیہ کا خیال نہ آجائے۔
[5] خواص خاں نہایت بہادر و ذی ہمت افسر تھا۔ سلطان سکندر لودی نے نگرکوٹ کا کوہستانی علاقہ زیر کرنے کے لئے اسکو مامور کیا تھا اسنے بہت جلد یہ تمام صوبہ فتح کرکے دیبی شنکر کا مشہور مندر توڑا اور وہاں سے ہندوؤں کا سنگ مقدس اور تانبہ کا چھتر لے آیا۔ پہلے اس نو فتح کی جاگیریں، صرف ۳ لاکھ تنکہ آمدنی رکھتی تھیں۔ لیکن اس فتح کے بعد ۱۵ لاکھ تک آمدنی بڑھ گئی۔ جب یہ واپس آیا تو بیمار تھا۔ اس نے بادشاہ سے ملنے کی درخواست کی اور حاضر ہوکر تمام حسابات پیش کئے۔ سکندر لودی نے کہا میں نے تمھیں مختار کامل بناکر بھیجا تھا اور جو کچھ تم نے کیا وہ بالکل درست و بجا ہے۔ میں حسابات دیکھ کر کیا کروں گا۔ چنانچہ بادشاہ نے حساب کے تمام کاغذات پانی میں ڈلوادئے۔
خواص خاں بڑا معتمد علیہ اور نہایت وفادار و امین افسر تھا۔ اس کے مرنے کے بعد میاں بھورہ کو اس کی جگہ دی گئی۔

(بقیہ فٹ نوٹ صفحۂ ۲۷۰ پر ملاحظہ ہو)

وقائع نگار سے دریافت کیا کہ اس قسم کے گناہ مجھ سے کتنی مرتبہ سرزد ہوئے ہیں جب اس نے بھی تفصیل لکھ دی تو بادشاہ نے حساب لگا کر حکم دیا کہ اس قدر سونا غربا کو دیا جائے لیکن خزانۂ شاہی سے ایک پیسہ نہ لیا جائے۔ علماء کو اس پر حیرت ہوئی کہ بادشاہ کے پاس سلاطین و امراء کی طرف سے جو تحایف آتے تھے وہ علٰحدہ رکھے جاتے تھے اور ان کا سالانہ حساب طیار ہوتا تھا۔[۱]

وفات

بادشاہ کا مرض بڑھتا جاتا تھا[۲] لیکن وہ اُمور سلطنت سے غافل نہ تھا اور برابر اپنے فرائض انجام دیتا جاتا تھا آخرکار ۷ ذی قعدہ ۹۲۳ھ (نومبر ۱۵۱۷ء) کو اس نے انتقال کیا۔
تاریخ خان جہاں لودی کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ بعد کو اس کا جنازہ دہلی گیا اور وہاں ایک باغ میں مدفون ہوا۔

سلطان ابراہیم

۹۲۳ھ ۱۵۱۷ء سے ۹۳۲ھ ۱۵۲۶ء تک

ابراہیم خاں کی تخت نشینی

سلطان سکندر لودی نے اپنے دو بیٹے چھوڑے، جو حقیقی بھائی ایک ہی ماں سے تھے، بڑے کا نام ابراہیم تھا اور چھوٹے کا نام جلال خاں۔
چونکہ ابراہیم اپنے حسنِ صفات کی وجہ سے امراء کے طبقہ میں بہت مقبول تھا اور یوں بھی وہ بڑا بیٹا تھا اس لئے

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۲۶۹)

[۱] میاں معروف فرملی بھی، عہدِ سکندر لودی کا نہایت مشہور امیر تھا یہ اپنے زہد و ورع، ہمت و شجاعت، فیاضی و سخاوت کی وجہ سے بہت ممتاز درجہ رکھتا تھا۔ یہ سلطان لودی کے زمانہ سے لیکر سلام شاہ کے عہد تک سیکڑوں لڑائیوں میں شریک رہا لیکن کبھی زخمی نہیں ہوا ... انعام یا تحفہ بادشاہ کی طرف سے قبول نہیں کیا۔ جب شیر شاہ اور مال دیو کے درمیان جنگ ہوئی تو یہ بھی تلوار سے زخمی ہوا ... عمر ۱۰۰ سال کی تھی شیر شاہ نے اس کے زخمی ہونے کے بعد ۳ لاکھ تنکہ اسکے پاس بھیجے لیکن اس نے واپس کر دئے اور کہلا بھیجا کہ میں نے آج تک کبھی سلطانی انعامات کو قبول نہیں کیا کیونکہ جو کچھ مجھے فی الحال ملتا ہے وہ بھی میرے خدمات سے زاید ہے رہا زخم کھانا سو اس کا معاوضہ کیا لوں گا جبکہ وہ صرف اللہ کی راہ میں میں نے حاصل کیا ہے۔

[۱] تاریخ داؤدی (الیٹ) ۴۷۰-۴۷۱ — [۲] مرض یہ تھا کہ تنفس میں دشواری تھی اور غذا وغیرہ ضیق نفس کی وجہ سے ترک ہو گئی تھی

سلطان سکندر لودی کی وفات پر وہ نہایت تزک و احتشام کے ساتھ تخت نشین کیا گیا۔[1] لیکن یہ کہنا کہ تمام امراء سلطنت اس تخت نشینی پر دل سے رضامند تھے درست نہ ہوگا۔ کیونکہ اُن میں سے بعض ایسے بھی تھے جو سلطنت میں تفریق پیدا کرکے اپنی اغراض پوری کرنے کی غرض سے یا حقیقتاً ابراہیم سے برہم ہونے کی وجہ سے[2] جلال خاں دوسرے بیٹے کے طرفدار تھے۔

جب ابراہیم تخت نشین ہوگیا تو انھیں امراء نے جو سلطان ابراہیم کی سلطنت کو زیادہ قوی دیکھنا گوارا نہ کرسکتے تھے یہ تجویز پیش کی کہ سلطنت کے دو حصے کردئے جائیں۔ ایک حصہ آگرہ سے جونپور تک، جو سلطان ابراہیم کے قبضہ میں رہے اور دوسرا جونپور کا معہ اس کے اطراف کے، جو جلال خاں کو ملنا چاہئے۔ چنانچہ فوراً اس تجویز پر عمل ہوگیا اور جلال خاں کو جلال الدین کا لقب دیکر جونپور کی طرف روانہ کردیا۔[3]

فرشتہ کا بیان ہے کہ جلال خاں کالپی میں تھا اور وہ وہیں سے جونپور روانہ ہوگیا اور مسند شاہی پر بیٹھ گیا۔ بہرحال جلال خاں آگرہ سے گیا ہو یا کالپی سے یہ امر متفق علیہ ہے کہ سلطنت کی تفریق ہوگئی اور جونپور کا حصۂ سلطنت جلال خاں کے سپرد کردیا گیا۔

اس کے بعد جب خان جہاں[4] ریڑی سے سلطان ابراہیم کی خدمت میں حاضر ہوا تو اس نے ملامت کی کہ ایک سلطنت کے دو حصے کردینا کسی طرح مناسب نہیں ہے، چنانچہ سلطان ابراہیم نے ہیبت خاں گرگ انداز کو روانہ کیا کہ وہ کسی طرح لطایف الحیل سے جلال الدین کو لے آوے۔ مگر اس میں کامیابی نہیں ہوئی۔ بمجبوراً نواح جونپور کے امراء و حکام کو ترغیب دی گئی کہ وہ جلال الدین کی اطاعت نہ کریں۔ چنانچہ ان لوگوں نے اس سے روگردانی اختیار کی اور جلال الدین کو مجبوراً کالپی جانا پڑا۔ یہاں پہونچکر اس نے علانیہ مخالفت شروع کردی اور اپنے نام کا سکہ و خطبہ جاری کردیا۔ اس وقت اعظم ہمایوں سردار، کالنجر[5] کے محاصرہ میں مصروف تھا۔ جلال الدین نے اس کو اپنی بے بسی و بے کسی کے اظہار سے [illegible] مائل کرلیا اور یہ آخر کالنجر کا محاصرہ چھوڑ کر جلال الدین سے مل گیا۔ اب جلال الدین کو تقویت پہونچی اور اعظم ہمایوں کے مشورہ سے جونپور کی طرف چلا۔ راستہ میں سلطان ابراہیم کے

---

[1] مخزن افاغنہ، تاریخ خان جہاں لودی میں تاریخ تخت نشینی ۸ ذیقعدہ ۹۲۳ھ تحریر ہے۔ اور تمام دیگر مورخین کا بھی یہی بیان ہے۔ البتہ احمد یادگار (تاریخ سلاطین افاغنہ کا مصنف) بجائے ۸ ذیقعدہ کے ۸ ذی الحجہ تحریر کرتا ہے جو غالباً درست نہیں ہے۔ کیونکہ سلطان سکندر لودی کی تاریخ وفات محقق طور سے ۷ ذی قعدہ کو وقوع میں آئی اور ظاہر ہے کہ اس کے ایک ماہ بعد رسم تاجپوشی ادا نہیں ہوسکتی بلکہ دوسرے ہی دن دوسرا بادشاہ تخت نشین ہوگیا ہوگا۔ [2] برہم ہونے کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ ابراہیم نے جانشین ہوتے ہی اپنے باپ دادا کے خلاف تمام افغان امراء کے ساتھ اپنا طرز عمل بدل دیا اور اُن کے ساتھ ایسا سلوک شروع کیا جو اخوان سلطنت کے ساتھ نہیں کیا جاتا۔ مثلاً یہ کہ دیگر عام وابستگان کی طرح انھیں بھی دست بستہ تخت کے سامنے کھڑا ہونے پر مجبور کیا۔ [3] سلاطین افاغنہ (ایلیٹ) ۵-۸۔ [4] یہ نام فرشتہ، نظام الدین احمد اور ملا بدایونی نے تحریر کیا ہے۔ احمد یادگار نے اعظم ہمایوں لودی اور خانخانان فرملی کا نام تحریر کیا ہے۔

[5] کالنجر تقسیم کے مطابق جلال الدین کے قبضہ میں تھا۔

مقرر کردہ حاکم اودھ (سعید خاں پسر مبارک خاں لودی) سے مقابلہ ہوا۔ یہ بھاگ کر آگرہ کی طرف چلا گیا اور سلطان ابراہیم کو تمام حالات کی اطلاع دی۔

سلطان ابراہیم کا مقابلہ

یہ خبریں سُن کر سلطان ابراہیم خود ۹۲۳ھ میں مقابلہ کے لئے روانہ ہوا قبل اس کے کہ بادشاہ وہاں تک پہونچتا، اعظم ہمایوں، جلال خاں سے منحرف ہو کر راستہ میں اس سے آکر مل گیا اور جلال خاں اپنے متعلقین کو کالپی میں چھوڑ کر تیس ہزار فوج کے ساتھ آگرہ کی طرف روانہ ہو گیا۔ لیکن اسے اس میں بھی کامیابی نہیں ہوئی۔ کالپی بھی مفتوح ہو گیا اور آگرہ پر بھی قبضہ نہ ہو سکا۔ ناچار یہ گوالیار گیا اور وہاں کے راجہ مان سنگھ[1] کی حمایت چاہی۔

جلال الدین کی فراری

شاہی افواج نے گوالیار کا محاصرہ کیا اور بادل گڑھ وغیرہ مسمار کر کے جلال الدین کو یہاں سے بھی بھاگ جانے پر مجبور کر دیا۔

جلال خاں کی گرفتاری اور قتل

جلال خاں اب مالوہ گیا لیکن وہاں کے فرمانروا محمود خلجی نے کچھ زیادہ مدارات نہ کی تو وہ گڑھ کٹنگ کی طرف بھاگ نکلا جہاں گونڈوں نے اسے گرفتار کر کے سلطان ابراہیم لودی کے پاس بھیجدیا۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ قلعہ ہانسی میں قید کر دیا جائے۔ لیکن وہاں پہونچنے سے قبل ہی راستہ میں اُسے قتل کرا دیا[2]۔ اس کے بعد جب سلطان ابراہیم لودی ذرا اطمینان سے آگرہ میں بیٹھا تو اس کی بدگمانی اور نخوت بہت زیادہ بڑھ گئی اور انھیں امراء و ارکین کے ساتھ بُرا سلوک کرنے لگا جو حقیقتاً مدارِ سلطنت تھے۔ اعظم ہمایوں اور اس کے بیٹے فتح خاں کو بلا کر قید کر دیا۔ میاں بھوا کو جو عہد سکندری کے مشہور امراء میں سے تھے، پابزنجیر کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بغاوتیں رونما ہونے لگیں اور امراء بددل ہو گئے۔ دریا خاں بہار کے حاکم نے خود مختاری کا اعلان کر دیا اور اس کے بیٹے محمد[3] نے جو دریا خاں کے بعد جانشین ہوا اپنے نام کا خطبہ و سکہ جاری کر دیا۔ تمام امراء جو بادشاہ سے منحرف تھے محمد سے مل گئے اور اس طرح تقریب ایک لاکھ سواروں نے سنبھل تک قبضہ کر لیا۔

دلاور خاں کی بغاوت

اتفاق سے اس زمانہ میں دلاور خاں (دولت خاں لودی حاکم پنجاب کا بیٹا) آگرہ آیا اور بادشاہ کی برہمی کا حال اپنے باپ سے بیان کیا۔ یقیناً دلاور خاں بغاوت نہ کرتا اگر وہ بادشاہ کی بے وجہ برہمی سے خائف نہ ہوتا۔ اس نے مفر اسی میں دیکھا کہ وہ اس سے الگ ہو جائے۔ چنانچہ اس نے بھی بغاوت شروع کر دی اور بابر کو ہندوستان آنے کی دعوت دی۔

بابر کا حملہ

اس کا نتیجہ پانی پت کی وہ مشہور لڑائی تھی جس نے سلطان ابراہیم کو ہمیشہ کے لئے نیست و نابود کر کے اور بابر کو

---

[1] مان سنگھ نہایت بہادر راجہ تھا لیکن اتفاق سے جلال خاں کے پہونچنے پر وہ مر گیا اور اس کا بیٹا بکرماجیت جانشین ہوا۔

[2] فرشتہ ۱۹۰۔ طبقات ۱۷۷۔ سلاطین افاغنہ (الیٹ) ۵-۱۲۔

[3] فرشتہ نے اس کا نام غازی خاں اور منتخب التواریخ میں خانخاناں لکھا ہے۔

[4] چونکہ یہ جنگ بابر کا مشہور کارنامہ ہے اس لئے اس کی مفصل کیفیت اس کے حالات میں درج کی جائے گی۔

دہلی کا فرمانروا بنا کے ۹۳۲ھ / ۱۵۲۶ء میں ہندوستان کی سلطنت چغتائیہ تیموریہ خاندان میں منتقل کر دی۔

سلطان ابراہیم نے کل ۹ سال تک سلطنت کی (جس کو فرشتہ نے خدا جانے کس حساب سے بیس سال تحریر کیا ہے) اور اس کے دوران حکومت میں اگر کوئی خاص بات نظر آتی ہے تو وہ غیر معمولی ارزانی ہے۔

مصنف تاریخ داؤدی کا بیان ہے کہ سلطان بہرام کے عہد میں، غلہ، کپڑا اور تمام چیزیں ایسی ارزاں تھیں کہ اس سے قبل کبھی نظر نہیں آئیں۔ سلطان علاء الدین خلجی کے عہد میں جو ارزانی تھی وہ جبر و سختی سے پیدا ہوئی تھی لیکن ابراہیم کے زمانہ میں پیداوار اس قدر کثرت سے ہوتی تھی کہ لوگ خود ارزاں فروخت کرنے پر مجبور تھے۔ سکندر لودی کے وقت میں بھی ارزانی بہت تھی، لیکن نہ اس قدر۔ اس کے عہد میں ایک بہلولی سکہ[1] کا دس من غلہ آتا تھا، پانچ سیر گھی اور دس گز کپڑے کی قیمت بھی ایک بہلولی تھی۔ علاوہ ان کے اور تمام اشیاء کی ارزانی کا بھی یہی عالم تھا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ بارش کی موزونی سے دہ چند غلہ پیدا ہونے لگا اور بادشاہ نے حکم دے دیا کہ لگان میں بجائے روپیہ کے غلہ وصول کیا جائے، جس نے سکہ کی قیمت کو گھٹا دیا اور امراء و جاگیرداروں کو مجبور کر دیا کہ اپنے اپنے اقطاع کا غلہ نہایت ارزاں قیمت پر فروخت کریں۔ ایک معزز آدمی معہ اپنے خاندان کے پانچ تنکہ ماہوار کی آمدنی میں نہایت امن و راحت سے زندگی بسر کرتا تھا اور اگر کوئی سوار[2] دہلی سے آگرہ تک کا سفر کرتا تو صرف ایک بہلولی سکہ اس کے، اس کے گھوڑے اور سائیس کے مصارف کے لئے کافی ہوتا تھا[3]۔

---

[1] تانبہ کا سکہ تقریباً پونے دو تولہ کے برابر۔

[2] سوار کی تنخواہ بیس سے تیس تنکہ تک تھی اور اس سے اُس عہد کی خوشحالی کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

[3] تاریخ داؤدی (ایلیٹ)۔ ۴ - ۴۷۵ - ۴۷۶

ہندوستان سنہ ۹۳۲ھ (۱۵۲۵ء) میں

حملۂ بابر کے وقت

راجپوتانہ

وجیانگر
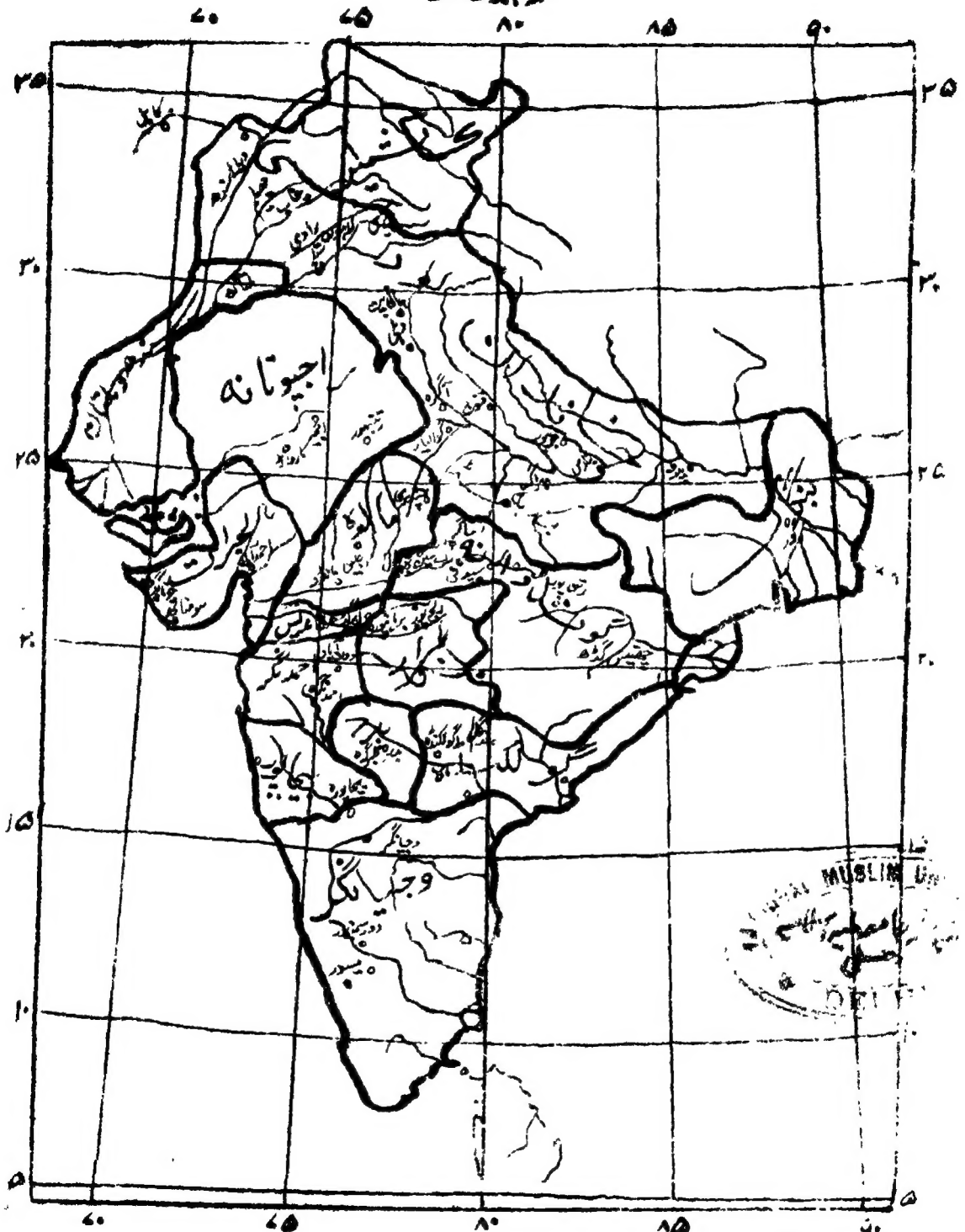
حکومت خاندان لودی و دیگر خود مختار ریاستیں

رجسٹرڈ نمبر اے ۱۱۰۴